مجلۂ عثمانیہ

طلبۂ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ



مدیر:- محمد یونس سلیم

بی اے (جامعہ عثمانیہ)

نائب مدیر:- محمد فضل الدین

متعلم سال چہارم

مطبع شمس المطابع مشیر پریس حیدرآباد دکن

مجلس انتظامی

جلد (۱۱) سال تعلیمی ۱۳۴۷ف شمارہ ۱-۱ اور ۲

(صدر)

قاضی محمد حسین صاحب

ایم اے ال ال بی دینیات

نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

(نگران کار حصہ اردو)

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام اے پی ایچ ڈی (لندن)

پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

ڈاکٹر مولوی عبدالحق بی اے (علیگ) ڈی لٹ

مددگار پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

(نگران کار حصہ انگریزی)

مسٹر ایف۔ جے۔ اے ہارڈنگ ام اے (آکسن) پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ

(خازن اعزازی)

مولوی وحیدالرحمن صاحب بی ایس سی پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

(معتمد)

محمد یونس سلیم متعلم ال ال بی (آخری) مہتمم مدیر مدیر حصہ اردو مجلہ عثمانیہ

(اراکین)

محمد بن عمر صاحب بی اے صدر انجمن اتحاد

محمد فضل الدین صاحب نائب مدیر حصہ اردو متعلم سال اول علم

محمد عبدالجبار صاحب مدیر حصہ انگریزی
متعلم ال ال بی (آخری)

مسٹر پی پنا بھ نائب مدیر حصہ انگریزی
متعلم ام ایس سی

مجلۂ عثمانیہ

جلد (۱) شمارہ (۱) اور (۲)

چندہ سالانہ پیشگی



(۱) سرکار آصفیہ و برطانیہ سے	۱۲ روپے
(۲) ارباب جامعہ اصحاب مقتدر اور اداروں سے	۸ ,,
(۳) عام خریداروں سے	۶ ,,
(۴) طلبائے قدیم" رفاہیہ انجمنوں اور دار المطالعوں سے	صہ ,,
(۵) طلبائے کلیہ جامعہ عثمانیہ سے	۴ ,,
(۶) ممالک بیرون ہند سے	۱۵ شلنگ
(۷) بلاد یورپ کے طلبائے قدیم کلیہ جامعہ عثمانیہ سے	۱۰ شلنگ
(۸) فی رسالہ	۲ روپے

ملنے کا پتہ

دفتر مجلہ "عثمانیہ" جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

فہرست مضامین مجلہ عثمانیہ

جلد یازدہم شمارہ اول و دوم

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دوآتشہ

(۱)

آٹھ پہر کی یہ بے چینی یہ بیتابی کیا کہیے
حد سے گذری دل کی خرابی دل کی خرابی کیا کہیے

تم کیا جانو کیا شے ہے طوفان سرشکِ خونی کا
تم نے چھلکتی ہی نہیں دیکھی دل کی گلابی کیا کہیے

ہائے وہ پہلی نظروں میں ہر موج کا ساحل بن جانا
بحرِ بے پایانِ محبت کی پایابی کیا کہیے

اگلے برس کے پھولوں کا کیا حشر انھیں معلوم نہیں
پھولوں کا یہ طرزِ تبسم یہ شادابی کیا کہیے

ہوش جنھیں دل بنکر آیا اُن کی تڑپ کا کیا کہنا
غم نے جنھیں بیدار کیا، ان کی بیخوابی کیا کہیے

کتنے فتنے جمع کیے ہیں ان کی ایک جوانی نے
چال قیامت، کافر نظریں، آنکھ شرابی کیا کہیے

خاکِ وطن ہی راس نہ آئی غربت تو پھر غربت ہے
فانیؔ اپنی خانہ بدوشی خانہ خرابی کیا کہیے

(۲)

ھ ہوش گنوانے کے چرچے کچھ ہوش میں آجانے کے — یہ دونوں عالم کچھ بھی نہیں ٹکڑے ہیں مرے افسانے کے
ھ حسرت کے آثار سے ہیں کچھ دل سا ٹھہرا جاتا ہے — وحشت سے گذرتے جاتے ہیں انداز ترے دیوانے کے
ل کی جو حقیقت ہے کیا کہیے حسن بھی دل ہے عشق بھی دل — ہر شمع جلائی جاتی ہے پردہ میں کسی پروانے کے
یداد یہ کہیے اف نہ کریں کہیے تو تڑپ کر دم دیدیں — کچھ شغل ہمیں بھی آتے ہیں سرکار کا دل بہلانے کے
و پرسش حال نہ فرمائیں تو جرأتِ عرضِ حال کہاں — آج اُن کے نہ فرمانے میں شاید تیور تھے فرمانے کے
جام سکوتِ مرگ آیا جب ہجر کی پچھلی رات ڈھلی — اب جاگنے والی آنکھوں پر آثار کھلے نیند آنے کے

وہ جادۂ ہستی ہو **فانی** یا راہ محبت ہو کچھ ہو
ہر غم کے لئے دو رستے ہیں اور وہ بھی مرے غمخانے کے

فانی بدایونی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اداریہ

الحمدللہ مجلۂ عثمانیہ کی گیارہویں جلد کا پہلا اور دوسرا مشترک شمارہ آپ کی خدمت میں حاضر ہے ۲۰ جنوری سنہ ۱۹۳۰ء کو ہمیں جائزہ دیا گیا اور یہ مارچ کا دوسرا ہفتہ ہے کہ تقریباً تین سو صفحہ کا رسالہ ہم آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی عزت حاصل کر رہے ہیں۔ اس قلیل مدت میں مجلہ کو کامیابی کے ساتھ شایع کرنے کی جو کوششیں ممکن تھیں اس میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا گیا اور ہم اپنی کوششوں میں کہاں تک کامیاب ہوئے اس کا فیصلہ خود آپ ہی کریں گے۔ اگر امتحان کی کشمکش اور سرکار سرکاری کی سرمہری دامنگیر نہ ہوتیں تو شاید مجلہ کچھ دن اور پہلے اس سے بہتر صورت میں شایع ہو چکا ہوتا۔

اس مجلہ میں جو مضامین شایع ہو رہے ہیں ان کے متعلق بھی ہمیں کچھ عرض کرنا ہے۔ سب سے زیادہ سعی ہم نے اس بات کے لئے کی کہ مجلہ میں ایسے مضامین شایع ہوں جو زبان کے لحاظ سے بلند ہوں اور اپنے میں عمومی دلچسپی کا سامان رکھتے ہوں۔ صرف ادبی معاشی اور سیاسی مضامین تمام طلبا کے لئے یکساں تفریح کا باعث نہیں ہو سکتے بلکہ ضرورت اس امر کی ہے کہ جامعہ میں جتنے شعبہ قائم ہیں ان سب شعبوں کے مضامین مجلہ کے لئے فراہم کئے جائیں تاکہ ہر طالب علم کو اپنے ذوق کے مطابق کوئی نہ کوئی مضمون پڑھنے کے لئے مل سکے مگر ہم کو بڑی نا امیدی ہوئی جب ہماری پیہم استدعاؤں کے بعد بھی بعض شعبوں سے مضامین نہیں وصول ہوئے اور آئے بھی تو ایسے مضامین جن کی ان سے توقع نہیں کی جاتی تھی۔ مثلاً کلیہ انجینیری اور کلیہ طبیہ سے رباعیات اور افسانے مجلہ میں شایع کرنے کے لئے بھیجے گئے ہیں۔

سلسلہ میں اپنے تمام اہل قلم برادران جامعہ سے یہ عرض کرنا ہے کہ ہم مجلہ میں بالعموم صرف ایسے ہی مضامین شایع کرتے ہیں جو علمی اور تحقیقی ہوں اور طلباء سے یہ توقع رکھتے ہیں کہ وہ اپنے اپنے ذوق کے لحاظ سے مضامین تحریر فرمائیں گے تاکہ ہم اپنی جامعہ کے تمام شعبوں کی نمایندگی مجلہ کے ذریعہ سے کر سکیں اور اپنے ہر قسم کے علوم و فنون کے کارناموں کو دنیا کے سامنے پیش کرنے کے قابل ہوں۔ افسانے اور غزلیں شایع کرنے والے رسالے ہندوستان میں بہت ہیں۔ اگر مجلۂ عثمانیہ بھی اس قسم کے مضامین کی اشاعت شروع کردے تو دوسرے "ہلکے قسم" کے رسالوں میں اور اس میں فرق ہی کیا باقی رہے گا۔ اس سے ہمارا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ ہم افسانے اور غزلیں بالکل شایع ہی نہیں کرنا چاہتے۔ اگر مجلہ کے شایانِ شان غزلیں اور افسانے ہم کو ملیں تو ہم نہایت مسرت سے ان کی اشاعت کے لئے آمادہ ہیں چنانچہ اس مرتبہ ہمیشہ سے زیادہ غزلیں مجلہ میں شائع ہو رہی ہیں اور کوئی شک نہیں کہ ادبی افادیت کے لحاظ سے غزل کی اہمیت نظم سے کسی طرح کم نہیں ہے جو لوگ اردو میں غزل گوئی کے مخالف ہیں وہ شاید غزل کی خوبیوں کو سمجھ نہیں سکے۔

ہم کو جتنے افسانے وصول ہوئے ان میں صرف ایک ہی افسانہ ایسا تھا جس پر دراصل لفظ "افسانہ" کا اطلاق ہو سکتا ہے اور بڑی خوشی کی بات ہے کہ وہ افسانہ "کلیہ اناث" کی ایک طالبہ کا ہے۔ یہ افسانہ بیشک ایک معیاری افسانہ ہے اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی مشاق افسانہ نگار کے قلم سے نکلا ہے۔ اس کے علاوہ دو اور مضامین کلیہ اناث کی طالبات کے شایع ہو رہے ہیں جن میں سے ایک "کارپنٹر" کے کسی ادبی شاہکار کا ترجمہ ہے۔ اور بہت کامیاب ترجمہ ہے۔ دوسرا مضمون "ادب لطیف" کے دو ٹکڑوں پر مشتمل ہے۔ ان کے علاوہ جو افسانے شایع نہیں کئے گئے وہ یا تو زبان کے لحاظ سے اس قابل نہ تھے کہ مجلہ میں جگہ پا سکیں یا آرٹ کے لحاظ سے ان میں خامیاں تھیں۔ بقیہ مضامین جو اس شمارہ میں شایع ہو رہے ہیں وہ سب علمی یا تحقیقی ہیں اور ان میں ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کا مضمون "اسلامی مملکت گستری اپنے آغاز میں" اپنی نوعیت کا بہترین مضمون ہے اور ہم اس مقالہ کو فخر کے ساتھ شایع کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں۔

حصۂ نظم میں جہاں تک طلباء کی نظموں کا تعلق ہے ہمیں اس امر کا اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ نظمیں اتنی معیاری نہیں جتنی کہ ہونا چاہئیں اور یہ کمزوری مجلہ کے گزشتہ شماروں میں بھی پائی جاتی ہے یہ امر ایک حد تک باعث افسوس ہے کہ جامعہ عثمانیہ نے دو چار اصحاب کے علاوہ اب تک کچھ زیادہ اچھے شاعر پیدا نہیں کئے۔ ہر چند کہ اچھے شاعر پیدا کرنا کسی یونیورسٹی کے فرائض میں داخل نہیں ہے لیکن جامعہ عثمانیہ جیسے تعلیمی مرکز میں جو اردو علم و ادب کا گہوارہ ہو، اعلیٰ مصنفین، اور بہترین انشاپردازوں کے ساتھ ساتھ اچھے شاعروں کا پیدا ہونا بھی ضروری ہے۔ تاہم ناامیدی کی ضرورت نہیں ہے ہمارے جامعہ میں بعض خوش فکر طالب علم ایسے ہیں جو اگر بے راہ روی میں نہ پڑ گئے تو جامعہ کے لئے باعث افتخار ثابت ہوں گے۔

دکن نے اہل کمال کی ہمیشہ قدر شناسی کی ہے۔ اور اس کو جغرافی حدود تک کبھی محدود نہیں رکھا ہے، قزلباش خاں امید اور موسوی خاں حیدرآبادی نہ تھے لیکن باقی دولت آصفیہ کو ہمیشہ ان پر فخر رہا۔ موسوی خاں کی قابلیت سے متاثر ہو کر نادر شاہ نے جب ان کو لینا چاہا تو

نواب مغفرت مآب نے عذر کیا کہ ابوالفضل کے بعد دربار اکبری میں کیا رہ گیا۔ ذوق کے استاد شاہ نصیر اپنے زمانہ میں ادب اردو کے شاید سب سے بڑے محسن تھے۔ حیدرآباد نے ان کی منزلت کی دل کھول کر داد دی جس کی داستانیں مہاراجہ چندو لال کی بارہ دری کو اب تک یاد ہوں گی شاہ صاحب کو یہ دار ایسی بھائی کہ آخر یہیں کے ہو رہے اور آج تک رود موسیٰ کے کنارے نئے پل کے قریب موسیٰ شاہ قادری کے درگاہ میں خواب عدم میں غرق ہیں۔

آج اعلیٰحضرت سلطان العلوم آصف سابع خلد اللہ سلطانہٗ کی شان جلالت آج اس وقت تیرہ سو برس کی جلالت شان کی یادگار ہے اس درخشندہ و تابناک عہد گوہرین میں بدون کسی تفریق کے ہر ملک کے اہل کمال فراہم ہیں اور بہ قدر حال ان سب کے افادات سے ملک مستفید ہو سکتا ہے۔ انھیں مایۂ ناز نفوس ادبیہ میں ایک علامہ عبداللہ العمادی اور دوسرے مولوی شوکت علیخان فانی کی ذات مجمع الصفات بھی ہے علامہ موصوف کا ایک مضمون اور حضرت فانی کی دو غزلیں ابھی ابھی نظر افروز ہوں گی جن کے لئے ہم ان دونوں حضرات کے دل سے سپاس گذار ہیں۔

اس سال جامعہ الہ آباد نے ہماری دولت ابد مدت کے تین معزز و محترم اصحاب کو اعزازی ڈگریاں عنایت کیں۔ رائٹ آنریبل نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر کی علمی اور معاشری خدمات کا اعتراف ابھی چند ماہ قبل آکسفورڈ یونیورسٹی میں کیا جا چکا ہے انگلستان کے بعد الہ آباد یونیورسٹی نے بھی نواب مستطاب کو ال ال ڈی کی اعزازی ڈگری دے کر "اس اعتراف خدمات" پر شمالی ہند کے باشندوں کی طرف سے بھی مہر توثیق ثبت کر دی۔ ہر وہ شخص جو اردو سے ذرا بھی مناسبت رکھتا ہے مولوی عبدالحق صاحب کا نام ضرور جانتا ہوگا۔ مولوی صاحب نے معمار اردو کی حیثیت سے "ایوان اُردو" کی تعمیر اور اُس کی آرائش و زیبائش میں جتنا حصہ لیا ہے وہ اندازہ میں نہیں آسکتا، ان کی خاموش محنت اور پُر خلوص خدمت اگرچہ نشر و اشاعت سے مستغنی رہی پھر بھی جو جوہر شناس ہیں وہ جانتے ہیں اور خوب سمجھتے ہیں کہ اگر آج مولوی صاحب نہ ہوتے تو اس "اردو ہندی" کے قضیے نے خدا معلوم کتنی نازک صورت اختیار کر لی ہوتی مولوی صاحب نے جس سہولت اور رواداری سے اس گتھی کو سلجھایا ہے وہ تاریخ میں ہمیشہ یادگار رہیگا۔ مولوی عبدالحق صاحب سے زیادہ جامعہ الہ آباد قابل مبارکباد ہے کہ اس نے سب سے پہلے ان کی خدمات کو سراہ کر تمام ہندوستانی جامعات میں طرۂ امتیاز حاصل کیا۔

سرزمین حیدرآباد کے لئے یہ امر بھی کچھ کم باعث فخر نہیں کہ وہ مسز سروجنی نائڈو ایسی شیریں زبان مقررہ اور جادو بیان شاعرہ کا مولد و مسکن ہے۔ مسز نائڈو نہ صرف سحر آفریں مقررہ اور انگریزی زبان کی بلند پایہ شاعرہ ہیں بلکہ وہ نہایت اعلیٰ درجہ کی سیاست داں بھی ہیں جس سے ہندوستان کا ہر فرد واقف ہے الہ آباد یونیورسٹی نے انھیں بھی ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری دے کر ان کی "بزرگی" اور شخصیت کا اعتراف کیا ہے ہم ان تینوں اصحاب کی خدمت میں ایک تہنیت

اور ہدیہ مبارکباد پیش کرنے کی عزت حاصل کرتے ہیں۔

ابھی تھوڑے ہی دن ہوئے کہ ہماری جامعہ کا جلسہ تقسیم اسناد منعقد ہوا تھا اور اس جلسہ میں ملک کے چار افراد کی خدمتوں میں اعزازی ڈگریاں پیش کی گئیں۔ ان میں بہت نمایاں شخصیت ہماری جامعہ کے قدیم سرپرست اور سابق امیر جامعہ صدر اعظم مہاراجہ سرکشن پرشاد یمین السلطنت کی تھی۔ مہاراجہ بہادر میں ان کی علمی و ادبی خصوصیات کے علاوہ سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ وہ قدیم مشرقی تہذیب و تمدن کی ہندوستان میں یکتا یادگار ہیں۔ اور ان کی ایک ذات میں اتنی خوبیاں اکٹھا ہو گئیں ہیں کہ کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔ جامعہ عثمانیہ نے ان کو ال ڈی کی اعزازی ڈگری دے کر گویا ان کے احسانوں کا شکریہ ادا کیا ہے۔

رائٹ آنریبل سر تیج بہادر سپرو اپنی قانونی استعداد، سیاسی معلومات اور علمی و ادبی دستگاہ کی وجہ سے سارے ہندوستان میں مشہور ہیں، مسز سروجنی نائیڈو، ٹیگور، اور سر اقبال نے دنیا کے سامنے اپنی شاعری اور علمی معلومات کے جو خزانے لٹائے ہیں اس کا اعتراف کرنا حیدرآباد جیسی قدرشناس اور جوہر آشنا سرزمین کے لئے لازمی تھا چنانچہ اس سال جامعہ عثمانیہ کے جلسہ تقسیم اسناد کی یہ تاریخی اہمیت کبھی بھلائی نہیں جاسکتی کہ اس نے ملک کے ان یگانہ روزگار افراد کی خدمتوں میں اعزازی سندیں پیش کر کے اپنی علم نوازی اور جوہر شناسی کا ثبوت دیا۔

آخر میں ہم اپنی جامعہ کے اہل قلم طلبا کو ایک خوش خبری سنانا چاہتے ہیں وہ یہ کہ حسب تحریک جناب محمد بن عمر صاحب صدر انجمن اتحاد ملۂ عثمانیہ کی مجلس انتظامی نے اپنے گذشتہ اجلاس میں اس امر کا تصفیہ کیا ہے کہ مجلہ عثمانیہ کی جانب سے سال میں دو انعام ایسے طالب علموں کی ہمت میں پیش کئے جائیں گے جو اردو میں سب سے بہتر مضامین مجلہ کے لئے روانہ کریں گے اور اسی طرح دو انعامات ان طالب علموں کو دیئے جائیں گے جو حصۂ انگریزی کے لئے سب سے اچھے مضامین لکھیں گے۔ مضامین کے لئے کوئی عنوان مخصوص نہ ہوگا۔ اس کے متعلق تفصیلی اطلاع بعد میں شایع کی جائے گی۔

اس شمارہ کے مقالات و منظومات کے لئے زبان شکر اپنا فرض ادا کرنے سے قاصر ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کی شان تحقیق سیاس سے بلند تر ہے حصہ نظم میں مولانا صدق جائسی کہاں علی خستہ، جناب نجم آفندی اور مولانا ماہر القادری کے ہم خاص طور پر شکر گذار ساتھ ہی ہم اپنے اہل قلم برادران جامعہ کی شان کو شکر و ثنا سے مستغنی سمجھتے ہیں اگرچہ ہمارا دل سب سے زیادہ انھیں کا ممنون منت ہے

تسلیم

تیرے بغیر

آہ میری روح ہے ناشاداں تیرے بغیر　　میری بیداری ہے اک خواب گراں تیرے بغیر

مجھ کو اے صیاد رہنے دے گرفتار قفس　　زہر ہے آب و ہوائے آشیاں تیرے بغیر

تشنۂ کیف طرب ہیں صبح کی انگڑائیاں　　رات گویا بھر رہی ہے سسکیاں تیرے بغیر

میں تری رنگینیٔ حسن تبسّم کے نثار　　ہر نفس میں کانپتی ہیں بجلیاں تیرے بغیر

رہ گئی ہے بن کے عمر مختصر عمر طویل　　جی رہا ہوں دیکھ او نا مہرباں تیرے بغیر

تو بتو مجھ پر تراشی جا رہی ہیں تہمتیں　　کو بکو رسوا ہے میری داستاں تیرے بغیر

ہر نفس ہے اضطراب دل سے آہنگ فغاں　　ہر فغاں میں ہے نفس آتش فشاں تیرے بغیر

فرشِ خواب ہے تیرا وہاں تیرے لئے
درد شرحِ زندگانی ہے یہاں تیرے بغیر

تو ہے آئینہ ہے اور آرائشِ زلف دراز
میں ہوں اور صبر آزما حیرانیاں تیرے بغیر

وہ فروغِ لالہ و گل کی تمنا اب کسے
وہ خیالِ بادہ و ساغر کہاں تیرے بغیر

اخترِ ناشاد کی شیریں بیانی اب کہاں؟
نطق ہے بیگانۂ حسنِ بیاں تیرے بغیر

علی اختر

ابن خلدون

و فلسفۂ ابن خلدون

(۱)

اسلام میں اکثر علوم و فنون کی طرح تاریخ کی ابتدا بھی پہلی صدی ہجری میں ہوئی "الفاروق" کے مقدمہ میں علامہ شبلی مرحوم نے تصریح کی تھی کہ حضرت معاویہؓ کے حکم سے عبید بن شریہ نے عہد قدیم کی ایک تاریخ تالیف کی جس کا نام کتاب الملوک و اخبار الماضین تھا، پچھلے سال دائرۃ المعارف نے "کتاب التیجان" شائع کرکے اس "تصریح" کی تصدیق کر دی، ابن ہشام مولف سیرۃ کی یہ کتاب ابن شریہ ہی کی تصنیف سے ماخوذ اور اسی پر مبنی ہے۔ اسی زمانہ میں زیاد بن امیہ نے ایک دوسری کتاب تالیف کی جس کا نام علامہ ابن الندیم بغدادی نے کتاب مثالب الانساب بتایا ہے۔

دوسری صدی میں ہشام بن عبدالملک کے حکم سے (۱۰۷ھ میں) تاریخ عجم کا ترجمہ عربی میں ہوا، تصنیفات کی فہرست میں موسیٰ بن عقبہ متوفی ۱۴۱ھ کی کتاب مغازی النبی (صلی اللہ علیہ وسلم) عوانہ بن حکم متوفی ۱۴۷ھ کی کتاب اخبار معاویہ والامویین ابن اسحاق متوفی ۱۵۱ھ کی کتاب سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم اور ابو خیثمہ احمد بن زہیر بن حرب متوفی ۲۷۹ھ کی کتاب تاریخ الرداۃ خاص طور پر قابل ذکر ہیں،

تیسری صدی میں ہیثم بن عدی الطائی المتوفی ۲۰۷ھ نے عراق کے افسران پولیس کی تاریخ لکھی جس کا نام تاریخ

عمال الشرطۃ و امراء العراق ہے، ابن سعد متوفی ۲۳۰ھ نے طبقات تالیف کی، ابن قتیبہ متوفی ۲۷۶ھ نے معارف لکھی، بلاذری نے فتوح البلدان ترتیب دی اور ابو حنیفہ دینوری متوفی ۲۸۰ھ نے الاخبار الطوال تالیف کر کے فن تاریخ کی نمایاں خدمت کی۔

چوتھی صدی کے نامور مورخ ابو جعفر بن جریر طبری مؤلف تاریخ الامم والملوک متوفی ۳۱۰ھ اور علامہ مسعودی مؤلف مروج الذہب متوفی ۳۰۶ھ ہیں، علامہ بلاذری کا کارنامہ بھی ہمارے سامنے ہے، ان کی ضخیم تاریخ انساب الاشراف سب سے بہتر اور برتر ہے اور ابھی ابھی اس کی پانچویں جلد آئی ہے،

پانچویں صدی میں ابو عبد اللہ الحاکم المتوفی ۴۰۵ھ کی مشہور کتاب تاریخ نیشاپور، اور خطیب ابو بکر احمد بن علی المتوفی ۴۶۳ھ کی کتاب تاریخ بغداد کو زمانے نے قبول عام کی سند دی اور یہ کتابیں اس صدی کی بہترین تالیفات سمجھی گئیں۔

چھٹی صدی کے طبقہ مورخین میں علامہ ابن الجوزی کی تاریخ المنتظم اور عماد الکاتب کی الخریدہ (یہ کتاب دس حصوں میں ہے اور پانچویں صدی سے ۳، ۵ تک کے شعراء عرب کی تاریخ لکھی ہے، اور البرق الشامی (یہ تاریخ سات حصوں میں ہے اس میں سلطان نور الدین و صلاح الدین کے فتوح حروب صلیبیہ مذکور ہیں اور خود اپنے واقعات بھی تفصیل سے لکھے ہیں، اور اخبار الدولۃ السلجوقیہ اور تاریخ فتح بیت المقدس (الفتح القسی فی الفتح القدسی طبع اطالیہ) کو ایک حد تک شہرت حاصل ہے، ان دونوں نامور مؤلفوں نے ایک ہی سال یعنی ۵۹۷ھ میں وفات پائی،

ساتویں صدی کی مشہور تاریخیں، ابن اثیر متوفی ۶۳۰ھ کی تاریخ الکامل، ابن خلکان متوفی ۶۸۱ھ کی وفیات الاعیان، اور ابن العدیم متوفی ۶۶۰ھ کی تاریخ حلب ہے جس کی تیس جلدیں ہیں،

آٹھویں صدی میں علامہ ابن خلدون کا دور تھا، جو نہ صرف اس صدی بلکہ تمام عہد اسلام کے شہرۂ آفاق مورخ تھے اور جن کا نام موضوع کلام کا عنوان ہے، ابن خلدون کا سب سے بڑا کارنامہ یہی ہے کہ انھوں نے تاریخ کو علم بنا دیا، ان سے پیشتر دستور تھا کہ تاریخی واقعات سنہ وار قلمبند کئے جاتے تھے، یعنی سال بھر میں جس قدر واقعات دنیا بھر میں ہوئے ہیں سب ایک سنہ کے تحت لکھے جاتے، یہ روش اہل عرب کے خاص ذوق میں داخل تھی، وہ ہر سال کے لئے ایک تاریخی سالنامہ لکھا کرتے تھے جس کی جلدیں اگر جمع کر دی جائیں تو ایک مکمل تاریخ ہو جاتی، لیکن اس میں نقص یہ تھا کہ سلسلہ واقعات کا تجزیہ ہو جاتا تھا، مثلاً کسی واقعہ کی ابتدا سال کے آخر میں ہوئی اور دوسرے سال کے وسط میں انجام پذیر ہوا، مورخین پابندی سنہ کی وجہ سے اس کا تذکرہ نامکمل چھوڑ دیتے اور پھر دوسرے سنہ کے تحت بہت سے واقعات ترتیبی لکھنے کے بعد اس کے انجام کار کی اطلاع دیتے

واقعات کی تحریر کا صرف روایت پر مدار تھا، جس واقعہ کے متعلق جتنی روایتیں ملتیں بغیر تنقیح و تحقیق کے سب کو جمع کر دیتے تھے، طبری وغیرہ متقدمین کا یہی طرز تھا، اور یہ چنداں ناپسندیدہ بھی نہ تھا، اس لئے کہ نقادوں کو تبصرہ کی گنجایش تھی، ہر واقعہ کے متعلقات کا ذخیرہ فراہم تھا، اور موقع حاصل تھا کہ اصول درایت سے بات منقح کر لی جائے اور اسباب واقعہ دریافت ہو جائیں، لیکن بعد کو یہ صورت نہ رہی، متاخرین نے انتخاب کی روش اختیار کی، ایک واقعہ کے متعلق اگر دس روایتیں ہوتیں تو جس روایت میں کسی قسم کی غرابت کا پہلو ہوتا وہ اسی کو درج کرتے اور باقی سیدھی سادی باتیں معمولی سمجھ کر چھوڑ دی جاتی تھیں، منشائے تاریخ فقط سلاطین اور سلطنتوں اور اُن کی لڑائیوں کا لکھنا تھا، قدما کے ہاں اس کے ضمن میں اکثر ایسی باتیں بھی ہوتی تھیں جن سے ملک اور قوم کی عام حالت کا بھی اندازہ ہو سکتا تھا لیکن متاخرین کی تاریخوں میں یہ خصوصیت گویا مفقود تھی،

فلسفہ تاریخ ابن خلدون نے اس طرز کو بالکل بدل دیا، اُن کی تاریخ گویا آج کل کی تالیف ہے، تمام واقعات یکجا فراہم ہیں اور سب میں ایک خاص حد تک تسلسل قائم ہے، انھوں نے فلسفۂ تاریخ کو اس وقت ایجاد کیا جب دنیا اس سے بالکل بے خبر تھی، اور گو اپنی تاریخ میں وہ اس کی پابندی نہ کر سکے تاہم ایک علمی ایجاد کی وجہ سے دنیا اُن کی زیر بار احسان ہے، اُن کی زندگی سیاسی معاملات میں پریشانیوں سے بسر ہوئی، اور بے اطمینانی کے عالم میں انھوں نے تاریخ لکھی، تونس میں اُن کو ایک تھوڑا سا اطمینان نصیب ہوا تھا جس سے فائدہ اُٹھا کر انھوں نے مقدمہ تاریخ کی تکمیل کر ڈالی، کافی موقع ملتا تو اُن کی تاریخ بھی اسی طرز کی ہوتی لیکن وہ معذور تھے،

تعریف علم تاریخ آٹھویں بلکہ نویں دسویں صدی ہجری تک جس قوم کی چاہو تاریخ پڑھ کر دیکھو سلاطین کی شان و شکوہ جنگ و جدال، قتل و خونریزی وغیرہا کے علاوہ عام ملکی حالت کا کہیں تذکرہ نہ ہوگا، محاربات کے سیکڑوں ورق پڑھ جاؤ لیکن فن حرب کے متعلق کوئی بات نہ معلوم ہوگی،

انقلاب سلطنت اور سیاسی تغیرات کا ایک ضخیم دفتر ہر ایک تاریخ میں ہوتا ہے، مگر یہ بالکل نہیں معلوم ہو سکتا کہ اس وقت کا فن سیاست کیا تھا اور ان اقوام کو سیاست سے کہاں تک مناسبت تھی، عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا تھا کہ تاریخ سلطنتوں کا ایک افسانہ ہے اور مورخ کا خاص فرض یہ ہے کہ سلاطین کی کہانیاں جمع کر دے، ابن خلدون نے اس خیال کی سخت مخالفت کی، اور انھوں نے تاریخ کی وہی تعریف قرار دی جو قریب قریب آج بھی صحیح سمجھی جاتی ہے، اُن کے خاص

الفاظ یہ ہیں:-

حقيقة التاريخ انه خبر عن الاجتماع الانساني الذي هو عمران العالم وما يعرض لطبيعة ذلك العمران من مثل التوحش والتانس والاصناف والعصبيات والتغلبات للبشر بعضهم على بعض وما ينشاء عن ذلك من الملك والدول ومراتبها وما ينتحله البشر باعمالهم ومساعيهم من الكسب والمعاش والعلوم والصنائع وسائر ما يحدث في ذلك العمران لطبيعته من الاحوال

تاریخ کی حقیقت ہے انسانی اجتماع جس کا نام دنیا کی آبادی ہے، اس آبادی کی فطرت سے جو حالات عارض ہوتے ہیں مثلاً وحشی ہونا۔ آدمیت یعنی تمدن، عصبیت یعنی اپنی قوم کو مدد دینے کا خیال، انواع و اقسام کے آدمیوں کا باہم ایک دوسرے پر غلبہ حاصل کرنا، اس غلبہ سے ملک و سلطنتیں اور جو مراتب پیدا ہوتے ہیں، انسان اپنے کاموں اور کوششوں سے کسب معاش و علوم اور صنعتوں میں جو خصوصیات پیدا کرتے ہیں اور اس آبادی کے عالم میں حسب اقتضائے طبیعت جو باتیں ہوتی ہیں، ان سب سے مطلع ہونے یا مطلع کرنے کا نام تاریخ ہے

اصول تاریخ نویسی

ابن خلدون نے تاریخ نویسی کے لیے چند اصول قرار دئے ہیں، اور ایک ضابطہ مقرر کیا ہے جو قابل غور ہے، فرماتے ہیں:-

يحتاج صاحب هذا الفن العلم بقواعد السياسة وطبائع الموجودات واختلاف الامم والبقاع والاعصار في السير والاخلاق والعوائد والنحل والمذاهب وسائر الاحوال والاحاطة بالحاضر من ذلك وما بينه وبين الغائب من العرفان وما بينهما من الاختلاف والتعليل المتفق منها والمختلف والقيام على اصول الدول والملل ومبادي ظهورها واسباب حدوثها ودواعي كونها واحوال القائمين بها واخبارهم

اس فن (تاریخ) کو حسب ذیل امور کی ضرورت ہے، قواعد سیاست کا جاننا، موجودات کی طبیعت فطرت سے باخبر ہونا، سیرت، اخلاق و عادات و طریق و مذہب وغیرہا کے متعلق اقوام و مقامات اور زمانوں کے اختلاف سے واقف ہونا، ان امور کی موجودہ حالت پر احاطہ رکھنا، اور حاضر و غائب میں جو اتفاق یا اختلاف ہو اس کو سمجھنا، ہر اتفاق یا اختلاف کے سبب کا تلاش کرنا، سلطنتوں اور مذہبوں کے اصول کو پیش نظر رکھنا، ان چیزوں کی ابتدائی حالت پر غور کرنا، جن اسباب سے یہ باتیں پیدا ہوئیں ان کو سوچنا سرگروہوں کے حالات و واقعات کا جاننا۔

ان اصول میں حاضر و غائب کے اتفاق و اختلاف سے یہ مراد ہے کہ موجودہ زمانہ قدیم زمانہ کے واقعات کا نتیجہ ہے لہذا موجودہ اور گذشتہ امور پر غور کرنا چاہیے کہ ان میں کتنی باتیں باہم ملتی جلتی ہیں اور کس قدر مختلف ہیں۔ تاریخ کی موجودہ تعریف اسی ضابطہ سے استنباط ہوئی ہے اور یہیں سے یہ قاعدہ تسلیم کر لیا گیا ہے کہ "التاریخ یعید نفسہ"

ابداع و اختراع — پہلے واقعات کی تحقیق کا دستور یہ تھا کہ (۱) سلسلہ روایت جس شخص پر منتہی ہوا اُس نے بچشم خود اس واقعہ کو دیکھا اور اُس میں شریک رہا ہو (۲) راویوں میں کوئی جھوٹا اور کم فہم نہ ہو۔ ابن خلدون نے اس پر حسب ذیل اصول زیادہ کئے:

۱۔ تغیرات، یعنی دنیا کی تمام باتیں بدلتی رہتی ہیں کسی قوم یا ملک کی جو حالت پہلے تھی اور تمدن و سیاست اور عادات و مذہب میں اس کی جو روش تھی کچھ ضرور نہیں کہ اب بھی وہی کیفیت باقی ہو۔ جس طرح لوگوں کی حالت میں تغیر ہوتا ہے، اوقات میں تبدیلیاں ہوتی ہیں، شہروں میں انقلاب ہوا کرتے ہیں، اُسی طرح آفاق میں، ملکوں میں، زمانہ میں، اور سلطنتوں میں انقلاب ہوا کرتا ہے، مورخ کا فرض ہے کہ اس کا لحاظ رکھے،

۲۔ تعلیل، یعنی واقعات کے اسباب دریافت کرنا، اس لئے کہ کوئی بات بے سبب نہیں ہوتی اور جب تک سبب نہ معلوم ہو واقعہ کی تنقیح نہیں ہوسکتی۔

۳۔ تعمیم، یعنی واقعہ کی نسبت یہ غور کرنا کہ ملک و قوم کی عام حالت اس کی مقتضی تھی یا نہیں۔

۴۔ اعتدال طبعی، جب تک کہ انسان فارغ الذہن اور معتدل مزاج نہ ہوگا واقعہ کی تحقیق نہیں کرسکتا، اگر وہ پہلے سے کسی کا جانبدار ہے یا مخالف یا معتقد تو واقعات کے اسی قدر حصے اُس کو نظر آئیں گے جو اُس کے ذوق کے موافق ہوں۔

۵۔ وثوق، یعنی کسی شخص کی باتوں پر یقین رکھنا کہ یہ سچ یا جھوٹ بولتا ہے، حالانکہ ممکن ہے کہ ایک شخص عادتاً سچا ہو مگر جو واقعہ بیان کرتا ہو صحیح نہ ہو، یا عادتاً جھوٹا ہو مگر جو خاص بات بیان کی ہو وہ صحیح ہو،

۶۔ لحاظ اغراض، یعنی جو واقعہ راوی بیان کررہا ہے اس سے اُس کی خاص غرض کیا ہے،

۷۔ تطبیق، یعنی حالات کو اسباب سے منطبق کرنا،

۸۔ اقتضائے طبیعت، از روئے عمران و آبادی ہر واقعہ یا حالت کی ایک خاص فطرت ہوتی ہے، لہذا سوچنا چاہیے کہ واقعہ کی ذاتی فطرت کیا ہے،

۹۔ امتیاز عوارضات، یعنی اجتماع کے ساتھ ذاتی یا طبعی حیثیت سے جو حالات لاحق ہیں اُن میں امتیاز کرنا کہ ذاتیات کا پہلو کس قدر ہے اور عارضی حالت کتنی ہے، ذاتی حالت کو عارضی حالت سے جب تک جدا نہ کیا جائے واقعیت ظاہر نہیں ہو سکتی، کیونکہ عوارض پر حکم کرنا صحیح نہیں،

یہی وہ اصول ہیں جن کی ایجاد کا فخر ابن خلدون کو حاصل ہے، ان میں بعض باتیں پہلے بھی نامعلوم نہ تھیں، شلاً عبداللہ بن المقفع نے جو آخر عہد بنی امیہ کا مشہور سیاسی منشی تھا، رسالۂ سیاست میں پہلے پہل بڑی قابلیت کے ساتھ بحث کی ہے، اور ابن خلدون کے بعض اصول بھی ضمناً درج کئے ہیں، لیکن رسالۂ مذکور منشیانہ طرز پر ہے، اور ادبی لطافت کا ایک بے نظیر نمونہ نظر آتا ہے، حکیمانہ استدلال کا رنگ اس میں نہیں ہے، قاضی ابوبکر طرطوشی نے سراج الملوک میں اس قسم کے ابواب باندھے ہیں، لیکن فلسفہ کا شائبہ اس میں بھی نہیں ہے، حکما اور مشاہیر عالم کے اقوال اس میں نقل کئے ہیں، اور یہی اُس کا استدلالی رنگ ہے، ابن جوزی و ابن ابی حاتم نے موضوعات میں ایک حد تک ان اصول سے فائدہ اُٹھایا ہے، خصوصاً شرط نہم تو خاص ابن جوزی کی ایجاد ہے، لیکن ان بزرگوں کے مباحث علم ایک حد تک محدود تھے، تاریخ کو ان سے تعلق نہ تھا، وہی ابن جوزی جن کا مدار موضوعات میں اس قسم کی تحقیقات پر ہے تاریخ میں جب آتے ہیں تو ان سنگلاخ راہوں سے جدا ہو جاتے ہیں، ان کی تاریخ منتظم اس طرز کی واضح مثال ہے، ابن خلدون کی خصوصیت یہ ہے کہ ان اصول وضوابط کو انھوں نے تاریخ سے وابستہ کرکے فلسفہ کی حیثیت پیدا کی، اور استدلال و تنقیح واقعات کا نیا انداز قائم کیا، اس مفید اختراع پر ان کو ناز ہے، اور ایسا ہونا چاہئے تھا، تاہم خاکساری جو مسلمانوں کی طبیعت میں داخل ہے کہیں نہ کہیں اُن کو منکسر مزاج بنا دیتی ہے، فرماتے ہیں:۔

فاعلم ان الکلام فی ھذا الغرض مستحدث الصنعة غریب النزعة غزیر الفائدة اعثرنی علیه البحث وادی الیه الغوص

واضح ہو کہ اس غرض (فلسفۂ تاریخ) میں کلام بالکل نیا اور انوکھا اور کثیر الفائدہ ہے، بحث و تحقیق اور غور و تعمق سے یہ بات حاصل ہوئی ہے۔

ولعمری لم اقف علی الکلام فی منحاہ لاحد من الخلیقة ما ادری لغفلتھم عن ذلك

میں خلق اللہ میں کسی ایسے شخص سے واقف نہیں ہوں جس نے اس موضوع میں کلام کیا ہو، مجھے معلوم نہیں کہ آیا ان کی غفلت اس کا باعث

ولیس الظن بھم او لعلھم کتبوہ فی ھذا الغرض واستوفوہ ولم یصل الینا ہوئی، جس کا گمان ان کی طرف نہیں ہوسکتا یا غالباً انھوں نے لکھا ہو اور تفصیل سے لکھا ہو مگر ان کی تحریریں ہم کو نہ ملی ہوں،

ان اصول کی بنا پر مورخ مذکور نے مقدمۂ تاریخ میں بہت سی خبروں کی تنقیح کی ہے اور بزعم خود اکثر چیزیں غلط ثابت کی ہیں، جن میں بعض باتیں مسامحہ سے خالی نہیں، تاہم اُن میں بھی ایک شان ہے،

خطا نمود و سزا وار آفریں باشد

عبداللہ العمادی

مشاہدات ومحسوسات

(۱)

دنیا تیری ہزار پہلو بدلے
بدلی ہے کبھی اور نہ مری خو بدلے
تیرا ہی دیا ہوا ہے احساسِ خودی
میں تجھ سے بدل جاؤں اگر تو بدلے

(۲)

من کا درپن دکھا کے بسمل کر دے
ساجن کو سکھی دردبنا دل کر دے
پوجا کا یہ بیوہار چلے گا کب تک
اک روز پریم کھیت گھائل کر دے

(۳)

تمہیدِ نشاط جاودانی لے جا
ناکام ہے روحِ کامرانی لے جا
آخر کو اتر گیا جوانی کا نشہ
لے مجھ سے مرے دل کی جوانی لے جا

(۴)

سب ہیں اس جگ میں جینے جی کے کارن
ہم پیت نہ کرتے تھے اسی کے کارن
آئی ہے اجل ساتھ لئے جاتی ہے
ساجن سے بگڑ گئی سکھی کے کارن

نجم آفندی

اسلامی عدل گستری اپنے آغاز میں[1]

حیدرآباد کی مجلس وضع قوانین[2] کے ضابطے اور عدالت عالیہ کے متعدد فیصلوں میں تسلیم کیا گیا ہے کہ ممالک محروسہ سرکار عالی (حیدرآباد) کا بن لکھا یا غیر موضوعہ قانون، شریعت اسلام ہے۔ موجودہ حیدرآباد کی عدل گستری کو بہتر طور سے سمجھنے کیلئے ہمیں اسلامی عدل گستری کی ابتدائی تاریخ کا مطالعہ ناگزیر ہے۔

اسلام پہلے عرب سے شروع ہوا۔ عرب اپنی جاہلیت کے زمانے میں بھی عدل گستری کو جو اہمیت دیتے تھے اس کی شاہد دلپذیر کے الفاظ میں خود ان کی زبان ہے جس میں "حکومت کرنے" اور "مقدمے کا فیصلہ کرنے" کے لئے ایک ہی لفظ (حکم) پایا جاتا ہے۔[3] دوسرے الفاظ

---

[1] دو ڈھائی سال پہلے ایک مضمون "کانفرنس طیلسانین عثمانیہ" میں سنایا گیا جس کا انگریزی ترجمہ گزشتہ سال اپریل ۱۹۳۷ء کے رسالہ اسلامک کلچر (حیدرآباد) میں چھپا ہے۔ اصل مضمون دگنے تگنے اضافے کے بعد یہاں پہلی مرتبہ شایع کیا جاتا ہے۔

[2] ۱۸۹۳ء میں قائم شدہ اور دیسی ریاستوں میں سب سے پہلی (دیکھئے اخبار ہندو مدراس مورخہ ۱۱ فبروری ۱۹۳۷ء ضمیمہ سلور جوبلی مبارک، صفحہ (ہ)، مضمون راجہ کرشناچاریہ، سابق معتمد مجلس وضع قوانین و مشیر قانون حیدرآباد۔

[3] Wellhausen, *Ein Gemeinwesen ohne Obrigkeit*, p. 8: "regieren heisst richten.

میں حکومت کا۔ اگر واحد نہیں تو سب سے بڑا مقصد اور فریضہ "عدل گستری" سمجھا جاتا تھا۔ "اے داؤد ہم نے تجھے زمین پر نائب بنایا ہے اس لئے لوگوں میں حق طور سے فیصلے کیا کر"[1] سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم سے دیگر ممالک میں بھی عدل گستری کی اہمیت برابر تسلیم کی جاتی رہی ہے، اسلام نے بھی اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کوئی کوشش نہیں کی بلکہ اسے انسانیت کا عین اقتضا اور "خدا کی نیابت"[2] کا پہلا فریضہ قرار دیا۔ چنانچہ یہ حکم دیا گیا کہ حق رسانی میں مدد دینے کے لئے بن بلائے بھی آگے بڑھنا اور اپنے معلومات کی حد تک سچ سچ گواہی دینا ہر شہری کے لئے ضروری ہے[3]۔

قدیم عربوں کے پاس عدلیہ اور تنفیذیہ کے ادارے تو تھے لیکن تشریعیہ (یعنی ادارہ قانون سازی) نہ تھا۔ یہ کمی اسلام نے آکر پوری کی جیسا کہ آگے بتایا جائے گا۔ عرب میں عدلیہ اور تنفیذیہ تو تھے لیکن بہت ہی ابتدائی حالت میں۔ ان میں اسلام نے جس کی تحریک سنہ ۶۱۰ء (۱۳ ق ھ) میں شہر مکہ میں شروع ہوئی، رفتہ رفتہ اسلامی جماعت کے اغراض اور ضروریات کے لئے اصلاح و ترمیم کی، اگرچہ بعض قدیم چیزیں جو بری نہ تھیں برقرار رہیں[4]۔

اسلام سے پہلے عرب میں جو عدالتی نظام تھا، اس کے سلسلے میں سب سے پہلے اس ادارے کا ذکر کیا جا سکتا ہے جو خاص شہر مکہ میں قائم کیا گیا تھا۔ جس بھی دور میں اس کا آغاز ہوا مگر اس وقت کی زیادہ تفصیلیں ہم کو معلوم نہیں ہیں۔ حرب فجار کے بعد اس ادارے کو دوبارہ زندہ کیا گیا اور اس کی حلف گیری کے ابتدائی جلسے میں اس ہونہار نوعمر نے بھی باوجود کمسنی کے بڑے ذوق و شوق سے حصہ لیا تھا جسے کچھ دنوں بعد دنیا پیغمبر اسلام کے محترم نام سے جاننے لگی۔ اس "حلف الفضول" میں ایک رضاکار جماعت شریک ہوئی جس کا مقصد حدود شہر میں ہر مظلوم کی خواہ وہ شہری ہو یا اجنبی، مدد کرنا اور اس وقت تک چین نہ لینا تھا جب تک کہ ظالم حق رسانی نہ کرے[5]۔ نبوت ملنے کے بعد بھی آنحضرتؐ اس جماعت کے کام میں فاعلانہ حصہ لیتے اور اس پر فخر کرتے تھے[6]۔

تاریخ بتاتی ہے کہ اس حلف الفضول کی دہائی سے بڑے بڑے سرکش گھبراتے تھے اور اس رضاکار جماعت نے جس نیک

---

[1] قرآن مجید ۳۸ : ۲۶ (یہ ایک ابتدائی مکی سورہ ہے)

[2] ایضاً آیت بالا نیز حضرت آدم کا خلیفۃ اللہ مقرر ہونا۔

[3] ایضاً ۲ : ۱۹۶، ۲ : ۲۰۳، ۲ : ۱۴۰، ۲ : ۲۸۲، ۲۲ : ۳۰، ۲۵ : ۷۲ وغیرہ وغیرہ

[4] ایک حدیث ہے کہ "اسلام میں جاہلیت کی اچھی باتوں پر عمل کیا جائے گا" مسند احمد بن حنبل جلد (۳) صفحہ (۴۲۵)

[5] سیرۃ ابن ہشام صفحہ ۸۵ تا ۸۶۔ روض الانف للسہیلی ج ۱ صفحہ ۹۰ تا ۹۱۔ طبقات ابن سعد ج ۱/۱ صفحہ ۸۲۔ مسند احمد بن حنبل ج ۱ صفحہ ۱۹۰

[6] علاوہ اس قول کے (دیکھئے حوالۂ بالا) کہ "اگر مجھے اس کی دہائی دے کر بلایا جائے تو میں اب بھی مدد کو دوڑوں گا" یہاں اراشی شخص کے واقعے کا حوالہ دیا جا سکتا ہے جس کا ابن ہشام میں صفحہ (۲۵۷ تا ۲۵۸) پر ذکر ہے

کام کا بیڑا اٹھایا تھا، اسے وہ عہد بنی امیہ کی ابتدا تک انجام دیتی رہی[1] نئے ارکان کے بھرتی نہ کئے جانے کے باعث ابتدائی ارکان کے مر جانے پر یہ ادارہ آخر برخاست ہو گیا۔

یہ تو غیر معمولی اور خصوصی طریقہ تھا۔ معمولی اور عام طور سے انصاف رسانی اور فیصلہ یابی کے لئے ملک میں تین مسلمہ طریقے تھے:۔

(۱) سب سے پہلے قبیلہ واری پنچ تھے۔ جب باہمی گفت و شنید سے معاملہ طے نہ ہوتا تو مستغیث اور ملزم یا مدعی و مدعا علیہ ان قبیلہ واری پنچوں کے سامنے حاضر ہوتے جن کا فیصلہ قطعی ہوتا اور بہت سی صورتوں میں جرم کو اصطلاحی الفاظ میں "دفن" کر دیا جاتا اور پھر اسی بنیاد پر انتقام طلبی جائز نہ ہوتی۔[2]

(۲) اگر اندرونی طور سے یوں فیصلہ نہ ہو سکتا اور خاص کر اگر کسی قبیلے کی الگ الگ شاخوں سے تعلق رکھنے والے افراد میں جھگڑا ہوتا تو کاہنوں سے رجوع کیا جاتا۔ "کاہن" جو ایک عبرانی لفظ کا معرب ہے، عبرانی زبان میں اور یہودیوں کے ہاں عبادت گاہوں کے منتظم کو کہتے ہیں۔ ابتداءً لوگ ان مذہبی پیشواؤں کی غیر جانبداری اور بے لاگ فیصلوں کی توقع میں ان سے رجوع کرتے ہوں گے۔ یہ عرب کاہن بھی یونانی مندروں کے پجاریوں کی طرح عموماً ذو معنی اور مسجع و مقفا عبارت میں اپنی رائے کا اظہار کرتے تھے۔ غالباً یہ صحیح نہیں کہ عرب کے کاہن سب کے سب یہودی رہے ہوں۔ بہرحال عرب میں کچھ لوگ غیب دانی کے مدعی پائے جاتے تھے۔ ان کو کاہن کہا جاتا تھا۔ مشکل مقدموں میں ان سے رجوع کیا جاتا اور یہ اپنے قصوں کے مطابق بعض وقت دو فریقین سے ایک لفظ بھی سنے بغیر صحیح فیصلہ گنگنانا شروع کر دیتے۔[3] ان فیصلوں کی عدم تعمیل پر کسی قوت تنفیذیہ کے تدارک کی عدم موجودگی کے باوجود ان لوگوں کے توہمات ہی تہدید کا کام دیتے۔ انسائکلوپیڈیا آف اسلام میں لفظ "کاہن" کے تحت لکھا ہے:۔

> "اپنی خانگی حیثیت میں کاہن خاص کر جھگڑوں اور ہر طرح کے قانونی مسائل میں فیصلہ کنندہ کا کام دیتے تھے (عوض کاہن اور حکم کے تصورات باہم بہت قریبی تعلق رکھتے ہیں (الحطیہ نظم ۳۱ بیت ۲۷۔ نیز الاشیبی مطبوعہ قاہرہ ۱۳۲۱ھ ج ۲ ص ۳۷)، ان کے فیصلوں کو ایک طرح کے خدائی فیصلے سمجھا جاتا جن کے خلاف کوئی مرافعہ نہ ہو سکتا۔"

---

[1] صبح الاعشیٰ للقلقشندی ج ۱۳ صفحہ (۳۵۲)

[2] مثلاً ایضاً ج ا صفحہ ۳۹ تا ۹۹)

[3] البدایہ والنہایہ لابن کثیر ج ۲ صفحہ (۲۰۶)۔ ابن ہشام صفحہ (۱۰۰ تا ۹۱)" تحاکموا الیہ حتی خرف وھو الذی قرعت لہ العصا"۔
الاشتقاق لابن درید صفحہ (۱۹۴)

زمزم کا چشمہ دریافت کرنے کے بعد اس کی ملکیت کا تصفیہ کرانے کے لئے عبدالمطلب اور دیگر مکے والے ایک کاہن ہی کے پاس گئے تھے۔ عبدالمطلب نے اپنے ایک بیٹے کی قربانی کی منت مانی تھی۔ اس سے چھٹکارا پانے کی تدبیر معلوم کرنے کے لئے بھی ایک کاہنہ ہی سے رجوع کیا گیا تھا۔ اس قسم کی بہ کثرت نظیریں عربوں کی تاریخ جاہلیت میں مل سکتی ہیں۔

(۳) تیسرا اور شاید سب سے اہم ادارہ تحکیم کا تھا۔ عامر بن الظرب العدوانی کے پاس عرب کی ہر جگہ سے تحکیم کیلئے مقدمے آتے تھے۔[۵۱] قبیلہ تمیم کے سرداروں کا موروثی طور پر پورے عرب کا حکم ہوا کرنا عربیات کا ہر طالبعلم جانتا ہے۔ یہ سردار سال میں ایک بار کسی بڑے میلے مثلاً عکاظ میں جاتے اور اس جگہ دیوانی اور فوجداری ہر قسم کے مقدمات کو سنکر فیصلہ کرتے۔ یہاں جنگ بندی کا خوف و حکم کے پس پشت پورے میلے کی اخلاقی قوت، تہدید کا کام دیتی۔ ان موروثی حکموں سے چند کا ذکر ابو عبیدہ،[۵۲] ابن درید اور المرزوقی[۵۳] نے بھی کیا ہے۔ اور ابن قتیبہ[۵۴] نے لکھا ہے کہ غیلان بن سلمہ ثقفی کی عادت تھی کہ ایک دن اپنے ذاتی معاملات پر توجہ کرتا۔ ایک دن شعر شاعری کے جلسوں میں حصہ لیتا اور ایک دن حکم بن کر جھگڑے چکاتا۔ قبیلہ داری حکم بھی ہوتے تھے۔ چنانچہ خود شہری مملکت مکہ کے سرکاری اداروں میں سے ایک حکم کا بھی تھا۔ موقتی طور پر بھی کسی کو حکم بنایا جا سکتا تھا چنانچہ قصیٰ اور قضاعہ کی جنگ میں بنی کنانہ کے ایک فرد شداخ کو حکم بنایا گیا تھا۔[۵۵]

یہ تو اُس زمانے کا ذکر ہے جب عرب میں اسلام شروع ہونے کو تھا۔ یہ نظام بھی کچھ ترقی یافتہ نہیں کہا جا سکتا لیکن خود اس حالت تک پہونچنے کے لئے بھی عرب میں کم و بیش وہی ارتقاء عمل میں آیا ہوگا جو اور ملکوں میں یعنی فطری احساس مدافعت نے شروع میں خود انتقامی کی سجھائی ہوگی جس میں ملزم، ورنہ اس کے قریبی رشتہ دار بیٹے بھائی وغیرہ سے بدلہ لیا جاتا تھا۔ (اس سلسلے میں جنگ تغلب کی نظیر سے کون واقف نہیں)، اس کے بعد اندرون قبیلہ جرم یا تعدی پر داخلی امن قائم رکھنے، جھگڑا چکانے، ظالم کو سزا دینے اور مظلوم کی فریادرسی کرنے کے لئے خود قبیلہ اپنے سرداروں یا انصاف کے لئے مقرر شدہ خصوصی افسروں کے ذریعے دخل دہی کر کے عدل گستری کرنے لگا ہوگا۔ یہ شروع میں آنکھ کے بدلے آنکھ سے کم نہ ہوتا ہوگا۔ لیکن رفتہ رفتہ جب بعض صورتوں میں ضرر کی مالی یا رقمی قدر و قیمت کی جانے لگی

---

[۵۱] "قال ابو المنذر وتزعم مضر ان امر الموسم وقضاء عکاظ فی بنی تمیم،، (مرزوقی ج ۲) صفحہ (۱۶۷)

[۵۲] نقائض جریر و فرزدق صفحہ (۱۰۵، ۳۹، ۲۲۸، ۴) وغیرہ

[۵۲] ڈاکٹر وینسنک کا مقالہ ۱۹۳۲ء میں چھپا ہے جو ... اس کی تفصیل ذکر ہے

[۵۳] ھرم بن قطبة کان من حکماء العرب وھو الذی تحاکم الیہ عامر بن الطفیل وعلقمة بن علاثة (اشتقاق صفحہ ۱۷۲)

[۵۴] کتاب الازمنة والامکنة ج ۲ صفحہ (۱۶۳ تا ۱۶۴)

[۵۵] کتاب المعارف، بر موقع نیز المرزوقی ج (۲) صفحہ (۱۶۹ تا ۱۷۰)

[۵۶] عقد الفرید ابن عبد ربہ ج ۳ صفحہ ۴۵ تا ۴۶

[۵۷] ابن کثیر، کتاب مذکور ج ۲ صفحہ (۲۰۷)، ابن ہشام صفحہ (۹ تا ۷۵)

اور بالآخر متعین بھی ہوگئی تو ملزم کے سماجی درجے، عمر اور جنس کے لحاظ سے بھی فرق بہر حال باقی اور جاری رہا ہوگا۔ چنانچہ اس کی نظیریں عام طور سے ملتی ہیں کہ کسی طاقتور قبیلے کے فرد کا خون بہا معمولی قبیلے کے فرد سے مثلاً دگنا ہوتا[۱]۔ یا کسی آزاد فرد کا قاتل غلام ہوتا تو غلام سے قصاص لینا ناکافی سمجھا جاتا اور غلام کے مالک یا کسی اور آزاد رشتہ دار کا سر مانگا جاتا۔ یا کوئی آزاد کسی غلام کو قتل کرتا تو قاتل کا قصاص گوارا نہ کیا جاتا بلکہ کوئی کمتر معاوضہ دیا جاتا۔ یہی حال عورت کا بھی تھا۔ اور اسی قاعدے کو قرآن نے اسلامی دور میں منسوخ کیا:۔

آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام اور عورت کے بدلے عورت ہی قتل کئے جائیں (نہ کم نہ زیادہ)

(قرآن مجید ۲: ۱۷۸)

یہ سب سزائیں تو اس وقت دی جاسکتی تھیں جب ملزم قبیلے کی دسترس میں ہوتا۔ اگر ملزم فرار ہوجاتا تو یہ محدود وسائل رکھنے والے خانہ بدوش بعض صورتوں میں خاص کر ہین القبائل جرم کے موقع پر ملزم کو "طرد" یعنی ذات باہر کردیتے اور وہ اپنے قبیلے کی ہر قسم کی اخلاقی اور مادی مدد سے محروم ہوکر اپنی حفاظت خود ہی تنہا کرنے پر مجبور ہوجاتا اور اکثر بے بسی اور بے کسی سے غربت میں جان دیدیتا۔ ممکن ہوتا تو وہ دور دراز کے کسی اجنبی قبیلے میں جاکر پناہ گزین ہوتا اور انھیں سے بھائی چارہ کرکے انھیں کا ایک فرد بن جاتا۔ ایسے لوگ دخیل، مولا اور حلیف کے مختلف ناموں سے موسوم ہوتے اور یہ اس زمانہ کا طریق تھا[۲]

توطن (Law and Mode of Domicile)

اب تک صرف تاریخی پس منظر پیش کیا گیا۔ اس کے بعد جیسا کہ بیان ہوا ۶۱۰ء سے اسلام شروع ہوا۔ اس کے آغاز اور ترقی سے یہاں بحث نہیں۔ البتہ یہ ظاہر ہے کہ آنحضرت صلعم کی ذات ہجرت سے پہلے اور بعد زندگی بھر اپنے پیرؤوں کے لئے انتہائی عدالت کا کام دیتی رہی۔ لیکن حقیقی مملکت کی بنیاد ہجرت کے بعد ہی پڑی۔ ہجرت کرکے مدینہ آتے ہی آنحضرت نے فوراً اپنے عدالتی حقوق و فرائض

[۱] ابن ہشام صفحہ ۲۰۰ تا ۲۰۳

[۲] یہ یاد رہے کہ دخیل، مولا اور حلیف افراد کا یہ طبقہ ——— جسے دیگر اصلی افراد قبیلہ سے عام حقوق کچھ کم حاصل ہوتے تھے۔ مثلاً وہ کسی اجنبی کو اپنی پناہ میں نہ لے سکتا تھا جیسا کہ ابن ہشام نے سیرۃ رسول اللہ صفحہ (۲۵۱) پر بیان کیا ہے ——— صرف فرار شدہ پناہ گزینوں ہی پر مشتمل نہ تھا بلکہ اس میں آزاد شدہ غلام، غیر قبائل بلکہ غیر عرب کے عام افراد بھی باہمی رضامندی سے شریک ہوتے تھے۔ اور یہ رواج اسلام نے بھی بہت کچھ باقی رکھا اور غیر عرب کو عرب بنانے میں اس سے عرب مسلمانوں نے بڑی مدد لی۔

کا تعین فرما دیا تھا[1]۔ اور ہماری خوش قسمتی سے یہ دلچسپ اور اہم دستاویز بجنسہٖ و بلفظہٖ ہم تک نقل ہوتی آئی ہے[2]۔ اسے سب سے پہلی اسلامی مملکت کا دستور اور آئین کہا جا سکتا ہے۔

اس تاریخی دستاویز کے دو حصے ہیں، فقرہ (۱ تا ۲۳) میں مہاجرین اور انصار کی وحدتوں کا ذکر ہے اور فقرہ (۲۴ تا ۴۷) میں ان قواعد کا ذکر ہے جو مضافات مدینہ میں بسنے والے حلیف یہودی قبائل اور بستیوں سے متعلق تھے۔ ان ہر دو حصوں کے عدالتی فقرات کی تحلیل یہاں بے محل نہ ہوگی:۔

—— حسب سابق ہر قبیلۂ انصار اپنے افراد کے مواخذہ جات کا خود اجتماعی طور پر ذمہ دار ہوگا۔ اگر کوئی فرد دشمن کے ہاتھوں گرفتار ہو تو اس قیدی کے قبیلے کے سب افراد مل کر فدیہ ادا کریں گے (ف ۴ تا ۱۱)

—— اس سلسلے میں انصار کے قبائل تو معین تھے لیکن مہاجرین کہ سب مل کر ایک قبیلہ تصور کئے جائیں گے (ف ۲)

—— انصاف رسانی منفرد کے ہاتھ میں نہیں رہے گی بلکہ وہ پوری جماعت مسلمانان کا فریضہ سمجھی جائے گی اور اس میں کسی کی رشتہ داری اور قرابت کے باعث پاس و لحاظ نہیں کیا جائے گا (ف ۱۳) اور کسی قاتل یا مجرم کو کوئی شخص پناہ نہیں دے سکے گا (ف ۲۲)

—— کسی مسلمان کا قتل عمد سزائے موت کا مستوجب ہوگا البتہ مقتول کے ولی فدیہ لے کر قصاص سے درگزر کر سکیں گے (ف ۲۱) اور اگر کسی غیر مسلم کے ولی مسلمان ہوں تو انھیں چاہئے کہ[3] قاتل کے مسلمان ہونے کی صورت میں قصاص کا مطالبہ نہ کریں (ف ۱۴)

—— ہر قسم کے جھگڑے کے لئے آنحضرتؐ کا فیصلہ قطعی اور آخری[4] ہوگا (ف ۲۳)

---

[1] ژان ژاک روسو نے اپنی مشہور کتاب "معاہدۂ عمرانی" میں قیاس کیا ہے کہ بادشاہت اور مملکت کا آغاز "بیعت" کے ذریعے ہوا ہوگا۔ بیعت عقبہ اور اس زیر ذکر معاہدے کی روشنی میں شاید کہا جا سکتا ہے کہ چاہے دیگر بستیوں میں بھی یہی طریقہ رہا ہو یا نہ ہو، اسلام میں واقعتاً یہی ہوا۔ کوئی تعجب نہیں کہ روسو کے قیاس کا ماخذ یہی اسلامی بیعتیں ہی ہوں۔ نیز دیکھئے رسالہ قرآنک کلچر حیدرآباد اپریل ۱۹۳۶ء میں میرا مضمون The Quranic Conception of State

[2] ابن ہشام صفحہ ۳۴۱ تا ۳۴۴۔ کتاب الاموال لابی عبید فقرہ (۵۱۷) صفحہ (۲۰۲ تا ۲۰۵)۔ ابن کثیر ج (۳) صفحہ (۲۲۴ تا ۲۲۶) نیز ابن سید الناس وغیرہ

[3] ملاحظہ ہو، یہ کہا گیا ہے کہ "انھیں چاہئے کہ ... مطالبہ نہ کریں" اور یہ نہیں کہا گیا کہ "وہ مطالبہ نہیں کر سکتے"۔

[4] اس کے ساتھ ملاحظہ ہو قرآن مجید (۳۳: ۳۶) "جب خدا اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دیں تو کسی مومن یا مومنہ کو اپنی بات (بقیہ نوٹ صفحۂ آئندہ پر)

یہودیوں سے جو دفعات متعلق ہیں ان میں یہاں بیان کیا گیا ہے:-

فدیہ، دیت، ولاء اور جوار کے ادارے حسب سابق برقرار رہیں گے (ف ۲۵، ۳۱، ۴۰) اگر کوئی شخص قریش اور ان کے مددگاروں کو اپنے جوار یعنی پناہ میں لینے کا مجاز نہ ہوگا (ف ۴۳)

—— عدل گستری ایک مفاد عامہ کا معاملہ ہے اور کوئی شخص خود اپنے رشتہ داروں کی بھی پاسداری نہ کر سکے گا (ف ۳۶ ب، ۳۱)

—— آنحضرت ہر قسم کے جھگڑوں میں آخری فیصلہ کریں گے (ف ۴۲)

دیگر جزئی تفصیلوں کو یہاں نظر انداز کیا جا سکتا ہے[1]۔ گو اس عظیم الشان اور انقلابی اصلاح کی جانب خاص طور پر دوبارہ اشارہ کرنا بے محل نہ ہوگا کہ انفرادی انتقام جوئی کی جگہ مرکزی عدل گستری کا ادارہ وجود میں آگیا اور یہ اختیار افراد ہی نہیں قبائل سے بھی چھین کر حکمران وقت کے سپرد کیا گیا جو تفتیش اور غیر جانبداری کا پابند تھا۔

اس موقع پر یہ بیان کرنا مناسب ہوگا کہ کم از کم اہل کتاب غیر مسلموں کے مقدموں میں آنحضرت صلعم ان کے شخصی قانون ہی کے

(بقیہ نوٹ صفحہ (۶)) کے متعلق کیسے اختیار رہ سکتا ہے! اور جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے تو یہ کھلم کھلا اس کا گمراہ ہونا ہے۔" یہ سورۂ احزاب کی آیتہ ہے جو مدنی ہے) قبیلہ داری افراتفری کی جگہ مرکزیت پیدا کرنے کے لئے، علاوہ ایک خاص شخص کو ہمہ گیر حکمران تسلیم کرنے کے، مرکزی حکومت کو زکات (جائداد ی ٹیکس) دینا، مرکزی حکومت کی جبری فوجی خدمت (بذریعہ جہاد) اور مرکزی حکومت کے بنائے ہوئے تمام قوانین کی تعمیل، تین اہم اصول اختیار کئے گئے۔ نتیجے کی کامیابی کسی تذکرے کی محتاج نہیں۔

[1] اس دستاویز کی غیر معمولی اہمیت کے باعث متعدد مولفوں نے اس سے خصوصی بحث کی ہے۔ مثلاً

Wellhausen, *Skizzen und Vorarbeiten*, IV, ' Gemeindeordnung von Medina"

Caetani, *Annali dell ' Islam*, 1 : 43 etc.

Wensinck, *Mohammed en de Joden te Medina*, p. 78 et seq.

Buhl, *Das Leben Muhammeds*, p 210-12

Hamidullah, *La Diplomatie Musulmane*, I, p 20-26.

Grime, Muller, etc., etc

مطابق فیصلہ فرماتے تھے۔ چنانچہ یہودیوں کے دو مقدموں کا اکثر مورخوں نے ذکر کیا ہے جن میں توریت پر عمل کرایا گیا تھا۔[1] قرآن مجید میں اس مسئلے سے کافی طویل بحث کی گئی ہے اور حکم دیا گیا ہے کہ یہودی توریت پر عمل کریں تو نصرانی انجیل پر، اور مسلمان قرآن پر، اور یہ کہ خدا ہی نے ہر ایک کو الگ الگ شریعتیں دی ہیں ورنہ اگر وہ چاہتا تو سب کو ایک ہی "امت" بنا دیتا۔[2] آنحضرتؐ کا یہ طرز عمل بعد میں مستقل قانون بن گیا کہ غیر مسلم رعایا اور مستامنوں سے ان کا شخصی قانون ہی متعلق ہو اور اس غرض کے لئے خصوصی عدالتیں بنائی جائیں چنانچہ خلافت راشدہ میں اس طرز انصاف نے خاصی ترقی کر لی تھی اور ان ملی عدالتوں کے حکام بھی ہم ملت مقرر ہوتے تھے۔ ممکن ہے اس میں یہ مصلحت بھی پوشیدہ ہو کہ تحت تر شخصی قانون والی "ملتیں" ہمسایہ و ہمشہری مسلمانوں کی "الحنیفیۃ السمحا" کی لوچ کو دیکھ دیکھ کر اپنے سکون کے لمحوں میں اس کو قبول کرنے کی خاموش ترغیبیں پاتی رہیں۔ بہرحال ایک ابتدائی اور فوری اور بہت اہم فائدہ اسلامی مملکت کو اس سے یہ پہنچا کہ جدید مفتوحہ علاقے میں اقلیتوں کی جن پر وہاں کی سابقہ حکومت سخت مظالم توڑا کرتی تھی، پرخلوص تائید حاصل ہو گئی جس سے اس کو اپنی تازہ فتح کے مستحکم اور مکمل کرنے میں کافی مدد ملی۔ چنانچہ مشہور پادری کا الیفسکی لکھتا ہے:

"علاوہ یہودیوں کے جن پر بہت سخت مظالم ہو رہے تھے ۔۔۔ یعقوبی عیسائیوں نے بھی عربوں کو اپنے نجات دہندہ سمجھا"

---

[1] پہلے مقدمہ کے لئے دیکھئے بخاری ۶۱:۲۶، ۹۵: ۱، ۵۔ ابن ہشام صفحہ ۳۹۳ تا ۳۹۵، ابو داؤد ج ۲، صفحہ ۱۵۲، التنبیہ للمسعودی صفحہ ۲۴۷

دوسرے مقدمے کے لئے تفسیر طبری ج ۶ صفحہ ۲۴۰ تا ۲۵۰، نیز بخاری، مسلم، ابو داود، ابن ماجہ، نسائی، دارمی، طیالسی، احمد بن حنبل وغیرہ جن کے صفحوں کے حوالے ونسنک کی مفتاح کنوز السنۃ میں لفظ "قصاص" کے تحت مل جائیں گے۔

اول الذکر مقدمے میں مسلمان مولفوں نے اس الزام کو دہرایا ہے کہ یہودیوں نے توریت کی تحریف کی ہے، اور لکھا ہے کہ زنا پر رجم کی سزا کا حکم یہودیوں نے چھپا دیا تھا۔ اس کا ثبوت اب دیگر ذرائع سے بھی ملتا ہے۔ چنانچہ ایک یہودی [illegible] پروفیسر Torry, Jewish Foundation of Islam. ہی نے ناقابل تردید ثبوت ڈھونڈ نکالا ہے کہ ایک زانیہ کے گرفتار ہو کر آنے پر حواریوں نے حضرت عیسیٰؑ سے پوچھا: توریت میں اس کی سزا رجم ہے اب آپ کیا حکم دیتے ہیں؟ (دیکھئے انجیل یوحنا ۸:۵) توریت کے موجودہ ایڈیشن اس حکم رجم سے یکسر خالی ہیں۔

نجران کے عیسائیوں سے آنحضرتؐ نے جو معاہدہ کیا تھا (اور جس کا متن ابن سعد وغیرہ میں ہے)، اس میں بھی ان کی داخلی عدالتی خود مختاری برقرار رکھی گئی تھی۔

[2] قرآن مجید ۵: ۴۲ تا ۵۰

کی حیثیت سے ہاتھوں ہاتھ لیا۔۔ مسلمانوں کی سب سے اہم جدت جس کا یعقوبی عیسائیوں نے دلی خوشی سے استقبال کیا، یہ تھی کہ ہر مذہب کے پیروؤں کو ایک خود مختار وحدت قرار دیا جائے اور اسی مذہب کے روحانی سرداروں کو ایک بڑی تعداد میں دنیاوی اور عدالتی اقتدارات عطا کئے جائیں۔[1]

ایک اور شہادت جو معصر ہونے کے باعث خاص اہمیت رکھتی ہے، قابل ذکر ہے۔ چنانچہ شام کی فتح کے صرف پندرہ سال بعد حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک نسطوری پادری نے ایک دوست کے نام جو خط لکھا تھا وہ موجود ہے اور اس میں لکھا ہے:۔

"یہ طائی (یعنی عرب) جن کو خدا نے آج کل حکومت عطا کی ہے، ہمارے بھی مالک بن گئے ہیں۔ لیکن وہ عیسائی مذہب سے مطلق برسرپیکار نہیں۔ اس کے برخلاف وہ ہمارے دین کی حفاظت کرتے ہیں، ہمارے پادریوں اور قدیسیوں کا احترام کرتے ہیں اور ہمارے گرجاؤں اور کلیساؤں کو جاگیریں عطا کرتے ہیں۔"[2]

یہ یاد رہے کہ کم از کم انصار کے قبائل کی حد تک آنحضرت صلعم نے ہجرت سے پہلے ہی بیعت عقبہ میں ہر ایک کا ایک ایک "نقیب" مقرر کر دیا تھا جو اپنے قبیلے کی نمایندگی کرتا اور اندرونی نظام اور باقاعدگی کا ذمہ دار تھا۔ اگر کسی معاملے میں نقیب کا فیصلہ تشفی کا سامان نہ کرتا تو معاملہ آنحضرتؐ کے پاس آتا۔ نقیب کے تحت ہر دس آدمیوں کا ایک افسر ہوتا جسے "عریف" کہتے تھے۔ یہ روما کے decurion سے مشابہ تھا۔ اس نظام سے وقت ضرورت استصواب عامہ میں بھی مدد لی جاتی تھی۔[3]

مدینے کی حد تک آنحضرتؐ پورا عدالتی کام خود انجام دیتے تھے لیکن جب اسلامی عملداری میں وسعت ہوئی اور انتظامی کام بڑھ گیا تو مدینے میں آنحضرت نے چند مفتی (یعنی قاضی)[4] مقرر فرمائے تھے جن کے فیصلوں کے خلاف آنحضرتؐ کے پاس مرافعہ

---

[1] Karalevskij, *Dictionnarie d'Histoire et Geographie Ecclesiastiques*, s. v. Antioche, col 592. 594.

[2] Assemani, *Bibl Orient.*, III, 2, p. XCVI; De Goeje, *Memoire sur la Conquete de la Syrie*, 2nd ed., p. 106.

[3] سیرت نبوی کی کسی کتاب میں جنگ ہوازن کے قیدیوں کی رہائی کا واقعہ ملاحظہ ہو۔ اس وقت نقیبوں اور عریفوں سے مدد لی گئی تھی۔

[4] ابتداءً قاضی کو مفتی کے نام سے موسوم کیا جاتا تھا۔ (المبسوط للسرخسی ج ۱۶ صفحہ ۱۰۶)

[5] التراتیب الاداریہ للکتانی ج ۱ صفحہ ۱۰ (بحوالہ ابن الجوزی)

بھی ہوتا تھا[۱]۔ مدینے میں مستقل قاضیوں کے علاوہ کسی خاص شخص کو کسی خاص مقدمے کی سماعت کے لئے موقتی قاضی بنائے جانے کی بھی عہد نبوی میں متعدد نظیریں ملتی ہیں نیز ان کے آنحضرتؐ کے پاس مرافعوں کی بھی[۲]۔ یہ تو ظاہر ہی ہے کہ دارالحکومت کے باہر صوبوں اور ضلعوں میں بھی علاحدہ عدالتی افسروں کی ضرورت تھی اور معلوم ہوتا ہے کہ صوبوں کے عامل (گورنر) ہی بہ یک وقت سپہ سالار، افسر مال، قاضی اور محتسب (نگران اخلاق و مال تجارت وغیرہ) ہوتے تھے۔ ان کی کارروائیوں اور فیصلوں کے خلاف بھی آنحضرتؐ کے پاس مرافعے آیا کرتے تھے[۳]۔

ان قاضیوں کو مستقر کی جانب روانگی کے وقت جو ہدایتیں دی جاتی تھیں، ان میں سے بعض کو تاریخ نے محفوظ رکھا ہے۔ حضرت معاذ بن جبل عہد نبوی کے عدالتی حلقے میں جو نمایاں حیثیت رکھتے ہیں وہ محتاج بیان نہیں۔ ان کے حالات سے عام کیفیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ابن عبدالبر نے لکھا ہے:۔

> معاذ بن جبل۔ کو آنحضرت نے قاضی بنا کر جَنَد (جو یمن میں ہے) بھیجا تاکہ لوگوں کو قرآن اور احکام اسلام سکھلائیں اور ان کے مقدموں کا فیصلہ کریں اور یمن کے تحصیلداروں سے جمع شدہ سرکاری محاصل اپنی تحویل میں لیں[۴]۔

جب معاذ بن جبلؓ روانہ ہونے لگے تو حضرت نے آخری باریابی کے موقع پر ان سے جو گفتگو فرمائی وہ بھی اسلامی عدل گستری اور قانونیات کی تاریخ میں اہمیت رکھتی ہے:۔

> "آنحضرت نے جب معاذ کو یمن بھیجا تو پوچھا: کس طرح فیصلے کروگے؟ کہا: اسی کے مطابق جو اللہ کی کتاب (قرآن) میں ہو۔ فرمایا: اگر کتاب اللہ میں نہ ہو؟ کہا: تو رسول اللہ کی سنت کے موافق۔ فرمایا: اگر رسول اللہ کی سنت میں نہ ملے؟ کہا: تو میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا۔ فرمایا: خدا کا شکر ہے جس نے اپنے رسول کے فرستادے کو ایسی بات کی توفیق دی جس سے اللہ کا رسول راضی ہے[۵]۔"

---

[۱] التراتیب ۱/۱۰، بہ حوالہ الکتانی ج (۱) صفحہ (۲۵۱) (بحوالہ موطا)

[۲] مسند احمد بن حنبل ج (۲) ص ۱۸۷؛ ج (۴) صفحہ (۳۰۵)؛ ج (۵) صفحہ (۲۹)

[۳] مثلاً استیعاب حدیث (۵۵۴)

[۴] استیعاب حدیث (۱۰۰۱)

[۵] ترمذی ۱۳: ۳۰۳ - ابوداؤد ۲۳: ۱۱ - اعلام الموقعین لابن القیم ج (۱) صفحہ (۷۳)، طبقات ابن سعد ج ۲/۲ صفحہ (۱۰۷، ۱۰۸)

قاضیوں کو یہ بات اچھی طرح سمجھا دی جاتی تھی کہ دی ہوئی ہدایتوں کے خلاف وہ جو کام کریں گے وہ کالعدم سمجھا جائے گا۔[1]

جب عمرو بن حزمؓ یمن کے گورنر بنا کر بھیجے گئے تو ان کو آنحضرت نے ایک تحریری ہدایت نامہ دیا۔ یہ اسلامی تاریخ انتظام مملکت میں ہمیشہ یادگار رہے گا۔ اس طویل اور ہمہ گیر دستاویز میں انھیں انصاف رسانی اور بے لاگ عدل کا حکم دیا گیا ہے اور ظلم و ستم سے باز رہنے کی تاکید کی گئی ہے۔[2] عمرو بن حزمؓ کے لئے لکھے ہوئے ہدایت نامے میں تفصیل سے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ جسمانی ضرر رسانی کی کس کس صورت میں متضرر کو کیا ہرجہ دلایا جائے گا۔[3] اس قسم کا ایک قانون آنحضرت کے حکم سے حضرت ابو شاہؓ کو بھی لکھ کر دیا گیا تھا۔[4]

بدلے اور انتقام کا تصور حمورابی (شاہ بابل) کے زمانے میں یہ تھا کہ کسی کی بیٹی یا بیٹے کے قتل پر قاتل کی بھی بیٹی یا بیٹے کو قتل کیا جائے۔[5] حمورابی کے بعد اس کے قانون قصاص اعضا کا کچھ حصہ[6] قانون حضرت موسیٰ (توریت) میں بھی ملتا ہے جس میں آنکھ کے عوض آنکھ اور کان کے عوض کان کا طریقہ قائم کیا گیا۔[7] مگر یہ عہد اسلام کی (آنحضرت صلعم کے زمانے کی) ترقی ہے کہ عمد، شابہ عمد اور خطا میں فرق کیا جانے لگا۔[8] اور نیت سب سے پہلے دیکھی جانے لگی۔[9] اس کے علاوہ بہت سی صورتوں میں ضمان یعنی تاوان مقرر کر دیا گیا۔ اور ہرجے کا معاوضہ بجائے مساوی انتقام کے رقمی یا مادی صورت میں دلایا جانے لگا۔[10] اور سخت قانونی انصاف کی جگہ استحسان یا نصفت کو عدالتیں روا رکھنے لگیں۔[11] مطلب یہ ہے کہ انصاف کے ساتھ رحم کو بالکل نظر انداز نہیں کر دیا جا سکتا اور حالات و واقعات و نیت

---

[1] مَن عمل عملاً لیس علیہ امرنا فھو ردّ (مسلم ۳۰ : ۱۷ تا ۱۸) من استعملناہ علی عمل فلیأت بقلیلہ وکثیرہ فما اوتی منہ اخذ وما نھی عنہ انتھی (ابوداود ۲۳ : ۵)

[2] متن کے لئے دیکھئے ابن ہشام صفحہ ۹۶۱ تا ۹۶۲، طبری صفحہ ۱۷۲۷ تا ۲۹)

[3] موطا، باب العقول؛ نیز سنن نسائی بر موقع

[4] بخاری باب کتابۃ العلم

[5] قانون حمورابی دفعات ۱۱۶، ۲۱۰، ۲۳۰ (قاتل محفوظ رہتا تھا)

[6] ایضاً ف ۱۹۶، ۱۹۷، ۲۰۰۔

E. Edwards, *Hammurabi Code*, p IX. 111-143

[7] تائید کے لئے دیکھئے قرآن مجید ۵ : ۴۵۔ نیز

Stanley A. Cook. *The Laws of Moses and the Code of Hammurapi*, (reviewed in O.L.Z. Berlin, 1904 by J. Kohler)

[8] خطبہ حجۃ الوداع میں بھی اس کا ذکر ہے۔

[9] حدیث انما الاعمال بالنیات صحاح ستہ میں

[10] موطا وغیرہ میں باب العقول ملاحظہ ہو۔

[11] قرآن مجید ۵ : ۹۰ "خدا عدل اور احسان کا حکم دیتا ہے" نیز احسان کا ذکر اصول فقہ کی کسی کتاب میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

کے لحاظ سے مناسب موقع رعایت بھی کی جا سکتی ہے۔ اور ذمہ داری کو شخصی قرار دیا گیا کہ "ایک کا بار دوسرے پر نہ ڈالا جائے"[1]
ایک نئی جدت یہ کی گئی کہ انسانوں کے سوا باقی سب مخلوقات کو ذمہ داری سے بری کر دیا گیا۔ ورنہ اب تک عرب
میں کوئی گڑھا اور جانور بھی کسی آدمی کے ضرر اور ہلاکت کا باعث ہوتا تو ذمہ داری سے بری نہ ہوتا[2]۔ چنانچہ امام ابو یوسف
نے بیان کیا ہے :-

"زمانہ جاہلیت میں اگر کوئی گڑھے میں گر کر مر جاتا تو وہ گڑھا اس کا خون بہا قرار دیا جاتا (اور ہلاک شدہ
شخص کے وارثوں کی ملک قرار پاتا) اگر کوئی جانور کسی کو قتل کرتا تو وہی اس کا خون بہا قرار دیا جاتا۔ اگر کوئی
کسی کان میں ہلاک ہوتا تو وہ کان اس کا خون بہا قرار دی جاتی۔ کسی نے اس بارے میں آنحضرت سے پوچھا
تو آپ نے فرمایا کہ بے زبان جانور اور کان اور کنوئیں پر ضرر رسانی سے کوئی ذمہ داری نہیں پیدا ہوتی"[3]

ابھی بیان ہوا کہ مختلف صوبوں پر جو عامل اور قاضی بھیجے جاتے تھے انھیں خاص احکام اور ہدایتیں دی جاتی تھیں۔ مرکز
حکومت مدینہ میں عدالت ابتدائی ہر قبیلے کے عریف اور نقیب ہوتے یا مفتی اور قاضی۔ عدالت مرافعہ اور عدالت انتہائی خود
جناب رسالت مآب کی ذات تھی۔ مرافعہ اور استصواب آنحضرت کے پاس بعض وقت اضلاع اور صوبہ جات سے بھی ہوتا۔ تصحیح
کی بھی متعدد نظیریں تاریخ نے اس عہد کے متعلق محفوظ کی ہیں اور جب کبھی آنحضرت صلعم کو کسی افسر کے غلط فیصلے یا طرز عمل کا پتہ چلتا تو
آپ (بصیغہ نگرانی) دخل دہی فرما کر تلافی اور تدارک فرماتے۔ حضرت خالد بن الولید اور واقعۂ بنی جذیمہ اس کی ایک انتہائی مثال
ہے۔ نگرانی اور مرافعہ کا نظام حضرت عمرؓ کے زمانے میں ایک بہت ہی ترقی یافتہ ادارہ بن گیا تھا۔ اور انھوں نے حج کے موقع
کو ایک عدالتی اور انتظامی تنقیح کا مقام بھی قرار دیدیا تھا، چنانچہ جملہ صوبہ دار اور حکام عدالت اس وقت مکہ معظمہ آتے اور حضرت عمرؓ ان

---

[1] قرآن مجید میں یہ آیت پانچ جگہ آئی ہے (۶: ۱۶۴؛ ۱۷: ۱۵؛ ۳۵: ۱۸؛ ۳۹: ۷؛ ۵۳: ۳۸)

[2] انگلستان ابھی گزشتہ انیسویں صدی کے وسط تک کسی گاڑی کسی درخت، کسی جہاز اور کسی دوسرے غیر جاندار "قاتل" کو بھی قانوناً سزائے
قتل دی جاتی تھی۔ دیکھئے

Hobhouse, *Morals in Evolution*, ch. Law and Justice.

اس طرح جاہل عرب ہی کا زیادہ معقولیت پسند رہا ہونا معلوم ہوتا ہے۔

[3] کتاب الخراج صفحہ (۱۳)

کے خلاف دعوے اور مقدمے خود سنتے اور حق رسائی کرتے۔ اگر سرکاری افسروں سے کوئی لغزش ہوئی ہوتی تو بڑی سختی سے دار و گیر کرتے۔

جیسا کہ ایک حدیث میں بیان کیا گیا ہے کہ ثبوت مانگے بغیر اگر ہر دعوے کو صحیح مان لیا جایا کرے تو لوگوں کی جان و مال محفوظ نہ رہیں۔[1] اسی لئے امور تنقیح طلب اور شہادت پیش شدہ کی جانچ کے لئے[2] آنحضرت صلعم کے بہت سے اصولی اور ذیلی احکام حدیث میں ملتے ہیں۔ ان میں سے چند کا یہاں ذکر کیا جاتا ہے۔

انصاف رسانی کے لئے قاضی کو چاہئے کہ صرف روداد پر فیصلہ کرے اور اپنے خانگی معلومات کو دخل نہ دے۔[3] ایسا حکم نہ ہوتا تو ظاہر ہے کہ قاضیوں کو بددیانتی کی ہمیشہ زبردست ترغیب ہوتی رہتی۔ ناحق فریق کی جادو بیانی کے سلسلے میں ایک دلچسپ حدیث قابل ذکر ہے جو صحاح ستہ میں آنحضرت سے مروی ہے :۔

"بے شبہ میں صرف ایک انسان ہوں۔ تم میرے پاس جھگڑتے آتے ہو اور یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص دلیل پیش کرنے میں دوسرے کے زیادہ چرب زبانی کے ساتھ پیش کرے اور میں جو کچھ سنوں اسی کے مطابق فیصلہ صادر کر دوں۔ اگر کسی کو میرے اس طرح کے فیصلے سے کچھ (ناحق) ملے تو وہ اس سے استفادہ نہ کرے کیونکہ میں جو کچھ دیتا ہوں وہ آگ کے ایک ٹکڑے کے سوا کچھ نہیں۔"[4]

جس سماج میں پیشہ ور وکیل اور اڈوکیٹ نہ ہوں اور جو قانونی حق سے زیادہ قدرتی حق پر زور دیتا ہو، اس کے قاضیوں کے لئے حضرت علیؓ کو دی ہوئی اس ہدایت نبوی سے بہتر اور کیا ہدایت دی جا سکتی ہے کہ :۔

"جب تیرے پاس دو جھگڑنے والے آئیں تو تو اس وقت تک ان کا فیصلہ صادر نہ کر جب تک کہ تو پہلے دوسرے

---

[1] مسند احمد بن حنبل ج (۱) صفحہ (۳۴۳، ۳۶۳)

[2] ورنہ قدیم عرب میں ملزم کا کھوج لگانے کے لئے "روحانی" قوتوں سے مدد لی جاتی اور فال، قرعہ، جادو، ٹوٹکے، دیو بانی، ہاتف جیسے غیر یقینی ذرائع برتے میں آتے یا غیب دانی کے مدعی عراف، کاہنوں وغیرہ کی من گھڑت باتوں پر عمل کیا جاتا۔

[3] اس مسئلے پر ایک مختصر بحث اور حضرت ابوبکر و عمر کے اقوال و افعال کے لئے دیکھئے الطرق الحکمیۃ لابن القیم صفحہ (۳ تا ۲۶)

[4] بخاری ... مسلم ۳۰:۴ - ترمذی ۱۳:۱۱ - ابو داؤد ۲۳:۷ - ابن ماجہ ۱۳:۵ - نسائی ۴۹:۱۳، ۲۳ - ابن حنبل ج (۶) صفحہ (۲۹۰) تا ... نیز اقضیۃ رسول اللہ للقرطبی صفحہ (۸۲)، الطرق الحکمیۃ صفحہ (۲۶۶)

دونوں کا بیان نہ سن لے۔ تیرے لئے اس طرح صحیح فیصلے کا سمجھنا زیادہ ممکن ہے۔ (حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ) اس کے بعد سے میں ہمیشہ فیصلے کرتا رہا ہوں اور فیصلے کرنے میں مجھے کبھی شک اور ہچکچاہٹ نہیں محسوس ہوئی"۔[۱]

آنحضرت صلعم نے قانون اور انصاف رسانی کا یہ اہم قاعدہ مقرر فرمادیا کہ بار ثبوت مدعی پر ہے۔ اور اگر مدعی ثبوت نہ پیش کرسکے[۲] تو دعوے کے منکر یعنی مدعا علیہ کو قسم دی جائے۔[۳] اس قاعدے کو بدلنے کی ابتک کہیں ضرورت نہیں سمجھی گئی ہے۔ مزید برآں، مدعی اپنے ناکافی ثبوت کی تلافی، جب کہ مدعا علیہ کے پاس بھی جوابی ثبوت نہ ہو، قسم کے ذریعے بھی کرتا اور عہد نبوی میں اس کی بہ کثرت نظیریں ملتی ہیں۔[۴] ایک نسبتہً فروتر اخلاق کے زمانے میں ثبوب میں پیش شدہ گواہوں کے علاوہ قاضی شریح مدعی کو قسم بھی دیتے تھے کہ اسکا دعویٰ سچا ہے۔ لوگوں نے اسپر اعتراض کیا تو کہا: "جب میں نے دیکھا کہ لوگوں میں نت نئی برائیاں پیدا ہوگئی ہیں تو مجھے بھی نئے طریقے اختیار کرنے پڑے"۔[۵]

اسی سلسلے میں حضرت علیؓ کی ایک نئی اصلاح کی طرف توجہ منعطف کرائی جاسکتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ گواہوں کی پیشی پر ان کا "تزکیہ" یعنی معتبر ہونے کے متعلق اہل محلہ وغیرہ کا اظہار قدیم سے رائج تھا۔ لیکن اس تحقیقات کو قاضی شریح نے مخفی طور سے کرنا شروع کیا[۶] اور جھوٹے گواہوں کا انسداد کرنے کے لئے حضرت علیؓ ایک گواہ کا اظہار لیتے وقت دوسروں کو عدالت کے کمرے سے ہٹا دینے لگے اور ان کا قول مشہور ہے کہ " انا اول من فرق بین الشھود"، ورنہ اس سے پہلے سب گواہ کمرہ عدالت میں حاضر رہتے اور ایک دوسرے کے بیانات سنتے رہتے تھے۔[۷]

---

[۱] ترمذی ۱۳: ۵۔ ابوداود ۲۳: ۶۔ ۱۔ ابن حنبل ج (۱) صفحہ (۱۱۱، ۱۴۹، ۱۵۰، ۹۰، ۹۶)۔ الکنانی ج (۱) ص (۲۵۷ تا ۲۶۱)

[۲] ابن حنبل ج (۱) صفحہ (۲۰۸)

[۳] البینۃ علی المدعی والیمین علی المدعیٰ علیہ (والیمین علی من انکر) بخاری ۴۸: ۱، ۶۵: ۲، ۳: ۲۰۔ مسلم ۳۰: ۱، ۲۔ ابوداود ۲۳: ۲۱، ۲۳: ۱۳؛ ۲۳: ۴۴، ۲۲۔ ترمذی ۱۳: ۱۲۔ نسائی ۴۹: ۳۶۔ ابن ماجہ ۳۶: ۸۔ ابن حنبل ج (۱) صفحہ ۳۴۲، ۳۵۱، ۳۵۶، ۳۶۳۔ المبسوط للسرخسی ج (۱۷) صفحہ ۲۸۔ الطرق الحکمیہ لابن القیم صفحہ (۴۹)

[۴] مسلم ۳۰: ۱۔ ترمذی ۱۳: ۱۳۔ ابوداود ۲۳: ۲۱۔ چنانچہ دو گواہوں کی ضرورت کے وقت ایک گواہ اور قسم پر فیصلے صادر کئے گئے۔

[۵] الطرق الحکمیہ صفحہ ۱۲۰

[۶] المبسوط للسرخسی ج (۱۶) صفحہ (۹۰)؛ نیز محاضرۃ الاوائل صفحہ (۹۷)

[۷] الطرق الحکمیہ صفحہ (۹۰)

قاضی شریح کا ذکر اب تک کئی بار آیا ہے۔ فصل خصومات ان کا موروثی پیشہ تھا۔ اور ان کے والد ہانی اپنے بے لاگ فیصلوں کے باعث زمانۂ جاہلیت میں ابوالحکم کے معزز نام سے مخاطب کئے جاتے تھے۔[۱] خود شریح ان مادرزاد قاضیوں میں سے ہیں جن کی تعداد تاریخ عالم میں بھی کم ہے اور جن پر ہر قوم بجا طور پر فخر کر سکتی ہے۔ یہ بچے سے تھے کہ انھوں نے ایک پیچیدہ قانونی مقدمے میں، جس میں خلیفہ حضرت عمرؓ پریشان تھے، ایک بہترین اصول پیچیدگی کے حل کا بتایا۔ مردم شناس اور قدردان حضرت عمرؓ اس قدر خوش ہوے کہ باوجود لوگوں کی مخالفت کے اس کمسن بچے کو عراق کے اہم صوبے کا قاضی بنا کر روانہ کیا۔ قاضی شریح کو وہاں جو کامیابی ہوئی اس کے لئے صرف اتنا بیان کرنا کافی ہوگا کہ وہ تقریباً پچھتر سال تک مسلسل اسی کام کو انجام دیتے رہے اور کسی خلیفہ مابعد کو ان کی اہلیت کے متعلق بدگمانی نہیں ہوئی۔[۲] انھیں قاضی شریح کو حضرت عمرؓ نے جو ہدایت نامہ دیا تھا اس کے چند فقرے خود ان کی زبانی سنئے:۔

"اگر تجھ کو کتاب اللہ میں کوئی چیز مل جائے تو پھر اس کے متعلق کسی اور سے رجوع نہ کر۔ اگر کتاب اللہ میں نہ ملے تو سنت میں اور جو سنت میں بھی نہ ملے تو پھر اپنی رائے کو کام میں لا۔"[۳]

ایک دوسری روایت میں ہے:۔

"شعبی نے شریح سے روایت کی ہے، انھوں نے کہا: مجھ سے حضرت عمرؓ نے فرمایا: اگر کتاب اللہ میں کوئی چیز مل جائے تو اسی کے مطابق فیصلہ کر۔ اگر پوری کتاب اللہ میں وہ مسئلہ نہ ملے تو رسول اللہ کے فیصلوں میں جو چیز ملے اس کے مطابق فیصلہ کر۔ اگر رسول اللہ کا کوئی فیصلہ نہ ملے تو راہ یاب اماموں کے فیصلوں کے مطابق فیصلہ کر۔ اگر راہ یاب اماموں کے فیصلوں میں بھی کوئی چیز نہ ملے تو اپنی رائے کو کام میں لا اور علم و صلاح والوں سے مشورہ کر۔"[۴]

جیسا کہ اوپر بتایا جا چکا ہے۔ یہی طرز عمل اور حکم آنحضرت صلعم کا تھا اور بغوی نے لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کا بھی یہی طرز عمل تھا۔[۵]

---

۱ سنن نسائی میں کتاب آداب القضاۃ دیکھئے۔

۲ المعارف لابن قتیبہ صفحہ (۱۴۲) وفیات الاعیان لابن خلکان بر موقع۔ استیعاب لابن عبدالبر حدیث نمبر (۳۱۵۹)

۳ اعلام الموقعین لابن القیم ج (۱) صفحہ (۳۰۱) بعض اور تفصیلوں کے لئے دیکھئے المبسوط ج (۱۶) صفحہ (۶۹) کنزالعمال ج (۲) صفحہ (۱۷۵)

۴ اعلام الموقعین ج (۱) صفحہ (۳ تا ۴۷)۔ آخری جملے کی تائید کے لئے دیکھئے سنن نسائی کتاب آداب القضاۃ۔ نیز المقارنات صفحہ (۶۲)

۵ بحوالہ السیاسۃ الشرعیۃ لعبدالوہاب الخلاف صفحہ (۴۷) نیز عیون الاخبار لابن قتیبہ، باب "القضاء"۔

حضرت عمرؓ نے اپنی خلافت کے زمانے میں مختلف صوبوں کے قاضیوں کو جو ہدایتیں دی تھیں، ان میں سے چند تاریخ نے محفوظ رکھی ہیں۔[1] ان میں سے ایک جو "کتاب سیاستہ القضاء وتدبیر الحکم"، کے موزوں نام سے مشہور[2] ہے، سب سے زیادہ اہم ہے۔ یہ وہ ہدایت نامہ ہے جو انہوں نے حضرت ابو موسیٰ الاشعری کو بصرے کا قاضی بنانے کے بعد بھیجا تھا اور جو آج کل بھی حکام عدالت کے لئے دستور العمل بن سکتا ہے۔ اس کی اہمیت نے آکسفرڈ کے پروفیسر عربی ڈاکٹر مارگولیوث کو ۱۹۱۰ء میں اس بات پر آمادہ کیا تھا کہ اس پر ایک بسیط مضمون لکھے۔[3] مگر بدقسمتی سے اصل دستاویز کا انگریزی ترجمہ جو مارگولیوث نے کیا ہے، حد درجہ ناقص ہونے سے اس کی اہمیت کا صحیح اندازہ پڑھنے والے کو بالکل نہیں ہو سکتا۔ اسلامی مولفوں نے بھی قدیم سے اس دستاویز کو بڑی اہمیت دی ہے، اور اس پر شرح لکھی ہے۔[4] اس کافی طویل دستاویز کا خلاصہ یہاں پیش کیا جاتا ہے۔ اصل متن بہ کثرت مولفوں نے محفوظ کیا ہے[5]:-

—— قضاۃ ایک خدائی فریضہ اور آنحضرت کا واجب التعمیل حکم اور طرز عمل ہے۔

—— اگر آپ کے پاس کوئی مقدمہ رجوع ہو تو غور و فکر کے بعد پوری طرح سمجھ کر فیصلہ کیجئے اور اس کی تعمیل کرائیے بغیر تعمیل کے اچھے سے اچھا فیصلہ بھی بیکار ہے۔

—— فریقین سے برابری کا برتاؤ کیجئے تاکہ کمزور آپ کے عدل سے ناامید نہ ہو جائے اور قوی ظالم اس سے بے جا فائدہ نہ اٹھائے، اور نہ ظلم پر دلیر ہو جائے۔

بار ثبوت مدعی پر ہے اور منکر پر قسم۔

—— اگر فریقین صلح کر لینا چاہیں تو جن شرائط پر چاہیں صلح کر سکتے ہیں۔ صرف شرط یہ ہے کہ اس طرح

---

[1] بنام ابو عبیدہ (کتاب الخراج لابی یوسف صفحہ (۶۷)) بنام حضرت معاویہ (المبسوط للسرخسی ج (۱۶) صفحہ (۶۵)) عقد الفرید لابن عبد ربہ ج (۱) صفحہ (۲۴)۔ دیگر بنام شریح (المبسوط ج (۱۶) صفحہ (۶۶)) کنز العمال ج (۲) صفحہ (۱۷۵)) بنام حضرت ابو موسیٰ، علاوہ اس کے جس کا ذکر آگے ہے (عقد الفرید ج (۱) صفحہ (۲۴))

[2] المبسوط ج (۱۶) صفحہ (۶۰)		[3] J. R. A. S., 1910.

[4] مثلاً السرخسی نے المبسوط ج (۱۶) صفحہ (۶۰) و ما بعد میں اور ابن القیم نے اعلام الموقعین ج (۱) میں

[5] عربی متن اور جملہ عربی ماخذوں کے لئے دیکھئے مارگولیوث کا مذکورہ مضمون (مثل ابن قتیبہ، المبرد، الجاحظ، ابن خلدون، ابن عبد ربہ وغیرہ)

کوئی حرام چیز حلال نہ ہو جائے اور حلال چیز حرام۔
—— فیصلہ کر چکنے کے بعد نظر ثانی میں کوئی حرج نہیں کیونکہ اصل مقصد حق رسائی اور انصاف ہے۔
—— اگر کسی بات کے فیصلے میں قرآن اور سنت میں کوئی چیز نہ ملے تو خوب غور و فکر کیجئے اور نظائر او رشابہ امور کو ڈھونڈ کر ان پر قیاس کیجئے اور ایسا فیصلہ کیجئے جو خدا کو زیادہ پسند آئے اور حق سے زیادہ قریب ہو۔
—— اگر مدعی کو اپنا حق ثابت کرنے یا شہادت فراہم کرنے میں مہلت درکار ہو تو وہ دی جائے۔ شہادت سے اگر وہ دعویٰ ثابت کردے تو اُس کے موافق ورنہ اس کے مخالف فیصلہ صادر کیا جائے۔
—— شہادت کے اغراض کے لئے سب مسلمان قابل اعتماد ہیں، سوائے بدچلنی میں سزا یافتہ (مجلودٌ فی حدٍ) اور ایسے لوگوں کے جن کا جھوٹی گواہی دینا اس سے پہلے ثابت ہو چکا ہو۔
—— کسی مدعی کے رشتہ دار کی خاص اس مقدمے میں شہادت قابل اعتماد نہیں۔
—— مجلس عدالت میں غرور و تکبر، لوگوں کو جھڑکنا اور حق بات پر ناگواری نہیں ظاہر کرنی چاہئے۔ خدا سب دیکھتا اور سنتا ہے۔ اسی سے سب کو اپنا معاملہ صاف رکھنا چاہئے۔

اس عہد کا اسلامی قانون شہادت اتنا وسیع موضوع ہے کہ ایک مستقل مقالے کے بغیر یہ بتانا ناممکن ہوگا کہ تفتیش کس طرح ہوتی ہے، تنقیح شہادت اور جرح کے کیا قاعدے ہیں، گواہوں کی تعداد، عمر، جنس (مرد اور عورتیں)، مسلم اور غیر مسلم کی شہادت، غیر ملکی مستامنوں کے عدالتی حقوق وغیرہ کے کیا قاعدے تھے۔ وغیرہ۔

قاضیوں کی تنخواہ بھی ایک دلچسپ چیز ہے۔ اسلام میں اس اصول کو شروع ہی سے تسلیم کیا جاتا رہا ہے کہ قاضیوں کو معقول بلکہ بیش قرار تنخواہیں دے کر رشوت کے لالچ سے بچایا جائے۔ آنحضرتؐ، طالب عہدہ لوگوں کو کبھی گورنر یا قاضی نہیں بناتے تھے۔ تاریخ سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلعم نے حکام عدالت کے لئے ماہواریں بھی مقرر کرنی شروع فرمادی تھیں، اور اس بارے میں حضرت عتاب بن اسید کا نام بطور نظیر پیش کیا جاتا ہے جن کو، کہتے ہیں کہ ماہانہ تیس درہم تنخواہ دی جاتی تھی[۱]۔ سلیمان بن ربیعۃ الباہلی کو حضرت عمرؓ ماہانہ پانچ سو درہم دلاتے تھے اور کسن قاضی شریح کو ماہانہ ایک سو[۲]۔ حضرت علی اپنے زمانۂ خلافت میں ایک مرتبہ قاضی شریح کے پاس اپنے ایک مقدمے کے لئے رجوع ہوئے اور

---

[۱] الکتانی ج (۱) صفحہ (۲۶۴) بحوالۂ ہدایہ)
[۲] المبسوط ج (۱۶) صفحہ (۱۰۲)

اپنے بیٹے امام حسنؓ کو بطور گواہ پیش کیا حضرت علیؓ کے، باوجود خلیفہ ہونے اور امام حسنؓ کی خصوصی شخصیت تبا کر اصرار کرنے کے، قاضی شریح نے بیٹے کی گواہی باپ کے حق میں قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ اس واقعے کے کچھ دنوں بعد حضرت علیؓ نے قاضی شریح کی بھی پانچ سو درہم ماہوار مقرر کر دی۔[۱]

متعدد نظیروں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت فوجداری مقدموں میں ملزم کو تحقیقات تک اور مدیون کو قرض کی ادائی کے لئے حوالات میں رکھتے تھے[۲]۔ نیز حاضری کا مچلکہ بھی لیتے تھے[۳]۔ خلافت راشدہ میں قیدخانوں کے لئے مستقل عمارت ہونے لگ گئی تھیں۔ اس غرض کے لئے حضرت عمرؓ کا مکان خرید کر نا مشہور ہے۔ حضرت علیؓ کے بنائے ہوئے دو قیدخانے نافع اور مخیس کے نام سے مشہور ہیں[۴]۔

انگریزی قانون کا ایک اہم اصول ہے کہ بادشاہ کے خلاف کوئی مقدمہ نہیں دائر کیا جاسکتا کیونکہ (King can do no wrong). لیکن اسلام کسی کو خطا سے مبرا نہیں سمجھتا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنے ذات کے خلاف نالش اور دیوانی دونوں قسم کے متعدد مقدمات سنے اور مدعیوں کے حق میں فیصلے صادر کئے۔ حضرت عمرؓ نے نہ صرف اضلاع بلکہ مستقر حکومت، مدینہ منورہ میں مستقل اور پورا وقت دینے والے قاضی مقرر کر دیئے تھے۔ اس کا نتیجہ تھا کہ خود خلیفہ کے خلاف کوئی مقدمہ دائر ہوتا تو خلیفہ کو بھی عدالت میں حاضر ہو کر جوابدہی کرنی پڑتی۔ اس قسم کے نظیریں نہ صرف حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ کے زمانہ میں ملتی ہیں[۵]۔ بلکہ خلفا بنی امیہ و بنی عباس تک اس سے اپنے کو مستثنیٰ کرنے کی جرأت نہیں رکھتے تھے۔ اور خلیفہ منصور عباسی کا عدالت میں مدعا علیہ بن کر جوابدہی کے لئے حاضر ہونا ثبوت کے لئے کافی ہے۔ اس کی نظیریں بعد کے زمانوں میں دیگر اسلامی ممالک میں بھی ملتی ہیں۔

مستقل قاضیوں کے سلسلہ میں ایک بعد کے زمانے کا واقعہ بیان کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ مورخ ابن الجوزی نے بیان کیا ہے کہ عبید اللہ بن الحسن العنبری اور عمر بن عامر بصرے میں پہلی مرتبہ ایک عدالت میں مشترک قاضی مقرر کئے گئے اور

---

[۱] مبسوط ج (۱۶) صفحہ (۲۲)
[۲] ابوداؤد ۲۳ : ۴۳ قرطبی صفحہ (۴ تا ۵) کتانی ج (۱) صفحہ (۲۹۶)
[۳] مبسوط ج (۲۰) صفحہ (۷۶)
[۴] مبسوط ج (۲۰) صفحہ (۸۸)
[۵] ابن ہشام صفحہ (۴۴۴) ابن الاثیر ج (۲) صفحہ (۴۴)
[۶] مبسوط ج (۱۶) صفحہ ۳، ۷، ۴۵، و ۱۲۲ طبقات ابن سعد ج ۷/۲ صفحہ (۹۷)
[۷] ولاۃ مصر للکندی ص (۳۰۴ و ۳۰۵) (الحکم بن ہشام بن عبدالرحمن الداخل کے لئے دیکھئے المقری کی نفح الطیب طبع یورپ ج (۱) صفحہ (۵۵۷) الخ میں اس حوالے کے لئے محترم پروفیسر جمیل الرحمان صاحب کا ممنون ہوں۔ اسی طرح ماوردی میں بھی کچھ واقعات ہیں۔

انھیں حکم دیا گیا کہ وہ مل کر مقدمے سنیں اور متفقہ فیصلے صادر کریں۔[۱]

قاضی یا حاکم عدالت کا اجلاس شروع میں عموماً مسجدوں میں ہوتا تھا جو شہر کے ٹاون ہال کا کام دیتی تھیں۔ ان مسجدوں میں مسلم اور غیر مسلم سب بے تکلف آسکتے تھے۔ ابن عساکر کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عثمان کے زمانے میں ایک عمارت "دارالقضا" کے نام سے بن چکی تھی۔[۲] سلطان نورالدین زنگی کا ایک "دارالعدل" تعمیر کرانا البتہ ایک بعد کا واقعہ ہے۔

چونکہ مقدمات ہر قسم کے پیش ہوتے ہیں اس لئے ان کے تصفیے کے لئے ماہرین کی امداد حاصل کرنی ضروری ہوتی ہے۔ تعمیرات،[۳] غلے[۴] اور زرعی پیداوار کا اندازہ، قیافہ شناسی[۵] اور اسی طرح کے چند چیزوں کے ماہر خود عہد نبوی میں عدالتی اغراض کے لئے بر سر موقع بھیجے جایا کرتے تھے اور ان کے رائے پر آنحضرت فیصلہ کرتے اور فیصلہ نافذ کراتے۔

قاضی کا تقرر شروع سے مرکزی حکومت سے متعلق رہا ہے خاص کر صوبوں کے صدر قاضی، البتہ بعض بیانات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت علیؓ اور خود حضرت عمر اپنے گورنروں کو اجازت دیتے تھے کہ اپنے علاقے میں حسب ضرورت حکام عدالت خود مقرر کریں اور انھیں کافی تنخواہ دے کر مستغنی بنا دیں۔[۶]

قاضیوں کا سخت غصے کی حالت میں فیصلے نہ کرنا، پیچیدہ مقدموں میں مشورے کرنا، جھوٹے دعوے، جھوٹی شہادت و جانبدارانہ فیصلوں پر سخت وعیدیں، رشوت اور سفارش کی ممانعت، مبہم فیصلوں و تضاد القضائین، کی ممانعت وغیرہ امور زیادہ تر ادب القاضی[۷] سے متعلق ہیں۔ ان پر اس مختصر اشارے کے بعد ایک اہم تر چیز کا ذکر کیا جاتا ہے:۔

عدل گستری کے لئے حق و ناحق میں امتیاز کرنے کے لئے ایک معیار یعنی قانون کی ضرورت ہوتی ہے تاکہ فیصلوں میں ہر حکم

---

[۱] کتاب الاذکیا، مخطوطہ باڈلیئن، ورق ۲۳ ب نیز دیکھئے کتاب المقارنات صفحہ (۱۹)

[۲] بحوالہ کتانی ج (۱) صفحہ (۱۷۱)　　[۳] (بصیر یا بنا) کتانی ج (۱) صفحہ (۲۸۰ تا ۲۸۱)

[۴] اخراص، کتاب الاموال لابی عبید فقرہ ۱۴۳۵ تا ۱۴۹۶، نیز بکثرت حوالے۔

[۵] الطرق الحکمیۃ لابن القیم صفحہ (۱۹۶)۔ مزید حوالوں کے لئے کتاب مفتاح کنوز السنۃ۔ تحت لفظ "قاف"

[۶] الکتانی۔ التراتیب الاداریہ ج اص (۲۶۰)

[۷] علاوہ فقہی کتابوں کے "باب ادب القاضی" کے شاہ ولی اللہ صاحب کی حجۃ اللہ البالغۃ ج (۲) صفحہ (۲۴ تا ۲۷) "القضا" ملاحظہ ہو۔ نیز مفتاح کنوز السنۃ تحت لفظ "قضا"

بلسانی رہے اور لوگوں کو اپنے حقوق و فرائض پہلے ہی سے معلوم رہیں۔ اور ساتھ ہی ان احکام کی خلاف ورزی کے لئے ایک مدارک اور ایک تہدید بھی مقرر کر دی جائے تاکہ ان کی پابندی زیادہ سے زیادہ ہو سکے۔

تدارک کے لئے عام طور پر صرف حکومت کی قوت کام میں لائی جاتی ہے لیکن پوشیدہ جرائم خاص کر جھوٹی تاویلوں کی اس سے روک تھام نہیں ہوتی۔ اس لئے اسلام نے برائیوں کی اصل جڑ پر وار کیا اور احکام کو ایک تقدس دے دیا تاکہ ہر فرد رعیت خوف سے نہیں بلکہ برضا و رغبت اور نہ صرف ظاہر بلکہ باطن میں حکومت کی دار و گیر سے بالکل باہر بھی، ہر جگہ اپنے فرائض بجالائے اور جرم اور گناہ سے بچے۔ حشر و حساب کا عقیدہ بھی اس کو موثر بنانے میں بڑا حصہ لیتا ہے۔ مطلب یہ کہ اسلامی نقطۂ نظر سے مقنن اصلی اور سرچشمۂ احکام صرف خدائے حکیم و قدیر کی ذات ہے جس کا کوئی حکم نامناسب یا ظالمانہ نہیں، جو انسانوں کے مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر کے ان کے اعمال کا حساب و کتاب لے گا اور اس کے مطابق سزا یا جزا دے گا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ایک پیغمبر تھے اور خدا کا پیغام بندوں تک پہنچاتے تھے اپنے دل سے کچھ نہیں کہتے تھے وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحیٰ[۱]۔

غرض خدا نے اپنے احکام کچھ تو اپنی کتاب[۲] یعنی قرآن کی صورت میں دئے جو ابتدائے اسلام سے تھوڑا تھوڑا نازل ہو کر آنحضرتؐ کی زندگی میں مکمل ہو گیا۔ اس کے سوا کچھ اور احکام آنحضرتؐ کے قول و فعل کے ذریعے پہنچائے گئے اور قرآن ہی میں ان کے واجب التعمیل ہونے کی صراحت کر دی گئی[۳]۔

یہ تو راست قانون سازی تھی۔ فقیہ، مجتہد، قاضی، وغیرہ اسی قانون موضوعہ کے پابند ہوتے ہیں گو جیسا کہ حضرت معاذ بن جبل گورنر کے سلسلہ میں بیان کیا گیا کہ اجتہاد اور صوابدید نیز استحسان کے لئے گنجایش رکھ کر قانون میں ضروری لچک پیدا کر دی گئی۔

قرآن و حدیث اور آرائے مجتہدین یعنی اجماع و قیاس سے قانون اسلام کا انتخاب، استنباط، تدوین اور ترقی اس وقت ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ البتہ اس مختصر خاکے کے آخر میں ان حقوق اساسی کا ذکر بے محل نہ ہوگا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع (سنہ ۱۰ھ) کے موقع پر اپنے جبل الرحمۃ کے مشہور پہاڑی خطبے[۴] میں حلقہ بگوشان اسلام کے لئے مقرر فرمائے۔ یہ خطبہ مسلمانوں

---

[۱] قرآن سورہ نجم آیت ۳

[۲] کتاب کے معنی "فرض مقررہ" کے بھی ہیں۔

[۳] قرآن ۲۲:۲۱-۵۹:۷، وغیرہ

[۴] پورے متن کے لئے دیکھئے ابن ہشام صفحہ (۹۶۸ تا ۹۷۰)، تاریخ طبری صفحہ (۱۷۵۳ تا ۱۷۵۵)، البیان والتبیین للجاحظ ج (۲) صفحہ ۱۴ تا ۲۹، تاریخ یعقوبی ج (۲) صفحہ (۱۲۲ تا ۱۲۳)، عقد الفرید لابن عبد ربہ باب خطب وغیرہ وغیرہ

کی تاریخ تمدن میں ایک منشور انسانیت کا کام دیتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے :-

—— ہر شخص کے تین بنیادی حقوق۔ جان مال اور عزت محفوظ اور قابل احترام ہیں۔

—— امانت اور قرض واپس ادا کئے جائیں۔

—— زمانۂ جاہلیت کا سود ممنوع کیا جاتا ہے اور فی الوقت واجب الادا سود بھی نہیں دلائے جائیں گے۔ صرف اصل واپس ملے گا۔ خود حضرت عباس کے سود بھی کالعدم کئے جاتے ہیں۔

—— زمانۂ جاہلیت میں کئے ہوئے خون لوگ اب بھول جائیں اور ان کے بدلے اور انتقام کا خیال نہ کریں خود آنحضرت اپنے چچازاد بھتیجے کا خون معاف کرتے ہیں۔

—— زمانۂ جاہلیت کے تمام آثار مٹا دئے جاتے ہیں سوائے خانہ کعبہ کی تولیت اور حاجیوں کے پانی کے انتظام کے۔

—— قتل عمد میں قصاص لیا جائے گا، اور شبہ عمد میں سو اونٹ خون بہا لیا جائے گا۔

—— سال کبیسہ کی تقویم برخاست کی جاتی ہے۔ اور قمری سنہ رائج کیا جاتا ہے جس میں بارہ مہینے ہوتے ہیں

—— میاں اور بیوی کے ایک دوسرے پر حق ہوتے ہیں شوہر کا حق یہ ہے کہ بیوی پاکدامن رہے اور ان لوگوں کو گھر میں داخل ہونے نہ دے جن کو شوہر ناپسند کرتا ہے۔ بیوی کا حق یہ ہے کہ شوہر اسے اچھا کھلائے اور پہنائے اور اچھا برتاؤ کرے۔

—— سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں بلا رضامندی کوئی کسی کا مال نہ لے۔ اور نہ آپس میں لڑائی کیجے

—— میں تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑے جاتا ہوں جب تک تم ان کو تھامے رہوگے، تم بھٹکوگے نہیں۔ وہ قرآن اور سنت ہیں اور میں تمہیں اپنے اہل بیت سے سلوک کے متعلق بھی یاددہانی کرتا ہوں۔

—— سب لوگوں کا رب بھی ایک ہی ہے اور سب آدمیوں کا باپ بھی ایک ہی ہے تم آدم سے ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ خدا کے نزدیک تم میں سب سے محترم وہی ہے جو سب سے زیادہ متقی ہو۔ ورنہ کسی عرب کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں۔

—— وراثت کے لئے حصے خدا نے مقرر کر دئے ہیں، وصیت ایک تہائی مال سے زیادہ کی روا نہیں

بچہ فراش (عورت) کا ہوگا اور زانی کو پتھر ملیں گے۔

نسب اور ولا میں جھوٹے دعوے اور کوششیں ایک ملعون فعل ہیں۔

یہ ایک سرسری خاکہ ہے جو ابتدا، اسلام کے زیادہ تر طرز عمل ونظائر کی روشنی میں مرتب کیا گیا ہے اور یہی طرز عمل بعد کے زمانوں میں ہمیشہ تمام دنیائے اسلام کے لئے ایک قابل عمل نمونے اور ایک واجب التعمیل نظیر اور حکم کا کام دینے لگا۔ اسلامی تصور عدل کے متعلق چند قرآنی آیتوں کی تلاوت سے اسے ختم کرتا ہوں۔

إن الله يامر بالعدل والاحسان (خدا عدل اور نرمی ونیکی کا حکم دیتا ہے) ولا يجرمنكم شنان قوم على الا تعدلوا اعدلوا هو اقرب للتقوى (کسی کے بغض کی وجہ سے تمہیں ناانصافی پر آمادہ نہیں ہونا چاہئے بلکہ عدل کرنا چاہئے جو پرہیزگاری کا تقاضا ہے) جزاء سيئة سيئة مثلها فمن عفا واصلح فأجره على الله (برائی کا بدلہ برابر کی برائی سے دیا جاسکتا ہے لیکن اگر کوئی معافی دیدے اور نیکی کرے تو خدا اس کا اجر دے گا) وإن عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم به ولئن صبرتم لهو خير للصابرين (اگر بدلہ لینا چاہو تو ہر جے کے برابر کا بدلہ لو لیکن اگر صبر کرو تو یہ بہتر ہے)۔

محمد حمید اللہ



وہاں

اُفق کے پار سُنتے ہیں کہ اک رنگین دُنیا ہے

وہاں بادِ صبا منھ چومتی ہے کوہساروں کے   شباب انگڑایاں لیتا ہے دامن میں بہاروں کے
وہاں شعلے لئے پھرتی نہیں برق اپنے دامن میں   سکوں کی نیند سوتے ہیں وہاں طائر نشیمن میں
وہاں مرآتِ حُسن و عشق میں قدرت سنورتی ہے   سنہری وادیوں میں شاہدِ فطرت نکھرتی ہے
ترنم رقص کرتا ہے وہاں کے آبشاروں میں   تبسم کھیلتا پھرتا ہے رنگیں مرغزاروں میں

اُفق کے پار سُنتے ہیں کہ اک رنگین دنیا ہے

وہاں دامانِ گردوں میں فضائیں مسکراتی ہیں   بکھر کر کوہساروں پر گھٹائیں مسکراتی ہیں
وہاں شیرازۂ رازِ سکوں برہم نہیں ہوتا   وہاں ناکامیٔ تقدیر کا ماتم نہیں ہوتا

وہاں ہوش و خرد پر مستیاں چھائی سی رہتی ہیں سدا بامِ فلک پر بدلیاں چھائی سی رہتی ہیں
سرور و کیف ہوتا ہے وہاں کی داستانوں میں وہاں موسیقیاں بستی ہیں الفت کے فسانوں میں
اُفق کے پار سنتے ہیں کہ اک رنگین دنیا ہے

وہاں بربط کے دامن میں انوکھے گیت سوتے ہیں رباب دل کے تاروں میں سُریلے گیت سوتے ہیں
محبت کو وہاں رسوائیوں کا ڈر نہیں ہوتا وہاں دامن سرشک چشم نم سے تر نہیں ہوتا
خزاں کی بدلیاں گلزار پر چھانے نہیں پاتیں نشیمن کو جلانے بجلیاں آنے نہیں پاتیں
بہت رنگیں وہاں کی داستانِ زندگانی ہے وہاں منزل نشیں ہر کاروانِ زندگانی ہے
اُفق کے پار سنتے ہیں کہ اک رنگین دنیا ہے

وہاں بہتے ہوئے دریا مسلسل گنگناتے ہیں وہاں راتوں کی خاموشی میں انجم مسکراتے ہیں
حیا کی گود میں چھپ کر وہاں سوتے نہیں جلوے نظر افروز ہو کر پھر نہاں ہوتے نہیں جلوے
وہاں نغمے نکلنے کے لئے بیتاب رہتے ہیں نفس کے تار لرزاں صورتِ مضراب رہتے ہیں
وہاں موسیقیوں میں جذب ہو جاتی ہے خاموشی وہاں نغموں کے ہنگاموں میں کھو جاتی ہے خاموشی
اُفق کے پار سنتے ہیں کہ اک رنگین دنیا ہے

علی احمد (عثمانیہ)

موضع ہنگنٹہ کی معاشی تحقیق

فاضل مقالہ نگار نے اس مضمون کو جس تحقیق و تفتیش اور محنت و کاوش سے لکھا ہے اس کا اندازہ وہی لوگ کر سکیں گے جو اس دلچسپ مقالہ کو شروع سے آخر تک پڑھنے کی زحمت گوارا کریں گے۔ یہ مقالہ "بزم معاشیات" جامعہ عثمانیہ کے روبرو مضمون نگاری کے مقابلہ میں پیش کیا گیا تھا اور اس کو ۱۳۴۶ف کے "میکنزی انعام" کا مستحق قرار دیا گیا۔ کاش ہمارے دوسرے برادران جامعہ کو بھی اس قسم کے تعمیری اور اصلاحی مضامین لکھنے کی ترغیب ہو جن پر قوم و ملک کی ترقی کا بہت کچھ انحصار ہے

مدیر

محل وقوع موضع ہنگنٹہ تعلقہ و ضلع گلبرگہ سمت مٹواری میں دور بہمنی کی ایک قدیم آبادی ہے جس کے شمال میں موضع ترن ہلی، جنوب میں دریائے کاگنا اور موضع کنور، مشرق دریائے کاگنا اور موضع انگلگی اور مغرب میں موضع کٹہلی واقع ہیں۔ ہنگنٹہ جی آئی پی ریلوے کے اسٹیشن شاہ آباد سے بجانب جنوب اور اسٹیشن وڑی جنکشن سے بجانب مغرب تقریباً پانچ میل کے فاصلہ پر دریائے کاگنا اور دریائے بھیما کے سنگم پر واقع ہے۔

رقبہ موضع کا مجموعی رقبہ (۱۰۰۱) ایکر ۸ گنٹہ، رقبۂ مزروعہ (۳۴۷و۹) ایکر اور رقبہ غیر مزروعہ (۶۲۲) ایکر ہے۔

آبادی از روے مردم شماری ۱۳۴۰ف موضع ہذا کی آبادی جملہ (۷۵۴) خاندان یا (۱۶۳۲) نفوس پر مشتمل ہے۔ جس میں (۲۳۲) خاندان یا (۱۲۴۰) نفوس ہندو، (۸۹) خاندان یا (۵۸۲) نفوس مسلمان اور (۳۶) خاندان یا (۱۴۳) نفوس اچھوت ہیں۔ بہ لحاظ مذاہب موضع کی مجموعی آبادی کا (۷۵،۳۳) فیصد حصہ ہندو، (۹۱،۲۶) فیصد حصہ مسلمان اور (۷۷،۱۵) فیصد اچھوتوں پر مشتمل ہے۔

ذکور و اناث بلحاظ ذکور و انات (۱۶۳۲) نفوس کے (۶۲۴) مرد، (۶۲۳) عورتیں، (۳۲۰) لڑکے، اور (۳۹۲) لڑکیاں ہیں۔ جس میں سے کتخدا مرد (۵۴۴)، بے زن مرد (۹۰)، کتخدا عورتیں (۵۴۴)، بیوائیں (۱۰۹)، شادی شدہ لڑکے (۳۵) اور بیاہی لڑکیاں (۱۱۰) ہیں۔ گویا منجملہ (۶۲۴) مردوں اور (۳۲۰) لڑکوں کے (۵۵،۹) فیصد مرد کتخدا، (۸،۱) فیصد بے زن اور (۵،۳۷) فیصد کنوارے ہیں۔ اور منجملہ (۶۲۳) عورتوں اور (۳۹۶) لڑکیوں کے (۵۷،۵) فیصد کتخدا اور (۱۶) فیصد بیوہ اور (۲۵،۶) فیصد کنواری ہیں۔

شادیاں مندرجہ بالا اعداد و شمار میں کتخدا مردوں اور عورتوں کی تعداد سے ہندوستانی دیہی زندگی کی ایک عام عمرانی خصوصیت کا پتہ چلتا ہے کہ اہل دیہہ کے نقطۂ نظر سے کسی مرد کا سن بلوغ پر پہنچ جانے کے بعد متاہل زندگی اختیار کرنے میں توقف خانہ آبادی سے انکار کے مرادف ہے۔ رسم و رواج کے مطابق والدین اس بات کے پابند ہیں کہ اکثر صورتوں میں بلوغ سے کچھ مدت قبل اور بصورت مجبوری بلوغ سے فوراً ہی بعد اپنی لڑکیوں کو بیاہ دیں۔ بالغ لڑکیوں کا بے بیاہی گھر میں رہنا عیب سمجھا جاتا ہے۔ دوران تحقیق میں اس امر کا انکشاف ہوا کہ اکثر صورتوں میں ہندو لڑکی کی شادی کی عمر (۱۱) سال اور مسلمان لڑکی کی (۱۳) سال ہے۔ چنانچہ موضع میں شاید ہی کوئی ہندو بالغ لڑکی اور شاذ و نادر صورتوں میں کوئی بالغ مسلمان لڑکی بے بیاہی ہو چونکہ آبادی کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ یہاں کی آبادی بھی ازدواج کمسنی کی خوب صورت بلا کے آہنی چنگل سے آزاد نہیں ہے۔ اور یہ ایک واقعہ ہے کہ ان کی پست حالت جسمانی کے دیگر اسباب میں کمسنی کی شادی ایک اہم سبب ہے۔ قبل از وقت تعلقات ازدواجی

[1] بذات خود کی گئی۔

کے قائم ہو جانے سے فریقین کے جسمانی نشو و نما کے رُک جانے اور مریض و ناتوان اولاد کے پیدا ہونے کے علاوہ جو بجائے خود معاشی اعتبار سے مضرت رساں ہیں افرادِ خاندان میں نامناسب اضافے کے سبب موجودہ پست معیارِ زندگی پست تر ہو جاتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک بدیہی بات ہے کہ مزارعین کی قلیل المقدار آمدنیاں کثیر التعداد اولاد کی پرورش کے بارِ عظیم کی متحمل نہیں ہو سکتیں۔

صحت عامہ دیہی باشندوں کے انحطاطِ جسمانی میں ان کے ناپاک اور گندہ طرزِ سکونت کو بڑا دخل ہے۔ ہنگلنہ و درِ بھہلنیہ کی آبادشدہ بستی ہے۔ ویران کھنڈروں کے علاوہ صرف قابلِ سکونت دکانوں کی تعداد (۳۶) بمقابلہ (۵۰، ۴۵) خاندان ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ متعدد گھر یا تو بے چراغ ہیں یا کسی نے اُن میں چارہ اور بوسیدہ سامان بھر دیا ہے۔ کھنڈروں کی کثرت کی وجہ سے آبادی گندی اور غیر صحت بخش ہو گئی ہے۔ چند خوشحال خاندانوں سے قطع نظر دیگر خاندانوں کے مکانات کی حالتِ صفائی افسوسناک ہے۔ ان کے مکانات نہ صرف تنگ و تاریک ہیں بلکہ گنجان بھی۔ آبادی کے بعض حصے ایسے ہیں جہاں دو رویہ مکانات کے درمیان تین چار فٹ سے زیادہ راستہ نہیں ہے۔ انھیں تنگ گلیوں سے مزارعین کی خود بھی آمد و رفت رہتی ہے اور اُن کے مویشی بھی انھیں راستوں سے گذرتے ہیں۔ بستی کی غلیظ حالت کی وجہ سے یوں بھی ہوا ناپاک رہتی ہے مگر ان تنگ گلیوں کے ساکنین جب تک گھروں میں ہوتے ہیں اس گندی ہوا سے بھی تقریباً محروم رہتے ہیں۔ موضع کے مختلف حصے تدریجی نشیب و فراز میں آباد ہیں۔ زمانہ بارش میں جب گندہ پانی اِن تنگ گلیوں میں بہتا پھرتا ہے تو ان پر بدروؤں کا شبہ ہونے لگتا ہے۔

مزارعین اپنے مویشی بالعموم مکانوں کے صحن میں باندھتے ہیں۔ اگر صحن نہ ہوا تو مکان کا ایک گوشہ مویشیوں کے لئے مختص کر دیا جاتا ہے جن کی وجہ سے مکانات متعفن رہتے ہیں۔ مویشیوں کے فضلے سے نہ صرف سارا مکان بھرا ہوتا ہے بلکہ ہوا کی آمد و رفت کی جو راہیں دیواروں اور چھتوں میں رہ بھی جاتی ہیں دیہاتی عورتیں اوپلے تھوپ تھوپ کر انھیں بھی مسدود کر دیا کرتی ہیں۔

موضع کے پیدائشیں اور اموات کے اعداد و شمار دستیاب نہیں ہو سکے تاہم مندرجۂ ذیل اعداد و شمار سے صحت عامہ کا ایک دھندلا سا خاکہ پیش نظر ہوتا ہے:۔

(خاکہ ملاحظہ ہو صفحۂ آئندہ پر)

سولہ سال سے کم عمر بچوں کی تعداد

سنہ ۱۳۳۰ ف

	عمر	لڑکے	لڑکیاں
	ایک سال یا اس سے کم	۲۵	۳۰
(۱)	ایک سال سے زیادہ پانچ سال تک	۱۱۰	۶۰
	پانچ سال سے زیادہ پندرہ سال تک	۲۱۶	۳۵۰

سنہ ۱۳۴۰ ف [۱]

	عمر	لڑکے	لڑکیاں
	ایک سال سے زیادہ یا اس سے کم	۱۳۸	۱۲۷
(۲)	ایک سال سے زیادہ پانچ سال تک	۶۵	۲۵
	پانچ سال سے زیادہ پندرہ سال تک	۶۰	۴۶

سنہ ۱۳۴۶ ف [۲]

	عمر	لڑکے	لڑکیاں
	ایک سال سے زیادہ یا اس سے کم	۳۵	۲۹
(۳)	ایک سال سے زیادہ پانچ سال تک	۱۱۰	۱۳۴
	پانچ سال سے پندرہ سال تک	۲۴۶	۲۵۸

---

۱ حاصل کردہ از دفتر دیہی

۲ از مردم شماری سنہ ۱۳۴۶ ف جو بذات خود کی گئی۔

صحت عامہ کے اندازہ کرنے میں مندرجہ ذیل جدول بھی مفید مطلب ہوسکتا ہے جس میں موجودہ آبادی کی تقسیم بلحاظ عمر کی گئی ہے :-

عمر	مرد	عورت
سولہ تا بیس سال	۹۵	۱۲۵
اکیس تا تیس سال	۱۸۹	۲۳۳
اکتیس تا چالیس سال	۱۹۱	۱۰۸
اکتالیس تا پچاس سال	۸۳	۱۰۱
اکیاون تا ساٹھ سال	۴۰	۵۲
ساٹھ سے زیادہ	۳۱	۳۷

آبادی کی حالت مستقل ہے

سنین ماضیہ[1] میں آبادی کی حالت درج ذیل ہے :-

سنہ ۱۳۱۰ف " " " " " " (۲،۲۳۴)

سنہ ۱۳۲۰ف " " " " " " (۲،۲۳۶)

سنہ ۱۳۳۲ف " " " " " " (۲،۱۴۸)

سنہ ۱۳۴۶ف[2] " " " " " " (۲،۱۶۳)

یعنی گذشتہ (۳۵) سال کی مدت میں موضع کی آبادی کم و بیش قائم ہی رہی۔ اور ظاہر ہے کہ بچوں کی اس کثیر تعداد کا لحاظ کرتے ہوئے جو اوپر درج کی گئی ہے یہ حالت بہر طور افسوسناک ہے۔ اس سے سوائے اس کے اور کیا نتیجہ

[1] سنہ ۱۳۱۰، سنہ ۱۳۲۰، سنہ ۱۳۳۲ف کے اعداد و شمار دفترِ تحصیل تعلقہ گلبرگہ سے حاصل کئے گئے۔

[2] سنہ ۱۳۴۶ف کے اعداد و شمار بذاتِ خود مردم شماری سے ماخوذ ہیں۔

نکالا جاسکتا ہے کہ ہر سال آبادی میں جس قدر اضافہ بذریعہ پیدائش ہوا اسی قدر تخفیف بذریعہ اموات ہوتی رہی اور آبادی پینتیس سال پیشتر جتنی تھی اتنی ہی رہ گئی۔

موجودہ حالات کے اعتبار سے فی مربع میل مزروعہ زمین پر (۴۷،۴) افراد کی بسر اوقات ہو رہی ہے۔ حالانکہ ماہرین کی رائے میں "اگر ایک آبادی اپنے وسائل قدرت سے بدرجہ اتم استفادہ کرے تو (۲۵۰) نفوس فی مربع میل کی پرورش ہوسکتی ہے"[1] مقامی حالات کے مدنظر بہرحال اس کی گنجایش باقی ہے کہ نہ صرف موجودہ افراد ہی کی پرورش معقول معیار پر ہوسکتی ہے بلکہ اس میں مزید اضافہ سے بھی تشویشناک صورت حال کے پیدا ہوجانے کا احتمال نہیں ہے بشرطیکہ "وسائل قدرت سے استفادۂ اتم" کی شرط پوری ہو۔

ذرائع معاش

اہالیان موضع کے ذرائع معاش زیادہ تر زراعت، مزدوری اور صنعت و حرفت پر مشتمل ہیں۔ صرف (۲) خاندان یا (۳۰) نفوس کا ذریعۂ معاش سرکاری ملازمت مثل مدرسی یا پٹیل گیری ہے۔

صنعت و حرفت صنعت و حرفت سے (۱۲) خاندان یا (۵۷) نفوس آذوقہ حیات پا رہے ہیں جس میں (۶) خاندان یا (۲۲) نفوس پارچہ بافی، (۴) خاندان یا (۱۹) نفوس نجاری، (۳) خاندان یا (۱۷) نفوس رنگریز (۱) خاندان یا (۱۰) نفوس لوہاری، (۱) خاندان یا (۴) نفوس خیاطی، ایک خاندان یا (۳) نفوس گلی ظروف سازی میں مصروف ہیں۔ مزید براں دھنگروں کے سات خاندانوں کا ذریعۂ معاش کمبل بافی بھی ہے۔

موضع کے سن رسیدہ باشندوں کی زبانی معلوم ہوا کہ یہ موضع کسی زمانہ میں بھی کسی خاص صنعت کے لئے مشہور نہ تھا۔ یہاں کی صنعتیں تمام تر دیہی نوعیت کی چلی آتی ہیں۔ چنانچہ جن (۶) خاندانوں میں پارچہ بافی ہوتی ہے اس سے پیشتر مقامی ضروریات کے لئے معمولی پارچہ کی فراہمی مقصود ہوتی ہے۔ ان پارچہ بافوں کے آلات قدیم طرز کے ہیں۔ سوت کی فراہمی رنگم پیٹھ، یادگیر یا شولاپور سے ہوتی ہے۔ نجار اور لوہار بھی قدیم وضع کے آلات استعمال کرتے ہیں۔

زراعت یوں تو مندرجۂ بالا اہل حرفہ اور ملازمین سرکاری کے علاوہ جملہ آبادی کی روزی کا انحصار کسی نہ کسی صورت

[1] معاشیات ہند مصنفہ جبتار دبیری صاحبان صفحہ (۴۰)

سے زراعت پر ہے۔ لیکن ایسے افراد کی تعداد جن کا ذریعہ معاش خالص زراعت ہے (۷۹۸) ہے اور ایسے افراد جن کا اصل پیشہ تو مزدوری یا اور کچھ ہے لیکن ذیلی طور پر زراعت کرتے ہیں (۴۰۹) ہیں۔ مزید برآں (۲۷۰) ایسے افراد بھی موجود ہیں جن کا اصل پیشہ تو زراعت ہے لیکن ذیلی طور پر مزدوری کرتے ہیں۔ گویا بہ حیثیت مجموعی (۱۴۷۷) افراد یا کل آبادی کا ۶۷٫۲۰ فیصد حصے کی گزر اوقات زراعت پر ہوتی ہے۔

مخفی مباد کہ (۵۱۴) افراد ایسے بھی ہیں جن کا تعلق زرعی مزدوری سے ہے اور یہ مجموعی آبادی کا (۲۳٫۲۵) فیصد جزو ہیں۔ یہ مزدور پیشہ آبادی ایسی ہے جن کے قبضہ میں چپہ بھر مزروعہ زمین بھی نہیں ہے ورنہ جن اشخاص کی ملکیت میں (۲) یا (۱½) ایکڑ آراضی بھی ہے انھیں ہم نے ذیلی زراعت میں شمار کر لیا ہے۔

سطور بالا میں زراعت پیشہ آبادی کے تناسب کے تخمینہ میں صرف انھیں افراد کا شمار کیا گیا تھا جو زراعت کو بطور خاص اصل یا ذیلی پیشہ کے اختیار کئے ہوئے ہیں۔ ورنہ موضع کی مزدور پیشہ آبادی کی زندگی اور موت بھی زراعت ہی کے دامن سے وابستہ ہے۔ اور اس نقطۂ نظر سے زراعت پر گزر بسر کرنے والوں کی تعداد (۱۴۷۷) سے بڑھ کر (۱۹۹۱) اور زراعت پیشہ آبادی کا تناسب (۶۷٫۲۰) کی بجائے (۹۲) فیصد ہو جاتا ہے۔ آبادی کے اس طرح کُلّی یا جزئی طور پر زراعت میں مشغول رہنے سے ہماری دیہی زندگی میں زراعت کی غیر معمولی اہمیت کا ثبوت ملتا ہے۔

جدول ذیل میں موضع کے ذرائع معاش کی وضاحت کی گئی ہے۔

	نام پیشہ	افراد	فیصد تناسب
۱	زراعت خالص	۷۹۸	۳۶٫۰۰
۲	اصل زراعت دیگر ذیلی	۲۷۰	۱۲٫۵
۳	اصل مزدوری وغیرہ ذیلی زراعت	۴۰۹	۱۸٫۹
۴	مزدوری خالص	۵۱۴	۲۳٫۳

زمین | مزارعین کی مرفہ الحالی کا مدار بڑی حد تک زمین، مویشی، آلات زرعی، تخم، کھاد، اور ذرائع آب پاشی پر ہے۔

چنانچہ ہم بھی اسی ترتیب سے یہاں پر غور کریں گے۔

زمین کے متعلق یہاں زمین کی اُن قسموں کا بیان خالی از دلچسپی نہ ہوگا جو کسانوں نے بہ لحاظ زرخیزی و نوعیت زمین مقرر کر رکھی ہیں:۔

۱۔ ہوسیل یا پل زمین:۔ وہ سیاہ رنگ ریتیلے ذرات آمیز زمین جو سب سے زیادہ زرخیز سمجھی جاتی ہے۔ اور جوار، گیہوں، چنے کے لئے خاص طور پر موزوں خیال کی جاتی ہے۔

۲۔ ریگڑ:۔ وہ سیاہ زمین جو کتھے کی مانند نہایت نرم ہوتی ہے۔ جس میں پانی جذب ہونیکے بعد اوپر کی سطح تو خشک ہو جاتی ہے لیکن تہ میں کیچڑ ٹھہری رہتی ہے۔ گیہوں اور کرڑ کے لئے بہت موزوں متصور ہوتی ہے۔

۳۔ کرل:۔ سیاہ رنگ چکنی مٹی۔ کپاس کے لئے عموماً اور کوٹیکل کپاس کے لئے خصوصاً موزوں ثابت ہوتی ہے۔

۴۔ ہاڑ:۔ یہ وہ زمین ہوتی ہے جو کسی گاؤں کی آبادی کے اُٹھ جانیکے بعد زیر کاشت لائی جاتی ہے۔ اس کا رنگ راکھ کی مانند بھورا ہوتا ہے۔ تمباکو، مرچ، برنی اور کنگنی کے لئے موزوں پائی گئی ہے۔

زمین کے متعلق یہاں یہ واضح کر دینا مناسب ہے کہ موضع کی زمینیں بلحاظ زرخیزی بحالت موجودہ یاس انگیز ہیں بلکہ واقف کاروں کا خیال ہے کہ یہاں کی زمینات مرہٹواری کے کسی علاقہ سے خراب نہیں ہیں۔ شاید "ہن گنٹہ" کی وجہ تسمیہ بھی یہاں کی زمینوں کی زرخیزی ہی ہوئی ہو۔ کیونکہ کنڑی زبان میں "ہن" کے معنی خزانے کے ہوتے ہیں۔

تقسیم و انتشار آراضی

موضع کا مجموعی رقبۂ مزروعہ (۹۴۴۷) ایکڑ (۲۷) گنٹہ اور (۴۲۸) قطعات مزروعہ بہ اخراج قطعات انعامی پر مشتمل ہے بحقیت آراضی کے لحاظ سے مزارعین کی تین قسمیں ہیں:۔

۱۔ پٹہ دار جو اپنی زمین پر خود کاشت کرتا ہے اور کاشتکار کہلاتا ہے۔

۲۔ ایسا ہر وارث جو پٹہ دار کی اراضی میں حصہ پاتا ہے شکمیدار کہلاتا ہے۔

۳۔ جو کسان کسی پٹہ دار یا شکمیدار سے بعوض ایک مقررہ رقم کے ایک مدت معینہ کے لئے زمین کاشت پر لیتا ہے تو لدار کہلاتا ہے۔

تولداروں کی بھی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ وہ جو سالانہ معاوضہ بصورتِ نقد ادا کرے۔

۲۔ وہ جو کھیت کی سالانہ پیداوار کا ایک مقررہ حصہ مالکِ زمین کو ادا کرتے ہیں۔ اور باقی کے خود بمعاوضہ کاشت مالک ہوتے ہیں۔

سنہ ۳۰ف[1] میں تعداد پٹہ واران و شکمیداران بالترتیب (۲۴۵) اور (۸۱) تھی تو سنہ ۴۵ف میں (۲۴۹) اور (۷۹) ہوگئی گویا (۱۵) سال کی مدت میں پٹہ داروں میں صرف (۴) کا اضافہ ہوا تو شکمیداران میں (۲) کی کمی ہوگئی۔ اس طرح اس دوران میں آراضی کی تقسیم کا عمل بہت کم ہوا۔ لیکن یہاں یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ حقیقی کاشتکار صرف پٹہ دار و شکمیدار ہی نہیں ہوتے بلکہ تولدار بھی ہوتے ہیں۔ گو تولداروں کو آراضی کی بیع و شرع میں کوئی دخل نہیں ہوتا تاہم ان کی تعداد میں اضافہ سے حقیقی قطعاتِ مزروعہ کا رقبہ کمتر ہو جاتا ہے۔ چنانچہ سنہ ۳۰ف میں خود کاشتکار (۱۳۰) شکمیدار (۲۰) اور تولدار (۴۹) تھے تو سنہ ۴۵ف میں خود کاشت کار (۱۰۲) شکمیدار (۱۸) اور تولدار (۳۰) ہو گئے۔

تولداروں میں اس اضافہ کا اثر صرف اس رقبۂ آراضی پر ہوا ہے جس میں آراضیٔ انعام شامل نہیں ہے۔ موضع میں انعام داروں کو بہ لحاظ رقبۂ انعامی دو بڑی قسمیں ہیں ایک وہ جن کا رقبۂ انعامی وسیع ہے دوسرے وہ جن کا رقبۂ آراضی مختصر ہے۔ اعلیٰ طبقہ کے انعام داروں میں پٹیل، پٹواری اور اہلِ خدمات مذہبی شامل ہیں اور ادنیٰ درجہ میں گاؤں کے خدام اور چوکیدار۔ انعامی زمینوں کا رقبہ مجموعی (۲۹۸) ایکڑ ۱۱ گنٹہ ہے۔ پٹیل پٹواریوں کی انعامی آراضیاں کافی وسیع ہیں۔ لیکن گاؤں کے خدام کی انعامی زمینیں مختصر ہیں۔ چنانچہ از روئے پہانی پترک سنہ ۴۵ف۔ سروے نمبر ۲۳ کا رقبہ (۱۳) ایکڑ (۲۲) گنٹہ ہے جس میں (۱۰) سیت سندھی (چوکیدار) شامل ہیں

غرض انعامی زمینیں اور بالخصوص موضع کے ادنیٰ خدام کی انعامی آراضی سے قطع نظر جو چھوٹے چھوٹے قطعات پر مشتمل ہیں دیگر مزارعین کی زمینوں پر تقسیم آراضی کا عمل اس قدر شدید نہیں ہے جس قدر کہ دیگر مواضعات میں بالعموم پایا جاتا ہے۔

ہمارے اس بیان کی تائید مندرجۂ ذیل اعداد سے بھی ہوتی ہے۔

رقبہ قطعاتِ مزروعہ (بہ اخراج انعام)

ایک ایکڑ سے کم ... ... (۲۵)

[1] یہ اعداد و شمار دفترِ دیہی سے حاصل کئے گئے۔ افسوس کہ ان سے قدیم اعداد و شمار باوجود کوشش کے دستیاب نہ ہو سکے

ایک ایکر . . . . (۵۵)
۱ تا ۵ ایکر . . . . (۲۶)
۵ تا ۱۰ . . . . (۸۴)
۱۰ تا ۱۵ . . . . (۷۰)
۱۵ تا ۲۰ . . . . (۴۶)
۲۰ تا ۲۵ . . . . (۴۰)
۲۵ تا ۳۰ . . . . (۴۰)
۳۰ سے زیادہ . . . . (۳۴)

مویشی موضع کے کاشتکار خاندانوں کی تعداد (۲۸۰) ہے۔ اور جملہ رقبۂ مزروعہ (۴۷۴۹) ایکر (۲۷) گنٹہ ہے حسبِ جدولِ ذیل زرعی اغراض کے جانوروں کی موجودہ تعداد (۵۹۵) ہے۔ اس طور پر فی خاندان (۲) مویشی کا اوسط ہوتا ہے اور فی بیل یا بھینسا (۸۰ر۱۵) ایکر اراضی کا اوسط پڑتا ہے۔

تعداد مویشیاں

		زرعی		لدو		دودھ دینے والے		بچے		متفرق		
		بیل	جاموش	بیل	جاموش	گاے	بھینس	گاے	بھینس	گھوڑے	مینڈھے	بکریاں
۱	سنہ ۱۳۱۰ ف	۶۸۲	۷۲	۰	۰	۲۵۴	۱۶۰	۲۶۷	۱۶۳	۳۱	۱۹۲	۲۹۵
۲	سنہ ۱۳۲۰ ف	۶۶۷	۹۶	۰	۰	۱۹۶	۱۴۲	۲۰۱	۱۴۹	۲۴	۱۷۱	۱۷۱
۳	سنہ ۱۳۳۰ ف	۴۳۶	۱۶	۹۰	۵۰	۲۰۲	۱۳۰	۶۰	۸۰	۲۰	۵۵۵	۱۳۴
۴	سنہ ۱۳۴۰ ف	۵۴۵	۵۰	۱۵	۵۵	۲۳۵	۲۰۵	۱۰۰	۸۰	۱۵	۲۴۰	۲۶۰

مویشیوں کی پرورش اور چارہ کی فراہمی گاؤں کے مویشی بالعموم معمولی طور پر تنومند ہوتے ہیں۔ بعض خوشحال

کسانوں کے یہاں دیونی نسل کے بیل بھی ہیں۔ مویشیوں کی پرورش کا کوئی خاص انتظام نہیں ہے۔ دودھ دینے والے جانوروں کو جب تک وہ دودھ دیتے رہیں بالعموم دن میں دو مرتبہ آدھ آدھ سیر ہنولہ دیا جاتا ہے اور بعض خوشحال خاندانوں کھلی دی جاتی ہے۔ کھیت پر کام کرنے والے جانوروں کو تخم ریزی کے زمانہ میں دن میں دو مرتبہ دو دو سیر کھلی دیجاتی ہے۔ جوں ہی کھیتوں میں سبز چارہ دستیاب ہونے لگتا ہے کھلی کی مقدار میں کمی کر دی جاتی ہے۔ حتیٰ کہ جب کافی سبز چارہ ملنے لگتا ہے تو کھلی موقوف کر دی جاتی ہے گویا تخم ریزی کے بعد ایک مہینہ تک مویشیوں کو کھلی ملتی ہے۔ موسم گرما میں بھی جبکہ سبز چارہ دستیاب نہیں ہوسکتا زرعی جانوروں کو کھلی دی جاتی ہے۔

سبز چارے سے مراد گھاس اور جوار وغیرہ کے ایسے پودے ہیں جن میں بالیاں نکلنے کا امکان نہیں ہوتا۔ جنھیں دیہی اصلاح میں "باتک"[۱] کہتے ہیں۔ جب تک فصلیں ایستادہ رہتی ہیں اس قسم کا سبز چارا کھیتوں سے حاصل کر لیا جاتا ہے۔ پورے گاؤں میں ایک مثال بھی ایسے کاشتکار کی نہیں ہے جو مویشیوں کے لئے سبز چارے کی فصلیں اگاتا ہو اور جب سبز چارا کھیتوں سے دستیاب نہیں ہوتا تو مویشیوں کی خوراک میں دو خشک چارا استعمال ہوتا ہے جسے فصلوں کے کٹ جانے کے بعد محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ محفوظ کرنے کا طریقہ نہایت سہل اور معمولی ہے۔ زمین پر چارے کی تہیں بچھا دی جاتی ہیں۔ اور جب حسب منشا چارے کا ڈھیر لگ چکتا ہے تو اس ڈھیر کے چاروں طرف سے مٹی کے ڈھیلے کو دلئے جاتے ہیں اور ڈھیلوں سے چارے کا ڈھیر پوشیدہ کر دیا جاتا ہے۔ جانوروں سے محفوظ رکھنے کے لئے اس ڈھیر کے اطراف کانٹے لگا دیئے جاتے ہیں اس محفوظ ذخیرۂ چارہ کو دیہی اصطلاح میں "گھنی"[۲] کہا جاتا ہے اس ذخیرہ میں سطح زمین سے ملحقہ اور ان حصوں کا چارہ جن پر مٹی کے ڈھیلے رکھے جاتے ہیں سڑ گل جاتا ہے اس کی مقدار ناقابل لحاظ ہوتی ہے اور اس کو بطور کھاد استعمال کیا جاتا ہے۔

خشک چارے کی مقدار یوں معلوم ہوسکتی ہے کہ سال حال (۱۳۴۵ف) جوار کا رقبۂ زیر کاشت (۸۹۰) ایکڑ تھا مزارعین کے بیان کے مطابق فی ایکڑ (۵۰۰) پولے کڑبی کا اوسط رہتا ہے۔ اس حساب سے کڑبی کی مجموعی مقدار (۴۴۹۰۰۰) پولے رہی۔ جدول بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان مویشیوں کی تعداد جنھیں چارا دیا جاتا ہے (۱۴۰۰) ہے۔ اگر چارے کی اس مقدار کو منہا کر دیا جائے جو ذخیرہ اندازی میں سڑ گل جاتا ہے یا قرب وجوار کے بازاری مقامات میں لے جا کر فروخت کر دیا جاتا ہے تو باقی کڑبی کی مقدار تقریباً (۳۰۰۰۰۰) پولے رہ جاتی ہے۔

---

[۱] اردو میں اس قسم کے پودوں کو "چری" کہتے ہیں۔ مدیر

[۲] اردو میں چارہ کے اس ڈھیر کو گری کہتے ہیں۔ مدیر

مویشیوں کو سال میں صرف چھ ماہ خشک چارہ دیا جاتا ہے اس لحاظ سے فی جانور روزانہ کڑبی کا اوسط (۱۲) پولے ہوتا ہے

غرض یہ کہا جا سکتا ہے کہ موضع میں زرعی مویشی زائد از ضرورت نہیں ہیں۔ اور مویشیوں کے یومیہ چارہ کے اوسط کا لحاظ کرتے ہوئے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ موضع میں چارے کی کمی بالعموم نہیں رہتی۔ سبز چارہ کی فصلیں یہاں اس لئے نہیں اگائی جاتی ہیں کہ زمینیں کسی قدر زرخیز ہیں اور کسان کسی طرح اس بات پر آمادہ نہیں ہو سکتے کہ جس زمین سے انہیں پیداوار مل سکتی ہو اس کو چارے کی فصلوں میں مصروف رکھیں۔

زرعی مویشیوں کی اس قلت کی توجیہہ یہی ہو سکتی ہے موضع کی زمینیں ایک حد تک زرخیز ہیں۔ مزارعین کو دیگر مواضعات کی طرح بار بار ہل اور ناگر چلانے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ظاہر ہے کہ ناگر کے لئے کم از کم چار بیلوں کی ضرورت ہوتی ہے اور چونکہ موضع میں ناگر چلانے کی اتنی ضرورت نہیں ہوتی اس لئے زرعی مویشیوں کی تعداد بھی لازماً کم ہوتی ہے۔

تحقیق سے معلوم ہوا کہ امراض مویشی میں موضع کے لئے "انڈرلیسٹ" سب سے زیادہ مضرت رساں ہے۔ چنانچہ ۱۳۴۹ف میں (۴۳) مویشیوں کی ہلاکت کا سبب یہی انڈرلیسٹ تھا۔ دیگر امراض متعدی و غیر متعدی سے بھی مویشیوں کی کچھ نہ کچھ تعداد ضائع ہوتی رہتی ہے۔ امراض و اموات مویشی سے متعلق سنین ماضیہ کا حال اس لئے واضح نہیں کیا جا سکتا کہ دیہی دفتر میں رجسٹر اموات و پیدائش مویشی کا انتظام ۱۳۴۹ف سے ہوا۔ متعدی امراض کے شیوع پر پولس پٹیل کی اطلاع پر مستقر گلبرگہ سے علاج حیوانات کے ڈاکٹر آ کر مویشیوں کے ٹیکے لگاتے ہیں۔

آلات زرعی اور کھاد موضع میں قدیم وضع کے آلات زرعی رائج ہیں۔ جو گاؤں کے بڑھئی اور لوہار تیار کر دیتے ہیں۔ گاؤں کی زمینیں اگرچہ عمدہ قسم کی ہیں جس کی وجہ سے ان معمولی آلات زرعی سے بھی کافی پیداوار حاصل ہو جاتی ہے۔ اس کی وجہ سے مزارعین نے اپنے دقیانوسی آلات زرعی ہی کو موزوں رکھا ہے۔ حالانکہ اصلاح یافتہ آلات زرعی کے استعمال سے کثیر فوائد کے امکانات ہیں۔ چنانچہ گاؤں کے دو ساہوکاروں نے سال گذشتہ سے آہنی ناگروں کا استعمال شروع بھی کر دیا ہے۔

یہی حالت کھاد کے استعمال کی ہے زمین کی زرخیزی نے جاہل مزارعین کو کھاد کی جانب سے بے پروا کر رکھا ہے۔ چنانچہ گاؤں میں صرف وہی تین چار گھرانے کھاد جمع کرتے اور استعمال کرتے ہیں جن کے باغیچے ہیں۔ ورنہ مزارعین بالعموم

کھاد کے استعمال کو نہ صرف غیر ضروری بلکہ غیر مفید بھی خیال کرتے ہیں۔ مویشیوں کا فضلہ بالعموم ایندھن کے کام آتا ہے۔ اگر مزارعین نے کھاد کے استعمال کی جانب توجہ کی بھی تو فراہمی ایندھن کا سوال اہم ہو جاتا ہے۔ موضع کے قرب وجوار میں نہ کوئی جنگل ہے اور نہ کوئی پہاڑی کہ جہاں سے ایندھن کی لکڑی فراہم کی جاسکے۔ اور غریب مزارعین اس قدر سکت نہیں رکھتے کہ دیگر مقامات سے لکڑی خرید کر فراہم کر سکیں

لہذا مزارعین کی یہ غلط فہمی رفع کر دینی چاہئے کہ کھاد کے استعمال کے بغیر بھی ان کی زمینیں زرخیز رہتی ہیں۔ ان کا سب سے بڑا اعتراض استعمال کھاد کے متعلق یہ ہے کہ چونکہ یہاں آب پاشی کے ذرائع مفقود ہیں اس لئے کھاد استعمال کرنے سے ان کی فصلیں بجائے منفعت بخش ہونے کے جل جاتی ہیں۔ اس بارہ میں انھیں ملکی کھاد کے استعمال کی جانب متوجہ کرنا چاہئے جو ان کی زمینوں کے لئے موزوں ہو۔ انھیں اس بات کا یقین دلانا چاہئے کہ دوسرے مقامات میں جہاں ذرائع آب پاشی انھیں کی طرح مفقود ہیں مزارعین کھاد کے استعمال سے مستفید ہو رہے ہیں۔ جہاں تک ایندھن کا تعلق ہے ان پر یہ واضح کر دینا ضروری ہے کہ بصورت مجبوری جس قدر فضلہ ان کے ایندھن کی ضروریات سے زاید ہو اسے دیگر قسم کے کوڑے کرکٹ کے ساتھ جو فی الوقت بلکل ضائع جاتا ہے محفوظ رکھیں اور اسے حسب ضرورت بطور کھاد استعمال کریں۔ اس بارہ میں انھیں ہمارے محکمۂ زراعت کے مشورہ اور رہنمائی کی شدید ضرورت ہے جس سے اب تک موضع کے مزارعین بدقسمتی سے محروم ہیں۔

تخم موضع میں جو تخم استعمال ہوتے ہیں انھیں خود موضع میں فراہم کیا جاتا ہے۔ فراہمی تخم کا طریقہ شاید صدیوں سے یہی چلا آرہا ہے کہ ہر کسان فصل کے موقع پر تخم علحدہ نکال لیتا ہے جسے نیم کے پتوں میں ملا کر بھٹیوں میں محفوظ کر لیا جاتا ہے۔ جن غریب کسانوں کے پاس تخم نہیں ہوتے وہ دوسروں سے سوائی پر قرض لیتے ہیں اور فصل کے بعد حاصل کردہ مقدار تخم سے سوایا ادا کرتے ہیں۔ اصلاح یافتہ تخم کا رواج نہیں ہے۔ صرف چند مزارعین ایسے ہیں جنہوں نے گیہوں اور کپاس کے اصلاح یافتہ تخم دو سال قبل خرید کر استعمال کرنا شروع کیا۔

محکمۂ زراعت کی توجہ ابھی تک اس موضع کی جانب مبذول نہیں ہے محکمۂ زراعت کے کسی عہدہ دار نے موضع میں اصلاح زراعت کی نشر و اشاعت نہیں کی بلکہ مزارعین کا بیان ہے کہ جب انھوں نے تخم طلب کئے تو تین کاشتکاروں سے زیادہ کو عہدہ دار زراعت نے مفت تخم دینے سے انکار کر دیا۔ حالانکہ ابتداً ترغیب و تحریص اور پروپگنڈے کی خاطر

ضروری ہے کہ محکمۂ زراعت مزارعین میں مفت تقسیم تخم کا انتظام کرے۔ مزارعین کا یہ بھی بیان ہے کہ محکمۂ زراعت کے عہدہ دار جن کا مستقر گلبرگہ (موضع سے ۶۰ میل کے فاصلہ پر) ہے صرف انھیں مواضعات میں تقسیم تخم کا وعدہ کیا جو ریلوے لائن یا سڑک سے متصل ہوں۔ اتصال ریلوے یا سڑک کی یہ شرط کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔ غرض موضع میں محکمۂ زراعت کی توجہ کے بعد اصلاح یافتہ تخم اور آلات زرعی سے کثیر فوائد کے امکانات ہیں۔

آب پاشی موضع ہنگنٹہ ان مواضعات میں سے ہے جہاں کاشت کا دارومدار تمام تر بارش پر ہے۔ حالانکہ دریائے کاگنا موضع کے دو سمتوں یعنی جنوب اور مشرق میں بالکل موضع سے متصل بہتی ہے اور دریائے بھیما بھی جنوب کی جانب سنگم بناتی ہے لیکن ان کا وجود اغراض زرعی کے لئے بے فیض ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دریا نشیب میں بہتے ہیں اور اراضی کسی قدر بلندی پر واقع ہے کنویں ہیں جن میں سے سات تو منہدم ہیں تین آب نوشیدنی کے کام آتے ہیں اور صرف (۵) کنووں سے آب پاشی کا کام لیا جاتا ہے۔

ذرائع آب پاشی کے اسی فقدان کے باعث موضع میں تری کی کاشت نہیں ہوتی البتہ باغات کے تحت (۱۰) ایکر (۳۹) گنٹہ رقبہ ہے۔ بارش کا سالانہ اوسط تقریباً (۲۵") رہتا ہے اور اسی پر پیداوار کا انحصار ہے۔

اجناس زرعی موضع میں دو فصلیں ہوتی ہیں۔ ربیع اور خریف۔ پیداوار کا بڑا حصہ جوار پر مشتمل ہے۔ اس کے بعد تور، السی اور مونگ پھلی کا نمبر آتا ہے۔ ہر جنس کے مزروعہ رقبہ کا اندازہ نقشۂ ذیل سے ہوسکتا ہے۔

مجموعی رقبہ زیر کاشت در ۴۶ف	نام جنس	نمبر شمار
(۸۹۷) ایکر (۳) گنٹہ	جوار	۱
(۶۸۹) ایکر (۳۴) گنٹہ	تور	۲
(۲۷۴) ایکر	السی	۳
(۲۳۹) ایکر (۲۲) گنٹہ	مونگ پھلی	۴
(۶۰) ایکر (۱۷) گنٹہ	چنا	۵
(۱۴) ایکر (۲۰) گنٹہ	تل	۶

۷	گیہوں	(۱۳) ایکر (۲۹) گنٹہ
۸	کپاس	(۱۰) ایکر (۱۲) گنٹہ
۹	مرچ	(۴) ایکر (۲۰) گنٹہ
۱۰	رتالو	(۴) ایکر (۱۰) گنٹہ
۱۱	بینگن	(۳) ایکر (۸) گنٹہ
۱۲	کیلے	(۲) ایکر (۲۶) گنٹہ
۱۳	کرڑ	ایک ایکر (۳۱) گنٹہ
۱۴	نیشکر	ایک ایکر (۱۲) گنٹہ
۱۵	بھینڈی	ایک ایکر
۱۶	میتھی	(۳۰) گنٹہ
۱۷	دھنیہ	(۲۰) گنٹہ
۱۸	پیاز	(۹) گنٹہ
۱۹	گاجر	(۱۲) گنٹہ

جدول بالا سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہاں مزروعہ زمینوں کے بڑے حصے پر جوار کی کاشت ہوتی ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ مزارعین کی غذا کا بڑا جزو جوار ہی پر مشتمل رہتا ہے دوسرے زمین کی حالت اور مقدار بارش کا لحاظ کرتے ہوئے مزارعین اسی کو منفعت بخش سمجھتے ہیں۔ اجناس تجارتی میں السی اور مونگ پھلی کی کاشت ہوتی ہے۔ ترکے تحت یہی خاص رقبہ اس لئے ہے کہ اول تو آبادی کی غذا میں اس کو خاص اہمیت حاصل ہے اور دوسرے جن زمینوں پر مسلسل کئی سال سے کاشت ہوتی رہی ہو ان کی تقویت کے لئے مزارعین ایک آدھ سال تور بو دیتے ہیں۔

امراض فصول

فصلوں کی بیماریوں کے متعلق معلوم ہوا کہ ذیل کی بیماریاں نقصان رساں ہوا کرتی ہیں۔

۱۔ جوار کی تخم ریزی کے بعد ایک کیڑا پیدا ہو جاتا ہے جو زمین کے اندر ہی اندر تخم کو کھا جاتا ہے

یا پودے جب تک کہ بالشت کے ہوں ان کو کتر کر رکھ دیتا ہے۔

۲۔ وہ کیڑا جو جوار کے بھٹوں (بالیوں) کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے یا ڈنٹھل میں لگ کر پودے کو کمزور کر دیتا ہے۔

۳۔ ایک خاص قسم کا سبز رنگ کا کیڑا چنے کو لگتا ہے جو یا چنے کے دانوں کو کھا جاتا ہے یا پودے کو پتوں سمیت چٹ کر جاتا ہے۔

۴۔ ایک خاص قسم کا سفید رقیق مادہ اسی کے پودوں پر اس وقت نظر آنے لگتا ہے جبکہ پودوں میں پھول نکلنے لگتے ہیں۔ اس کو مقامی زبان میں "مجگی روگ" کہتے ہیں۔ جس کی وجہ سے پودوں کی نشو ونما رک جاتی ہے۔ مزارعین کے بیان کے مطابق اس بیماری کا ایک خاص زمانہ ہوتا ہے یعنی پھول نکلنے کے بعد سے پندرہ بیس روز تک۔ اگر اس مدت میں بیماری کا حملہ نہ ہو تو خدشہ باقی نہیں رہتا۔

۵۔ تور کی فصل کو ایک کیڑا لگ جاتا ہے جس سے اس قدر شدید نقصان ہوتا ہے کہ سوائے اس کے کہ فصل سے کھاد کا کام نکل آئے اور کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ کیڑا اس وقت پیدا ہوتا ہے جبکہ پودوں میں پھلیاں لگنی شروع ہو جاتی ہیں۔ اگر اس زمانہ میں پندرہ بیس روز تک ابر چھایا رہا تو بیماری کا حملہ یقینی ہوتا ہے۔ اگر پھلوں میں دانے بھر گئے تو ابر چھا جانے سے نقصان کا اندیشہ نہیں رہتا۔

فروخت پیداوار موضع سے قریب ترین آڑھتیا بازار شاہ آباد پانچ میل کے فاصلہ پر ہے۔ جہاں تک بیل گاڑیوں کا معمولی راستہ ہے۔ مزارعین اپنی فروخت شدنی پیداوار آڑھتیے کے دوکان پر لے جاکر لگا دیتے ہیں۔ دن کے دس گیارہ بجے تک مختلف تھوک فروش کمپنیوں کے ایجنٹ آڑھتیوں کے پاس آتے ہیں۔ آڑھتیے کو روزانہ بمبئی کے بازاری نرخ ذریعہ ٹیلیگرام معلوم ہوتے رہتے ہیں۔ آڑھتیا ان ایجنٹوں کے روبرو اپنے مزارعین کا مال نیلام کرتا ہے۔ جس ایجنٹ کی قیمت زیادہ ہوتی ہے پیداوار اس کے ہاتھوں فروخت کر دی جاتی ہے بالعموم یہ قیمت بمبئی کے نرخ کے لگ بھگ ہوتی ہے۔ آڑھتیے کی ہمیشہ یہ کوشش ہوتی ہے کہ اپنے گاہکوں کی پیداوار زیادہ سے زیادہ نفع پر فروخت ہو جس کے معاوضہ میں قیمت پیداوار کے ہر سیکڑے پر اسے کمیشن ملتا ہے۔

بایں ہمہ فصل کے زمانہ میں چونکہ بازاری قیمتیں ارزاں ہوتی ہیں اس لئے مزارعین کو اپنی پیداوار کی حقیقی قیمت

نہیں ملتی۔ حالت یہ ہے کہ جب کسی کسان کو فصل کے دو تین ماہ بعد اپنی ضرورت کے لئے اناج خریدنے کی ضرورت ہوتی ہے تو جو قیمت کہ زمانۂ فصل میں اپنی پیداوار کی اسے حاصل ہوئی تھی اس سے تقریباً سوائی قیمت ادا کرنی پڑتی ہے۔ مزید براں زمانۂ فصل میں بھی پیداوار کی قیمتیں اس روز کے بازاری نرخ پر منحصر ہوتی ہیں اگر کسی دن قیمتیں بہت ہی گری ہوئی ہوں تو زیادہ سے زیادہ آڑھتیا ایک دن کے لئے مال اپنی دکان پر محفوظ رکھنے کی ذمہ داری لیتا ہے۔ کسان دوسرے دن جو بھی نرخ ہو اس پر فروخت کرنے کے لئے مجبور رہتا ہے۔

مزارعین کے قرضے

موضع کی آبادی کے (۹۲) فیصد جز و کا رشتۂ زندگی زمین سے منسلک ہے۔ گنتی کی چند دیہی دستکاریاں جاری ہیں۔ زمین گو زرخیز ہے لیکن کسان اس کی قوت پیداواری میں اضافہ کے لئے مطلق ہاتھ پیر نہیں ہلاتے۔ زمین کی قدرتی زرخیزی پر کسان اس درجہ تکیہ کرتے ہیں کہ اکثر مزارعین تخم ریزی سے قبل زمین کو نرم کرنے کی خاطر ناگر کا استعمال تک غیر ضروری سمجھتے ہیں۔ سوائے چند ایکڑ رقبہ تحت باغات کے موضع کی دیگر آراضی کو کھاد کی صورت تک دیکھنی نصیب نہیں ہوتی۔ ذرائع آب پاشی سرے سے مفقود ہیں۔ کسان اپنی پیداوار کے لئے کلیتاً مانسون ہواؤں کے رحم و کرم کا محتاج ہے۔ آلات زرعی اسی طرز کے ہیں جس طرز پر شاید ان کے موجد نے انہیں بنایا ہوگا۔ اصلاح شدہ تخم مستعمل نہیں۔ مزید براں خود کسان جو اس سارے کارخانہ کا کرتا دھرتا اور روح رواں ہے ان پڑھ ہونے کی بنا پر دنیا تو دنیا خود اپنے حال سے بھی بے خبر ہے۔ اس میں ترقی کا نہ تو احساس ہے نہ ترقی کی صلاحیت ہے اور نہ ترقی کی خواہش۔ اکثر خاندان کثیر العیال ہیں۔ وقتاً فوقتاً قلت باراں کے سبب فصلیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ مویشی ضائع ہوتے رہتے ہیں اور جب کسان کی محدود آمدنی خود اس کی اور اس کے خاندان کی کما حقہٗ پرورش کی متحمل نہیں ہو سکتی تو ان حادثات ناگہانی اور شادی بیاہ کے مسرفانہ اخراجات کی تکمیل کا واحد ذریعہ ساہوکار کا دروازہ کھٹکھٹانا رہ جاتا ہے۔ بظاہر ہمارا یہ بیان ایک معمہ سا معلوم ہوگا کہ باوجود زرخیز زمینوں کے موضع کی آبادی کے مجموعی قرض کی تعداد (۲۹۲۹۱) روپیہ ہے۔ لیکن یہ ایک حقیقت ہے اور نہایت تلخ حقیقت۔ مزارعین کے قرضوں کا پیشہ وارانہ خاکہ درج ذیل ہے۔

مقروضیت کی پیشہ ورانہ تقسیم

	پیشہ	تعداد خاندان	تعداد مقروض خاندان	مجموعی رقم قرضہ	فیصد مقروض خاندان	اوسط رقم فی مقروض خاندان
۱	زراعتِ خالص	۱۲۶	۸۶	۵۵،۳۴۰	۶۸٫۲۵	۶۴۳٫۳۴
۲	زراعتِ ذیلی	۹۲	۶۶	۱۸،۹۵۹	۷۳٫۲۷	۲۷۵٫۱۴
۳	مزدوری خالص	۱۲۱	۳۲	۳،۸۴۶	۲۶٫۴۵	۱۲۰٫۱۹
۴	مزدوری ذیلی	۵۲	۳۶	۷،۵۴۴	۶۹٫۲۳	۲۰۶٫۷
۵	صنعت و حرفت	۱۳	۴	۱،۹۲۵	۳۰٫۷۷	۴۸۱٫۲۵[۱]
۶	دیہی خدام (قصاب، دھوبی، حجام وغیرہ)	۱۵	۹	۳،۶۲۵	۶۰٫۰۰	۴۰۲٫۷۸

مندرجہ بالا اعداد و شمار سے واضح ہوتا ہے کہ :-

الف :- سب سے زیادہ بارِ قرض زراعت خالص پر ہے۔

ب :- زراعت خالص کے بعد بارِ قرض کے لحاظ سے زراعت ذیلی اور مزدوری ذیلی کا درجہ ہے۔

اور ج :- مزدوری خالص پر قرض کا بار دیگر طبقوں کی بہ نسبت کم ہے۔

ہم اس کا بھی پتہ چلا سکتے ہیں کہ قرض کا بار ان خاندانوں پر زیادہ ہے جن کے قبضہ میں آراضی ہے۔ وجہ بالکل بدیہی ہے کہ ملکیت زمین کے باعث ساہوکار کی نظروں میں کسان کی ساکھ رہتی ہے۔ خالص مزدوری کرنے والے خاندانوں پر قرض کا بار اس لئے کم ہے کہ ان غریبوں کے نصیب میں زمین کا ایک ٹکڑا بھی تو نہیں اور ظاہر ہے کہ گاؤں کا ساہوکار ایسے بے زمین افراد کو قرض دے کر اپنی رقم کو خطرہ میں ڈالنا کیوں گوارا کرنے لگا۔ البتہ زراعت ذیلی اور مزدوری ذیلی پر قرض کا بار کافی ہے کیونکہ ان کے قبضہ میں آراضی ہوتی ہے اور وہ محض اپنی مجموعی آمدنی میں اضافہ کی خاطر مزدوری کرتے ہیں یا اصل پیشہ تو مزدوری ہوتا ہے لیکن مجموعی آمدنی میں اضافہ کی خاطر زراعت کرتے ہیں۔

---

[۱] صنعت و حرفت کا اوسط قرضہ بظاہر اس لئے زیادہ معلوم ہو رہا ہے کہ زرگروں کا ایک ہی خاندان (۱۵۰۰) روپیہ کا مقروض ہے۔

اب دریافت یہ کرنا ہے کہ آخر وہ کیا اسباب ہیں کہ موضع کے باشندے بار قرض کے تلے اس قدر دبے ہوئے ہیں حالانکہ موضع کی زمینوں کی زرخیزی کا لحاظ کرتے ہوئے تو انھیں خوش حال ہونا چاہئے تھا۔

مزارعین کی قرضداری کے مقامی اسباب

مزارعین کی قرضداری کے عام اسباب میں جو ہندوستان کے عموماً اور حیدرآباد کے خصوصاً تقریباً ہر دیہات پر صادق آتے ہیں وہ قیاسی اور غیر نفع بخش طریق کاشت کھاد اور عمدہ تخم کا عدم استعمال ذرائع آب پاشی کی قلت، نقدان یا بیجا استعمال، کسانوں کی قدامت پرستی، جہالت اور اسراف، ضایع بیضیمنی کی عدم موجودگی، مزارعین کے اوقات فرصت کا غیر مفید اور استعمال اور مہاجنی لین دین شامل ہیں لیکن موضع زیر تحقیق کے مزارعین کی قرضداری کے خاص اسباب ہیں یہ اسباب گو بہ لحاظ نوعیت دیگر مقامات سے مختلف نہیں لیکن یہاں صرف انھیں اسباب کا ذکر کیا جائے گا جو بڑی حد تک مزارعین موضع کو مقروض بنانے کا باعث ہیں

قرضہ کے ان مقامی اسباب میں پہلا سبب طریقۂ قولداری ہے۔ قولداری سے مراد یہ ہے کہ کسان کسی پٹہ دار یا ٹھیکیدار سے سالانہ معینہ رقم یا مقدار جنس کے عوض مقررہ مدت کے لئے زمین کاشت پر حاصل کرتا ہے۔ ایسے کسان قولدار کہلاتے ہیں۔ اگر کسی سال فصل خراب ہوئی اور مقررہ رقم یا مقدار جنس ادا نہ ہوسکی تو قولدار اس کے خاندان کی سالی محنت پر پانی پھر جاتا ہے اور اس کے علاوہ مالک زمین کا مقروض بھی ہوجاتا ہے۔ اگر فصل کی یہی حالت ایک آدھ سال اور رہی تو اس کا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے گرداب قرض میں پھنس کر رہ جانا یقینی ہے کیونکہ اس کاشتکار سے جو اپنی اراضی پر بمشکل گذر بسر کرسکتا ہے یہ کیونکر توقع کی جاسکتی ہے کہ اس رقم خطیر کی ادائی کی کوئی صورت بہت جلد نکال سکے گا۔

مزارعین کے مستقل طور پر مقروض رہنے کا ایک سبب ان کے جدی قرضے ہیں۔ کیونکہ ہمارا کسان ترکہ میں جائداد سے زیادہ قرضہ پاتا ہے، اور اسی کی ادائی میں عمر بھر اپنا خون پسینہ ایک کرتا رہتا ہے۔

لیکن مزارعین کی قرضداری کی بڑی وجہ مقامی ساہوکاروں کا بے قاعدہ اور قابل اعتراض لین دین ہے۔ یہ شکایت عام ہے کہ ساہوکار ادائی قرضہ کے بعد بھی بے بس مزارعین کی نہ دستاویزات واپس کرتے ہیں نہ وصولی اقساط کی رسیدیں دیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جہاں ساہوکار اور کسی کسان میں تکرار ہوئی اور اس نے ادا شدہ رقم کا دعویٰ کردیا

ساہوکاروں کا طریق قسط بندی بھی کسانوں کو قرضدار رہنا ہے۔ جب کسی کسان کے ذمہ قابل لحاظ رقم واجب الادا ہو جاتی ہے تو ساہوکار رقم کا مطالبہ کرتا ہے اور دعوے کی دھمکی دیتا ہے۔ غریب اور جاہل مزارعین اپنی بے بسی اور غربت کے سبب ساہوکار کے خلاف عدالتی چارہ جوئی اختیار کرتے ہوئے خوف کھاتے ہیں ایک تو اس وجہ سے کہ عدالتی اخراجات کی برداشت کی ان میں سکت نہیں ہوتی اور دوسرے " دریا میں رہکر مگرمچھ سے بیر " انھیں مناسب نظر نہیں آتا۔ بڑی منتوں اور سماجتوں کے بعد ساہوکار بہ اقساط ادائی کو منظور کرتا ہے لیکن اس صورت میں ادا شدنی رقم کی مقدار دوچند کردی جاتی ہے۔

ساہوکاروں کی صریحًا بددیانتی بھی بعض اوقات غریب مزارعین کی مصیبت کا باعث ہوتی ہے بعض مزارعین ایسے ہیں جنھوں نے ساہوکار سے نقد رقم حاصل نہیں کی بلکہ ساہوکار کی دکان سے کپڑا یا غلہ ادھار لیا جب اس کی قیمت ادا نہ ہوسکی تو ساہوکار نے من مانی قیمت لگاکر معہ سود در سود دستاویز لکھالی اور اب اس دستاویز پر سود واجب الادا ہوگیا۔

موضع میں مزارعین کے لئے فراہمی قرضہ کی کوئی صورت سوائے ساہوکار کے موجود نہیں ہے۔ اور جو ساہوکار ہیں ان کی بدمعاملگی ظلم و تعدی اور بددیانتی کی داستانیں موضع کے تقریبًا ہر شخص کی زبان پر ہیں دستاویزات کا واپس نہ کرنا اور رسیدوں کا جاری نہ کرنا تو ان کا دستور ہی ہے۔ غریب مزارعین کو ان کے سکونتی مکانات سے بزور باہر نکال دینے اور ان کی زمینوں کو جبر پر رجسٹری کرا لینے سے بھی انھیں دریغ نہیں۔ آبادی کے پندرہ بیس خاندان ایسے ہیں جنھوں نے ساہوکاروں کے ظلم و تعدی کی تاب نہ لاکر گاؤں کی سکونت ترک کردی ہے۔ ان درندہ صفت ساہوکاروں کی بربریت کا یہ عالم ہے کہ انھیں اس غریب اور آفت زدہ قرضدار کو زدوکوب کرنے سے بھی عار نہیں ہوتا۔ جس کے گھر میں مردہ باپ کی لاش پڑی ہو اور جو کفن کا کپڑا لینے بازار آیا ہوا !!

طریق لین دین موضع میں قرضہ کا لین دین کرنے والے ساہوکاروں کی تعداد تین ہے۔ جن میں سے ایک مسلمان ہے ایک لنگایت ایک برہمن ۔ لین دین کے دو طریقے ہیں بصورت نقد و بصورت جنس۔ نقد کی صورت میں معمولی رقوم بلا تحریر دستاویز دی جاتی ہیں اور بڑی رقمیں بہ تحریر دستاویز و رہن آراضی۔ جنس کی صورت میں ادائی قرض کی متوقع مدت چونکہ زیادہ سے زیادہ نو ماہ یا ایک سال ہوتی ہے اس لئے

ابتداء میں دستاویز نہیں لکھائی جاتی البتہ جب فصل کے موقع پر بھی جنس ادا نہ ہو سکی تو اس نرخ سے جو قرض لیتے وقت تھی کل جنس واجب الادا کی قیمت کے مساوی دستاویز تحریر کر دینی پڑتی ہے۔ شرح سود نقد کی صورت میں (۱۸، تا ۲۵) روپیہ فیصد سالانہ اور جنس کی صورت میں فی من (۴ تا ۸) پائلی سالانہ ہوا کرتی ہے۔ لیکن یہ شرح سود حقیقی اور واقعی نہیں بلکہ نام نہاد اور ظاہری ہے۔ کیونکہ شرح سود تو اس نام نہاد شرح سے کئی گنا زیادہ ہوتی ہے جو غریب مزارعین بے چون و چرا ادا کرنے پر مجبور ہوتے ہیں۔

(۱) چنانچہ مسمی سلیمان نے ایک ساہو سے ۱۳۱۱ف میں مبلغ (۶۰) روپے نقد حاصل کئے سود در سود ہوتے ہوئے ۱۳۳۰ف اور ۱۳۳۳ف میں علی الترتیب چھ چھ سو روپے کے متعلق دو نمبر رہن بالقبض کر دئے گویا (۲۲) سال کی مدت میں (۶۰) کی رقم المضاعف ہو کر (۱۲۰۰) روپے ہو گئی اور مسمی مذکور نے جو سود ادا کیا اس کی شرح ۱/۶ ۴ روپے (۴ روپے چھ آنے ۴ پائی) فیصد سالانہ ہوئی۔ مسمی مذکور ہی نے اسی ساہو سے ۱۳۲۷ف یا ۱۳۲۸ف میں دو من جوار (جبکہ جوار کا نرخ بوجہ گرانی شاید ۵/۱۲ فی من تھا) حاصل کی ۱۳۴۳ف میں اس جوار کی قیمت کے عوض مسمی مذکور نے ساہو کو (۲۴۴) روپیہ کی دستاویز لکھدی۔ گویا پندرہ سال کی مدت میں (۴۰) روپیہ کی بجائے (۲۴۴) روپیہ ادا کئے اور سالانہ (۸ ۱۷/۳۶) فیصد شرح سے سود ادا کیا۔ مسمی مذکور نے ۱۳۳۰ف تا ۱۳۴۴ف سالانہ مبلغ (۵۲ ۱/۱۲) روپیہ مذکورہ بالا رقم کے سود میں ادا کیا یعنی (۲۲۶۸) روپیہ ادا کئے باوجود اس کے ۱۳۴۵ف میں ساہوکار نے مزید (۲۰۲) کا دعوی کر دیا۔ عدالت نے آپس کے سمجھوتے پر سالانہ (۱۰۰) روپیہ کی قسط مقرر کر دی۔ غرض اس شخص نے ۱۳۱۱ف میں ۶۰ اور ۱۳۲۸ف میں ۲۴۴ روپیہ حاصل کرکے ۵/۱۲ (۴۲۶۸) روپیہ کا قرض اپنے سر لیا

مندرجہ بالا واقعہ تو ایک کسان کا ہے لیکن خود موضع کا پٹواری بھی ساہوکاروں کے پنجہ حرص و آز سے محفوظ نہ رہ سکا۔ دکھل راؤ پٹواری کا بیان ہے کہ ۱۳۲۸ف میں اس نے ایک ساہو سے ایک ہزار روپئے قرض لئے کئی سال تک سود اور اصل کی ادائی نہ ہو سکی ۱۳۴۴ف میں اس کے ذمہ (۶۵۰۰) کی رقم واجب الادا ہو گئی۔ پٹواری نے اس قرض کے عوض اپنی (۸۰) ایکڑ زمین ساہوکار کے حوالے کر دی اور اب اس کے پاس صرف (۲۱) ایکڑ ناقص زمین رہ گئی ہے جس کی پیداوار سے مالگذاری بھی بمشکل ادا ہو رہی ہے۔ گویا پٹواری نے (۱۰۰۰) روپیہ کے عوض (۵۵۰۰) روپئے سود میں ادا کئے۔ جس کی شرح ۵/۱۲ ۴۲ فیصد سالانہ ہوئی۔

یہ تو خیر اسامیوں کا حال ہے جنہوں نے قرض بصورتِ نقد حاصل کیا تھا۔ بعض مزارعین ایسے ہیں جن کا قرض محض زمینوں کے قول پر دینے کا نتیجہ ہے۔ مثال کے طور پر بھو دیا سا ئینا کولی کا نام پیش کیا جا سکتا ہے۔ جس نے دس سال قبل (شاید ۱۳۳۵ف میں) ایک ساہوکار کا باغچہ (۴۰۰) روپیہ سالانہ قول پر لیا۔ اس سال صرف (۲۰۰) ادا ہو سکے۔ دو سال بعد ایک کھیت اسی ساہو کا بہ حساب سالانہ (۵۰۰) قول پر لیا۔ جس میں ساہو بھی بطور حصہ دار شریک تھا۔ اب کی مرتبہ اس کے ذمہ (۲۵۰) روپئے واجب الادا رہے۔ قرض کے خوف سے گاؤں سے فرار ہوگیا۔ ایک سال بعد یعنی ۱۳۳۹ف میں واپس آیا۔ اور ایک سو روپئے ساہوکار سے پھر قرض لئے کہ گاؤں میں رہ کر اپنا کاروبار کرے۔ جملہ رقم ملاکر ساہوکار نے مبلغ (۶۰۰) روپئے کی دستاویز لکھالی اور ادائی قرض کے لئے سالانہ (۵۰) روپیہ اور بعد میں (۲۵) کی اقساط مقرر کیں چنانچہ اب تک مسمی مذکور اقساط ادا کر رہا ہے اب اس کے ذمے (۵۶۰) رہ گئے ہیں۔ مختصر یہ کہ ۱۳۳۹ف کی نقد حاصل کردہ رقم سے قطع نظر محض قول کے باعث (۱۰۰) روپیہ کا قرض مسمی مذکور کے ذمہ ہوگیا۔

بعض کاشتکاروں نے کسی ساہوکار کی دوکان سے کپڑا ادھار لیا۔ اور جب کچھ مدت تک قرض کی رقم ادا نہ ہو سکی تو ساہوکار نے ان سے دستاویز لکھالی۔ چنانچہ مسمی تپناکالا کا واقعہ ہے کہ اس نے تقریباً دس سال قبل ایک ساہو سے تقریباً ۲۵؎ روپیہ کا کپڑا ادھار لیا۔ چار سال کے بعد ساہو نے اس کپڑے کی بابت (۵۰؎) کا دعویٰ کر دیا۔ جس کے بعد سالانہ ۵؎ کے اقساط سے تین سال میں رقم ادا ہوئی۔ مسمی مذکور کا بیان ہے کہ ڈگری سے قبل ایک سال کی مدت میں اس نے ۵؎ کے عوض (۲۱۰) روپئے ساہوکار کو ادا کئے شرح سود سالانہ (۱۲½؎) رہی۔

مسمی پدمنا پجاری دھنگر نے آج سے سترہ اٹھارہ برس قبل جبکہ خشک سالی کے سبب جوار کا نرخ ڈھائی سیر فی روپیہ تھا۔ ایک من جوار قیمتی لعہ؎ روپیہ ایک ساہو سے خریدی۔ یہ گرانی صرف ایک سال رہی۔ مگر پدمنا رقم مذکور کی ادائی نہ کر سکا نتیجہ یہ ہوا کہ اس کا وہی ۲ ایکر کا کھیت جو اس کی زندگی کا سہارا تھا ساہوکار کے قبضہ میں ہے اور رقم ہنوز واجب الادا ہے۔

بعض اوقات مقامی ساہوکاروں نے صریحاً بے ایمانی سے کام لے کر بے بس کسانوں کی زندگیاں تلخ کر دی ہیں۔ چنانچہ ۱۳۲۸ف میں مسمی اسمٰعیل شاہ اور اس کے چچازاد بھائی کے مابین قبضۂ آراضی سے متعلق نزاع سے فائدہ اٹھا کر ایک ساہو نے اسے ترغیب دی کہ اگر تم نے مابہ النزاع آراضی برائے نام میرے قبضہ میں دیدی تو تمہارے فریق مخالف کو آراضی پر

قبضہ کرنے کی جرأت نہ ہوگی مبلغ (۸۰۰) روپیہ کی دستاویز لکھالی۔ وعدہ کیا گیا کہ بعد فیصلۂ عدالت دستاویز مسمی مذکور کے حوالہ کر دی جائے گی۔ اور رقم وغیرہ نہ لی جائے گی۔ جب دوسرے سال عدالت سے مسمی اسماعیل شاہ کے موافق فیصلہ ہوا تو ساہو نے بددیانتی سے دستاویز کی رقم طلب کی۔ اور دعوے کی دھمکی دی۔ مجبور ہو کر مسمی مذکور نے (۶۰۰) روپیہ ادا کرنا منظور کیا۔ چھ سات مہینے بعد ۱۳۴۲ ف میں بشمول رقم سود مبلغ (۸۰۰) روپیہ کی رجسٹری کرا دی۔

اکثر صورتوں میں ساہوکار قرض داروں کی ادا کردہ رقوم کی نہ رسید دیتے ہیں اور نہ دستاویز واپس کرتے ہیں۔ غریب کسان بے زبان جانور کی طرح ساہو کے تعمیل حکم پر مجبور رہیں۔ چنانچہ مسمی مارننڈ پاکولی نے ایک ساہو کو (۱۵۱) کی رقم ادا کی۔ ساہو نے دستاویز واپس کرنے کا وعدہ کیا کئی روز تک بلطائف الحیل ٹالتا رہا۔ اور اسی دوران میں ایک مقدمۂ قتل کے سلسلہ میں ساہو فرار ہو گیا۔ واپسی کے بعد ساہو نے دوبارہ رقم طلب کی۔ لیکن مسمی مذکور نے رقم دینے سے انکار کر دیا۔ دستاویز اب تک ساہو کے قبضہ میں ہے اور قرض کا مطالبہ برابر جاری ہے۔

ساہوکاروں کے ظلم وزیادتی کا یہ حال ہے کہ بھیما بھنیر نے پچیس یا تیس برس پہلے ایک ساہو کی دوکان سے سات عدد چوڑیاں خریدی تھیں۔ غریب نے ان کی قیمت ادا نہیں کی اور آج انھیں سات عدد چوڑیوں کی قیمت کے عوض (۷۰۰) روپیہ کا قرضہ ہے۔ حالانکہ غریب انھیں سات سو روپیوں کی زرتار چوڑیاں اپنی بیوی کو پہنا سکتا تھا۔

ان قرضوں کے متعلق قطعیت کے ساتھ یہ معلوم کرنا دشوار ہے کہ مجموعی رقم کا کس قدر جز و پیداواری اغراض کے لئے لیا گیا اور کس قدر غیر پیداواری اغراض کے لئے۔ لیکن بلاخوف تردید اس قدر ضرور کہا جا سکتا ہے کہ ان قرضوں کی کثیر غیر پیداآور ہے اور غیر پیدا آور قرضوں کی خصوصیت یہ ہے کہ جب وہ ایک بار وجود میں آچکتے ہیں تو بجائے جلد ختم ہونے کے عروج پانے لگتے ہیں۔

مندرجہ بالا واقعات کے اظہار کے بعد شاید یہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں کہ اس ہیبت ناک بار قرض کے سبب زارعین کی زندگی مرقع حسرت و یاس بنکر رہ گئی ہے۔ کیونکہ کسان جب دیکھتا ہے کہ ہر بار جہاں اس کی فصل تیار ہوئی دوسرے اس پر قبضہ کر لیتے ہیں تو فطرتاً اس کی ساری امیدیں خاک میں مل جاتی ہیں اور زندگی کو وہ ایک بوجھ سمجھنے لگتا ہے۔ اس کے قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں۔ اس کا دماغ کمزور ہو جاتا ہے اور مستقبل کو بہتر بنانے کی کوئی تدبیر پھر اُسے نہیں سوجھتی اسی بلائے بے درماں نے اس کے نظریہ حیات کو الم پسند اور قنوطی بنا دیا ہے۔

مزارعین پر ساہوکار کے دانت اس لئے تیز ہوتے ہیں کہ وہ مفلس ہیں اور وہ مفلس اس لئے ہیں کہ وہ قرضدار ہیں۔ اس قابل اعتراض کاروبار سے مزارعین کس قدر تباہ ہوئے اور ساہوکاروں نے کس قدر استحصال ناجائز کیا اس کا ثبوت یوں ملتا ہے کہ موضع کے بڑے بڑے ساہوکار تین ہیں۔ ساہوکار نمبر ۱ کے قبضہ میں ۱۳۳۰ف میں (۱۲۷) ایکڑ ۴ گنٹے آراضی تھی اور ۱۳۴۵ف میں (۴۹۷) ایکڑ (۴) گنٹے۔ ساہوکار نمبر ۲ کے قبضہ میں اس سال ۲۶۶ ایکڑ (۲) گنٹے زمین تھی اور ۱۳۴۵ف میں (۳۱۴) ایکڑ (۲۴) گنٹے ساہوکار نمبر ۳ کے پاس ۱۳۳۰ف میں ۵۶۳ ایکڑ آراضی تھی۔ تو ۱۳۴۵ف میں (۴۹۲) ایکڑ (۹) گنٹے کا مالک ہے۔ گویا پندرہ سال کی مدت میں مزارعین کی (۵۴۰) ایکڑ آراضی ان کے قبضہ سے نکل نکل کر ساہوکاروں کی ملکیت ہوگئی۔ اس ٹھوس اور مادی شہادت کے مقابلہ میں شاید ہم پر یک طرفہ فیصلہ کا الزام نہیں لگایا جاسکتا۔ مانا کہ ساہوکاروں سے مزارعین کی اکثر ضرورتیں پوری ہوتی ہیں اور اس میں بھی کلام نہیں کہ مزارعین کے حق میں مہاجنوں اور ساہوکاروں کا وجود دیگر بلا اہل نہیں تاہم اس میں بھی کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ یہ ساہوکار اپنی خدمات کا معاوضہ واجبی سے کہیں زیادہ پاتے بلکہ جبراً وصول کرتے ہیں۔

اصلاحی تدابیر

اصلاحی تدابیر کے تجویز کرنے یا ان پر عمل کرنے سے قبل اس کا یقین کر لیا جانا چاہیے کہ ان تدابیر کی حیثیت محض نظری نہ ہو بلکہ عملی طور پر وہ مزارعین کی فلاح وبہبود کا وسیلہ ہوں:-

اصلاحی تدابیر کو دو حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے (۱) بلاواسطہ (۲) بالواسطہ۔ بلاواسطہ اصلاحی تدابیر سے ہماری مراد ایسی تدابیر ہیں جن کے ذریعہ کسانوں کو فی الفور نقصانات سے بچایا جاسکے اور بالواسطہ تدابیر وہ ہیں جن سے مزارعین کی مرفہ الحالی بتدریج مگر مستقل طور پر متاثر ہوتی ہو۔

بالواسطہ تدابیر مزارعین کا طریقۂ کاشتکاری اور آلات زرعی دقیانوسی ہیں۔ انھیں اپنی زمینوں کی زرخیزی بڑھانے کی فکر نہیں۔ عمدہ تخم کے استعمال کا حوصلہ نہیں۔ ان کے مکانات گندہ اور تاریک ہیں۔ انکی صحتیں کمسنی کی شادیوں کی بدولت تباہ و خستہ ہیں۔ زراعت سے انہیں معقول آمدنی نہیں ہوتی لیکن آبادی کی اکثریت اسی میں مصروف ہے اور دیگر گھریلو یا دستی صنعتوں کی جانب مائل نہیں۔ ساہوکاروں کے ظلم وستم کے وہ شاکی ہیں مگر اسی سے طالب پناہ

اور خواہاں امداد ہوتے ہیں۔ اس سے نجات پانے کے بجائے اس کی گرفت مضبوط سے مضبوط تر کرتے جا رہے ہیں۔ ان سب خرابیوں کی اصل وجہ ان کی جہالت ہے۔ وہ کاشتکار ہوتے ہوئے بھی کاشتکاری کے اصل مفہوم سے ناآشنا ہیں۔ زراعت کے معنی ان کے نزدیک وہی ہیں جو صدیوں پیشتر ان کے آبا و اجداد کے ذہنوں میں تھے۔ تبدیل شدہ حالات اور جدید ضروریات سے وہ بیگانہ ہیں۔ شفیق و مہربان حکومت نے جو آسانیاں انھیں بہم پہنچائی ہیں نہ ان سے پورے طور پر آگاہ ہیں نہ ان سے استفادہ کرنا جانتے ہیں۔ ترقی یافتہ ممالک کے مزارعین کو دوسری سہولتوں کے علاوہ سب سے بڑی سہولت تعلیم ہے۔ وہاں کے مزارعین اس قدر پڑھے لکھے ہوتے ہیں کہ حکومت کی جاری کردہ اصلاحات و طریق ہائے کاشت کو سمجھیں اور ان پر عمل کریں۔ یہ ایک بدیہی امر ہے کہ جن کی اصلاح مقصود ہو اگر انہیں مہیا کردہ سہولتوں سے استفادہ کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو تو فلاح و بہبود کی ساری کوششوں کا بے نتیجہ رہ جانا یقینی ہے۔

دور جدید میں جن ملکوں نے معاشی اور سیاسی حیثیت سے حیرت انگیز ترقی کی ہے ان میں سے ہر ایک نے اپنے مرض کا علاج تعلیم کے نسخہ ہی سے شروع کیا۔ جاپان اور ترکی کے علاوہ روس کی ترقی کی ابتدا بھی تعلیم ہی سے ہوئی تھی۔ سوئٹزرلینڈ کے ایک محب وطن کا قول ہے کہ "ہمیں معلوم ہے کہ ہماری آبادی کی اکثریت تہی دست رہے گی لیکن ہم نے تہیہ کر لیا ہے کہ وہ تہیدستی کے ساتھ جہالت کے بھی شکار نہ رہیں" موضع میں خواندہ افراد کی تعداد ناقابل لحاظ ہے۔ ایسے موضع کے مدرسہ تحتانیہ میں جہاں کی آبادی دو ہزار ہو ایک سو بیس لڑکوں کا زیر تعلیم ہونا موضع کی تعلیمی پستی کا آئینہ دار ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ مدرسہ میں طالب علموں کی تعداد میں اضافہ کے علاوہ تعلیم بالغان کے لئے مدارس شبینہ قائم کئے جائیں۔ غلام احمد صاحب مددگار تحتانیہ کی کوششیں لائق ستایش ہیں کہ آپ نے ذاتی دلچسپی اور ہمدردی سے کام لے کر حال ہی میں ایک دارالمطالعہ کی بنیاد ڈالی ہے۔ جہاں روزناموں کے علاوہ ماہوار رسایل کا بھی انتظام ہے۔ محکمہ تعلیمات کی جانب سے مدارس شبینہ کا قیام بے حد ضروری ہے۔ تعلیم نسواں کی خاطر ایک معلمہ موجود ہے لیکن ضرورت ہے کہ پروپگنڈے سے کام لے کر گاؤں کی لڑکیوں میں تعلیم کا شوق پیدا کیا جائے اور ساتھ ہی ان پڑھ عورتوں کو کفایت شعاری صفائی اور اصول حفظان صحت سے واقف کرایا جائے۔

بلاواسطہ تدابیر لیکن ظاہر ہے کہ ان تدابیر سے کما حقہٗ مستفیض ہونے کے لئے ایک عرصہ لگے گا۔ نیز کسانوں کو حصول تعلیم و پابندیٔ حفظان صحت پر مائل کرنے کی خاطر ضروری ہے کہ ان کی مادی حالت

کی اصلاح کی تدابیر فی الفور اختیار کی جائیں۔ ان کی سقیم حالت نے انھیں قسمت پرست بنا دیا ہے۔ ان کا نقطۂ نظر اس درجہ الم پسند ہو گیا ہے کہ وہ اپنی زبوں حالی کو اپنی قسمت کا نتیجہ سمجھنے لگ گئے ہیں اور اس لئے اس تباہ حالی سے نجات پانے کی کوئی تدبیر ان کو کارگر معلوم نہیں ہوتی۔ اگر ان کی مادی حالت کے ارتفاع کی موثر تدابیر اختیار کی جائیں تو یقین ہے کہ انھیں تقدیر سے زیادہ تدبیر پر اعتقاد ہو جائے گا۔

مزارعین کی اصلاح کی کوشش اس وقت تک بارآور نہیں ہو سکتی جب تک کہ ان کو قرض کے موجودہ بار گراں سے نجات نہ دلائی جائے گی۔ واقعہ یہ ہے کہ موضع کی اکثریت ساہوکاروں کے آہنی گرفت میں ہے اور اسی آہنی گرفت نے زرعی ترقی کو پا بہ زنجیر کر رکھا ہے۔ پروفیسر گنگولی کا بیان ہے کہ "گراں شرح سود ہی ہماری دیہی آبادی کی روز افزوں افلاس کا سبب ہے۔ میرا ایقان ہے کہ جب تک اس خطرہ کو کھلے بندوں رہنے دیا گیا اس سے ہماری زرعی معیشت کی بنیادیں کھوکھلی ہوتی رہیں گی"۔ ان خطرات کے سدباب کے لئے حسب ذیل تجاویز مفید نظر آتی ہیں۔

۱۔ سودی لین دین کے کاروبار کے لئے ساہوکاروں کو لائسنس کا پابند بنایا جائے۔

۲۔ قانوناً شرح سود مقرر کی جائے۔

۳۔ ساہوکاروں کو مجبور کیا جائے کہ لین دین کے باقاعدہ حسابات رکھیں۔ اصل اور سود کی ادا شدہ رقوم کی رسائد جاری کریں بہتر تو یہ ہوگا کہ منجانب سرکار مطبوعہ حسابات کے رجسٹر اور رسائد قیمتاً ساہوکاروں کو فراہم کئے جائیں۔ محکمۂ پولس و مال کے عہدہ دار بلحین دورہ وقتاً فوقتاً ان رجسٹرات کی تنقیح کرتے رہیں۔ اگر ان ساہوکاروں کے حسابات کی جانچ پڑتال کے لئے ہر تعلقہ میں ایک آڈیٹر بطور خاص مقرر کیا جائے تو زیادہ مفید نتائج کے برآمد ہونے کا قرینہ ہے۔ ان آڈیٹروں کی تنخواہیں اس آمدنی سے ادا کی جائیں جو ساہوکاروں کے اجرائی لائسنس سے حاصل ہوگی۔ کیونکہ یہ ظاہر ہے کہ اوسطاً ہر تعلقہ میں دو سو یا پونے دو سو مواضعات ہوتے ہیں۔ ساہوکاروں کی اقل ترین تعداد فی موضع ایک بھی فرض کی جائے تو پورے تعلقہ میں (۱۵۰) ساہوکار رہیں گے۔ اگر لائسنس کی اجرت سالانہ بیس روپیے بھی رکھی گئی تو (۳۰۰۰) روپئے کی آمدنی ہوگی اور اس رقم سے آڈیٹر کی تنخواہ کا نکالنا کوئی مشکل کام نہیں۔

۴۔ موجودہ رقوم قرض کے متعلق بطور سرکاری مفصل تحقیق کرائی جائے۔ اگر ساہوکاروں نے اصل کے سود میں کافی رقم حاصل کر لی ہے تو ساہوکاروں کو ایسے قرضوں سے دست بردار ہونے پر مجبور کیا جائے اور جن مزارعین کے ذمہ

اتنا قرضہ ہو کہ ان سے دست برداری ساہوکاروں کے مالی نقصان کا موجب ہو بشرطیکہ ان سے ساہوکار نے سود میں اصل کے مقدار مساوی یا اس سے زاید رقم وصول نہ کی ہو تو حکومت کی جانب تحقیق کے بعد اصل رقم کو دو چند کر کے مناسب اقساط مقرر کر دی جائیں۔ حکومت کو اس کا لحاظ نہ کرنا چاہئے کہ ساہوکار کا دعویٰ کس قدر رقم کا ہے بلکہ اس امر پر نگاہ ہونی چاہئے کہ ساہو نے فی الحقیقت کس قدر اصل قرض دیا ہے۔

۵۔ قرض سے نجات کے لئے انجمنہائے امداد باہمی کا توسط بے انتہا مفید ثابت ہوگا۔ مگر ان انجمنوں کو حقیقی طور پر منفعت بخش بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ان کے انتظام کی اصلاح کی جائے بعض مقامات پر انجمنوں کے ہوتے ہوئے بھی مزارعین ساہوکاروں کے مرہون منت رہنے پر مجبور رہتے ہیں۔ وجہ یہ ہے کہ ساہوکار آدھی رات کو بھی مزارعین کو قرض دینے پر آمادہ رہتا ہے۔ ضرورت ہے کہ ناگہانی اور معمولی ضرورتوں کی پابجائی کے لئے ان انجمنوں میں قلیل المدت قرضوں کی سہولت مہیا کی جائے۔ یہ شکایت عام ہے کہ انجمن امداد باہمی سے قرض حاصل کرنے میں ایک تو کافی مدت درکار ہوتی ہے اور جو رقم ملتی بھی ہے اس کا ایک قابل لحاظ جز دفتر کاری میں صرف ہو جاتا ہے۔ بعض فرض ناشناس ملازمین انجمن ہائے امداد باہمی کی دیانت پر نگرانی رکھی جائے۔ آج سے سترہ برس قبل موضع میں انجمن امداد باہمی کا قیام عمل میں آیا تھا لیکن اب یہ بند ہے۔ انجمن کی ناکامی کا سبب یہ ہوا کہ ابتدا میں وصولیابی رقم کی جانب سے غفلت کی گئی اور جب کئی سال ہو گئے تو وصولی رقم میں سختی کی جانے لگی۔ چنانچہ اب ہر سال انجمن کا عامل یہاں آتا اور مقروض مزارعین کی زمینیں نیلام کرتا ہے۔ ضرورت ہے کہ مزارعین کو پروپگنڈے اور تعلیم کے ذریعہ امداد باہمی کے اصولوں سے واقف کرایا جائے اور ان کی بدگمانیوں کو رفع کیا جائے۔

۶۔ ان محکموں کو موضع کے لئے عملی طور پر مفید بنایا جائے جن کا تعلق دیہی فلاح و بہبود سے ہے۔ خصوصاً محکمہ ہائے زراعت اور امداد باہمی کی جانب سے باقاعدہ پروپگنڈے اور تبلیغ کی ضرورت ہے۔ مزارعین کو اس بات کا یقین دلانا چاہئے کہ ہر زرعی مشکل میں محکمہ کی خدمات ان کے لئے وقف ہیں اصلاح شدہ آلات زرعی اور تخم کا استعمال عام کرنے کی کوشش کی جائے۔ انتخاب کھاد اور طریق استعمال میں مزارعین کی رہنمائی کی جائے۔ ذرائع آب پاشی کے فقدان کی تلافی ڈرائی فارمنگ کے عام کرنے سے کی جا سکتی ہے۔

۷۔ کس قدر حیرت کا مقام ہے کہ ایسے موضع میں جہاں کی مالگزاری سالانہ دس ہزار ایک سو سینتالیس (۱۰۱۴۷) روپیہ ہو، طبی امداد کا کوئی انتظام نہیں۔ بعض خوشحال مزارعین (بلکہ ساہوکاروں) کے علاوہ جو شاہ آباد سے طبی امداد طلب کرتے ہیں دیگر مزارعین کیلئے کسی قسم کے علاج معالجہ کی سہولت حاصل نہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ موضع میں حتی الامکان عجلت سے کم از کم ایک حکیم یونانی کا تقرر عمل میں آئے۔

۰۔ زائد از ضرورت افراد کو زراعت سے نکال کر گھریلو دستکاریوں میں لگایا جائے جس سے مزارعین کے اوقات فرصت بھی پیدا آور بن سکتے ہیں۔ دستی پارچہ بافی کی صنعت کی موضع میں اس لئے زیادہ گنجائش نہیں ہے کہ اوّل تو یہاں پارچہ باف جلاہوں کی تعداد کم ہے، دوم یہ کہ یہاں کی کپاس کی پیداوار بھی قلیل ہے۔ سوم یہ کہ دستی پارچہ کی قسمیں مشین کے بنائے ہوئے پارچہ کے مقابل گراں ہوں گی اور کسان بجائے دستی پارچہ کے بوجہ ارزانی و نفاست مشین ساختہ پارچہ خریدنے ہی کو مفید سمجھیں گے۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ خانگی ضروریات کے لئے عورتوں کے اوقات فرصت میں دستی پارچہ کی تیاری کی ترغیب دی جائے، گھر کے مرد بھی اپنے فرصت کے اوقات میں تاگا کاتنے اور بننے میں مصروف رہ سکتے ہیں اگر اس صورت سے ان کی پوشش ضروریات بھی پوری ہو جائیں تو ان کے حق میں نہایت سود مند ہوگا۔

مقامی حالات کے اعتبار سے مرغیوں اور بطوں کی پرورش سے مزارعین کی ایک معقول تعداد کی آمدنی میں قابل لحاظ اضافہ کی توقع ہے۔ شاہ آباد اور واڑی جنکشن سے قربت کی وجہ سے مرغیوں اور انڈوں کی فروخت کی سہولت موجود ہے کیونکہ ان اسٹیشنوں سے روزانہ مرغیاں اور انڈے کثیر تعداد میں بمبئی بھیجے جاتے ہیں۔

چند مزارعین کے لئے بکریوں کی پرورش بھی مفید ہو سکتی ہے۔ مزید برآں باشندگان موضع کی ضروریات تمباکو نوشی کے پورا کرنے کے لئے بیڑیاں بنانے کی صنعت بھی کئی خاندانوں کی مجموعی آمدنی میں اضافہ کا باعث بن سکتی ہے۔

بہرحال باشندگان موضع کی اس حد سے بڑھی ہوئی فلاکت کے دور کرنے کی خاطر کسانوں میں وسعت نظر، خود اعتمادی اور خود اعانتی کا جذبہ پیدا کیا جائے۔ اسی کے ساتھ ان کی آمدنیوں میں اضافہ کی خاطر ان کی زراعت کو زیادہ منفعت بخش ان کے اوقات فرصت کو پیدا آور بنایا جائے۔ خصوصاً ساہوکاری لین دین کی لعنتوں سے انھیں نجات دلائی جائے۔ اگر تعلیم کے ساتھ ساتھ ان امور کے جانب موثر اور عملی توجہ کی گئی تو باشندگان موضع کی خوش حالی کے وسیع قراین موجود ہیں۔ فقط

شیخ محبوب علی متعلم بی اے

بیداری

خزاں کا دور ہوا ختم پھر بہار آئی
عروس گل نے اُٹھائی نقاب چہرہ سے
نئے سرے سے ہوئے تازہ داغ لالہ کے
صبا نے چوم لیا منہ حسین کلیوں کا
نسیم صبح نے جھولے جھلائے شاخوں کو
چمن میں چڑیوں نے گائے نئے نئے گانے
ہر ایک چیز میں پیدا اک انقلاب ہوا
مری حیات نے بھی ایک تازہ کروٹ لی
مرے خیال نے بھی اک نیا ورق الٹا

قدیم نظریے بیکار سے نظر آئے
پُرانے شوقوں میں دلچسپیاں ذرا نہ رہیں
نئے خیال نئے ولولے نئے ارماں
غرض بدل گئے میرے تمام احساسات
مری نگاہ نے رمزِ حیات ڈھونڈھ لیا
سمجھ میں آ گئے اسرارِ زندگی مجھکو
کُھلا کہ ذرّہ بے مایہ بھی نہیں ناچیز
ہر ایک چیز کے دل میں ہے آرزوئے کمال
ہر ایک شے کو ازل سے ہی جستجوئے کمال
نہ صرف سینۂ گل ہی میں ہے بہارِ کمال
ضمیرِ خار میں بھی ہے نہاں شرارِ کمال
جو بن پڑے تو یہ کانٹے گلاب بن جائیں
گلاب بن کے گل آفتاب بن جائیں
کُھلا یہ راز تو سب کچھ بُھلا دیا میں نے
ہر ایک نقشِ تمنا مٹا دیا میں نے
مگر وہ داغِ محبت کہ ہے جو حاصلِ زیست
تلاشِ منزلِ تکمیل میں اُٹھوں گا جب

وہی چراغ ہدایت بنے گا میرے لئے
اُسی کے نور میں یہ راہ طے کرونگا میں
مرے حبیب! تجھے ساتھ لے چلونگا میں
کہ تو نہ ہو تو ہے بے صرفہ جستجوے کمال
ترے بغیر ہے ناممکن العمل یہ خیال
"بیا کہ قاعدۂ آسماں بگردانیم"
چلیں تلاش کریں منزل حقیقت کو
بہم عبور کریں بحر زندگانی کو
خوشی کے گیت بھی گائیں بہ سرخوشی شباب
بہ سعیِ مقصد فطرت بہائیں آنسو بھی
بناؤں گا میں تجھے اپنا ہمدم و ہمساز
رفیقِ رنج و مسرت شریک راز و نیاز
مری حیات کا مقصود بن کے آجا تو
یہ انتظار ہے اب کیوں بلا توقف آ!
جھجک فضول ہے بے پردہ بے تکلف آ!
نگاہ ناز کی باتیں سمجھ رہا ہوں میں
"نہیں" میں "ہاں" کے اشاروں کو جانتا ہوں میں

اُٹھا کے کسوتِ فانوس آ بھی جا باہر
یہ قیدِ خلوتِ ناموس تا کُجا آخر
حیاتِ عشق کی رسوائیوں کو دیکھ ذرا
پھر اپنے حسن کی معصومیوں کو رسوا کر
کہ حسن و عشق پہنچ جائیں ایک منزل پر
وہی کمال کی منزل ہے جس کا نام "بقا"
جہاں فنا کا گزر ہے نہ رنجِ فرقت کا
جہاں حیات کو موجِ نسیم کہتے ہیں
"جہاں خلش کو سکونِ عظیم کہتے ہیں"
وہی مقام ہے سرچشمۂ عشق و الفت کا
وہی ہے نقطۂ آغاز مسرتِ تکمیل
وہاں پہنچ کے پرانے نظام کو چھوڑیں
جہانِ زندگیٔ ناتمام کو چھوڑیں
نئی حیات کا ہو اُس مقام سے آغاز
کریں فضائے محبت میں ساتھ دل پرواز

اختر

خطبۂ افتتاحیہ نواب سر حیدر نواز جنگ بہادر

صدر اعظم باب حکومت سرکار عالی

رائٹ آنریبل نواب مستطاب سر حیدر نواز جنگ بہادر نے انڈین اکونامک کانفرنس کے اکیسویں اجلاس کا افتتاح کرتے ہوئے جو تدبر آمیز خطبہ ارشاد فرمایا تھا ہر چند کہ وہ بعض مقامی اخباروں میں شایع ہو چکا ہے اس کی بے نظیر افادیت اس امر کی مقتضی ہے کہ اس خطبہ کو "مجلۂ عثمانیہ" میں شایع کرنے کا شرف حاصل کیا جائے تاکہ مستقبل میں ملک و ملت کی باگیں سنبھالنے والے وابستگان "عثمانیہ" کی توجہ ایک مرتبہ اور اس امر کی جانب ملتفت ہو سکے کہ مدبر اکبر کا دماغ سلطنت کی فلاح و بہبود اور اس کے مستقبل کو شاندار بنانے کے لئے کیسی کیسی انوکھی اور بے مثال تدبیریں سوچ رہا ہے۔

مدیر

خواتین و حضرات!

مجھے اجازت دیجئے کہ میں سب سے پہلے ارکین مجلس استقبالیہ اور مجلس کے صدر نواب مہدی یار جنگ بہادر کی خدمت میں

اظہار تشکر کروں کہ انھوں نے انڈین اکنامک کانفرنس کے اکیسویں اجلاس کا افتتاح کرنے کی مجھے دعوت دی۔ ہندوستان کی سب سے بڑی ریاست کے دار السلطنت میں ملک کے اتنے ممتاز ماہرین معاشیات کو خوش آمدید کہنے کا جو موقع مجھے آج ملا ہے اُس کی میں دل سے قدر کرتا ہوں۔ میں یہ باور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں کہ یہ محض حسن اتفاق ہے کہ آپ نے اس سال حیدرآباد کو اپنے اجلاس کا مرکز منتخب کیا۔ درحقیقت میں آپ کے اس انتخاب کو بہت معنی خیز سمجھتا ہوں۔ ماہرین معاشیات کی حیثیت سے آپ قدرتاً ان تعلقات سے باخبر ہیں جو ہندوستانی ریاستوں کو برطانوی ہند سے منسلک کرتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ آج آپ کی اس جگہ موجودگی سے ریاستوں کے اُس مرتبہ کی اہمیت کا ایک اور ثبوت ——— اگر کسی ثبوت کی ضرورت ہو ——— ملتا ہے جو مادر وطن کے اجتماعی نظام میں اب مسلمہ ہے۔

اُس زمانہ کو گذرے ہوئے تو بہت دن ہو گئے جب ریاستوں کو نامرغوب ملحقات میں سمجھا جاتا تھا۔ اب تو یہ امر تسلیم کیا جا چکا ہے کہ ریاستیں اس سیاسی تحریک عمل کے روایتی علمبردار ہیں جو ہماری تاریخ کو طویل صدیوں میں اپنے کو نمایاں کرتی رہی ہے۔ یہ تحریک عمل ان تمدنوں کی حیرت انگیز وسعت و اقسام سے پیدا ہوئی جن میں ہندوستان کا جاہ و جلال مضمر ہے۔ ان تمدنوں کی حفاظت ہماری قومی وراثت کا ایسا ہی ایک جزو ہے جیسا کہ ہمارے ملک کا یہ حق کہ وہ اپنے مستقبل کا خود مختار ہو۔ ریاستیں بہت قدیم زمانہ سے ہندوستان کی تہذیب و تمدن کے روایتی گہوارے ہیں اور ان گہواروں نے اوضاع زمانہ کے تمام تغیرات میں ملک کی قدیم تہذیب کے تصورات کو محفوظ رکھا ہے۔ ہندوستان کی بیش بہا مقامی تہذیبوں کی یہ کثرت ملک کی ترقی میں سد راہ نہیں ہو سکتی اور برطانوی ہند میں جس صوبہ واری خود مختاری کا چند روز ہوئے افتتاح ہوا اس کے ذریعہ مقامی اختلافات کا وہ اصول تسلیم کر لیا گیا ہے جو ہمارے ملک کے اساسی اتحاد ہی کا دوسرا پہلو ہے۔ دراصل اس عظیم الشان سرزمین ہند کی عافیت اسی پر منحصر ہے کہ اُن دو قوتوں کے درمیان صحیح توازن قائم رہے جن میں سے ایک اتحاد و اتفاق کی تشکیل کرتی ہے اور دوسری اُس جد و جہد سے تقویت حاصل کرتی ہے جو مقامی خود مختاری کے لئے ہر زمانہ میں جاری رہی ہے۔ اپنے اپنے مخصوص دائرہ عمل میں ان دونوں قوتوں کا توازن ناگزیر ہے اور تاریخ ہم کو بتاتی ہے کہ جب کبھی ایک قوت دوسری قوت کے حلقۂ عمل میں دخل انداز ہوئی تو سارے ملک نے نقصان اُٹھایا۔ مجھے اس واقعہ کی طرف اشارہ کرنے کی اجازت دیجئے کہ اسی بنیادی حقیقت کے احساس نے خانوادۂ آصفیہ کو ہمیشہ اس حکمتِ عملی کے اختیار کرنے پر مائل کیا کہ ایک طرف ہندوستان کے

اجتماعی مفاد کو ترقی دیں اور دوسری طرف ان قدیم انتظامی، تمدنی، سماجی اور معاشی روایات کی دولت کو محفوظ رکھیں جو ممالک محروسہ کے باشندوں کے فطری جوہر کا امتیاز ہیں، اسی لئے حیدرآباد میں ہم بعض اعتبارات سے تمام ہندوستان کی حیثیت مجموعی کی ایک چھوٹی سی تصویر دیکھ رہے ہیں۔ اس دکنی تمدن کو جو ہماری امتیازی خصوصیت ہے گزری ہوئی صدیوں میں مختلف نسلوں اور مختلف مذاہب کے باہمی امتزاج نے رفتہ رفتہ تعمیر کیا ہے اور دکنی تمدن کی اس ترکیب ہیئت میں مسلمان ہندو اور بدھ مت والے تمام عناصر نے حصہ لیا ہے۔

خواتین و حضرات! مجھے یقین ہے کہ آپ کو اپنی اس سیاحت میں جو ہمارے لئے باعث مسرت ہے حسن کاری اور فن تعمیر کے اس گہوارہ میں اُن گرانقدر خزانوں کو بچشم خود دیکھنے کے مواقع ملیں گے جو ہندوستانی تمدن کی دولت میں گویا حیدرآباد کا مخصوص حصہ ہیں۔ اور میں آپ کو یہ بھی یاد دلانا چاہتا ہوں کہ ادبیات و علوم کی دنیا میں بھی وہ دکنی تمدن جس کا میں نے ذکر کیا ہے اپنی مخصوص فتوحات جتلا سکتا ہے اس طرح اعلیحضرت بندگان عالی کی سلطنت کے اندر ہماری زندگی "کثرت میں وحدت" کی مثال رکھتی ہے جو تمام ہندوستان کی اجتماعی زندگی کی ایک نمایاں خصوصیت ہے۔

پس جس طرح ہم نے اپنی قومی وراثت میں بیرونی تمدنی اثرات کا خیر مقدم کیا ہے اور انھیں اپنی تہذیب کے عناصر میں داخل کر لیا ہے اسی طرح آج اس موقع پر بھی ہم آپ سے توقع کرتے ہیں کہ آپ اپنے تجربہ کی روشنی اُن مسائل پر ڈالیں گے جو ہمارے اور آپ کے درمیان مشترک ہیں۔

کیا آپ مجھے اجازت دیں گے کہ میں مختصراً بعض اُن مباحث کی طرف اشارہ کروں جو آجکل تمام ہمدرد انسانوں کی گہری توجہ کا مرکز ہیں۔ وہ ایک مسئلہ جو شاید سب سے زیادہ اور سب سے پہلے ہم سب کے خیال میں آجاتا ہے بیروزگاری کا مسئلہ ہے۔ اس موضوع پر بہت لکھا اور کہا جا چکا ہے۔ اور بیروزگاری کے اسباب کو مختلف نقطہ ہائے نظر سے جانچا گیا ہے۔ مگر فی نفسہ اس مسئلہ کی بنیادی حقیقت بہت سادی ہے یعنی یہ کہ اس وقت اُن لوگوں کے لئے جو پیدا آور محنت کرنا چاہتے ہیں کافی کام موجود نہیں۔ میری رائے میں یہ مسئلہ در اصل حالات میں از سر نو تطابق پیدا کرنے کا مسئلہ ہے۔ ہمارے ملک میں تقریباً ہر قسم کے قدرتی ذرائع موجود ہیں۔ اگر ان کو زیادہ وسیع پیمانہ پر استعمال کیا جائے تو کم از کم میں تو یقین نہیں کر سکتا کہ ہر شخص کو کام نہیں ملے گا۔ بہرصورت حالات میں از سر نو تطابق پیدا کرنا ضروری ہے۔

ایک طرف تو یہ لازم ہے کہ ہم اپنے نظم معیشت میں اس قدر ترمیم کر دیں کہ سائنس کے طریقوں اور اصولوں کے مطابق ہم اپنے قدرتی ذرائع کو استعمال کر سکیں اور دوسری طرف ہم کو اپنے رائج الوقت طرز تعلیم میں اس طرح تغیر و تبدل کرنا چاہئے کہ ہماری نئی نسل اُن مواقع اور امکانات سے کافی فائدہ اُٹھا سکے جو اس تغیر سے پیدا ہوں گے۔

میری رائے میں بیروزگاری کا اصلی علاج یہی ہے کہ ہم اپنے طرز تعلیم کو مسائل حاضرہ کے مطابق بنا دیں۔ جس قدر جلد ہم یہ تغیر پیدا کر سکیں گے اسی قدر جلد ہم موجودہ بے ترتیبیوں کا خاتمہ کر سکیں گے اور ان تکلیف دہ مشکلات کو بھی رفع کر سکیں گے جن کا سامنا گریجویٹ اور انڈر گریجویٹ نوجوانوں کو کرنا پڑتا ہے جو کام کے باوجود کام کی بے سود تلاش میں سرگرداں ہیں۔

آپ کو یہ سن کر خوشی ہوگی کہ اس ریاست میں طریق تعلیم کی از سر نو تنظیم اسی خیال پر مبنی ہے کہ اُس کو اہل ملک کی ضروریات کے مطابق بنایا جائے۔ مجھے یقین ہے کہ اس حکمت عملی سے ہم دوہرا فائدہ حاصل کریں گے۔ یعنی ایک طرف تو ہم کو یہ امید ہے کہ ہم اس طرح بڑی حد تک تعلیم یافتہ بیروزگاری کے مسئلہ کو حل کر لیں گے اور دوسری طرف ہمارا مقصود یہ بھی ہے کہ ہم ملک کے اقتصادی ذرائع کو وسیع پیمانہ پر ترقی دے سکیں۔ ان فوائد کے یکجا جمع ہونے سے کئی دوسرے فوائد بھی حاصل ہوں گے۔ وہ نئے طریقے اور وسائل جو ہم کو سائنس اور علوم کی ترقی اور ان کے استعمال سے معلوم ہوئے ہیں جب کام میں لائے جائیں گے نتیجتاً ہماری معاشی تنظیم میں زیادہ توازن پیدا ہو جائے گا۔ اس طرح حکومت اور رعایا دونوں قدرتی وسائل اور تربیت یافتہ ذہانت کے ترقی پذیر اتصال سے یکساں مستفید ہو سکیں گے پورے اعتماد کے ساتھ آپ حضرات سے توقع کرتا ہوں کہ آپ کے مباحث ان مسائل میں بہت سے مسائل پر روشنی ڈال سکیں گے۔

ایک اور مسئلہ جو بلا شبہ آپ کے پیش نظر ہوگا مقامی ساہوکاری کا سوال ہے۔ اس مسئلہ کی بعض مشکلات جو اس ریاست کے درپیش ہیں تقریباً وہی ہیں جن کا آپ میں سے اکثر حضرات نے مختلف صوبوں میں مطالعہ کیا ہوگا۔ دوسرے مقامات کی طرح حیدرآباد میں اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ ملک کے لاتعداد چھوٹے اور بڑے ذرائع اصل کے درمیان تعلق اور ارتباط پیدا کیا جائے۔ اس حد تک ہمارا کام بھی بالکل وہی ہے جو بحیثیت مجموعی تمام ملک کا کام ہے۔ گو اب کاروبار میں ہندوستانی سرمایہ کے ضرب المثل شرمیلے پن کا ذکر ہم بہت کم سنتے ہیں۔ تاہم ملک کے لئے ایک ایسے طریق بنک کی ارتقاء میں ابھی تک دشواریاں نظر آتی ہیں جسمیں موجودہ سرمایہ کو بہترین طریقہ پر استعمال کرنا ممکن ہو

حیدرآباد میں ہم اس وقت جس خاص نہج پر ان امکانات کی تحقیق کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ ہمارے تمام ذرائع اصل میں اس طرح تطابق پیدا کر دیا جائے کہ ہم ان کو ریاست کی زراعتی اور صنعتی تعمیر جدید میں زیادہ سے زیادہ موثر بنا سکیں آج کل مسئلہ کے اس پہلو پر ماہرانہ تحقیقات کی جا رہی ہے اور ہم کو امید ہے کہ آپ کے مباحث سے بھی ہم خاطر خواہ فائدہ اُٹھا سکیں گے۔ مقامی ساہوکاری سے تجارتی گردش کا مسئلہ بھی وابستہ ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم بار بار پیدا ہونے والی تجارتی مرفہ الحالی اور کساد بازاری کا تجزیہ کریں۔ ظاہر ہے کہ ہم میں سے اُن لوگوں کے لئے جو نظم و نسق سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ معاملہ بہت ہی اہم ہے اس لئے کہ یہ مدوجزر جس معاشی بربادی کا باعث ہوتا ہے وہ لازماً حکومت کی تمام ہیئت ترکیبی میں درہمی پیدا کر دیتی ہے یہ صورت حال ایسی ہے کہ بہت سے مغربی ممالک میں بھی۔ جیسا کہ آپ کو معلوم ہوگا۔ حکومت کا یہ فرض سمجھا جاتا ہے کہ وہ جہاں تک ممکن ہو تجارتی گردش کی رفتار پر ایسے طریقوں سے اثر ڈالے جو عارضی مرفہ الحالی کی اونچائی کو ہموار کرتے رہیں اور کساد بازاری کے ڈھال میں تدریج قائم رکھیں۔

آپ کے پروگرام کا ایک موضوع صوبہ واری مالیات کی بحالی کا مسئلہ ہے۔ یہ معاملہ بھی انتہائی اہمیت رکھتا ہے۔ صوبوں میں حکومت خود اختیاری کی کامیابی کا معیار صرف وہ فائدہ ہے جو حکومت رعایا کو پہنچا سکے اور یہ کامیابی بڑی حد تک لازماً اس امر پر منحصر ہوگی کہ وہ لوگ جو صوبہ واری حکومت کی عنان اپنے ہاتھوں میں لے رہے ہیں وہ کہاں تک اُن مالی ذرائع کو سائنٹفک طریقہ پر استعمال کر سکیں گے جن پر انھیں اختیار حاصل ہوا ہے۔ شاید آپ کے لئے وہ طریقۂ کار دلچسپی کا باعث ہو جو بہت محتاط تجربات کے بعد ہم نے حیدرآباد میں اختیار کیا ہے۔ یہاں ہمارا سررشتۂ مالیات ہر سررشتہ کے لئے اس کے سالانہ اوسط اخراجات کی بنیاد پر سہ سالہ بجٹ بندی کرتا ہے۔ تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ یہ طریقۂ کار ایک طرف تو ترقی کی دوررس تجاویز کا معاون ہوتا ہے اور دوسری طرف اُن اخراجات کو روکتا ہے جو سالانہ بجٹ کے تحت، جہاں بچت واپس کرنی پڑتی ہے کبھی کبھی ختم سال کے قریب سررشتوں پر عائد ہوتے ہیں نیز ہم نے یہ مزید نزاکت پیدا کر دی ہے کہ سہ سالہ بجٹ بندی کے اختتام پہ جو بچت ہوتی ہے اُس کو پس انداز کنندہ سررشتوں اور اُن سررشتہ جات کے مابین تقسیم کر دیا جاتا ہے جو قومی تعمیر کے کاموں میں مصروف ہیں۔ خود ہمارا تجربہ یہ ہے کہ یہ طریقۂ کار انتظامی معاملات میں کفایت شعاری اور بہتر کارکردگی کا معاون ہے۔ ممکن ہے — میں قطعی طور پر ادعا نہیں کر رہا ہوں — کہ

یہ طریقہ کاجو ہمارے لئے اس قدر مفید ثابت ہوا ہے ملک کے دوسرے حصوں میں بھی مفید ثابت ہو۔ لیکن اس کا تو مجھے یقین ہے کہ اس قسم کے تجربے جن سے ہم کو حیدرآباد میں مالیات کی سررشتہ داری بجیل بندی کا خیال پیدا ہوا اگر تمام ملک میں کئے جائیں تو وہ خود بحیثیت مجموعی ملک کے لئے فائدہ سے خالی نہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ بمقابلہ برطانوی ہند کے ہندوستانی ریاستوں میں تجربے کرنا آسان ہے اور اس موقع پر پھر میں آپ سے درخواست کروں گا کہ آپ ان فوائد کا اندازہ کریں جو ہمارا ملک بحیثیت مجموعی اس "کثرت" حالات سے حاصل کرسکتا ہے جس سے ہمارے ملک کی "وحدت" تعمیر ہوئی ہے۔

ان تمام مسائل کی جن کا میں نے ذکر کیا ہے ایک اصولی شرط یہ ہے کہ معاشی حقایق کی کافی معلومات حاصل ہونی چاہئیں۔ چنانچہ گذشتہ سال اس جگہ سائنس کانگریس کے اجلاس پر میں نے علم الاعداد کی اہمیت پر توجہ دلائی تھی۔ ماہرین معاشیات اور ارباب حکومت دونوں کے لئے صحیح اعداد ہی تنہا رہنما ہیں، تجربہ شاہد ہے کہ صحیح واقعات کی جانبدارانہ جانچ کے مقابلہ میں اپنے ذاتی رجحانات کے تحت نتائج اخذ کرنا زیادہ آسان ہے لیکن اگر ہم صحیح اعداد کا علم نہیں رکھتے تو کوئی شخص ہم سے یہ توقع کیونکر کرسکتا ہے کہ ہمارے فیصلے ذاتی تعدیل سے متاثر نہیں ہوں گے۔ سیاسی جماعت بندیاں، انتخابی سرگرمیاں اور رائے عامہ کو اپنے موافق بنانے کی ضرورت، ان سب کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کسی ایک یا دوسرے نقطۂ نظر کا جانبدار بن جاتا ہے۔ صحیح اعداد کی امداد کے بغیر ہمارے پاس کوئی ایسا مواد نہیں ہوتا جس کی بنیاد پر ہم صحیح فیصلہ کرسکیں اور اگر ایسا مواد دستیاب بھی ہو جائے تب بھی یہ ضروری ہے کہ ہم اس پر غیر جانبدارانہ غور کریں۔ ہم کو فرقہ پرستی کی زنجیروں سے آزاد ہونا چاہئے اور ہم کو اپنے اغراض کے بنیادی اتحاد کو تسلیم کرنا چاہئے۔ اگر مجھے اجازت ہو تو میں کہوں کہ اس سمت میں انڈین اکنامک کانفرنس جو ایسے لوگوں پر مشتمل ہے جن میں علمی تجربوں نے غیر جانبدارانہ نقطۂ نظر سے معاملات دیکھنے کی صلاحیت پیدا کر دی ہے ملک کے مدبروں اور ارباب حکومت کی بیش بہا رہنمائی کرسکتی ہے۔ حیدرآباد میں ہم نے ان فرائض کا صحیح اندازہ کرنے میں تاخیر نہیں کی جو انڈین اکنامک کانفرنس تمام ملک کے لئے انجام دے رہی ہے۔ خود ہم نے بھی ۱۹۱۹ء سے ایک سررشتہ اعداد و شمار قایم کیا ہے، نیز ریاست کے معاشی مسائل کا غیر جانبدارانہ مطالعہ کرنے کے لئے

اپنی ایک ایکونامک ایسوسی ایشن قائم کرلی ہے اور جامعہ عثمانیہ میں بھی ایک " اسکول آف اکنامکس قائم ہوچکا ہے جو اپنی توجہ کا ایک حصہ اعلیحضرت بندگانعالی کی سلطنت کی معاشی ضروریات کے مطالعہ میں صرف کررہا ہے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ ایسے محققین کی ایک جماعت کو یکجا کر کے جن کی نظر ہم سب کے مشترکہ مفاد پر مستقل مزاجی کے ساتھ جمی ہو ہم نہ صرف ریاست کی معاشی ترقی میں عملی اضافہ کرتے ہیں بلکہ ہم اُس فرقہ واری احساس اور جانبدارانہ فیصلے کو بھی مسترد کردیتے ہیں جس سے غیر ضروری تصادم پیدا ہوا کرتا ہے۔

حیدرآباد کی صورت حال ایک معاشی لائحہ عمل کی متقاضی ہے۔ ہم کو خود ان خطرات کا قومی احساس ہے جو ان مسائل میں کافی غور وفکر کے بعد بغیر سرکاری مداخلت سے پیدا ہو سکتے ہیں۔ نیز جب تک معاشی ترقی ایک مرتبہ نقشہ کے مطابق روبہ عمل نہ ہو تمام گذشتہ محنت اور تحقیق بے سود ثابت ہوگی اور متوقعہ ترقی محض بے مقصد راہ روی ہوکر رہ جائے گی پس ان ہی اصولوں پر ہم ان مسائل کا مقابلہ اور ان پر غور وفکر کررہے ہیں جو معاشی دائرہ میں ہمارے درپیش ہیں۔ میں پہلے ذکر کرچکا ہوں کہ ہم پیشہ وری تعلیم پر کس قدر زور دے رہے ہیں اور میں بنکوں اور لین دین کے کاروبار کے متعلق موجودہ تحقیقات کا بھی تذکرہ کرچکا ہوں۔ علاوہ بریں کھیتوں کی یکجائی اور قرضہ کی ادائی اور زیادہ محفوظ حق اراضی کے ذریعہ سے اور اسی کے ساتھ —— جیسا کہ بلاشبہ ضروری ہے —— طریق کاشت اور زمین کی حالت کو بہتر بنا کر ملک کے مزارعین کو معاشی گرانباری سے سبکدوش کرنے کے امکانات پر بھی تحقیقات جاری ہیں۔ توقع ہے کہ لین دین اور بنک کے کاروبار کی تحقیقات کے سلسلہ میں ایسے مواقع پر جہاں باقاعدہ خرید وفروخت اور پیداوار کی درجہ بندی کا کام ہو رہا ہے ہم قرض گیری کے لئے مزید آسانیوں کی داغ بیل ڈال سکیں گے۔ اس کے علاوہ ہم سستی برقی قوت مہیا کرنے کا ارادہ بھی رکھتے ہیں اور اب اس غرض سے پیمائش کا کام جاری ہے تاکہ اس ریاست میں پانی سے برقی قوت مہیا کرنے کے ذرائع سے فائدہ اُٹھایا جائے۔ اس طرح مزید ریلوے کی توسیع بھی ان رقبوں کا راستہ کھول دے گی جو بہت بڑے معاشی امکانات رکھتے ہیں۔ اصلاح و ترقی کا نقشہ جو ہم نے بنایا ہے اُس کا ایک ضروری جزو یہ بھی ہوگا کہ ہم اچھی طرح سوچ لیں کہ خانگی کاروبار اور سرکاری دائرہ عمل میں توازن قائم رکھنے کا بہترین طریقہ کیا ہوگا۔

مجھے امید ہے کہ میں نے آپ کا بہت زیادہ وقت نہیں لیا ہے۔ میں توقع کرتا ہوں کہ میرے ان کلمات سے

آپ یہ محسوس کرسکے ہوں گے کہ ہم سب آپ کے اس اجتماع میں کس قدر گہری دلچسپی لے رہے ہیں اور کس قدر ذوق وشوق کے ساتھ آپ کے مباحث کا انتظار کر رہے ہیں۔ یہ مباحث بلاشبہ ان مسائل پر روشنی ڈالیں گے جو ہمارے اور آپ کے لئے مشترکہ طور پر باعث فکر و تردد ہیں۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ملک کے معاشی مفاد کے لئے ہم سب صدق دل سے آپ کی سرگرمیوں میں شریک ہیں۔

خواتین وحضرات! میں نہایت مسرت کے ساتھ انڈین اکنامک کانفرنس کے اکیسویں اجلاس کا افتتاح کرتا ہوں۔

اقبال کا اثر اُردو شاعری پر

اقبال ایک عہد آفریں شاعر ہیں۔ اُن کے کلام سے اُردو شاعری کا متاثر ہونا لازمی ہے لیکن ہم سے زیادہ ہمارے بعد آنے والی نسلیں اس اثر کو ٹھیک ٹھیک طور پر متعین کر سکیں گی۔ کسی شاعر یا ادیب کی زندگی میں اس کی خدمات کا کامل اندازہ مشکل سے کیا جا سکتا ہے۔ خاص کر اقبال جیسے شاعر کی خدمات کا، جس کی ذہنی دنیا میں اب تک کئی انقلاب آئے، اور جس کا ہر نیا کارنامہ ایک نئے رنگ میں رنگا ہوا منظر عام پر آتا رہا۔

اقبال کی شاعری ان کے قلب و دماغ کی کشمکشوں کی آئینہ دار رہی ہے۔ انھوں نے اپنے جدید مجموعۂ کلام میں اپنی نسبت بالکل ٹھیک لکھا ہے

اسی کشمکش میں گذریں مری زندگی کی راتیں ... کبھی سوز و ساز رومی، کبھی پیچ و تاب رازی

مگر یہ اردو شاعری کی خوش قسمتی ہے کہ اُس کے شاعر اعظم کا سوز و ساز اور پیچ و تاب بیکار نہیں ثابت ہوا۔ اقبال کی شاعری کا ہر دور ایک نئی بہار اپنے ساتھ لا رہا ہے۔ ان کی فطرت پرستی، ان کی وطن دوستی، ان کا فلسفہ، مولانائے روم سے ان کی والہانہ عقیدت، ان کا ذوق آگہی، ان کی تہذیب مغرب سے بیزاری، ان کی جرأت رندانہ، ان کی فقیری و قلندری، غرض ان کے ذہنی ارتقاء کا ہر پہلو ایک نئی شان سے ان کے کلام میں جلوہ گر ہے۔ وہ جو چاہیں موضوع اختیار کریں ان کا کمال شاعری ہر جگہ نمایاں ہے۔ ان کے قلب و دماغ کی غیر معمولی وسعتیں اور بے پناہ ہمہ گیریاں ان کے ہر طرز کے کلام پر اثر انداز ہیں۔ وہ جس رنگ کا چاہیں

جامہ پہن لیں ان کا انداز قد چھپ نہیں سکتا۔

اقبال کی شاعری کے مختلف دور، ان کے کلام کی اہم خصوصیتیں اور اردو شاعروں میں ان کا درجہ، یہ سب ایسے موضوع ہیں جن پر اطمینان کے ساتھ کچھ نہ کچھ کہا جا سکتا ہے لیکن ان کے کارنامے اردو شاعری کو کس طرح متاثر کر رہے ہیں، اور اردو کے جو شاعر اُن سے متاثر ہو رہے ہیں وہ ہندستان کی جدید سیاسی فضا میں اس اثر کو کس حد تک باقی رکھیں گے، اور مستقبل کی ضرورتوں کے لحاظ سے اس رنگ میں کس طرح کی تبدیلیاں کریں گے اس کا صحیح اور کامل اندازہ مستقبل ہی میں ہو سکے گا۔ اسوقت تو یہ بھی یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ خود اقبال اپنے اس مسلسل سوز و ساز اور پیہم پیچ و تاب کی وجہ سے کس منزل پر جا کر ٹھہریں گے؟ اور ان کی شاعری ابھی کس کس طرح کی فن کاریوں سے مزین اور کیسے کیسے کمالات سے بہرہ ور ہونے والی ہے؟ تاہم "زرہ مثال امر" اس موضوع پر کچھ نہ کچھ کہنا ضروری ہے اس لئے اردو شاعری کی تاریخ پر آئندہ کے متعلق جو نتائج اخذ کئے جا سکتے ہیں انہی کے بل بوتے پر اظہار خیال کرنے کی جرأت کی جاتی ہے۔

اردو زبان و ادب کی تاریخ سے دلچسپی رکھنے والے اچھی طرح واقف ہیں کہ ہماری شاعری اب تک جو مدارج طے کرتی آئی ہے اور جس طرح مختلف ادوار میں مختلف رجحانات کی حامل رہی ہے وہ زیادہ تر اقبال جیسے عظیم الشان شاعروں ہی کی جدت پسندی کا نتیجہ ہیں۔ ابتدا میں اُردو شاعری مذہبی خیالات کی تبلیغ اور عقاید کی اشاعت کے لئے استعمال کی گئی۔ چنانچہ بزرگان دین نے عوام کی خاطر اردو میں شعر لکھے جو عام مجالس سماع میں گائے جانے کے علاوہ شرفا کی محفلوں میں بھی مثنوی مولانا رومؒ کی طرح پڑھ کر سنائے جاتے تھے۔

یہ اُردو کا ابتدائی دور تھا۔ اس کے بعد ایک زمانہ آیا کہ ہندستان میں اسلامی حکومت استوار ہو گئی اور استحکام سلطنت کے ساتھ ہی رزم آرائیاں بزم آرائیوں میں منتقل ہونے لگیں ایسے وقت میں گولکنڈہ کے ایک اہل ذوق تاجدار سلطان محمد قلی قطب شاہ نے اردو شاعری کے ابتدائی مذہبی رجحان کو ادبی رنگ سے بدل دیا۔ وہ پہلا عظیم الشان اُردو شاعر ہے جس نے ہماری شاعری کو جملہ فن کارانہ خصوصیوں سے مالا مال کر دیا۔ اس کا نام نہ صرف شہر حیدرآباد کا بانی ہونے کی حیثیت سے تاریخ میں زندہ رہے گا بلکہ اردو شاعری کو فارسی کے پہلو بہ پہلو لا کھڑا کرنے کے سبب اور جملہ اصناف سخن میں پہلا اردو دیوان مرتب کرنے کی وجہ سے بھی ہر اردو داں سے خراج عقیدت حاصل کرتا رہے گا۔

یہ پہلا اُستاد سخن تھا جس کے اثر سے ہماری شاعری مذہبی رنگ اور محدود اصناف سخن کی قیود سے آزاد ہو گئی۔

اور ایک نئے دور کا آغاز ہوا۔

محمد قلی قطب شاہ کے بعد دوسرا عظیم الشان اُردو شاعر جس نے ہماری شاعری کو متاثر کیا ولی اورنگ آبادی ہے جس کو بابائے ریختہ کہا جاتا ہے اور جس کی عہد آفرینی کی یاد میں گزشتہ سال اسی فرخندہ بنیاد میں دو صد سالہ جشن منایا گیا تھا۔

ولی ایک ایسے زمانہ میں پیدا ہوا جب سلطان محمد قلی کی سلطنت کے ساتھ ساتھ اس کا پیدا کیا ہوا دور شاعری بھی ختم ہو رہا تھا۔ ایسے نازک وقت میں اردو کو سنبھالنا اور اُردو شاعری کا بول بالا کرنا ولی ہی کی کرامت تھی چنانچہ ولی نے فاتحین کے روزمرے اور دہلی کے لشکر یا اُردوے معلی کی زبان سے مفتوحین کی زبان یعنی دکنی اُردو کا امتزاج کیا اور اس طرح اُردو دکن کے علاوہ شمال میں بھی شعر و شاعری کے لئے رواج پا گئی ورنہ اس سے قبل وہاں کی علمی و ادبی زبان فارسی تھی اور اگر اسوقت تک وہاں اُردو میں کچھ لکھا بھی گیا تھا تو اس کی حیثیت ویسی ہی تھی جیسی دکن میں محمد قلی کی عہد آفرینی سے قبل کے اردو کارناموں کی تھی۔ ولی کا اثر اتنا ہمہ گیر تھا کہ دہلی کے تمام فارسی گو شاعروں نے ولی کی تقلید میں اُردو میں شعر کہنا شروع کر دیا اور یہ زبان جو اُس وقت تک بازاروں میں بولی جاتی تھی اور عوام کے اظہار خیال کا ذریعہ تھی خواص کی محفلوں اور ادبی مجلسوں میں باریاب ہو گئی۔

ولی کے بعد مرزا مظہر جان جاناں کی ایسی ہستی تھی جس نے پھر اردو شاعری کو متاثر کیا اور اس کا رُخ بدل دیا۔ مرزا مظہر نے یہ تحریک شروع کی کہ ولی کی زبان میں شعر کہنے کے بجاے دہلی کے شعرا کو خالص اردوے معلی کی زبان میں شاعری کرنی چاہئے۔ کیونکہ ایک دوسرے ملک کی زبان اور محاورہ کی تقلید میں کامیابی حاصل کرنا غیر فطری امر ہے۔ حضرت جان جاناں کی یہ تحریک آسانی سے کامیاب نہ ہو جاتی اگر میر و سودا جیسے رفیع المرتبت شعرا ان کے خیال پر عمل پیرا نہ ہوتے۔ ان دو اساتذۂ سخن کا اُردو شاعری پر اتنا اثر پڑا کہ اُردو زبان سے دکنی عنصر کم ہونے لگا اور چونکہ دکنی الفاظ کو کم کر کے مغلیہ لشکر یا اُردوے معلے کے الفاظ اور محاورے رائج کئے گئے تھے اس لئے اس زبان کا نام ہندستانی باقی نہ رہا بلکہ زبان اُردو قرار پایا۔

اس دور سے پہلے ہماری زبان کا نام اُردو نہیں تھا۔ بلکہ ہر جگہ کے لوگ اس کو اپنے مقام کی ہندستانی یا ہندی کہتے تھے۔ مثلاً دکن کے عہد قطب شاہیہ کے شعرا یا مصنفین نے اپنی زبان کو یا تو ہندستانی کہا یا دکنی۔ غرض میر و سودا

کی وجہ سے مغلیہ لشکر یا اردو کے الفاظ کا ہماری زبان پر قبضہ ہو گیا۔
میر و سودا کے بعد لکھنؤ میں ناسخ و آتش نے اس زبان اور شاعری کو متاثر کیا جس کی وجہ سے اردو میں ہمہ گیری پیدا ہو گئی اور ایک ایسی باضابطہ اور منضبط زبان بن گئی کہ اب تک ہمارے شاعر لکھنو ہی کی معین کی ہوئی زبان میں شاعری کرتے ہیں۔
ناسخ و آتش کے بعد آزاد و حالی نے پھر اردو شاعری پر اثر ڈالا۔ اس دفعہ زبان سے زیادہ خیالات متاثر ہوئے کیونکہ لکھنوی شعرا نے زبان پر اتنا زور دیا تھا کہ اس کا ردعمل ہونا ضروری تھا مطالب و معانی کی خوبیوں کا اتنا خون ہوا تھا کہ اس کا رنگ لانا لازمی تھا۔ اس کے علاوہ چونکہ اس دور کی اردو شاعری اپنے عہد کی زوال پذیر معاشرت کی ترجمان تھی اس لئے اس میں وہ تمام عناصر راہ پاگئے جو قوموں کو ترقی سے زیادہ تنزل کی طرف مائل کرتے ہیں۔
یہی وجہ تھی کہ حالی اور آزاد نے اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور اپنی اپنی حد تک اپنے مقصد میں کامگار رہے۔ لیکن جس طرح مرزا مظہر جان جاناں کی تحریک میر و سودا کی وجہ سے کامیاب ہوئی اور اردو شاعری کی شکل بدل گئی بالکل اسی طرح حالی اور آزاد کی اصلاحی کوششیں آج کلام اقبال کی وجہ سے تکمیل کو پہنچ رہی ہیں۔
اقبال نے تخیل کی جولانیوں کے لئے ایسے ایسے میدان کھول دئے ہیں جن کی طرف اس سے قبل اردو شاعروں کی توجہ کبھی منعطف ہی نہیں ہوئی تھی۔ انھوں نے خیالی اور مصنوعی شاعری کو نظروں سے گرا دیا۔ اردو شاعروں کا فرضی معشوق اپنی کمر کی طرح اب خود بھی عنقا ہوتا جا رہا ہے۔ مصنوعی عشق بازی اور جھوٹی معاملہ بندی اب ہماری شاعری کی جان نہیں رہی۔ قصیدوں کی مبالغہ آمیزیاں اور مثنویوں کے فوق الفطری قصے جنوں اور پریوں کی طرح آہستہ آہستہ غائب ہوتے جا رہے ہیں۔ اقبال نے لفظی چٹکلوں اور دور از کار محاورہ بندیوں کی جگہ حقایق کی تلمیح اور سیاسیات حاضرہ کے ناگفتہ بہ مسائل کو اس خوبی سے شاعری میں داخل کر دیا ہے کہ اب اردو شاعری کے موضوع ہی بدل گئے۔ اور شاعری واقعی ساحری بن گئی اقبال نے صاف صاف اعلان کر دیا ہے

کہتا ہوں وہی بات سمجھتا ہوں جسے حق   نے ابلۂ مسجد ہوں نہ تہذیب کا فرزند
اپنے بھی خفا مجھ سے ہیں بیگانے بھی ناخوش   میں زہر ہلاہل کو کبھی کہہ نہ سکا قند

بیگانے تو ناخوش رہتے ہی ہیں لیکن اقبال سے اپنوں کا خفا ہونا بھی ضروری تھا کیونکہ انھوں نے غالب کی طرح قدیم ڈگر کو چھوڑ کر نئی روش اختیار کی اور خیالی معاشقے یا فرضی بادہ و ساغر کے بیانات سے اپنے کلام کو آلودہ نہیں کیا

وہ کہتے ہیں ؎

حدیث بادہ و مینا و جام آتی نہیں مجھ کو　　نہ کر خارا شگافوں سے تقاضہ شیشہ سازی کا

ایک اور جگہ لکھا ہے ؎

عزیز تر ہے متاع امیر و سلطاں سے　　وہ شعر جس میں ہو بجلی کا سوز و براقی

میری مینائے غزل میں تھی ذرا سی باقی　　شیخ کہتا ہے کہ ہے وہ بھی حرام اے ساقی

اقبال پر ایک بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ انھوں نے لوازم غزل کی پابندی ہی نہیں کی اور ایسے نامانوس اور خشک مضامین باندھے جن کی ہماری شاعری متحمل نہیں ہو سکتی۔ اس کے علاوہ زبان و محاورہ کا بھی خیال نہیں رکھا۔ اس کا جواب خود اقبال نے اپنی مختلف نظموں میں اس طرح دیا ہے :۔

نہ زباں کوئی غزل کی نہ زباں سے باخبر میں　　کوئی دلکشا صدا ہو عجمی ہو یا کہ تازی

مری نوا میں نہیں ہے ادائے محبوبی　　کہ بانگ صور سرافیل دلنواز نہیں

مری نوائے پریشاں کو شاعری نہ سمجھ　　کہ میں ہوں محرم راز درون میخانہ

تھا ضبط بہت مشکل اس سیل معانی کا　　کہہ ڈالے قلندر نے اسرار کتاب آخر

خوش آگئی ہے جہاں کو قلندری میری　　وگرنہ شعر مرا کیا ہے شاعری کیا ہے

غرض اقبال نے شاعری کا اسلوب ہی بدل دیا۔ آزادہ روی، حقیقت نگاری، شاعری کے لوازم ہوتے جا رہے ہیں۔ معاملہ بندی، آسمان یا معشوق کے ظلم و ستم کا ماتم، رقیب روسیاہ کے رشک و حسد کا گلہ، غزل کی زبان کا لحاظ، دلی یا لکھنو کے محاوروں یا روزمروں کی پابندی غرض طرح طرح کی قید و بند سے ہماری شاعری آزاد ہوتی جا رہی ہے۔ مولوی حالی نے پھر بھی قدیم مشرقی مروت سے کام لیا تھا اور شعرائے نازک خیال کے تکلفات لایعنی اور خیالی لوازم شعری کی مدافعت اس مہذب پیرایہ میں کی تھی کہ ؎

اہل معنی کو ہے لازم سخن آرائی بھی　　بزم میں اہل نظر بھی ہیں تماشائی بھی

لیکن اقبال ضروریات زمانہ کے پیش نظر سخن آرائی کے قایل ہی نہیں ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اسی سخن آرائی کے لحاظ نے حد سے زیادہ ہمارے شاعروں کو گمراہ کر کے معانی و مطالب کی گہرائیوں سے بے پروا کر دیا اور اردو شاعری

یا تو قافیہ پیمائی یا محاورہ بندی کے لئے وقف ہوگئی یا چند موضوعوں کے لئے محدود کردی گئی۔ اقبال اسلوب سے زیادہ مطالب و معانی کے قائل ہیں۔ وہ اس نظریہ کی تبلیغ کرتے ہیں کہ اگر خیال اچھا ہے تو اس کو پیرایۂ بیان بھی خود بخود اچھا ہی مل جائے گا۔ اور بغیر مشاطگی یا پروپگنڈے کے اس کے سننے اور سمجھنے والے بھی پیدا ہو جائیں۔ ایک جگہ وہ کہتے ہیں ؎

مری مشاطگی کی کیا ضرورت حسن معنی کو   کہ فطرت خود بخود کرتی ہے لالہ کی حنا بندی

میں شاخ تاک ہوں میری غزل ہے میرا ثمر   مرے ثمر سے مئے لالہ فام پیدا کر

دوسرے شعرا کی طرح اقبال اپنے کلام کو جام مے بنا کر گردش میں لانا نہیں چاہتے بلکہ وہ اہل محفل کو دعوت عمل دیتے ہیں کہ اس ثمر سے وہ خود مئے لالہ فام نکال لیں۔ اور جو اس دعوت پر لبیک کہنا نہیں چاہتے اور ذوق خودی نہیں رکھتے ان سے تو وہ مخاطب بھی نہیں ہیں۔ ان کا شعر ہے ؎

نظر نہیں تو مرے حلقۂ سخن میں نہ بیٹھ   کہ نکتہ ہائے خودی ہیں مثال تیغ اصیل

یہی وجہ ہے کہ ابھی تک ہندستان کی محفل ان کے کلام کو سمجھنے اور اس سے کما حقہٗ محظوظ ہونے کے قابل نہیں ہوئی۔ ان کا تخیل دور نکل گیا ہے اور ان کے ساتھی بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔ اس کا خود ان کو بھی احساس ہے وہ کہتے ہیں

کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا   مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں

شعرا تو کجا اہل مدرسہ و اہل خانقاہ بھی اس ذوق سے بے بہرہ نظر آتے ہیں اور اسی محرومی کی وجہ سے اب تک ملک و قوم کو نقصان پہنچ رہا ہے۔ اقبال کا شعر ہے ؎

کسے خبر کہ سفینے ڈبو چکی کتنے   فقیہ و صوفی و شاعر کی ناخوش اندیشی

اس خیال کو ایک اور جگہ اس طرح ظاہر کیا ہے ؎

جلوتیاں مدرسہ کور نگاہ و مردہ ذوق   خلوتیان میکدہ کم طلب و تہی کدو

میں کہ مری غزل میں ہے آتش رفتہ کا سراغ   میری تمام سرگزشت کھوے ہوؤں کی آرزو

ان کے خیال میں اضطراب و اثر اور خون جگر کے بغیر سخن بے فیض ہے اور شاعر ساحر نہیں بن سکتا ؎

سینہ روشن ہو تو ہے سوز سخن عین حیات   ہو نہ روشن تو سخن مرگ دوام اے ساقی

نقش ہیں سب ناتمام خون جگر کے بغیر   نغمہ ہے سودائے خام خون جگر کے بغیر

اقبال نے ہمارے شاعروں کے سب سے بڑے نقص یعنی اظہار بوالہوسی اور زلف و کاکل خد و خال " اور جوبن و کمر کے مضامین باندھنے کی کیا اچھی توضیح کی ہے کہ ؎

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل ان کا — ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
چشم آدم سے چھپاتے ہیں مقامات بلند — کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس — آہ بیچاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

یہ مصرعہ کہ آہ بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار جتنا اردو کے شاعروں اور خاص کر غزل گو شعرا پر صادق آتا ہے دنیا کے کسی اور فن کار پر منطبق نہیں ہوتا۔

عشق عاشقی اور معاملہ بندی کی جگہ اقبال چاہتے ہیں کہ ہمارے شاعر حقیقت نگاری سے آشنا ہوں اور اپنی خودی کی حفاظت کریں جب تک ادیبوں اور شاعروں میں یہ احساس پیدا نہ ہو گا کوئی شاعری ملک و قوم کے لئے وجہ حیات اور باعث دوام ثابت نہیں ہو سکتی

سرود و شعر و سیاست کتاب و دین و ہنر — گہر ہیں ان کی گرہ میں تمام یک دانہ
اگر خودی کی حفاظت کریں تو عین حیات — نہ کر سکیں تو سراپا فسون و افسانہ
ہوئی ہے زیر فلک امتوں کی رسوائی — خودی سے جب ادب و دین ہوئے ہیں بیگانہ

جو کلام حقیقت پر مبنی نہ ہو اور زندگی کے سبق نہ سکھلائے وہ بیکار ہے۔ وہ باد سحر ہی کیا جس کے جھونکے چمن کی افسردگی کو شگفتگی میں نہ بدل سکیں۔ اقبال کہتے ہیں ؎

اے اہل نظر ذوق نظر خوب ہے لیکن — جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
جس سے دل دریا متلاطم نہیں ہوتا — اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا
شاعر کی نوا ہو کہ مغنی کا نفس ہو — جس سے چمن افسردہ ہو وہ باد سحر کیا

اسی خیال کو ایک اور نظم میں اس طرح واضح کیا ہے ؎

ہے شعر عجم گرچہ طربناک و دل آویز — اس شعر سے ہوتی نہیں شمشیر خودی تیز
افسردہ اگر اس کی نوا سے ہے گلستاں — بہتر ہے کہ خاموش رہے مرغ سحر خیز

اقبال یہ ہے خارہ تراشی کا زمانہ　　از ہر چہ بآئینہ نمایند بپرہیز

آخر میں ہم اقبال کی اس نظم کے چند شعر بھی سنائے دیتے ہیں جو ہمارے نوجوان شاعروں کے لئے لائحۂ عمل کا کام دے رہے ہیں اور جن میں اقبال شاعر ہی سے مخاطب ہیں ؎

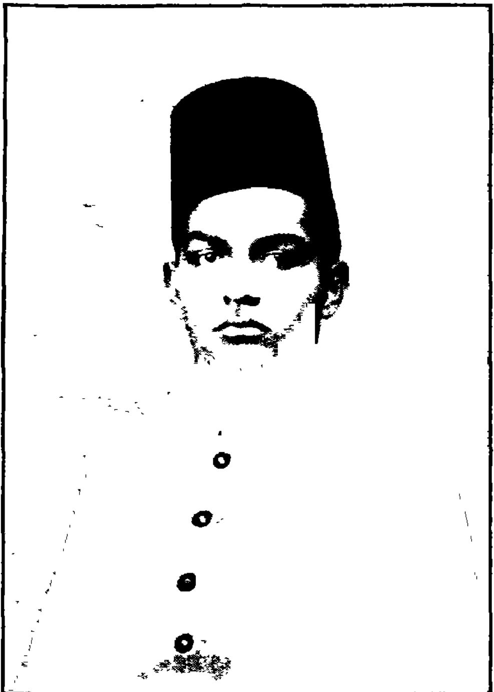
مشرق کے نیستاں میں ہے محتاج نفس نے　　شاعر ترے سینے میں نفس ہے کہ نہیں ہے
تاثیر غلامی سے خودی جس کی ہوئی نرم　　اچھی نہیں اس قوم کے حق میں عجمی لے
شیشے کی صراحی ہو کہ مٹی کا سبو ہو　　شمشیر کی مانند ہو تیزی میں تری مے
ہر لحظہ نیا طور نئی برق تجلی　　اللہ کرے مرحلۂ شوق نہ ہو طے

یہ ہے وہ وسعت نظر اور مرحلۂ شوق کی گونا گونی جو اردو شاعری کو متاثر کر رہی ہے۔ اقبال کی تلخ نوائیوں نے نہ صرف نوجوانوں بلکہ تسلیم و سیماب، اور جوش و ساغر جیسے پختہ مشق شاعروں کو بھی متاثر کر دیا۔ اقبال کے اثر سے رفتہ رفتہ قدیم طرز کی شاعری متروک ہوتی جا رہی ہے۔ ایک زمانہ میں ناسخ و آتش کے اثر سے الفاظ و محاورات اور اسالیب بیان متروک ہو گئے تھے۔ اور آج اقبال کے اثر سے بہت سے فرسودہ خیالات لایعنی تکلفات اور غیر ضروری لوازم شعر متروک ہوتے جا رہے ہیں۔ اور جہاں تک مطالب و معانی کا تعلق ہے اردو شاعری اقبال کے کلام سے متاثر رہے گی اور اہل اردو میں زندگی اور زندہ دلی قائم رکھنے کا باعث ہوگی۔

سید محی الدین قادری زور



مسٹر ابوالخیر صدیقی معتمد انجمن اتحاد طلباء جامعہ عثمانیہ



مسٹر امجد علیخاں مہتمم کتب خانہ انجمن اتحاد طلباء جامعہ عثمانیہ

وفاق ہند

اس مضمون نے انجمن شبان المصدقین کے فی البدیہ انعامی مقابلہ میں دوسرا انعام حاصل کیا

مدیر

مملکت کی دو طرح سے تقسیم کی گئی ہے ایک مملکت فردیہ اور دوسرے مملکت وفاقیہ. فردیہ مملکت میں تمام اختیارات نظم ونسق عاملہ، تقننہ وعدلیہ صدر عاملہ، بادشاہ یا صدر جمہوریہ کو حاصل ہوتے ہیں اختیارات کی مرکزی ومقامی تقسیم نہیں کی جاتی بلکہ مرکزی حکومت کی جانب سے صوبہ دار اور دیگر اعلیٰ عہدہ دار مقرر کئے جاتے ہیں ان کو اختیارات بھی مرکزی حکومت کے ملتے ہیں مرکزی حکومت ان کو اختیارات دے سکتی ہے اور پھر واپس لے سکتی ہے اس کی عمدہ مثال ہماری ریاست ابدمدت اور افغانستان وغیرہ میں مل سکتی ہے. مملکت وفاقیہ میں اختیارات کی تقسیم کی جاتی ہے مرکزی اور مقامی امور الگ کرلئے جاتے ہیں مرکزی امور مرکزی وفاقی حکومت کے تحت رہتے ہیں اور مقامی امور مقامی حکومت کے قبضہ میں ہوتے ہیں. مرکزی امور میں ملک کی مدافعت وحفاظت، مالیات، فوجی تنظیم، ذرائع حمل ونقل مثلاً ریلوے جہازات ہوائی جہاز وغیرہ کروڑگیری وچنگی اسکہ ڈھلائی شامل ہیں یہ تمام امور وفاقیہ مملکت میں وفاقی مرکزی حکومت کے تحت ہوتے ہیں. وفاقی مملکت میں مرکزی اور مقامی حکومتیں ہوتی ہیں مقامی امور مقامی حکومتوں کے تحت ہوتے ہیں تعلیمات، حفظان صحت، تعمیرات، ودیگر قومی فلاح وبہبود کے جتنے بھی امور ہیں وہ سب مقامی حکومتوں کے تحت ہوتے ہیں.

مملکت وفاقیہ کی مثال ہمیں امریکہ، کناڈا، اسٹریلیا، سوئیٹ روس اور سوزرستان میں ملتی ہے بقول پروفیسر پنیا وفاق دو طرح سے قایم ہوتا ہے (۱) اگر ملک کی وحدتیں آپس میں منتقل نہ ہوں انتشار پایا جاتا ہو اور مشترکہ قومی مفاد کا خیال نہ ہو اور باہر سے حملہ کا خوف ہو تو اُن وحدتوں میں اتفاق ہو جائے گا اور وفاق قایم ہوگا۔ امریکہ میں جنگ آزادی شروع ہونے سے قبل تیرہ مختلف نوآبادیات تھیں آپس میں پھوٹ اور نا اتفاقی تھی مرکزی حکومت ناپید تھی قومی مشترکہ مفاد نظرانداز کر دیا گیا تھا مگر جب جنگ آزادی کا اعلان ہوا تو مشترک دشمن انگلستان کے خلاف تمام نوآبادیات نے جنرل واشنگٹن کے تحت اتحاد کر لیا اور جنگ میں متحد ہو کر کامیابی حاصل کی امریکہ آزاد ہو گیا تمام نوآبادیات میں وفاقی حکومت قایم کی گئی مرکزی امور مرکزی حکومت کے تحت دیئے گئے اور مقامی امور، قومی فلاح و بہبود اور ترقی کے لئے مقامی حکومتوں کے تحت رکھے گئے اور ان تمام مقامی ریاستوں کی نمایندگی مجلس مقننہ میں مساوی طور پر ہوتی ہے صدر جمہوریہ تمام قوم کی رائے سے منتخب ہوتا ہے۔ وفاق کی دوسری قسم یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں جغرافیائی معاشرتی مذہبی اور لسانی ونسلی اتحاد نہ ہو آپس میں یگانگت و یک جہتی نہ ہو اور ہمیشہ اختلافات رہتے ہوں تو اُن اختلافات کو مٹانے کے لئے وفاق قایم کیا جاتا ہے اس کی مثال ہمیں کناڈا میں ملتی ہے۔ کناڈا میں انگریزی اور فرانسیسی قومیں آباد ہیں جن کا مذہب اور تمدن علیٰحدہ تھا زبان الگ تھی سیاسی انتشار تھا آپس میں رشک و حسد پایا جاتا تھا، ان اختلافات کو مٹانے کے لئے وفاق قایم کیا گیا۔

اس طرح سے وفاق دو قسم سے قایم کیا جاتا ہے ایک تو سیاسی وفاق ہوگا جیسا کہ امریکہ میں ہے دوسرا سماجی مذہبی و تمدنی وفاق جیسا کہ کناڈا میں ہے اور ہندوستان میں قایم کیا جا رہا ہے پروفیسر پنیا نے اپنی کتاب "ہندوستان بہ سلطنت وفاق" میں لکھا ہے کہ ہندوستان کا وفاق نہ صرف سیاسی نوعیت کا ہے بلکہ وہ سماجی تمدنی اور مذہبی وفاق بھی ہے۔ برطانوی حکومت کا یہ عطیہ ہے کہ ہندوستان ایک وحدانی حکومت بن گیا دور قدیم و قرون وسطیٰ میں ہندوستان بہ حیثیت کل کسی شاہنشاہیت کے تحت نہ تھا۔ گپتا، موریا، مغلیہ شاہنشاہیتوں کے زمانہ میں جنوبی ہند شمال سے بالکل آزاد رہا ہے یہ صرف برطانوی حکومت کا طفیل ہے کہ نظم و نسق مملکت اور حکومت کے لحاظ سے ہندوستان ایک وحدت بن گیا ہمالیہ سے لے کر راس کماری تک تمام ملک تمدنی، تہذیبی، معاشرتی، لسانی، نسلی غرضکہ ہر طرح کے اختلافات موجود ہیں آئے دن فرقہ وارانہ فسادات ہوا کرتے ہیں ملک میں اتحاد و اتفاق کا نام تک نہیں افراد مملکت

میں انتشار ہے کسی نقطۂ خیال پر بھی اتحاد نہیں ہے ہندوستان جغرافیائی لحاظ سے ایک برّاعظم ہے یہاں کئی قومیں مختلف زبانیں بولنے والی مختلف تمدن و تہذیب و طرز معاشرت رکھنے والی آباد ہیں ہندوستان میں مختلف تہذیب و تمدن مختلف زبانیں مختلف طرز معاشرت اور مختلف طرز خیال پائے جاتے ہیں اور مذہبی اختلافات کی تو کوئی حد ہی نہیں ہندوؤں اور مسلمانوں میں بھی اندرونی طور پر کئی کئی فرقے پائے جاتے ہیں۔ ان سب اختلافات کو دور کرنے سیاسی، معاشی اور تمدنی وحدت قایم کرنے کے لئے وفاق مفید طریق حکمرانی ہو سکتا ہے۔ انھیں اختلافات کو پیش نظر رکھ کر ۱۹۳۵ء کے قانون ہند کے رو سے ہندوستان میں وفاق قایم کیا جا رہا ہے۔ یہاں پر مختصراً ہندوستان کی سیاسی ارتقا پر روشنی ڈالنا مناسب ہے۔ بقول صاحب سیرۃ المتاخرین انگریزوں کا ستارۂ اقبال کرناٹک (ارکاٹ) میں طلوع ہوا پلاسی میں چمکا اور بکسر میں بلند ہو کر افق ہند پر جگمگانے لگا۔ ۱۷۷۳ء تک بمبئی، کلکتہ، مدراس کی حکومتیں مجلس نظما (لندن) کے تحت تھیں گورنر مقرر کئے جاتے تھے مگر ۱۷۷۳ء میں قانون تنظیم نافذ کیا گیا جس کے ذریعہ کلکتہ کا گورنر بہ اجلاس کونسل گورنر جنرل مقرر کیا گیا جس کو جنگ و صلح کے اختیارات دیے گئے ۱۷۸۴ء کا قانون پٹ (Pitt's India Bill) کے رو سے بھی گورنر جنرل کے اختیارات کی توسیع کی گئی ۱۸۳۳ء میں لارڈ ولیم بنٹنگ کے عہد حکومت میں مرکزی حکومت عاملہ و مقننہ اور تمام ہند میں مرکزی حیثیت حاصل ہو گئی۔ ذرائع حمل و نقل کی ترقی ریل، تار برقی اور دیگر سہولتوں کی بدولت صوبہ جات ہند مرکزی حکومت کے قریب تر ہو گئے مرکزی حکومت کے اثرات صوبوں پر پڑنے لگے ۱۸۶۱ء میں لارڈ منٹو کے عہد حکومت میں صوبوں کو کچھ مالیاتی اور اندرونی نظم و نسق کے اختیارات عطا کئے گئے جو موجودہ صوبہ جاتی خود اختیاری کا پہلا قدم تھا۔

۱۸۵۷ء کا غدر حقیقت میں مشرقی اور مغربی تہذیب و تمدن اور اختلافات کا تصادم تھا گو اہل ہند کو ناکامی ہوئی مگر حکومت ہند کو اپنے طریق حکومت میں تبدیلی کرنی پڑی مغربی تعلیم کا آغاز لارڈ بنٹنگ اور لارڈ میکالے کے زمانہ حکومت ہی سے ہو چکا تھا کلکتہ، بمبئی، مدراس وغیرہ میں جامعات قایم کئے گئے جس کی بدولت اہل ہند مغربی تعلیم پا کر مغربی اثرات سے متاثر ہو کر حکومت سے مساوات اور حقوق کا مطالبہ کرنے لگے ۱۸۸۵ء میں آل انڈیا کانگریس کا قیام عمل میں آیا اس کا مقصد یہ تھا کہ اہل ہند کی جائز شکایتیں حکومت کے سامنے پیش کر کے رفع کی جائیں اور حکومت سے حقوق طلب کئے جائیں اہل ہند کو عہدے دیئے جائیں۔ تعلیم یافتہ طبقہ کانگریس میں شریک ہونے لگا۔ لارڈ کرزن نے بغور ہندوستان کی سیاسی ذہنیت و تمدن کا مطالعہ کیا اور اس نتیجہ پر پہنچ گیا کہ ان کے آپس کے اختلاف سے فایدہ اٹھایا جائے تو برطانوی حکومت عرصۂ دراز

تک قایم رہ سکتی ہے۔ اس لئے اس نے بنگال کی تقسیم کر دادی بنگالی ہندوؤں نے اس کی مخالفت کی اور مسلمانوں نے تائید کی اس طرح ہندو مسلم اختلاف پیدا ہوگیا ۱۹۰۹ء میں مارلے منٹو اصلاحات نافذ کئے گئے جس کے ذریعہ مسلمانوں کو مجلس مقننہ میں علیحدہ نشستیں دی گئیں اور ان کا حلقہ انتخاب بھی الگ کر دیا گیا گویا اس طرح سے ہندو مسلم اختلاف کی خلیج کو اور وسیع کر دیا گیا۔ یہ جداگانہ حلقہ انتخاب قومی ارتقاء میں حائل ہوگیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا مسلمانوں نے اپنا علیحدہ نمایندہ سیاسی ادارہ قایم کر لیا۔ گو مسلم لیگ اور کانگریس میں وقتی طور پر ۱۹۱۶ء میں اتحاد ہوا تھا مگر یہ اتحاد زیادہ عرصہ تک قایم نہ رہ سکا ۱۹۱۷ء میں برطانوی حکومت نے اعلان کیا کہ اہل ہند کو ذمہ دار حکومت دی جائیگی ۱۹۱۸ء میں بمبئی کانگریس نے ذمہ دار حکومت کا مطالبہ کیا اور اعلان کیا کہ اہل ہند اتنے باشعور ہوگئے ہیں کہ وہ حکومت چلا سکیں ۱۹۱۹ء میں مانٹیگو چیمسفرڈ اصلاحات جاری کئے گئے جس کے رو سے صوبہ جاتی امور کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ایک امور محفوظہ اور دوسرے امور منتقلہ صرف امور منتقلہ کو ہندوستانی وزراء کے تفویض کیا گیا اور وزراء مجلس قانون ساز کے سامنے ذمہ دار قرار دیئے گئے۔

جنگ عظیم کے بعد سے ہندوستانیوں میں سیاسی بیداری اور جذبۂ قومیت و آزادی پیدا ہونے لگا اس کے دو اسباب ہیں ایک تو جنگ عظیم جس میں برطانیہ فرانس و امریکہ کو فتح ہوئی گویا جمہوریت کا غلبہ رہا۔ جمہوری خیالات اہل ہند کو متاثر کرنے لگے دوسرے کانگریس۔ مہاتما گاندھی کی قیادت میں کانگریس نے ہندوستان کی سیاسی نمایندہ کی حیثیت حاصل کر لی اور تمام تعلیم یافتہ ہندو اس میں شریک ہوگئے اور محب وطن آزاد خیال مسلمان بھی کانگریس میں داخل ہوگئے۔ کانگریس کی جد و جہد اور کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان میں سیاسی بیداری اور جذبۂ قومیت و آزادی پیدا ہوگیا بیگم شاہ نواز نے راونڈ ٹیبل کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ "جنگ کے اثرات اور کانگریس کی کوششوں سے ملک میں جذبۂ آزادی و قومیت کو فروغ ہو رہا ہے ہر نوجوان مرد و عورت شہر اور دیہات میں آزادی اور قومیت کی باتیں کرتے ہیں"۔ ۱۹۲۲ء میں عالمی کساد بازاری عام معاشی پستی رولٹ بل کی مخالفت اور خلافت تحریک کی وجہ سے کامل قومی اتحاد ہوگیا تھا مگر یہ اتحاد بھی وقتی تھا کانگریس ذمہ دار حکومت کا پیہم مطالبہ کر رہی تھی اس دوران میں جلیانوالہ باغ کا قتل عام وقوع پذیر ہوا تمام ہندوستان میں ایک سنسنی پھیل گئی ہر طرف غم و غصہ اور نفرت کا جذبہ سرایت کر گیا قومی وقار کو بڑھانے کے لئے کانگریس نے مہاتما گاندھی کی قیادت میں عدم تعاون، عدم تشدد اور سیول نافرمانی کی تحریکات کا آغاز کیا اور عام شورش برپا ہوگئی کانگریس نے سوراج کا مطالبہ شروع کیا جذبۂ قومیت کو فروغ دینے اور سوراج کے مطالبہ کو

کامیاب بنانے کے لئے برطانوی مال کا بائیکاٹ کیا جانے لگا سودیشی مال کا پروپگنڈا شروع ہوا گو تمام تحریکات میں ناکامی ہوئی مگر جذبۂ قومیت اور احساس آزادی عوام میں پیدا ہو گیا۔ جمہور سے کانگرس کے تعلقات قایم ہو گئے عوام میں سیاسی بیداری کو فروغ ہوا۔ برطانوی حکومت نے تحقیقات کے لئے سائمن کمیشن ۱۹۲۷ء میں مقرر کیا مگر کانگرس نے اس کا بائیکاٹ کیا اور ۱۹۲۷ء میں مدراس کانگرس نے بصدارت پنڈت جواہر لال نہرو مکمل آزادی اور خود مختاری کا اعلان کیا ۱۹۲۸ء میں لاہور کانگرس میں پنڈت جواہر لال نہرو نے اعلان کیا کہ کانگرس مکمل آزادی کا مطالبہ کرتی ہے وہ اپنا دستور بنائے گی اس کو پارلیمنٹ کے بنے ہوئے دستور پر عمل کرنے سے انکار ہے۔

سائمن کمیشن نے اپنے رپورٹ میں قیام وفاق کی سفارش کی اور صوبہ واری خود مختاری عطا کرنے کے متعلق حکومت برطانیہ کو توجہ دلائی۔ بشہ ۱۹۲۸ء و ۱۹۲۹ء میں کانگرس نے پھر عدم تشدد اور سیول نافرمانی کی دھمکی دی اس پر ۱۹۲۹ء کو لارڈ اروِن وائسرائے ہند نے ایک اعلان جاری کیا کہ سائمن کمیشن نے ملک معظم کی حکومت سے استدعا کی ہے کہ اس کی سفارشات اور رپورٹ شائع ہونے کے بعد جائنٹ پارلیمنٹری کمیٹی میں تحقیقات کے لئے پیش ہونے سے قبل ایک کانفرنس برطانوی ہند کے نمایندوں اور والیان ریاست کے نمایندوں کی منعقد کی جائے جس میں ایک ایسا حل دریافت کیا جائے جو سب کے لئے قابل قبول اور اختلافات کو مٹانے والا ہو۔ ملک معظم کی حکومت نے انعقاد کانفرنس کا اعلان کیا ۲۳ ڈسمبر ۱۹۳۰ء کو لارڈ اروِن نے گاندھی جی اور پنڈت موتی لال نہرو اور دوسرے لیڈروں سے ملاقات کی اور کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی ان لیڈروں نے کانفرنس کو سیاسی جال سمجھ کر انکار کر دیا بہرحال گاندھی اور اروِن میں ایک طرح کی مفاہمت (Gandhi Irwin Truce) ہو گئی مگر پھر حالات بدلے سنہ ۱۹۳۰ء میں گاندھی ڈنڈی کو روانہ ہوئے تا کہ نمک کے قانون کی خلاف ورزی کی جائے جب کہ ہندوستان کی سیاسی فضا مکدر تھی انھیں حالات میں پہلی گول میز کانفرنس کا اجلاس لندن میں سنہ ۱۹۳۰ء میں ہوا حکومت کے نامزدہ ارکان شریک تھے۔ سائمن کمیشن کی سفارشات کے بموجب وفاق کی اسکیم پیش کی گئی مسلمانوں نے وفاق کی تائید کی مولانا محمد علی مرحوم سر محمد اقبال اور سر محمد شفیع نے وفاق کی تائید میں تقاریر کیں مسلمانوں کا مطالبہ یہ تھا کہ وہ چونکہ اقلیت میں ہیں لہذا ان کے تہذیب و تمدن طرز معاشرت مذہب اور اصول زندگی زبان اور روایات کی حفاظت ہونا چاہئے یہ وفاق ہی میں ممکن ہو سکتا ہے۔ مسٹر شفیع نے بدوران تقریر گول میز کانفرنس کے سامنے کہا تھا کہ مسلمانوں نے ایک ہزار سال ہند پر حکومت کی ہے ابتدا سے اب تک ہندوستان میں جمہوری نظام کی حکومت قایم نہیں ہوئی تھی مگر اس کا تجربہ کیا جا رہا ہو

مسلمان اقلیت میں ہیں جمہوری نظام کے تحت وہ اکثریت کے غلام بن جائیں گے اور ہندو راجپوت سکھ مرہٹے جو اُن کے دشمن ہیں مسلمانوں کو غلام بنا دیں گے اگر صوبہ جاتی خود اختیاری عطا کی جائے تو پنجاب بنگال سرحد اور سندھ میں مسلمان اکثریت میں ہیں اور دوسرے صوبوں میں ہندو اکثریت میں ہیں ہر دو اپنی اقلیتوں کے حقوق کی حفاظت کریں گے اس طرح ہندو مسلم مسئلہ طے ہو جائے گا وفاق ہی ہندوستان کے لئے مفید طریقہ حکمرانی ہو سکتا ہے اس میں تمام اقلیتوں مثلاً مسلمان سکھ پارسی عیسائی وغیرہ کے حقوق مذہب، تمدن، زبان اور طرز معاشرت کی حفاظت ہو سکیگی اس طرح سے وفاق ہند نہ صرف سیاسی بلکہ تمدنی اور ساجی اختلافات کا حل ہو جائے گا۔ کناڈا میں انگریزی فرانسیسی ساجی و مذہبی تمدنی لسانی اختلافات کا واحد حل یہی وفاق ثابت ہوا ہے اسی طرح ہندوستان میں وفاق نہ صرف سیاسی جغرافی بلکہ ساجی بھی ہوگا۔

دیسی ریاستوں نے بھی وفاق کی تائید کی۔ سب سے پہلے وفاق کی تائید کرنے والے ہمارے اعلیحضرت بندگان اقدس ہیں جنھوں نے ہندوستان کے لئے وفاق کو مفید تصور فرمایا والیان ریاست اس لئے وفاق میں شریک ہو کر اپنے پوزیشن وقار اور طریق حکومت و اندرونی خود اختیاری کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں کہ آجکل ہندوستان ایک انقلاب انگیز دور سے گذر رہا ہے مغربی اثرات جذبہ قومیت، جمہوریت اور آزادی کا نتیجہ یہ ہو رہا ہے کہ برطانوی ہند میں جمہوری طرز حکومت مقبول ہو رہی ہے اور وہ شاہی مطلق العنانی کے دشمن ہو رہے ہیں یہی جمہوری خیالات دیسی ریاستوں کی رعایا کو بھی متاثر کر رہے ہیں۔ اور ان کی رعایا موجودہ شاہی طرز حکومت پر نکتہ چینی کر رہی ہے کانگرس بھی ہندوستان میں جمہوری طرز کی حکومت قایم کرنا چاہتی ہے وہ والیان ریاست کے بھی خلاف ہے اس اندرونی اور بیرونی خطرات سے محفوظ رہنے کے لئے والیان ریاست "قوت بالادست" (Paramount Power) کا سہارا ڈھونڈتے ہیں مسلمان اکثریت کی حکومت سے ڈر کر اور والیان ریاست جمہوریت کے سیلاب سے خوفزدہ ہو کر وفاق میں شریک ہو کر اپنے پوزیشن وقار اور حقوق کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں۔

کانگرس وفاق کی مخالفت کر رہی ہے اس کا مطالبہ مکمل آزادی ہے وہ ملک میں جمہوری طرز کی حکومت قایم کرنا چاہتی ہے جس میں اکثریت کی حکومت ہوگی وفاق کی کانگرس اس وجہ سے بھی مخالفت کر رہی ہے کہ اس میں رجعت پسند طبقہ اور ریاستیں شریک ہو رہی ہیں۔ برطانوی حکومت ہند رجعت پسند طبقہ اور ریاستوں کو کانگرس کے خلاف استعمال کرنا چاہتی ہے اس لئے کانگرس ریاستوں کو وفاق میں شریک ہونے سے منع کر رہی ہے ورنہ ان دونوں میں دشمنی ہو جانے کا

اندیشہ ہے کانگرس کے موجودہ رجحان جمہوریت و اشتراکیت سے والیان ریاست ڈر رہے لہذا ان دونوں میں تصادم ہوگا۔ اس کے لئے مجلس مقننہ کا میدان طیار کیا گیا ہے کانگرس اس وجہ سے بھی وفاق کے خلاف ہے کہ کناڈا اسٹریلیا جو شاہنشاہیت برطانیہ کے اجزا ہیں ان میں وفاق قایم کرنے سے قبل ذمہ دار حکومت دیدی گئی تھی صرف افنت اور خارجہ پالیسی برطانیہ کے تحت رکھی گئی افراد قوم اور مختلف علاقوں کے لوگوں کے مشورے سے تمام مقامی اختلافات کو مٹا کر مدبران ملک نے وفاقی دستور بنایا تھا پوری قوم کی رائے اس دستور وفاقیہ میں شامل تھی اور انھیں کی مرضی کے مطابق برطانوی حکومت نے وفاق کناڈا اسٹریلیا میں قایم کیا۔ مگر ہندوستان میں معاملہ بالکل برعکس ہے یہاں ذمہ دار حکومت نہیں اور نہ دستور افراد قوم کی رائے سے بنایا گیا ہو برطانوی پارلیمنٹ نے اس وفاقی دستور کو وضع کیا ہے اور ہندوستان کے گلے میں پھر طوق غلامی بنا کر ڈال رہی ہے تاکہ تاحیات اس سے خلاصی نہ پاسکے انھیں تمام وجوہ پر کانگرس وفاق کی سختی سے مخالفت کر رہی ہے مگر حکومت ہند گاندھی جی کے ذریعہ کانگرس سے سمجھوتہ کر کے وفاق قائم کرا ہی دیگی۔ عدالت وفاقیہ کا قیام عمل میں آچکا ہے اب آیندہ وفاق کی طیاری ہے۔ وائسرائے ہند نے اپنی کسی تقریر میں اعلان کیا تھا کہ قریب میں وفاق قایم کیا جائے گا۔

۱۹۳۵ء کے قانون ہند دو اجزا میں تقسیم ہے ایک صوبہ جاتی خود اختیاری (۲) وفاق۔ صوبہ جاتی خود اختیاری کا قیام عمل میں آچکا ہے قانون کے رو سے عدن اور برما حکومت ہند سے علیحدہ ہوگئے صوبہ سندھ اور صوبہ اڑیسہ کا قیام عمل میں آیا مقامی صوبہ جاتی تمام امور قانون کی رو سے ہندوستانی وزرا کے تحت دیئے گئے صوبہ جاتی خود مختاری کے معنی ہی یہ ہیں کہ تمام صوبے اندرونی نظم و نسق میں آزاد رہیں گے اور اکثریت کی حکومت ہوگی جس پارٹی کا مجلس قانون میں غلبہ ہوگا اس کے رہنماؤں کی وزارت قایم کی جائے گی چھ ماہ کے تعطل کے بعد کانگرس نے عہدے قبول کئے اور صوبہ جاتی خود اختیاری کو عملی جامہ پہنایا گیا ہے پہلا جز قانون کا مکمل ہوگیا اب وفاق قایم کیا جائے گا جس میں برطانوی ہند کے صوبہ جات کے ساتھ ریاستیں بھی وفاق میں شریک رہیں گی۔

وفاق میں شرکت کا سوال ریاستوں کے لئے بہت اہم ہے۔ گول میز کانفرنس میں تقریر کرتے ہوئے راجہ ناگر نے کہا تھا کہ ہم وفاق میں شریک ہونے کے لئے راضی ہیں بشرطیکہ ہمارے اندرونی نظم و نسق اور طریق حکومت میں مداخلت نہ کی جائے ہمارے موجودہ مشکلات رفع کئے جائیں والیان ریاست اندرونی معاملات میں مداخلت کو کبھی گوارا نہیں

کر سکتے"۔ سچ تو یہ ہے کہ ہندوستان ایک ہے اور اُس کو برطانوی ہند اور دیسی ریاستوں میں تقسیم کرنا یہ صرف سیاسی تقسیم ہے جغرافیائی سماجی معاشی تمدنی لحاظ سے تمام ہندوستان ایک معاشی و سیاسی وحدت ہے۔ ذرائع حمل ونقل کی ترقی اور مغربی تعلیم کے اثرات سے تمام ہندوستان میں ایک سیاسی بیداری کی لہر دوڑ رہی ہے چند امور مثلاً مدافعت فوجی نظام ضابطہ ٹیارف، تامین، تجارت، ذرائع حمل ونقل کی ترقی، ایسے امور ہیں جن میں پورے ہند کا مفاد مشترک طور پر وابستہ ہے ان تمام امور پر پورے ہند کو متحد ہو جانا چاہئے۔ بیگم شاہ نواز نے کہا تھا کہ وہ دن خوش قسمت ہوگا جبکہ ریاستیں اور برطانوی ہند مشترکہ مفاد کی خاطر متحد ہو جائیں گے اس سے حقیقت میں ہندوستانی قومیت کو تقویت ہوگی۔

والیان ریاست کا دعویٰ ہے کہ وہ اندرونی معاملات ریاست میں آزاد ہیں انھیں اقتدار اعلیٰ حاصل ہے صرف امور اور مدافعت کا سوال "قوت بالادست،" یعنی تاج برطانیہ کے ساتھ ہیں مگر کہا جاتا ہے کہ حکومت ہند ان کے اندرونی معاملات میں عمل دخل کرتی ہے اور معاہداتی موقت کو بھلا کر ان کے اندرونی معاملات میں مداخلت کرکے ان کے وقار اور آزادی کو سلب کرتی ہے۔ یہ تضاد اس وقت سمجھ میں آتا ہے جبکہ ہم (Paramount-Power) "قوت بالادست کی تشریح کو سمجھ لیں۔ والیان ریاست اور تاج برطانیہ میں تعلقات بین الاقوامی قوانین پر مبنی نہیں ہیں نہ وہ معاہداتی موقت پر مبنی ہیں بلکہ تعلقات محض سیاسی ہیں۔ قوت بالادست سیاسی حالات کے لحاظ سے ان کے معاملات میں مداخلت کرتی ہے اس کا کوئی تعین نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ والیان ریاست کسی طرح سے بھی آزاد نہیں ہیں معاہداتی رو سے ان کے خارجی تعلقات تاج برطانیہ کے تحت ہیں بیرونی حملہ کی مدافعت برطانیہ کے ذمہ ہے اندرونی معاملات میں گو وہ اپنے نظم ونسق عدالت قانون وغیرہ میں ہر طرح آزاد ہیں مگر رزیڈنٹ کے کسی مشورہ کو رد نہیں کرسکتے قوت بالادست کو بھی ہر طرح اندرونی معاملات میں مداخلت کا حق ہے وہ وزیر اعظم دیوان بہادر کا تقرر کرواسکتی ہے برطانوی عہدہ دار مقرر کرسکتی ہے رزیڈنٹ مشورہ دیتا ہے اندرونی بغاوت کو فرو کرنے کا حق بھی برطانیہ کو حاصل ہے ریاست کی تقسیم نہیں کی جاسکتی۔ جانشین کا جھگڑا بھی تاج برطانیہ طے کرسکتا ہے ملک میں نظم ونسق کی نگرانی کی جاتی ہے اگر بدنظمی و بدامنی پھیل جائے تو برطانوی حکومت مداخلت کرسکتی ہے اس طرح اندرونی اور بیرونی طریقہ پر والیان ریاست قوت بالادست کے تحت ہیں۔ لارڈ کرزن کے نظریہ کے تحت ان کے تمام اختیارات تاج برطانیہ کے دیئے ہوئے ہیں اب جبکہ ان کے آس پاس جمہوری طرز خیال فروغ پا رہا ہے۔ شخصی حکومت سے نفرت پھیل رہی ہے تو

والیان ریاست بھی اپنے پوزیشن اور تخت و تاج کی حفاظت کے لئے وفاق میں شریک ہو رہے ہیں۔

ریاست حیدرآباد اور مسئلہ وفاق

ریاست حیدرآباد کے طرز عمل پر لگی ہوئی ہیں۔ ہماری ریاست کو اس وقت تمام ریاستوں کی لیڈری حاصل ہے کیونکہ اپنی وسعت، جغرافیہ اور آبادی، تاریخی روایات اور عظمت و وقار کے لحاظ سے ریاست حیدرآباد کا سیاسی موقف شاندار اور عظیم المرتبت ہے لہذا ہمارے ارباب مقتدر کو نہایت ہی حزم و احتیاط کے ساتھ آگے قدم اٹھانا چاہئے۔ ہندوستانی والیان ریاست کی نظریں شرکت وفاق کے مسئلہ کے متعلق

حیدرآباد کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ ہم نے ایک خود مختار سلطنت کی حیثیت سے برطانوی سلطنت سے معاہدات کئے ان معاہدات کے ذریعہ یہ طے پایا تھا کہ امور خارجہ کی حد تک ہم حکومت برطانوی ہند کے علم و مشورے کے بغیر کوئی عملی اقدام نہیں کریں گے فوجی انتظامات کے سلسلے میں دونوں حکومتوں سے باہمی امداد اور مدافعت کا اقرار کیا لیکن جملہ معاہدات میں صراحتاً یہ امر درج ہے کہ سلطنت آصفجاہی کے اندرونی معاملات میں حکومت برطانوی ہند کو مداخلت کا کوئی حق نہ ہوگا۔ چنانچہ یہ امر صراحتاً معاہدہ ۱۸۰۰ء کے فقرہ نمبر ۱۵ میں درج ہے جس کے روسے تاجداران دکن اپنی رعایا یا ملازمین اور اقربا کی حد تک مختار مطلق ہیں حیدرآباد اور حکومت برطانوی ہند کے باہمی تعلقات کے تعین کے لئے فقرہ مذکور ایک اہم ترین اور ناقابل ترمیم معیار ہے۔

اس معاہدہ میں حلیفی کے نام سے یاد کیا گیا ہے جیسا کہ کئی اور موقعوں پر بھی ثابت کیا گیا ہے۔ اس سے ریاست حیدرآباد کا اقتدار اعلیٰ بالکل متاثر نہیں ہو سکتا کسی مشورے کے ماننے کی کوئی پابندی لازمی بھی نہیں ہے باوجود اس تاریخی معاہدہ کے ۱۹۳۰ء کے جدید ترین معاہدہ برار میں ایک سے زائد مرتبہ حیدرآباد کو برطانوی حکومت نے اقتدار اعلیٰ (Sovereignty) کا حامل تسلیم کیا ہے مثلاً ان ممالک محروسہ میں جو ہز اگزالٹڈ ہائی نس دی نظام آف حیدرآباد کے اقتدار اعلیٰ کے تحت ہیں چند علاقہ جات موسوم بنام برار شامل ہیں حضور نظام حقیقی معنوں میں سلطنت مغلیہ کے جانشین ہیں۔ تاریخ ہند گواہ ہے کہ ابتدا میں انگریزوں اور حضور نظام کے تعلقات ایسے ہی تھے جیسے ایک معطی اور معطی لہ کے ہوا کرتے ہیں برطانوی ہند معروضہ گذرانا کرتی تھی اور خود کو نظام حیدرآباد کی مرضی کا پابند اور ان کے فضل و کرم کا امیدوار و محتاج سمجھتی تھی۔ مسٹر پانیکر نے لکھا ہو کہ:-

"انگریزوں کا یہ دعویٰ کہ وہ مغلوں کے جانشین ہیں بے بنیاد اور لغو ہے کیونکہ حکومت برطانوی ہند نے خود یہ تسلیم کر لیا ہے کہ حکومت حیدرآباد حقوق و فرائض کے لئے حکومت مغلیہ کی جانشین ہے۔"

ہم ریاست حیدرآباد کی خود مختاری ثابت کرنے کے لئے غیروں کی شہادت پیش کرتے ہیں۔ ٹائمس آف انڈیا ۱۴ جنوری ۱۸۷۵ء کی اشاعت میں لکھا ہے: "یہ امر یاد رکھنے کے قابل ہے کہ حضور نظام معاہدہ پیرس میں جو ۱۸۵۶ء میں طے ہوا تھا بالکل خود مختار شاہ دکن تسلیم کئے جا چکے ہیں جس کا اظہار مجلس نظمار نے بھی کیا ہے" اسٹیٹسمین یکم جولائی ۱۸۸۱ء کی اشاعت میں لکھتا ہے کہ:- "اندرونی معاملات میں جو خود مختاری حیدرآباد کو از روئے معاہدات حاصل اور محفوظ ہے اُس پر محض اس وجہ سے کہ نواب میر محبوب علی خان بہادر شاہ دکن ابھی کم سن ہیں کوئی اثر نہیں پڑ سکتا"

گورنر جنرل لارڈ ڈلہوزی نے ۲۷ مئی ۱۸۵۱ء میں جو یادداشت لکھی ہے اُس میں لکھتے ہیں "ہم اعتراف کرتے ہیں کہ نظام خود مختار ہیں۔ ہم معاہدات کے ذریعہ اپنے کو پابند کر چکے ہیں کہ ہم ان کی حفاظت کرینگے اور ہم نے انکو اُن کی اولاد، رشتہ دار، ملازمین اور رعایا کی حد تک مقتدر کُل تسلیم کر لیا ہے لہذا حکومت برطانوی ہند ایماندارانہ طور پر کبھی ایسے آزاد اور خود مختار حاکم پر جبر نہیں کر سکتی اور نہ ہم مجاز ہیں کہ حیدرآباد کے اندرونی معاملات میں دخیل ہوں"

اگر کوئی قوت یہ دعویٰ کرے کہ وہ معاہدات کی جس طرح تعبیر کر سکتی ہے محض اس وجہ سے کہ وہ قوت داہنی یا اس کو فوجی برتری حاصل ہے تو یقیناً یہ نظریہ دنیائے سیاسیات میں ایک تہلکہ ڈال دے گا حقیقت میں سوال اصول کا ہے نہ کہ برتری اور قوت کا لہذا کمزور حکومت کے حقوق کو کسی صورت نظر انداز نہیں کیا جا سکتا اور ان کی خود مختاری کے خلاف حکومت برطانوی ہند اگر اپنی حسب مرضی عمل کرے تو یہ کسی طرح درست نہیں ہو سکتا برطانوی ہند کو چاہئے کہ ایمانداری اور انصاف کے نقطہ نظر سے اپنے رویہ کا ثبوت دے۔

حضرت بندگان اقدس جملہ قوانین کا سرچشمہ اور جملہ عدالتی و مالمانہ اقتدار کا منبع و ماخذ ہیں تاجدار دکن حضرت بندگان عالی کے حکم محکم کا مرافعہ کسی دنیاوی عدالت کے روبرو پیش نہیں ہو سکتا یہ ایسا واقعہ ہے جو اس حقیقت پر دلالت کرتا ہے کہ خسرو دکن ریاست حیدرآباد کے مقتدر اعلیٰ ہیں یہ ہماری آئینی حیثیت ہے اور اس اقتدار کا ایک خاکہ جس کے ہم قانوناً اور انصافاً مستحق ہیں جو از روئے معاہدات حاصل ہونے چاہئے مرور زمانہ کے جو بدعنوانیاں ان باہمی تعلقات میں رونما ہوتی ہیں وہ ہر طرح قابل اصلاح ہیں ہم کو چاہئے کہ جو طریقہ عملدرآمد رائج ہو گیا ہے یعنی قوت بالادست کی اندرونی معاملات میں مداخلت اس کو ختم کر دیا جائے اس کی اصلاح کی کوشش کرنا چاہئے۔ اپنے معاہداتی حقوق پر اصرار کرنا شیوۂ دوستی کے خلاف نہیں ہے ہمارے جائز اور آئینی حقوق کا مطالبہ، باہمی تعلقات کو صحیح اور پائیدار اصول پر

منضبط کرنے کی کوشش کسی اعتبار سے بھی اپنے حلیف سے مخالفت کے مترادف نہیں ہو سکتی۔ ہمیں اس امر کے اعلان پر ذرا بھی تامل نہیں کہ ہم حکومت برطانوی ہند کے ایسے دوستانہ تعلقات رکھنے پر قائم ہیں جو دو مساوی الحیثیت ہمسایہ حکومتوں میں ہونا چاہئے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ ہم اپنے شاہی حقوق پر دست اندازیوں کو روا رکھیں شاہی حقوق کے مفہوم کو بھی واضح کر دینا ضروری ہے حیدرآباد میں۔ رعایا اور راعی کا مفاد حقیقتاً مشترک ہے۔

تاجداران آصفی کی تمنا اور کوشش بجز اس کے اور کچھ نہیں رہی کہ حیدرآباد میں امن و خوش حالی اور باعزت زندگی بسر کریں۔ رعایا کی انتہائی تمنا بھی اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے اس مشترکہ تمنا کی تکمیل کے لئے شاہی اقتدارات لازمی ہیں کیونکہ کوئی ذمہ داری اقتدار کے بغیر تکمیل نہیں پا سکتی یہ جداگانہ سوال ہے کہ اقتدارات شاہی کا استعمال کن اصولوں پر مبنی ہو لیکن کوئی ذی شعور حیدرآبادی اس امر سے انکار نہیں کر سکتا کہ اقتدارات شاہی کا مرکز حیدرآباد ہی میں رہے اور بلا شرکت غیرے رہے۔

ہماری ریاست حیدرآباد کے تاریخی خصوصیات و روایات ایسے شاندار اور عظیم المرتبت ہیں کہ کوئی دوسری ریاست اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی حکمران حیدرآباد "شاہنشاہانہ حیثیت" کے حامل ہیں ہز ہائی نس سلطان مکلہ و شحر حیدرآباد کے ایک جاگیردار ملازم ہیں ہز ہائی نس ہولکر مہاراجہ اندور حیدرآباد کے مواضع پارنہ و بابل گاؤں کے موروثی پٹیل ہیں اور نذر پیش کرتے ہیں ہز ہائی نس مہاراجہ جودھ پور حیدرآباد کے ایک جاگیردار ہیں اور موضع جونت پورہ ان کو حاصل ہے جے سنگھ پورہ ہز ہائی نس مہاراجہ جے پور کی جاگیر ہے اور ان دونوں ریاستوں کے نمائندے عیدین میں صوبہ دار اورنگ آباد کو جہاں وہ علاقے ہیں نذر پیش کرتے ہیں۔

اعلیٰ حضرت بندگان اقدس کو مسلمانان ہند کی قیادت بھی حاصل ہے ۲۴ جنوری ۱۹۱۸ء کے ایک خط میں جس میں جارج پنجم آنجہانی کے اپنے دستخط ہیں اس میں یہ تسلیم اور اقرار کیا گیا ہے کہ حضور نظام ہندوستان میں "قائد اسلامی والئی ریاست کی حیثیت سے لطف اندوز ہیں"۔ جنگ عظیم کے آغاز پر مسلمانان ہند خلیفۃ المسلمین کے خلاف جنگ کرنے سے انکار کر رہے تھے مگر اعلیٰ حضرت نے اعلان شائع کیا جس کے بعد ہندوستان کے مسلمان ترکوں کے خلاف سیاسی جنگ میں شام و فلسطین عراق میں لڑے اور بڑے بڑے مہمات سر کیں۔ نواب فتح علی خاں ٹیپو سلطان کے اور مرہٹوں کے خلاف ہماری ریاست نے انگریزوں کو ہر طرح امداد دی اور دوران غدر ۱۸۵۷ء جبکہ برطانوی حکومت ہند کا خاتمہ قریب تھا اور بقول

گورنر بمبئی اگر نظام گئے تو ہر چیز ہاتھ سے نکل جائے گی" ایسی صورت میں حضور نظام نے انگریزوں کی ڈوبتی ہوئی کشتی کو سہارا دیا۔ برطانوی حکومت ہمارے احسانات فراموش نہیں کرسکتی۔ لیکن موجودہ دور میں سیاسی معاشی اور سماجی حالات بدل چکے ہیں اس لئے مشترکہ مفاد کی خاطر برطانوی ہند اور ریاستوں کو آپس میں متحد ہوجانا چاہئے ایسے امور جو برطانوی ہند اور ریاستوں سے متعلق ہیں مثلاً مدافعت، خارجی تعلقات، ضابطۂ پارٹ بورڈ، مابین تجارت، ذرائع حمل ونقل میں ترقی اور صنعتی و سماجی ارتقاء میں تمام ہندوستان کو متحد رہنا چاہئے اور ایک ہی طرز عمل اختیار کرنا بھی ضروری ہے ہندوستانی قومیت قایم کرنے کے لئے ہندوستانی ریاستوں اور برطانوی ہند کا اتحاد لازمی ہے۔ خسرودکن اعلیٰحضرت بندگان عالی کی ہمدردی ابتداہی سے وفاق کے ساتھ ہے اور انھیں ایک عظیم ہند کی تخلیق کی توقع ہے وفاق کا نصب العین جاذب نظر بھی ہے حضرت اقدس و اعلیٰ نے پہلی گول میز کانفرنس میں اپنا وفد مع یہ ہدایت بھیجا تھا کہ وفاق ہند کے مسئلہ کی طرف ہمدردی لیکن ساتھ ہی دانشمندانہ احتیاط کے ساتھ قدم اٹھائیں اور اس ہدایت کی حیدرآبادی وفد نے نقطہ بہ نقطہ تعمیل کی۔ اور اب تک حضرت اقدس و اعلیٰ کی ہمدردی وفاق کے ساتھ ہے۔

سرصدر اعظم بہادر نے اعلان فرمایا تھا کہ شرکت وفاق سے متعلق تصفیہ ہونے سے قبل نوشتہ شرکت او رسلہ وفاق کے بارے میں ایک زرد کتاب شائع کی جائے گی تاکہ عوام الناس کو اطلاع دی جاسکے اور رائے عامہ معلوم کی جائے رائے عامہ تسلیم کی جائے گی اور محبان وطن کے مشوروں پر ہمدردانہ غور کیا جائے گا۔ صورت حال یہ ہے کہ محبان وطن کا تعلیم یافتہ طبقہ خاموش ہے زرد کتاب کی اشاعت کے بعد جس کا وعدہ کیا گیا ہے اظہار خیال کیا جائے گا۔

سررشتہ میں تقریر کرتے ہوئے سرصدر اعظم بہادر نے فرمایا تھا کہ "ابتدائے گول میز کانفرنس سے اس وقت تک حکومت سرکار عالی نے یہ صاف طور پر واضح کردیا ہے کہ وہ ڈاک کے حقوق سے جسے وہ علامت اقتدار سمجھتی ہے دستبردار ہونا تو درکنار اس میں کسی قدر ضعف پیدا ہونے کو گوارا نہ کرے گی"۔ اس اقتباس سے صاف ظاہر ہو رہا ہے کہ اگر ریاست حیدرآباد شریک وفاق ہو تو ڈاک کا کامل تحفظ کرلیا جائے گا۔ دوسرے موقع پر عدالت العالیہ میں بہ دوران تقریر فرمایا تھا کہ "میر مجلس عدالت العالیہ اپنے تقریر میں اس جانب اشارہ کرتے ہیں کہ عدالت کو بیرونی مداخلت سے آزاد اور محفوظ رکھنے کی ضرورت ہے اور اس کے جواب میں بحوالہ دفعات قانون حکومت ہند ۱۹۳۵ء یہ یقین دلایا گیا کہ ایسی مداخلت وفاقی عدالت کی جانب سے نہ ہوگی"۔ سرصدر اعظم کا یہ یقین دلانا کہ عدالت میں وفاقی عدالت

مداخلت نہ کرے گی اور دوسرے یہ کہ وفاقی عدالت کا بھی خیر مقدم کرنا یہ صاف ظاہر کرتا ہے کہ شرکت وفاق کے موقع پر عدالت کا بھی تحفظ کیا جائے گا ان مندرجہ بالا اقتباسات سے ظاہر ہوتا ہے کہ ریاست حیدرآباد وفاق ہند میں شریک ہو رہی ہے اسی وجہ سے عوام الناس میں ایک طرح کی بے چینی اور اضطراب پیدا ہوگیا تھا ہر طرف چہ میگوئیاں شروع ہوگئیں تھیں رائے عامہ اس غلط ترجمانی کے خلاف ہو رہی تھی اور وائسرائے بہادر کی آمد اور طویل قیام سے یہ خیال کیا جانے لگا تھا کہ ریاست حیدرآباد وفاق ہند میں شریک ہو جائے گی مگر حالات و واقعات نے ثابت کردیا کہ حکیم السیاست کا تدبر کس طرح سے رعایا کی صحیح ترجمانی کرسکتا ہے۔ آفتاب تدبر و سیاست کے مقابلے میں قمقموں کی مدھم روشنی کا وجود و عدم مساوی ہے اعلیٰ حضرت بندگان عالی نے وائسرائے بہادر کی آمد پر جو محلہ مبارک کی ضیافت کے موقع پر اپنی تقریر دلپذیر کے ذریعہ نہ صرف وابستگان دولت آصفیہ کی ترجمانی کی بلکہ ناامیدی یاس کو امید و اور تمناؤں سے بدل دیا رعایا کے قلوب اپنے شاہ ذیجاہ کی تقریر سے شاد ہوگئے۔

اعلیٰ حضرت حکیم السیاست نے اپنی زبان حکمت نشان سے بدوران تقریر فرمایا کہ "ابتدا میں میرے پیش نظر جو نصب العین تھا وہی آخر تک قایم رہے گا یعنی اس عظیم الشان تاریخی ریاست کی رعایا کی فلاح و بہبود جب وفاق کی مکمل تصویر ہمارے سامنے ہو گی اس وقت قبل ازیں کہ میں مہتم بالشان فیصلہ کروں میری رعایا کو جیسا کہ میں نے وعدہ کیا ہے ان مسائل کے مطالعہ اور اپنی تمناؤں کے اظہار کا موقع دیا جائے گا۔ میں جانتا ہوں کہ میرا اقتدار اعلیٰ اور میرے معاہداتی حقوق بہرصورت محفوظ ہیں خانوادہ آصفیہ کی میراث کا محافظ ہونے کی حیثیت سے اس مقدس امانت کے متعلق خاص حقوق و روایات ہیں ان کے تحفظ کا خیال لازماً میرا دامنگیر رہے گا"

اعلیٰ حضرت بندگان عالی نے بجا طور پر "اقتدار اعلیٰ" اور "معاہداتی حقوق" پر زور دیا ہے اور اپنی سب سے مایوس ہوکر آپ ہی کے ذات والاصفات سے ساری آرزوں کو وابستہ رکھنے والی رعایا کو جس کے موجودہ تردد و تشویش کی نظیر شاید اس سے قبل نہیں مل سکیگی یہ یقین دلایا ہے کہ جتنے خاص حقوق و روایات ہیں ان کے تحفظ کا خیال لازماً دامنگیر رہے گا "حضور والا کی رعایا کو بھی حضرت ظل سبحانی و آیہ رحمانی کے" اقتدار اعلیٰ "اور" معاہداتی حقوق "کی افادیت پر اتنا شدید اعتماد ہے کہ وہ دل سے ان کی حفاظت و صیانت کی آرزو ہے اور انھیں عملی صورت میں نہایت آزاد دیکھنا چاہتی ہے۔

خواجہ معین الدین متعلم سال چہارم

نوجوان سے خطاب!

بیگانۂ رسم دہر ہوجا تو ذرہ ہے گر تو مہر ہوجا
موجوں کی طرح رواں دواں ہو تو خاک ہے گر تو پر فشاں ہو
پیمانہ مثال بے کراں بن تو غنچہ ہے گر تو گلستاں بن
دنیا سے بسان بو گذر جا آوارۂ دشت کام کرجا
پھولوں سے نشاطِ زندگی سیکھ اے موجِ ہوا ئیک روی سیکھ
برق افگنِ قید و بند ہوجا پستی سے نکل بلند ہوجا
اُٹھ پردۂ کیف وکم اُٹھا دے دنیا سے بساطِ غم اُٹھا دے
ہر ذرہ کو آفتاب کردے ہر جلوے کو بے نقاب کردے

دھوکا ہے فنائے زندگانی   غافل ہستی ہے جاودانی
محروم نہیں نگاہ محرم   ذرہ میں بسا ہوا ہے عالم

پیغامِ حیاتِ سرمدی کا
خود موت ہے راز زندگی کا

کس درجہ بسیط ہیں فضائیں   کس درجہ لطیف ہیں ہوائیں
عرفانِ حیاتِ زندگی ہے   فطرت پردہ اُلٹ رہی ہے
اب زندگی و عدم ہیں کچھ اور   اس راہ کے پیچ و خم ہیں کچھ اور
سوکھی ہوئی شاخ پھل رہی ہے   دنیا چولا بدل رہی ہے
آئندہ کا راز کس نے جانا   ماضی بھولا ہوا فسانہ

ہم حال میں سانس لے رہے ہیں   خود درسِ حیات دے رہے ہیں
نقطہ سے ہے دائرہ کی ہستی   بستی ہے اسی طرح سے بستی
آئینِ کہن شکستہ پا تھا   وہ خواب کہ ہمت آزما تھا
دنیا منزل تک آچکی ہے   آلامِ دوش اُٹھا چکی ہے
گم کردہ ظلمت گراں ہیں   ہم رفتہ گردِ کارواں ہیں
مطلوب ہے گر نشانِ منزل   مقصود ہے گر سکونِ ساحل

آہستہ روی ہے موت کا نام		آپہونچا ہے دوڑنے کا ہنگام

سن لیں یہ سبھی حقیقت اندیش		تعمیر کا مرحلہ ہے درپیش

تخریب کا ساز چھڑ چکا ہے		ایوانِ قدیم گر رہا ہے

گمراہ کرے نہ فکرِ باطل		تقلید کی مے ہے زہرِ قاتل

پندارِ خود آزما سے ہوشیار		اس فتنۂ نا سزا سے ہوشیار

جو کیفِ طرب کا راز ہوگا		وہ بادہ خانہ ساز ہوگا

کھو دے نہ کہیں خوش اعتقادی		مشرق کی حیاتِ انفرادی

اغیار کے ساغروں میں پینا		ہے ننگ زمانہ بن کے جینا

یوں فکرِ اصول تو بنائے		سارے عالم کو رشک آئے

یہ دورِ شباب امتحاں ہے
منزل کا نشاں ابھی کہاں ہے

تسلیم

مادّہ ایک معمّہ ہی — ناقابل حل

(ماخوذ از جے ڈبلیو این سلیوان J. W. N Sullivan)

آگ ایسی چیز ہے جس کے متعلق کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ سب سے پہلے حضرت انسان کو کب اس چیز سے سابقہ پڑا۔ مگر از منۂ قبل تاریخ کی چیز ضرور معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح عرق انگور کی تخمیر، دھاتوں کی صفائی اور سنگی مجسموں کا تراشنا بھی تاریخ سے قبل کے علوم معلوم ہوتے ہیں۔ قدیم مصری، مختلف فنون اور صنعتوں سے کافی واقف تھے۔ چنانچہ وہ روغنیات اور چہرے کے لئے غازہ بنانے پر قادر تھے۔ دھاتوں کا ڈھالنا، شیشہ سازی اور دھاتوں کی ملمع کاری بھی ان میں رائج تھی۔ ظاہر ہے کہ اس منزل پر پہونچنے سے قبل ان کو علم کیمیا نیز طبیعیات سے ایک حد تک واقفیت حاصل کرنی پڑی ہوگی۔ نظری مسائل کی چھان بین سب سے پہلے یونانیوں نے شروع کی تھیلیز (Thales) نے دریافت کیا کہ قدرت میں ایک طرح کی دوریت سی پائی جاتی ہے۔ ہوا، مٹی اور پانی کا ایک دور ہوتا ہے جو پودوں اور حیوانات کے اجسام میں سے ہوتا ہوا پھر ہوا میں پہونچ جاتا ہے۔ پودوں اور حیوانات کی غذا اس کے خیال کے بموجب رطوبت ہے اور اس لئے ہر شئے میں پانی موجود رہتا ہے۔ کسی میں تکثیف کی حالت میں اور کسی میں تلطیف (Rarefaition) کی حالت میں۔

مادی کائنات کی سب سے اہم خصوصیت اس کا تنوع ہے۔ ذرا آنکھ اٹھایئے دیکھئے بیک وقت،

پانی، بادل، درخت، مٹی، چٹان، گھاس، پھول، خود ہمارا جسم اور لباس، غرض کتنی چیزیں ہمیں نظر آتی ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ سوال قدرتاً ہمارے دل میں پیدا ہوگا کہ اتنی مختلف اشیاء کی کس طرح سے جماعت بندی کیجائے یونانیوں کو سب سے پہلے مختلف قسم کے مادوں کی مختلف شکلوں اور کثافتوں نے متاثر کیا اور اس لئے انہوں نے مادہ کی چار قسمیں کیں جنکو کثافت کی کمی کے اعتبار سے اس طرح لکھ سکتے ہیں۔ مٹی، پانی، ہوا اور آگ۔ آگ کو بھی وہ نہایت لطیف قسم کا مادہ تصور کرتے تھے۔

اب چونکہ مادہ کی مختلف اقسام کے مابین امتیازی فرق کثافت کو قرار دیا گیا اسلئے ظاہر ہے کہ ان چار عناصر میں سے کسی ایک کو منبع اور بقیہ کو اسکے مشتقات ہونا چاہئے۔ مشتقات اسی کی تکثیف یا تلطیف سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ تھیلز نے پانی کو منبع تصور کیا، انیکسیمنس (Anaximenes) نے ہوا کا انتخاب کیا اور ہرقلیطوس (Heraclitus) کے نزدیک آگ تمام کائنات کی جڑ تھی —— نہایت ہی لطیف قسم کی اثیری آگ جسے وہ کائنات کی روح سمجھتا تھا —— لیکن ساتھ ہی یہ بات بھی تسلیم کیجاتی تھی کہ یہ چاروں عناصر ایک دوسرے کے تابع نہیں ہیں۔ صقلیہ (Sicily) کے فلسفی امبیدا قلس (Empedocles) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ تمام اشیاء جن سے ہم کو سابقہ پڑتا ہے ان ہی چاروں عناصر کے اجتماع سے بنتی ہیں البتہ تناسب بدلتا رہتا ہے اور تناسب کا حصر دو مخالف قوتوں —— جذب و دفع —— پر ہے۔ انسانی فطرت میں یہی قوتیں محبت اور نفرت کے جذبات برانگیختہ کرتی ہیں۔

یونانی علماء کے خیال کے بموجب جلنے سے چیز اپنے اجزائے ترکیبی میں بٹ جاتی ہے۔ مصری لکڑی جلائی جائے تو آگ پیدا ہوتی ہے، کچھ دھواں فضاء میں اڑتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اور لکڑی کے سرے پر پانی کے بلبلے بنتے نکلتے ہیں۔ آخر کار نور اسی راکھ اس ظلم کی نشانی کے طور پر باقی رہ جاتی ہے۔ جو بظاہر مٹی کی ہم جنس معلوم ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی بنیاد ہی غلط ہے کیونکہ احتراق کا جو مفہوم اسمیں مضمر ہے وہ سراسر ناقص ہے۔ احتراق کی ماہیت بھی صدیوں تک ہماری نظر سے پوشیدہ رہی۔

یوں تو دماغ کی ایک اور اہم پیداوار۔ دیمقراطیس (Democritus) کا نظریۂ جواہر ہے۔ مادہ کے ایک ٹکڑے پر اگر مسلسل تقسیم کا عمل جاری رکھا جائے تو نتیجہ کیا ہوگا؟ کیا اس کے تمام خواص برقرار

رہیں گے؟ کیا شکر کا نہایت چھوٹا ریزہ بھی میٹھا ہوتا ہے؟ یونانی علماء میں سے بعض کا خیال تھا کہ مادہ کے خواص ناقابل تغیر ہیں۔ تقسیم کا عمل جس حد تک چاہیں جاری رکھئے۔ مٹی، پانی نہیں ہو سکتی۔ نتیجہ اس زاویہ نگاہ کا یہ ہوا کہ مادہ کی تقسیم ناممکن سمجھی جانے لگی۔ دیمقراطیس اس نظریہ کے خلاف تھا۔ اس کے الفاظ ہیں "عام مسلمات کے بموجب بعض چیزیں شیریں ہیں اور بعض تلخ ہیں۔ بعض گرم ہیں اور بعض سرد۔ علاوہ بریں رنگ بھی ایک چیز ہے۔ اس لئے حقیقت میں چیزیں صرف دو ہیں۔ ایک جوہر اور دوسرے خلا۔" اس کے خیال کے بموجب تمام جواہر ایک ہی مادہ کے ہوتے ہیں البتہ جسامت اور شکل میں اختلاف ممکن ہے۔ مادہ کی مختلف اقسام اس وجہ سے نظر آتی ہیں کہ ہر ایک مختلف شکل اور جسامت کے جوہروں پر مشتمل ہے۔

یہ نظریہ موجودہ نظریہ جواہر سے کچھ زیادہ مختلف نہیں ہے البتہ بعض باتوں میں عدم مشابہت ہے۔ سائنس کے نقطۂ نظر سے تو یہ نظریہ اس وقت تک بار آور نہیں ہو سکا جب تک کہ کیفیت کے ساتھ اس کو کمیت کا جامہ نہیں پہنایا گیا۔ موجودہ نظریہ کے ساتھ یہ اس حد تک ہم آہنگ ہے کہ دونوں کی رو سے مادہ کی اصلی دنیا اس رنگین دنیا سے بالکل مختلف ہے جو حواس خمسہ سے محسوس ہوتی ہے۔ اور یہیں سے اصلی دنیا ایک بیرنگ تعین کی شکل میں ہمارے تخیل میں داخل ہوئی جس میں نہ تو بو ہوتی ہے اور نہ ذائقہ یا آواز

موجودہ کیمیا کے پیش رو کیمیاگروں یعنی (alchemists) کو بھی مادہ کی جماعت بندی میں چند در چند مشکلات سے سابقہ پڑا۔ وہ لوگ رنگ کو بہت اہمیت دیتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ اگر کسی دھات کا رنگ سونے کی طرح بنا دیں تو وہ سونے میں تبدیل ہو جائے گی۔ یہ خیال ایک عام طرز نظر کا نتیجہ تھا۔ افلاطون کے فلسفہ کی رو سے یہ بات مسلم تھی کہ کسی چیز کی حقیقت ان خیالات میں مضمر ہے جو ہمارے دماغ پر اس کی وجہ سے طاری ہوتے ہیں۔ آدمی کی قیمت جس طرح اس کی روح کی نوعیت کے لحاظ سے بدلتی ہے نہ کہ جسم کے گوشت کے لحاظ سے۔ اسی طرح خواص کے مقابلہ میں ہم مادہ کی مادیت کو نظر انداز کر سکتے ہیں۔ علم نجوم میں خاص خاص روحانی خصوصیات کے حامل ہیں اسی طرح دھاتیں بھی ویسی ہی خصوصیات سے متصف ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ کیمیا دانوں نے فلکی اجسام اور دھاتوں میں ایک واضح ربط پیدا کر دیا تھا۔ چنانچہ سونے کو آفتاب کا ارضی نمایندہ سمجھتے تھے اور چاندی کو چاند کا خیال تصور کرتے تھے۔

کیمیا دانوں کا یہ خیال کہ مادّہ اپنے خواص سے بنتا ہے، اور اسی بنا پر یہ کوشش کہ اشیا کے خواص میں تبدیلی کرنے سے خود ان میں تغیر ہو جاتا ہے ایک لحاظ سے غلط نہیں ہے۔ البتہ یہ بات عجیب ہے کہ رنگ کی ان کے نزدیک غیر معمولی اہمیت تھی۔ مشہور عالم طبیعیات اور طبیب بو علی سینا اپنے اس خیال میں بالکل منفرد تھا کہ دھاتوں کا باہمی فرق رنگ کے مقابلہ میں کہیں زیادہ گہرا ہے۔ اور صرف رنگ کی تبدیلی سے ایک دھات دوسری میں تبدیل نہیں ہو سکتی۔ مگر اس کے باوجود رنگ کی اہمیت بدستور باقی رہی۔ مشہور کیمیائی نظریہ، جس کی بنیاد میں گندک، پارا اور نمک ہیں، وہ بھی رنگ کی اہمیت سے منحرف نہ تھا۔ دریافت سے معلوم ہوا کہ پارا اور گندک کی ترکیب سے چمکدار سرخ سلفائڈ بنتا ہے اس سے خیال ہوا کہ کوئی دھات اس رنگ کی ایسی ضرور موجود ہے جو سفید چاندی اور زرد سونے سے بھی زیادہ قیمتی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر گندک اور پارے کو عمومی اہمیت دے کر ان سے اصول وضع کر لئے گئے۔ گندک کو آگ کا مبدا سمجھا گیا اور خیال ہوا کہ یہ گندک ہی ہے جو کسی شئے کو احتراق پذیر کر دیتی ہے اور چیز کے جلنے پر گندک ہی غائب ہو جاتی ہے۔ پارے کی رقت کے باعث اس کو سیالوں کا مبدا تصور کیا گیا اور کہا گیا کہ وہ پارا ہی ہوتا ہے جو جلنے والی شئے کے ایک حصہ کو ماچ کی شکل میں کشید ہونے کا موقع دیتا ہے۔ نمک کو ٹھوس اشیاء کا مبدا گردانا گیا اور خیال گذرا کہ کسی چیز کے جلنے پر بطور ثفل نمک ہی باقی رہ جاتا ہے۔ یہ زاویۂ نگاہ سترھویں صدی کے وسط تک عام رہا۔

(۲)

رابرٹ بائل نے سب سے پہلے یہ خیال ظاہر کیا مادی اشیا کی جماعت بندی کسی دوسری بنیاد پر ہونی چاہئے اس نے اپنی کتاب میں بتایا ہے کہ حرارت کے لئے ضروری نہیں کہ وہ ہمیشہ اشیاء کو ان کے اجزاء میں تحلیل کر دے۔ مختلف درجہ ہائے حرارت کے اثرات بھی مختلف ہوتے ہیں۔ اور اکثر اوقات ختم تعامل پر ہمارے پاس ایک نہایت ہی پیچیدہ چیز باقی رہ جاتی ہے۔ اس نے یہ بھی بتایا کہ سونے کو ماء الملوک میں حل کر دیں تو پھر اسے اصلی شکل میں حاصل کر سکتے ہیں اور اس سے یہ خیال ہوتا ہے کہ سونا جواہر منتقل ہوتا ہے اور یہ جواہر حل پذیری کے دوران میں بلا تغیر قائم رہتے ہیں۔ اسی بنا پر اس نے اپنا یہ خیال باصرار پیش کیا کہ تمام اشیاء بعض ممتاز اور مستقل اشیاء سے مرکب ہیں یہیں سے عناصر اور مرکبات میں بنیادی فرق قائم ہوا جو کیمیا کی جان ہے۔

مادی اشیاء کی یہ نئی جماعت بندی آئندہ ترقیوں کا پیش خیمہ ثابت ہوئی چنانچہ عرصہ تک اس بات کی

جہاں بین ہوتی رہی کہ کون سی چیزیں عناصر ہیں اور کون اشیا، مرکبات ہیں۔ احتراق کا معمہ ابھی تک حل ہونا باقی تھا۔ لازماً اس کی وجہ سے ترقی میں رکاوٹیں پیش آئیں۔ جب کوئی چیز جلتی ہے تو اس میں سے دھواں سا خارج ہوتا ہے۔ قرون اولیٰ کے کیمیا داں اس دھوئیں کو گندک سمجھتے تھے۔ اٹھارویں صدی کے اوائل میں اس کا نام فلوجسٹون (Phlogiston) رکھا گیا۔ اور اس کی عجیب خصوصیت یہ قرار دی گئی کہ اس میں منفی وزن ہوتا ہے۔ کسی جسم میں اس کا اضافہ ہو تو جسم ہلکا پڑ جاتا ہے۔ یہ خصوصیت بالکل لازمی تھی کیونکہ بائل (Boyle) پہلے بتا چکا تھا کہ دھاتی اشیا جلتی ہیں تو حاصل شدہ ٹھوس کا وزن اصل دھات کے وزن سے زیادہ ہوتا ہے۔ یعنی دھاتی شئے میں سے فلوجسٹون نکل جائے تو وہ بھاری ہو جاتی ہے اس لئے فلوجسٹون کا وزن صفر سے کم ہونا چاہئے

بائل کی تحقیقات سے معلوم تھا کہ ہوا مادی شئے ہے اور وزن دار بھی ہے لیکن یہ گیسوں کا آمیزہ ہے یا بسیط شئے ہے یہ دریافت طلب تھا۔ بلکہ واقعہ تو یہ ہے کہ اس کے پاس گیسوں میں لے دے کے صرف ایک ہوا تھی اور کسی گیس کا علم بھی نہ تھا۔ پریسٹلی اور ہنری کیونڈش کے جیسے ذہین لوگ بھی فلوجسٹون کے نظریہ کے اس حد تک قائل تھے کہ پانی کو اس کے اجزاء میں تقسیم کر لینے کے باوجود کیونڈش آکسیجن اور ہائیڈروجن کو ایک ہی چیز سمجھتا رہا۔ حقیقت یہ ہے کہ سائنس کی ترقی میں جتنی رکاوٹ اس فلوجسٹون کے نظریہ سے پیدا ہوئی اتنی کسی اور چیز سے نہیں ہوئی۔

لاوآزیے (Lavoisier) نے احتراق کی حقیقت معلوم کرنے کے لئے وزن اور پیمائش سے مدد لی۔ اس نے ایک بند برتن میں، جس کی ہوا کا وزن معلوم تھا، پارے کی وزن کردہ مقدار گرم کی۔ ہوا میں کمی ہوگئی اور پارے پر سرخ سرخ زنگ بن گیا۔ اس زنگ کو گرم کیا تو پارہ پیدا ہوا اور ایک گیس خارج ہوئی۔ آزاد شدہ گیس اس کمی کے برابر تھی جو ہوا میں ہوئی تھی۔ لاوآزیے نے معلوم کیا کہ زنگ بننے کے بعد جو ہوا برتن میں باقی رہ گئی وہ احتراق میں مدد نہیں تھی اور نہ تنفس میں مدد دیتی تھی۔ برخلاف اس کے زنگ سے آزاد ہونے والی گیس تنفس میں بھی معاون تھی اور احتراق کو بھی برقرار رکھتی تھی۔ لاوآزیے کہتا ہے" اس تجربہ کے حالات پر غور کرنے سے پتہ چلتا ہے کہ پارا، گرم ہونے پر، فضا کا وہ حصہ جذب کر لیتا ہے جو احتراق اور تنفس میں مدد دیتا ہے اور باقی ماندہ شئے نہ تو تنفس میں معاون ہے اور نہ احتراق میں" اس سے یہ معلوم ہو گیا کہ فضا کی ہوا دو ایسے لچک دار سیالوں پر مشتمل ہے جو ایک دوسرے کی مخالف نوعیت کے ہیں۔ اس تجربہ سے فلوجسٹون کا نظریہ ہمیشہ کے لئے زندہ درگور ہو گیا۔

یہ رکاوٹ ایک مرتبہ راستہ سے ہٹ گئی تو مادہ کی جماعت بندی میں باقاعدہ ترقی شروع ہوگئی۔ چنانچہ یہ معلوم کیا گیا کہ ایک ہی شئے تین مختلف حالتوں ——— ٹھوس، مائع اور گیس ——— میں رہ سکتی ہے۔

یہ نظریہ کہ تمام اشیاء چھوٹے چھوٹے ناقابل تقسیم ذرات پر مشتمل ہوتی ہیں بہت ہی قدیم تھا۔ یونانی اس سے واقف تھے اور موجودہ سائنٹفک دور کے بانی، گیلیلیو، نیوٹن اور بائل بھی اس کو ایک حد تک صحیح تصور کرتے تھے۔ لیکن اب مانچسٹر کے ایک مدرس جان ڈالٹن کی محنتوں سے یہ بار آور ہوا اور اس میں کیفیت کے ساتھ ساتھ کمیت کا عنصر بھی داخل کیا گیا۔ ڈالٹن نے عناصر اور مرکبات میں نہایت ہی واضح امتیاز پیدا کردیا اس نے کہا کہ مرکب اشیاء دو یا دو سے زیادہ عناصر سے مبنی ہیں۔ ڈالٹن کے زمانے میں صرف بیس عناصر معلوم تھے۔ آج ہم کو بانوے (۹۲) عناصر کا علم ہے۔ ڈالٹن نے اپنے جوہری نظریہ کی بنیاد یہ قرار دی کہ مختلف اشیا کے جوہروں کے اوزان مختلف ہوتے ہیں۔ نیز کسی خاص مرکب کی پیدائش کے لئے عناصر ہمیشہ ایک خاص تناسب میں ترکیب کھاتے ہیں۔

نظریۂ جواہر کو بنیاد مان کر آج مختلف اشیاء کو بانوے (۹۲) عناصر میں تقسیم کرلیا گیا ہے لیکن کیمیا آج تک اس گتھی کو سلجھا نہ سکی کہ مادی دنیا کن اصولوں پر تعمیر ہوئی ہے۔ موجودہ دور کے کیمیا دانوں نے پیچیدہ اشیاء کو مختلف سادہ تر چیزوں میں تقسیم کردیا لیکن اس کے باوجود کائنات کے معمہ کو حل نہ کرسکے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ علم کیمیا ایک حد سے آگے نہیں بڑھ سکتا۔ اور زیر بحث مسائل بغیر طبیعیات کی مدد کے صاف نہیں ہوسکتے۔ کیمیا سے ہم کو سب سے اہم چیز جو ملی وہ یہ ہے کہ جوہر بھی ایک چیز ہوتی ہے اور کیمیا دانوں کا "جوہر" سخت ٹھوس قسم کا ذرہ ہوتا ہے جو غالباً کروی شکل کا مالک ہوتا ہے لیکن جیسا کہ ہم آگے بتائیں گے جوہر اس ذرہ سے بہت مختلف ہے۔

مادہ کو جواہر میں تقسیم کرلیا گیا تو لوگ سمجھنے لگے کہ تحقیق معراج کمال پر پہنچ گئی لیکن یہ بات واضح نہ ہوسکی کہ جوہر کی ایک نہ دو بانوے اقسام کیوں ہیں؟ بعض علماء نے یہ خیال پیش کیا کہ جوہر کی ساخت اس قدر سادہ نہیں ہے جتنی کہ سمجھی جاتی ہے کیونکہ بعض عناصر کو بعض خاص عناصر سے زیادہ رغبت ہے۔ اس سے یہ بھی گمان ہوتا ہے کہ ان عناصر کے جواہر کی ساخت یکساں ہوگی۔ جوہر کا وزن معلوم کیا گیا تو فوراً خیال پیدا ہوا کہ تمام جواہر کی ترکیب میں ہائیڈروجن کا جوہر شامل ہے کیونکہ ہائیڈروجن سب سے ہلکا عنصر ہے۔ یعنی تمام مادہ حقیقت میں ایک ہی ——— یعنی ہائیڈروجن تحقیقات کا دائرہ اور بڑھا تو معلوم ہوا کہ اوزان جوہر سے اس نظریہ کی تصدیق نہیں ہوتی اور اس لئے کیمیا دانوں کو مادے کی بانوے (۹۲) مختلف اقسام ماننے پڑے۔ اس سے

قدرت کے ناقابل حل تنوع کا بھی پتہ چلتا ہے۔

(۳)

موجودہ دور ایک لحاظ سے ۱۸۹۵ء سے شروع ہوتا ہے۔ ۱۸۹۵ء اور ۱۹۰۰ء کے درمیان ایسی ایسی تحقیقات کی گئیں جنہوں نے مادہ کے متعلق ہمارے تمام خیالات کی کایا پلٹ دی۔ اور طبیعیات کا جو مطلب اور مقصد ہم نے قرار دیا تھا اس میں بھی تغیر کرنا پڑا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ پانچ سال کا زمانہ طبیعیات کی دنیا میں انقلاب عظیم کا زمانہ تھا۔ سب سے پہلا تجربی مظاہرہ یہ ہوا کہ ہائیڈروجن کے جواہر سے بھی چھوٹے ذرات موجود ہیں اور یہ ذرات برقائے ہوئے ہوتے ہیں۔ شیشہ کی ایک بند نلی کے دونوں سروں پر دو دھاتی برقیرے قائم کر کے اس میں تقریباً کامل خلا پیدا کر دیا گیا۔ اب اس میں سے برقی رو گذاری گئی تو برقائے ہوئے ذرات پیدا ہوئے۔ مشاہدہ سے کسی چیز کی ایک دھار خط مستقیم میں نلی کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک جاتی ہوئی معلوم ہوئی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دھار کی بڑی مقدار ایسے چھوٹے چھوٹے ذرات پر مشتمل تھی جو برقائے ہوئے تھے اور ہائیڈروجن کے جوہر کے ۱/۱۸۰۰ گنے تھے۔ بظاہر اس انکشاف میں کوئی بات انقلاب انگیز معلوم نہیں ہوتی۔ کیونکہ خود ہائیڈروجن کے جوہر اس قدر چھوٹے ہوتے ہیں کہ ان کا تصور ہم نہیں کر سکتے۔ اب یہ کہنا کہ ان سے بھی چھوٹے ذرات موجود ہیں ظاہر ہے کہ کوئی اہمیت نہیں رکھتا لیکن قابل غور چیز یہ تھی کہ یہ ذرات برقائے ہوئے تھے۔ اور یہی وجہ ہے کہ جب ان ذرات یعنی برقیوں پر مزید تحقیق کی گئی تو مادہ کے متعلق ہمارے تخیلات کی ساری عمارت مسمار ہو گئی۔

ریاضی استدلال سے یہ بات معلوم ہو چکی تھی کہ کسی جسم کو برقا دیا جائے تو اس کا سلوک ایسا ہو جاتا ہے گویا اس کی کمیت بڑھ گئی ہے۔ اس لئے اب یہ بات مرکز توجہ ہو گئی کہ برقیہ کا کس قدر وزن اس کے برقی بار کی وجہ سے ہے۔ پیمائش سے یہ حیرت خیز نتیجہ برآمد ہوا کہ برقیہ کی ساری کمیت اس برقی بار کی وجہ سے ہوتی ہے۔ یعنی برقیہ برقی بار کے سوا اور کچھ نہیں مادیت اس میں مطلق نہیں ہوتی۔ یہ نتیجہ نہ صرف تحیر خیز اور دلچسپ ہے بلکہ ایک خاص اہمیت بھی اس کو حاصل ہے۔ موجودہ سائنس کا یہ سب سے پہلا اشارہ اس امر کی جانب تھا کہ دنیا اس قسم کی مادی شئے نہیں ہے جیسی ہم تصور کرتے آئے ہیں۔ مادہ بتدریج ایک طیفی (Immaterial) چیز میں تبدیل ہونے لگا۔

اس نئے نظریہ کو فی الفور شرف قبول حاصل نہیں ہوا کیونکہ بہت سے قدامت پسند لوگ یہ بیان تسلیم کرنے کیلئے

تیار نہ تھے کہ برقی بار موجود ہے لیکن کسی مادی رہوار پر سوار نہیں ہے بلکہ آزاد ہے۔ یہ تو ایسا ہے کہ ہم حرکت کا ذکر کریں لیکن یہ نہ بتائیں کہ حرکت کرنے والے جسم کا کوئی وجود ہے یا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اس انکشاف کو اس وقت تک ذرا سمجھنا مشکل ہے جب تک مادہ کے متعلق ہمارے تصورات مجرد (Abstract) نہ ہو جائیں۔ اب ہم کو مادہ کے تخیل کی بجائے "سلوک" کا تخیل داخل کرنا پڑے گا۔

مادہ کے نئے تصور کی تمثیل ذرا مشکل ہے۔ کسی شئے میں سختی، ٹھنڈک اور رنگ وغیرہ خواص موجود ہو سکتے ہیں لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر وہ شئے ـــــ وہ مادہ ـــــ کیا چیز ہے جو ان خواص کی مالک ہے۔ شئے سے اگر ہم اس کے خواص چھین لیں تو باقی کیا رہ جائے گا۔ جب ہم مادہ کے اس تخیل پر غور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا اس کا تصور ہماری اس اعصابی کوشش سے کوئی نہ کوئی ربط ضرور رکھتا ہے جو اس کا احساس کرتے وقت ہم کو کرنا ہوتی ہے اس قسم کے مادہ میں صرف جمود کی خاصیت ایسی ہے جسے ہم سائنٹفک کہہ سکتے ہیں اور جس کی پیمائش ممکن ہے۔

کوئی چیز متحرک ہو یا ساکن تا وقتیکہ اس پر کوئی بیرونی قوت عمل نہ کرے اس کی یہ حالت بدل نہیں سکتی مادہ کی اسی خاصیت کو "جمود" کہتے ہیں۔ یہ ایسی خاصیت ہے جس سے مادہ کی مادیت کا اظہار ہوتا ہے۔ نور کو پہلے مادیت سے مبرا سمجھا جاتا تھا لیکن اب چونکہ ہم کو معلوم ہے کہ نور جس جسم پر واقع ہوتا ہے اس پر دباؤ عائد کرتا ہے اب ہم کو اس کے ساتھ مادیت کا تخیل آمیز کرنا پڑے گا۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ برقیوں میں بھی جمود کی خاصیت ہوتی ہے ہم کو یہ تسلیم کرنے میں عذر نہ ہونا چاہئے کہ برقیے، جو برق کے غیر مجسم بار ہیں، مادہ کی طرح عمل کر سکتے ہیں۔ ان کا سلوک یہاں مادہ کے مماثل ہے۔ بعض اور صورتوں میں بھی برقیے مادی ذرات کی طرح سلوک کرتے ہیں۔ مثلاً برقیہ جگہ گھیرتا ہے اور عملی ضروریات مکان[1] (space) کے ایک حصہ میں ہمیشہ واقع رہتا ہے۔ ہم نے "عملی ضروریات" کے الفاظ خاص طور سے استعمال کئے ہیں کیونکہ نظری طور پر برقیہ کا اثر مکان میں ہر سمت میں لامتناہی تک پھیلا ہوا رہتا ہے لیکن ایک خاص فاصلہ کے بعد یہ محسوس نہیں ہوتا۔ برقیہ حرکت کا بھی اہل ہے۔ اور مکان میں اس کا راستہ متعین کیا جا سکتا ہے۔ ان خصوصیات کا لحاظ رکھیں تو ہمارے لئے اس امر میں کوئی شبہ باقی نہیں رہتا کہ برقیہ واقعی مادہ کی طرح سلوک کر سکتا ہے۔ اس بیان میں قدرے ترمیم کی ضرورت ہے لیکن فی الحال ہمارے لئے یہی کافی ہے۔

---

[1] مکان کا لفظ آئندہ جس جگہ بھی استعمال ہو قارئین اس سے (space) مراد لیں۔

اوپر جس قسم کے مادہ کا ذکر کیا گیا ہے اس کا تصور ہمارے دماغ کے لئے ناقابل برداشت بار نہیں ہے۔ ہم اس منزل پر بلا کسی فاش غلطی کے برقیہ کو کر دی جسم تصور کر سکتے ہیں۔ اب ہمیں مادہ کی ایسی تصویر بنانا ہے جو برقیوں پر مشتمل ہو ساتھ ہی مادہ کی ہر قسم کے لئے ایک علحدہ نمونہ تیار کرتا ہے۔ ہم کو معلوم ہے کہ تمام برقیوں پر ایک ہی قسم کا برقی بار رہتا ہے اور یہ بھی علم ہے کہ جوہر برقائے ہوئے ٹھوس نہیں ہوتے بلکہ برقی طور پر تعاون کی حالت میں رہتے ہیں۔ اس لئے ظاہر ہے کہ جوہر کی تعمیر کے لئے صرف برقیے کافی نہیں ہو سکتے۔ ہر جوہر میں مثبت اور منفی باروں کی مساوی مقدار کی ضرورت ہے۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ متضاد نوعیت کے یہ بار جوہر میں کس طرح رہتے ہیں؟ شروع شروع میں یہ خیال ظاہر کیا گیا کہ مثبت بار کا ایک کرہ ہوتا ہے جس میں برقیے کچھے رہتے ہیں۔ ردتھر فرڈ نے اس خیال کی تقلید کی، اس نے تجربوں سے بتایا کہ مثبت برق کے جوہر کے سارے جسم میں منتشر نہیں رہتی بلکہ مرکز حالت میں مرکز پر قائم رہتی ہے۔ اور برقیے اس مثبت بار کے گرد گردش کرتے رہتے ہیں۔ مرکز پر کی مثبت برق کو مرکزہ (Nucleus) کہتے ہیں۔ جوہر کی یہ تصویر چھوٹے پیمانہ پر نظام شمسی کی تصویر ہے یہ نظریہ اب تک قابل قبول ہے اور اس کی رو سے تقریباً تمام جوہر خلا پر مشتمل ہوتا ہے کیونکہ برقیہ کا قطر جوہر کے قطر کا $\frac{1}{.....}$ ہوتا ہے (جوہر کے قطر سے اس بیرونی مدار کا قطر مراد ہے جس میں برقیہ گردش کرتا ہے)، مرکزہ کا قطر بھی برقیہ کے قطر کے تقریباً مساوی ہوتا ہے۔ انسانی جسم کے تمام جواہر کو اگر اس طرح اکٹھا کر دیں کہ جواہر کے درمیان مطلق خلا باقی نہ رہے تو کل مجموعہ ایک چھوٹے نقطہ سے زیادہ نہ ہوگا۔ اتنا چھوٹا کہ اسے ہم خالی آنکھ سے دیکھ بھی نہیں سکتے۔ مندرجہ بالا نظریہ کی رو سے تمام ٹھوس مادہ نہایت ہی خفیف المقدار چیز ہے۔

ریڈیم کا جوہر بہت وزنی ہوتا ہے اور ہم کو معلوم ہے کہ جوہر جس قدر بھاری ہوگا اتنی ہی اس کی ساخت پیچیدہ ہوگی بھاری جوہر میں بہت سے برقیے گردش کرتے رہتے ہیں اور خود مرکزہ بھی پیچیدہ رہتا ہے سب سے ہلکا اور سادہ جوہر ہائیڈروجن کا ہوتا ہے یہ صرف ایک مثبت بار پر مشتمل ہوتا ہے جس کے گرد ایک برقیہ گردش کرتا ہے۔ اس مثبت برق کو بدئیہ (Proton) کہتے ہیں۔ اس کا بار بھی برقیہ کے بار کے مساوی مگر مختلف العلامت ہوتا ہے۔ مگر کمیت برقیہ سے زیادہ ہوتی ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ جوہر کا سارا وزن ان ہی بدئیوں کا نتیجہ ہے۔ ہائیڈروجن کے سوا تمام جواہر کے مرکزے میں بدئیے بھی ہوتے ہیں اور برقیے بھی، البتہ بدئیوں کا وزن نسبتاً بہت زیادہ ہوتا ہے۔ زیادہ وزنی جواہر میں ان کی ترتیب اس قدر پیچیدہ رہتی ہے کہ یہ غیر قائم (Unstable) معلوم ہوتے ہیں۔ ان جوہروں کے مرکزے میں ہمیشہ تجزیہ ہوتا رہتا ہے۔

ریڈیم کی صورت میں تجزیہ کا عمل بہت تیز تیز ہوتا ہے۔ اور تجزیہ کی شرح نہ تو تپش یا دباؤ سے متاثر ہوتی ہے اور نہ ہمارے

کسی دوسرے عمل سے۔ تجزیہ کے دوران میں ریڈیم کے جوہر سے تین قسم کا اشعاع ہوتا ہے۔ ان کو عموماً عہ، بہ، جہ کہتے ہیں۔ عہ شعاعیں ذرات کو ایک دھارے پر مشتمل ہوتی ہیں اور ہر ذرہ چار بڈیوں اور دو برقیوں سے بنتا ہے۔ درحقیقت عہ ذرہ ہیلیم کے جوہر کے مشابہ ہوتا ہے۔ بہ ذرات محض برقیے ہوتے ہیں۔ جہ شعاعیں ذرات نہیں ہوتیں بلکہ نہایت ہی چھوٹی لاشعاعیں ہوتی ہیں۔ یہ تمام شعاعیں ریڈیم کے نہایت ہی پیچیدہ مرکزے سے خارج ہوتی ہیں اور اس منظر سے جوہر کی ساخت کے تمام نظریہ کی توثیق ہوتی ہے۔ لیکن بحالت موجودہ ہم اس تجزیہ کی ماہیت سے بالکل بے خبر ہیں۔

اس نظریہ کی تجربی تفصیلات بیان کرنے کا یہ موقع نہیں اس لئے ہم فرض کریں گے کہ عام اصولوں کی حد تک یہ نظریہ بالکل درست ہے۔ البتہ جوہر کی توانائی کے مبدا کا ذکر ضروری ہے۔ ایک اونس ریڈیم کے ایک گھنٹہ میں جو حرارت خارج ہوتی ہے اس سے ڈیڑھ اونس پانی کو جوش دیا جا سکتا ہے۔ مقابلتاً توانائی کی یہ مقدار ناقابل لحاظ ہے کیونکہ ریڈیم کے جواہر کے مجموعہ کے صرف ایک حصہ کا تجزیہ ہوتا ہے اور کسی ہلکے عنصر مثلاً ہیلیم کے جوہر کو برق پاروں اور برقیوں سے تیار کرنے کے لئے زیادہ توانائی کی ضرورت ہے۔ مثلاً ایک اونس ہیلیم بنانے کے لئے اس قدر توانائی کی ضرورت ہے جس سے سو اسپی طاقت کے انجن کو مسلسل آٹھ گھنٹے چلایا جا سکتا ہے۔ واقعہ صورت یہ ہے کہ توانائی کا سب سے قوی مبدا۔ مادہ کی "تخریب" ہے۔ اگر ہم برق پارہ اور ایک برقیہ کو اتحاد کا موقع دیں تو بے اندازہ توانائی صرف ہوگی۔ اگر ایک تولہ کنکر کی تخریب کریں تو اتنی توانائی حاصل ہوگی جس سے ایک بڑا جہاز بحر اوقیانوس کے ایک طرف سے دوسری طرف تک جا سکتا ہے۔

یہ بات اب پایۂ ثبوت کو پہونچ چکی ہے کہ تخریب کا یہ عمل زمین پر نہیں بلکہ ستاروں میں جاری ہے۔ ستاروں سے مسلسل توانائی کی بڑی بڑی مقداریں خارج ہو رہی ہیں اور فلکیات میں یہ سوال ناقابل حل بنا ہوا ہے کہ یہ توانائی کہاں سے آ رہی ہے۔ اس مسئلہ کا ایک اہم جزو یہ بھی ہے کہ اس سے ہم ستاروں کی عمر کے متعلق اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تخمینہ سے ستاروں کی عمریں $۱۰^{۱۲}$ سال کے ضعف میں حاصل ہوتی ہیں۔ اگر یہ خیال صحیح مان لیں تو اب تک توانائی کے ان تمام مبدؤں کو ختم ہو جانا چاہئے تھا جن کے متعلق قیاس ہے کہ توانائی ان ہی سے آ رہی ہے۔ کیونکہ اس مدت مدید تک وہ توانائی کی اس قدر کثیر مقدار خارج نہیں کر سکتے۔ سب سے زیادہ قابل قبول حل یہ معلوم ہوتا ہے کہ ستاروں میں تخریب کا عمل جاری ہے۔ اس بنا پر آفتاب سے ہر روز ۳۶×۱۰^{۱۰} ٹن مادہ فنا ہو رہا ہے لیکن خود آفتاب کی کمیت اتنی ہے کہ یہ عمل آئندہ ۱۵×۱۰^{۱۲} سال تک جاری رہ سکتا ہے۔

تخمینہ سے زمین کی عمر $۱۰^{۱۲}$ سال نکلتی ہے اور صرف مندرجۂ بالا نظریہ سے اس تخمینہ کی تشفی ہوتی ہے۔ البتہ وقت کے اس پیمانہ کے

متعلق اگر شبہ ہوتا ہے تو وہ اس نظریہ سے جس کی رو سے کائنات برابر پھیل رہی ہے اور کائنات کی اتنی زیادہ عمر صحیح نہیں معلوم ہوتی بجائے اس کے یہ زیادہ قرین قیاس ہے کہ زمین کی عمر (10^9) سال ہوگی۔ ایسی صورت میں یہ خیال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ ستاروں سے جو توانائی آ رہی ہے اس کا سبب مادہ کی تخریب نہیں ہے بلکہ تعمیر ہے۔ اس ترمیم شدہ پیمانہ وقت کے لحاظ سے توانائی کی جو مقدار حاصل ہوتی ہے وہ اتنی ہے کہ ہائیڈروجن کے جواہر سے ہیلیم کے جوہر کی تعمیر میں خارج ہو سکتی ہے۔ اگر آفتاب صرف ہائیڈروجن پر مشتمل ہو تو اس ہائیڈروجن سے ہیلیم کے جواہر کی تعمیر میں اتنی توانائی حاصل ہوگی جو موجودہ شرح سے ۱۱ سال تک مل سکتی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کائنات کے مادہ کی تخریب ہو رہی ہے یا تعمیر، یا دونوں عمل ساتھ ساتھ جاری ہیں علماء سائنس تا حال اس سوال کے جواب پر متفق نہیں ہو سکے تقریباً بیس سال قبل ایک بہت زیادہ نفاذ (نفوذ کرنے والا) (Penetrating) اشعاع کا انکشاف ہوا جو ہماری فضا ارض میں سے گذر رہا ہے۔ یہ اشعاع زمین سے نہیں ہو رہا ہے کیونکہ غبارہ کی مدد سے دریافت کیا گیا ہے کہ سطح سمندر کے مقابلہ میں بلندیوں پر اس اشعاع کی طاقت نفوذ بہت زیادہ ہے نیز یہ آفتاب سے بھی نہیں آ رہا ہے کیونکہ دن اور رات میں اس اشعاع کی مقدار میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ اب آفتاب خود ایک اوسط جسامت کا ستارہ ہے اس لئے یہ فرض کرنے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی کہ یہ اشعاع کسی دوسرے ستارہ سے آ رہا ہے۔ اس کو بیرونی مکان سے آنا چاہیئے۔ اس کا حقیقی مبدا کیا ہے؟

اس اشعاع کا نام کونی اشعاع (Cosmic) ہے۔ اور زمین پر ہم کو اشعاع پیدا کرنے کے جو طریقے معلوم ہیں ان میں سے کسی سے بھی یہ پیدا نہیں کیا جا سکتا ہمارے پیدا کردہ اشعاعوں میں سب سے زیادہ طاقتور اشعاع لا شعاعیں اور جیم شعاعیں ہیں۔ لا شعاعیں سیسے کی چند ملی میٹر موٹی تختی میں گذر سکتی ہیں اور جیم شعاعیں چند انچ سے زیادہ سیسہ میں نہیں جا سکتیں لیکن یہ نیا اشعاع سیسے کی سولہ فیٹ موٹی دیوار میں سے گذر جاتا ہے۔ اب اگر اس کی ساخت بھی لا اور جیم شعاعوں کی ساخت کے مماثل فرض کر لی جائے تو اس کی طاقت نفوذ سے طول موج محسوب کیا جا سکتا ہے۔ اور اس وقت ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس قسم کی موجیں ہائیڈروجن کے جوہر کی تخریب سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس طرح ان شعاعوں سے یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ مکان کے کسی بعید حصہ میں برابر تخریب کا عمل جاری ہے۔ دوسری طرف بعض لوگوں نے خصوصاً (Millikan) ملیکین نے بتایا ہے کہ بعض عناصر پیچیدہ جواہر کی تعمیر میں ایسی شعاعیں پیدا ہونی چاہئیں یعنی کائنات میں تخلیق یا تعمیر کا عمل جاری ہے ہی۔

موخر الذکر نظریہ اول الذکر کے مقابلہ میں کم تر قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ پیچیدہ جواہر اچانک

کیونکہ یہ چل نہیں سکیں گے۔ تعمیر کے کام کو تبدیج ہونا چاہئے اور تدریجی تعمیر سے اس قسم کا اشعاع پیدا نہیں ہو سکتا۔ بہر کیف فی الحال یہ سوال تصفیہ طلب ہے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ کونی شعاعیں لا شعاعوں کے مماثل نہ ہوں بلکہ برقیہ ذرات کی طرح ذرات پر مشتمل ہوں۔ اس صورت میں ان کی رفتار نور کی رفتار کے تقریباً مساوی ہونی چاہئے کیونکہ بغیر اس کے اتنا اشعاع پیدا نہیں ہو سکتا۔ عام خیال یہ ہے کہ یہ امکان صحیح نہیں ہوگا۔

(۴)

اس وقت تک برقیہ کو ذرہ فرض کیا گیا ہے۔ یہ تخیل ۱۹۲۵ء تک صحیح سمجھا جاتا تھا لیکن اب برقیہ کی بعض اور خصوصیات کا پتہ چلا ہے جن کی رو سے بعض صورتوں میں برقیہ کے خواص موجوں کے خواص کے مشابہ ہوتے ہیں یعنی برقیہ ذرہ کی طرح بھی سلوک کرتا ہے اور موجی گروہ (wave group) کی طرح بھی۔ بعض تجربات میں برقیہ ناقابل انکار طور پر ذرہ کی طرح عمل کرتا ہے لیکن ایسے تجربات بھی ہیں جن میں اس کا طرز عمل موجی گروہ کے سلوک کے مشابہ ہے۔ ان دوہری خصوصیات کے اظہار کے لئے ایڈنگٹن نے برقیہ کا نام موجک (wavicle) تجویز کیا ہے لیکن ہم ایسے برقیہ کا طبعی تصور کرنے سے قاصر ہیں جو بیک وقت ذرہ بھی ہے اور موج بھی۔ نتیجہ یہ ہے کہ برقیہ اب ہمارے تصورات کی دنیا سے بہت بلند ہو گیا ہے۔

ان مشکلات کے باوجود ریاضیات کی مدد سے ہم برقیہ کے متعلق یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ خاص حالات کے تحت کیا واقعہ پیش آنا چاہئے ناقابل تصور برقیہ کی جگہ ہم چند علامات مقرر کر لیتے ہیں۔ ان علامات کا طبعی مفہوم ہم نہیں جانتے لیکن یہ معلوم ہے کہ وہ کن کلیات کی پابند ہیں۔ لہذا ہم یہ بھی بتا سکتے ہیں کہ یہ علامات جس چیز کی تعبیر کرتی ہیں اس کو خاص خاص شرائط کے تحت کیا افتاد پیش آئے گی۔ ریاضیات کا عالم اس بحث میں پڑتا ہی نہیں کہ برقیہ کا تصور بھی ممکن ہے یا نہیں وہ تو صرف یہ دیکھتا ہے کہ ریاضیاتی اعمال برقیہ پر جاری ہو سکتے ہیں یا نہیں اگر ہو سکتے ہیں تو مطلب پورا ہو گیا۔ لیکن ظاہر ہے کہ ہر شخص، خواہ وہ سائنس داں ہی کیوں نہ ہو، ریاضیات کا عالم تو نہیں ہے اس لئے طبعی سائنس کی اس منزل پر عموماً لوگوں کے قدم جمنے نہیں پاتے۔

برقیہ کا اوپر بیان کردہ تصور کسی صورت سے خلاف توقع نہیں ہے۔ کیا ضروری ہے کہ قدرت کے تمام مظاہر ان ہی قوانین کے پابند ہوں جو ہم نے اپنے روزمرہ کے محدود تجربات کی بنا پر وضع کئے ہیں؟ مگر انیسویں صدی کے برطانوی سائنس داں ذرا تنگ نظر اور قدامت پرست واقع ہوئے تھے۔ وہ بقول لارڈ کلون کے کسی ایسی چیز کو سمجھ ہی نہیں سکتے تھے جس کا نمونہ تیار نہ کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ قدرت تو اس چیز کی پابند نہیں ہے کہ اس کے کسی مظہر کا

نمونہ انیسویں صدی کا برطانوی سائنس داں تیار کرسکتا ہے یا نہیں اس لئے آخر کار ان سائنس دانوں کو مجبوراً اپنی کوتاہ فہمی کا اعتراف کرنا پڑا۔ براعظم کے سائنس داں اتنے تنگ خیال نہ تھے۔ سمجھنے کا مفہوم ان کے نزدیک زیادہ وسیع تھا۔ اور یہی وجہ ہے کہ آج کل براعظم کے سائنس داں زیادہ کامیاب ثابت ہو رہے ہیں۔ طبعی تحقیقات کے موجودہ دور میں وہ شخص بہت بدقسمت ہے جو کسی ایسی چیز کا ادراک ہی نہ کرسکے جس کی تصویر بنانے سے وہ قاصر ہے۔

عوام کے سامنے اگر ہم موجودہ سائنٹفک نظریات کا خاکہ پیش کرنا چاہیں تو بڑی مصیبت کا سامنا ہوگا کیونکہ عوام کا پہلا سوال یہی ہوگا کہ اس کو شکلوں اور نمونہ سے واضح کیا جائے۔ اور جب ہم ایسی چیز سے بحث کر رہے ہوں جو بیک وقت ذرہ بھی ہے اور موجوں کا گروہ بھی تو بتائیے کہ اس کی شکل بنائی جائے تو کیونکر اور نمونہ پیش کیا جائے تو کس طرح کا۔

بیسویں صدی کے سائنس دانوں کی قسمت میں اگر راہبانہ زندگی نہیں لکھی ہے تو انھیں سائنس کے معموں کی ایسی تصویریں مہیا کرنی پڑیں گی جنھیں عوام سمجھ سکیں یا پھر عوام میں وہ قوت پیدا کرنی ہوگی جس کی مدد سے وہ منطقی استدلال اور رابطوں کو سمجھنے کے لئے غیر مادی اشیا کا تصور کرسکیں۔ ذرا دیر کے لئے ایسی کائنات کا تصور کرنے کی کوشش کیجیے جو محدود بھی ہے اور پھر برابر پھیل بھی رہی ہے، آپ کامیاب نہیں ہوسکتے لیکن ریاضیات کا عالم جب اس چیز کو پیش کرے گا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ کائنات کا صرف ایک ایسا ہی تصور ایسا ہوسکتا ہے جس میں مکانی رابطے (spatial relations) اور پیمائشی فاصلے بمقابلہ دوسری ریاضیاتی اسکیموں کے زیادہ صحت کے ساتھ جمائے جاسکتے ہیں۔ اب اگر اس ریاضیاتی تصویر پر چند منطقی اعمال جاری کئے جائیں تو نتیجہ نکلتا ہے کہ مکان محدود بھی ہے اور اس میں مسلسل وسعت بھی ہو رہی ہے۔

اس قسم کے مکان کے تصور کی کوشش فضول ہے۔ کوشش سے صرف اس قسم کے سوال دماغ میں پیدا ہوں گے۔ اگر مکان پھیل رہا ہے تو کس چیز کے اندر پھیل رہا ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال میں پہلے ہی سے یہ مفروضہ شامل ہے کہ ایک چیز کے پھیلنے کے لئے دوسری چیز کی ضرورت ہے جس کے اندر پہلی چیز پھیل سکے۔ اس لئے ریاضیات کا عالم اس سوال پر توجہ نہیں کرے گا بلکہ اس سوال سے اس کے دماغ میں ایک اعتراض اپنے نظریہ پر پیدا ہوگا اور وہ اس کی توجہ کو جذب کرے گا۔ اعتراض یہ ہوگا کہ "تمہارا یہ نظریہ کہ مکان محدود بھی ہے اور پھیل بھی رہا ہے خود اپنی تغلیط کرتا ہے"۔

عالم مذکور اس اعتراض پر غور کرے گا اور اس کی بنیادوں کو بھی پرکھے گا۔

قدرتی مسائل کی چھان بین میں اب ہم ایسی منزل پر پہونچ چکے ہیں کہ جہاں ہم ایسی چیزوں سے بحث کرتے ہیں جن کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اس لئے ہم کو متعجب نہ ہونا چاہئے اگر اچانک یہ معلوم ہو کہ برقیہ جن کلیات کا پابند ہے وہ بھی اتنے ہی عجیب ہیں جس قدر کہ خود اس کی ساخت لیکن سائنس داں جب طبعی کلیات کی غیر معمولی نوعیت کا ذکر کرتا ہے تو اس کا کیا مطلب ہوتا ہے؟ وہ کون کلیات ہیں جن کو ہم معمولی سمجھیں اور موجودہ طبیعیات کے کلیات کس طرح ان کلیات سے مختلف ہیں؟ بشرط فرصت اس چیز پر کسی آئندہ اشاعت میں روشنی ڈالی جائے گی۔ فقط

محامد علی عباسی بی۔ ایس سی

نامۂ حبیب

ہائے کل بھی رات بھر آنکھوں میں نیند آئی نہیں — موجِ نکہت کوئی عشرت کی خبر لائی نہیں
سو رہی تھی ساری دنیا خواب کے آغوش میں — میں دلِ افگارِ تمنا تھی ابھی تک ہوش میں
چاندنی چھٹکی ہوئی تھی خامشی چھائی ہوئی — بہکی بہکی تھی فضا جیسے بہار آئی ہوئی
ذرہ ذرہ اپنے دامن میں چھپائے نور تھا — وادیِ ایمن نہ تھی روشن چراغِ طور تھا
آسماں پر اس طرح بکھرے ہوئے انجم تمام — منتشر شیرازۂ عالم کا جیسے ہو نظام
جھلملاتے جھلملاتے ڈوب جاتے تھے کبھی — ہستیِ موہوم کا نقشہ دکھاتے تھے کبھی

چھا رہا تھا دامنِ گیتی پہ کیفِ سرمدی ۔۔۔ مجھ فسردہ دل کی دنیا میں وہی افسردگی
دیکھتے ہی دیکھتے یہ دل فریبی کا سماں ۔۔۔ کروٹیں لینے لگا جیسے مریضِ ناتواں
تھک گیا جب یہ سرِ مغرب کا نکلا ماہتاب ۔۔۔ سامنے کی وادیوں میں چھپ گیا جیسے خواب
چھا گئیں تاریکیاں تارے پریشاں ہو گئے ۔۔۔ چاند کی فرقت میں مہ پارے پریشاں ہو گئے
میں سراپا درد طوفانِ حوادث میں گھری ۔۔۔ آنسوؤں کے تار کا مالا بنانے میں رہی
کثرتِ گریہ سے جب بے نور آنکھیں ہو گئیں ۔۔۔ رات کی تاریکیوں میں آرزوئیں سو گئیں
تم سرِ بالینِ حسرت تھے سراپا انتظار ۔۔۔ اور تھی میں ناتواں غافل فریبِ اعتبار
ہر سکوتِ منتظر آغوش پھیلائے ہوئے ۔۔۔ میری روٹھی نوجوانی کو تھا بہلائے ہوئے
چونک اٹھی جب تصور سے جدا تم ہو گئے ۔۔۔ دفعتاً خاموش مثلِ بحرِ قلزم ہو گئے
اور کیا احوال میں تم کو جدائی کا لکھوں ۔۔۔ ماجرائے سوزِ فرقت اور میں اب کیا لکھوں

جاں نواز آؤ کہ اب غم کی پذیرائی نہیں
دل نواز آؤ کہ اب تابِ شکیبائی نہیں

عزیز احمد عزیز متعلم سال چہارم

جاہلیت کا ایک عرب جس نے یورپ پر سلطنت کی

مولوی محمد عثمان صاحب عمادی جامعۂ عثمانیہ کے قدیم طالب علم ہیں اور آج کل بی ٹی ٹریننگ کالج میں زیرِ تعلیم ہیں۔ موصوف اگرچہ سائنس کے گریجویٹ ہیں مگر ادب و تاریخ کا اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں۔ سائنس اور ریاضی ایسے خشک مضامین کی درس و تدریس کے ساتھ ایسے تحقیقی اور علمی مضامین قلم بند کرنا آپ کے لئے خاص طور پر قابلِ ستایش ہے اور یہ فیض موصوف کو یقیناً اپنے والد ماجد علامہ عبداللہ العمادی مدظلہ سے حاصل ہوا ہے جن کے علم و فضل سے نہ صرف ہندوستان بلکہ عراق و مصر بھی مستفیض ہو رہے ہیں۔

مدیر

عربوں کا دعویٰ ہے کہ انھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک سے بہت پہلے دنیا کے بیشتر ممالک پر حکومت کی اور ان کو تہذیب و تمدن سے روشناس کیا، ملکِ تبت کا نام انھیں کے ایک بادشاہ تُبَّع سے موسوم ہوا، یمن کا ایک بادشاہ شمر اپنی فوج لے کر ترکستان تک تمام علاقے فتح کرتا گیا، موجودہ سمرقند کا شہر اسی کے نام کی یادگار ہے، ایرانی جو اپنے مہذب و متمدن ہونے کے بڑے بڑے دعاوی پیش کرتے ہیں زمانۂ دراز تک اسی قوم کے غلام بنے رہے، عربوں کا ایک

قبیلہ وادیٔ نیل کے ساحل پر نزیل ہوا اور اس نے مدت مدید تک مصریوں پر حکومت کی، چونکہ یہ لوگ خانہ بدوش تھے لہذا اہل ملک نے اس حکمراں خاندان کا نام ہی "ہکسوس" یعنی چرواہوں کا بادشاہ (ملوک الرعاۃ) رکھا، اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ان کے تعلقات بعثت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے صدہا سال پہلے تمام اقصائے عالم سے ہو چکے تھے، دانایان فرنگ نے بہت سی جگہوں پر کھدائی (حفریات) کے ذریعہ ایسے آثار پائے ہیں جن سے ان تمام دعووں کی تصدیق و توثیق ہوتی ہے، ہماری زبان میں ایک بے مثل کتاب "تاریخ عرب قدیم" ہے جس میں اس اجمال کی تفصیل مل سکتی ہے لیکن آج کی صحبت میں ہم ناظرین کرام کا تعارف سلطنت روما کے ایک زبردست عرب شہنشاہ سے کرانا چاہتے ہیں جس کو مدت ہوئی کہ ہم بھول چکے ہیں مگر اس کے کارنامے اب تک تاریخ کی کتابوں میں محفوظ ہیں اور ہم تک پہنچے ہیں، گبن نے اس شہنشاہ کا نام "فلپ" لکھا ہے۔

سنہ دو سو اڑتیس عیسوی کا عالم آشوب زمانہ ہے، چند ماہ کی ایک قلیل مدت میں روما کے تخت پر چھ شہنشاہ یکے بعد دیگرے بیٹھے اور قتل ہوئے، تمام شہر میں ایک اضطراب و ہیجان کارفرما ہے، لوٹ مار قتل و غارتگری کا طوفان برپا ہے، ہر شخص کی زندگی عام اس سے کہ وہ امیر ہو یا فقیر شہری ہو یا پردیسی خطرہ میں ہے، ایسے وقت میں فوج نے گارڈین کو جس کی عمر مشکل سے چودہ پندرہ سال کی ہے روما کے تخت پر بٹھا دیا اور تمام رومی دنیا نے اس کو اپنا شہنشاہ تسلیم کر لیا، گارڈین نے اپنے خسر مسی تھیس کی مدد سے انتظام سلطنت نہایت خوبی و خوش اسلوبی سے انجام دیا، اور چند ہی روز میں روما کے باشندوں کو پھر امن و اطمینان نصیب ہو گیا۔

اسی اثنا میں ایرانیوں نے عراق کا ملک فتح کر لیا اور انطاکیہ پر پیش قدمی کر دی، روما میں جب یہ خبر پہونچی تو مسی تھیس نے سمجھا بجھا کر نو عمر شہنشاہ کو ایرانیوں کے مقابلہ پر آمادہ کیا، گارڈین تمام فوج لے کر مشرق کی طرف روانہ ہوا، ایرانیوں کو جب اس کے ورود کی خبر پہونچی تو جتنے شہر انھوں نے فتح کئے تھے خالی کر کے دریائے دجلہ تک ہٹ آئے، گارڈین نے اس فتح کی خوشخبری روما کو بھیجی اور اپنے خسر کی بہت تعریف کی، اس پوری مہم میں مسی تھیس نے نہایت قابلیت اور جانفشانی و قابلیت کے ساتھ فوج کے آرام و آسایش کا انتظام کیا، رسد کی کثیر مقدار ہر منزل پر جمع رہتی جس سے کوئی تکلیف سپاہیوں کو نہ ہوئی اور ان کو شکایت و بغاوت کا موقع نہ ملا، لیکن مسی تھیس اسہال کی بیماری میں مبتلا ہو کر مر گیا جس کے ساتھ ہی گارڈین کی خوش نصیبی بھی رخصت ہو گئی۔

شہنشاہ نے مسی تھیس کی جگہ فلپ کو سر لشکری عطا فرمائی (۲۴۳ء)، فلپ عرب تھا اور شہر بصری اس کا وطن تھا گبن کے بیان کے مطابق اوائل عمر میں وہ قزاق تھا کیونکہ وہ عرب تھا "اگر عرب ہونا قزاق ہونے کے مترادف ہے تو ہمیں ایسے

غیر عرب لٹیروں کے حالات ہمیں ملتے ہیں جنہوں نے آئینِ جہانداری وجہاں بانی کا سبق سکھایا۔ خود انگلستان کی تاریخ میں ایسے پادشاہوں کی نسبت کیا کہا جائے گا جن کی قزاقیوں کی داستانیں خود تاریخ میں مذکور و ماثور ہیں۔

فلپ اپنے زور بازو سے جب ملک میں معروف ہوچلا تو قسمت آزمائی کے لئے رومی فوج میں شریک ہوگیا۔ بڑے بڑے معرکے اس نے سر کئے، اُس کے کارنامے بہت مشہور ہوئے اور جلد ہی ایک ادنیٰ سپاہی سے ترقی کرکے سپہ سالار ہوگیا۔ فوج میں اتنا ہر دلعزیز تھا کہ ادنیٰ سے اعلیٰ تک ہر شخص اس کی عزت کرتا۔ گارڈین بھی اس کو بہت مانتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مسی تھیس کے مرنے کے بعد اُس کی نظروں میں سوائے فلپ کے کوئی دوسرا اس عہدۂ جلیلہ کے قابل نہ دکھائی دیا۔ اس وقت فلپ کی عمر چالیس سال کی تھی، اُس کے حوصلے بہت بلند تھے، وہ ترقی کے انتہائی زینے پر گو ابھی تک نہیں پہونچا تھا تاہم قسمت اُس کی یاوری پر تھی۔ اولو العزم سپہ سالار اپنے فرائض منصبی نہایت احتیاط وخوبی سے ادا کرتا رہا۔ لیکن وہاں تو روز ازل ہی سے روما کا تخت اُس کے حصہ میں آچکا تھا۔ اس لئے حالات و واقعات نے بھی اسی کے مطابق صورت اختیار کرنی شروع کی۔

زمان ومکان کے اتنے فاصلہ پر صحیح واقعات کا پیش کرنا بہت دشوار ہے۔ گبن کا بیان ہے کہ فلپ نے نہایت ہوشیاری سے ایسا انتظام کیا جس سے لشکرگاہ میں غلہ کی کمی محسوس ہونے لگی، سپاہی بہت برافروختہ ہوئے اور شہنشاہ کو اس کی نوعمری اور ناتجربہ کاری کا الزام دینے لگے، غیظ وغضب کے عالم میں وہ شہنشاہ کو تخت سے تختہ پر کھینچ لائے اور فوراً قتل کردیا اور بلا کسی توقف کے اپنے محبوب سپہ سالار فلپ کو تخت نشین کیا، رومی دنیا نے بطیب خاطر اس "لٹیرے شہنشاہ" کو اپنی قسمتیں سپرد کردیں (مارچ ۲۴۴ء)

فلپ نے تخت پر قدم رکھنے کے ساتھ ہی پہلا کام یہ کیا کہ اپنے محسن کی یادگار کے طور پر ایک بڑا مقبرہ اس مقام پر تعمیر کرایا جہاں وہ قتل ہوا تھا۔

رومی مورخین کہتے ہیں کہ فلپ کے ایما سے گارڈین کو فوجیوں نے قتل کیا اگرچہ اوّل اوّل وہ اپنے محسن کی جاں بخشی دینا چاہتا تھا۔ یہاں ہم گبن کی دقت نظری اور منصف مزاجی کی تعریف کئے بغیر نہیں رہ سکتے کہ اُس نے ان تمام الزامات کو واقعات کی روشنی میں باطل قرار دیا اور اس "لٹیرے شہنشاہ" کے زبردست کردار پر کوئی دھبہ نہ آنے دیا۔

اُس کے دلائل یہ ہیں :-

گارڈین کے مرنے کے بعد فلپ رومی دنیا کے سیاہ وسپید کا مالک بلا شرکت غیرے ہوا۔ فوج اُس کی مطیع و فرمانبردار تھی سینیٹ نے اُس کی اطاعت کا حلف اپنی رضا و رغبت سے اُٹھالیا تھا۔ وادی دجلہ سے لے کر بحر ظلمات تک اور افریقہ سے

لے کر فرغستان تک جدھر اُس کی نگاہ اٹھتی کوئی اُس کی راہ میں حائل و مزاحم نظر نہ آتا، گارڈین کے مرنے سے کوئی خوف اُس کو نہ تھا، بایں ہمہ اگر گارڈین فلپ کے اشارہ سے قتل ہوا تو یہ کیا ستم ظریفی تھی کہ اس کی یادگار میں ایک عالیشان مقبرہ تعمیر کرایا؟ دوسری بات یہ ہے کہ سینٹ کے نام جتنے مراسلے اس نے بھیجے ہر ایک میں اپنے کو اس جرم سے بری کیا، اگر گارڈین اس کے حکم سے قتل ہوا تو اس عذر گناہ کے کیا معنی؟ ان دلائل کے علاوہ ایک اور بات بھی قابل لحاظ ہے، فوج فلپ کے تابع تھی، جیسا کہ پہلے ہم بیان کرچکے ہیں گارڈین کے قتل کے بعد فوج نے اُس کو تخت پر بٹھایا، اگر خود فلپ نے محسن کشی کی تھی تو فوج کو اُسے تخت پر بٹھانے کی کیا حاجت تھی؟ اُس کے راستہ میں جب کچھ نہیں حائل تھا تو وہ خود ہی تخت و تاج کو غصب کرے سکتا تھا، لیکن نہیں، عرب کا شریف زادہ تاریخ میں غاصب کے لقب سے مشہور ہونا نہیں چاہتا تھا، فوج کے اصرار پر اور مہمات ملکی کی فوری ضروریات پر اُس نے یہ بارگراں اپنے کندھوں پر اُٹھایا، رومی مقبوضات کو چھوڑ کر ایرانی پہلے ہی پسپا ہوچکے تھے، اس نے سرحد کی حفاظت کا معقول انتظام کرکے اطالیہ کا رُخ کیا، اور نہایت شان کے ساتھ روما میں داخل ہوا، رومیولس کو دریائے طبرہ کے کنارے تھوڑے سے "چرواہوں اور ڈاکوؤں" کی مدد سے روما کی بستی بسائے ہوئے پورے ایک ہزار سال گزر چکے تھے، فلپ نے اس ہزار سالہ قیام سلطنت کا جشن اپریل ۲۴۸ء میں بڑی دھوم دھام سے منایا، دریائے طبرہ کے کنارے تین رات تک قربانیاں ہوتی رہیں، تمام منادر رقص و سرود کی آواز سے گونجتے رہے، چراغوں اور شعلوں کی روشنی میں تمام شہر جگمگا اٹھا، ستائیس نوجوان اور اتنی ہی حوروں نے اپنی سریلی آواز میں حال اور مستقبل کے لئے دعا مانگی، فلپ کی شاندار نمائشوں اور ضیافتوں نے عوام کی آنکھوں کو خیرہ کردیا، لوگوں کی تفریح طبع کے لئے تماشا گاہوں میں ایک مدت تک طرح طرح کے کھیل ہوتے رہے، غرض رومیوں نے نہایت عقیدت سے اس جشن میں حصہ لیا اور ہفتوں تک دن عید اور رات شب برات بنی رہی، لوگ جوق جوق قطع منازل و طے مراحل کرکے دیکھنے آتے، سارا شہر دن میں آدمیوں کا جنگل اور راتوں کو چراغوں کا فانوس نظر آتا۔

جس زمانے کا ہم ذکر کرتے ہیں بادشاہ اور رعایا کے درمیان رشتہ الفت ٹوٹ چکا تھا، رومی سوسائٹی کی حالت نہایت ناگفتہ بہ ہوگئی تھی، یکے بعد دیگرے بہت سے شہنشاہوں کو اس تخت کے لئے عزیز جانیں دینی پڑی تھیں، خود فلپ کو بھی خوف ہر وقت لگا رہتا، آخر سنہ دوسو انچاس عیسوی کے موسم گرما میں یہ بلا خود اس کے سر پر بھی آئی، میسیا کے دستہ فوج میں مرلیس نامی ایک گمنام شخص نے بغاوت کردی، فلپ اس خوف سے کہ کہیں یہ بغاوت سارے لشکر میں عام ہوجائے

سینٹ کو اس سے آگاہ کیا، ساری مجلس ساکت وصامت تھی، ڈلبیس نے مُہر سکوت کو توڑا اور شہنشاہ کو تسلی و دلاسا دے کر اطمینان دلایا کہ یہ بغاوت محض عارضی ہے اور اس کا اثر جلد زائل ہو جائے گا ڈیسیس کی یہ پیشین گوئی بہت جلد ظاہر ہوئی اور باغی قتل کر دیا گیا، لیکن فوج اب بھی غیر مطمئن تھی لہذا اُن کو ہموار کرنے کے لئے شہنشاہ نے ڈیسیس کو بھیجا یہاں فوج نے اُسے مجبور کر کے شہنشاہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر لیا، یہ دیکھ کر فلپ اپنی آزمودہ کار فوج جرار کو لے کر بغاوت فرو کرنے کے لئے روانہ ہوا، جنگ میں اس کو شکست ہوئی ایک روایت کے مطابق وہ فوراً قتل کر دیا گیا، لیکن دوسرے بیان سے ایسا واضح ہوتا ہے کہ کچھ دنوں کے بعد وہ ویرونا میں قتل ہوا،

جاہلیت میں تو مشرق کے ایک فرزند نے اتنا عروج حاصل کیا تھا، اس عہد میں کہ تہذیب و شائستگی کا عہد کہا جاتا ہے مشرق کو اپنے فرزندوں سے کیا کچھ اُمید نہ ہوگی۔ اگرچہ زمانہ کی زبان حال کہہ رہی ہے۔

امید نیست کہ قسیس بشکند ناقوس
ہمیں بس است نہ بندند مومناں زُنار

محمد عثمان عمادی، بی ایس سی
(ٹریننگ کالج جامعہ عثمانیہ

قومیت کا تصور

(زمانہ حاضرہ میں)

قومیت کا وجود احیائی دور کی فرمانروائی سے ہوا ہے اور ان میں حقوق انقلابی کو خصوصاً بڑا دخل ہے۔ قومی حکومت کی سقائی خود مختاری کا نظریہ اس خیال پر منحصر ہے کہ باشندوں کو اپنا ذاتی طریقۂ حکومت پسند کرنے کا حق حاصل ہے اور اسی بنا پر اس تصور کی بنیاد پڑی کہ جو کوئی گروہ کافی مستقل اور متمیز ہستی رکھتا ہو اور ایسی روایات کا حامل ہو جو قومی حکومت قائم کرنے کے لئے ضروری ہیں، اس کو خود اپنے طریقۂ حکومت کو ارتقاء کا موقع حاصل ہونا چاہئے۔ قومی امتیازات اور قومیت کی حد بندی عموماً دو باتوں سے کی جاتی ہے:-

(۱) نسل (۲) گرد و پیش کے حالات

(۱) نسل: ہمارے اسلاف کے واقعات کو ہمارے معاشرہ کی تنظیم میں بہت بڑا دخل ہے صدیوں سے یہ سلسلہ جاری ہے کہ ہر نسل اپنی پیشرو نسل کے خیالات اور جذبات کو قبول کرتی ہے چنانچہ موجودہ زمانہ میں بھی شکل و شباہت، عادات دماغی و جسمانی، قومی زبان اور لباس، ایسی چیزیں عہد ماضی کی یادگار ہیں۔ ابتدائی زمانہ میں جن وجوہ سے طبقۂ انسان کی تقسیم مختلف گروہوں میں ہوئی تھی اب وہی اسباب ایک عالمگیر مجلس شوریٰ یا وفاق عالم کے قائم ہونے میں حائل ہیں غرضکہ ہم میں سے ہر شخص فرداً فرداً اور من حیث الجماعت ان نتائج کا مرقع ہے جو زمانہ ماضی کے اثرات سے مترتب ہوئے ہیں۔

(۴) گرد و پیش کے حالات میں قدرتی اور انسانی کیفیتیں شامل ہیں۔ قدرتی ماحول، آب و ہوا، اور جغرافیائی حدود کی بنا پر مختلف گروہ انسانی میں ایک بڑا فرق پیدا ہو جاتا ہے۔ لیکن ان باتوں سے نسلی خصوصیات کے متعلق کوئی اصول نہیں بن سکتا کیونکہ ممکن ہے کہ کسی قوم میں بعض صفتیں ہمیشہ برقرار رہنے والی نہ ہوں۔ اس میں شک نہیں کہ خلقت انسانی کے عادات و خصائل پر آب و ہوا کی کیفیت اور دیگر جغرافیائی عناصر کا بہت بڑا اثر پڑتا ہے لیکن یہ نہیں کہا جا سکتا کہ ایک خاص قوم یا نسل کسی خاص صفت پر اس طرح بلا شرکت غیرے قابض ہو سکتی ہے جو اس کو اور قوموں یا نسلوں سے متاثر کرنے کے لئے ضروری ہے۔ کیونکہ یہ دیکھا گیا ہے کہ مختلف قومیں مختلف زمانوں میں ایک ہی مقام پر آباد ہوئیں اور ایک ہی مقام پر نشو و نما حاصل کیا لیکن ایک ترقی نصیب ہوئی اور دوسری اس سے محروم رہیں۔ اس کے علاوہ اکثر قومیں انھیں جغرافیائی حالات میں جن میں وہ ہمیشہ سے رہتی آئی ہیں مختلف زمانوں میں مختلف خصوصیات سے متصف رہی ہیں۔ بیان بالا سے ہمارا مطلب صرف اتنا ہے کہ جغرافیائی عناصر کے اثرات اور نسلی عادات و فضائل کے متعلق مبالغہ سے گریز کرتے ہوئے اگر موجودہ حالت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس وقت جو قوم جہاں جہاں اور جس جس حالت میں سکونت پذیر ہے وہ دوسری تمام قوموں سے مختلف واقع ہوئی ہے۔ ایک خاندان دوسرے خاندانوں سے بلحاظ خون جدا ہوتا ہے اور چونکہ وہ گروہ یا جمہور جسے ہم "قوم" کے لقب سے موسوم کرتے ہیں کم و بیش مختلف خاندانوں کا ایک متفق مجموعہ ہوتا ہے اس لئے ظاہر ہے کہ دو قوموں کے درمیان خونی اختلاف بھی ہوتا ہے لیکن اس اختلاف کی شدت تبدیلی وطن تعلقات تجارتی اور ذرایع حمل و نقل کی فراوانی کی وجہ سے کم ہو جاتی ہے۔

انسانی ماحول سے وہ ذہنی اور جذباتی اثرات مراد ہیں جو ایک انسان سے دوسرے انسان پر اور ایک گروہ سے دوسرے گروہ پر پڑتے ہیں۔ چنانچہ کوئی شخص سیاسی مسائل پر اس وقت تک صائب رائے نہیں قائم کر سکتا جب تک کہ فرداً فرداً ہر شخص کی کارکردگی اور اس تغیر کو پیش نظر نہ رکھے جو گروہوں کے ایک دوسرے سے مل کر رہنے کے سبب تمام قوم میں رونما ہو جاتا ہے۔ گو جمہور یا قوم ایک نہایت ہی اہم اور قابل لحاظ شئے ہے مگر افراد کی ہستی بھی نظر انداز نہیں کی جا سکتی جماعتی تعلقات کے علاوہ روایات کے میل جول اور تقلید کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے۔ جو قومیں مدت دراز تک ساتھ ساتھ رہتی ہیں اُن میں ان باتوں کے متعلق جو عادات و خصائل میں قابل ستائش یا زندگی میں فائدہ مند ہوتی ہیں اور اس امر کی نسبت کہ قانون اور حکومت کی کیا حیثیت ہونی چاہئے ایک خاص خیال یا تصور پیدا ہو جاتا ہے۔ یکساں سرگذشت اور یکساں معیار سے قومیت کی تشکیل میں اس قدر مدد ملتی ہے جتنی ایک خون سے نہیں۔ الغرض یہ ایسی قوتیں ہیں جن کے ذریعہ سے وحدت انسانی

گروہ بنتا ہے جسے ہم "قوم" کہتے ہیں۔ انہیں قوتوں کے اعتبار سے قوم کی نوعیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ سیاسی ارتقا میں بہ حیثیت ایک طاقت کے اس کو کس قدر اہمیت حاصل ہے۔

آج ایسے صدہا گروہ موجود ہیں جن میں ایسے امتیازات اور اختلافات ہوتے ہیں جن کو تسلیم کرنے سے کوئی بھی ذی ہوش اہل خیال انکار نہیں کر سکتا۔ حالیہ خیال یہ ہے کہ ان اختلافات کو قائم رکھ کر مختلف قوموں کو ترقی کرنا چاہیئے۔ اور اس کے کئی وجوہ ہیں، پہلے تو یہ کہ ایک فرد کی حیثیت کو مٹا دینے سے جس طرح اس کی ذاتی قابلیت مفقود ہو جاتی ہے اسی طرح تمام قوموں کو آئینی دستور، ملک اور حکومت کے لحاظ سے بالکل یکساں بنا دینے میں ہمت، ثابت قدمی، ذکاوت ایسی خاص صفات کے معدوم ہو جانے کا بھی احتمال ہے۔ ہر قوم میں ایسی خاص صفت ضرور ہوتی ہے جس کی حفاظت کرنا تمام انسانوں کی فلاح کے لئے بہت کارآمد ہوتا ہے لیکن ایسی صفات کا تحفظ اسی حالت میں ممکن ہے جب اس قوم کو اپنے ذاتی قوانین اور آئین حکومت کی امتیازی ترقی کے لئے موقع حاصل رہے۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ جب کوئی قوم اپنی خاص سیاسی زندگی سے محروم ہو جاتی ہے تو اس کی کارگزاریوں کی وقعت گھٹ جاتی ہے اور جب اس قوم کو سیاسی آزادی حاصل ہو جاتی ہے تو اس کے علوم و فنون سے تہذیب و تمدن میں عام ترقی ہونے لگتی ہے۔

قومیت کے اس تصور کے تین لوازم ہیں:-

(۱) اولاً یہ کہ معقولات کے اقتضا کے بموجب ہم کو ایک چھوٹی سی حکومت سے بھی نسل انسانی کے اتنے ہی نفع بخش نتائج کی توقع رکھنی چاہیئے جس قدر کہ عظیم الشان اور دولت مند سلطنتوں سے۔ چھوٹی حکومتوں کے قومی لیڈر، افراد کے باہمی تعلقات کی تمثیل پر یہ دعویٰ کیا کرتے ہیں، "اگر ایک کمزور شخص ایک نہایت تندرست دشمن کے مقابلہ میں اپنے ابنائے جنس کو زیادہ فائدہ پہنچا سکتا ہے تو ہمیں چاہیئے کہ فنا کرنے کے بجائے اُسے اُبھرنے کا موقع دیں۔ اسی طرح جب ایک گروہ، جسے اپنی مہذب روایات پر ناز ہے، ایسی چیزیں پیدا کر سکتا ہے جو طبقۂ انسان کے لئے عام طور پر مفید ہو سکتی ہیں تو اسے آزادی کے ساتھ ترقی کرنے کا حق حاصل ہونا چاہیئے۔

(۲) افراد کے باہمی تعلقات کی سیاسی تنظیم کا خواہ کوئی بھی طریقہ ہو وہ ہر قوم کے لئے درست نہیں ہو سکتا۔ اس لئے عملی سیاست میں ہر جداگانہ طور پر ہر قومی گروہ کو حقیقی سیاسی آزادی کا موقع دینا چاہیئے۔ مختلف ملکوں میں قانون اور عملداری کے طریق مختلف ہوتے ہیں اور اس تفریق میں انسانی جماعتوں کے امتیازات جھلکتے ہیں۔ خود مختاری کے علاوہ ایسی

خاص خاص باتوں کا بھی ارتقاء ہوتا ہے جو اُس قوم کی خصوصیات ہیں۔

(۳) اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ ہر گروہ علحدہ علحدہ ہے کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ کامل علحدگی کی حالت میں، افراد کی طرح کوئی قوم بھی کمال عروج پر نہیں پہنچ سکتی۔ اگر مختلف انسانوں کے درمیان رشتۂ دوستی و رابطۂ یگانگت قائم ہو تو یہ ضروری نہیں کہ وہ سب اشخاص ایک ہی سانچے میں ڈھل جائیں مختلف قوموں کے درمیان اتحاد یا اخوت کے استحکام سے قومیت کو نقصان نہیں پہنچتا بلکہ اور ترقی ہوتی ہے۔

یہاں تک جس قسم کی قومیت کا تصور پیش کیا گیا اُس میں جغرافیائی حدود کو بہت کچھ دخل ہے۔ ایک ہی ملک کے باشندے جو بلحاظ تہذیب و تمدن یکساں ہیں، ایک قوم کہلاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ یکسانیت ایک دم سے ظہور پذیر ہو جائے، بلکہ جیسا کہ لکھا جا چکا ہے، دو یا اس سے زائد مختلف نسل کے باشندے سیاسی، معاشی، تجارتی اور معاشری تعلقات کی بنا پر ایک ہی ملک میں رہتے رہتے ایک دوسرے سے اس طرح گھل مل جاتے ہیں کہ ان کے اس تدریجی امتزاج سے ایک قوم کی تشکیل ہونے لگتی ہے۔ لیکن "قوم" کا لفظ ایسے افراد کے مجموعہ کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے جو ایک ہی مذہبی رشتہ سے منسلک ہوں خواہ ان کی بود و باش کسی ملک میں بھی ہو مثلاً مذہب اسلام کے پیرو خواہ ہندوستان میں ہوں یا چین میں، عربستان میں ہوں یا یورپ میں، ایک ہی قوم کے افراد خیال کئے جاتے ہیں۔ ایسی قوم کی بنیاد مذہب اور صرف مذہب پر ہوتی ہے؛ مذہب ایسی قومیت کا جزو لازم ہوتا ہے اور مختلف لوگوں کے مذہب کی وحدت سے قومی زندگی ظہور میں آتی ہے۔ گو بعض حلقوں میں اس قسم کی وحدت کو بجائے قوم (Nation) کے نیشنیلیٹی (Nationality) کے نام سے موسوم کرتے ہیں اور ان دونوں اصطلاحوں میں فرق بھی پیدا کیا جاتا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ پان اسلامزم کا تصور اور صیہونیت کی تحریک اس قسم کی قومیت کے وجود کے سب سے بڑے ثبوت ہیں۔

کوئی شخص قومیت کا حامی ہو یا نہ ہو لیکن اس بات کے تسلیم کرنے سے کسی کو انکار نہیں ہو سکتا کہ سیاسیات حاضرہ میں قومیت کا تصور ایک زبردست قوت ہے۔ قومیت پہلے پہل انقلاب انگیز تھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ اُس وقت یورپ میں خاندانی تقسیم اور جاگیرداری نظام کے آثار باقی تھے جن کا نیست و نابود کر دینا حریت، مساوات اور اخوت کا ضروری شاخسانہ سمجھا جاتا تھا؛ اور بعض حالتوں میں ایک قوم اپنے اصولوں کو زبردستی دوسری قوم میں رائج کرنا چاہتی تھی جیسا کہ آسٹریا نے اطالیہ میں کیا تھا چنانچہ اطالیہ کے نوجوانوں کی انجمن کے مقصد کے تین ناقابل تقسیم اجزا تھے یعنی خود مختاری، اتحاد اور مساوات

اور جن کا منشا یہ تھا کہ آسٹریا والے اطالیہ سے بیک بینی و دو گوش چلے جائیں، نیز مختلف چھوٹی چھوٹی مملکتیں ایک ہی رشتۂ اتحاد سے منسلک ہوں اور ایسی جمہوری حکومتیں قائم کی جائیں جن کے افراد کو آزادیٔ رائے حاصل ہو۔ چنانچہ آجکل بھی اُن ملکوں میں، جہاں کے باشندے غیر ملکی حکومت کے محکوم ہیں، قومیت کا یہی منشا سمجھا جاتا ہے کہ ان غیر ملکی حکومتوں کا استیصال کر دیا جائے۔

قومیت کا دوسرا پہلو تعمیری ہے۔ تعمیری قومیت کا یہ مطلب ہے کہ ہر ایک قومی جماعت کو ذاتی خصوصیات کی ترقی اور ذاتی معاملات کے بندوبست کا اختیار رہے۔ غور و فکر سے جو خوبی نظر آتی ہے اور جس کو قومیت ترقی دینا چاہتی ہے وہ قومی سیرت اور خصلت کا امتیاز اور قومی روایات کی ترقی ہے۔ لیکن جب طرزِ حکومت ایسا ہو کہ عوام کے دلوں میں یہ خیال پیدا ہو جائے کہ جس نظم و نسق میں وہ رہتے ہیں اس کے ذریعہ سے ان کے اغراض نیز عادات وخصائل کی ترجمانی نہیں ہوتی اور ساتھ ہی ساتھ غیر قوم کی حکمرانی سے یہ احساس زیادہ شدید ہو جائے تو عوام کے دلوں میں ایک قومی جذبہ سرایت کر جاتا ہے اور قومی تحریک زور پکڑتی جاتی ہے جس کا مقصد ایک طرف تو اس جبر و استبداد کا خاتمہ کرنا ہوتا ہے جو حکومت کام میں لاتی ہے اور دوسری طرف اس سے از سرِ نو تنظیم کے لئے بھی تدابیر مہیا کرنا ہوتا ہے جن کے مطابق یہ قوم اپنے خاص پسند کے اصول قانون اور طرزِ حکومت رائج کرنا چاہتی ہے اور اس طرح ایک زبان اور یکساں رواج رکھنے والی قوموں کا واحد اور یکساں نظامِ حکمرانی کارفرما ہوتا ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب نہ اخذ کرنا چاہئے کہ قومیت کا معیار خواہ مخواہ شہنشاہیت کا مخالف ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ دونوں معیاروں میں تصادم کی کوئی وجہ نہیں پائی جاتی لیکن بعض لوگوں کو ان دونوں معیاروں میں تصادم اس وجہ سے دکھائی دیتا ہے کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کا بھی اندازہ اچھی طرح نہیں ہوتا۔ اگر قومیت کا منشا یہ ہو سکتا ہے کہ ایک ہی نظامِ حکومت میں متعدد نسلوں کے امتزاج سے اجنبیت دور ہو اور ان کے مابین ایک قریبی تعلق پیدا ہو جائے تو شہنشاہیت کا بھی یہ اقتضا ہے کہ ایک ہی حکومت کے اندر مختلف اغراض و مقاصد کا خیال رکھا جائے۔

قومیت کے اس تصور میں ایک نقص یہ نکالا جاتا ہے کہ اس سے سیاسی مقصد کا دائرہ تنگ ہو جاتا ہے، ایک قوم کی روح کو برقرار رکھنے کے لئے جو کوشش کی جاتی ہے اس کا نتیجہ اکثر یہ ہوتا ہے کہ علٰحدگی پسند وحشی پن پیدا ہو جاتا ہے، بین الاقوامی تجارت میں محصولات و دیگر پابندیوں سے طرح طرح کے روڑے اٹکائے جاتے ہیں، ہر ملک کوشش کرتا ہے کہ

معاشی پیداوار کے اعتبار سے وہ دوسرے ملکوں کا دست نگر نہ رہے نیز دوسرے ملکوں سے درآمد تو موقوف کر دے لیکن برآمد میں اس قدر زیادتی کی جائے کہ تمام غیر ملکی منڈیاں اس کی مصنوعات سے بھر جائیں۔ اس قسم کی سیاسیات کی وجہ سے جو قومیت کی انتہائی تنگ خیالی پر مبنی ہیں اکثر قوموں میں باہمی رشک و حسد ہی نہیں بلکہ دشمنی بھی پیدا ہو گئی ہے چنانچہ فرانس کی قومی تحریک کا ایک زمانہ میں یہ نتیجہ نکلا کہ قریب قریب جرمن قوم کے ہر فرد سے وہاں وحشیانہ طور پر نفرت کی جانے لگی۔ ہر ایک نسل تعداد میں جس قدر بڑھتی جاتی ہے اسی حد تک ملک گیری کے بارے میں اس میں رشک و حسد پیدا ہو جاتا ہے جو بالآخر بڑھ کر امپیریل حکمت عملی کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ قومیت پسندی میں بھی اس قدر زور و شور سے جنگ کی حمایت شروع ہو جاتی ہے جس قدر شد و مد سے شہنشاہیت پسندی میں یہ باتیں ہوتی ہیں۔

اس کے علاوہ قومیت کو عدم مداخلت کے عجیب و غریب اصول کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے جس کا کسی زمانہ میں یہ منشا تھا کہ اگر کسی جماعت میں جبر و استبداد کا عمل ہو تو دوسرے گروہ کو اس سے کچھ واسطہ نہ رہے۔ لیکن اس بات کا ٹھیک ٹھیک تعین کرنا نہایت دشوار ہے کہ ایک قوم کو دوسری قوموں سے کب اور کس طرح سروکار رکھنا چاہئے۔ دوسروں پر ان کی مرضی کے خلاف حکومت کرنا خواہ وہ ان کے فائدہ ہی کے لئے کیوں نہ متصور ہو ایک متروک طریقہ ہے لیکن اس کے برعکس دوسری قوموں کے معاشرتی نظام میں جو خرابیاں ہیں ان کی طرف سے کوئی مہذب جماعت یا فرقہ بے پروا نہیں رہ سکتا کیونکہ یہ بھی ممکن ہے کہ اگر ان کی روک تھام نہ کی گئی تو ان خرابیوں کا دور دورہ ہو جائے اور پھر انسانیت کا بھی یہ تقاضا کہ دوسروں کو ٹھیک راہ پر لگایا جائے ایک قوم کو مداخلت کرنے کے لئے مجبور کر دیتا ہے۔ اس نقطۂ نظر کو غیر معمولی اہمیت دے کر تعصب اور تنگ نظری کی بنا پر بین الاقوامی صورت حال کو نازک بنا دیا گیا ہے اور امن خطرہ میں پڑ گیا ہے۔ وہی قومیت جو پہلے چھوٹی چھوٹی مظلوم نسلوں کا معیار تھی، شہنشاہیت سے مشابہ ہو گئی ہے، چنانچہ اطالیہ کے تسخیر حبش کا واقعہ اس جذبہ کا پتہ دیتا ہے جو قومیت کے غلط تصور پر مبنی ہے اور جو امپیریلیزم کے مترادف ہے۔ سیاسیات پر معقولیت کے ساتھ غور کرنے سے یہ بات سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک قوم کے لئے دوسری قوم کو مٹا کر ترقی اور توسیع کرنے کی ضرورت نہیں ہے جس طرح کہ ایک فرد واحد کے لئے یہ مناسب نہیں ہے کہ دوسرے افراد کی ہستی مٹا کر جادۂ ارتقاء میں گامزن ہو۔ دوسروں کو مٹا کر ترقی کرنا اسی حالت میں مناسب ہے جب مالتھس کے نظریہ آبادی کے مطابق بہم رسانی ضروریات کی کوئی خاص حد مقرر کر دی جائے لیکن قدرت سے امداد لینے کے لئے جو ذرائع کام میں لائے جاتے ہیں ان کی ترقی کے پیش نظر یہ باور کیا جا سکتا ہے کہ دوسری

قوموں کو بیوقوف بنانے یا آلاتِ جنگ میں اضافہ کرکے ان پر ہیبت طاری کرنے کے لیے جو فہم و فراست، دولت و قوت کام میں لائی جاتی ہے اگر اس کا استعمال قدرتی ذرائع کی تحقیق و تجسس کے لیے کیا جائے تو تمام قوموں کے انتہائی آسائش و ترقی کی خواہشات کو پورا کرنے کے لئے ضرورت سے زیادہ سامان مہیا ہو جائے۔ اگر حکمت عملی اور چالبازی سے کام لینے کے بجائے مناسب اور جائز راستے اختیار کئے جائیں تو ہر قوم کو دوسری قوموں کی ضروریات کا احساس ہونے لگے اور انسان اپنے طبقہ کی بربادی کے بجائے اس کی ترقی کے لئے قدرت سے کام لینے لگے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اعلیٰ ترین قومیت کی تشکیل اسی وقت ممکن ہے جبکہ ہر قوم کے افراد دوسری قوموں کو اپنا مخالف نہیں بلکہ رفیق سمجھنے لگیں۔ کسی قوم کا اپنی ذاتی خصوصیات کو معاندانہ حیثیت سے ترقی نہ دینا چاہیئے۔ بلکہ ان کی جد وجہد قوموں کے حلیف اور بنی نوع انسان کی عام بھلائی و خوش حالی کی غرض سے ہونا چاہیئے۔

محمد معروف بی اے (جامعہ عثمانیہ)

فضا میں ایک آواز

(کارنیپٹر)

فضائے بسیط میں ایک آواز بلند ہوتی ہے: "میری آواز تمام عالم میں ہے میں ہر ملک اور ہر شہر سے گزرتی ہوں۔ جو انسان کا وطن ہے وہی میرا وطن ہے۔" اور ساری کائنات میں یہ صدا گشت لگاتی ہے:۔

(۱)

"یہ قوموں کی محافظ سربلند مغرور پہاڑیاں، یہ گنجان وادیاں، صحرا کے نشیب و فراز میں ہوا کا اتار چڑھاؤ، برف پوش چوٹیوں کے اوپر تیزی سے اُڑتے ہوئے نیلے گلابی اور کاسنی بادل، یہ وسیع میدان، سبزہ زار، چھوٹی بڑی آبادیاں، شہر، دیہات، اور یہ ہزاروں میل تک پھیلے ہوئے بڑے بڑے ملک، میں ان سب کو دیکھتی ہوں اور ان کو بھی جو اس میں آباد ہیں۔

تمام عالم میں میں پرواز کرتی ہوں۔ اور تمام انسانی اعمال کی شاہد ہوں۔

(۲)

اب اٹلی کے میدان وسیع سبزہ زار اور بار میڈا کے مقبوضات میری نظروں کے سامنے ہیں۔ وہ سمندر کی موجوں کے مانند اونچی نیچی پہاڑیاں اور ان پر انگور کے باغیچوں کا وہ طویل سلسلہ کسانوں کے گلابی اور زرد رنگ کے کھیت مکانات

اور گودام، گنجان آبادیاں اور وہ آسمان سے باتیں کرتے ہوئے گھنٹہ گھر میں ان سب کو دیکھتی ہوں۔

وہ دیکھو بچاری اخروٹ کی سی رنگت والی ضعیف ماں تمام دن اکیلی گھر میں ادھر سے ادھر پھرا کرتی ہے۔ سب لوگ کھیت پر چلے گئے ہیں وہ گھر میں بالکل تنہا ہے۔ کبھی اس کمرے میں کبھی اس کمرے میں وہ ایک خود فراموشی کی حالت میں یوں ہی چکر لگایا کرتی ہے۔ اس کی زندگی ماضی ہے حال سے وہ بے خبر ہے کبھی بالا خانہ پر چڑھ جاتی ہے اور خشک انگوروں کو سمیٹ کر یکجا کرتی ہے اور تازہ انگوروں کو پھیلانے لگتی ہے۔ یہی اس کے مشاغل ہیں۔ اور اس کی زندگی اتنی ہی محدود ہے۔

مزدور دن بھر درانتیاں ہاتھ میں لئے ننگے پاؤں دھوپ میں گھانس کاٹتے رہے اب خوشنما شام میں چھوٹے پہیوں والی گاڑی پر اپنی دن بھر کی محنت کا حاصل بار کر کے گھروں کو لوٹ رہے ہیں۔ کسان کھیت میں ایک لکڑی والے ہل سے آخری لکیر ختم کر رہا ہے۔ اور اس کا لڑکا ناہموار سڑک پر اپنی گاڑی اور زرد بیلوں کے ساتھ ہچکولے کھاتا ہوا شہر کی طرف جا رہا ہے۔

لڑکیاں اور عورتیں زرد اور سرخ دستیاں لئے ہوئے سڑک کے کنارے ریشم کے کیڑوں کے لئے شہتوت کی پتیاں جمع کر رہی ہیں۔ گاؤں کے معززین گرجا کی سیڑھیوں پر بیٹھے ہوئے راہرو عورتوں کو تک رہے ہیں۔ بے فکر نوجوان ہوٹلوں میں "مورا" (ایک قسم کا کھیل جو انگلیوں سے کھیلتے ہیں) کھیلنے میں مصروف ہیں۔ بچے گلیوں میں گیند اچھال رہے ہیں اور چلا رہے ہیں۔

زندگی کا صدیوں کا پرانا کھیل جاری ہے۔ ابھی سطح زمین پر رومن تباہ شدہ جھیل کے کچھ نشانات باقی ہیں۔ ابھی رومن طرز معاشرت کچھ کچھ سانس لے رہی ہے۔ ہاں ابھی پرانا خون رگوں میں دوڑ رہا ہے۔

پانی دریا میں بہتا ہے۔ فصلیں کھیت میں پکتی ہیں اور حیات، جوانی اور محبت کی روشنیاں انسانی آنکھوں میں چمکتی ہیں۔

اب میں اس چند فٹ کے انسانی جسم کو جو میری عارضی قیام گاہ تھی۔ جہاں سے میں زندگی کے خوشنما چمن زار کا نظارہ کر رہی تھی۔ اب میں اس کو چھوڑ رہی ہوں۔ ان بے جا خواہشات سے جو ہر وقت مجھے گھیرے رہتی ہیں اور ان برائیوں سے جو ہمیشہ زندگی کے بہتے ہوئے پانی کو گندلا کر دیتی ہیں۔ روح آزاد ہوتی ہے۔ ہاں اب میں ان انسانی خواہشوں کی مضبوط زنجیروں کو توڑ کر آسمان کی رفعتوں پر پرواز کرتی ہوں۔ آہ! وہ چھوٹا سا انسانی قفس بہت پیچھے چھوٹ گیا۔ میں

آزاد ہوں۔ زمان و مکاں کی قیود سے آزاد ہوکر تمام کائنات کی وسعتوں میں پرواز کرتی ہوں اوپر اور اوپر نیلگوں فضاؤں میں پھر آہستہ آہستہ نیچے اور نیچے زمین پر۔ ایک بار پھر انگور کے سرسبز باغوں میں میرا مسکن ہے۔ میں غلاموں اور مزدوروں کے ساتھ کام کرتی ہوں۔ پھر انسانی ہستیوں کی شریک کار ہوں کبھی یہاں کبھی وہاں کبھی معماروں کو گارا ملا کر دیتی ہوں تو کبھی آرائش کے ساتھ آرا کھینچتی ہوں۔ نوجوان محبوب و محب پھر اسی طرح چاندنی ضیاؤں میں میرے سینہ پر سر رکھ کر سورہتے ہیں ایک ماں کی نظریں آج بھی مجھے اسی طرح جانتی اور پہچانتی ہیں جس طرح صدیوں پہلے جانتی تھیں۔ میں وحشی آنکھوں والی گائے بھی ہوں اور ریلی آنکھوں والے بیل کی جوڑی بھی۔ اور گاڑی بان بھی جو کبھی تو انھیں چابک مار مار کر بھگاتا ہے اور کبھی اپنی خوش کن تانوں سے انھیں مست بنا کر منزل کیطرف لے جاتا ہے۔

میں عاشق بھی ہوں اور محبوب بھی۔ دشمن بھی ہوں دوست بھی۔ ہاں میں ایک ہی وقت میں یہ بھی ہوں اور وہ بھی میں نے بارہا اپنی یکسانیت کو کھویا بھی ہے اور پایا بھی ہے۔

(۳)

پڑمانیز (اٹلی کے شمال مغرب میں ایک قصبہ) کا ایک غریب باشندہ مجھے انگور کے کنج میں کچی اینٹوں کے چھوٹے سے مکان میں لے جاتا ہے اور شراب انگوری کا ایک جام پیش کرتا ہے۔ میں اس چھوٹے سے گھر کو اور اس کے مختصر سے اثاثہ کو دیکھتی ہوں ایک میز چند کرسیاں، ۵، ۶ برتن ایک ہلتی ہوئی شکستہ لکڑی کی سیڑھی بالائی منزل پر چڑھنے کا ذریعہ۔ اور ایک بید سے بنا ہوا ٹھہرا جہاں وہ اپنے ریشم کے کیڑے پالتا ہے سب ہی اسباب آرائش ہے ایک سادہ زندگی کا کل اثاثہ لیکن یہ مختصر سی جگہ بھی غم سے ناآشنا نہیں۔ بچارا غریب لڑکا اپنی ماں کا عزیز ترین فرزند بیمار ہے۔ اس کی زندگی کا پھول مرجھا رہا ہے۔ تمام دن وہ اپنے کمزور جسم کے گرد ایک شال لپیٹے ہوئے دروازہ پر دھوپ میں بیٹھا رہتا ہے۔ وہ کھیت پر اپنے باپ کی مدد نہیں کرسکتا اور یہ احساس اسے ہر وقت بےچین رکھتا ہے۔ رات کو وہ خاموش بستر پر پڑا ہوا ریشم کے کیڑوں کی سرسراہٹ سنتا رہتا ہے۔ اس کی آنکھیں ایک لمحہ کے لئے بھی بند نہیں ہوتیں بچارہ دلگیر اور غمزدہ ماں ہر وقت اچھے خدا سے اپنے بچہ کی صحت کی دعا کرتی رہتی ہے۔ مگر نہیں جانتی کہ اس کا اچھا خدا اس کی دعا کو سنتا بھی ہے یا نہیں۔ پاک مریم کا مجسمہ چھوٹے طاق پر اسی طرح اور ویسا ہی رکھا ہوا ہے اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں۔ اس کی نظروں کے سامنے نہ جانے کتنے دل پامال ہوچکے ہیں اور کتنے ہو رہے ہیں۔ کتنی آرزوئیں خاک

یں مل رہی ہیں مگر ہاک چہرہ پر کوئی تغیر نہیں ہوتا۔ وہاں کوئی تاثر نمایاں نہیں ہوتا۔

(۴)

انسانی چاہت کی خوشبو اڑ گئی۔ بادل فانی اور ناپائدار شکلوں سے خوفزدہ ہوکر زمانہ کی محض خیالی رات میں اڑے چلے جارہے ہیں۔ شباب کی مستیاں۔ جوانی کی شوخیاں۔ دو محبوب ہاتھوں کا لمس۔ دو چاہنے والے دلوں کی دھڑکنیں۔ دو متصل لبوں کا ارتعاش سب کچھ ختم ہوگیا۔ آزادی کے شیدا جسم کے قیدی کو پر دار موت نے رہا کر دیا۔ محلوں، گھاٹیوں، وادیوں، صحراؤں، جھونپڑیوں اور صحراؤں میں رینگنے والا چند روزہ کیڑا اب چند گز زمین میں مقید ہے پانی اور بجلی سے بھری ہوئی گھٹائیں ننھی کمزور مخلوق اور ہر طاقتور ہستی پر یکساں طور پر سایہ ڈالتی ہیں۔ سوچ عمیق گہرائیوں سے بلند ہوتا ہے اور انھیں اپنی آتشیں انگلیوں سے چھوتا ہوا گزر جاتا ہے۔ ہر چیز میں ایک زندگی رونما ہوتی ہے ہاں ایک ایسی زندگی جسے موت کے ہاتھوں تباہ و برباد ہونا ہے۔

حساب و کتاب ہوگیا تحقیقات ختم ہوگئی۔ فیصلہ سنا دیا گیا۔ اب میں ایک قیدی ہوں ایک مجرم جسے حکم سزا سنایا جاچکا ہے۔ انصاف پسند جج قاقم و دیبا کے قرمزی لباس میں سرخ وردی پوش پیامبروں کے ساتھ نقاروں اور باجوں کے شور وغل میں برآمدے کی سیڑھیوں سے اترتا ہے اور تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا وسیع مجمع کے درمیان سے گزر کر اپنی سنہری قبضوں والی گاڑی میں بیٹھ کر چلا جاتا ہے۔ سپاہی مجھے ملزموں کے کٹہرے سے نکال کر ایک بند قیدیوں کی گاڑی میں پہونچا دیتے ہیں۔ گاڑی زمین دوز تاریک راستوں سے گذرتی ہوئی مقتل میں پہونچتی ہے۔ اور اب مجھے یہاں جلاد کا انتظار کرنا ہے۔

ایک بار پھر میرے پر ہوا میں کھلتے اور بند ہوتے ہیں اب میں اور آگے پرواز کرتی ہوں چمکتی ہوئی آگ کا دھواں فضا میں اڑ رہا ہے۔ ہر طرف ایک کاروباری ملک کا شور وغل سنائی دیتا ہے عجیب وغریب آوازیں پیدا ہوتی ہیں اور خلا میں ناپید ہو جاتی ہیں۔ میں اپنے پروں کو سمیٹ کر نیچے اتر آتی ہوں۔ اور تمباکو کی کمپنی میں کمسن لڑکیوں کی صف میں اپنا آئینہ کا ٹکڑا اور کنگھی، ٹوٹی ہوئی پنج کے سوراخ میں چھپا کر بیٹھ جاتی ہوں۔ یا نہیں تو کسی روزانہ اخبار کے مطبع میں "کرکٹ میچ" اور "ایوان شاہی" کی خبریں چھاپنے میں مصروف ہو جاتی ہوں۔

یہاں سے بھی آگے ——— دور ——— پھر میں اپنے بازو کھول دیتی ہوں۔ اور پرواز کرتی ہوں اب میں کیا دیکھتی ہوں

آہن گر کی دوکان پر، زرد رو پژمردہ صورت کمزور لڑکے اور لڑکیاں آہنی پہیوں پر جھکے ہوئے ہیں۔ ان کے ہاتھ مسلسل حرکت کر رہے ہیں اور مالک مطمئن انداز سے کھڑا ہوا چاروں طرف دیکھ رہا ہے۔ موسم سرما کے آفتاب کی اداس کرنیں خاک آلود کھڑکیوں سے ہوکر اس گندگی اور غلاظت پر چمکتی ہیں جو ان کے گرد پھیلی ہوئی ہے۔ !

ارزاں اور کم قیمت مال جو استعمال سے قبل ہی ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا ہے روزانہ پیک ہوتا ہے اور افریقہ اور جزائر ہند کے تاجروں کے پاس روانہ کر دیا جاتا ہے۔

تہذیب و تمدن ہر قوم اور ہر ملک کی تاریخ میں اپنا پارٹ ادا کرتے ہیں۔

انکشافات کا زمانہ آتا ہے اور گزر جاتا ہے۔ عروج و زوال آگے پیچھے اپنے تیز رفتار گھوڑوں پر سوار ایک دوسرے کا تعاقب کرتے ہیں۔ اور باری باری فتح و شکست سے ہمکنار ہوتے ہیں۔

ذرا ادھر نظر اٹھا کر دیکھنا۔ کلوں اور انجنوں کے کارخانوں میں توانا، طاقتور، دیو ہیکل شکلیں۔ آدھی دھوئیں میں چھپی ہوئی اور آدھی آگ کی روشنی میں چمکتی ہوئی، مسلسل حرکت میں ہیں۔

کلوں اور منجنیقوں کی کھڑکھڑاہٹ آگ کی چنگاریوں اور انسانی چیخوں کے ساتھ بلند ہوتی ہے مہتمم کارخانہ ایک پروقار انداز سے کھڑا ہوا ہاتھ نچا نچا کر احکامات دے رہا ہے۔ شریر آفتاب کے پھینکے ہوئے ہزاروں لاکھوں سنہرے تیر مسلسل کھڑکیوں، دروازوں اور روشندانوں سے داخل ہو ہو کر دھوئیں کی چادر کو چھلنی کر رہے ہیں۔ اور بھٹیوں میں یاقوت کی طرح سرخ لوہے کے ٹکڑے چمک رہے ہیں۔ کچھ لوگ بالکونی پر کھڑے ہوئے بڑی بڑی پانی کھینچنے کی کلوں کو حرکت دے رہے ہیں اور کچھ دہکتے ہوئے آہن کو پیٹ رہے ہیں۔ اور ایک موٹا طاقتور آدمی سب سے علحدہ پانی کی بالٹی میں اپنا گرد آلود سر دھو رہا ہے —— ! میری نظریں یہ سب کچھ دیکھتی ہیں —— ! اب میں اور آگے بڑھتی ہوں —— ! یہ بھٹیوں میں کیا چیز دہک رہی ہے —— ؟ لوہا آگ کی ہمسری کر رہا ہے اور چند دیو قامت ہستیاں بڑے بڑے چمٹے ہاتھوں میں لئے ہاتھوں اور پیروں پر چندیاں لپیٹے ہوئے اور پسینہ سے بھیگی سیاہ دستیاں اپنے دانتوں میں پکڑے لوہے کے دہکتے ہوئے ٹکڑوں کو آگ سے نکال رہے ہیں۔

ہر قسم کے اوزار، زرہ بکتر، ڈھال، تلواریں، کلیں، طرح طرح کی مشینیں ہر روز سیکڑوں کروڑوں کی تعداد میں تیار ہوتی ہیں اور سمندر کے سینہ پر بار کرکے تمام دنیا میں منتشر ہونے کے لئے بھیجدی جاتی ہیں۔

قومیں برسرِ پیکار ہوتی ہیں۔ عظمت وشوکت کا مظاہرہ ہوتا ہے۔ فتحمندی کی خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ جلسے ہوتے ہیں۔ رقص وسرود کی محفلیں آراستہ ہوتی ہیں۔ قہقہے بلند ہوتے ہیں۔ فخر و غرور کے گیت گائے جاتے ہیں۔ انسانی خون کے سمندر میں کامیابی کی کشتیاں تیرتی ہیں۔ اور بیجا غرور وتکبر کا پرچم فضا میں لہراتا ہے ———۔ لیکن وہ غریب آہن گر اسوقت بھی بھٹی کے قریب ہی پسینہ میں شرابور کھڑا رہتا ہے اور تمام دن اسی محبت کے خواب میں کھویا رہتا ہے جو ایکدن اس زمین پر اترے گی اور اس دنیا کو بہشت بنا دے گی۔ مگر اس کا شریک کار ساتھی ہمیشہ اس کے اس خواب بیداری پر ہنستا ہے۔ اور اس کا مضحکہ اڑاتا ہے۔

موسم بہار کی سخاوت ہر درخت اور ہر تپہ پر یکساں ہوتی ہے۔ چھوٹے چھوٹے بوٹے کے پودوں میں زرد کلیاں پھوٹتی ہیں ——— بھوراچوہا خشک گھانس کے اندر حرکت کرتا ہے اور غلہ کھانے والا پرندا اپنی لانبی گردن اٹھائے ہوئے گنجان کھیتوں میں گھس جاتا ہے مگر آہن گر اسی طرح بھٹی کے کنارے کھڑا رہتا ہے۔

(۷)

ہر صبح پہاڑوں پر کہرا ایک نئے انداز سے گرتا ہے اور سورج خاکی بادلوں کو چھیڑنے کے لئے ایک شوخ حسینہ کی طرح مسکراتا ہوا طلوع ہوتا ہے۔ اور اس کی پہلی کرن کوئلہ کی کان میں کام کرنے والے مزدور کی ڈھیلی ڈھالی نیلی قمیص پر پڑتی ہے۔

لکڑہارا دن بھر جنگل میں لکڑیاں کاٹتا رہا۔ اب اس کے سامنے اک انبار لگ گیا ہے۔ اب وہ انھیں گاڑی پر لاد رہا ہے۔ درخت کی ایک بلند ٹہنی پر ایک چڑیا کا دلنواز نغمہ بلند ہو رہا ہے وہ اپنے کام میں منہمک ہے اور وہ اپنی آواز کی سیٹیوں میں گم۔

اس وقت مضطرب زرگر اپنے مقید عزیز بھائی کے لئے بیقرار اسٹیشن پر پہونچا ہے اور ٹرین پر بیٹھ کر مرلے میں داروغۂ جیل کی قیام گاہ پر جاتا ہے۔ میلے کوٹ کی جیب سے ایک سونے کا سکہ نکال کر اسے پیش کرتا ہے تاکہ ازکم بے گناہ بھائی کچھ اچھی غذا ہی حاصل کر سکے۔ اور زندگی کے آخری لمحات فاقہ کی مصیبت میں نہ بسر کرے۔

داروغۂ جیل بہت نرم دل بوڑھا شخص ہے۔ وہ کبھی کسی کو نقصان پہونچانا نہیں چاہتا وہ رشوت قبول کرلیتا ہے۔ اور پریشان بھائی کو تسلی دیتا ہے کہ وہ قیدی کے ہر ممکنہ آرام کا خیال رکھے گا۔ اور جب اس کے کمرے میں داخل

ہوتا ہے تو چپکے سے ایک روٹی اس کے سامنے ڈال دیتا ہے۔ قیدی کچھ پوچھنا چاہتا ہے مگر وہ بغیر کچھ کہے یا سنے کمرہ مقفل کرکے واپس چلا جاتا ہے۔

آگے اور آگے اب میں پرواز کرتی ہوں۔ لنکا شائر میری نظروں کے سامنے ہے: ناچ رنگ، بالسری پیانو، سگرٹ اور شراب ——— ؛ زندگی ہی زندگی۔ آہ یہ ہنگامہ زا سا اور یہ صرف اپنی مسرتوں میں گم رہنے والوں کی مسرور آوازیں ——— ؛ اے آقائے جمہوریت تو کہاں ہے ؛۔ کیا یہ مسرور قہقہہ تیرے کانوں تک نہیں پہنچے ———؟

شفق کی روشنیاں آہستہ آہستہ ماند پڑتی جاتی ہیں۔

ڈچ وضع کے پرانے مکانات ایک ایک کرکے روشن ہو رہے ہیں۔ کسانوں کے لڑکے اور لڑکیاں کچھ قلابازیاں کھا رہے ہیں اور کچھ ایک دوسرے کے زانوؤں پر بیٹھے ہوئے ہنس ہنس کر باتیں کر رہے ہیں۔

موٹی اور بھدی عورتیں آپس میں گپ شپ کر رہی ہیں۔ مرد اپنے نوجوان ساتھیوں کے ساتھ رقص کر رہے ہیں اور کچھ کسی کھلیان کے پیچھے یا کسی گھنے جھاڑ کی آڑ میں محبت کی سرگوشیوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

"اوہ کس قدر لطف انگیز" رقاصہ کے گھنگروؤں کی طرح کانپتی لرزتی ہوئی صدائیں فضا میں بلند ہوتی ہیں" پھر ایک بار وہی کہنا "کس قدر شیریں"

میں اپنے بازو پھڑپھڑاتی ہوئی دور بہت دور ان ذلیل بستیوں اور اس میں بسنے والوں کی پہونچ سے بہت دور پرواز کرجاتی ہوں۔

رضیہ

وصل کی رات

کسے امید تھی یوں کارگر جذبِ نہاں ہوگا
دل اس پہلو میں اُس پہلو میں وہ آرام جاں ہوگا

تلافی رنجِ فرقت کی وصالِ دوست سے ہوگی
پھریں گے دن خداوندِ دو عالم مہرباں ہوگا

بلائے گردشِ دوراں سے بے خوف و خطر ہونگے
زمیں آرام دہ ہوگی فلک راحت رساں ہوگا

اِدھر وہ مہر وش رونق فروزِ پہلوئے عاشق
اُدھر ماہ مبیں زینت فزائے آسماں ہوگا

اُدھر چھٹکے ہوئے تاروں کے جھرمٹ میں مہِ تاباں
اِدھر پھولوں کی نازک سیج پر جانِ جہاں ہوگا

ضیا بار ایک ہی ساعت میں ہونگے دو مہِ تاباں
وہ شب ہوگی کہ جس پر روزِ روشن کا گماں ہوگا

رہے گا رات بھر پیشِ نظر وہ خوشنما منظر
کہ ہوگی روح کو بالیدگی دل شادماں ہوگا

یہاں عجز و نیازِ عاشقانہ پیار کی باتیں		غرورِ دلبری و نازِ دلداری وہاں ہوگا
اِدھر ہر لحظہ عشقِ ناشکیبا داد کا خواہاں		اُدھر آمادۂ بیداد حسنِ بے اماں ہوگا
وہاں ہونگے ادائے حُسن پر وہ جس قدر نازاں		کہیں اُس سے سوا ناز اپنی قسمت پہ یہاں ہوگا
زبانوں کا کریں گی کام دونوں سمت سے نظریں		کسی پر خوبیِ قسمت سے کوئی مہرباں ہوگا
کبھی ہنس ہنس کے ذکرِ آغازِ ایامِ محبت کا		کبھی رو رو کے اندوہِ شبِ فرقت بیاں ہوگا
کبھی ہوگی شکایت شکر کے پردے میں غفلت کی		کبھی بے کھٹکے اظہارِ ستمہائے نہاں ہوگا
کبھی خوئے جفا پر دل ہی دل میں منفعل ہونگے		کبھی ذکرِ وفا بھی طبعِ نازک پر گراں ہوگا
کشیدہ عشق سے ہوگا کبھی حُسنِ حیا پرور		کبھی دونوں میں باہم ارتباطِ جسم و جاں ہوگا
کبھی دونوں طرف اک آگ سی بھڑکی ہوئی ہوگی		کبھی اک شرم کا ہلکا سا پردہ درمیاں ہوگا

سرور آنکھوں میں ساغر ہاتھ میں محبوب پہلو میں
زبانِ صدق پر شکرِ خدائے دو جہاں ہوگا

صدق جائسی

مذہب کے متعلق یورپی نظریے

جرمنی کا ایک حکیم "گسلر" کہتا ہے کہ "مذہب ابدی چیز ہے کیونکہ یہ جس حاسہ کا نتیجہ ہے وہ کسی زمانہ میں بھی معدوم نہیں ہو سکتا"۔ فرانس کا مشہور عالم رینان اپنی کتاب "تاریخ مذہب" میں لکھتا ہے کہ یہ ممکن ہے کہ کل وہ اشیا جن کو ہم محبوب رکھتے ہیں اور کل وہ چیزیں جو لذائذ زندگی میں محسوب ہیں مٹ جائیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ مذہب دنیا سے معدوم ہو جائے یا اس کی قوت میں زوال آجائے ذہنیات کا ہمیشہ علانیہ ثبوت دیگا کہ مادی مذہب بالکل غلط ہے جو یہ چاہتا ہے کہ انسان کی دماغی قوت اس پست خاکی زندگی تک محدود رہ جائے"۔ پروفیسر سینٹر "فلسفہ دینیہ" میں لکھتا ہے " میں کیوں پابند مذہب ہوں؟ اس لئے کہ اس کے خلاف ہو ہی نہیں سکتا تھا کیونکہ پابند مذہب ہونا میری ذاتیات میں ہے۔ لوگ کہیں گے کہ یہ وراثت یا تربیت یا مزاج کا اثر ہے میں نے خود اپنی رائے پر بھی اعتراض کیا ہے لیکن میں نے دیکھا کہ سوال پھر پیدا ہوتا ہے اور وہ حل نہیں ہوتا مذہب کی ضرورت جس قدر مجھ کو اپنی ذاتی زندگی کے لئے ہے اس سے زیادہ عام سوسائٹی کو ہے۔ مذہب کی شاخ و برگ ہزاروں دفعہ کاٹ ڈالے گئے لیکن جڑ ہمیشہ قائم رہی اور اس میں نئے برگ و بار پیدا ہو گئے ہیں اس بنا پر مذہب ابدی چیز ہے جو کبھی زائل نہیں ہو سکتی مذہب کا چشمہ روز بروز وسیع ہوتا جاتا ہے اور فلسفیانہ فکر اور زندگی کے دردناک تجربے اس کو اور گہرا کرتے جاتے ہیں انسانیت کی زندگی مذہب ہی سے قائم ہوئی ہے اور اسی سے قوت پائے گی"۔

مذہب بالکل فطری چیز ہے کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ہر قوم ونسل ہر طبقہ کوئی نہ کوئی مذہب رکھتا ہے اور اس کے جو متقدم اصول ہیں وہ سب مذہبوں میں یکساں پائے جاتے ہیں مثلاً خدا کا وجود اور اس کی پرستش کا خیال حیات بعد الممات اور اعمال کی جزا و سزا کا یقین سچائی اور دیانت داری کو اچھا سمجھنا وغیرہ ارسطو و بنتھم بہت سے دلائل کے بعد اس نتیجہ پہنچے کہ سچائی اور دیانت داری وعلم اچھی چیزیں ہیں لیکن افریقہ کا وحشی بغیر تعلیم اور بغیر کسی دلیل کے ان چیزوں کو اچھا جانتا اور اچھا سمجھتا ہے نیچرلسٹ کے سوا تمام محققین نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ انسان نے سب سے پہلے خدا کی پرستش اختیار کی تھی مشہور محقق مکس مولر اپنی کتاب میں لکھتا ہے کہ ہمارے اسلاف نے خدا کے آگے اس وقت سر جھکا دیا تھا جبکہ وہ اس کا نام بھی نہ رکھ سکتے تھے۔ جس زمانہ سے دنیا کی تاریخ معلوم ہے دنیا کے ہر حصہ میں خدا کا اعتقاد تھا آثوری۔ مصری۔ کلدانی۔ یہود وغیرہ سب کے سب خدا کے قائل تھے۔ پلوٹارک کہتا ہے اگر تم دنیا پر نظر ڈالوگے تو بہت سے ایسے مقامات ملیں گے جہاں نہ قلعے ہیں نہ سیاست نہ علم نہ صنعت نہ حرفہ نہ دولت لیکن ایسا کوئی مقام نہیں مل سکتا جہاں خدا نہ ہو۔" والٹیر جو فرانس کا مشہور فاضل تھا کہتا ہے کہ زرداشت۔ منو۔ سولن سقراط۔ سرو۔ سب کے سب ایک سردار ایک منصف ایک باپ کی پرستش کرتے تھے۔

لیکن یہ ایک عجیب بات ہے کہ ہر زمانہ میں اور ہر مقام پر منکرین مذہب کا بھی ایک گروہ موجود رہا ہے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ مختلف خارجی اسباب کی وجہ سے انسان میں جو حاسۂ مذہبی موجود ہے وہ دب جاتا ہے ایسی صورت میں خدا اور روح وغیرہ خارج از محسوسات چیزوں کے لئے استدلات پیش کرنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے پھر اگر عقل نے جذبات کی ہم آہنگی اختیار کی تو مقصود حاصل ہو جاتا ہے ورنہ انسان ہٹ دھرمی پر تل جاتا ہے اور ایک عظیم الشان گمراہی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ اس زمانہ میں جبکہ دنیا نئے قسم کے خیالات اور اعتقادات کی رو میں بہتی چلی جارہی ہے ہر طرف دل و دماغ پر الحاد اور بے دینی کا رنگ چھایا ہوا ہے۔ اس عالمگیر گمراہی کا بہت کچھ وبال یورپ کے مذہبی گروہ کی گردنوں پر ہے کیونکہ پندرھویں صدی عیسوی میں جبکہ یورپ میں علوم جدیدہ کی داغ بیل ڈالی جارہی تھی مذہب کو بہت وسیع کر دیا گیا تھا۔ پرانے راستے اور پرانے اعتقادات سے جو کوئی ذرا بھی ہٹتا اس کو سخت سے سخت سزا دی جاتی کسی قسم کا کوئی علمی مسئلہ مذہب کی دست اندازی سے نہیں بچ سکتا تھا۔ اس مقصد کے لئے اسپین میں مجلس انکوزیشن قائم ہوئی تھی جس کا کام یہ تھا کہ جو لوگ مذہب کے خلاف کچھ کہتے ہوں ان کی تحقیقات کرے اور ان پر کفر کا الزام لگا کر سزائیں تجویز کرے چنانچہ ۱۴۸۱ء سے لے کر ۱۴۹۹ء تک دس ہزار دو سو بائیس آدمی ارتداد کے الزام میں زندہ جلا دئے گئے۔ اس مجلس نے ابتدائے قیام سے

لے کر آخر زمانہ تک تین لاکھ چالیس ہزار آدمیوں کو کافر اور ملحد قرار دیا اور سزائیں دیں کوپرنکس نے نظام بطلیموسی سے انکار کرکے یہ ثابت کیا کہ زمین اور چاند وغیرہ آفتاب کے گرد گھومتے ہیں تو اس پر کفر کا الزام لگایا گیا اور سزا ملی۔ گیلیلو نے جو دوربین کا موجد تھا کوپرنکس کی تائید کی تو دس سال قید کی سزا پائی کولمبس نے نئے جزیرے کی تلاش کا ارادہ کیا تو کلیسا نے فتویٰ دیا کہ اس قسم کا ارادہ مذہب کے خلاف ہے۔ زمین کے کروی ہونے کا خیال جب اول اول ظاہر کیا گیا تو پادریوں نے سخت مخالفت کی کہ یہ بات کتاب مقدس کے خلاف ہے غرض ہر قسم کی ایجادات اور اکتشافات پر پادریوں نے کفر و ارتداد کے الزام لگائے تاہم چونکہ علمی ترقی کا ام اٹھان تھا ان کی کوششیں رائگاں گئیں اور علوم و فنون تکفیر ہی کے سایہ میں پھلے پھولتے رہے۔ پادریوں کی وہم پرستی اور تعصبات اگرچہ علم کو نہ دبا سکے لیکن اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ علمی گروہ نے پادریوں کے خیالات اور اوہام ہی کو مذہب سمجھا اور اس بنا پر نہایت مضبوطی سے ان کی یہ رائے قائم ہوگئی کہ مذہب جس چیز کا نام ہے وہ علم کی حقیقت کے خلاف ہے۔ یہی ابتدائی خیال ہے جس کی آواز بازگشت آج تک یورپ میں گونج رہی ہے۔

یورپ کی نت نئی اور حیرت انگیز ایجادات و انکشافات ساری دنیا میں شائع ہوئیں تو عوام الناس بڑے مرعوب ہوئے اور انھوں نے یورپ والوں کے جملہ خیالات و اعتقادات کو مسلم الثبوت سمجھ لیا۔ جو بات ان کے منھ سے نکلی آمنا صدقنا کہہ کر تسلیم کر لیں گے لیکن بعد ازاں یورپ میں جہاں ساری دنیا کے علوم و فنون کی تحقیقات ہوئی وہاں مذاہب کی بھی چھان بین شروع ہوئی اور بالآخر بہت سے ارباب دانش اس بات پر متفق ہوگئے کہ کوئی مذہب ہو بنیادی اور اصلی اصول و اعتقادات کے لحاظ سے کبھی اوہام پرستی کا مجموعہ نہیں ہو سکتا اور چند غیر مادی اور مافوق الفطرت چیزوں کے تخیلات جو تمام مذاہب میں مشترک ہیں ضرور حقیقت پر مبنی ہیں چنانچہ یورپ کے کئی بڑے بڑے علماء کو خدا اور روح کا وجود تسلیم کرنا پڑا اور انھوں نے صاف صاف اعتراف کیا ہے کہ یہ چیزیں ہم پر اس طرح منکشف ہوئیں جیسے دن کی روشنی۔

آئزک نیوٹن کہتا ہے کہ کائنات کے اجزا میں باوجود ہزاروں انقلابات زمان و مکان کے جو ترتیب و تناسب ہے وہ ممکن نہیں کہ بغیر کسی ایسی ذات کے پایا جا سکے جو سب سے اول اور صاحب علم ہے ہربرٹ اسپنسر کہتا ہے کہ ان تمام اسرار سے جن کی یہ کیفیت ہے کہ جس قدر ہم زیادہ غور و فکر کرتے ہیں اس قدر وہ غامض ہوتے جاتے ہیں اس قدر قطعی ثابت ہوتا ہے کہ انسان کے اوپر ایک ازلی اور ابدی قوت موجود ہے جس سے تمام اشیاء صادر ہوتی ہیں۔ نیشنل انسائیکلوپیڈیا میں لکھتا ہے کہ علم طبیعیات کا مقصد صرف یہ نہیں کہ عقل کی پیاس بجھائی جائے بلکہ اس کا ایک بڑا مقصد یہ ہے کہ اپنی عقل

کی نظر خالق کائنات کی طرف اُٹھائیں اور اس کے جلال پر فریفتہ ہو جائیں۔ رسکین کہتا ہے "اے آسمانو مجھ کو خبر دو اے ہواؤ مجھ کو بتلاؤ اے زمین مجھے جواب دے اے بے انتہا ستارو تم بولو کون سا ہاتھ ہے جس نے تم کو افق میں تمام رکھا ہے اے شب چہاردہ کس نے تیری تاریکی کو خوبصورت بنا دیا ہے تو کس قدر پرشان کس قدر عظمت آب ہے تو خود بتا رہی کہ تیرا کوئی صانع ہے جس نے تجھ کو بغیر کسی زحمت کے بنایا ہے اس نے تیری چھت کو قبہ ہائے نور سے مرصع کیا ہے جس طرح اس نے زمین پر خاک کا فرش بچھایا ہے۔ اے ہیبت ناک سمندر۔ اے وہ کہ غضبناک ہو کر زمین کو نگل جانا چاہتا ہے کس نے تجھ کو محبوس کر رکھا ہے جس طرح شیر کٹہرے میں قید کر دیا جاتا ہے تو اس قید خانہ سے بے فائدہ نکلنے کی کوشش کرتا ہے۔ تیری موجوں کا زور ایک حد معین سے آگے نہیں بڑھ سکتا"۔

ملین اڈورڈ کہتا ہے انسان اسوقت سخت حیرت زدہ ہو جاتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ ان مکرر ناطق مشاہدات کے ہوتے ہوئے ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو یہ کہتے ہیں کہ یہ تمام عجائبات صرف بخت و اتفاق کے نتائج ہیں۔ یہ فرضی احتمالات اور عقلی گمراہیاں جن کو لوگوں نے علم المحسوسات کا لقب دیا ہے علم حقیقی نے ان کو بالکل باطل کر دیا ہے فزیکل سائنس جاننے والا کبھی اس پر اعتقاد نہیں لا سکتا۔

ہمارے ملک میں یہ عام خیال پھیلا ہوا ہے کہ یورپ عام طور پر خرق عادات اور روح کا منکر ہے اور اسی بنا پر جدید تعلیم کا ایک ایک بچہ ہر قسم کے ایسے واقعات پر جو محسوسات عام کے خلاف ہوں استہزا اور انکار کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے اس لئے ہم چاہتے ہیں کہ خرق عادات اور روح کے متعلق یورپ کے مشہور مستند حکما و فضلا کی تحقیقات کا حال لکھیں سنہ ۱۸۶۹ء میں بمقام لندن ایک بہت بڑی مجلس ان امور کی تحقیقات کے لئے منعقد ہوئی اس مجلس کے ارکان حسب ذیل اصحاب تھے۔

سر جان لبک :۔ ممبر آف پارلیمنٹ۔ صدر انجمن
پروفیسر ہکسلی جو طبیعیات کا سب سے بڑا عالم تھا
لوئس۔ فزیکل سائنس کا بہت بڑا عالم
الفرڈ ولز: جو ڈاروِن کا ہمعصر اور مسئلہ ارتقا میں برابر کا شریک تھا۔
مارگن۔ مجلس علوم ریاضیہ کا صدر انجمن

جان کوکس، امپیریل سائنٹفک سوسائٹی کا صدر انجمن
ان کے سوا اور بہت سے فضلا شریک مجلس تھے اٹھارہ مہینے تک یہ مجلس برابر تحقیقات کرتی رہی آخر میں مجلس نے جو رپورٹ مرتب کی اس کے بعض فقرے یہ ہیں۔

" مجلس نے اپنی رائے کا مدار صرف ان تجربوں پر رکھا جو مجلس نے خود مشاہدہ کئے اور جن میں کسی قسم کا شک وشبہہ نہیں ہو سکتا مجلس میں چار شخص ایسے ممبر تھے جو شروع میں اس قسم کے واقعات کے سخت منکر تھے اور سمجھتے تھے کہ یا تو ان واقعات میں فریب وشعبدہ بازی سے کام لیا جاتا ہے یا خود انسان کے عصبی نظام کا اثر ہے لیکن نہایت دقیق اور مکرر تجربوں کے بعد ان کو یہ اقرار کرنا پڑا کہ یہ خرق عادات حقیقی اور واقعی ہیں"

اس کے بعد انگلستان اور امریکہ میں ان تحقیقات کے لئے ایک ایک مجلس قائم ہوئی جس کے صدر انجمن ہیزلوب اور ہوڈسن تھے یہ مجلس تقریباً بارہ برس تک تحقیقات میں مصروف رہی اور بالآخر ۱۹۰۹ء میں اس نے اپنی تحقیقات ختم کی اور ان واقعات کی صحت کا اعتراف کیا ہیزلوب نے جو رائے لکھی اس کے بعض فقرے یہ ہیں:-

" مجھ کو امید ہے کہ میں ایک برس کے بعد دنیا کے سامنے دلائل قطعیہ سے یہ ثابت کروں گا کہ اس عالم فانی کے بعد ایک اور عالم ہے۔ میں نے خود اپنی آنکھوں سے وہ خرق عادات دیکھے ہیں جن کی نسبت کسی طرح شعبدہ اور فریب کا احتمال نہیں ہو سکتا۔

ہوڈسن کی رپورٹ کے بعض جملے یہ ہیں۔

" دنیا کو بہت جلد عظیم الشان جدید اطلاعیں حاصل ہونے والی ہیں مجھ کو امید ہے کہ دو ایک ہی برس میں دنیا کے لئے انسانی زندگی کے قوانین فطرت کی نئی تفسیر پیش کروں گا۔ اگر پروفیسر ہیزلوب نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ اس نے مردوں کی روحوں سے باتیں کیں تو ان کا یہ دعویٰ بالکل درست ہے"

ایک اخبار کے نامہ نگار نے ہوڈسن کے اس مسئلہ کے متعلق گفتگو کی تو اس نے یہ الفاظ کہے " میں نے اور پروفیسر ہیزلوب نے ایک ساتھ تحقیقات شروع کی ہم دونوں دہریے تھے اور کسی شئے پر یقین نہیں رکھتے تھے تحقیقات سے ہماری غرض یہ تھی کہ عیان روحانیت جو شعبدہ بازیاں کرتے ہیں ان کی پردہ دری کردی جائے لیکن آج میں اس بات کا قائل ہوں کہ مُردوں سے بات چیت ہوسکتی ہے اور اس کے متعلق ایسے دلائل ظاہر ہوچکے ہیں کہ اب مطلق شبہہ کی گنجائش نہیں رہی"

پروفیسر کوکس جو امپیریل سائنٹفک سوسائٹی کا صدر انجمن تھا۔ اس نے مجمع عام میں کہا کہ میں صرف یہی نہیں کہتا کہ یہ ممکن ہے

بلکہ میں کہتا ہوں کہ وہ بالکل حقیقت واقعی ہے۔ پروفیسر کوکس نے خاص اسپریچولیزم پر ایک کتاب لکھی جو نہایت کثرت سے بار بار چھپ چکی ہے اس میں وہ لکھتا ہے کہ چونکہ مجھے ان واقعات کا قطعی یقین ہو چکا ہے اس لئے یہ اخلاقی کمزوری اور نامردی ہے کہ میں ان کے ظاہر کرنے میں اس بناء پر جھجکوں کہ نکتہ چیں میری ہنسی اڑائیں گے۔

ماوئین میں بہت بڑا فاضل جارج سکستون ہے وہ روح وغیرہ کا نہایت مخالف تھا اور ان امور پر سخت حملے کیا کرتا تھا اس لئے صرف اس غرض سے کہ مدعیان روح کی شعبدہ بازیوں کا پتہ لگائے اس طرف توجہ کی اور پندرہ برس تک اس تگ و دو میں رہا بالآخر اس نے یہ الفاظ کہے۔

"میں نے خاص اپنے گھر میں جہاں میرے احباب کے سوا کوئی موجود نہ تھا بغیر کسی درمیانی شخص کے قطعی طور پر اس کا تجربہ کیا۔ جن لوگوں سے بات چیت ہوئی وہ مرے ہوئے میرے عزیز و اقارب تھے۔"

باکس نے جو مشہور جیالوجسٹ فاضل ہے ایک علمی پرچہ میں لکھا کہ میں نے تمام وہ کتابیں جو روح کی رد میں لکھی گئیں تھیں پڑھیں اور ان تمام لوگوں سے مناظرے کئے لیکن میں نے یہ مشاہدات خود اپنی آنکھوں سے دیکھے اور دس برس تک تجربے کرتا رہا یہاں تک کہ اب میں ان مشاہدات پر بہ علم و رویت گفتگو کر سکتا ہوں۔

مارگن جو علوم ریاضیہ کا پریسیڈنٹ تھا۔ اس نے یہ شہادت دی کہ میں نے خود اپنی آنکھوں سے جو دیکھا اور اپنے کانوں سے جو سنا اس نے مجھ کو ایسا مطمین کر دیا ہے کہ شک کا احتمال بھی نہیں رہا۔

غرض اس قسم کی تحقیقات کی اگر تفصیل لکھی جائے تو ایک کتاب طیار ہو سکتی ہے یہاں صرف مقصد یہ ہے کہ ہمارے ملک کے وہ اصحاب جن کی آنکھیں بعض کم درجہ کے ادیبوں کی ملمع کاریوں سے خیرہ ہو گئی ہیں، مذہب کے معاملہ میں پھر غور و فکر کریں

محمد خلیل الرحمن (سال دوم شعبۂ دینیات)

مغل اور گولکنڈہ

عہد شاہجہاں تک

یہ مضمون عبدالوہاب صاحب مسلم کے امتحان ایم۔ اے کے مقالہ کا ابتدائی جزو ہے۔ مسلم صاحب یوں تو تاریخ کے طالب علم ہیں لیکن ساتھ ہی زبان و ادب کا نہایت صحیح اور اعلیٰ ذوق رکھتے ہیں جس کی چاشنی اس مقالہ میں بھی جا بجا موجود ہے۔ یہ مضمون جس محنت اور کاوش سے لکھا گیا ہے۔ اس کی داد ہر وہ شخص دینے کے لئے مجبور ہوگا جو اس کو غور و خوض کے ساتھ پڑھنے کی زحمت گوارا کرے گا۔

مدیر

پندرھویں صدی کے آخر میں بہمنی سلطنت کے حصے بخرے شروع ہوئے اور عماد شاہی، عادل شاہی، نظام شاہی، برید شاہی اور قطب شاہی سلطنتیں قائم ہوگئیں۔ ان میں قطب شاہی سلطنت نے سب سے آخر یعنی ۱۵۱۲ء میں اعلان خود مختاری کرکے اپنا دار السلطنت گولکنڈہ مقرر کیا۔

ان سلطنتوں کے قیام کے تھوڑے ہی عرصہ بعد ۱۵۲۶ء میں بابر کے ہاتھوں شمالی ہند میں عظیم الشان مغل سلطنت

کی بنیاد پڑی۔ بابر اور ہمایوں کی زندگی نے وفا نہ کی، لیکن اکبر کو موقعہ ملا اور اتنا اقتدار بھی کہ اپنی سلطنت کے حدود کو وندھیاچل کے جنوب میں پیشرو ہندو راجاؤں کی طرح وسعت دے۔ جہانگیر اور شاہجہاں نے بھی اس مسلک کی پیروی کی لیکن مغلوں کی یہ آرزو کہ پورے ہندوستان پر اپنا پرچم لہرائیں اس خاندان کے چھٹے عظیم الشان اور عظیم المرتبت بادشاہ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں پوری ہوئی، جس نے ۱۶۸۷ء میں دکن کی آخری سلطنت قطب شاہیہ کو فتح کر کے مغل سلطنت میں اس کا الحاق کیا۔

اکبر کے دکن کی طرف توجہ کرنے سے پہلے ہی ۱۵۷۴ء میں نظام شاہی سلطنت نے برار پر قبضہ کر کے، عماد شاہی سلطنت کا خاتمہ کر دیا تھا اور بیدر کے بریدی خاندان کے قبضہ میں صرف خاندیش کا مختصر سا علاقہ باقی تھا۔ ۱۵۹۱ء میں اکبر نے اپنے سفیر دکنی درباروں میں بھیجکر مطالبہ کیا کہ وہ شہنشاہ دہلی کا اقتدار اعلیٰ تسلیم کرلیں۔ خاندیش نے اطاعت کی لیکن احمد نگر بیجاپور اور گولکنڈہ نے انکار کر دیا، جس پر ۱۵۹۳ء میں عبدالرحیم خانخاناں کے تحت دکن کے خلاف ایک زبردست فوج بھیجی گئی، جس سے چاند بی بی نے احمد نگر میں بڑی بہادری سے مقابلہ کیا، لیکن آخر کار مجبور ہو کر ۱۵۹۶ء میں نظام شاہیوں نے صلح کر کے برار مغلوں کے سپرد کر دیا۔ یہ صلح زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکی۔ نظام شاہیوں نے برار واپس لینے کی کوششیں کیں تو مغلوں نے احمد نگر فتح کر لیا، لیکن آپس کے اختلافات کی وجہ سے مغل فوجیں اس کامیابی سے فائدہ نہ اٹھا سکیں، اور اکبر نے دکنی فتوحات میں مشکلات، انتظامی دقتوں اور دکھنیوں کے زبردست مقابلہ کو دیکھ کر بیجاپور اور گولکنڈہ کی تسخیر کا ارادہ ترک کر دیا۔

۱۶۰۹ء میں بیجاپور نے بریدشاہی سلطنت کا خاتمہ کر دیا۔ اس وقت نظام شاہیوں کو خوش قسمتی سے ملک عنبر ایسا لائق مدبر اور سپہ سالار مل گیا تھا جس نے نہ صرف نظام شاہی سلطنت کے کھوئے ہوئے وقار کو دوبارہ حاصل کر لیا بلکہ اسے ایک زبردست قوت بھی بنا کر گولکنڈہ کو چار لاکھ ہون سالانہ خراج دینے پر مجبور کیا[1]۔ احمد نگر پر مغل قبضہ کر چکے تھے۔ لہٰذا اس نے موجودہ اورنگ آباد کے قریب کھڑکی نامی قصبہ کو نظام شاہیوں کا دارالحکومت قرار دیا، بیجاپور کے علاقہ میں لوٹ مار شروع کی اور کچھ علاقہ پر قبضہ بھی کر لیا۔ اس نے برگیوں کو اپنی فوج میں بھرتی کیا اور وہ طریقہ جنگ شروع کیا جسے خافی خاں اور دیگر مورخ "برگی گری" کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ اسی طریقہ جنگ کو آخر کار

[1] خافی خاں جلد اول صفحہ ۲۷۴ و بادشاہ نامہ عبدالحمید جلد اول حصہ ۲ صفحہ ۱۷۱

سیواجی اور اس کے جانشین کام میں لائے یا دکنی سلطنتوں کی بنیادیں کھوکھلی کرنے کے بعد مغل سلطنت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا اور دکن کے شاداب خطہ کو تباہ و برباد کر دیا۔

دہلی دو رکھی؛ ملک عنبر نے بیجاپور اور گولکنڈہ سے اتحاد کیا اور ۱۶۱۵ء کے قریب نظام شاہی اور عادل شاہی حکومتوں نے مغلوں کے چند دکنی علاقے دبا لئے۔ ان میں احمد نگر بھی شامل تھا جسے بڑی مشکلوں اور خون فشانیوں کے بعد مغلوں نے حاصل کیا تھا؛ لہذا ۱۶۱۶ء میں جہانگیر نے شہزادہ خرم کو دکن کی طرف بھیجا۔ مغلوں کی جارحانہ کارروائیوں کے سامنے مجبور ہو کر دکنی سلطنتوں کو سر تسلیم خم کرنا پڑا۔ عادل شاہ نے اطاعت کی، شہر سے پانچ کوس آگے آکر شاہی فرمان کا استقبال کیا، اور شاہی سفیروں افضل خاں اور رائے رایاں کے سامنے وعدہ کیا کہ تمام شاہی محالات مع احمد نگر واپس کر دئے جائیں گے اور میں ہمیشہ شہنشاہ کی اطاعت کروں گا۔ اس نے رائے رایاں کو دو لاکھ روپیہ دیا اور شہنشاہ کے لئے پندرہ لاکھ روپیہ کی نقد جنس بطور پیشکش بھیجی۔ اس زمانہ میں میر مکی اور رائے جادو داس گولکنڈہ بھیجے گئے تھے قطب شاہ نے پانچ کوس آگے آکر فرمان کا استقبال کیا اور پندرہ لاکھ روپیہ کی پیش کش روانہ کی جس کے بعد شاہجہاں واپس ہوا؛ لیکن اس کی واپسی پر دکنی سلطنتوں نے پھر سر اٹھایا، اور متحد ہو کر قطب شاہ، عادل شاہ اور نظام شاہ نے بالاگھاٹ کے مغل علاقہ پر قبضہ کر لیا؛ شاہی لشکر کو شکست دے کر بھگا دیا؛ مغل علاقہ میں خوب لوٹ مار کی، اور برہانپور کا محاصرہ کر لیا؛ جس سے مغل حکام نے سخت پریشان ہو کر شہنشاہ کی خدمت میں مدد کے لئے عرضداشتیں بھیجیں۔ جہانگیر نے اطلاع پا کر بہت جلد ۲۹ دسمبر ۱۶۲۰ء کو حکم دیا کہ شاہجہاں فوراً دکن روانہ ہو؛ جو حسب الحکم یلغار کرتا ہوا ملک عنبر کے سر پر پہنچا اور پے در پے شکستیں دیں جس سے مجبور ہو کر ملک عنبر نے اطاعت کی اور وعدہ کیا کہ اگر مجھے معاف کیا جائے تو تمام شاہی علاقہ واپس کر کے چودہ لاکھ روپیہ کے نئے محالات نذر کر دوں گا۔ اس کے علاوہ اس نے دیگر سلاطین دکن کی جانب سے پیشکش وصول کر کے ادا کرنے کا بھی وعدہ کیا۔ شاہجہاں نے اس کی عرضداشت کو قبول کیا اور تصفیہ یہ ہوا کہ اکبر کے وقت سے جن پرگنات اور محالات پر مغلوں کا قبضہ ہو چکا ہے ان کو واپس لیں۔ ان محالات کی آمدنی چودہ کروڑ دام یعنی پینتیس لاکھ روپیہ تھی۔ واپسی محالات اور پیشکش کے علاوہ ایک شرط یہ بھی تھی کہ دکنی حکومتیں پچاس لاکھ روپیہ نقد بھی ادا کریں۔ ملک عنبر نے جملہ شرطیں قبول کر لیں اور اس کی درخواست پر شہنشاہ نے فیصلہ کیا کہ اس پچاس لاکھ روپیہ میں سے

---

[1] مرزا کی رجار دواس دیوان بیوتات، مآثر الامرا جلد سوم صفحہ ۱۵

عادل خاں بیس لاکھ، قطب الملک اٹھارہ لاکھ، اور نظام الملک بارہ لاکھ روپیہ ادا کرے۔ یہ معاہدہ جلد پورا کیا گیا اور تینوں سلطنتوں سے خراج پہنچنے پر شاہزادہ شاہ خرم واپس ہوا۔[۵۱]

اس طرح ۱۶۲۰ء میں یہ سلطنتیں مغلوں کی باجگذار بن گئیں۔ ان کے دار الحکومتوں میں مغل حاجب رہ کر اندرونی معاملات میں مداخلت کرنے لگے ان کو شاہی فرمان کا استقبال کرنا پڑتا اور ہر وقت شہنشاہ کی خفگی کا اندیشہ لگا رہتا۔ وہ شکست خوردہ تھے اور حالات کے تحت مطیع ہو گئے لیکن ان حکمرانوں کے دلوں میں اب بھی آزادی اور خود مختاری کا جذبہ باقی تھا۔[۵۲] چنانچہ اکثر موقعوں پر مختلف قسم کے بہانے کر کے فرامین کا استقبال کرنے سے گریز اور پیشکش ادا کرنے میں پس و پیش کرتے؛ حاجبوں کی خاطر و مدارات کر کے اور رشوتیں دیکر راضی کر لیتے؛ تاکہ ان کا بھرم باقی رہے اور یہ حاجب شہنشاہ کے پاس ان کی شکایت نہ لکھیں۔ مغلوں کا برتاؤ بھی ابتداءً زیادہ سخت نہ تھا بلکہ بعض اوقات یہ مراسم خوشگوار کہلائے جا سکتے تھے چنانچہ جس وقت شاہجہاں ۱۶۲۲ء میں جہانگیر کے خلاف بغاوت کر کے دکن آیا اور ملک عنبر، عادلشاہ اور قطب شاہ سے مدد مانگی تو ملک عنبر نے صاف انکار کیا اور بیجاپور نے اس کے سفیر کی توہین کی مگر گولکنڈہ کی طرف سے اس کی خاطر و مدارات ہوئی جس سے شاہ جہاں بہت خوش ہوا۔ ۱۶۲۶ء میں باپ اور بیٹے میں صلح ہو گئی۔[۵۳] لیکن شاہجہاں کو گولکنڈہ کا خاص خیال رہا اور قطب شاہ بھی شاہجہانی سفیر کا دیگر سلاطین کے مقابلہ میں زیادہ خیال رکھتا اور اس کی خاطر و مدارات کرتا چنانچہ اسی سال ۱۶۲۶ء میں جب عبد اللہ قطب شاہ تخت نشین ہوا تو شاہزادہ خرم کی طرف سے اخلاص خاں قزوینی تہنیت و مبارکباد کے علاوہ "تبرکات مرغوب و مکتوبات محبت اسلوب" لے کر آیا "مقربان اورنگ خورشید پایۂ دو شاہ سکندر جاہ تنظیم و تکریم او کما ینبغی شمردند و بہ نسبت حجاب دیگر او را منزلے وسیع مرحمت فرمودند و باحسان و اکرام پادشاہی مفتخر و مباہی گردید۔۔۔ ۔۔ حاجب شاہزادہ عالمیان را کہ بجہت اداے وظائف مبارکباد و تہنیت آمدہ بود مدعیات نیز عرضداشتہ مستدعیات ایشان بعز اجابت اقتراں یافت۔[۵۴]

---

[۵۱] خافی خان جلد اول صفحہ ۳۰۴ تا ۳۲۲

[۵۲] یہ جذبہ آخر تک باقی رہا چنانچہ بقول خان سعادت خاں حاجب سلطان ابو الحسن قطب شاہ نے کہا تھا کہ "ما ہم بادشاہ ئیم اگرچہ گرفتہ ئیم" جلد دوم صفحہ ۲۹۵

[۵۳] میرے پاس ایک مخطوطہ میں جہانگیر کا خط خرم کی بغاوت کے متعلق نثر اور اس کا جواب نظم میں موجود ہے جو مجھے میسور میں دستیاب ہوا

[۵۴] حدیقۃ السلاطین۔ قلمی دفتر دیوانی۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ۶ فروری ۱۶۲۸ء کو شاہجہاں تخت نشین ہوا تو بیجاپور اور گولکنڈہ کے پیام تہنیت و مبارکباد آئے[1] لیکن یہ تعلقات دیرپا نہ تھے۔ خانجہاں صوبہ دار دکن تھا اس نے بالاگھاٹ کا مغل علاقہ عادل شاہ کے سپرد کردیا اور خود آگرہ پہنچا لیکن شہنشاہ کے خوف اور قتل کئے جانے کے وہم سے پریشان ہوکر دکن میں نظام شاہ کے پاس پناہ لی۔ شاہجہاں نے مطالبہ کیا کہ اسے واپس کردیا جائے لیکن احمدنگر نے جواب دیا کہ اسے ہم نے بلایا نہیں خود آیا ہے شاہجہاں بہت غضبناک ہوا لیکن موقعہ کی نزاکت دیکھ کر خود دکن روانہ ہوا۔ اور برہان پور پہنچکر عادل شاہ اور قطب شاہ کے پاس حاجب روانہ کئے گولکنڈہ میں اس کے حاجب شیخ محی الدین کی بڑی خاطر مدارات ہوئی اور قطب شاہ نے اس کے قیام گولکنڈہ ۱۶۲۷ تا ۱۶۳۱ء کے زمانے میں اسے اور اس کے اقربا کو ایک لاکھ پچاس ہزار ہون نقد، دس ہاتھی پچاس عراقی گھوڑے اور خلعت مرحمت کئے[2]

معلوم ہوتا ہے کہ جب عبداللہ قطب شاہ کی نوعمری سے دکنی حکومتیں اور مغل سلطنت گولکنڈہ سے فائدہ اٹھانا چاہتی تھی اس زمانے میں انھوں نے بعض بیجا مطالبات پیش کئے خصوصاً شیخ محی الدین نے جس کے پاس ہر ماہ شاہجہانی ہرکارہ آکر مطالبات پورے کئے جانے اور اس کی واپسی پر زور دیتا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر سلطان عبداللہ نے شاہ محمد کو برطرف کرکے اس کی جگہ شیخ محمد کو پیشوا مقرر کیا شاہ محمد پر نااہلی کا الزام لگایا گیا اور شاہی معاملات میں خیانت کرنے کی بنا پر اسی کے مکان میں نظربند کردیا گیا نئے پیشوا نے آصف خاں اور دیگر امرا کے پاس خطوط بھیجکر شاہجہاں سے یہ حکم لے لیا کہ "من بعد شیخ محی الدین تخلف از رضائے خاطر آں قطب فلک جاہ و جلال نہ نمودہ در جمیع امور متابعت نماید"[3]
اس سے معلوم ہوتا ہے کہ شیخ محی الدین پیرزادہ اجینی خود کو شہنشاہ کا حاجب تصور کرکے قطب شاہ کو دھمکیاں دیتا اور بیجا مطالبات پیش کرکے مجبور کرتا تھا کہ رشوت دے کر اسے رام کرے۔ شاہجہاں نے بقول نظام الدین صاعدی اپنے حاجب کو قطب شاہ سے اس کے برتاؤ کی بنا پر صرف سرزنش ہی نہیں کی بلکہ جس وقت وہ ۳ اپریل ۱۶۳۱ء کو یوسف شا المخاطب بہ وفا خاں حاجب گولکنڈہ کے ساتھ برہان پور پہنچا اور گولکنڈہ کی جانب سے "موازی چہار دہ لک روپیہ جواہر و مرصع آلات بہا زر نقد و فیلان کوہ پیکر و دیگر امتعہ نفائس گولکنڈہ" پیش کرنے کے بعد خود اپنی جانب سے

---

[1] عبدالحمید جلد اول حصہ صفحہ ۲۲۶
[2] حدیقۃ السلاطین قلمی و حدیقۃ العالم صفحہ ۲۲۲
[3] حدیقۃ السلاطین قلمی و حدیقۃ العالم صفحہ ۲۲۲
[4] حدیقۃ السلاطین

ایک لاکھ روپیہ کے جواہر پیش کئے۔[1] تو شاہجہاں نے قطب شاہی حاجب پر عنایت کی اور "شیخ محی الدین مغضوب و مردود گردید۔ ۔۔۔ خوار و بے اعتبار شد و اقربائے او را نیز تادیب بلیغ نمودند"[2] اس کے بعد اُسے جو کچھ گولکنڈا سے ملا تھا سب ضبط کر لیا[3] دفاخاں کو ۲۲ مئی ۱۶۳۱ء کو خلعت و دس ہزار روپیہ انعام ملا؛ جس نے شاہجہاں کے سلوک کی تمام کیفیت لکھ کر گولکنڈہ بھیجی لیکن تعجب ہے کہ شاہ جہاں کے درباری مورخین نے پیشکش کا ذکر تو کیا ہے لیکن شیخ محی الدین کو سزا دینے اور اس کا مال ضبط ہونے کے متعلق کچھ نہیں لکھا۔ شاہ جہاں کے مطالبات جن کی بنا پر ہمراہ شیخ محی الدین کے پاس ہرکارہ آتا تھا کیا تھے معاصر تاریخیں خاموش ہیں لیکن قیاس کہتا ہے کہ یہ غالبًا عادل شاہ کو مدد نہ دینے اور پیشکش بھیجنے کے متعلق تھے جس کا تصفیہ ایام شاہزادگی میں ہوچکا تھا۔ گولکنڈہ کا بادشاہ اس کو اپنی توہین اور آزادی کے خلاف تصور کر کے لیت و لعل کر رہا تھا لیکن اتفاقًا شاہجہاں کو، خان جہاں کی بغاوت کچلنے اور نظام الملک کی تنبیہ کے لئے دکن آنا پڑا۔ اس نے عادل شاہ سے ایک معاہدہ کر کے صابر بیگ المخاطب بہ نصیری خاں کو قطب شاہی سرحد پر بھیجدیا تا کہ ادھر سے مدد نہ آسکے۔ قطب شاہی پالیسی کے متعلق حدیقۃ العالم کا بیان ہے کہ "خاقان زمان کہ باطنًا با عادل شاہ متفق بود، ظاہرا رعایت جانب بادشاہ عالمیان شاہجہان می نمود بنا بر صلاح وقت سپاہ عادل شاہ را مدد خروج مرحمت فرمودتا بر سر مغل رفتہ محاربہ نماید"[4] نصیری خاں کے آنے کی خبر سنکر گولکنڈہ سے احتیاطًا آدم خاں حبشی اور اللہ قلی بیگ وغیرہ سرحد کی حفاظت کے لئے کولاس بھیجے گئے۔ اس زمانہ میں سید میرنے جو کنکوٹہ اور کلنگ میں سپہ سالار تھا، عریضہ بھیجا کہ باقر خان نجم ثانی صوبہ دار بنگالہ اس طرف آیا ہے اور اس نواح میں اس کا لشکر بے اعتدالیاں کر رہا ہے لہذا کمک کی ضرورت ہے۔ عبداللہ قطب شاہ نے سید عبداللہ شاہ قلی ولد سلمان قلی، دریا قوت خاں حبشی وغیرہ کو کنکوٹہ روانہ کیا اور سید عبداللہ کو سپہ سالار بنا کر تاکید کی کہ سرحد کی اچھی طرح حفاظت کی جائے۔ سید عبداللہ یلغار کرتا ہوا کنکوٹہ کے قریب پہنچا؛ اپنے چند سواروں کو باقر خاں کے مقابلہ میں روانہ کیا اور خود کوہ سیاہ کے قریب قیام کیا۔ قطب شاہ اور مغل لشکروں میں ایک خوں ریز جنگ ہوئی اتفاق سے وہاں دلدل تھی شاہ قلی دلدل میں پھنس کر مارا گیا۔ قطب شاہی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے

---

[1] حدیقۃ السلاطین (قلمی)، وعبد الحمید جلد اول حصہ ۲ صفحہ ۳۶۶
[2] حدیقۃ السلاطین
[3] حدیقۃ العالم صفحہ ۳۲۴۔
[4] حدیقۃ العالم صفحہ ۳۳۵۔

اور مغلوں کو فتح ہوئی۔ سید عبداللہ نے مدد طلب کی تو خواجہ افضل ترک، حاکم مرتضیٰ نگر روانہ کیا گیا اور اس نواح کے جملہ نایک واڑیوں کو حکم ہوا کہ سرحد کی حفاظت کریں اس کے ساتھ ہی شیر خاں کو حکم ہوا کہ وہ راج مندری جاکر قلعہ کو مستحکم کرکے حفاظت کرے۔ چنانچہ وہ دھاوے مارتا ہوا باقر خاں سے پہلے وہاں پہنچ گیا[1] لیکن اس اثنا میں باقر خاں نے مئی ۱۶۲۹ء میں کمیر اباڑا اور ۲۴ دسمبر ۱۶۲۹ء کو قلعہ منصور گڈھ فتح کرلیا۔ قطب شاہیوں کو ہر جگہ زک ہوئی اور شیر خاں کو بھی شکست کا منہ دیکھنا پڑا۔ نایک واڑیوں کے گڈھ اور قلعے فتح ہوگئے اور انھوں نے ہتھیار ڈالدیئے، جس کے بعد نصیری خاں قلعہ قندھار کی تسخیر کو بھیجا گیا، ایک زبردست اور خونخوار مقابلہ کے بعد یہ قلعہ بھی مغلوں کے ہاتھ آگیا عادل شاہی و نظام الملکی فوجیں جو مدد کو آئی تھیں شکست کھا کر بھاگ گئیں اور مغل فوجوں نے نظام الملکی علاقہ کو خوب تباہ و برباد کیا۔ یہ حالت دیکھ کر عبداللہ قطب شاہ نے اظہار ندامت کیا اور پیشکش بھیجی۔ شاہجہاں نے بھی "نظر بر ایں کہ طریقہ الطاف با خدیو جہاں (عبداللہ قطب شاہ) مرعی میداشت وظاہرا در مقام تلافی و تدارک حقوق سابق بود، فرامین بہ باقر خاں ارسال فرمود کہ "ترک جرأت نمودہ وولایات مفتوحہ را وکلائے قطب شاہ سپردہ بہ بنگالہ مراجعت نماید"[2]

شیخ محی الدین کے مال و اسباب کی ضبطی، اور معتوب ہونے کی غالباً ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ شاہجہاں کے بار بار بلانے پر بھی شیخ محی الدین واپس نہ ہوتا تھا۔ شہنشاہ یہ نہ چاہتا تھا کہ اس کا حاجب گولکنڈہ کے دیئے ہوئے مال سے دولتمند ہو۔ مغل دربار میں کسی کو ہاتھی دیا جانا بڑا اعزاز تصور کیا جاتا تھا اور قطب شاہ نے شیخ محی الدین کو کثیر روپیہ ہاتھی، گھوڑے اور دیگر مال و اسباب عطا کئے تھے جس کی وجہ سے اس نے شہنشاہی احکام پر عمل کرنے میں بے پروائی برتی تھی اگر اسے سزا نہ دی جاتی تو دوسرے حاجب بھی شاہی اغراض و مقاصد کے خلاف گولکنڈہ کی رعایت اور اعانت کرکے دولت حاصل کرتے بہرحال چونکہ اس وقت شہنشاہ گولکنڈہ کے اندرونی معاملات میں دخل نہ دینا چاہتا تھا اس لئے صرف پیشکش پر اکتفا کرکے قطب شاہ کے مفتوحہ علاقے واپس کردیئے اور خود نظام الملک اور خان جہاں کے استیصال میں مصروف رہا۔ خان جہاں نے زبردست مقابلہ

[1] حدیقۃ العالم صفحہ ۳۲۵

[2] شاہجہاں کے برہان پور جانے کے بعد باقر خاں بنگالہ واپس ہوا۔ حدیقۃ العالم صفحہ ۳۲۲

کیا لیکن آخر کار اس کے بازو ٹوٹ گئے اور بے یار و مددگار چند ہم قوم ہمراہیوں کے ساتھ آگرہ کی طرف بھاگا مگر شاہی لشکر نے تعاقب کرکے جھانسی کے قریب اس کا خاتمہ کر دیا۔

شاہ جہاں کا دکن پر حملہ اور ۱۶۳۶ء کا عہدنامہ

مغلوں نے نظام شاہی علاقہ تباہ و برباد کر دیا تھا اور رفتہ رفتہ اس پر قبضہ کر رہے تھے؛ تھوڑے ہی عرصہ میں انہوں نے قلعہ دھارور بھی فتح کرلیا جو بہت مستحکم اور اہم تھا۔ عادل شاہ سے اس سے قبل معاہدہ ہو چکا تھا کہ مغلوں کی مدد کرنے پر اُسے نظام شاہی علاقہ کے پانچ قلعے (جن میں دھارور بھی شامل تھا) کوکن کے کچھ علاقوں کے ساتھ دئے جائیں گے؛ لیکن عادل شاہ یہ نہ چاہتا تھا کہ نظام شاہی سلطنت کا بالکل خاتمہ ہو جائے۔ دکنی سیاسیات کا اقتضا بھی یہی تھا۔ اب تک وہ مغلوں کے مدد کرنے سے پہلو تہی کرتا رہا لیکن دھارور فتح ہونے کے بعد اس نے اپنے سردار رندولہ خاں کو بھیجا اور یہ علاقہ طلب کئے۔ اگر اعظم خاں نے یہ کہکر کہ "عادل شاہ نے اب تک کوئی مدد نہیں دی ہے؛ اس کو چاہئے کہ مدد دے کر اپنی وفاداری اور ایفائے عہد کا ثبوت دے۔ اس وقت حسب معاہدہ یہ قلعے اسے ضرور دے جائینگے" قلعہ پرینڈہ کا محاصرہ کرلیا۔ نظام الملکی سرداروں نے پریشان ہوکر عادل شاہ کو لکھا کہ نظام شاہی علاقہ تو ختم ہو رہا ہے پرینڈہ کی فتح عادل شاہی سلطنت کے خاتمے کی تمہید ہوگی۔ اس لئے مناسب ہے کہ ہم اور آپ ملکر مغلوں کا مقابلہ کریں۔ پرینڈہ عادل شاہی سرحد کا اہم ترین قلعہ تھا اس لئے عادل شاہ بھی گھبرا رہا تھا چونکہ وہ خفیہ طور پر نظام شاہی سرداروں کی مدد کر رہا تھا اور حسب معاہدہ مغلوں کو مدد بھی نہیں پہنچائی تھی اس لئے اس کا خوف اور زیادہ بڑھ گیا اور اب اُس نے اپنی فوجیں علانیہ نظام شاہی سرداروں کی مدد کو بھیجیں۔ چنانچہ اس متفقہ فوج کی کوششوں اور آذوقہ کی کمی کے باعث مجبوراً اعظم خاں کو پرینڈا کا محاصرہ اٹھا لینا پڑا۔

اسی زمانہ میں پے درپے شکستوں کے باعث برہان نظام شاہ کے دماغ میں فتور آگیا اور اس نے فتح خاں ابن ملک عنبر کو جسے ناراض ہوکر اس نے قید کر دیا تھا، رہا کر دیا لیکن یہ رہائی خود نظام شاہ کی قید اور موت کا باعث ہوئی کیونکہ لوگوں کے بھڑکانے سے فتح خاں نے برہان نظام شاہ کو قید کرکے آخر میں گلا گھونٹ کر مار ڈالا اور اس کے

دس سالہ لڑکے حسین نظام شاہ کو تخت نشین کرکے خود ۱۶۳۳ء میں شہنشاہ کی اطاعت کرلی

اب چونکہ خان جہاں کا خاتمہ اور نظام الملک کا استیصال ہو چکا تھا، اور انھیں ایام میں ممتاز محل بیگم کا انتقال بھی ہو گیا تھا، جس سے شہنشاہ نہایت غمگین تھا اس لئے دکن میں زیادہ قیام کو غیر ضروری تصور کرکے سنہ ۱۶۳۲ء کے وسط میں برہان پور ہوتا ہوا آگرہ واپس ہوا لیکن اس کے واپس ہوتے ہی دکنی حکومتوں نے پھر سر اٹھایا اس کا سبب یہ تھا کہ شاہ جہاں نے فتح خاں کی اطاعت سے خوش ہوکر نظام الملک کے چند محالات جو اس سے قبل ساہو کو دئے گئے تھے، اسے عنایت کئے۔ ساہو نے ناراض ہوکر بیجاپور میں پناہ لی اور دولت آباد پر حملہ کیا۔ فتح خاں کے مدد مانگنے پر مغل سپہ سالار مہابت خاں ادھر روانہ ہوا۔

مغلوں کے کامیاب حملے، غارتگری اور اپنی بے بسی دیکھ کر دکھنی حکومتوں کی آنکھیں کھل چکی تھیں اور ان کو اپنی تباہی بلکہ خاتمے کے آثار نظر آرہے تھے چنانچہ انھوں نے ایک دوسرے کی مدد کو اپنی بقا کے لئے ضروری سمجھ کر پیام و سلام کا سلسلہ شروع کر دیا تھا مغل فوج نے ساہو اور نرہری پنڈت سپہ سالار بیجاپور کو شکست دی جنھوں نے فتح خان کو وقتی مصالح سمجھا کر ملالیا[1] مغلوں کو معلوم ہوا تو انھوں نے اس پر حملہ کر دیا اور اس نے خود میں مقابلہ کی سکت نہ پاکر قلعۂ دولت آباد میں پناہ لی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں بیجاپوری فوجیں مدد کو پہنچ گئیں، جس کے بعد مغلوں اور دکھنیوں میں کئی خونریز لڑائیاں ہوئیں اور گھمسان کے رن پڑے۔ محصورین نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن آخر کار غلہ کی کمی اور محاصرہ کی سختی سے تنگ آکر فتح خاں نے ۱۷ جون ۱۶۳۳ء کو قلعہ خان خاناں کے سپرد کر دیا مگر مہابت خاں نے خلاف عہد فتح خاں اور نظام الملک کو قید کرکے شاہ جہاں کے پاس بھیجا[2]۔ جس نے فتح خاں کا وظیفہ مقرر کرکے نظام شاہ کو قلعہ گوالیار یعنی مغلوں کے شاہی قید خانہ میں قید کر دیا۔ ۔ ۔ ۔ عادل شاہ نے فتح خاں کو مدد بھیجتے وقت اپنے سفیر شیخ دبیر نامی کو عبد اللہ قطب شاہ کے پاس حیدرآباد روانہ کیا تھا جس نے قطب شاہی دربار میں حاضر ہوکر عرض کیا کہ مغلوں کے حملے ہو رہے ہیں اور ان سے دونوں سلطنتوں کی تباہی کا اندیشہ ہے لہذا بیجاپور اور گولکنڈہ کو متحد ہو جانا چاہئے۔ اس سفیر کا استقبال گولکنڈہ میں بڑے تپاک سے ہوا بجائے سابق سرد مہری کے گرمجوشی کا اظہار ہونے لگا اور تعلقات معاندانہ کے بجائے دوستانہ ہو گئے۔ اگرچہ یہ خاندان عرصہ سے ازدواجی رشتوں سے وابستہ تھے اور

---

[1] خافی خاں جلد اول صفحہ ۴۷۹ تا ۴۸۰

[2] حدیقۃ العالم ۳۵۲

سلطان محمد قلی کی ہمشیر جہاں آرا بیگم کی شادی ابراہیم عادل شاہ سے ہوئی اور اس کے بعد سلطان محمد قطب شاہ نے عادل شاہ کی بیٹی سے شادی کی تھی لیکن تعلقات کو زیادہ مستحکم اور استوار بنانے کے لئے سلطان محمد عادل شاہ نے خاقان جنت مکان سلطان محمد قطب شاہ کی بیٹی سے شادی کا پیام دیا۔ جسے عبداللہ قطب شاہ نے بخوشی منظور کیا چنانچہ بڑی دھوم دھام سے شادی ہونے کے بعد ۱۶۳۳ء میں رخصتی عمل میں آئی[1]۔

یہ شادی درحقیقت اس سیاسی خلفشار کا نتیجہ تھی جو شاہجہاں کے دکن میں آنے کی وجہ سے پیدا ہوا تھا چنانچہ فتح خاں پر حملہ ہونے پر نہ صرف عادل شاہ نے مدد بھیجی بلکہ قطب شاہ سے بھی مدد مانگی جہاں سے خفیہ طور پر روپیہ روانہ کیا گیا۔ مہابت خاں نے اپنی مشکلات دیکھ کر شہنشاہ کو لکھا کہ کسی شہزادہ کو امداد کے لئے روانہ کیا جائے شاہجہاں نے شجاع کو مع اس کے اتالیق سید مظفر کے روانہ کیا لیکن اس کی کاہلی اور عیش پرستی نے ناکامی کا منہ دکھایا۔ مہابت خاں نے شاہزادہ کو ساتھ لے کر قلعہ پرینڈہ کا دوبارہ محاصرہ کیا، جو اس وقت عادل شاہ کے قبضہ میں تھا لیکن چار ماہ تک محاصرہ کرنے کے بعد بے نیل و مرام واپس ہوا۔ شاہجہاں کو قلعہ دولت آباد دیکھنے کا بہت اشتیاق تھا۔ اسی زمانہ جھجھار سنگھ شکست کھا کر دکن کی طرف بھاگ آیا تھا۔ مہابت خاں اور شجاع کو محاصرہ پرینڈہ میں ناکامی ہوئی تھی دکنی سلطنتوں نے عرصہ سے پیشکش نہیں بھیجی تھی ان میں آپس میں مغلوں کے مقابلہ میں اتحاد اور معاہدے ہو رہے تھے جو مغل سلطنت کے مفاد کے خلاف تھے۔ اسی زمانہ میں ساہو نے نظام الملک کے خاندان سے ایک بچے کو لے کر برائے نام تخت نشین کر کے لوٹ مار بھی شروع کر دی تھی اس لئے شاہجہاں نے دکن جانا ضروری سمجھا۔ عبدالحمید لاہوری لکھتا ہے " عادل خاں از مستی بادہ ناخوردی جمع از فتنہ ... نظام الملکیہ را، خصوصاً ساہو فساد خو کہ بعضی محال ملک بے نظام بہ تصرف آوردہ بود ہر لحظہ دود سودا از کانون سر بے مغزش سر بر می زد اعانت نمودہ در ارسال پیشکش تعلل می ورزید و قطب الملک نیز عروہ وثقائے بندگی و حبل متین عبودیت از دست دادہ با عادل خاں راہ موافقت می پیمود[2]"

شاہجہاں گولکنڈہ سے زیادہ ناراض تھا کیونکہ یہاں کے سلاطین نہ صرف پیشکش نہ بھیجتے اور عادل شاہ کی مدد کرتے تھے بلکہ مساجد میں شاہ ایران کے نام پر خطبہ پڑھا جاتا اور خلفائے ثلاثہ کو علانیہ برا بھلا کہا جاتا۔ ان

---

[1] حدیقۃ العالم صفحہ ۳۳۷ تا ۳۴۵

[2] عبدالحمید جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۲۵

حالات کو سن کر شاہجہاں نے مکرمت خاں دیوان بیوتات کو بیجاپور بھیجا اور عبداللطیف گجراتی کو ایک فرمان دیگر گولکنڈہ روانہ کیا جس کا خلاصہ یہ ہے:-

"بہ بسامع جاہ وجلال رسیدہ کہ در ملک آن قطب فلک شوکت علی رُوس الاشہاد سب اصحاب کبار " " " " می نماید و آن ایالت پناہ منع نمیکند کہ آیات قرآن مجید و فرقان حمید دلالت میکند بر فضل ایشاں ..." برایں از روئے ارشاد حکم می فرمائیم کہ (۱) از ملک خویش ایں امر قبیح و فعل شنیع و بہ سزائے اعمال شریر ساند بنا برایں از روئے ارشاد حکم می فرمائیم کہ (۱) از ملک خویش ایں امر قبیح و فعل شنیع برطرف گرداند و اگر بدبختے از بے سعادتی مرتکب شود اورا سیاست نماید و اگر چنیں نخواہد کرد " " " " " در ین صورت بر ما لازم است کہ در مقام تسخیر آں ملک شویم " " " " و دیگر بعرض رسید کہ (۲) کہ خطبہ را در آن ملک بنام فرمانروائے ایران می خوانند - ہرگاہ آں ایالت پناہ دعوئ مریدئ ما می نمودہ باشد با فرمانروائے ایران چہ ارجوع دارد - باید کہ بعد ازیں نام فرمانروائے ایران در خطبہ مذکور نہ سازد و دراں ملک خطبہ بنام نامی والقاب سامی ما مزید باشد و دیگر مبلغ کلی از بابت پیشکش آں ایالت و شوکت پناہ را باید داد چنانچہ تفصیل آن و راتے کہ بدستخط دیوانیان کرام رسیدہ و ہمراہ ایں فرمان عالی شان فرستادہ شدہ معلوم خواہد شد آن را ادا نماید " " " " " " خدمتے کہ ازاں مرحوم (سلطان محمد قطب شاہ) بہ وقوع آمدہ ایں ہمہ عنایت پادشاہ نسبت بآن قطب فلک ایالت می فرمائیم و آں ملک را با و مرحمت نمائیم و در عوض مبلغ مذکور جواہر نفیسہ و مرصع آلات ثمینہ و فیلان بے عیب کلاں نامی مثل ڈاک سمندر و لشکر کہ پدر او بہ عنوان پیشکش فرستادہ بود " " " " روانہ درگاہ والا گردد"[1]

ان مطالبات کے بعد مطالبہ کیا گیا تھا کہ یہ پیشکش ایام نوروز میں دولت آباد پہونچ جائے عدم تعمیل کی شکل میں حملہ کی دھمکی دی گئی تھی - ۲۱ فروری ۱۶۳۶ء کو شاہجہاں دولت آباد پہونچا اور اپنی فوج کو جو پچاس ہزار سپاہیوں پر مشتمل تھی تین حصوں میں تقسیم کر کے قطب شاہی، عادل شاہی، اور نظام شاہی علاقوں پر خان دوراں، خان زماں، اور مہابت خاں کے تحت بھیجدیا اور حکم دیا کہ اگر عادل شاہ اور قطب شاہ اطاعت نہ کریں تو قرار واقعی تنبیہ کی جائے - خان دوراں مع چند بڑے سرداروں کے قطب شاہی علاقوں پر حملہ کے لئے

[1] عبدالحمید جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۳۰ تا ۱۳۲

قندھار اور نامدیڑ کی طرف روانہ ہوا۔ اسے حکم ہوا تھا کہ اس علاقے میں، جو عادل شاہی اور قطب شاہی سرحد ہے قیام کرے اور تاخت و تاراج کرکے اودسہ اور اودگیر کے قلعوں کو فتح کرلے چنانچہ اس نے اس علاقہ میں پہونچ کر لوٹ مار شروع کی۔ عبداللہ قطب شاہ کو حالات معلوم ہوئے تو اس نے مدد کے لئے ایک جرار فوج بھیجی اور جنگ کے لئے تیار ہونے کا حکم دے دیا۔ اس اثنا میں شاہجہاں کو اطلاع ملی کہ عادل شاہ نے فرمان کی خلاف ورزی کی اور اودسہ و اودگیر کے قلعہ داروں کو روپیہ اور فوج سے مدد دے رہا ہے! اس کے علاوہ ساہو نے اس کی پناہ لی اور عادل شاہ نے اس کی مدد پر رندولہ خاں کو مامور کیا۔ شاہجہان نے حکم دے دیا کہ تمام سردار متفق ہوکر عادل شاہی سلطنت کو تاخت و تاراج کریں لیکن اطاعت کرنے کی صورت میں لوٹ مار اور قتل و غارت سے ہاتھ اٹھالیں۔

واقعہ یہ ہے عادل شاہ کو سفارت کا علم ہوا تو اس نے حسب سابق پانچ کوس آگے بڑھ کر فرمان کا استقبال کیا لیکن دیگر مطالبات کے تصفیہ میں لیت و لعل کر رہا تھا۔ مغل حاجب، مکرمت خاں نے شہنشاہ کو اطلاع دی جس پر اس نے تاخت و تاراج کرنے کے احکامات دئے اور مغل لشکر نے بہت جلد کئی قصبوں اور گاؤں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا۔ یہ حالت دیکھ کر عادل شاہ سخت پریشان ہوا اور اس نے میر ابوالحسن اور قاضی ابو سعید کو شہنشاہ کی خدمت میں بھیجا جنہوں نے آصف خاں کے ذریعہ حاضر ہوکر عادل شاہ کا عجز و انکسار ظاہر کیا اور اس کی طرف سے شہنشاہ کی خدمت میں پیشکشی حاضر کی۔

قطب شاہ نے مقابلہ کرنا بے سود جانا اور بغیر لڑے بھڑے شہنشاہ کے جملہ مطالبات قبول کرلئے چنانچہ خلفاء ثلاثہ پر تبرہ بند کرکے ان کے اسمائے گرامی کے ساتھ شہنشاہ ہند کا نام بھی شامل کرایا اور اسی پر اکتفا نہ کرکے سکہ پر بھی شہنشاہ کا نام ثبت کرایا اور پابندی سے پیشکش ادا کرنے کا وعدہ کیا چنانچہ عبدالحمید لاہوری لکھتا ہے کہ ” عبداللہ پذیرائی اوامرے کہ در منشور ثبت بود گشتہ خطبہ را باسمائے سامیہ خلفائے راشدین و القاب نامیہ بادشاہ عادل آئین بلند آوازہ گردانید و کر رہنگام خطبہ خواندن حاضر شدہ با نشاندن زر و دادن خلعت بخطیب سرمایہ سعادت اندوخت و سکہ را باسم سامی خدیو ہفت اقلیم مزین ساختہ از زر مسکوک بدرگاہ والا ارسال داشت۔ و بہ تنبیہہ پیشکش مغتر گردید“[1]

---

[1] عبدالحمید جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۴۵

صاحب حدیقۃ السلاطین نظام الدین صاعدی لکھتا ہے کہ شاہجہاں کے دکن نہ آنے کی خبر سُن کر قطب شاہ نے ملا تقیا ئی شیرازی کو مع تحفوں اور ہدیوں کے روانہ کیا تھا جو برہانپور میں آستان بوس ہوا! لیکن شاہجہاں نے دولت آباد ہو چکر عبداللطیف دیوان تن کو بطور حاجب گولکنڈہ روانہ کیا اور خان دوران کو قطب شاہی علاقہ کی سرحد پر بھیجدیا جو ناندیڑ پہنچا۔ یہ مقام قطب شاہی سرحد سے آٹھ فرسخ کے فاصلہ پر تھا۔ قطب شاہ نے حالات سُن کر اپنے بھی چند سردار بھیجدیئے کہ "در آں سمت شوکت قرار گیرید" اور جنگ کی تیاری کا حکم دیا۔ عبداللطیف نے گولکنڈہ کی تیاریاں دیکھ کر لکھا کہ مصلحت اسی میں ہے کہ گولکنڈہ پر سختی نہ کی جائے اور صرف پیشکش پر اکتفا کریں ورنہ ایسا نہ ہو کہ پیشکش بھی ہاتھ سے جائے۔ اس کے بعد وہ لکھتا ہے کہ "از جانب عالی حضرت شاہجہاں این تکلیف نیز واقع شدہ بود۔ چنانچہ قبل ازیں در اعیاد وجمعات بہ روش منابر فاتحہ سلاطین صفوی نژاد را در مقدم فاتحہ ایشاں می خواندند بعد ازیں بجائے آں فاتحہ حضرت شاہجہاں بخوانند" اس کے لئے قطب شاہ کسی طرح راضی نہ ہوتا تھا لیکن ملا عبداللطیف نے اپنی چرب زبانی سے شہنشاہ کا یہ مطالبہ بھی منوالیا[1]

نظام الدین کا یہ بیان کہ شاہجہاں نے اس خوف سے کہ کہیں پیشکش بھی ہاتھ سے نہ جائے قطب شاہ سے صلح کرلی، حالات اور واقعات دیکھتے ہوئے غلط معلوم ہوتا ہے بلکہ اس کا سبب یہ تھا کہ قطب شاہ نے اطاعت کرلی تھی اور ججھار سنگھ کے بھائی اور بیٹے کو گرفتار کر کے بھیجدیا تھا۔ شاہجہاں خونریزی پسند نہ کرتا تھا۔ اپنے جملہ مطالبات بغیر کسی لڑائی جھگڑے کے پورے ہوتے دیکھ کر اس نے حملہ نہیں کیا۔ چنانچہ عادل شاہ کے خلاف لشکر روانہ کرتے وقت بھی اس نے اپنے سرداروں کو یہی حکم دیا تھا کہ اگر عادل شاہ اطاعت کرے تو اس کے علاقہ پر حملہ نہ کیا جائے۔ خافی خاں کا بیان ہے کہ "ملا تقی فرستادۂ حیدرآباد مطابق حکم روز جشن نوروز با قدرے جواہر و پنج فیل کوہ شکوہ و دیگر تحف کہ قیمت جملہ یک لک و شصت ہزار روپیہ مع عرضداشت تہنیت سال نوروز رسیدہ ملازمت نمودند[2]" ۵ اگسٹ ۱۶۳۶ء کو شیخ عبداللطیف قطب شاہی حاجب شیخ محمد طاہر کے ساتھ واپس آیا۔ اور مطالبہ کے مطابق چالیس لاکھ روپیہ نقد وجنس از جواہر گراں بہا و مرصع آلات اور سو ہاتھی نر و مادہ پیش کئے جن میں سے دو ہاتھیوں کا ساز و سامان سونے اور دو کا چاندی کا تھا۔ ان کے علاوہ

[1] حدیقۃ السلاطین قلمی، دفتر دیوانی
[2] خافی خاں جلد اول صفحہ ۵۲۲ و عمل صالح جلد ۲ صفحہ ۱۶۱

پچاس عربی گھوڑے مع طلائی و نقرئی ساز و سامان و دیگر اشیائے نفیسہ پیش کئے۔

قطب شاہ نے لکھا تھا کہ "این مرید موروثی از صدق اعتقاد و وفور اخلاص تعہدی نماید کہ ہموارہ دریں ملک خطبہ چاریار با صفار ... " مزین بنام نامی و لقب گرامی بندگان اعلیٰ حضرت " " " درجمع و اعیار لاینقطع میخواندہ باشد و ہرگز پیرامون روش کہ سابقا خواندہ اند نگردند و پیوستہ بہ زر سرخ و سفید سکہ مبارک از درگاہ عالم پناہ کندہ فرستادہ اند می زدہ باشند و نیز قبول نمودم کہ از ابتدائے سن سنہ جلوس مقدس مبلغ دو لک ہون را کہ ہشت لک روپیہ می شود از جملہ چار لک ہون بابت نظام الملک سال بسال بے عذر و اہمال سرکار خاصہ شریفہ واصل سازم بہ ہیچگونہ اگر بادشاہزادہ والا گہر بلند اختر نظام بخش صوبہ دکن باشند بخدمت ایشاں بفرستم یا بہر یک از عہدہائے آں دولت ابد اتصال کہ پرداخت صوبہ مذکور برائے زرین او مغرض رسانم و ہشت لک روپیہ از جملہ سی و دو لک روپیہ پیشکش تا آخر سنہ بالقطع بریں نیازمند درگاہ مقرر شدہ بود باقی ماندہ با دو لک ہون سال متصل کہ سنہ جلوس مبارک باشد بدرگاہ معلیٰ بفرستم و آنچہ تفاوت قیمت اسپاں وغیرہ با موافق قیمت حضور اشرف نسبت بقیمت گولکنڈہ از پیشکش حال مشخص شود ایں مرید موروثی تعہد می نماید کہ بلا عذر واصل خزانہ عامرہ سازد و در سنوات آئندہ ہم اگر جنسے در جملہ زر پیشکش فرستادہ شود ہمیں طریق سلوک باشد و بعد ازیں ہمیشہ با اولیائے دولت عظمیٰ از صمیم قلب یکرنگ و موالف با مخالفاں از تہ دل دشمن باشم"[1]

چونکہ قطب شاہی اطاعت کر رہے تھے جو دکنی سیاسیات اور عادل شاہ کے مصالح کے خلاف تھا اسے خوف ہوا کہ شہنشاہ کے جانے کے بعد عادل شاہ اس کو نقصان نہ پہونچائے لہذا اس نے درخواست میں لکھا کہ "طریقہ عہدہائے دولت کہ صوبہ دار دکن باشند آنکہ چوں ہمچشماں بسبب پیش قدمی ایں نیازمند در قبول اطاعت و بندگی درگاہ جہاں پناہ کمر بغاوت من جہت بستہ اند اگر احیاناً عادل خانیہ بعد ازیں معاودت رایات عالیات از کوتہ اندیشی و نا عاقبت بینی دست تطاول بملک ایں نیازمند دراز کنند ایشاں در دفع شر آنہا از من و ملک من مدد و معاون باشند و اگر باوجود آنکہ ایں نیازمند طلب امداد و اعانت نماید قصور دا

[1] عبدالحمید جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۶۹

دکن متغافل نگذارند و عادل خانیہ بعنف و تعدی از یں نیاز مند مبالغ نگیرند آن مبلغ دریں ہشت لک روپیہ پیشکش ہر سالہ مجرا باشند۔[1]

عبداللطیف کے ہمراہ نہال چند جوہری جواہرات کے انتخاب اور تعین قیمت کے لئے گیا تھا اس نے قطب شاہ کے ہاتھ میں یاقوت جڑی ہوئی ایک قیمتی انگوٹھی دیکھی اور واپس آکر شہنشاہ سے تعریف کی شہنشاہ نے حکم دیا کہ قطب شاہ کو وہ انگوٹھی بھیجنے کے لئے لکھا جائے۔ قطب شاہ نے نوشتہ پاتے ہی وہ انگوٹھی جس کے یاقوت کا وزن بارہ رتی تھا اور بہت خوبصورت تھی شہنشاہ کی خدمت میں بھیجدی اس کی قیمت پچاس ہزار روپیہ آنکی گئی اور پیشکش کی کمی میں محسوب کی گئی۔ چونکہ قطب شاہ نے شہنشاہ کی تصویر طلب کی تھی اس لئے شہنشاہ نے ایک تصویر اور اس کے ساتھ چند تحفے مع عہدنامہ نوشتہ ۷ ربیع الثانی سنہ ۱۰۴۶ھ محمد زاہد کے ذریعہ شیخ محمد طاہر صاحب گولکنڈہ کے ساتھ روانہ کئے۔ اس عہدنامہ میں قطب شاہ کے سکہ و خطبہ جاری کرنے اور مطیع ہونے پر اظہار خوشنودی کیا گیا تھا اور قطب شاہ سے وعدہ تھا کہ اگر تم اطاعت پر ثابت قدم رہے تو مجھسے یا میری اولاد سے تم کو کبھی ضرر نہ پہونچے گا۔[2]

قطب شاہ نے شہنشاہ کے تمام مطالبات پورے کئے تھے اور معلوم ہوتا ہے کہ جن جن چیزوں کی فرمائش ہوئی تھی سب شہنشاہ کو وصول ہو چکی تھیں اور اب قطب شاہ کا خزانہ جواہرات اور نفائس سے خالی ہو چکا تھا چنانچہ خواجہ محمد زاہد کے پہونچنے پر جو یاد داشت قطب شاہ نے بھیجی اس میں لکھا ہے کہ فیل گجراتی جس کے لئے اعلیحضرت نے تحریر فرمایا تھا فرمان آنے سے قبل ہی روانہ کیا جاچکا ہے؛ امید کہ اب تک پہونچ گیا ہوگا۔ میرے پاس اس سے بہتر ہاتھی نہیں ورنہ حاضر خدمت کرتا۔ عرضداشت خالی بھیجنی مناسب تھی اور میرے پاس کوئی تحفہ قابل فرستادگی باقی نہیں رہا، اسلئے پریشان تھا اتفاقاً اسی اثنا میں یک جرا یک الماس اسی وزن کا لایا جس وزن کا بھیجا جاچکا ہے میں نے اسے خرید لیا اگرچہ اکیلا بھیجنا اچھا نہیں معلوم ہوتا لیکن بحالت مجبوری وہی ارسال خدمت ہے۔[3]

عہدنامہ، عرضداشت اور حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ قطب شاہ نے اطاعت قبول کرلی تھی اور حدیقۃ السلاطین کا یہ بیان کہ شاہجہاں نے قطب شاہی عساکر کے خوف اور عبداللطیف کے لکھنے سے صرف پیشکش پر اکتفا کیا تھا، قابل غور ہے۔ عادل خاں کی عرض پر کہ اس کے پاس اب کوئی ہاتھی نہیں رہا شہنشاہ کے حکم سے عہدنامہ کے ساتھ ایک اچھا ہاتھی بھیجا گیا۔

---

[1] عبدالحمید جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۰۰ تا ۱۰۰ [2] ایضاً صفحہ ۲۰۹ تا ۲۱۱ [3] ایضاً صفحہ ۲۱۳ تا ۲۱۵

معلوم ایسا ہوتا ہے کہ اس کے ساتھ جس نے بلاجنگ وجدل کے اطاعت کی وہی بلکہ اس سے سخت برتاؤ کیا گیا جیسا کہ اس کے ساتھ جس نے شاہی لشکر کو کافی نقصان پہنچایا تھا۔ بلکہ عہدنامہ کے شرائط و نتائج سے معلوم ہوتا ہے کہ گولکنڈہ کو یہ صلح اگر اسے صلح کہا جا سکتا ہے، بمقابل عادل شاہ بہت مہنگے داموں میں خریدنی پڑی کیونکہ عادل شاہ کو بہت سے سابق اور نئے مفتوحہ نظام شاہی قلعے دیدیے گئے جن کی آمدنی اسی لاکھ روپیہ تھی۔ ہٹلر کا قول ہے کہ کمزوری سب سے بڑا گناہ ہے۔ اسی گناہ کا خمیازہ قطب شاہ کو اچھی طرح بھگتنا پڑا۔ شہنشاہ نے اس کی اطاعت سے خوش ہو کر اتنا ضرور کیا کہ اسکی درخواست پر چار لاکھ ہون میں سے جو گولکنڈہ نظام الملک کو دیتا تھا دو لاکھ معاف کر دیئے اور عادل شاہ کو اپنے طویل فرمان نوشتہ ۱۶ مئی سنہ ۱۶۳۶ء میں علاوہ دیگر سیاسی مطالبات کے قطب شاہ کے متعلق لکھا کہ چونکہ قطب شاہ نے ہمارے جملہ احکام کی تعمیل کی ہے لہذا "می باید کہ آن عدالت پناہ کہ کلاں ترین دنیاداران دکن و راس رئیس آنہا و بجائے برادر کلاں آن قطب فلک ایالت است اصلاً و مطلقاً در مقام رسانیدن ضرری بملک آن قطب فلک شوکت نشود و متعرض محال متعلقہ او نگردد و تکلیف داون چیزی از نقد و جنس بآن قطب فلک ایالت نکند و بہانہ او نسازد و یا چیزی دیگر کہ از قدیم الایام میان آبائے آن عدالت پناہ و قطب ابہت متعارف بودہ اکتفا نماید و این مقدمہ را نیز شرائط پیمان قرار دادہ اند۔"[1]

ظاہر ہے کہ نظام شاہی حکومت کا تقریباً خاتمہ ہو چکا تھا اور اب اس میں کچھ بھی جان باقی نہ تھی ایسی شکل میں قطب شاہ قطعاً اسے مقررہ چار لاکھ ہون خراج نہ دیتا۔ شاہجہاں نے خود اپنی طرف سے خراج مقرر کیا اور مقررہ نظام شاہی خراج سے بھی دو لاکھ ہون ادا کرنے کا حکم دیا۔ انصافاً یہ خراج وصول کرنا قطعاً مناسب نہ تھا اس کے علاوہ عادل شاہ کو یہ حکم دینے سے بھی کہ وہ گولکنڈہ سے مقررہ نقد و جنس کے سوا کچھ وصول نہ کرے قطب شاہ کو کوئی فائدہ نہیں پہونچا۔

عادل شاہ کو جو فرمان بھیجا گیا تھا اسکے جواب میں اس نے جو درخواست بھیجی اس میں جملہ شرائط متعلق علاقہ نظام الملک سابق ہو دریکا اور قطب شاہ کو بصد ادب قبول کر کے اظہار اطاعت و وفاداری کیا اور اس طرح دکن کا سب سے بڑا رئیس بھی شہنشاہ دہلی کا مطیع و فرمانبردار ہو کر باجگزار حاکم بن گیا۔

درحقیقت یہ سنہ ۱۶۳۶ء کا معاہدہ ہی تھا جس کی بنا پر مغلوں کو گولکنڈہ کے معاملات میں بار بار دخل دینے کا موقع ملا قطب شاہیوں کے تعلقات اس معاہدہ کے بعد بھی ایران سے عرصہ تک باقی رہے ان کے دلوں میں مغلوں کے خلاف نفرت و عداوت پرورش پاتی رہی اور مغل حاجب اندرونی معاملات میں بُری طرح مداخلت کرتے رہے۔

محمد عبدالوہاب مسلم۔ ایم اے۔

---

[1] عبدالحمید جلد اول حصہ دوم صفحہ ۱۷۰ تا ۱۷۱ و خافی خاں جلد اول صفحہ ۵۳۴۔

سقراط اور اُس کی موت

اقربا میرے کریں خون کا دعویٰ کس پر؟

یونان کے دارالسلطنت اتھینیہ میں سفرونیکس نام ایک بُت تراش تھا۔ اُسی کو سقراط کے باپ ہونے کی عزت حاصل ہے۔ ہوش وحواس سنبھالتے ہی سقراط نے بھی یہی خاندانی صنعت سیکھنی شروع کی جس کی ان دنوں یونان میں بہت ہی قدر تھی۔ لیکن اسی اثنا میں قریطو نامی ایک دولتمند فلسفی نے اس کی طباعی وذہانت کا اندازہ کرکے اسے تحصیل فلسفہ کی طرف متوجہ کیا اس طرح سقراط اپنا آبائی کام چھوڑکر مسایل الٰہی اور رموز حکمت دریافت کرنے میں منہمک ہوگیا ان دنوں اس نے بندقلیس نام ایک حکیم کے اصولوں کی پیروی کی۔

کچھ عرصہ کے بعد اس نے ایک جانباز سپاہی کی حیثیت سے فوجی خدمات بھی انجام دیں عربی محققین کا قول ہے کہ اس زمانہ میں یونانی فلسفیوں اور حکیموں کی قدر بطور مذہبی پیشواؤں کے کرتے تھے اور لڑائی کے موقع پر بھی تبرکاً فوج کے ساتھ لیجایا کرتے تھے۔ اسی رسم کے مطابق یونان کا فرمانروا ایک مرتبہ سقراط کو اپنی فوج کے ساتھ میدان جنگ میں لے گیا مگر سقراط بجائے سپاہیوں میں رہنے اور ان سے ملنے جلنے کے ایک خلوت کے مقام میں بیٹھا رہتا۔ اور جب آفتاب نکلتا تو دھوپ کھانے کے لئے باہر آبیٹھتا۔ ایک دن اتفاقاً بادشاہ اس طرف سے گزرا۔ اس کی طرف دیکھتے ہی بادشاہ نے کہا کہ "آپ مرے پاس کیوں نہیں

آتے؟" جواب دیا "فرصت نہیں ہوتی" پوچھا "آخر آپ کیا کام کرتے ہیں؟" کہا "صرف وہی کام جس سے زندگی رہ سکے" بادشاہ نے حیرت سے کہا "یہ کون بڑی چیز ہے یہ تو آپ کے لئے میرے پاس ہر وقت موجود ہے جب اور جس وقت آیئے حاضر کروں گا" سقراط نے کہا کہ "اگر یہی امید ہوتی تو میں کبھی آپ کا دروازہ نہ چھوڑتا" اب بادشاہ نے یہ بات چھوڑ کر پوچھا میں نے سنا ہے کہ آپ کہتے ہیں "بت پرستی سے نقصان پہنچتا ہے" سقراط بولا "نہیں یہ تو میں نے نہیں کہا" پوچھا "پھر کیا کہا تھا؟" بولا "میرا تو یہ قول ہے کہ بت پرستی بادشاہ کے لئے مفید ہے اور سقراط کے لئے مضر۔ اسی لئے کہ بادشاہ اس مذہب کے ذریعہ رعایا کا انتظام کرتا ہے اور خراج حاصل کرتا ہے بخلاف اس کے سقراط کو یقین ہے کہ بت پرستی سے نہ کوئی نفع ہو سکتا ہے اور نہ کوئی ضرر پہونچ سکتا ہے اسے تو ایک خالق مطلق پر اعتقاد ہے جو اسے روٹی دیتا ہے اور ہر برے اور بھلے کام کا اسے بدلہ دے گا۔" یہ سن کر بادشاہ نے کہا "اچھا فرمایئے آپ کو کسی چیز کی حاجت تو نہیں ہے؟" کہا "جی ہاں ہے اس قدر کہ گھوڑے کی باگ موڑ کر چلے جایئے اور میری دھوپ چھوڑ دیجئے" بادشاہ نے اس کی اس بے نفسی سے متاثر ہو کر اس کو خلعت فاخرہ اور بہت کچھ مال و زر دینا چاہا مگر سقراط نے انکار کیا۔ اور کہا کہ بادشاہ تو نے تو اس چیز کے دینے کا وعدہ کیا تھا جس سے زندگی کو قیام ہو حالانکہ دے وہ چیز رہا ہے جس سے موت کو قیام ہو۔ سقراط کو زمین کے پتھروں (جواہرات) گھاس کے ریشوں (کپڑوں) اور کیڑوں کے لعاب دہن (ریشمی کپڑوں) کی ضرورت نہیں ہے اور جس چیز کی اسے واقعی ضرورت ہے وہ جہاں چاہے اور جس جگہ ہو ہمیشہ اس کے پاس رہتی ہے" اس جواب نے بادشاہ کو ایسا لاجواب کیا کہ بجز اس کے کہ چپکے واپس چلا جائے اور کچھ بن نہ پڑی۔

اس کے بعد سقراط نے بہت دنوں تک طیماطاوس ایک زبردست فلسفی کی شاگردی کی اور اپنے فلسفیانہ مذاق میں زیادہ تر اسی کے نقش قدم پر چلتا تھا۔ تعلیم دینے کے زمانہ میں طیماطاوس اسے کچھ لکھنے کی اجازت نہ دیتا تھا بلکہ مجبور کرتا تھا کہ ہر چیز کو زبانی یاد کر لیا کرے۔ ایک دن سقراط نے اس سے کہا کہ آپ مجھے لکھنے کی اجازت کیوں نہیں دیتے؟ طیماطاوس بولا "علم الہی اور رموز حکمت کا مردار جانوروں کی کھال پر رہنا اچھا یا انسان کے دل پر" اگر راستہ میں کوئی شخص تم سے مسئلہ پوچھ بیٹھے تو کتاب دیکھنے کے لئے گھر دوڑے جاؤگے؟ یہ بات اس کے دل میں جم گئی اور اسی وجہ سے وہ اپنے تمام شاگردوں کو لکھنے اور تالیف و تصنیف سے منع کرتا تھا۔

وہ اپنے علمی ذوق میں اس قدر ڈوبا ہوا تھا اور علم و حکمت کی شرافت کس پایہ کا مانتا تھا کہ ان مسائل کا چمڑے یا حریر (ان نوں

کاغذ نہ تھا، پر لکھنا اس کے خیال میں بے ادبی اور گستاخی میں شامل تھا۔ وہ کہتا اور دعویٰ کرتا ہے کہ حکمت پاک اور مقدس چیز ہو نہ اس میں کوئی خرابی ہے اور نہ اس میں کسی قسم کی نجاست لہذا اس کی شان اس سے اعلیٰ و ارفع ہے کہ اس کے رموز لوح دل کے سوائے کسی اور چیز پر ثبت کئے جاویں اور اسی وجہ سے اکثر لوگوں کا خیال ہو کہ اس نے بجائے فائدہ پہونچانے کے علم و فضل کو ضرر پہونچایا ہے کیونکہ سوائے پڑھا دینے اور شاگردوں کو سکھا دینے کے نہ کبھی کوئی مضمون اُس نے لکھا اور نہ اپنے باغ علم کے خوشہ چینوں میں سے کسی کو لکھنے دیا تاہم دنیا میں حکمت و فلسفہ کا جاننا اور جس قدر رواج ہوا ہے سب اسی کی برکت ہے اس لئے کہ افلاطون اور ارسطو طالیس جو فلسفہ کے زبردست ارکان اور پہلے مروج تسلیم کئے جاتے ہیں دونوں نے اپنے چراغ علم اسی کے چراغ سے روشن کئے تھے

افلاطون سے بھی زیادہ زہد خدا پرستی اور علوم روحانیہ میں منہمک رہنا سقراط کی زندگی کا طرز عمل تھا دولت و حشمت کو وہ ذلیل اور ہیچ خیال کرتا تھا اور فخر و تمکنت کو انسان کا سب سے بڑا عیب۔ آخر اسی تصوف کے دریا میں غوطے لگاتے لگاتے الہیات کے آسمان پر پرواز کرتے کرتے اس درجہ کو پہونچ گیا کہ بے اختیار ہو کر صدائے توحید بلند کی۔ ملک و قوم میں ہر طرف بت پرستی کا رواج تھا اور صنم پرستی یونانیوں کا عام مذہب بنی ہوئی تھی۔

سقراط ایک پیغمبر کی شان سے بے خوف و خطر کہنے لگا کہ ان بتوں کی پرستش کو چھوڑو جو پتھر سے کاٹ کر بنائے گئے ہیں نہ بول سکتے ہیں نہ سن سکتے ہیں نہ ان میں کسی قسم کی حس و حرکت ہے۔ عبادت صرف اس ایک خدائے واحد بزرگ کے لئے ہے جو پاک و صاف ہے سب کا پیدا کرنے والا ہے حکیم و دانا ہے جسے ہر بات کی قدرت ہے اور ہر چیز اس کے اختیار میں ہے لہذا اسی کی پرستش کرو نیکی کرو برے کاموں سے بچو اور اپنی فحش حرکات سے باز آؤ۔

یہ خبر جیسے ہی مشہور ہوئی یونانیوں کا مذہبی مقتدا۔ بڑے بڑے بت خانوں کے پجاری اور سلطنت کی کونسل کے تمام ارکان بگڑ گئے ہر طرف سخت برہمی پھیل گئی اور آخر اثینیہ کے قاضیوں اور مجسٹریٹوں نے بالاتفاق اس کے واجب القتل ہونے کا فتویٰ دیدیا۔ فرمانروائے اثینیہ کو اگرچہ یہ فتویٰ ناگوار تھا مگر مجبور تھا اور اس کے اختیار سے باہر تھا کہ کونسل کے فتوے کو مسترد کر دے تاہم اس نے اتنی مہربانی ضرور کی کہ سقراط سے پوچھا کہ آپ جس طرح قتل ہونے کو پسند کریں وہی طریقہ عمل میں لایا جائے، سقراط نے زہر پیکر جان دینے کو پسند کیا اور یہی طریقہ منظور کر لیا گیا۔ ان دنوں معمول تھا کہ ہر سال ایک جہاز یونانیوں کی نذریں اور چڑھاوے کی چیزیں لیکر اپالو کے مندر کو جایا کرتا تھا۔ اپالو یونانیوں کا سب سے بڑا دیوتا تھا جو دنیا میں سورج کا

مثلاً خیال کیا جاتا تھا یہ جہاز جب تک واپس نہ آجاتا اور جبتک نذر و نیاز کی چیزوں کے قبول ہوجانے کا یقین نہ ہو لیتا اس وقت تک کسی مجرم کو موت کی سزا نہ دیجاتی۔ موسم خراب ہونے اور سمندر میں تلاطم ہونے کی وجہ سے اس زمانہ میں جہاز کی روانگی میں بہت دیر ہوگئی جس کی وجہ سے بیچارہ سقراط واجب القتل ٹھیرائے جانے کے بعد بھی کئی مہینے تک قید خانے میں پڑا رہا قید میں وہ نہایت ہی استقلال اور پامردی سے موت کا انتظار کرتا تھا یہ بھی غنیمت تھا کہ اس کے شاگردوں اور عزیزوں کو اجازت تھی کہ جس وقت اور جب چاہیں اس سے آکر مل جائیں۔

اب جہاز کے آنے میں دو ہی چار روز باقی رہ گئے اس کے شاگرد اور قدردان سہمے ہوئے تھے کہ قیامت کی گھڑی سر پر آیا چاہتی ہے انھیں دنوں اس کا شاگرد رشید افریطون قید خانہ میں آکر اس سے ملا اور کہا "جہاز آج ہی کل میں آنے والا ہے پھر اس کے آجانے کے بعد کوئی تدبیر بن نہ پڑے گی میں نے داروغہ محبس کو راضی کر لیا ہے کہ چار سو روپیہ لے کر آپ کو نکل جانے کا موقع دیدے آپ بس اتنا کیجئے کہ رات کو چپکے سے نکل کر روم میں چلے جائیے جہاں آپ آزادی سے رہیں گے اور کوئی آپ کا بال بیکا نہ کرسکے گا" سقراط نے کہا "افریطون تم جانتے ہو کہ میں چار سو روپیہ کا بندوبست نہیں کرسکتا نہ اتنا روپیہ نقد میرے پاس موجود ہے اور نہ اتنا اسباب رکھتا ہوں کہ اُسے بیچ کھوچ کر اتنا روپیہ فراہم کرسکوں"۔ افریطون بولا "میرا یہ مطلب نہ تھا کہ آپ روپیہ کی فکر کیجئے اس کا بندوبست میں کرلوں گا آپ صرف اقرار کیجئے کہ قید خانہ سے نکل کر چلے جایئے گا" اس کا جواب سقراط نے یہ دیا کہ "یہ سزا جو مجھے دی گئی ہے خود اپنے وطن اور قوم کی طرف سے دی گئی ہے تم دیکھ رہے ہو کہ ان لوگوں نے مجھے قید کیا ہے اور قتل کرنا چاہتے ہیں اور پھر یہ بھی جانتے ہو کہ میں اس سخت سزا کا مستحق نہیں ہوں نہ میں نے کوئی جرم کیا ہے نہ کسی کا کچھ بگاڑا ہے بلکہ میرا جرم صرف یہ ہے کہ ظلم کی مخالفت کرتا ہوں اور لوگوں کو کفر و الحاد اور خدا کی ناشکری سے روکتا ہوں بت پرستی کو بُرا کہتا ہوں اور شرک کی بُرائیاں ظاہر کرتا ہوں میری یہ حالت کسی طرح بدل نہیں سکتی جہاں جاؤں گا اور جب تک زندہ رہوں گا اسی اصول پر قایم رہوں گا اور یونہی لوگوں کو ہدایت کرنے کی کوشش کروں گا پھر روم میں کیا ہے جہاں جاؤں گا یہی حال ہوگا اور جس سرزمین پر رہوں گا یہی فساد کھڑا ہوگا اور اس کی سزا جب اہل وطن اور دوستوں سے یہ ملی ہے تو غیر قوم والے تو اس سے بھی سخت برتاؤ کریں گے انھیں تو ہم وطنی کا تھوڑا بہت پاس اور لحاظ بھی ہوگا مگر غیروں سے اتنی بھی امید نہیں کی جاسکتی۔

یہ سُن کر افریطون بولا اگر آپ کو اپنے اوپر رحم نہیں آتا تو اپنے اہل و عیال پر تو ترس کھائیے۔ سقراط نے کہا کہ اہل

حیثیت سے بھی میرا روم جانا مناسب نہیں ہے وہاں میرے بعد نہ ان کا کوئی حامی ہوگا نہ پرسان حال اور یہاں تم لوگ موجود ہو
جن سے ہر طرح لطف اور شفقت کی امید ہے آخر اقریطون لاجواب ہو کر چپ ہو رہا اور نہایت حسرت واندوہ کے ساتھ قیدخانہ
سے چلا آیا اس کے تیسرے دن قیامت کی گھڑی آگئی جبکہ سقراط دنیا سے رخصت ہونے والا تھا صبح ہوتے ہی قیدخانہ کے باہر
تمام شاگردوں کا ہجوم ہوگیا وہ لوگ ہجوم کئے ہوئے تھے کہ قیدخانہ کا داروغہ دروازہ کھول کر اندر سقراط کے پاس گیا پھر
وہاں کونسل کے گیارہ ارکان آئے اور چند لمحہ اس کے پاس ٹھیر کر چلے گئے اب سقراط کے پیروں سے زنجیریں کھول دی گئیں
جن میں ایام اسیری میں وہ غریب جکڑا رہا تھا اور شاگردوں وعزیزوں کو اجازت دی گئی کہ اپنے استاد اور عزیز کا آخری
دیدار کرلیں اجازت پاتے ہی سب لوگ اندر گئے اور سقراط کے آس پاس بیٹھ گئے ان لوگوں کو دیکھ کر یہ بے نفس حکیم یونان تخت
سے اتر کر زمین پر آبیٹھا اپنی رانیں کھول دیں۔ ان پر ہاتھ پھیرا بعض بعض جگہ انھیں ملا اور دبایا اور حاضرین کی طرف دیکھ کر کہا
خدا کی بھی کیا حکمت ہے کہ ایسی ایسی چیزوں کو جمع کردیا ہے جو باہم ایک دوسرے کی ضد ہیں کوئی راحت نہیں ہوتی جس کے
بعد الم نہ ہو اور کوئی الم نہیں ہوتا جس کے بعد راحت نہ ہو اس وقت تک سب لوگ خاموش بیٹھے نہایت حسرت سے اس کی صورت
کو دیکھ رہے تھے یہ جملہ اس کی زبان سے نکلتے ہی بحث و مباحثہ ہونے لگا اور جو جس کے دل میں آیا پوچھنے لگے چنانچہ میاس اور
قیدیوں نے نفس کے افعال کے متعلق سوال کیا اور سقراط نے اس کا اطمینان کشادہ خاطری اور خندہ پیشانی کے ساتھ جواب دیا گویا
اسے موت کی خبر ہونا تو درکنار یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ قیدخانے میں ہے سقراط نفس انسانی پر ایک نہایت دقیق معنی خیز
اور محققانہ لکچر دے رہا تھا اور لوگ حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے تھے کہ دل کا کتنا بڑا مضبوط ہے اور کس قدر بے خوف ہے
کہ موت کی ذرا بھی پروا نہیں کرتا اور ایسی نازک گھڑی میں بھی ایسا ثابت قدم ہے کہ معمولی اخلاق وعادات میں بھی کسی قسم
کا فرق نہیں آیا آخر میاس سے ضبط نہ ہوسکا اور بولا افسوس آپ سے کچھ پوچھتے ہی بنتا ہے اور نہ خاموش رہتے کچھ
پوچھتے ہیں تو آپ سے علیحدگی کے خیال سے دل بھر آتا ہے اور نہیں پوچھتے تو حسرت رہ جاتی ہے کہ ان رموز الٰہی کو آپ
کے بعد ہم کس سے پوچھیں گے۔ سقراط نے کہا میاس جو کچھ پوچھنا ہے شوق سے پوچھو تمہارے ان سوال سے میں خوش ہوتا ہوں
اور میرے نزدیک تو اس حال اور اس زندگی میں اور اس دوسرے حال اور دوسری زندگی میں کوئی فرق نہیں ہے
یہ تغیر کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ اس کا خیال میرے ذوق علم پر غالب آجائے اگرچہ اس انقلاب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ
ہم بہت سے نیک فاضل اور لایق دوستوں اور رفیقوں سے جدا ہوجاتے ہیں۔ مگر ان کو چھوڑ کر ہم ان سے بھی اچھے

اُن سے زیادہ فاضل و لائق دوستوں اور بھائیوں سے ملتے ہیں میں اب یہاں سے جاکر اسلاؤس۔ ایارس اور ریاقیاس سے ملوں گا نفس پر بحث ہونے کے بعد شاگردوں نے عالم کی حیات اور آسانوں کی حرکت کے متعلق سوالات کئے اور پوچھا کہ عناصر اربعہ کی ترکیب کیونکر ہے ان مسایل پر بحث کرکے سقراط نے سب کا اطمینان کردیا پھر دیر تک علوم الٰہی اور اسرار ربانی کے بہت سے نکات بیان کرتا رہا اور جب اچھی طرح سب کی تسلی و تشفی ہوگئی تو بولا۔ اب میں جانتا ہوں کہ وقت آگیا کہ غسل کرکے جہاں تک ممکن ہو عبادت کروں اور کسی کو اپنی میت کے غسل کی تکلیف نہ دوں۔ مجھے ارماانی نے بلایا ہے اور زاؤس کے پاس جانے والا ہوں (یہ بھی قدیم مشہور یونانیوں کے نام ہیں) اور تم بھی اپنے اہل وعیال کے پاس جاؤگے یہ کہتے ہی اُٹھا ایک کمرہ میں جاکر غسل کیا اس کے بعد دیر تک وہیں مصروف عبادت رہا اس وقت وہ عبادت کررہا تھا اور دوسرے کمرہ میں اس کے شاگرد اور پیرو بیٹھے باہم افسوس کررہے تھے اور بار بار ان کی زبان سے نکلتا تھا کہ افسوس کتنا بڑا حکیم اور پدر شفیق چھوٹا جاتا ہے اس کے بعد ہم سب یتیم ہوجائیں گے۔

سقراط عبادت کے کمرہ سے نکل آیا اور اپنے بچوں اور بیوی کو بلایا۔ ایک بڑا بیٹا تھا اور دو ننھے ننھے بچے تھے جنھیں سامنے بلاکر رخصت کیا کچھ سمجھایا بجھایا اور کہا بس اب جاؤ اس وقت موقع پاکر اقریطون نے کہا آپ ان بچوں اور اپنی بیوی کے متعلق ہمیں کیا حکم دیتے ہیں اور خود ہمارے لئے کیا فرماتے ہیں جواب دیا کچھ نہیں جو ہمیشہ کہتا رہا کہ اپنے نفسوں کی اصلاح کرو۔ وہی اب بھی کہتا ہوں اگر تم نے اس نصیحت پر عمل کیا تو مجھے بھی خوش کروگے اور اُن تمام لوگوں کو بھی جو میرے ہم خیال ہیں یہ کہہ کر خاموش ہوگیا اور سب شاگرد بھی خموشی سے اس کی صورت دیکھتے رہے اتنے میں ممبران کونسل کا ایک خادم یا یوں کہئے کہ عدالت کا سپاہی آیا اور حکیم اجل کی طرف دیکھ کر بولا اے سقراط! آپ جانتے ہیں کہ میں آپ کی موت کا باعث نہیں ہوں آپ کے لئے یہ حکم ان گیارہ ممبروں کا نافذ کیا ہوا ہے جو عدالت فوجداری کے رکن ہیں اور مجھے اس کی تعمیل کرنے کا حکم دیا گیا ہے جس کے بجالانے پر میں مجبور ہوں حالانکہ اقرار کرتا ہوں کہ آپ تمام لوگوں سے افضل و اعلیٰ ہیں لہذا اس جام زہر کو لے لیجئے اور نوش کیجئے۔ اس کے پیتے وقت جو اضطرابی اور بیقراری کی حالت طاری ہو اس کو صبر اور ضبط کے ساتھ گوارا کیجئے سپاہی کہنے کو تو اتنا کہہ گیا مگر ساتھ ہی آنکھوں میں آنسو بھر آئے اور بے اختیار روتا ہوا بلٹ پڑا سقراط نے اسی استقلال کے ساتھ نہایت شگفتگی اور بےنفسی سے کہا میں تمہارا کہنا مانونگا اور تم کو الزام نہیں دیتا یہ کہہ کر چند لمحہ سقراط خاموش رہا پھر اقریطون کی طرف متوجہ ہوکر پوچھا یہ شخص تو چلا گیا میرے لئے شربت مرگ کب لائے گا اور

ایک نوجوان سے کہا "اسے بلاؤ تو" نوجوان نے پکارا اس کے آواز کے ساتھ ہی سرکاری سپاہی آیا اور اس کے ہاتھ میں زہر کا جام تھا سقراط نے جام ہاتھ میں لے کر بے تامل بغیر کسی بیتابی کے اور نہایت بے پروائی کے ساتھ منہ سے لگا لیا۔ بلند مرتبت استاد کو جام زہر پیتے دیکھ کر شاگردوں میں ضبط کی تاب نہ رہی زار و قطار رونے لگے اور ہر طرف سے آہ و بکا کی آواز بلند ہوئی۔ سقراط نے پورا جام پی کر ان لوگوں کی طرف توجہ کی اُن کو اس آہ و زاری سے روکا اور سمجھانے لگا کہ اس طرح بے صبر ہونا چاہئے میں نے عورتوں کو اس وقت اس وجہ سے ہٹا دیا تھا کہ ان سے ضبط نہ ہو سکے گا۔ الغرض ایسی باتیں کیں اور ایسا حوصلہ بڑھایا کہ سب لوگوں کو اپنے اس فعل پر ندامت ہوئی اور خاموش ہو رہے سقراط اُٹھ کھڑا ہوا اور ادھر اُدھر ٹہلنے لگا گویا کسی تکلیف کو دبا رہا ہے۔ تھوڑی ہی دیر ٹہلا ہو گا کہ پیروں کی طاقت سلب ہو گئی اور اسی سرکاری آدمی سے مخاطب ہو کر بولا اب میرے پاؤں بوجھل ہو گئے اور مجھ میں چلنے کی قوت نہیں ہے اس نے کہا لیٹ جائیے سقراط بے تامل لیٹ گیا اور ایک نوجوان شخص پیر دبانے لگا۔ دباتا تھا اور بار بار پوچھتا کہ میرا دبانا آپ کو محسوس ہوتا ہے جواب دیا "نہیں" سرکاری آدمی بولا بس یونہی یہ حالت جب قلب تک پہونچے گی تو آپ ختم ہو جائیں گے۔

اب افریطون بیتابی کے ساتھ پکارا اور اے امام حکمت یہ کیا بات ہے کہ آپ کے حواس اور آپ کی عقل بھی ویسی ہے جیسی کہ ہماری ہے اس بارے میں کچھ ارشاد ہو اب سقراط میں بات کرنے کی طاقت نہ تھی مگر زور کر کے بولا میں تم سے وہی کہتا ہوں جو کچھ کہہ چکا ہوں یہ کہہ کر ہاتھ بڑھایا اور افریطون کا ہاتھ اپنے ہاتھ پر رکھ لیا۔ افریطون نے کہا جو فرماتے ہیں فرمائیے اس کا جواب سقراط نہ دے سکا بلکہ اب آنکھیں پتھرا گئیں مگر پھر بھی اتنا جملہ اور اس کی زبان سے نکلا "میں اپنی جان اُس خدا کے سپرد کرتا ہوں جو سب کا سچا معبود ہے" اسی جملہ کے ساتھ اُس گراں پایہ حکیم فلسفی خداشناس، غواص دریائے معرفت کی زندگی کا خاتمہ ہو گیا۔

افسوس زمانے! تو نے کیسے کیسے لوگوں پر کیا کیا ظلم کئے ہیں لیکن مبارک ہے ایسی موت کہ دشمن اور قاتل تک رو رہے ہیں یونان نے یہ ایسا فعل کیا ہے جس سے زیادہ شرمناک فعل اس سے کبھی سرزد نہ ہوا ہو گا۔ اور کیا عجب کہ اس کے انتقام میں ایسی گمراہی سے اس قدیم متمدن اور زبردست قوم کا تنزل شروع ہوا ہو۔ کیونکہ چند ہی روز کے بعد ہم دیکھتے ہیں کہ یونان کی سلطنت خاک میں مل گئی اس کی آزادی ہمیشہ کے لئے چھن گئی اور وہ رومیوں کی ماتحتی میں ذلت و غلامی کی تکالیف برداشت کرنے لگا۔

شنکر موہن لعل (متعلم بی۔ اے آخری)

غزل

داستان اپنی تھی گویا بھول جانے کے لئے
داغ حسرت رہ گئے دل میں چھپانے کے لئے

کون سمجھے یہ کرشمہ سازیاں قدرت کی ہیں
شمع ہستی کو جلایا ہے بجھانے کے لئے

کچھ تجھے معلوم بھی ہے جذبۂ شوقِ وفا
وہ خفا ہم سے ہوئے ہیں آزمانے کے لئے

جذبہ الفت کی یہ ناقدردانی دیکھئے
شمع سوزاں رہ گئی آنسو بہانے کے لئے

سطح بیں! کاشانۂ ہستی کے یہ نقش و نگار
دستِ قدرت نے بنائے ہیں مٹانے کے لئے

پھر بنایا آشیاں گلشن میں بلبل نے تراب
پھر فلک تیار ہے بجلی گرانے کے لئے

سید تراب حیدر زیدی بی ایس سی ابدالی،

اقبال کی شاعری
میں
حُسن و عشق کا عنصر

جستجو کُل کی لئے پھرتی ہے اجزا میں مجھے حُسن بے پایاں ہے دردِ لا دوا رکھتا ہوں میں
ہر تقاضا عشق کی فطرت کا ہو جس سے خموش آہ وہ کامل تجلّی مدعا رکھتا ہوں میں
فیضِ ساقی شبنم آسا ظرفِ دل دریا طلب تشنۂ دائم ہوں آتش زیر پا رکھتا ہوں میں
محفلِ ہستی میں جب ایسا تنک جلوہ تھا حُسن پھر تخیل کس لئے لا انتہا رکھتا ہوں میں (اقبال)

(۱)

نفسیاتی رجحانات

حُسن سے متاثر ہونے کی صلاحیت ہر انسان میں کم و بیش موجود ہے اور اسی طرح حُسن میں محو ہو جانے اور حُسن کی

طرف کھنچ جانے یا حسن کو اپنی طرف کھینچنے کی صلاحیت بھی انسانی فطرت کا ایک عنصر ہے۔

شاعر میں یہ صلاحیتیں بدرجۂ اتم موجود ہوتی ہیں۔ جذبات اس قدر عمیق اور اس قدر وسیع ہوتے ہیں کہ جب ان میں جوش آتا ہے تو وہ اُس کی ذات میں سما نہیں سکتے، اور الفاظ اور نغمے بن کر اُبل پڑتے ہیں۔

حُسن شاعر کے جذبوں پر چھا جاتا ہے، اور جذبوں میں ایک تپش، ایک جوش، ایک بیتابی پیدا ہو جاتی ہو۔ یہ بیتابی عشق ہے اور جب یہ بیتابی اُس کے قلب کی لطافتوں، اور اُس کے دماغ اور ادراک کی مدد سے الفاظ و معانی کی شکل اختیار کر لیتی ہے تو شعر بن جاتی ہے۔ اسی لئے اگر عشقیہ شاعری کی صحیح تعریف کی کوشش کی جائے تو صرف انہی الفاظ میں اس کی تعریف کی جاسکے گی کہ وہ ایک انسان کے لطیف احساسات، اور بے چین جذبات کا عکس ہے اگر یہ عکس بے ساختہ پڑے تو شاعری حقیقی اور سچی ہے۔ اور اگر اس میں رنگ بھرنے کی کوشش کی جائے۔ یا کوئی اور مصنوعی دلکشی پیدا کی جائے تو عکس لاکھ خوبصورت ہو اُس میں وہ فطری حقیقت باقی نہیں رہے گی۔ جس طرح عشق ایک اضطراری جذبہ ہے اُسی طرح عشقیہ شاعری میں بھی اضطرار کی جھلک ہونا ضروری ہے اور یہی اضطرار شعر میں وہ کیفیت پیدا کر دیتا ہے کہ شعر "متحرک" ہو جاتا ہے۔

عشقیہ شاعری دل کی شاعری ہے، اور اقبال دل سے زیادہ دماغ کے شاعر ہیں۔ عشق ان کے نزدیک ایک اضطراری چھا جانے والا، محو کر دینے والا جذبہ نہیں، جس کا جادو انھیں، اور اُن کی پوری ہستی کو مسحور کر دے۔ عشق اُن کے نزدیک ایک حقیقت ہے اور وہ اس حقیقت تک پہنچنا چاہتے ہیں ان کے پورے کلام میں ایک نظم بھی ایسی نہیں جس سے یہ ظاہر ہو کہ وہ جذبات کے افسوں سے اس قدر مسحور ہیں کہ فطرت اُن سے خود بخود لکھوا رہی ہے۔ عشق اُن کی شاعری کا "باعث" نہیں "مقصد" ہے۔

"عشق" کا جو تصور اقبال کے ذہن میں ہے وہ ایک مستقل اور عظیم الشان حقیقت کا تصور ہے۔ اور اس حقیقت کی جستجو، اس کو سمجھنے اور اس تک پہنچنے کی کوشش اس امر کو ظاہر کرتی ہے کہ شاعر کی ہستی اس حقیقت سے بالکل الگ ہے۔ کلیم دور سے طور کے شعلوں کو دیکھ رہا ہے اور اُن تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہے۔

اس تصور نے اقبال کے عشقیہ کلام میں دو خصوصیتیں پیدا کر دیں۔ ایک تو یہ کہ عشق ہمیشہ ایک فلسفیانہ مبحث بنتا گیا۔ دوسرے یہ کہ فطری لطافت، "سادگی اور پرکاری"، اور نازک اور لطیف شعریت جو دل پر اثر کرنے والی شاعری کی جان ہے اُن کے عشقیہ کلام میں تقریباً مفقود ہے۔

اقبال شاعری کے لئے ہمیشہ ایک "مقصد" کو اپنا منتہائے نظر بنائے رہے۔ خود "شعر" کی اہمیت اُن کے مقصد میں زیادہ نہیں تھی۔ اُن کا پیغام الفاظ کی طرح جذبات سے بھی "ماورا" رہا۔ اور ہر وہ شاعر جو پیغام دے کرتا ہے محض جذبات کا مجموعہ نہیں ہوتا۔ وہ ایک قوم، ایک جماعت کے جذبات کا رہبر ہوتا ہے محض اس پیغام کے اثر سے اقبال کی عشقیہ شاعری میں ذاتی اور شخصی رنگ ہمیشہ پھیکا رہا جہاں انھوں نے عشق کے جذبے سے اپنی ذاتی تاثر کا اظہار کیا ہے اُن کی شاعری پھیکی اور بے مزہ ہوگئی ہے۔ لیکن جہاں انھوں نے عشق کا بلند اور پاکیزہ تر تصور ایک قوم کے لئے لائحہ عمل بنا کر پیش کیا ہے وہاں اُس میں رفعت اور بلندی پیدا ہوگئی ہے۔

اسی شان رہبری نے عشق کو ان کے نزدیک ایک تصور بنا کر پیش کیا ہے۔ ایسا تصور جو ایک شخص نہیں بلکہ ایک قوم کی جذباتی اور روحانی زندگی کو گرما سکے۔

عشق اقبال پر چھا نہیں جاتا۔ وہ حسن کو دیکھنے اور عشق کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اور اُن کا زاویہ نظر اس قدر ہمہ گیر ہے کہ وہ چاہتے ہیں کہ وہ اُسے ایک پوری قوم کا زاویہ نظر بنا سکیں۔

(۲)

اقبال کے کلام میں حسن و عشق کے عنصر کی نشو و نما

اقبال کے مشق سخن کے زمانہ میں داغ و امیر کا طوطی ہندوستان میں بول رہا تھا "زبان" کی خوبیوں کی طرف شعر فہموں اور شاعروں کی توجہ تھی۔ اور گویہ شاعری برائے نام عشقیہ شاعری تھی۔ مگر اسی کی وجہ سے عشقیہ شاعری کا صحیح مفہوم مٹ چکا تھا۔

"غزل" جب اردو میں آئی تو تصنع بھی اُس کے ساتھ آیا۔ اور جہاں تصنع کا زور رہا۔ جذبات کی صحت ختم ہوجاتی ہر لفظی خوبیاں، جب شاعری کا اصول بن جاتی ہیں تو جذبات کے فطری اظہار کی شاعری میں صلاحیت نہیں رہتی۔ اُردو شاعری سے شعر کی رُوح پرواز کرچکی تھی۔ مُردہ جسم کی آرائش کی جا رہی تھی، اور مصری ممی کی طرح، طرح طرح کے مسالے لگا کر اس جسم کو باقی رکھنے کی کوششیں ہو رہی تھیں۔

اس ماحول میں اقبال نے شاعری شروع کی۔ لیکن اسی ماحول کے ساتھ ساتھ ایک نیا ماحول بھی پیدا ہوگیا تھا۔

اور وہ سرسید اور حالی کا پیدا کیا ہوا ماحول تھا۔ مغربی شاعری کے اثرات بھی پڑنے لگے تھے۔

اقبال کی ابتدائی غزل گوئی میں داغ کا رنگ بہت نمایاں ہے۔ داغ سے انھوں نے اصلاح بھی لی تھی اور داغ کے وہ بہت معترف تھے۔ داغ کے مرنے پر انھوں نے ایک نوحہ بھی لکھا۔ امیر کی شاعری کا بھی اُن پر کافی اثر تھا۔ خود لکھتے ہیں۔

عجیب شئے ہے صنم خانۂ امیر اقبال　　میں بت پرست ہوں رکھ دی کہیں جبیں میں نے

اقبال کا تغزل بے روح اور بے رنگ تھا۔ ابتدا سے لے کر آخر تک کبھی ان کی غزلیں حقیقت کا خفیف سا اثر بھی پیدا نہ کر سکیں کہیں اُن میں لطف اور سوز و گداز نہیں۔

بعد کی غزلوں میں فلسفیانہ خیالات نے اور علوِ تخیل نے جا بجا جذبات کے فقدان کی تلافی کی ہے مگر عشقیہ رنگ کہیں نہ بن سکا۔

لیکن وہ دوسرا ماحول جو اقبال کی شاعری پر اپنا اثر ڈال رہا تھا یعنی حالی اور سرسید کا ماحول بہت کامیابی سے اقبال کو اپنے آپ میں جذب کر سکا۔ وہ مغربی شاعروں کے کلام کا مطالعہ کرتے رہے۔ اور اُن کا اثر بھی ان پر پڑتا رہا۔ اور رفتہ رفتہ اس بے روح تغزل اور اس حقیقت سے عاری شاعری کا ایک شدید ردعمل اقبال کی قومی، اخلاقی اور اُن نظموں میں ظاہر ہونے لگا جو انھوں نے مناظرِ قدرت یا قدرت کے اہم اجرام کو دیکھ کر یا اُن سے مخاطب ہو کر لکھیں۔

اس زمانہ میں اقبال کے ذہنی ارتقاء کے مطالعہ کے سلسلے میں ایک بہت اہم چیز معلوم ہوتی ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عشق کے جذبے کو ان کی فطرت سے جذباتی مناسبت سے زیادہ ذہنی مناسبت تھی۔ سب سے زیادہ جن مغربی شاعروں کا اُن پر اثر ہوا وہ گوئٹے۔ ورڈسورتھ، شکسپیر اور گرے تھے۔ ان میں سے کوئی خالص جذباتی شاعر نہ تھا۔ ہر ایک دل سے زیادہ دماغ کا شاعر تھا۔ اس اثر سے اقبال کی اس نفسیاتی کیفیت کا پتہ چلتا ہے کہ ان پر عشق جذبہ بن کر نہیں چھا سکتا تھا۔

فلسفے کے مطالعہ نے جہاں اقبال کے تمام تر زاویہ ہائے نگاہ کو ایک مستقل اور مکمل حیثیت دیدی۔ وہاں حسن و عشق کے متعلق بھی ایک خاص نقطۂ نظر کی تعمیر کی۔ فطرت ہی نے انھیں جذبات پرست طبیعت عطا نہیں کی تھی۔ فلسفے کے مطالعہ سے جو ذہنی ارتقا ہوا اُس نے عشق اور حسن کے مطالعے کو اُن کی شاعری میں بجائے جذبے کے ایک "فکر" بنا دیا اور جس طرح نیم فلسفیانہ اور نیم شاعرانہ فکر سے وہ زندگی کی اہم خصوصیتوں کو دیکھنے اور پرکھنے لگے انھوں نے عشق کو بھی دیکھنا اور پرکھنا شروع کیا۔

یہ وہ زمانہ تھا جب اقبال کی شاعری کا اہم ترین مقصد قومی شاعری تھی۔ عشق کے متعلق اُن کا تصور تشکیل پا رہا تھا لیکن ابھی یہ تصور "پیغام" نہیں بنا تھا وطنیت اور قومیت اُن کے اہم ترین پیغام تھے۔

یورپ جانے کے بعد اُن کے نقطۂ نظر میں بہت اہم تبدیلی ہونے لگی۔ وطنیت جو اُن کی شاعری کے پہلے دور کا پیغام تھا ان کو باطل نظر آنے لگا۔ اسلامیات کے مطالعے اور گوناگوں مختلف اور متضاد اثرات سے ایک نئے اہم پیغام نے اُن کی ہستی کو گھیرنا شروع کردیا تھا۔ پان اسلامی تحریک ان کو اس قدر متاثر کرگئی کہ وہ وطنیت کے جوش کو بھول گئے۔ اور یہ پان اسلامی تحریک جو مادی اور روحانی دونوں پہلوؤں پر مشتمل تھی، اُن کی ہستی میں ایک اہم انقلاب پیدا کرنے لگی۔

یہ اُن کے قیام یورپ کا زمانہ تھا۔ وطنیت کے تخیل کو وہ باطل قرار دے چکے تھے۔ اور پان اسلامزم کا اثر مستقل اور مکمل طور پر چھانے نہیں پایا تھا اور اس زمانے میں جب کہ اُن کی ذات اُن کی ہستی میں نئی تعمیر ہو رہی تھی۔ ایک نئے تخیل اور نئے تفکر کی دنیا بن رہی تھی، ان کی شاعری نسبتاً کم اہم اور ذاتی اور شخصی احساسات کے اظہار کا ذریعہ بن سکی۔ اُن کی شاعری کا اصل مقصد یعنی اُن کا "پیغام" ابھی مکمل نہیں ہوا تھا۔ اسی لئے اُن کی شاعری اس زمانے میں بڑی حد تک شخصی اور ذاتی شاعری بنی رہی۔ جا بجا انھوں نے جذبات نگاری کی کوشش کی۔ چند عشقیہ نظمیں لکھیں عشق کے متعلق اشعار کہے۔ ان میں کسی نظم میں درد و اثر یا حسن و لطافت کی گرمی پیدا نہ ہو سکی۔

عشق کا مغربی اثر اُن کی شاعری پر پڑا۔ یہ اثر جو شخصی اور مجازی تھا کبھی تو مجازی جذبے کے شخصی اظہار کی صورت میں (مثلاً .... کی گود میں بلی کو دیکھ کر) کبھی مغربی نظموں سے متاثر خیالات کی شکل میں (مثلاً "حسن اور زوال") نمودار ہوا یہ اثر محض ایک شاعر کی وقتی "مشقوں" سے بڑھ کر نہیں لیکن عشق کے متعلق جو نظمیں انھوں نے اس زمانہ میں لکھیں یعنی جن میں ذاتی تاثر زیادہ نمایاں نہیں۔ اور جن کی تحریر "مقصد" رکھتی ہے اُن میں سے اکثر نظمیں باعتبار تخیل بہت بلند ہیں۔

پان اسلامزم کے اثرات جو اقبال کے ذہن پر چھا رہے تھے اور اُن کی شاعری کا مذہب بن رہے تھے، اسی زمانے میں دو مختلف طریقوں سے اُن کے کلام کے عشقیہ عنصر پر اثر انداز ہوئے ایک تو یہ کہ اُن کے کلام میں مولانا روم کے اثر اور تصوف کے رنگ کی ابتدائی چاشنیاں جا بجا پیدا ہونے لگیں۔ دوسرے یہ کہ عشق مجازی میں بھی مشرقی اور اسلامی حسن کا تخیل اور تصور ایک روحانی معیار بننے لگا۔ یہ تصور سب سے پہلے ایک مکمل اور دلکش اثر کی شکل میں "سلیمیٰ" کی تحریر کا باعث ہوا

جس کی نمود دیکھی چشم ستارہ بیں نے ۔۔۔ خورشید میں قمر میں تاروں کی انجمن میں
صوفی نے جس کو دل کے خلوت کدے میں پایا ۔۔۔ شاعر نے جس کو دیکھا قدرت کے بانکپن میں
صحرا کو ہے بسایا جس نے سکوت بن کر ۔۔۔ ہنگامہ جس کے دم سے کاشانۂ چمن میں

ہر شے میں ہے نمایاں یوں تو جمال اُس کا
آنکھوں میں ہے سلیمی تیری کمال اُس کا

سلیمی عرب کی پرانی محبوبہ ہے۔ اور شاعر حقیقت کے کیف کو مجاز میں تخیل کر کے مشرقی شاعری کی روایت کو جس میں مجاز و حقیقت ہمیشہ ایک دوسرے میں عیاں اور نہاں ہوتے ہیں، ایک نئے اور جدید رنگ سے زندہ کرتا ہے۔

عشق حقیقی کے عناصر کی نشو و نما پر ہم آگے چل کر روشنی ڈالیں گے۔

اس زمانہ کی عشقیہ شاعری کی چند اور خصوصیات کا ذکر ضروری ہے۔ ہر عشقیہ نظم میں اس کا احساس ہوتا ہے کہ جذبہ دل سے نہیں نکلا۔ تخیل ہمیشہ نظم کی تشکیل کا باعث نظر آتا ہے۔ جذبے میں جوش نہیں، اثر نہیں، حقیقت نہیں۔ معلوم ہوتا ہے کہ ایک غیر معمولی دماغ رنگین کھلونے بنا رہا ہے اور اُن سے تفریحاً کھیل رہا ہے۔ ممکن ہے کہ اکثر نظموں کی تہ میں کوئی واقعہ یا مشاہدہ یا حقیقی قلبی کیفیت کام کر رہی ہو۔ لیکن کسی طرح یہ واقعہ یا مشاہدہ یا قلبی کیفیت ایسی نہیں ہوتی جو اقبال کو بالکل مست کر گئی ہو۔ یا گرما گئی ہو۔ اگر اُن پر کوئی اثر پڑا ہے تو وہ اُس سے ضرورت سے زیادہ شعری کام لینا چاہتے ہیں۔ جذبے کے فقدان کے باعث باوجود تخیل کی رفعت کے زبان اور تناسب کا جامہ جا بجا چاک ہو جاتا ہے۔

زبان کی فطری سادگی، فطری جوش، اور فطری اصلیت کی سب سے زیادہ ضرورت عشقیہ شاعری میں ہوتی ہے۔ اور اقبال کو زبان پر بالکل اختیار نہیں۔ ایک مصرع میں اگر جوش اور اثر ہے تو دوسرا بالکل پھس پھسا ہے۔ ضرورت شعری کے لئے ٹکڑے کے ٹکڑے زبردستی بھرے ہوئے ہیں۔ الفاظ کا انتخاب بالکل غلط ہے اور وہ تناسب جو شاعری کے جسم کے لئے کسی حسینہ یا کسی حسین مجسمہ کے جسم سے زیادہ ضروری ہے اور تقریباً مفقود ہو جاتا ہے۔

اقبال نے "بانگ درا" کی اشاعت کے سلسلہ میں اکثر نظموں پر نظر ثانی کی۔ اور یو۔پی کے نقادوں کے بے پناہ اعتراضات سے کم سے کم اس حد تک متاثر ہوئے کہ زبان کی چند اہم لغزشیں دور کر دیں۔ پھر بھی عشقیہ نظموں کی حد تک یہ تبدیلیاں کافی نہیں ہوئیں۔ جوش اور اصلیت کے لئے زبان کی اس قدر صفائی کافی نہیں تھی۔ مثال کے طور پر اُن کی مشہور اور ایک حد تک دلفریب نظم "حسن و عشق" کا پہلا بند یہ ہے۔

جس طرح ڈوبتی ہے کشتی سیمین قمر　　　　نور خورشید کے طوفان میں ہنگام سحر
جیسے ہو جاتا ہے گم نور کا لے کر آنچل　　　　چاندنی رات میں مہتاب کا ہمرنگ کنول

جلوۂ طور میں جیسے ید بیضائے کلیم   موجۂ نکہت گلزار میں غنچے کی شمیم

ہے ترے سیل محبت میں یوں ہی دل میرا

پہلے مصرعے میں وہ سلاست اور روانی اور بے ساختگی نہیں جو ایک سلیقہ خد باتی نظم میں ہونا چاہئے۔ دوسرے شعر کے پہلے مصرعے میں لفظ "آنچل" اس وجہ سے بہت بے محل ہوگیا ہے کہ پوری نظم کے لہجہ میں رفعت اور شوکت پائی جاتی ہے اور یہ لفظ جو کسی زیادہ تادی نظم میں بہا رو دے جاتا، اس نظم میں باوجود اس کے کہ خالی "آنچل" نہیں "نور کا آنچل" ہے نظم کی فضا میں اجنبی سا معلوم ہوتا ہے، اور اس ٹکڑے کی وجہ سے تخیل کے رنگ میں ایک ناہموار شوخی سی پیدا ہوگئی ہے۔

لیکن بعض جگہ یہی نظم اُن بلندیوں تک پہنچ جاتی ہے کہ داد نہ دینا ظلم ہے۔

تو جو محفل ہے تو ہنگامۂ محفل ہوں میں   حسن کا برق ہے تو عشق کا حاصل ہوں میں

میرے دل میں تری زلفوں کی پریشانی ہے   تیری تصویر سے پیدا میری حیرانی ہے

حسن کامل ہے ترا عشق ہے کامل میرا

(۳)

مطالعۂ فطرت اور حُسن وعشق کے عناصر

فطرت کا مطالعہ اقبال کی شاعری کے اولین اور بنیادی عناصر میں سے ہے۔ ان کا مطالعۂ فطرت بھی جذباتی نہیں، ذہنی ہے۔ فطرت سے اُن کی قوت ادراک مستفید ہوتی ہے۔

اقبال کی شاعری کے حسن پرست اور عشقیہ عنصر پر اُن کے مطالعۂ فطرت کا اثر ہونا ضروری تھا سب سے زیادہ جس حسن نے اقبال کے قلب وادراک پر اثر ڈالا ہے۔ وہ فطرت کا حسن ہے۔ فطرت کے مختلف عناصر سے مخاطب ہوکر یا ان کے متعلق اقبال نے نظمیں لکھی ہیں۔

مطالعۂ فطرت کی حد تک ورڈسورتھ کا اثر اقبال پر بہت گہرا پڑا۔ فطرت میں وہ دو چیزیں دیکھتے ہیں۔ ایک تو فطرت کے ایک مظہر کا تعلق اور ربط دوسرے مظہر سے۔ یہ فطرت کی ایک عاشقانہ کیفیت ہے۔ دوسرے انسان اور فطرت کا موازنہ

یہاں وہ ورڈسورتھ کو چھوڑ کر مولینا روم اور متصوفین کے زیر اثر آجاتے ہیں۔ جن کے نزدیک انسان فطرت کا مظہر کامل ہو۔
چنانچہ ان کی وہ نظمیں جن میں حُسن وعشق کے احساسات مطالعۂ فطرت کا نتیجہ ہیں دو قسم کی ہیں ایک تو وہ کہ جنہیں وہ فطری عناصر کی باہم محبت، یا کسی مظہر فطرت کے حُسن یا کسی کے عشق سے نتائج کا استخراج کرتے ہیں اور اُن سے حُسن او عشق کے معیار انسانوں کے لئے تعبیر کرتے ہیں ان نظموں میں فطرت،، انسان کے معیار حُسن وعشق اور ترغیب عشق کے لئے نمونے اور مثال کا کام دیتی ہے۔ مثلاً "جگنو" کی چمک سے وہ حُسن کے اس تصور تک پہنچتے ہیں۔

حُسن ازل کی پیدا ہر چیز میں جھلک ہے — انسان میں وہ سخن ہے غنچے میں وہ چٹک ہے
یہ چاند آسماں کا شاعر کا دل ہے گویا — واں چاندنی ہے جو کچھ یاں درد کی کسک ہے
انداز گفتگو نے دہوکے دیئے ہیں، ورنہ — نغمہ ہے بوئے بلبل، بُو پھول کی چہک ہے
کثرت میں ہو گیا ہے وحدت کا راز مخفی — جگنو میں جو چمک ہے وہ پھول میں مہک ہے

یہ اختلاف پھر کیوں ہنگاموں کا محل ہو
ہر شئے میں جب کہ پنہاں خاموشی ازل ہو

یا مثلاً "غنچۂ ناشگفتہ اور آفتاب" میں سحر کے "عارض رنگیں" کی جلوہ فرمائی پر کلی کا "سینۂ زرین" کھول دینا۔ انسانی عشق کی اس دعوت کا بہانہ بن سکتا ہے کہ

مرے خورشید، کبھی تو بھی اُٹھا اپنی نقاب — بہر نظارہ تڑپتی ہے نگاہ بے تاب
تیرے جلوہ کا نشیمن ہو مرے سینہ میں — عکس آباد ہو تیرا مرے آئینے میں

اور اس کے بعد انشراح کی یہ کیفیت منقلب ہوجاتی ہے۔

اپنے خورشید کا نظارہ کروں دور سے میں — صفت غنچہ ہم آغوش رہوں نور سے میں
جان مضطر کی حقیقت کو نمایاں کردوں
دل کے پوشیدہ خیالوں کو بھی عریاں کردوں

دوسری قسم کی وہ نظمیں جن میں مطالعۂ فطرت حُسن وعشق کے عناصر کی تحریک کا باعث ہوا ہے وہ ہیں جن میں اقبال یہ محسوس کرتے ہیں کہ فطرت کا حُسن بے سوز ہے۔ فطرت میں محبت کا شرر نہیں۔ فطرت میں اور انسان میں بھی چیز ما بہ الامتیاز ہو۔

انسان کو عشق نے "حرارتِ سوزِ دروں" عطا کی ہے۔ انسان میں جلنے اور جلانے کی صلاحیت موجود ہے اور یہی وہ چیز ہے جو انسان کو تمام مظاہرِ فطرت سے بالاتر قرار دیتی ہے۔ مظاہرِ فطرت کی زندگی فانی ہے۔ انسان عشق کی وجہ سے باقی ہے۔ انسان کو محبت کے باعث زندگیٔ دوام حاصل ہے "ستارۂ صبح" جب اپنی بے ثباتی کی شکایت کرتا ہے تو اقبال اُسے اپنے "ریاضِ سخن کی جانِ پرور" فضائیں بتاتے ہیں کہ

میں باغباں ہوں محبت بہار ہے اس کی، بنا مثالِ ابد پائیدار ہے اس کی

یا مثلاً "انسان اور بزمِ قدرت" میں بزمِ قدرت انسان سے کہتی ہے۔

ہے ترے نور سے وابستہ مری بود و نبود، باغباں ہے تری ہستی پئے گلزارِ وجود
انجمن حسن کی ہے تو، تری تصویر ہوں میں، عشق کا تو ہے صحیفہ تری تفسیر ہوں میں

(۴)

حسن و عشق کے متعلق فلسفیانہ نظمیں

اقبال کی دو نظمیں ایسی ہیں جن میں سے ایک میں محبت کی تعمیر کا نیم شاعرانہ اور نیم متفکرانہ مطالعہ کیا گیا ہے۔ اور دوسری میں (جس کا خیال جرمن نثر سے لیا گیا ہے) زوالِ حسن اور کائنات پر اس زوال کے حزنیہ اثر کا ہلکا سا مطالعہ کیا گیا ہے۔ ان دونوں نظموں یعنی "محبت" اور "حسن و زوال" میں خیال گہرا ہے، ان میں ایک مقصد کام کر رہا ہے۔ ان نظموں کی بنیاد واقعات کے تجربے پر رکھی گئی ہے۔ اسی لئے بہت وسیع معنوں میں انہیں فلسفیانہ نظمیں کہا جا سکتا ہے۔

ان میں سے "محبت" میں عشق کی آفرینش کا ایک مخصوص تصور پیش کیا گیا ہے۔ عشق ایک سربستہ راز تھا۔ جو انسان کے لئے نہیں بنایا گیا تھا۔ مگر اس مخلوق نے جس میں عبودیت کے ساتھ بغاوت کی صلاحیت ہمیشہ سے موجود تھی۔ اس راز کو معلوم کرلیا۔ فطرت کی کیفیتوں اور روحِ خالص کی مختلف خاصیتوں سے یہ نسخہ تیار ہوا۔ تارے سے چمک، چاند سے داغِ جگر، رات سے سیاہی، بجلی سے تڑپ، شبنم سے افتادگی لی گئی۔ اور اس کے ساتھ ہی نفسہائے مسیح اور شانِ ربوبیت سے ادائے بے نیازی کے اثرات لئے گئے۔ اس طرح محبت کی تعمیر ہوئی۔ اور صرف انسان ہی نہیں، پوری فطرت اس نور سے جگمگا اُٹھی۔

خرامِ ناز پایا آفتابوں نے ستاروں نے، چمک غنچوں نے پائی داغ پائے لالہ زاروں نے

دوسری نظم یعنی "حسن اور زوال" کا بنیادی تخیل باہر سے لیا گیا ہے۔ مگر پوری نظم یہ ظاہر کر رہی ہے کہ اقبال نے اس حقیقت کو خود محسوس کر کے لکھا ہے۔ اس نظم سے دو جداگانہ حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ حسن اور زوال، لازم و ملزوم ہیں۔

وہی حسین ہے حقیقت زوال ہے جس کی　　　ہوئی ہے رنگ تغیر سے جب نمود اس کی

دوسری حقیقت یہ ہے کہ فطرت کے ہر حسین منظر کا زوال، زوالِ حسن کا ماتم بھی ہے۔

کلی کا ننھا سا دل خون ہو گیا غم سے　　　بھر آئے پھول کے آنسو پیامِ شبنم سے
شباب سیر کو آیا تھا سوگوار گیا　　　چمن سے روتا ہوا موسمِ بہار گیا

(۵)

اقبال کی اُردو شاعری میں تصوف کی جھلک

حسن اور عشق کے تصور اور تخیل میں اقبال کے پختہ تر زاویۂ نظر کا پتہ اُن نظموں میں چلتا ہے جن میں ایک عالمگیر حسن، یا ایک عالمگیر حقیقی عشق کا تصور ان کا محرک ہوتا ہے۔ حسن و عشق کی نظموں میں یہ نظمیں سب سے زیادہ بلند ہیں اور ان نظموں سے اُس اقبال کا اندازہ ہوتا ہے جو آگے چلکر اسرارِ خودی، رموزِ بے خودی، زبورِ عجم اور جاوید نامہ لکھنے والا تھا۔

مولینا روم کا اثر اقبال پر اسی قدر ہے جس قدر اثر پلوٹارک کا شکسپیر پر تھا۔ دُنیا کا ہر شاعر اُن کے لئے صرف دیکھ لینے کی چیز ہے، مگر مولینا روم کا اثر ان پر اسقدر چھایا ہوا ہے۔ کہ بڑی حد تک وہ مولینا کی روشنی میں دُنیا کے اہم تر مسائل کو دیکھتے ہیں۔

"شمع" میں یہ اثر پہلی مرتبہ کھلم کھلا ظاہر ہوتا ہے۔ اقبال نے زندگی کو سمجھنے کے لئے مشرق اور مغرب دونوں کے فلسفے کا مطالعہ کیا۔ بہت مدت تک اُن کو حقیقت اور سکون کی جستجو رہی۔ بہت دنوں تک ذوقِ استفہام اُن کو پریشان کرتا رہا۔ پھر جب اُن کو سکون ملا تو تصوف میں ملا۔ غزالی میں نہیں مولینا روم میں۔

اس جستجو اور کاوش کا مکمل ترین اظہار "بچہ اور شمع" کے آخری حصے میں ہوا ہے۔ صرف ظاہری حسن کی نمود شاعر کو تسکین نہیں دے سکی۔ روح کسی اور سکون کے لئے بیتاب ہے۔

محفلِ قدرت ہے ایک دریائے بے پایانِ حسن　　　آنکھ اگر دیکھے تو ہر قطرے میں ہے طوفانِ حسن
حسن کوہستان کی ہیبت ناک خاموشی میں ہے　　　مہر کی ضوگستری شب کی سیہ پوشی میں ہے

چشمۂ کہسار میں، دریا کی آزادی میں حسن — شہر میں، صحرا میں، ویرانے میں آبادی میں حسن
روح کو لیکن کسی گم گشتہ شئے کی ہے ہوس — ورنہ اس صحرا میں کیوں نالاں ہے یہ مثلِ جرس

حسن کے اس عام جلوے میں بھی یہ بے تاب ہے
زندگی اس کی مثالِ ماہیِ بے آب ہے

اس جستجو کے بعد تسکین نصیب ہوئی تو اس تخیل میں جو مولینا روم نے پیش کیا ہے "شمع" میں وہ کیفیتیں جو مثنوی معنوی میں معراجِ کمال کو پہنچ گئی ہیں جا بجا منعکس نظر آتی ہے۔

صبحِ ازل جو حسن ہوا دلستانِ عشق — آوازِ کن ہوئی تپش آموزِ جانِ عشق
مجھ سے خبر نہ پوچھ حجابِ وجود کی — شامِ فراق صبح تھی میری نمود کی
وہ دن گئے کہ قید سے میں آشنا نہ تھا — زیبِ درختِ طور مرا آشیانہ تھا،
قیدی ہوں اور قفس کو چمن جانتا ہوں میں — غربت کے غمکدے کو وطن جانتا ہوں میں

یادِ وطن فسردگیِ بے سبب بنی
شوقِ نظر کبھی، کبھی ذوقِ طلب بنی

اے شمع حالِ قیدیِ دامِ خیال دیکھ — مسجودِ ساکنانِ فلک کا مآل دیکھ
باندھا مجھے جو اس نے تو چاہی مری نمود — تحریر کر دیا سرِ دیوانِ ہست و بود
گوہر کو مشتِ خاک میں رہنا پسند ہے — بندش اگرچہ سست ہے مضموں بلند ہے
چشمِ غلط نگر کا یہ سارا قصور ہے — عالم ظہورِ جلوۂ ذوقِ شعور ہے
یہ سلسلہ زمان و مکاں کا کمند ہے — طوقِ گلوئے حسنِ تماشا پسند ہے
منزل کا اشتیاق ہے گم کردہ راہ ہوں — اے شمع میں اسیرِ فریبِ نگاہ ہوں
صیاد آپ حلقۂ دامِ ستم بھی آپ — بامِ حرم بھی، طائرِ بامِ حرم بھی آپ
میں حسن ہوں کہ عشق سراپا گداز ہوں — کھلتا نہیں کہ ناز ہوں میں یا نیاز ہوں

ہاں آشنائے لب ہو نہ رازِ کہن کہیں
پھر چھڑ نہ جائے قصۂ دار و رسن کہیں

اس نظم میں فطرت کا کوئی منظر اقبال کی نظر کے سامنے نہیں ۔شمع جو مشرقی شاعری کے لوازمات سے ہے، ایک نئے نور کے ساتھ اُن کے تخیل میں جل رہی ہے ۔ایک طرف تو وہ اس سے خیرہ کن نور حاصل کر رہے ہیں ۔ دوسری طرف اُسے ایک نئی روشنی عطا کر رہے ہیں ۔

اور یہ منزل، اقبال کے کلام میں حسن وعشق کے عنصر کی آخری منزل ہے ۔

یہ منزل اُن کی شاعری کے پختہ تر مذہب یعنی پان اسلامزم میں جاکر ضم ہو جاتی ہے ۔اور مشرق کے لئے روحانی پیغام بن کر اُن کی فارسی شاعری میں ایک نئی روشنی اختیار کرتی ہے اور اس روحانی پیغام میں عشق کا تصوّر وہی ہے ۔جو متصوفین اور سالکین کا تھا۔ مگر بالکل نئے رنگ میں، مغرب سے کامل اکتساب نور کرکے ،مغرب کی مادّیت کے خلاف اس پیغام کو پیش کیا گیا ہے ۔

اس کے بعد اقبال کی شاعرانہ نفسیاتی نشو و نما کی جو منزل آتی ہے اُس میں عشق اور عمل باہم مل جاتے ہیں "پیام مشرق" "زبورعجم" کے بعض حصّوں اور "جاوید نامے" میں عشق اور عمل کے مشترک اور کامل مشرقی تصور سے مشرق کو دوبارہ زندہ کرنے کی سعی کی گئی ہے ۔

عزیز احمد ۔بی ۔اے (عثمانیہ)

۹

زندگی کس قدر دشوار ہو جاتی اگر ہمیں گزری ہوئی باتیں یاد نہ آجایا کرتیں یا اگر ہمارے پاس اُنھیں یاد رکھنے کے ذرائع نہ ہوتے

جمشید اور عزیزہ کی شادی کو پورے دو سال گزر چکے تھے لیکن خانگی ناموافقتیں اُن کی زندگی میں داخل نہ ہوئی تھیں۔ شوہر کے دوستوں اور بیوی کی سہیلیوں نے یہی دیکھا کہ وہ ہمیشہ مسکراتا رہتا ہے اور یہ عموماً ہنستی رہتی ہے۔ اور انھیں اس پر تعجب بھی نہ تھا۔ "اعلیٰ تعلیم اور ہم مذاقی" وہ لوگ کہا کرتے "شادی شدہ خاندانوں کی مسرت کا راز ہے" وہ اس حقیقت سے بے خبر تھے کہ یہ دونوں چیزیں زندگی کو کامیاب ضرور بناتی ہیں لیکن صرف اس صورت میں جبکہ طرفین آپس میں محبت نہ کرتے ہوں اور اُن کی شخصیتیں ایک دوسرے کے لئے زیادہ سے زیادہ دلچسپ اور دلکش ہوں۔ کسی سے دلچسپی لینا، اس کے لئے اپنے اندر احساس اُنسیت کو محسوس کرنا، اُس شخص سے محبت کرنے سے بالکل مختلف ہے۔ محبت اپنے ساتھ رشک، حسد، خود غرضی اور خود غرضی کو لاتی ہے۔ محبت صرف ایک وجود کے سوا ساری دنیا کو فراموش کر دینے کا سبق دیتی ہے۔ محبت فرائض سے بے پروا کر دینے والی پہلی شے ہے جس سے انسان متعارف ہوا۔ محبت تعلیم دیتی ہے بعض اشیا کو صرف اپنا سمجھنے کی حالانکہ احساس ملکیت ایک لعنت ہے۔

دو سال کے بعد جمشید اور عزیزہ کی زندگی میں بھی ایک ایسا دن آیا جبکہ انھوں نے اپنے آپ کو ایک دوسرے سے برہم پایا۔ بات معمولی سی تھی لیکن طرفین کی بڑھی ہوئی محبتیں ایسے تلخ نتیجے کی ذمہ وار تھیں۔ جمشید کو ملال تھا کہ عزیزہ نے اُس کی محبت پر اعتماد نہ کیا اور ذراسی بات پر یوں خفا ہوگئی۔ عزیزہ کو رنج تھا کہ جمشید نے اُس کی محبت کی قدر نہ کی اور ذراسی بات کے لئے اُسے یوں خفا کردیا۔ اگر سوال محبت درمیان میں نہ ہوتا تو شاید وہ بہت جلد پھر اچھے دوست بن جاتے لیکن معاملہ بالکل جداگانہ تھا۔ احساس محبت نے انھیں مغرور بنا دیا تھا اور وہ اپنی ہستیوں کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دینے لگے تھے۔ وہ باوجود مل جانے کی خواہش کے ایک دوسرے سے نہ مل سکتے تھے صرف اس لئے کہ اُن کی متکبر محبتیں منتظر تھیں ایک دوسرے سے لفظ معذرت و معافی سننے کے لئے۔ خودغرضی و خودپرستی جو محبت کے زیر سایہ پرورش پاتی ہے پل کر بڑی ہوگئی تھیں

ڈرائنگ روم میں کرسیاں خاموشی سے میزوں کو تک رہی تھیں۔ ادھر کچھ روز سے بہت کم لوگ ان پر بیٹھنے کے لئے آتے تھے۔ دوست احباب اسی وقت تک ملاقات کے لئے آتے ہیں جب تک قہقہوں اور مسکراہٹوں سے ان کا خیر مقدم کیا جاتا ہے — محبت کے غم میں اُداس چہرے انھیں پسند نہیں آتے۔ تکلف سے بنائے ہوئے پان اور مجبوری سے پیدا کئے ہوئے تبسم ان کے لئے دلکش نہیں ہوتے۔

سارے گھر میں ایک پُراسرار خاموشی کا دور دورہ تھا۔ ملازم خاموشی سے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ ان کی خوش مزاجیاں مفقود ہو چکی تھیں۔ برآمدے میں لٹکے ہوئے پنجرے کے اندر سُرخ گردن والا طوطا بھی اپنی شرارتیں بھول گیا تھا۔ اب وہ اپنے کھانے اور پانی کے کٹوروں کو پیروں سے پکڑ کر پھینک نہ دیا کرتا تھا کیونکہ اُسے جلد جلد کھانا ملنے کی اُمید باقی نہ رہی تھی — دوپہر میں بجائے اپنی مالکہ کی سیٹی کی نقل کرنے کے وہ پردں میں سر کو چھپا کر سو جایا کرتا تھا — علی (بوڑھے خانساماں کا لڑکا) اور محبوب گھر کی نوجوان ملازمہ روزانہ کھانے کا میز ترتیب دیتے وقت آپس میں مذاق کیا کرتے تھے لیکن اب وہ بھی سنجیدہ تھے وہ اپنے آقا اور مالکہ کی مخالفت کی نوعیت سے ناواقف تھے لیکن انھیں رائے زنی کرکے کسی ایک فیصلے پر پہونچ جانے سے کون روک سکتا تھا؟

دوپہر ہو چکی تھی لیکن عزیزہ ابھی تک اپنے کمرے ہی میں تھی۔ خاموشی سے گھبرا کر وہ اُٹھی اور چاہا کہ کچھ پڑھے۔ جو کتاب اُس نے اُٹھائی وہ اسکر وائلڈ کی تھی اور جو فقرہ سب سے پہلے کتاب کھولنے پر اس کی نظروں کے سامنے آیا وہ یہ تھا:-

"Women are not to judge, they are to forgive".

اُس نے برہمی کے انداز میں کتاب کو بند کر دیا آج وہ اس نقاد کی رائے سے متفق نہ ہو سکتی تھی۔ بیکاری اُس کے دماغ کو پریشان کر رہی تھی، مشغولیت کی خاطر اُس نے اپنی پرانی چیزوں کی دیکھ بھال شروع کر دی۔ اُس نے سنا تھا اور پڑھا بھی تھا کہ جب خیالات افسردہ ہوں اور طبیعت مضمحل ہو رہی ہو تو انسان کو صرف مشغول رہنا چاہیئے —— اُس نے اپنی میز کے ان خانوں کو کھولا جو ایک مدت سے مقفل تھے۔ خطوط کے انبار اور اخبارات کے ڈھیر میں اُسے ہاتھی دانت کا ایک چھوٹا سا صندوقچہ نظر پڑا اُس نے اُسے کھینچ کر نکال لیا۔ پرانی گرد اور پرانے کاغذات کی ملی جلی خوشبو آ رہی تھی اور اس قسم کی خوشبوئیں ہمیشہ انسان کو اپنے گرد و پیش سے بے خبر کر دیتی ہیں۔ عزیزہ نے صندوقچہ کھولا یہ صندوقچہ گزشتہ سال اس کی سالگرہ کے موقع پر جمشید ہی نے اُسے دیا تھا۔ صندوقچہ کے اندر مختلف سائز کے کاغذات کا پیاں نوٹ بکس وغیرہ رکھی ہوئی تھیں۔ اُس نے ایک خانہ کھولا —— خانہ کا ہینڈل ٹوٹ چکا تھا اور اُسے کھولنے کے لئے اُسے کروشیا کی سوئی استعمال کرنی پڑی۔ ایک چھوٹی سی کاپی جس کی جلد پر تیل اور گرد کے دھبے تھے اُس خانہ میں رکھی ہوئی تھی پہلے تو عزیزہ اس کی اہمیت اور نوعیت کو نہ سمجھ سکی لیکن پھر اُسے یاد آ گیا —— اور ایک مضمحل سا تبسم اُس کے ہونٹوں پر ظاہر ہوا جو دوسرے ہی لمحہ غائب ہو گیا —— اُس نے بڑی محبت اور نزاکت سے کاپی کو کھولا اور پڑھنا شروع کیا —— یہ اُس کی ڈائریاں تھیں۔ اس وقت کی ڈائریاں جبکہ وہ ابھی ایک بچہ ہی تھی —— یوں بھی اُسے ڈائریاں لکھنے کا شروع ہی سے شوق تھا اور اُس کے علاوہ اس کے مولوی صاحب کی تاکید بھی تھی وہ کہا کرتے تھے —— بیٹی روزانہ جو کچھ تم کرتی ہو اُسے رات میں لکھ لیا کرو تا کہ تمھیں وہ باتیں یاد آ جائیں جو تمھیں روزانہ کرنے چاہئیں اور تم نہیں کرتیں" ہر پرانی چیز دلکش اور نظر فریب ہوتی ہے عزیزہ کے لئے اُس کی یہ ڈائریاں بھی دلچسپی رکھتی تھیں —————— اور اس نے پڑھنا شروع کیا۔

۱۲ اپریل

امّی آج خالہ جان سے ملنے گئی تھیں۔ میں ناشتہ کے بعد کمرے میں آئی تو دیکھا کہ جمشید (چچا ابا کا لڑکا) میری ڈرائنگ بک میں بھوتوں اور چڑیلوں کی تصویریں بنا رہا ہے۔ میں نے کاپی اس کے ہاتھ سے چھین لی —— جانتی ہوں کہ وہ ہو بہو چڑیلوں کی سی تصویریں اتار سکتا ہے لیکن پھر بھی مس میری، میری کاپی میں ایسی تصویریں دیکھ کر میرے مذاق کے متعلق کیا خیال کریں گی —— میرے کاپی چھین لینے پر جمشید نے کہا " اوہ۔ تو شاید تمھیں اپنی تصویر دیکھنا مطلق پسند نہیں؟" —میں اس کے فقرے کا مطلب سمجھ گئی —— وہ ہر وقت مذاق کر سکتا ہے —ہمیشہ بامعنی فقرے استعمال کر سکتا ہے —گر میں اُسے

برداشت نہیں کرسکتی کسی دن موقع ملے گا تو چچا ابا سے کہہ کر اس کی وہ گت بنواؤں گی کہ یاد ہی کرے گا۔ خالہ جان کا تو خیال ہے کہ میرے بال پریوں کے بالوں کی طرح خوبصورت ہیں۔ خیر تو اس کے بعد ماسٹر صاحب آگئے۔ انگلش کا سبق پڑھنے کے بعد میں بھی خالہ جان کے پاس چلی گئی۔ کیونکہ انھوں نے بلا بھیجا تھا —— شام کو واپس آئی۔ رات کے کھانے پر جمشید بھی موجود تھا۔ کھانے کے بعد میں نے جمشید کو کبوتر بند کرنے میں مدد دی وہ اپنے پلے ہوئے جانوروں کو اپنے ہاتھ سے بند کرتا ہے اور کبوتروں سے تو اسے عشق ہے۔"

عزیزہ جب اس فقرے پر پہونچی تو اس نے محسوس کیا کہ اس کے ہونٹوں پر بڑی دیر سے مسکراہٹ موجود ہے وہ ایکدم سے قصداً سنجیدہ ہوگئی۔ وہ آج کل اپنی زندگی کے جس دور سے گزر رہی تھی اس کا تقاضا یہ تھا کہ وہ مسکراہٹ کو ایک خطرناک چیز سمجھے۔ مسکراہٹیں انسان کی فطرت کو نرم اور گداز بنا دیتی ہیں۔ اور وہ ایک پتھر کی طرح سخت و منجمد رہنا چاہتی تھی اس نے کتاب کے دو تین ورق ایک ساتھ الٹ دیئے۔

۲۴ر اپریل۔

آج جمعہ تھا۔ امی نے صبح ہی صبح مجھے مچھلیاں پکانے کی اجازت دے دی تھی ناشتہ کے بعد میں نے ایک سفید ایپرن پہن لیا اور باورچی خانہ میں چلی گئی —— بوڑھی ملازمہ نے مصالحہ تیار کر رکھا تھا۔ اس نے اپنی بھدی آواز میں مجھے مچھلی پکانے کی ترکیب بھی بتادی اور خود ترکاری لینے باہر چلی گئی۔

ایک اونچی تپائی پر انگریزی چولھا رکھا ہوا تھا اور اس میں سے ہلکی سبز سبز آنچ نکل رہی تھی میں نے کڑھائی میں گھی گرم کرلیا۔ ایسا کرنے میں میرا ہاتھ تو ایک مرتبہ ضرور جلا مگر خیر۔ مچھلی پکانے کی خوشی میں اسے جلد بھول ہوگئی۔ اتنے میں جمشید اپنے بلی کے بچوں کو غذا دینے کے بعد مجھے ڈھونڈھتا ہوا باورچی خانہ میں آگیا تھا۔ میں نے اس سے کہا بھی کہ واپس چلا جائے کیونکہ اگر بوڑھی ملازمہ دیکھ پائے گی تو بہت برہم ہوگی لیکن اس نے ایک نہ مانی وہ چاہتا تھا کہ میں کرسی پر بیٹھ جاؤں اور وہ خود ساری مچھلیاں تل ڈالے۔ اور یہ میں کسی طرح پسند نہ کرسکتی تھی "تم کو شرم نہیں آتی" میں نے کہا۔ "مرد ہو کر ہنڈ کلیا کھیلتے ہو"۔ یہ بات اسے بہت بری لگی۔ تھوڑی دیر کچھ سوچتا رہا پھر اس نے پوچھا "تو پھر مرد کیا کیا کرتے ہیں؟" میں نے وہی فقرے دُہرائے جو نانی اماں کو ایک دفعہ کہتے سنے تھے "مردوں کو تلوار چلانا سیکھنا چاہئے" میں نے کہا "جنگلوں میں جاکر بہادری کے جوہر دکھانا چاہئیں۔ اور شیروں کی طرح لڑکر مرنا چاہئے" "مگر مجھے تو بلیوں کی طرح خاموشی سے مزاہمت پسند ہے" جمشید نے

زور سے ہنستے ہوئے کہا۔ "شرم شرم"۔ میں نے بالکل نانی اماں کے لہجے میں کہا۔ "آج کل کے مردوں کے خیالات کیسے خراب ہوتے جا رہے ہیں"۔ "بے انتہا"، جمشید نے کہا۔ لیکن یہ بھی بڑے شرم کی بات ہے کہ عورتیں ہنڈ کلہیا پکاتے وقت، بقول ماسٹر صاحب کے، "سیاسی مسئلوں" پر رائے زنی کرنے کی عادی ہوتی جا رہی ہیں"۔ اس کے لہجے میں بڑے بڑے معنی چھپے ہوئے تھے۔ اس لئے میں نے پلٹ کر مچھلیوں کی طرف نظر ڈالی تو کیا دیکھتی ہوں کہ جمشید کی ناہنجار بلی بیٹھی مصالحہ دار مچھلی کا آخری ٹکڑا کھا رہی ہے۔ میرے پاس مارنے کو کوئی چیز نہ تھی اس لئے میں نے کرچھے کا گرم گرم گھی اس پر الٹ دینا چاہا لیکن وہ بھاگ گئی اور جمشید بھی ہنستا ہوا بھاگ گیا۔ میں غصہ کے مارے دیوانی ہوگئی اور اس کے پیچھے دوڑی۔ آخر باغ میں جا کر اسے پکڑنے میں کامیاب ہوگئی اور دو تین گھونسے اس کے کان پر رسید کئے۔ اس نے جواب میں مجھے نہیں مارا بلکہ ہنستا ہی رہا۔ شاید اسے چوٹ نہ لگی ہوگی۔ امی اب تک ڈرائنگ روم میں بیٹھی اپنی سہیلی سے باتیں کر رہی تھیں ابا گھر پر نہ تھے نانی اماں وضو نے سے تھیں اس لئے بہت کم بات کر رہی تھیں اور برآمدے میں بیٹھی مسلسل نمازیں پڑھ رہی تھیں۔ میں مچھلی کے غم میں لبورتی ہوئی اپنے کمرے میں واپس آئی۔ واقعی اگر میں پہلے اپنا کام کر لیتی اور اس کے بعد باتیں کرتی تو کتنا اچھا ہوتا۔ پھر بھی یہ جمشید ہی کا کیا دھرا تھا اسی نے مجھے باتوں میں لگایا۔ رات کے کھانے کے بعد جمشید نے مجھ سے معافی مانگی وہ بڑی دیر تک خوشامد کی باتیں کرتا رہا۔ لیکن میں نے اسے معاف نہیں کیا۔ مگر کل صبح کو میں اسے معاف کر دوں گی۔ میں زیادہ دیر اس سے خفا نہیں رہ سکتی آخر وہ میرا بھائی ہی تو ہے"۔

عزیزہ یہیں تک پڑھنے پائی تھی کہ بھڑے ہوئے دروازے میں سے ایک بلی تیزی سے کمرے میں داخل ہوئی اس کے منہ میں ایک کبوتر تھا اس کے پیچھے ہی جمشید داخل ہوا اس کے ہاتھ میں ایک لکڑی تھی۔ آج صبح سے وہ مشغولیت کی خاطر اپنے محبوب کبوتروں کے گھروں کو صاف کروانے میں مصروف تھا اور ابھی ابھی اس کام سے فارغ ہو کر اپنے کمرے میں افسردہ خاطر کرسی پر بیٹھا یہ سوچ رہا تھا کہ آخر وہ عزیزہ سے اتنی زیادہ محبت کیوں کرتا ہے۔ اور اس کی خانگی زندگی اب پھر کس طرح دلچسپ و خوشگوار ہو سکتی ہے۔ عزیزہ سے معافی مانگ لینے میں کچھ حرج نہیں ہے لیکن وہ خود ہی مجھے کیوں نہ معاف کر دے؟" اس نے سوچا "اسے یہ تو خیال کرنا چاہئے تھا کہ میں اسے کتنا چاہتا ہوں"۔

اس کے خیالات کا سلسلہ یہیں تک پہونچا تھا کہ کبوتر خانے کی طرف سے پروں کی پھڑپھڑاہٹ سنائی دی اس نے جلدی سے نکل کر دیکھا تو ایک بلی کو اپنا سب سے زیادہ خوبصورت کبوتر پکڑ کر بھاگتے ہوئے دیکھا اس نے لکڑی اٹھائی اور اس کے

پیچھے ہولیا اتفاق سے۔ بالکل اتفاق سے وہ دونوں یعنی بلی اور جمشید عزیزہ کے کمرے میں داخل ہوگئے۔

"آہ جم۔ تو اُس نے تمھارے عزیزترین کبوتر کو پکڑلیا۔ ایں ہد" عزیزہ نے کتاب پر سے نظر اُٹھاتے ہوئے بے اختیار کہا۔ وہ بھول گئی کہ وہ جمشید سے ایک محبت کرنے والی بیوی کی طرح خفا ہے۔ اس کی آنکھوں میں بچپن کے وہ دلچسپ سین تھے جبکہ وہ روزانہ ایک دوسرے سے خفا ہوتے تھے اور دوسرے دن از سرِنو ان کے اتحاد کی تجدید ہوتی تھی۔ وہ اپنی ڈائری کے وہ حصہ پڑھ رہی تھی جہاں جمشید کو معاف کردینے کی خواہش دل میں لئے ہوئے وہ سو جاتی ہے اُسے اس وقت بھی یہی محسوس ہوا کہ جمشید اس کا شوہر نہیں بلکہ اس کے کھیل کود کا رفیق اور اس کا صرف ایک دوست ہے۔

"آہ، عزیزہ۔ تو تم نے مجھے معاف کردیا؟ تم مجھے معاف کردوگی؟"

جمشید کی خوشی بے انداز تھی "عزیزہ! مجھے یقین تھا کہ تم اس واقعہ کو ضرور بھول جاؤگی۔ اور مجھے معاف کردوگی۔ آخر میں تمہارا شوہر ہی تو ہوں اور مجھے تم سے کتنی بے پناہ محبت ہے"

عزیزہ خاموشی سے مسکرائی "ہاں" اس نے کہا میں نے آپ کو معاف کیا اس لئے نہیں کہ آپ میرے شوہر ہیں بلکہ اس لئے کہ کسی وقت آپ میرے شوہر نہ تھے۔ میں اس واقعہ کو بھول جاؤں گی اس لئے نہیں کہ آپ کو مجھ سے محبت ہے یا مجھے آپ کی چاہت ہے۔ بلکہ اس لئے کہ کسی زمانے میں ہمیں ایک دوسرے سے محبت نہ تھی بلکہ صرف دلچسپی"

رابعہ

سوزِ ناتمام

وہی عقل کی پرستش، وہی حوصلہ کی خامی — نہ وہ جرأتِ کلیمی نہ وہ ذوقِ ہمکلامی

مرے روز و شب کی فطرت جو بدل سکو بدل دو — کہ نہیں قبول مجھ کو مہ و مہر کی غلامی

میں زباں سے کیوں کہوں کچھ، مری خامشی ہے سب کچھ — مری ہر نظر گزارش مرا ہر نفس پیامی

مجھے کیا پیام دے گی، تری زندگی کی دُنیا — کہ فنا کی وادیوں میں، مجھے دی گئی سلامی

نئے کارواں کی فطرت، ہے تمام تر سیاست — نہ حُدی کی اب ضرورت، نہ وہ ذوقِ خوش خرامی

مجھے ڈر ہے کالجوں کو نہ خرابِ جہل کر دے — یہ غرورِ علم و دانش یہ جنونِ پختہ کا

مرے حالِ مضطرب پر ابھی ہنس رہی ہے دنیا ابھی ڈھیل دے رہا ہے مرا سوزِ ناتمامی
مرے سوزِ دل کی قیمت فقط اک نگاہِ الفت ترے دردِ دل کا سودا ابھی عشرتِ دوامی

مرے دل نے آج ماہرؔ کوئی چیز ان سے مانگی
بہ نگاہِ مستِ خسرو، بہ سرورِ قلبِ جامی

ماہر القادری

آزادی ہند کی ایک ناکام کوشش

اس تحریک کے متعلق جو عام طور پر ہندوستان کی تاریخ میں "غدر" کے نام سے موسوم ہو مورخین کے زاویہ نظر کو تین حصوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے، بعض مورخین کے نزدیک جو سر جان لارنس کی رائے سے متفق ہیں یہ تحریک محض ایک مقامی فوجی بغاوت تھی اور عام طور پر ملک میں بغاوت کے متعلق کوئی سازش نہ تھی، میرٹھ میں فوجوں کی بغاوت کو دیکھ کر چند خود غرض لوگوں نے ذاتی جلب منفعت کی خاطر ملک کے دوسرے حصوں میں شورش برپا کی اور یہ ایک حد تک صحیح ہے کہ اخیر تک یہ تحریک عام نہ ہو سکی،

جنرل اوٹرم نے جو اطاق اودھ سے پیشتر کمپنی کی جانب سے وہاں رزیڈنٹ تھے اس کے برعکس رائے ظاہر کی ہے، ان کے نزدیک غدر کی تحریک مسلمانوں کی ایک بہت بڑی سازش تھی جس میں ہندوؤں کے بعض طبقوں کو بھی شامل کر لیا گیا تھا۔

واقعہ یہ ہے کہ جہاں ایک حد تک یہ درست ہے کہ غدر کی تحریک کبھی عام ہونے نہیں پائی ان معنوں میں کہ ملک کا ہر فرد و بشر اس سے متاثر ہوا ہو وہیں اس امر کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ ملک کی وسعت اغراض کا اختلاف اور پچھلی تاریخ کو دیکھتے ہوئے ہندوستان میں اس سے قبل اتنے وسیع پیمانے پر کوئی ایسی تحریک نہیں ہوئی، اگر اسے محض فوجی بغاوت کہا جائے تو یہ اعتراض ہوتا ہے کہ بغاوت محض میرٹھ کے فوجی دستہ سے نہیں شروع ہوئی بلکہ اس سے پیشتر



مسٹر محمد بدرالدین حسین بی اے ۔ معتمد ٹینس کلب



مسٹر ذکی الدین صدیقی اسپورٹس کیپٹن



مسٹر محمد مولانا بی ۔ اے

ایک ہمہ گیر کھلاڑی ہیں اور جامعہ میں کھیل کود کی
مختلف انجمنوں کے عہدہ دار بھی رہ چکے ہیں

ہی اکثر فوجی دستوں میں بدظنی اور ہلچل پیدا ہو چکی تھی، مثال کے طور پر بیرک پور اور بیرام پور کے واقعات کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ جہاں ایک نیچ ذات کے ہندو کا ایک برہمن سے، پانی پلانے سے انکار کے جواب میں یہ کہنا کہ "اب ذات پات کا خاتمہ ہے اور ہم تم ایک ہیں کیونکہ خود تم کو ایسے کارتوس استعمال کرنا پڑ رہے ہیں جن پر گائے یا خنزیر کی چربی کی پالش ہوتی ہے۔ فساد کا باعث ہوا۔

اس ایک فقرہ نے بیرک پور اور بیرام پور کی چھاؤنیوں میں ہلچل ڈال دی تھی کیونکہ یہ نیچ ذات کا ہندو ڈمڈم کی میگزین میں ملازم تھا اور اسی زمانہ میں پرانی طرز کی بندوقوں کے بجائے جنھیں براؤن بس کہتے تھے نئی قسم کی انفیلڈ رائفلوں کا رواج فوجوں میں عام کیا گیا تھا اور ان میں کارتوسوں کا استعمال ناگزیر تھا، اس کے ساتھ ہی ایک واقعہ یہ بھی تھا کہ ان چھاؤنیوں میں صرف دیسی سپاہی ہی تھے اور یوروپین افسر برائے نام تھے اور یہ معدودے چند یوروپین افسر ہرگز ان سپاہیوں کی باہمی ملاقاتوں اور خفیہ سازشوں سے باخبر نہ تھے اور میرٹھ کی شورش سے بہت پیشتر بیرام پور اور بیرک پور میں حکومت کے خلاف بدظنی پیدا ہو چکی تھی بلکہ میرٹھ خود ان رجمنٹوں سے متاثر ہوا جو نئی بیرام پور اور بیرک پور کی چھاؤنیوں سے وہاں بھیجدی گئی تھیں۔

بنگال کی افواج کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی ہے کہ ان پر عام فوجی قانون عرصہ تک نافذ نہ کیا تھا جو مدراس اور بمبئی کی افواج پر نافذ تھا نیز یہ افواج مشتمل تھیں اودھ کے علیحدہ کردہ سپاہیوں، بنگالہ کے اونچی ذات کے ہندؤں اور راجپوت طبقہ پر جن پر مذہب کا رنگ اس قدر چڑھا ہوا تھا کہ حکومت اور بالخصوص ایک بیرونی اور غیر حکومت اور افسروں کی تابعداری و فرمانبرداری بھی اس کے سامنے ہیچ تھی، یہ مذہبی رنگ بنگال کی افواج تک محدود نہ تھا بلکہ ان تمام فوجوں پر چھایا ہوا تھا جو اس وقت کمپنی کی ملازمت میں تھیں، اس کا ایک تجربہ حکومت کو مدراس کی شورش ۱۸۰۶ء میں ہو چکا تھا کہ محض "پگڑی" کی بدعت پر فوج میں بغاوت کے اثرات رونما ہو گئے تھے، درآنحالیکہ ان مدراسی افواج کے متعلق تجربہ کار اور ذمہ دار انگریز افسروں کی رائے تھی کہ بنگال کی افواج کے مقابلہ میں ان کو قابو میں رکھنا کہیں زیادہ آسان ہے، لہٰذا اس شورش کی بنا پر محض یہ واقعہ نہیں پیش کیا جا سکتا کہ اس وقت ملک میں انگریزی افواج غیر معمولی طور پر کم تھیں اور دیسی سپاہیوں کی تعداد بہت بڑھی ہوئی تھی۔ اگرچہ اس میں شک نہیں کہ اس فرق کی نسبت کے احساس نے شورش شروع ہونے کے بعد جلتی آگ میں تیل کا کام کیا، لیکن اس شورش کے اسباب حقیقی معنوں میں کچھ اور ہی تھے۔

ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ یہ تحریک مسلمانوں کی تھی اور مسلمانوں کی سازش کو خود غرض ہندؤں کی مدد سے تقویت ملی، یہ

بھی غلطی پر مبنی ہے، اس میں شک نہیں کہ کمپنی نے ایک طرف مسلمانوں کی سب سے بڑی ریاست کا الحاق کر لیا تھا اور خود شہنشاہی کے اعزاز و مراتب پر ضرب کاری لگائی تھی اور اگرچہ لارڈ ڈلہوزی ان تمام تجاویز کو عملی جامہ نہ پہنا سکے تھے جو مجلس نظار کی طرف سے شہنشاہیت کے خاتمہ کے متعلق پیش کی گئی تھیں تاہم اپنے طرز عمل سے انہوں نے اتنا ضرور ثابت کر دیا تھا کہ دھلی کی شہنشاہیت برائے نام ہے اور لارڈ کیننگ نے ہندوستان کے حالات پر ڈلہوزی کی طرح اعتماد نہ کرنے کے باوجود بہادر شاہ کو ایک یادداشت میں یہ لکھ بھیجا تھا کہ ان کے بعد شہنشاہیت کا خاتمہ ہے۔

لارڈ کیننگ کا مقصد دراصل قلعہ دہلی پر فوجی تسلط تھا کیونکہ اس قلعہ کو خاص سیاسی اور فوجی اہمیت حاصل تھی، مگر اس مقصد کی کامیابی سے پہلے ہی اس یادداشت نے قلعہ کے اندر اور باقیماندہ وابستگان دولت کے دلوں میں کمپنی کے خلاف جو جذبہ پیشتر سے موجود تھا اس کو اور بھی مشتعل کر دیا اور نواب زینت محل بیگم کی کوششیں دکن اور فارس تک کے مسلمانوں کو ابھارنے کیلئے اسی یادداشت کی وجہ سے شروع ہوئیں کیونکہ اس یادداشت کا براہ راست اثر ولیعہد کی تخت نشینی پر پڑ رہا تھا۔

مگر باوجود اس کے اس پوری تحریک کو محض مسلمانوں کی سازش سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جس حکمت عملی سے مسلمانوں کو یہ نقصانات پہونچ رہے تھے اس کا اثر ہندوؤں پر بھی پڑے بغیر نہ رہا تھا اور مسلمانوں کی طرح بہت سے راجا اور ہندو والیان ملک اور ان کی املاک "قانون الحاق" کا شکار ہو چکے تھے۔ ناناصاحب کو وراثت سے محروم کر دینا، رانی جھانسی کو بدظن کر دینا، ستارا اور ناگپور کا الحاق اور بہت سے چھوٹے چھوٹے رجواڑوں کے اعزاز خاندانی، نسلی مناصب اور مراتب میں تخفیف اور خصوصاً ناناصاحب کا ولایت (انگلستان) سے بے نیل و مرام ہونا، یہ سب مل کر ہندو قوم کی بے چینی کا باعث بننے کے لئے کافی تھا، نیز ایسے سخت ضوابط و قوانین کا نفاذ عوام کے لئے اور خصوصاً ان طبقوں کے لئے جو اس وقت تک اپنے پشتہا پشت کے امتیازات کی وجہ سے بڑی حد تک ان پابندیوں سے مستثنیٰ خیال کئے جاتے تھے، حد درجہ بے چینی کا باعث ثابت ہوا یہی وجہ ہے کہ اکثر ایسے ہی مقامات پر شورش میں شدت اور سول انگریزی باشندوں پر مظالم زیادہ ہوئے جہاں کے ممتاز طبقوں پر ان قوانین کا اثر زیادہ ہوا تھا، مثلاً لکھنؤ، دہلی، کانپور

بعض مورخین کی رائے ہے کہ اس عام اصول کے تحت کہ جب مرکزی حکومت کمزور ہو جاتی ہے تو امراء و رؤسا ذاتی جلب منفعت کی خاطر بغاوت پر کمربستہ ہو جاتے ہیں، ہندوستان میں یہ شورش پیدا ہوئی مگر بہ زاویہ نگاہ فوجی تنظیم کی حد

تک صحیح ہوسکتا ہے ، یعنی یہ کہ مرکزی حکومت دہلی کی کمزوری کی وجہ سے فوجی تنظیم میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں ان کے مظاہرے لارڈ ہیسٹنگز کے وقت میں پنڈاری اور مرہٹوں کے غول درغول دستوں کی تباہ کاریوں کی صورت میں ہوئے تھے ، اور اگرچہ ان کا استیصال کر دیا گیا تھا لیکن صرف جرائم کی حد تک ، ورنہ ان کا بالکلیہ خاتمہ نہ ہوچکا تھا ، نیز انہی منتشر گروہوں کو جب کمپنی نے اپنے اغراض کے لئے جمع کیا تو ان کی سرشت بدلی نہ تھی اس وقت کی ہندوستان کی ایسی فوجی آبادی کا تو یہ عالم تھا کہ خود رنجیت سنگھ جیسا بہادر سپہ سالار یہ اعتراف کرنے پر مجبور تھا کہ اُسے اپنے دشمنوں سے زیادہ اپنے فتحیاب سپاہیوں سے اندیشہ رہتا ہے ، اور حقیقت بھی ہے کہ ۱۸۵۷ء کے معرکہ میں مرکزی حکومت کی کمزوری سے زیادہ خود کمپنی کے افسروں کی رسوم ملک سے بے اعتنائی کو ذمہ دار قرار دیا جاتا ہے کیونکہ اس سے نہ صرف عام باشندے بددل ہو رہے تھے بلکہ فوج کے سپاہی بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہے تھے ۔

عام طور پر اس تحریک کو علیحدہ علیحدہ حصّوں میں تقسیم کرنا اور ایک علاقہ کی تحریک کو دوسرے علاقہ کی تحریک سے غیر متاثر اور غیر متعلق سمجھنا صریح غلطی ہے ، اور ساتھ ہی یہ کہنا بھی درست نہیں کہ اس تحریک کا مقصد تمام طبقوں کے نزدیک یکساں طور پر ہندوستان کو آزاد کرا دینا ہی تھا لیکن ایک غیر قوم کی سیادت کا احساس ، اور انگریزوں کی مخالفت کا جذبہ ہندوستان میں عام تھا ، اور اسی کے اظہار کے لئے جدا جدا محاذ قائم تھے ، اگر طرز کارروائی میں یکسانیت ہوتی اور مقصد مشترک سے اغماض نہ برتا جاتا تو بہت ممکن تھا کہ یہ تاریخی واقعہ "۱۸۵۷ء کا غدر" نہیں بلکہ "جنگ آزادئ ہند" کے نام سے موسوم کیا جاتا۔

اس تحریک کی ناکامی ہی اس کے غدر یا شورش کے نام سے موسوم کئے جانے کی ذمہ دار ہے ، اگر اس تحریک کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو ہم کو ایک ایسی قوم نظر آتی ہے جو صدیوں پیشتر سیاسی قومی ترقی کے مراحل سے گذر چکی تھی ، جس کے ابھی ہندوستان نے خواب تک نہ دیکھے تھے اور دوسری طرف ایک ایسا منتشر انبوہ تھا جہاں جگہ جگہ پر ذاتی اغراض ومنافع پر ملک کے مفاد کو قربان کیا جا رہا تھا ، اتحاد و اتفاق ، ہم آہنگی یا قومیت کا تصور تک نہ تھا ۔ ایک اور وجہ اس تحریک کی ناکامی کی با وجودیکہ ملک کے طول وعرض میں اس کو مقبولیت حاصل تھی ، انگریزی فوج کی تنظیم اور حکومت کی مرکزیت تھی برخلاف اس کے دیسی افواج غیر منظم اور ذاتی ہوا و ہوس کا زیادہ شکار تھیں ۔ کمپنی کے افواج کی تنظیم ، انگریزی قوم کی خصوصیات اور حکومت کی مستحکم مرکزیت کے باوجود اس تحریک میں اتنی شدت اور سرعت سے اس کے وجود میں آنے کے اسباب پر اگر تاریخی حالات کی روشنی میں نظر ڈالی جائے تو ہم ان وجوہ کی حسب ذیل تقسیم کر سکتے ہیں۔

۱۔ سیاسی وجوہ

۲۔ فوجی وجوہ

۳۔ معاشرتی وجوہ

۴۔ مذہبی وجوہ

الحاق کی حکمت عملی نے سیاسی اور سماجی دونوں طرح پر بےچینی پیدا کر کے معرکہ ۱۸۵۷ء کے اسباب مہیا کئے، اس
حکمت عملی کی بنا پر ملک کا قدیم نظام درہم برہم ہوا، جہاں دیسی ریاستوں میں صدیوں سے رعایا اپنے ایک رئیس کی تابع
اور اس کے طرز حکومت پر قانع تھی اور یہ اطاعت روایاتی ہونے کے ساتھ ساتھ گویا مذہبی شکل اختیار کر چکی تھی، یہاں
ایک غیر ملک، غیر مذہب اور غیر معاشرت کے چند ایسے افراد آئے اثر سے جن میں سے بعض شرافت نفس سے بھی معرا تھے
ایک اندرونی انقلاب پیدا ہوا، ایشیا اور خصوصاً ہندوستان کے باشندے فطرتاً بادشاہ پرست واقع ہوئے ہیں
اور تخت و تاج کا انتقال ایشیائی تاریخ میں کبھی غیر اہم واقعات بغیر نہ ہوا، بادشاہ اور خاندان شاہی کے افراد سے
ناقابل توجیہ محبت، ایشیائی افراد کی فطرت و جبلت میں داخل ہے، اس دور جمہوریت میں بھی ایران، افغانستان
اور سب سے زیادہ ترقی یافتہ اور روشن خیال ملک جاپان میں بادشاہ پرستی کا جو جذبہ رعایا برایا کی ذہنیتوں پر چھایا ہوا
نظر آتا ہے وہ اسی شاہ پرستانہ سرشت کا نمونہ ہے، اور خود بادشاہ کی ذاتی رعایا نوازیاں ان پرستانہ جذبات کی ترقی کا
سبب اور ایشیائی بادشاہوں کے لئے طرۂ امتیاز رہی ہیں۔

ہندوستان میں مرکزی حکومت پر کمپنی کا قبضہ بالجبر اور ریاستوں کے حق میں مضر ثابت ہو رہا تھا اور پھر ریاستوں پر کمپنی اور
کمپنی کے ملازمین کا تباہ کن اثر افراد ریاست کے حق میں مہلک ثابت ہوا، بالخصوص ایسے طبقے زیادہ متاثر ہوئے جو اس ریاست
کی خوشحالی اور اس کے قائم رہنے سے قائم تھے، اس کے علاوہ جیسا کہ اودھ میں ہوا کہ کمپنی نے اصلاح کی کوشش کی
قدیم روایات کو نظر انداز کر کے ایسے عہدہ دار مقرر کئے جو ایک طرف تو ملک کے روایات سے ناواقف تھے اور دوسری
طرف نظم و نسق حکومت کے معاملات میں بھی کافی وسیع النظر نہ تھے، حالانکہ حالات کا اقتضار تو یہ تھا کہ پہلے بھی زیادہ
وسیع النظری سے کام لیا جاتا۔ مرہٹوں کی شکست کے لئے لارڈ ہسٹنگز کے عہد حکومت ہی سے کمپنی نے سیادت قائم کرنے
اور حلقہ اقتدار کو وسیع کرنے میں کوئی رکاوٹ محسوس نہ کی اور بہ نسبت ولزلی، کارنوالس اور وارن ہسٹنگز کے دور کے

کمپنی کو مارکوئیس آف ہیسٹنگز کے بعد اور بالخصوص ڈلہوزی کے زمانہ میں اقتدار سیاسی کا حصول بہت آسان معلوم ہونے لگا تھا، اور وہ تمام قوتیں جن سے کمپنی کو انفرادی طور پر سابقہ پڑا تھا بالکل ہیچ معلوم ہونے لگی تھیں اور اس میں شک نہیں کہ تین سال کے اندر اندر تقریباً سارے ملک پر کمپنی کا تسلط ہو گیا مگر اس سیاسی تفوق نے ذہنی تعصب میں اور بھی اضافہ کیا، اس سیاسی سیادت کا غرہ کمپنی کے اکثر عہدہ داروں کو احساس برتری کے اظہار پر مائل کرنے لگا، چنانچہ ملک کے رسوم کے ساتھ بعض مرتبہ سیاسی معاہدوں کو بھی نظر انداز کر دیا جاتا تھا اور یہ بڑی کامیابی سمجھی جاتی تھی حالانکہ صرف سلطنت کو وسیع کرنے کی حد تک یہ حکمت عملی بہت کامیاب رہی مگر انگریز عہدہ داروں میں احساس برتری اور دیسی باشندوں میں اپنی حق تلفیوں کا احساس یہ دو ایسے نتائج تھے جو اپنی اپنی جگہ پر خوشگوار تعلقات یا رواداری کے سخت منافی تھے اور جیسے جیسے ان میں اضافہ ہوتا گیا صورت حال نازک ہوتی گئی، خصوصاً ڈلہوزی کے زمانہ میں جو واقعات پیش آئے تو ان مواقع پر جہاں پالیسی صحیح تھی طریق کار کچھ ایسا تھا کہ جس میں احتیاط اور رواداری کے پہلو کو قطعی نظر انداز کر دیا گیا تھا، خود مقبوضات میں اتنی وسعت ہو گئی تھی کہ ان کو بیرونی و اندرونی خطرات سے محفوظ رکھنا بڑے تدبر کا کام تھا، ڈلہوزی نے ایک حد تک اس پہلو کو پیش نظر رکھا اور سیاسی اور فوجی مرکز کو کلکتہ سے دہلی منتقل کر دیا اور ساتھ ساتھ نظار کی توجہ انگریزی افواج میں اضافہ کی طرف مبذول کرائی، اس کے باوجود بھی اس کو یہ غلط فہمی تھی کہ وہ اپنے جانشین کے لئے ایک پرامن اور مستحکم سلطنت چھوڑ رہا ہے۔

انگلستان کے وہ مدبر جو ہندوستان کے حالات کو فطرت انسانی کی روشنی میں دیکھ رہے تھے واقف تھے کہ ایک ایسے ملک پر جو خود یورپ سے زیادہ قدیم تمدن کا مالک رہا ہے اس قدر جلد اقتدار قائم کر لینا سہل نہیں، نیز نئی تعلیم کے رواج اور پرانی تعلیم کے زوال کے نتائج حکومت کی استبدادانہ پالیسی کے لئے خوش آیند نہ ہوں گے، چنانچہ لارڈ کیننگ نے لارڈ ولیم بنٹنگ، سر چارلس مٹکاف اور سر جان مالکم کے بیانات کی بنا پر انگلستان سے روانہ ہوتے وقت یہ کہا تھا کہ اگرچہ بظاہر ہندوستان میں امن و امان قائم ہے مگر بہت ممکن ہے کہ کسی غیر اہم واقعہ ہی کی بنا پر ایک ایسا فساد برپا ہو جائے جس کا فرو کرنا حکومت کمپنی کے حیطہ اختیار سے باہر ہو، اور اس پرامن مطلع پر یہ بادل کا چھوٹا سا ایسا ٹکڑا نمودار ہو جو بڑھتے بڑھتے ایک ایسے طوفان کا پیش خیمہ ثابت ہو تو ہماری تباہی کا باعث بن جائے۔ لارڈ کیننگ کا یہ خطرہ خالی از علت نہ تھا، ہندوستان کی سماجی بےچینی سے واقف ہوش گوش رکھنے والے اہل نظر ایسی رائے قائم کریں۔

اودھ میں جیکسن اور گبنس کی آپس کی نااتفاقیوں نے کچھ ایسی فضا پیدا کر دی تھی کہ لارنس بھی اپنی تمام تر کوشش کے باوجود

حالات پر قابو پانے سے معذور رہا، اور سوا اس کے کچھ نہ کر سکا کہ سر چارلس مٹکاف اور سر جان مالکم کی تنبیہات کا اعادہ گورنر جنرل کے پاس کرتا رہے مگر کیننگ نے لارنس کے ان پیش کردہ خطرات کو ذرا بھی کان نہ دیا، اودھ کے شاہی خاندان کی شکایت تھی کہ حکومت کا سلوک قدیم روایات سے مختلف اور ان کے اعزاز و مراتب کے شایان شان نہیں، امرا شاکی تھے کہ مالگزاری کے انتظامات جدید ان کے لئے مکلف ہیں اور حکومت ان کے ساتھ مطلق ہمدردی کا اظہار نہیں کرتی، ان کی وراثت، اور بعض مواقع پر ان کی جاگیروں کے متعلق مالگذاری کے عہدہ داروں کی سرپرستی میں کمزور درجہ کے لوگ دعاوی پیش کرنے لگے، نیز اسی زمانہ میں حق وراثت ثابت کرنے کے لئے جو ضوابط نافذ ہوئے تھے اُن پر سختی سے عمل شروع ہوا، ساتھ ہی زمینداروں کے لئے اور بھی ایسے نئے ضوابط مرتب ہوئے جن کا مقصد یہ تھا کہ کیا نوں پر جو بار ہے اس کو کم کرکے حکومت کے لئے ان کی ہمدردی حاصل کی جائے، لیکن ایسی ریاستوں اور راجدھانیوں میں جہاں صدیوں سے نظام جاگیری کے اثرات پائے جاتے ہوں اور آخر میں مرکزی حکومت کی کمزوری کے باعث والیانِ ریاست کے اختیارات غیر معمولی ہوگئے ہوں، ایسے ضوابط کا نفاذ ظاہر ہے راجہ اور پرجہ دونوں کے احساسات کو ٹھیس لگانے اور انقلابی تحریک کا مادہ پیدا کرنے کے لئے کافی تھا، اودھ، ناگپور اور ستارا کے واقعات اس کی اچھی مثالیں پیش کرتے ہیں، اس اصول کے مطابق کہ جاگیر جو معرضِ بحث میں ہو یا تو کمپنی کے علاقہ میں ضم کردی جائے یا ہر ایسے مقدمہ میں جہاں وراثت مشکوک ہو تحقیقاتی مجلس کے تصفیہ کو بھی منسوخ کردیا جائے، حکومت بمبئی نے کئی چھوٹی بڑی ریاستوں کو ضم کرلیا اور تقریباً بیس ہزار جاگیرداروں اور انعام داروں کی معاش ضبط کرلی۔

ہندوستانی رؤسا کے دربار عیش و عشرت کے زبردست مرقع ہوا کرتے تھے اور انہیں عیش پسندیوں کی بدولت ہندوستانی نواب بدنام تھے مگر واقعہ یہ ہے کہ باوجود اس کے رعایا مطمئن اور خوش حال تھی کیونکہ ان کے اسباب عیش اور سامان طرب انکے ہی ملک میں سے فراہم ہوتے تھے اور شانِ ریاست کے برقرار رکھنے میں ہزاروں افراد ملک کا پیٹ پلتا تھا رؤسا کے خاتمہ کے بعد وہ تمام طبقے جو دربار کی نام نہاد "فضول خرچیوں" پر ہی زندہ تھے بے خانماں برباد ہوگئے، رؤسا کی سرپرستی ختم ہونا ان کے لئے پیام موت ثابت ہوا، درباروں کے خاتمہ نے بہت سی دیسی صنعتوں کا خون کیا اور اب ان مصنوعات کا قدردان کوئی باقی نہ رہا، مقامی صنعتوں کی اس تباہی نے معاشی انحطاط صورت اختیار کی، حکومت کی طرف سے بجائے اس کے کہ ان کی فلاح و بہبود کا کوئی انتظام ہوتا یا ان کے ساتھ رعائتیں کی جاتیں اُن کو پہلے تو اس الزام میں کہ وہ شاہی دولت کے "لوٹنے" میں حصہ

لے رہے تھے سزائیں دی گئیں اور پھر کمپنی چونکہ تاجروں کی ایک جماعت تھی اور دیسی صناع حریف کی حیثیت رکھتے تھے اسلئے نہ صرف اغماض برتا گیا بلکہ ان کے تباہ کرنے کا کافی سامان کیا گیا۔ انقلاب صنائع کی بدولت ہندوستان کی مصنوعات یونہی کس مپرسی کی حالت میں تھیں اس پر کمپنی کا رویہ اور ایک تازیانہ ہوا، تاجروں کی اس جماعت نے اپنے ہم وطنوں کے شور و غوغا کی بنا پر دیسی صناعوں کی تباہی میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھا یہی خانماں برباد افراد "چوں تنگ آمد بجنگ آمد" کے مصداق حکومت کمپنی کے خلاف سازش میں پیش پیش ہونے لگے۔

حکومت کمپنی کے خلاف لوگوں کے دلوں میں طرح طرح سے بدظنی پیدا کی گئی، عام طور پر یہ پیشین گوئی کیجا رہی تھی کہ چونکہ کمپنی کی حکومت کے سو سال پورے ہو گئے ہیں اسلئے اب اس کے خاتمہ کا وقت آگیا ہے، اور ہندوستان کے سریع الاعتقاد باشندے اس پیشین گوئی سے خاصے متاثر تھے، روٹیوں کی تقسیم اب تک ایک راز سربستہ ہے مگر اس سے عوام میں ایک سازش کا پتہ ضرور چلتا ہے جس کے پیچھے چند ارباب اقتدار کے ہاتھ بھی معلوم ہوتے ہیں۔

اسی عرصہ میں قلعہ دہلی سے ایک اعلان شایع ہوا جو شاہ ایران کی طرف منسوب کیا گیا تھا اور جس میں یہ بتایا گیا تھا کہ وہ عنقریب شمالی ہند پر حملہ کرکے کمپنی اور اس کے عہدہ داروں کو ملک سے نکال دے گا، یہ اعلان جعلی تھا مگر اسکا اثر عوام پر بہت ہوا، اس پر یقین کر لینے کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ شاہی خاندان کی طرف سے پیامات ایران روانہ کئے گئے تھے اور دوسرے یہ کہ ہرات کے مسئلہ پر انگریزوں اور ایرانیوں کے درمیان چشمک تھی، نیز دہلی میں امیدیں اس سے بھی پیدا ہو گئی تھی کہ فوجیں نظم و نسق کی غلطی سے کوئی انگریزی فوج مغلیہ شہنشاہی کے پایہ تخت میں نہ رکھی گئی تھی اور جو دیسی فوج دلی میں موجود تھی اس سے توقع تھی کہ وہ وقت پڑے پر بادشاہ کا ساتھ دے گی، کسی مالی معاوضہ کی امید نہ سہی محض بادشاہ کا نام اسکی امداد حاصل کرنے کے لئے کافی سمجھا گیا تھا، نیز قلعہ پر بادشاہ کا پورا قبضہ تھا جس سے ایک مرکزی حیثیت قائم تھی چنانچہ جب پہلے معرکۂ میرٹھ کے بعد فوجیں دہلی میں جمع ہوئیں تو اسی قلعہ پر مرکز بنایا گیا۔

فوجی اسباب کا جہاں تک تعلق ہے ان کا اثر شورش کے دوران میں زیادہ نمایاں ہوا۔ مگر جہاں تک شورش پیدا کرنیوالے اسباب کا تعلق ہے وہ معاشرتی یا سماجی اور سیاسی اسباب تھے، چند اور اسباب ایسے ہیں جن کو مذہبی کہا جا سکتا ہے اور جو سیاسی اور معاشرتی یا سماجی وجوہ سے کہیں زیادہ سریع الاثر ثابت ہوئے۔

یہ ایک واقعہ ہے کہ شروع میں انگریز محض تجارت کی غرض سے آئے تھے مگر ایک وسیع زرخیز ملک میں دولت

ولندیزیوں کی مثال ان کے سامنے موجود تھی کہ افراط دیکھ کر انھوں نے پیر جمانا شروع کئے اور رفتہ رفتہ خوب پیر پھیلائے، لہذا مذہب کے معاملہ میں علانیہ وہ کوئی رویہ اختیار کرنا نہ چاہتے تھے اسلئے شروع میں اس کی خاص طور پر احتیاط ملحوظ رکھی گئی مگر سنہ ۱۸۱۳ء میں کمپنی کے منشور کی تجدید کے سلسلہ میں منجملہ اور مطالبات کے جو عوام کی طرف سے پیش کئے گئے ایک یہ بھی تھا کہ دین مسیحی کی اشاعت کے لئے کلیسا کی باقاعدہ تنظیم کی جائے، چند دانشمند اور دور اندیش انگریزوں نے علانیہ اشاعت کی اسوقت بھی مخالفت کی مگر لارڈ میکالے ایسے لوگوں کا خیال تھا کہ چند سال ہی کے اندر اندر سارے ہندوستانی باشندوں کو عیسائی بنالیا جاسکتا ہے، پیش بین انگریزوں کا یہ اندیشہ درست ثابت ہوا کہ جب خود کمپنی کے عہدہ دار باوجود شاہی پابندیوں کے ہندوستانی عوام میں شورش کا باعث بن جاتے ہیں تو یہ مسیحی مبلغ ضرور ایک بڑی شورش پیدا کردیں گے، چنانچہ مشنریوں کو حکومتی امداد حاصل ہونے اور آزادانہ تبلیغ کی اجازت کا یہ نتیجہ ہوا کہ عام طور پر یہ خیال پیدا ہوگیا کہ خود حکومت بجبر مذہب کی تلقین کرانا چاہتی ہے مشنریوں کو جو غیر معمولی مراعات حاصل تھیں وہ دیسی باشندوں کو کھٹک رہی تھیں، نو عیسائیوں کو حکومتی امداد و اعانت حاصل ہوتی تھی، دیسی آبادی پر مشنریوں نے اثر جمانا شروع کیا تھا نیز بعض مقامات پر حکومتی عہدہ دار بھی ان کے زیر اثر تھے، اس صورت حال نے دین مسیحی کے بجبر رائج کئے جانے کو اور بھی تقویت دی۔

لارڈ ولیم بنٹنگ ہی کے زمانہ سے مشرقی تعلیمات کے لئے سرکاری امداد کا بند ہوجانا اور مغربی تعلیم کا روزافزوں رواج لوگوں کے سامنے تھا اور اس کا جو اثر نوجوان تعلیم یافتاؤں پر پڑ رہا تھا وہ بھی پوشیدہ نہ تھا جس سے فوراً یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ مغربی تعلیم کی بدولت ہندوستانی تہذیب و تمدن کے ساتھ باشندوں کا مذہب بھی خطرہ میں ہے، مسلمانوں کو انگریزوں سے سیاسی پرخاش تو تھی ہی مگر ایک قدیم مذہبی پرخاش بھی تھی جسے اس زمانہ میں خاص طور پر اہمیت دیدی گئی اور سیاسی شکایت کو زبان سے نکالنے کے بجائے یہ بتایا گیا کہ اسلام خطرہ میں ہے جو ایک حد تک واقعہ بھی تھا۔

نئی وردیوں کا رواج، کارتوسوں میں چربی کا استعمال ہندوؤں کی مذہبی جذبات کو مشتعل کرنے والی چیزیں تھیں، ساتھ ہی ہندوستانی اقوام کے عقائد اور مذہبی و معاشری رسوم سے حکومت کی بے اعتنائی یہ ظاہر کررہی تھی کہ حکومت انکے مذہب کے خلاف ہے، اتفاق سے لیڈی کیننگ کو دین مسیحی کی تبلیغ سے خاص دلچسپی تھی، اس کا اثر بھی لوگوں پر بہت ہوا۔ اسی طرح سنہ ۱۸۵۶ء کے قوانین سے بھی یہ واضح ہوتا تھا کہ حکومت کو اپنے اغراض کے سامنے مذہبی پابندیوں کا کوئی لحاظ نہیں ہے، نیز یہ خیال پیدا ہوگیا کہ اسی وجہ سے فوج میں کمتر ذات کے ہندو زیادہ بھرتی کئے جارہے ہیں۔

اس زمانہ کے تاریخی روزنامچے مظہر ہیں کہ دارالعوام میں ہندوستان کے متعلق جو یادداشتیں پیش کی گئی انہیں تمدنی اختلاف کی بنا پر ایک زبردست تصادم کا اندیشہ ظاہر کیا گیا ہے۔

غرض انیسویں صدی کے وسط میں سیاسی، مذہبی اور تمدنی یا سماجی تمام وجوہ میں ایک ساتھ شدت پیدا ہوئی، یہ وجوہ کمپنی کے ابتدائی دور سے ہی موجود تھے لیکن کمپنی کی پالیسی نے ان کو کم کرنے کے بجائے اور زیادہ ناقابل برداشت بنا دیا۔

فوجی اسباب جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے خاص طور سے شورش کا سبب نہیں بنے بلکہ ممکن ہے فوری سبب فوج —— ہو لیکن ان کی بڑی اہمیت میرٹھ کے فساد کے بعد سے شروع ہوئی، عام طور سے کمپنی کا یہ اصول رہا تھا کہ دیسی اور یوروپی افواج میں ایک خاص توازن قائم رکھا جاتا تھا، عموماً یوروپی افواج دیسی افواج کا ایک ثلث ہوا کرتی تھیں مگر جنگ کریمیا کے سلسلہ میں بہت سی انگریزی رجمنٹیں جو چند دیسی فوجوں کے ہندوستان سے بلالی گئی تھیں، لارڈ ڈلہوزی نے مخالفت کی بھی مگر کوئی اثر نہ ہوا، اس کے بعد ہی ایران سے جنگ کے سلسلہ میں بمبئی کی حکومت نے چار انگریزی اور دو دیسی دستے روانہ کئے، حکومت انگلستان کو اس بارے میں کئی دفعہ توجہ دلائی گئی کہ نہ صرف آیندہ کے لئے بلکہ موجودہ زمانہ میں بھی یہ اقدام خطرناک ہے مگر کوئی شنوائی نہ ہوئی، اس وقت تقریباً ہر شخص کو یہ معلوم تھا کہ انگریزی افواج بہت کم کردی جا چکی ہیں اور ہندوستانی فوجوں میں یہ خیال عام تھا کہ چونکہ کمپنی کی حکومت ان پر انہی کے ذریعہ سے ہو رہی ہے اسلئے ملک کا اصلی اقتدار انہی کے ہاتھ میں ہے، اور اس احساس نے ان کو یہ موقع دیا کہ اپنی شکایات کو خود رفع کریں، عام باشندوں کی طرح فوجی سپاہی بھی انہی مشترکہ وجوہ کی بنا پر حکومت سے ناراض تھے مگر چونکہ یہ نہایت منظم، مسلح اور طاقتور جماعت تھی، اس لئے عوام کے خلفشار سے کہیں زیادہ ان کا احتجاج کارگر ثابت ہوا۔

سب سے پہلے حکومت کمپنی کے خلاف فوجی اقدام بنگال کی دیسی افواج سے شروع ہوا۔ اس فوج میں زیادہ تر اعلیٰ ذات کے ہندو اور راجپوت تھے اور تقریباً چالیس ہزار اودھ کے آئے ہوئے سپاہی تھے جن کو چند خاص مراعات حاصل تھیں، مثلاً ان کے لئے علیحدہ عدالت تھی مگر جب صوبہ اودھ کا بالکلیہ الحاق کر لیا گیا تو ان مراعات کو بھی ختم کر دیا گیا اور اودھ کی افواج اور دیگر افواج میں کوئی تفریق باقی نہیں رہی، حالانکہ اودھ کی افواج کو جو مراعات حاصل تھیں وہ بربنائے معاہدہ تھیں اور ان کی خدمات کا معاوضہ، ان کو الحاق اودھ سے کوئی واسطہ ہی نہ تھا، اس ناانصافی سے فوج میں برہمی کے آثار نمودار ہوئے، ان فوجوں پر بیرون ہند جانے کی شرط عائد نہ ہوتی تھی چنانچہ جنگ برما میں سمندر پار جانے سے

ان افواج نے صاف انکار کردیا تھا، اور جب سنہ ۱۸۵۶ء میں جنرل انلسٹمنٹ ایکٹ کا نفاذ ہوا تو فوجوں میں حکومت کے خلاف جذبات اور بھی مشتعل ہوئے اور چونکہ یہ معلوم تھا کہ یوروپی سپاہ برائے نام ہے لہٰذا سازشوں کی گرم بازاری شروع ہوئی، شروع میں بیرام پور اور بیرک پور خاص مرکز تھے، وہاں سے ایک فوجی دستہ سنہ ۱۸۵۷ء مرشد آباد بھیجا گیا جس نے مرشد آباد کی چھاؤنی کی فضا کو بھی مسموم کردیا، انہی فوجوں میں کا ایک دستہ میرٹھ بھی آیا تھا اور میرٹھ کی فوجیں جو پہلے ہی سے موقعہ کی منتظر تھیں ان خیالات کی ہمنوائی میں سب سے نمبر لیگئیں۔

رفیق الدین احمد

بی۔اے (عثمانیہ)

سلطنت برطانیہ اور دیسی ریاستوں کے معاہداتی تعلقات

ایسٹ انڈیا کمپنی کو دیسی ریاستوں سے معاہدات کرنے کا حق اسے چارلس دوم کے زمانہ میں بذریعہ منشور عطا ہوا۔ شروع شروع کے معاہدات تو بالکل تاجرانہ نوعیت کے تھے۔ کیونکہ کمپنی آخر ایک تاجروں کی جماعت متحدہ تھی اُسے اپنا تجارتی اقتدار قائم کرنا تھا۔ اس لئے کمپنی ان معاہدات کے ذریعہ اپنی بنیادیں مضبوط کر رہی تھی۔ اندرونی استحکام کے لئے یہ ضروری تھا کہ آس پاس کی ریاستوں سے تجارتی معاہدات کئے جائیں۔ جب کمپنی کی بنیادیں ہندوستان میں مضبوط ہو گئیں تو اس نے ہندوستان کی سیاست میں حصہ لینے کے لئے قدم بڑھانا شروع کیا۔ سیاسی نوعیت کا پہلا معاہدہ وہ تھا جو ہماری ریاست آصفیہ سے سنہ ۱۷۵۹ء میں ہوا۔

اس مضمون میں ہم کو یہ دیکھنا ہے کہ کمپنی نے دیسی ریاستوں سے کیا کیا معاہدات کئے اور رفتہ رفتہ ان کی سپرٹ میں کیا کیا تغیرات ہوئے اور بحالت موجودہ ان کی کیا وقعت ہے؟ بہتر یہ ہوگا کہ چند معاہدات کو اور ان پر کس طرح عمل ہوا دیکھا جائے۔

(۱) پہلا معاہدہ سندھ کے مسلمان رؤسا کا ہے۔ اس معاہدہ کو پہلے دیکھنا اس لئے ضروری ہے کہ سندھ میں معاہدہ کے وقت انگریزوں کے قدم ابھی نہیں جمے تھے۔ وہ صرف چند تاجرانہ مراعات کے طالب تھے۔

معاہدہ سنہ ۱۸۳۲ء کے الفاظ یہ ہیں:-

(۱) دوستی نسلاً بعد نسلاً قایم رہے گی۔

(۲) معاہدین اقرار کرتے ہیں کہ وہ ایک دوسرے کی ریاست کو حریصانہ نظروں سے نہ دیکھیں گے۔

(۳) (۱) کوئی شخص سامان جنگ دریائے سندھ پر نہیں لے جائے گا۔

(۲) نہ کوئی مسلح کشتی اور نہ کوئی مسلح جہاز دریائے مذکور پر سے گذرے گا۔

(۳) کوئی انگریز تاجر سندھ میں اقامت نہ رکھے گا۔ صرف اپنی تاجرانہ ضرورتوں کے لئے چندے قیام کر کے واپس چلا جائے گا"

معاہدہ کے الفاظ سے اس اسپرٹ کا پتہ چلتا ہے کہ جس اسپرٹ میں وہ منعقد ہوا تھا۔ معاہدہ کے چار سال بعد تک معاہدہ کی پابندی ہوتی رہی اور اس کے بعد......

۱۸۰۹ء میں کمپنی نے مہاراجہ رنجیت سنگھ سے معاہدہ حلیفی کیا۔ ۱۸۳۶ء میں رنجیت سنگھ شاہ شجاع کی مہم افغانستان میں مدد کر رہا تھا۔ کمپنی رنجیت سنگھ کی حلیف تھی۔ اس لئے اسے بھی ساتھ ہونا پڑا۔ افغانستان میں داخل ہونے کے لئے سندھ کا راستہ اختیار کرنا ضروری تھا۔ کمپنی معاہدہ ۱۸۳۲ء کی رو سے اس کی مجاز نہ تھی۔ آخر کار کمپنی نے حکمت عملی سے رنجیت سنگھ کو سندھ پر سے گذرنے سے باز رکھا۔ سندھی روسا کو اپنی بروقت مدد کا احسان جتایا اور اس کے بدلے اپنا ایک رزیڈنٹ سندھ میں متعین کرنے کے لئے نور محمد خاں کو مجبور کیا۔ اس کے دو سال بعد یہ مطالبہ کیا کہ معاہدہ ۱۸۳۲ء کی دفعہ (۳) کے فقرہ (۱) اور (۲) کو منسوخ کیا جائے۔ سندھی روسا نے اس پر احتجاج کیا۔ جس کے جواب میں لارڈ آکلینڈ نے اپنے رزیڈنٹ متعینہ سندھ کو لکھا کہ اگر سندھی روسا انکار کریں تو ان کو تخت سے اتار کر ایک قدیم خاندان کو تخت نشین کیا جائے۔ یا انھیں مجبور کیا جائے کہ وہ ہماری اطاعت قبول کرلیں۔" فوج کو یہ حکم دیا گیا کہ وہ سندھ پر سے گذر کر افغانستان جائے۔ ناچار سندھی روسا نے فوج کو گذرنے دیا۔ اس مہم کا نتیجہ ہر ایک کو معلوم ہے۔ صرف ایک سپاہی افغانستان سے لوٹ کر آیا۔

(۲) مہاراجہ اندور سے جو معاہدہ ۱۸۱۸ء میں ہوا اس کی ایک دفعہ کے تحت اندور ریاست میں رزیڈنسی کو چار سو ایکڑ زمین دی گئی۔ انگریزوں کو جب ٹکنے کی جگہ مل گئی تو پاؤں پھیلانا شروع کیا۔ ۱۸۹۵ء تک انھوں نے سات سو چونتیس ایکڑ پر قبضہ مخالفانہ جمالیا۔ اسی پر اکتفا مناسب نہ سمجھ کر اور زمین کے لئے مطالبہ کیا۔ سر مادھو راؤ وزیر اعظم اندور نے صوبہ متوسط کے گورنر کو لکھا کہ:۔

"حسب معاہدہ رزیڈنسی کی عمارتوں کے لئے جگہ دے دی گئی مکانات تعمیر ہوگئے۔ عملہ کی زیادتی کے ساتھ ساتھ مکانوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہوتا گیا۔ قانون بین الممالک کے تحت رزیڈنٹ نے مہاراجہ سے مراعات خصوصی بھی حاصل کریں۔ مگر افسوس ہے کہ اس سپردکردہ علاقہ میں رزیڈنٹ کے عملے کے علاوہ ریاست کے باشندوں کو رہنے کی اجازت دی جارہی ہے۔ اور اُن کو بھی مراعات خصوصی سے مستفید کیا جارہا ہے۔ مراعات خصوصی صرف رزیڈنٹ اور ان کے عملے کے لئے ہیں نہ کہ رعایائے ریاست کے لئے۔ علاوہ ازیں ایسی رعایا کو جو سپردکردہ علاقہ میں آباد ہے بغیر کسی معاہدہ کے ملکی قانون کے اختیار سماعت سے بھی مستثنیٰ کردیا گیا ہے۔ اس عمل کی وجہ سے جو نقصان ریاست کا ہورہا ہے اس کا اندازہ اس مثال سے اچھی طرح واضح ہوگا۔ لندن میں اگر کوئی جرمن سفیر اپنے حدود سفارت خانہ میں انگریزی رعایا کو بسائے۔ اختیار سماعت و ملکی محصولات سے مستثنیٰ کردے اور اس حصہ آبادی میں شہر لندن کے دوسرے حصوں سے لوگ آآکر بسنے لگیں۔ تو ایک طرف تو اس حصہ شہر میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوتی جائے گی اور دوسری طرف لندن کے دوسرے محلے ویران ہوتے جائیں گے۔ یہی حال اس وقت اندور کا ہے۔ رزیڈنٹ کا یہ عمل قانون بین الممالک اور معاہدات کے مغائر ہے"

گورنر نے اس خط کا کوئی جواب نہیں دیا۔

(۳) ۱۸۱۸ء میں ریاست بیکانیر سے ایک دوامی دوستی کا معاہدہ ہوا جس کا ایک جملہ یہ ہے۔

"مہاراجہ۔ اُن کے وارث اپنے ملک کے حکمراں ہوں گے۔ اور برطانوی اثرات ان کے ملک میں داخل نہ کئے جائیں گے۔

۱۸۱۸ء کے معاہدہ کے کچھ عرصہ بعد بیکانیر میں ایجنسی کا قیام عمل میں آیا۔ ایجنسی نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ شاہی دارالضرب کو بند کردیا۔ ۱۸۹۸ء میں زمانہ نابالغی ختم ہونے پر نئے مہاراج کو مندرجہ ذیل شرائط کے ساتھ تخت نشین کرایا گیا۔

(۱) کہ ایجنسی کی کوئی اصلاح منسوخ نہ کی جائے۔

(۲) ہر اہم معاملہ میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ کی رائے حاصل کرنا ضروری ہے۔

(۳) کسی صورت میں بھی مہاراج بیکانیر پولیٹیکل ایجنٹ کی رائے کی مخالفت نہیں کرسکتے۔

معاہدہ ۱۸۱۸ء کے فقرہ مذکور دیکھئے۔ اس کے بعد مہاراج کے اختیارات پر یہ تحدیدات کمپنی کا مقصد یہ رہا ہے کہ ہندوستانیوں کو مسلح نہ ہونے دو۔ اس لئے ہر ریاست کے معاہدات میں تحدید اسلحہ کا بھی ذکر ہوتا رہا ہے۔ اس تحدید کے بعد جس قسم کے اسلحہ ہندوستان میں درآمد ہوتے تھے ان کا حال ذیل کی مثال سے واضح ہوگا۔

مثل دیگر ریاستوں کے ریاست نوانگر میں درآمد اسلحہ کے لئے رزیڈنسی سے اجازت نامہ" لینا ضروری ہے چاہے ریاست خود سرکاری اغراض کے لئے اسلحہ منگوائے یا کسی فرد رعایا کے لئے۔ ۱۹۱۷ء کا واقعہ ہے کہ نوانگر کی پولس نے ڈاکوؤں کے ایک گروہ پر حملہ کیا۔ پولس کو حفاظت خود اختیاری میں ایک باڑ چلانا پڑی۔ جس کا نتیجہ بہت ہی عجیب ہے۔ ایک ڈاکو مارا گیا۔ تو پولس کے سپاہی زخمی ہوئے وہ کیسے؟ بندوقوں کی نالیاں پھٹ گئیں۔ منجملہ نو زخمیوں کے دو تو اسی وقت مر گئے۔ دو کے ہاتھ کاٹ ڈالے گئے تاکہ وہ بچ جائیں۔ پانچ کے سر میں چوٹیں آئیں —— جس کی وجہ سے وہ ناقابل ملازمت ہوگئے۔ آج سے ۲۰ سال قبل برطانیہ کی یہ پالیسی تھی کہ وہ ہندوستانیوں کو سولھویں صدی کی بنی ہوئی بندوقیں رکھنے دیتی تھی تاکہ ہندوستانی اس کو استعمال کرتے ہوئے ڈریں کہ کہیں نال نہ پھٹ جائے۔

آخر میں خود ہماری ریاست ابد مدت کے متعلق جو کچھ عمل رہا ہے اس کو دیکھنا بھی ضروری ہے۔ ایک انگریز مورخ نے لکھا ہے "Our relations with the premier mohammeden Stateshave rarely been fortunate."

۱۷۹۰ء میں پچاس ہزار پونڈ سالانہ کے عوض کمپنی کو شمالی سرکار میں اپنی فوج رکھنے کا اختیار دیا گیا۔ اس فوج کے قیام کا مقصد یہ تھا کہ سلطنت آصفیہ کی وقت ضرورت مدد کرے گی۔ اس کی توثیق ۱۸۰۰ء میں ہوئی اور ایک نیا معاہدہ ہوا جس کے تحت ایک معاونتی فوج (Subsidiary force) کا قیام ریاست کے حدود میں عمل میں آیا۔ ریاست میں ایک حیدرآبادی فوج بھی تھی جس کا نام "حیدرآباد کنٹنجنٹ" تھا بعد میں یہی نام معاونتی فوج (Subsidiary force) فوج کو بھی دیا گیا۔ مگر خصوصیت کے ساتھ حیدرآبادی فوج کو کنٹنجنٹ کہا جاتا تھا اس فرق کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

معاونتی فوج (Subsidiary force) کے اخراجات کے متعلق نواب نظام علی خاں نے ۱۸۰۰ء میں وہ تمام علاقے کمپنی کے سپرد کر دئے جو معاہدہ سرنگاپٹم اور میسور کے تحت حیدرآباد کو حاصل ہوئے تھے۔

اس معاہدہ کے تحت کمپنی نے اقرار کیا کہ

"معزز ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت اپنی حدتک بذریعہ ہذا اعلان کرتی ہے کہ اسے ہزہائنس کے بچوں۔ رشتہ داروں رعایا ملازمین سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ان کی حدتک ہزہائنس مختار مطلق ہیں"[۵]

[۵] Aitchison's Sunads and Treaties Vol 5

اور اسی معاہدہ کی دفعہ ۱۷ کے تحت کمپنی نے حلیفی کا اقرار کیا تھا۔

۱۸۰۳ء میں نواب نظام علی خاں کا انتقال ہوگیا۔ اور نواب سکندر جاہ تخت نشین ہوئے۔ اس وقت انگریزوں نے معاہدہ ۱۸۰۰ء کی دفعہ ۱۵ کے خلاف ریاست کے وزیر اعظم کے انتخاب میں دخل دیا۔ یا بقول کمپنی کے "نظام کو مشورہ دیا"۔ میر عالم وزیر اعظم ہوئے۔ ۱۸۰۸ء میں ان کا انتقال ہوا۔ "مشورہ" کے خلاف نواب سکندر جاہ نے منیر الملک کو وزیر اعظم مقرر فرمایا۔ کمپنی نے راجہ چندو لعل کا نام پیش کیا تھا۔ نواب سکندر جاہ نے مجبوراً راجہ چندو لعل کو نائب وزیر اعظم مقرر فرمایا۔ تمام امور سلطنت راجہ چندو لعل انجام دیتے تھے اور منیر الملک برائے نام وزیر اعظم تھے۔ ۱۸۰۹ء سے ۱۸۳۲ء تک دو مرتبہ کمپنی نے اندرونی معاملات میں دخل دیکر ۱۸۰۰ء کے معاہدہ کی خلاف ورزی کی۔

کمپنی حسب معاہدہ آٹھ ہزار پیدل اور ایک ہزار سوار ریاست میں رکھنے پر مجبور تھی۔ جب غدر ۱۸۵۷ء میں دیسی فوج کی مدد سے انگریزی فوج نے بغاوت کو فرو کر دیا تو اخراجات کی کمی کی خاطر معاونتی فوج (Subsidiary force) میں کمی کی گئی یعنی صرف دو ہزار پیدل رکھے گئے۔ تخفیف کے بعد زائد رقم حسب معاہدہ ریاست کو واپس ملنا تھی وہ بھی نہیں ادا کی گئی یعنی دو مرتبہ نقض معاہدہ ہوا۔ ایک تو فوج میں کمی کرنے سے اور دوسرے زائد رقم واپس نہ کرنے سے۔

۱۸۱۳ء میں حیدرآبادی فوج یعنی کنٹنجنٹ نے بقایا تنخواہ کی وجہ سے بغاوت کر دی۔ راجہ چندو لعل نے بغاوت تو فرو کر دی۔ مگر اس فوج میں سے باغی سپاہیوں کو نکال کر ایک نئی فوج بھرتی کی اور اس کا نام حیدرآباد کنٹنجنٹ رکھا یعنی اس وقت ریاست میں تین فوجیں تھیں۔

(۱) دیسی فوج جس کو کنٹنجنٹ کہتے (۲) معاونتی فوج (Subsidiary force) (۳) حیدرآباد کنٹنجنٹ۔ موخر الذکر کو راجہ چندو لعل نے اپنے احکام سے رزیڈنسی کے تحت کر دیا۔ اور رزیڈنٹ کے نام سے اُس فوج کو معنون کرکے رسل بریگیڈ (Russels Brigade) اُس کا نام رکھا۔ اِس فوج کے تمام اخراجات جو چار لاکھ پونڈ تھے حیدرآباد کے خزانہ سے ادا کئے جاتے تھے۔ اس فوج کا قیام بغیر کسی معاہدہ کے ہوا تھا۔ کہنے کو تو وہ ریاست کی فوج تھی مگر اس کی کمان رزیڈنسی کے ہاتھ تھی۔ معاونتی فوج (Subsidiary force) تو انگریزوں کی تھی ہی۔ اس کے اخراجات کا انتظام سپرد کردہ علاقہ جات سے ہوتا تھا۔

کچھ عرصہ تک ریاست رسل بریگیڈ کے اخراجات ادا نہ کر سکی جس کی وجہ سے ریاست رزیڈنسی کی مقروض ہوگئی۔ راجہ چندو لعل نے پامر کمپنی (Palmer & co) سے ۲۵ فیصدی شرح سود پر قرض لے کر یہ قرضہ ادا کیا۔

کمپنی نے پچاس ہزار پونڈ سالانہ جو معاہدہ ۱۸۰۰ء کے تحت اس کو حیدرآباد کو ادا کرنے تھے شاید وہی ایک مرتبہ ادا کئے ہوں گے ورنہ وہ ہمیشہ وصول طلب ہی رہے۔ ریاست نے حساب دوستاں دردل پر عمل کرکے کبھی حساب فہمی بھی نہیں کی دوسری طرف کمپنی ریاست سے ایک ایک پائی وصول کرلیتی تھی۔ اگر حساب کیا جائے تو حیدرآباد پر ایک پائی بھی کمپنی کی باقی نہ نکلتی۔ کیونکہ وہ پچاس ہزار پونڈ سالانہ جو حیدرآباد کو وصول طلب تھے وہی رسل برگیڈ کے اخراجات میں مجرا کئے جاسکتے تھے۔

سنہ ۱۸۲۹ء میں ناصر الدولہ تخت نشین ہوئے۔ حالات زمانہ سے کمپنی کو خوف ہوا کہ کہیں رسل برگیڈ تخفیف نہ کردی جائے ایک مفت کی فوج ہاتھ سے جائے۔ یہ سوچ کر کمپنی نے گذارش کی تخفیف کے بعد ۲ لاکھ پونڈ سالانہ کمپنی کو وصول طلب رہیں گے۔ نواب ناصر الدولہ نے ۲ لاکھ پونڈ سالانہ دینے سے انکار کیا۔ اور کنٹنجنٹ علیٰ حالہ برقرار رہی۔ اس عمل کو کمپنی نے رسل برگیڈ کے قیام کی توثیق سمجھا۔ یعنی جو فوج بغیر کسی معاہدہ کے قائم ہوئی تھی نواب ناصر الدولہ کے اس عمل سے ان کا قیام قانوناً جائز ہوگیا۔ سنہ ۱۸۵۳ء میں کمپنی بہادر نے ۳۲ لاکھ روپیہ رسل برگیڈ کے اخراجات کے متعلق واجب الوصول قرار دیا اور کہا کہ برار کا صوبہ کنٹنجنٹ کے اخراجات کی پابجائی کے لئے دیا جائے۔ نہ صرف یہ مطالبہ کیا گیا بلکہ یہ دھمکی بھی دی گئی کہ اگر مطالبات پورے نہ کئے جائیں گے تو حیدرآباد پر حملہ کیا جائے گا۔

داب ناجائز سے مجبور ہوکر برار کا انتظام عارضی طور پر اس شرط کے ساتھ کمپنی کے حوالہ کیا گیا کہ اخراجات کی پابجائی کے بعد جو کچھ بچے وہ حیدرآباد کو واپس کیا جائے۔ حیدرآباد کنٹنجنٹ یا رسل برگیڈ ایک غیر قانونی فوج تھی جو ہمارے حکام کی عدم واقفیت کی وجہ سے کمپنی کے قبضہ میں چلی گئی۔ جن کی وجہ سے نہ صرف فوج بلکہ ریاست کو برار سے بھی ہاتھ دھونا پڑا۔

اس وقت تک تو ہم نے دیسی ریاستوں کے معاہدات اور کمپنی کے نقض معاہدات کی تفصیل دیکھی اب یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ باوجود ملکہ معظمہ۔ ایڈورڈ ہفتم جارج پنجم کے مندرجہ ذیل اعلانات کے محکمۂ سیاسیات کا یہ طریق عمل کیوں رہا؟

ملکہ معظمہ نے سنہ ۱۸۵۸ء میں اعلان کیا کہ۔

"ہم دیسی رؤسا کی عزت حقوق اور وقار کی مثل اپنے عزت کریں گے۔"

سنہ ۱۹۰۳ء میں ایڈورڈ ہفتم نے اعلان کیا کہ:۔

"رؤسا اور دیسی حکمرانوں کے حقوق اور وقار کا احترام کیا جائے گا اور اس کی حفاظت کی جائے گی اور اس کو

حب سابق بر قرار رکھا جائے گا کیونکہ ان کی دوستی اور وفاداری ہمیشہ استوار رہی ہے۔"

جارج پنجم نے دربار دہلی میں دیسی رؤسا کو مخاطب کرتے ہوئے ۱۹۱۱ء میں فرمایا :-

"میں ذاتی طور پر ان یقینات کی تجدید کرتے ہوئے مسرت محسوس کرتا ہوں جو آپ لوگوں کے اقتدار اور حقوق کی حفاظت کے لئے میرے پیشروؤں نے آپ کو دلائے ہیں۔"

اس اعلان کی توثیق ۱۹۱۹ء، ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ غرض ہر نیا بادشاہ ہر اہم موقع پر بطور رواج ایک اعلان کرتا یا اپنے پیشرو کے اعلان کی توثیق کرتا۔

محکمہ سیاسیات کی پالیسی کا دارومدار مندرجہ ذیل حالات پر ہے۔

غدر تک تو ہندوستان کی حکومت کمپنی کے ہاتھوں میں تھی۔ غدر کے بعد معاہدات کی نگرانی کا کام محکمہ سیاسیات کے سپرد ہوا یہ محکمہ بحیثیت اقتدار اعلیٰ کام کرتا رہا۔ پارلیمنٹ کو محکمہ پر سوالات کرنے کا موقعہ نہ تھا۔ جنگ عظیم کے بعد سے محکمہ سیاسیات کو اپنی پالیسی میں تھوڑی سی تبدیلی کرنا پڑی اور اس پالیسی کی تبدیلی کی وجہ سے ایوان رؤسا (Chamber of Princess) کا عمل ممکن ہوا کیونکہ جنگ عظیم سے پہلے یہ پالیسی تھی کہ ایک ریاست کے دوسری ریاست سے تعلقات ہی نہ قائم ہوں۔ ممکن ہے کہ معاہدہ شکنی کی صورت میں تمام ریاستیں متحد ہو کر علم بغاوت بلند کر دیں۔ ایوان رؤسا کے قیام سے صرف اتنا ہوا کہ والیان ریاست آپس میں مل بول لیتے ہیں۔ ایوان رؤسا کی تمام کارروائیاں محکمہ سیاسیات کے تحت ہیں۔ ایوان کے ممبروں کو اتنی بھی آزادی کلام حاصل نہیں جتنی کہ ہماری "انجمن اتحاد" کے ممبروں کو ہے ۱۹۲۲ء میں رؤسا نے اپنی قانونی حیثیت کے متعلق مشورہ لینا چاہا تو محکمہ سیاسیات نے اس کی اجازت نہ دی۔

جب کمپنی نے اولاً معاہدات کئے تو رؤسا کی حیثیت کے لحاظ سے معاہدات ہوتے تھے۔ اور اسی لحاظ سے معاہدہ میں تخاطب ہوتا تھا مثلاً بعض سے برابری کا عمل ہوتا اور بعض سے کمتری۔ بمقدمہ نواب آف کرناٹک بنام ایسٹ انڈیا کمپنی ۱۷۹۲-۲- دیسی جنس رپورٹس-۱ طے کیا گیا کہ کمپنی کی حیثیت برابری کی ہے ۱۸۲۹ء تک نظام حیدرآباد سے جو سرکاری مراسلت ہوئی اس میں گورنر جنرل "نیاز مند" لکھتا اور نظام الملک "مابدولت"۔ جیسے جیسے زمانہ گذرتا گیا اور قوت میں ترقی ہوتی گئی ویسے ویسے طرز تخاطب بدلنے لگا اور معاہدات کی پابندی غیر ضروری سمجھی جانے لگی۔ ایک زمانہ وہ آیا کہ ان معاہدات کو ردی کاغذ کے پرزے[1] سمجھا جانے لگا۔ کمپنی کے ایجنٹ اور رزیڈنٹوں کو حکومت کی خواہش تھی اسی خواہش کے تحت

[1] دیکھئے "Scraps of Paper" by Nicholson

وہ دیسی ریاستوں کے معاملات میں اپنی فوج کے زور پر دخیل ہوتے تھے۔ اور یہ دخل درمعقولات دوسرے رزیڈنٹ کے لئے نظیر ہو جاتا تھا۔ رفتہ رفتہ یہ تمام نظائر ایک نظائری قانون کی شکل میں مدون ہوگئے جس وقت ہندوستان کمپنی کے ہاتھوں سے نکل کر برطانیہ کے تحت آیا۔ اس وقت یہ نظائری قانون موجود تھے۔ یہ قانون سرچارلس لیوس ٹوپر کا مدونہ ہے۔ اس قانون کا کچھ حصہ بصیغہ راز محفوظ ہے۔ اُس حصہ میں رزیڈنٹوں اور گورنر جنرل کے لئے ہدایتیں ہیں کہ ان کو رؤسا کے ساتھ کیسا برتاؤ رکھنا چاہئے۔ ۱۹۲۲ء میں ایوان رؤسا نے اس قانون کو دیکھنے کی خواہش کی تو انڈیا آفس نے انکار کر دیا۔

ہندوستان کی حکومت حاصل ہونے کے بعد یہ ادعا کیا گیا کہ (۱) دیسی ریاستیں چونکہ حکومت ہند کی ماتحت ہیں اور حکومت ہند برطانوی پارلیمنٹ کے۔ اس لئے برطانیہ کو اقتدار برتر (Paramountcy) حاصل ہے۔ جب دیسی ریاستیں اس نظریہ پر اعتراض کرتی ہیں تو اُن کو مقدمات سکریٹری آف اسٹیٹ ان کونسل بنام کماچی بائی ۱۳ مورس پریوی کونسل کیس ۲۲۔ اور سکریٹری آف اسٹیٹ ان کونسل بنام سلامن۔ ۱۹۰۶۔ ا۔ک۔ب ۲۱۲ کا حوالہ دے کر اقتدار برتر کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ فعل مصلحت کی وجہ سے ہوا۔ اس پر نہ تو ہند کی کسی عدالت کو اور نہ برطانیہ کی کسی عدالت کو اختیار سماعت ہے۔ ابھی تک تو یہ نظریہ یک طرفہ ہے کسی دیسی ریاست نے اسے تسلیم نہیں کیا ہے۔

۲۔ دیسی رؤسا حکومت ہند کے کارندے ہیں یا موروثی عہدہ داران کہ جن کو تاج برطانیہ نے اپنی سلطنت کے کچھ حصے انتظاماً سپرد کئے ہیں۔

محکمۂ سیاسیات نے ۱۸۹۳ء میں سرچارلس لیوس ٹوپر سے "Our Indian protectorate" نامی کتاب نظریہ اقتدار برتر کے پرچار کے لئے لکھوائی جب اس کی اشاعت پر بہت لے دے ہوئی تو ولیم لی وارنر سے ایک اور کتاب (Protected Princess of India) لکھوائی گئی۔ اس میں بھی ۱۹۱۰ء میں ترمیم کی گئی اس کے بعد اسے (The native states of India) کا نام دیا گیا۔ اگرچہ اس کتاب میں نظریہ اقتدار برتر کا اس قدر پرچار تو نہیں ہے جتنا کہ اول الذکر دو کتابوں میں مگر پھر بھی دبی زبان سے کئی جگہ کہا گیا کہ

"The Paramount power has the right to assert their jurisdiction to a greater or less extent"

محکمۂ سیاسیات نے یہ کتابیں عوام کے لئے لکھوائیں ہیں۔ مگر اپنے رزیڈنٹوں کو اس کی ہدایت کر دی ہے کہ وہ مارس ٹوپر کی' رائز' کی ہدایتوں پر عمل کریں۔

قانون جس کے تحت ریاستوں اور اقتدار اعلیٰ یعنی تاج کا تعلق منضبط کیا جاتا ہے ایک عجیب نظام قانون ہے۔ کیونکہ اس قانون دستوری کی مثال کسی دوسرے ملک کے قانون دستوری میں نہیں ملتی ہے۔ یہ قانون خود درد طریقہ سے کمپنی بہادر کے طریق کار (usage) سے پیدا ہوا۔ دیسی ریاستیں معاہدات سے بڑھ کر طریق کار (usage) کی پابند سمجھی گئی ہیں۔ لارڈ کرزن دیسی ریاستوں کو برطانوی شہنشاہیت کا ستون سمجھتے تھے۔ اس کے باوجود انھوں نے دیسی روساء سے کبھی بھی ان کے حقوق کے متعلق کچھ نہ کہا بلکہ اُن کی ذمہ داریوں کا تذکرہ کرتے رہے۔

نظریہ اقتدار برتر کو لارڈ ریڈنگ نے اپنے خط موسومہ حضور نظام میں بہت اچھی طرح واضح کیا ہے[له]۔ اور اسی اقتدار برتر کے نظریہ کے تحت ریاستوں کے معاملات میں صریحی طور پر دخل دیا جاتا رہا ہے کبھی تو ضرورت اور مصلحت اور کبھی تمام ہند کے مفاد کو وجہ موجہ بنایا گیا۔ اور جب صریحی طور سے دخل دینا وقت کے لحاظ سے مناسب نہ تھا تو مشورہ کے نام ہدایت کی گئی۔ جیسا کہ نواب سکندر جاہ کو وزیر اعظم کے تقرر کے وقت مشورہ دیا گیا تھا۔

لفظ مشورہ کے معنی جو محکمہ سیاسیات سمجھتا ہے وہ ذیل کے خط سے واضح ہوں گے۔ یہ خط مہاراجہ ریوا کو ان کے پولیٹکل ایجنٹ نے لکھا تھا۔

——"ہز ایکسلنسی وائسرائے بہادر نے کہا کہ جب وائسرائے بذات خود کسی دیسی رئیس کو مشورہ دے تو دیسی رئیس کے لئے یہ غیر دانشمندانہ اور غیر صحیح فعل ہوگا کہ اس مشورہ پر عمل نہ کرے۔ کبھی بھی اُن کو نہ تو حکم دیا جائے گا اور نہ سرکاری طور سے استدعا کی جائے گی——"

اقتدار برتر کے نظریہ کی اشاعت کی کوشش میں الفاظ کو اس قدر تبدیل کر دیا گیا ہے کہ اُن کے معنی میں زمین آسمان کا فرق ہو گیا ہے مثلاً تخت نشینی کے بجائے گدی نشینی۔ کامل اختیار حکومت (Full reigning powers) کو بدل کر کامل اختیار (Full Powers) کر دیا ہے۔ ان الفاظ کی تبدیلی سے جو معنی میں تغیر ہوا اس کا اندازہ بخوبی کیا جا سکتا ہے۔

محکمہ سیاسیات کی اس پالسی کی روح رواں یہ ہے کہ کمپنی یا حکومت برطانیہ کے مقررہ کردہ حکام نے حکومت کی خواہش

له دیکھئے Indian new Constitutions by Eddy & Lawton Page 20

اور اپنے نام کو زندہ رکھنے کے لئے ہمیشہ یہ کوشش کی کہ برطانیہ کا فائدہ رہے۔ اسی مطمح نظر کے تحت انھوں نے کبھی یہ نہیں سوچا کہ کیا ہم ایسا کر سکتے ہیں؟ اگر اُن کا مطمح نظر یہ ہوتا تو آج ہندوستان کی سیاسیات ہی بالکل علحدہ ہوتی۔ اس کے برخلاف اُن کا مطمح نظر یہ تھا کہ برطانیہ کے مفاد کی خاطر ہم کو کیا کرنا چاہئے؟ اور اسی وجہ آج کلائیو کو ہندوستان میں انگریزی سلطنت کا بانی وارن ہیسٹنگز کو معمار اور ڈلہوزی کو استرکار کہا جاتا ہے۔

سر طامس منرو نے لکھا ہے کہ "ہم ہندوستانی روسا کو معاہدات میں خود مختار بادشاہ تسلیم کرتے ہیں اس کے بعد اپنا ایک رزیڈنٹ ان کے یہاں متعین کرتے ہیں جو بجائے سفیر کے ایک آمر (dictator) کے فرائض انجام دیتا ہے —— ان کے خانگی معاملات میں دخیل اور ستمردانہ اختیارات کا استعمال کرتا ہے۔"

ایڈورڈ ڈنہتم نے لکھا کہ

"مجھے جس بات سے بہت تعجب اور افسوس ہوا وہ پولیٹکل افسروں کا دیسی روسا کے ساتھ برتاؤ ہے میں اس پر متاسف ہوں اور کامل یقین کرتا ہوں کہ یہ طریق کار بالکل غلط ہے۔"

مندرجہ بالا واقعات کے نتیجہ کے طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ برطانیہ معاہدات کو ردی کاغذ کے پرزے سمجھتا ہے۔ کاش کہ برطانیہ کو یہ سمجھایا جا سکتا کہ جس طرح وہ "کاغذ کے پرزے" کے لئے ۱۹۱۴ء میں جنگ عظیم میں شریک ہو کر جرمنی سے معاہدہ درستی کروا سکتا ہے وہی حیثیت اِن کاغذ کے پرزوں کی ہے —— مگر

آنکھ پر ہوتا ہے جب یہ سر مجبوری عیاں
خشک ہو جاتا ہے دل میں اشک کا سیل رواں (اقبال)

محمد مظہر الدین احمد انصاری۔ بی اے (علیگ)
متعلم ال ال بی (آخری)

دل

برستے ہیں جہاں جلوے خدا کے وہ صنمخانہ / چھلکتی ہے مئے کوثر جہاں وہ بزم رندانہ
کمندِ وہم ہستی ایک نقشہ جس کی الجھن کا / قیامت ایک ادنےٰ سا نمونہ جسکی دھڑکن کا
جگر کا خون پی پی کر جہاں ارمان پلتے ہیں / جہاں درد والم ذوقِ محبت کو مسلتے ہیں
نگاہیں خیرہ ہو جاتی ہیں نورانی نظاروں سے / جہاں حسن و محبت کھیلتے ہیں چاند تاروں سے

جسے کہتے ہیں دل جو ایک غیر آباد بستی ہے
وہ اک قطرہ لہو کا ہے مگر بنیادِ ہستی ہے

محمود علی، سال دوم

حیدرآباد میں اصلاحِ معاشرت کی کوششیں

سبزواری صاحب نہایت مشاق مضمون نگار ہیں ان کے اکثر مضامین مجلۂ عثمانیہ اور ہندوستان کے دیگر وقیع رسالوں میں چھپ کر مقبول ہو چکے ہیں۔ ان کے مقالوں کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ بڑی محنت اور جانفشانی سے لکھے جاتے ہیں اور یہی وجہ ہے کہ سبزواری صاحب کے قلم سے جو مضمون نکلتا ہے وہ علمی اور تحقیقی ہوتا ہے جامعہ عثمانیہ نے ایسے اچھے محقق اور بلند پایہ مضمون نگار کم پیدا کئے ہیں۔ ——————— مدیر

دنیا کی سیاسی، معاشی دستوری اور اخلاقی تاریخ میں اٹھارویں صدی کے ربع آخر میں بڑی اہم تبدیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ اس دور کے دو اہم تغیرات جن کا اثر بنی نوع انسان کی زندگی کے ہر پہلو پر پڑا صنعتی انقلاب اور انقلاب فرانس ہیں صنعتی انقلاب حقیقتاً علوم فطری کی ترقی اور فنی ترقی کی وجہ سے نمودار ہوا۔ بھاپ کی ایجاد، اور اس کی وجہ سے دخانی مشین اور انجن کی ایجاد کے امکانات پیدا ہوئے۔ ریل اور دیگر ذرائع آمد و رفت کی وجہ سے سیر و سفر، حمل و نقل اور تجارت میں ترقی ہوئی۔ مختصر یہ ہے کہ قدرت پر انسان کی فتوح کا آغاز ہوا اور معاشی زندگی میں اہم تبدیلیاں نمایاں ہونے لگیں،

سرمایہ داری کے طریق کو تقویت ہوئی۔ پیدائش بہ پیمانۂ کبیر کا آغاز ہوا، مانگ سے زیادہ مال تیار ہونے لگا۔ پیدائش دولت سے زیادہ اہمیت دولت کی نکاسی کو حاصل ہوئی۔ آبادی دیہات سے قصبات کی طرف منتقل ہونے لگی، چھوٹے چھوٹے قصبوں نے اہمیت حاصل کرنا شروع کی۔ کارخانوں کے قیام، تقسیم عمل کے امکانات، مکانات کی قلت، آبادی کی کثرت اور صحت پر اس کے مضر اثرات، تعلیم اور اسی قسم کے دوسرے پیچیدہ مسائل پیدا ہونے لگے۔ دوسری طرف نشاۃ ثانیہ کا نتیجہ بالآخر امریکہ کی آزادی اور انقلاب فرانس کی صورت میں نمودار ہوا۔ امریکہ اور فرانس کا اقوام عالم پر یہ بڑا احسان ہے کہ انھوں نے حقوق انسانیت کے حاصل کرنے میں دنیا کی رہنمائی کی۔ مختلف طبقوں اور بالخصوص محکوم اور ادنیٰ طبقوں کو حقوق عطا کیے گئے۔ ان کے حقوق کی نگہداشت کی جانے لگی۔ اور مختصر یہ کہ سرکاری نظم و نسق میں ان کی مداخلت کے حق کو باضابطہ طور پر تسلیم کر لیا گیا۔

قرون اولیٰ اور قرون وسطیٰ کے بعد تک یہی خیال عام تھا کہ حکومت کا کام اپنی رعایا کے جان و مال کی غیر اقوام کے حملوں سے حفاظت اور اپنی عملداری میں امن و امان قائم رکھنا تھا۔ ایک اور خیال جو بعد میں تقویت پاتے پاتے حکومت کے فرائض میں داخل ہو گیا ہے کہ محض اندرونی اور بیرونی حملوں سے محفوظ رکھنا حکومت کے وجود کا صحیح نصب العین نہیں ہو سکتا۔ اس کا حقیقی منشا یہ ہے کہ وہ ملک کے اندر ایسے حالات پیدا کرے کہ باشندوں کی مرفہ الحالی میں اضافہ ہو، علوم و فنون کی ترقی ہو، رعایا کی جسمانی صحت کا معیار بلند ہو، ایسے انتظامات کرے جن کی بدولت باشندوں کو کھانے کے لئے صحت بخش غذا، پہننے کے لئے عمدہ کپڑا، رہنے کے لئے ہوادار مکان میسر ہو، ملک میں وباؤں اور بیماریوں کی کمی ہو جائے، اور جو باقی بھی رہ جائیں ان کے علاج کے بہترین ذرائع مہیا ہوں۔ سماجی بندشیں یا رسوم و رواج افراد کو جانی و مالی نقصانات نہ پہونچا سکیں۔ اگرچہ ابتدا میں اس اصول کو باضابطہ طور پر تسلیم نہ کیا گیا تھا مگر اس زمانہ میں بھی بہت سی باتوں پر عمل ہوتا تھا۔ مثلاً فوجی سڑکوں اور شاہراہوں کی تعمیر، سپاہیوں کی بیواؤں اور یتیموں کی امداد، قحط اور مصیبتوں کے زمانہ میں سرکاری امداد، علوم و فنون کی سرپرستی بالخصوص درباری شعرا کی قدر و منزلت، وغیرہ وغیرہ۔ دربار صناعوں کی بھی سرپرستی کرتے تھے۔ عبادت گاہوں، مدرسوں، خانقاہوں، پاٹھ شالوں کی امداد کے لئے جاگیریں عطا کی جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ گو حکومت معاشی اور سماجی معاملات میں دخل نہ دیتی تھی مگر ہر ملک اور ہر دور میں ایسے روشن خیال، ہمدرد خلائق، فرض شناس، عالی دماغ، دیانت دار حاکم گذرے ہیں

جنکی توجہ اس طرف بھی رہتی تھی۔ (Garrat) اور (Edward) نامی مورخین اپنی کتاب Moghul rule in India مطبوعہ لندن ۱۹۳۰ء کے صفحہ ۱۴ پر اکبر اعظم کی اصلاحی تحریکات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ "گو اکبر کو ہندوؤں اور راجپوتوں کو اپنے ساتھ ملانے کی دھن تھی مگر اس اصول کے تحت اس نے بنی نوع انسان کی ہمدردی کو فراموش نہ کیا۔ دختر کشی کی ممانعت کی، لڑکے اور لڑکی کی بلا رضامندی کی شادیوں کو ناجائز ٹھہرایا۔ بیواؤں کے دوبارہ عقد پر زور دیا اور ستی کی رسم کو بند کرنے کی کوشش کی۔" مگر اس قسم کی مثالیں مستثنیاتی صورتوں میں داخل ہیں اور چونکہ یہ اصلاحیں شخصی ہوتی تھیں اس لئے ان میں استحکام اور دیرپائی موجود نہ ہوتی تھی۔ مگر گذشتہ صدی میں دنیا نے اس اصول کو تسلیم کیا کہ حکومت کو معاشی اور سماجی معاملات میں بھی دخل دینا چاہئے اور اس کے بعد سے رفتہ رفتہ عدم مداخلت کی پالیسی کمزور ہوتی گئی اور سماجی اور معاشی معاملات میں حکومت کا عمل دخل بڑھتا گیا۔

حیدرآباد کے دور جدید میں ممالک محروسہ سرکار عالی کے ہر شعبہ اور ہر سررشتہ میں تبدیلیاں نظر آتی ہیں اگر ایک طرف زراعت کی ترقی کے لئے محکمہ زراعت، زرعی مزرعے اور عظیم الشان بند تیار کئے گئے تو دوسری طرف عوام کی ذہنی اور دماغی ترقی کے لئے جامعہ عثمانیہ کی داغ بیل پڑی۔ ذرائع آمد و رفت میں ترقی، شوارع کی تعمیر، محکمہ آرائش بلدہ، عدالت العالیہ انگریزی اور یونانی دواخانوں کا قیام، لاسلکی اور ہوائی اسٹیشنوں کی تعمیر اسی دور کے نمایاں کارنامے ہیں اس سلسلہ میں ان معاشی اور سماجی قوانین و اصلاحات کو بھی نظرانداز نہ کیا تھا جن کا مقصد عوام کی فلاح و بہبود سے تھا۔ یوں تو اعلیحضرت غفران مکان نے سالار جنگ اول کی وفات کے بعد ان کے رتبہ نظم حکومت کی کافی آزمایش کرکے اور نقائص کو دور کرکے ۱۸۹۲ء میں "قانونچہ مبارک" نافذ فرمایا تھا اور کچھ عرصہ کے بعد مزید اصلاح و انتظام کی خاطر ۱۸۹۵ء میں "قواعد قانونچہ" کی اشاعت عمل میں آئی۔ جب اعلیحضرت سلطان العلوم سریر آرائے سلطنت ہوئے تو حضور نے اصلاح کی خاطر انتظام مملکت کا بار گراں خود برداشت کرنا قبول فرمایا اور ۵ سال کے غور و خوض کے بعد حضور نے جدید تنظیم کا ارادہ فرمایا جس کا مقصد خود الفاظ ہمایونی میں "عزیز رعایا کی مزید فلاح و بہبود کے ذرائع کا قیام و استحکام تھا۔" چنانچہ ۱۹۱۹ء میں ایک جدید دستور کا نفاذ ہوا اور باب حکومت کا قیام عمل میں آیا۔ قوانین پر نظر ثانی ہوئی اور ان ہی کو ایک مجموعہ کی صورت میں ترتیب دیا گیا جو

"مجموعہ قوانین سرکار عالی" کہلاتا ہے اور جس میں تغیر و تبدل کی بھی گنجائش ہے۔

ہندوستان ایک قدیم ملک ہے جس کا شمار ایک زمانہ میں دنیا کے متمدن ممالک میں ہوتا تھا۔ یہاں مختلف مذاہب اور فرقوں کے لوگ آباد ہیں۔ ہر ایک کی طرز معاشرت اور رسوم و رواج جداگانہ ہیں مگر آپس کے میل جول نے ایک دوسرے پر گہرے اثرات ڈالے ہیں نئی اور بیرونی حکومت کے قیام نے قدیم معاشرت کی دیواریں متزلزل کر دیں مگر نہ تو وہ قدیم معاشرت کو بالکل مٹانے میں کامیاب ہوئی اور نہ اس کی جگہ جدید معاشرت ہی قائم ہو سکی۔ اس کے علاوہ موجودہ اعلیٰ تعلیم کی کمی، غلط تعلیمی نظریات اور دوسرے وجوہ کی بنا پر قدیم عمدہ اصول و نظریات کی صورت ایسی مسخ ہوگئی کہ یہ بھی معلوم کرنا مشکل ہوگیا کہ ان میں کیا کیا خوبیاں تھیں۔ زمانہ اور ماحول ہر وقت بدلتا رہتا ہے۔ دنیا میں وہی قوم یا ملک ترقی کر سکتا ہے جو اپنے اندر زمانہ اور ماحول کے مطابق تبدیلیاں کرتا رہے۔ مگر ہندوستان میں ایسا نہ ہوا اور سماجی زندگی اس بری طرح تباہ ہوئی کہ اس کے اثرات نہ صرف سماج پر پڑے بلکہ ہماری معاشی، تمدن اور سیاسی زندگی میں بھی نمودار ہوگئے۔ ایسی صورت میں ملک کی سب سے بڑی خدمت یہی ہو سکتی تھی کہ سماجی اصلاح کی طرف توجہ کی جائے مگر یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ ملک میں مصلحین معاشرت کی تعداد ہمیشہ کم رہی۔ ممالک محروسہ بھی ہندوستان کا ایک حصہ ہے یہاں بھی وہی حالات ہیں جو ہندوستان کے دیگر حصوں میں موجود ہیں اور یہاں کی سماجی زندگی میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے اس مضمون میں اس جز کا خاکہ مجملاً پیش کیا گیا ہے۔

نفس مضمون پر روشنی ڈالنے سے پہلے عمرانی قوانین کی مختصر تشریح ضروری ہے۔ ہر قانون کا اثر براہ راست یا بالواسطہ طریقہ پر، ہماری عمرانی زندگی پر پڑتا ہے۔ کیا اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ فوجداری کے سنگین جرائم مثلاً ڈکیتی، قتل، بلوہ کو ممنوع اور ناجائز قرار دینے والے قوانین عمرانی قوانین کے دائرہ میں داخل نہیں ہیں۔ بے شک ان سے اور اس قسم کے دیگر قوانین سے ہماری عمرانی زندگی متاثر ضرور ہوتی ہے مگر ان کا اثر بالواسطہ طریقہ پر پڑتا ہے۔ عمرانی قوانین میں ہم ان ہی اصولوں اور ضابطوں کو شامل کر سکتے ہیں جن کا تعلق براہ راست ہماری معاشرت یا سماج سے ہو۔ اس پابندی سے ہمارا دائرۂ تحقیق محدود ہو جاتا ہے اور کام میں آسانی ہو جاتی ہے۔

ستی۔ ہندوستان میں قدیم زمانہ سے ستی کی رسم جاری تھی۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ شوہر کی وفات کے بعد اس کی بیوی یا بیویوں کو زندہ رہنے کا حق نہیں ہے۔ اس لئے ان کو شوہر کی نعش کے ساتھ ہی جلا دیا جاتا تھا اکبر نے اپنے دور حکومت میں اس قبیح رسم کو روکنے کی کوشش کی۔ تو اس کو صرف اس قدر کامیابی ہوئی کہ کوئی عورت بلا رضامندی

کے جلائی نہ جا سکتی تھی۔ اس کا رواج زیادہ اس لئے نہ بڑھا کہ سماج شوہر کے مرنے کے بعد عورت کو بھی مردہ تصور کرتی تھی اس کو دوبارہ شادی کی اجازت نہ تھی۔ اس کو شادی کی تقاریب میں شرکت کی ممانعت تھی۔ اس کو کھانے پینے اور پہننے کی آزادی نہ تھی۔ مختصر یہ کہ اس کی زندگی موت سے بدتر تھی اس وجہ سے وہ موت کو ہی زندگی پر ترجیح دیتی تھی جب ہندوستان میں انگریزی حکومت قائم ہوئی تو لارڈ ویلزلی نے اس رسم کے انسداد کی کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی بعد میں لارڈ ولیم بینٹنگ نے اس کی ممانعت کے لئے ایک قانون نافذ کیا اور برطانوی ہند میں راجہ رام موہن رائے کی کوششوں سے ۱۸۲۹ء میں ستی کا خاتمہ ہوا۔ گو اس رسم کا خاتمہ آج تک قطعی طور پر تو نہیں ہو سکا ہے اور اب بھی سال میں ایک آدھ واقعہ پیش آہی جاتا ہے مگر اس کی وہ شدت نہیں رہی ہے جو پہلے تھی۔

اگرچہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں یہ رسم عام نہ تھی جیسا کہ خود قانون کی تمہید سے ظاہر ہوتا ہے تاہم بنظر دفع و انقطاع ۲۲ جمادی الاول ۱۲۸۲ھ (سنہ ف) کو قانون ستی نافذ کیا گیا جس کی تمہید حسب ذیل ہے۔

"چونکہ رسم و دستور ستی کا یعنی بیوگان ہنود کا زندہ جلنا اور دفن ہونا رحم اور رقت طبیعت انسانی کے خلاف ہے اور مذہب ہنود میں بھی بطور فرض و واجبات کے کوئی حکم موکد نہیں ہے بلکہ برخلاف اس کے بیوگان کے لئے عفت سے خلوت نشینی کا طریقہ مخصوص و معین اور مقرر ہے اور گو ممالک محروسہ سرکار عالی میں اس دیار کے اکثر لوگوں میں یہ رسم مروج نہیں ہے اور وہ مطلق اس کی رعایت نہیں کرتے اور بعض تعلقات میں مطلقاً عمل میں نہیں آتی تاہم بنظر دفع و انقطاع کلی رسم مذکور کے لئے ذیل کا قانون نافذ کیا گیا۔"

اس قانون کی رو سے ستی ہونے یعنی عورت کے زندگی میں جلنے یا دفن ہونے کو جرم قرار دیا گیا۔ نیز جملہ زمینداروں، تعلقہ داروں، مالکان اراضی، مستاجروں، جاگیرداروں، مقطعہ داروں، پٹیل، پٹواریوں اور مقدموں کو اس امر کا ذمہ دار قرار دیا گیا کہ وہ ہر ہونے والی ستی کی اطلاع پولس کو دیں اور اگر وہ اس کی خلاف ورزی کریں تو قانون کی نظر میں مستوجب سزا ہوں گے۔

جنسی و معاشی استحصال جنسی استحصال سے مراد اس طرح جنسی لطف حاصل کرنا ہے جن میں جان بوجھ کر عمداً ایک فریق کا فائدہ اور دوسرے کا نقصان ہو۔ عصمت فروش طبقہ کی عورتوں کی بڑی تعداد رضامندی اور بڑی خوشی سے اس پیشہ کو اختیار نہیں کئے ہوئے ہے۔ تحقیقات سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ بعض افراد اس طبقہ کو قائم

رکھنے کے لئے معصوم اور کمسن اور بالخصوص غریب خاندانوں کی لڑکیوں کو یہ پیشہ اختیار کرنے پر مجبور کرتے ہیں۔ انسان کی خرید و فروخت اگرچہ عرصہ ہوا قانوناً ممنوع قرار دی جاچکی ہے مگر قانونی گرفت سے بچنے کے لئے متعدد بہانے تلاش کئے جاتے ہیں۔

ہندوستان میں جنسی استحصال کی مختلف صورتیں مختلف شکلوں میں نظر آتی ہیں اور توہم پرست اور بدنفس اور بدکردار افراد مذہب کا نام لے کر جنسی استحصال میں مدد دیتے ہیں۔ اس کی ایک شکل کمسن لڑکیوں کو دیوتاؤں کے نام پر بطور چڑھاوے کے چڑھانا ہے۔ ہندوستان کے اکثر حصوں اور خصوصیت سے جنوبی ہند میں یہ رسم شدت سے جاری تھی۔ اس کی ابتداء کیوں اور کب ہوئی اور اس کا اصل مقصد کیا تھا۔ یہ بذات خود ایک تفصیلی بحث ہے۔ سردست ہم اس بحث میں پڑنا نہیں چاہتے مگر یہ جانتے ہیں یہ رسم جنسی استحصال کی ایک بین صورت تھی۔ اور انسانیت کی پیشانی پر ایک بدنما داغ تھی۔ چنانچہ اس سلسلہ میں متعدد احکامات جاری ہوئے۔ پہلا اعلان محکمہ معتمدی عدالت سے ۲۹ فروردی ۱۳۳۲ف کو ہوا جو حسب ذیل ہے۔

"سرکار عالی کو معلوم ہوا ہے کہ بعض اشخاص مذہبی رسوم انجام دینے کے بہانے کمسن لڑکیوں کو دیوتاؤں کے نام سے اس غرض سے نامزد کرتے ہیں کہ ان کی کمسنی کے زمانہ میں ان کو خلاف اخلاق کام کرنے میں مصروف کرکے ناجائز منفعت حاصل کریں۔ سرکار عالی کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ کسی فرقہ کے مذہبی افعال میں کسی طرح دست اندازی کرے لیکن جس صورت میں کہ کوئی شخص مذہبی افعال کے بہانے سے ان لڑکیوں کو جن کی عفت کی حفاظت اس کا فرض ہے ناجائز منفعت کی غرض سے فعل شنیع کے لئے یا کسی ناجائز یا خلاف اخلاق غرض کے لئے کام میں لائے گا تو سرکار عالی اس کے فعل کو کسی طرح جائز نہیں رکھ سکتی۔ اس لئے بذریعہ ہذا اطلاع دی جاتی ہے کہ کوئی شخص ذمہ داری سے محض اس وجہ سے محفوظ نہ ہوسکے گا کہ کوئی لڑکی جس کی عمر ۱۶ سال سے کم ہو، مرلی، بھوانی، درادھن، جوگن، پری، وغیرہ بنائی گئی۔"

جنسی استحصال کی دوسری شکل یہ تھی کہ بعض افراد دوسری اقوام کی کمسن لڑکیوں کو اپنی یا اپنے عزیزوں کی اولاد ظاہر کرکے شادی کی غرض سے مالدار افراد کے ہاتھ فروخت کردیتے تھے۔ نیز اس سلسلہ میں کبھی کبھی یہ بھی ہوتا تھا کہ نیچ ذات کی لڑکیوں کو اعلیٰ ذات کی ظاہر کرکے فروخت کیا جاتا تھا۔ چنانچہ ان دونوں خرابیوں کو روکنے کے لئے صدر تعلقات کوتوالی سے ۲۷ اسفندار ۱۳۱۹ف کو حسب ذیل گشتی جاری ہوئی۔

"شادی کی غرض سے کم استطاعت کومٹی اپنی لڑکیاں ہم قوم مالدار اشخاص کو معقول رقم لے کر دینے کے

عادی ہیں۔ اس پیرایہ میں بدمعاش لوگ دوسرے اقوام کی لڑکیاں لے کر جن کو وہ اپنے عزیزوں کی اولاد ظاہر کرتے ہیں دور دراز مقامات پر جا کر ان لڑکیوں کو رقم لے کر شادی کی غرض سے مالدار اشخاص کے حوالے کر دیتے ہیں۔ لہذا اس قسم کے لوگوں کی نگرانی کرنا چاہئے۔ نیز عام طور پر کومٹیوں کو ان حالات سے آگاہ کیا جائے جب کوئی شخص کمسن لڑکیوں کو ان کے پاس لائے تو اس کی اطلاع قریب ترین پولیس اسٹیشن پر کی جائے"

کوتوالی کی ۲ر اسفندار ۱۳۴۳ف کی دوسری گشتی ملاحظہ ہو۔

" ایسے کئی واقعات پیش آچکے ہیں کہ دلالی پیشہ اشخاص نے پنچ قوم کی لڑکیوں کو بڑی قوم کی ظاہر کر کے کومٹیوں کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ نیز ملک پنجاب کو جہاں لڑکیوں کی کمی ہے لڑکیاں بھگالے جانے کی کوشش کی گئی۔ ایسے اشخاص کو مجرم قرار دیا جاتا ہے"

غریب خاندان کے بچوں یا اطفال لاوارث کا معاشی اور جنسی استحصال بڑی آسانی سے کیا جا سکتا ہے بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ مالدار افراد غریب آدمیوں کے بچے پرورش کے لئے لے لیتے تھے مگر بعد میں اس سے ناجائز فائدہ حاصل کرتے تھے۔ اس لئے کوتوالی اور عدالت کے ایک اعلان مورخہ ۱۲ اردی بہشت ۱۳۲۰ف کے ذریعہ دوسروں کے اطفال کی پرورش کی ممانعت کر دی گئی۔ مگر محکمہ کو اس قسم کی اطلاعات موصول ہوتی رہیں کہ یہ ممانعت بجائے مفید ہونے کے مضر ثابت ہو رہی ہے کیونکہ دیہاتی رعایا یتیم خانوں کے حسن انتظام سے ناواقف ہوتی ہے مگر مقامی متمول اور مالدار افراد پر بھروسہ کرتی ہے اور بچوں کو پرورش کے لئے ان کے سپرد کرنا آسان تصور کرتی ہے۔ کیونکہ یہاں ایک فائدہ یہ بھی ہوتا ہے کہ والدین اور اولیا نہ صرف اپنے بچوں کے حالات سے باخبر رہتے ہیں بلکہ ان سے مختلف اوقات میں مل جل بھی سکتے ہیں۔ مگر ممانعت کی وجہ سے مقامی متمول افراد کو تو پرورش کا حق نہ رہا اور والدین اپنے بچوں کو یتیم خانوں میں داخل کرنے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ لازماً کم استطاعت والدین کے بچوں کی پرورش میں گڑبڑ پیدا ہو گئی۔ چنانچہ ۱۶ ار تیر ۱۳۳۲ف کو گذشتہ اعلان منسوخ کیا گیا اور آئندہ کے لئے حسب ذیل اعلان پر عمل درآمد ہونے کا حکم جاری کیا گیا۔

" غیر مستطیع اطفال کو بغرض پرورش کسی کو دینے اور لینے کی ممانعت کی گئی تھی جس کی نسبت سرکار کو اطلاع موصول ہوئی کہ اس حکم کی تعمیل سے رعایا کو مختلف دشواریاں محسوس ہو رہی ہیں لہذا اس حکم میں یوں ترمیم کی جاتی

ہے کہ اگر غیر مستطیع والدین واولیا اپنے اطفال کو بغیر فروخت کئے ہوئے اپنی رضامندی سے کسی کو بغرض پرورش دیں تو عدالت و پولیس تعرض نہ کرے گی مگر ان سے بدسلوکی قابلِ مواخذہ رہے گی نیز والدین کو یہ اختیار ہر وقت حاصل رہے گا کہ وہ جب چاہیں اپنے اطفال کو واپس لے لیں۔

متمول افراد ابتداء میں تو غریب خاندانوں کے بچوں یا لاوارث بچوں کو پرورش کی غرض سے حاصل کر لیتے تھے مگر بعد میں ان پر بڑے بڑے ظلم کرتے تھے۔ ان سے سخت سے سخت کام لیتے تھے، اور ان کی حالت غلاموں سے زیادہ بہتر نہ ہوتی تھی چنانچہ ان مظالم کے روکنے کے لئے معتمدی عدالت وکوتوالی سے آبان ۱۳۳۹ف کو حسب ذیل گشتی جاری ہوئی۔

"چند کارروائیوں کے ضمن میں یہ ظاہر ہوا ہے کہ بعض اوقات لاوارث اطفال پرورش کے نام سے حاصل کئے جاتے ہیں لیکن ان کے ساتھ جیسا انسانیت کا سلوک کیا جانا چاہئے وہ نہیں کیا جاتا اور ان کی حالت غلامی سے کچھ زیادہ بہتر نہیں ہوتی۔ بعض اشکال میں کم عمر بچوں کو خانگی طور پر ملازم رکھا جاتا ہے اور ان پر ظلم کیا جاتا ہے۔ ان تمام امور کے انسداد کے لئے قانون کی شکل میں عنقریب احکام نافذ کئے جائیں گے لیکن فی الوقت ان کے انسداد کے لئے حسب ذیل احکام جاری کئے جاتے ہیں۔

(۱) دفعہ ۳۷۰ تعزیرات سرکار عالی کی رو سے انسان کی خرید و فروخت جرم قرار دی گئی ہے اس دفعہ کی بڑی سختی سے پابندی کی جائے۔

(۲) آئندہ سے ۱۰ سال سے کم عمر کے کسی بچہ کو بطور خانگی ملازم رکھنا ممنوع قرار دیا گیا۔

سنہ ۱۳۳۱ف تک لاوارث اطفال کی پرورش کے متعلق جو مختلف احکام، گشتیات اور دستور العمل نافذ تھے اب ان میں ترمیم کی گئی اور وضاحت کے ساتھ مکمل طور پر قواعد اطفال لاوارث مرتب کئے گئے جن کا نفاذ یکم آذر ۱۳۳۶ف سے ہوا۔ اس کی بعض اہم دفعات حسب ذیل ہیں۔

طفل لاوارث سے مراد وہ بچہ ہے جس کی عمر ۱۲ سال سے کم ہو اور جو ایسی حالت میں پایا جائے کہ اس کا پرورش کنندہ کوئی نہ ہو۔ لاوارث بچوں کو یتیم خانہ میں داخل کیا جائے۔ نیز ایسے بچے جن کے والدین انھیں پرورش کرنے سے مجبور رہیں انہیں یتیم خانہ سرورنگر میں داخل کیا جائے۔

اس قانون کی دفعہ ۲۱ کی رو سے جب کسی لاوارث لڑکی (جو زیر حفاظت عدالت ہو) سے کوئی شخص عقد

کرنے کی درخواست کرے تو ناظم تحقیقات کنندہ کو حسب ذیل امور کی بابت محکمہ سرکار کو اطلاع دینا ہوگی

الف۔ خواہشمند لڑکی کا ہم قوم و ہم مذہب ہے یا نہیں۔

ب۔ خواہشمند اور لڑکی کی عمر کیا ہے۔

ج۔ خواہشمند کا رویہ عام طور پر کیا ہے

د۔ خواہشمند کی وجہ معاش کیا ہے اور ماہانہ یافت کس قدر ہے۔

ھ۔ خواہشمند کی شادی پہلے ہو چکی ہے یا نہیں۔ اور کیا اس کی پہلی بیوی زندہ ہے

و۔ دیگر ضروری امور

یہ وہ امور ہیں غالباً جن کی تحقیقات اچھے گھرانوں ہیں نہیں کی جاتی۔ ان امور کے پیش ہونے کے بعد شادی کی اجازت دی جاتی ہے لاوارث لڑکی کے عقد کے لئے ۲۵ روپیہ بغرض اخراجات عقد خوانی دئے جاتے ہیں۔ یتیم خانوں میں رہنے والے بچوں کے لئے بلدہ کے اطفال کی خوراک درجہ اول ۸ روپیہ اور درجہ دوم ۶ روپیہ اور اضلاع کے بچوں کے لئے ۵ روپیہ مقرر ہیں۔

عقد بیوگان اہل ہنود۔ ہندو مذہب کے عالموں نے اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ ہندو مذہب کی رو سے عقد بیوگان کی مخالفت نہیں ہے مگر رسم و رواج نے اس کو مذہبی حیثیت دے دی۔ کیشو راؤ آنجہانی نے ازدواج بیوگان ہندو کے لئے ایک مسودہ قانون ۱۳۳۲ف میں پیش کیا تھا جس کا مقصد بیوہ عورتوں کو عقد ثانی کی اجازت دینا تھا اور ان ظالمانہ قوتوں کا خاتمہ کرنا تھا جو عرصہ دراز سے ان کی زندگی پر مسلط تھیں اور جس کی وجہ سے عورتیں معاشی حیثیت سے تباہ اور سماجی حیثیت سے ناامید ہو چکی تھیں۔ مگر جب یہ مسودہ مجلس وضع قوانین میں پیش ہوا تو بعض حضرات نے اس کی سخت مخالفت کی اور ثابت کیا کہ بیوہ کا عقد ثانی مذہبًا جائز نہیں۔ اس مخالفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہ مسودہ تعویق میں پڑ گیا اور ۱۳۴۶ف تک اس پر کوئی کارروائی نہ ہو سکی مگر اس سال مجلس نے اس کو پاس کیا اور حال ہی میں اعلیحضرت بندگان عالی نے اس کو شرف منظوری بخشا ہے۔ اس قانون کی رو سے ہر ہندو بیوہ کو شادی کرنے کی اجازت ہے اور ایسی شادی کی اولاد صحیح النسب متصور ہوگی۔ بیوہ کی شادی کا یہ اثر ہوگا کہ اس کے تمام حقوق جو اس کو شوہر متوفی کی جائداد میں بہ لحاظ احکام دھرم شاستر بہ حیثیت بیوہ کے حاصل ہیں زائل ہو جائیں گے۔ مگر اس صورت

میں اس کا اثر کچھ نہ ہوگا جب بیوہ کے حقوق از دواج سے زائل نہ ہوتے ہوں۔

اصلاحات و قوانین محابس۔ محققین جرمیات نے اس بات کو اچھی طرح ثابت کر دیا ہے کہ جرائم کے ارتکاب میں مواقع اور شدت ترغیب کو بھی بڑا دخل ہے۔ بعض لوگ حالات یا مصیبت سے مجبور ہو کر ایسی حرکتیں کر بیٹھتے ہیں جنھیں جرم سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ ان بدقسمت افراد کو مجرم تصور کرنا یا بغیر ماحول کا لحاظ کئے ہوئے یا بغیر جرم کے داخلی و خارجی اسباب کو پیش نظر رکھتے ہوئے سخت سزائیں دینا اصلاح نہیں بلکہ ان کو تباہی کے غار میں ڈھکیلنا ہے۔ نیز بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ مجرم سزا سے بچ جاتے ہیں اور بے گناہ پھنس جاتے ہیں ان وجوہ کی بنا پر قیدیوں کے ساتھ ہمدردانہ اور منصفانہ سلوک کرنے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ ممتاز ناول نویسوں اور ڈرامہ نگاروں کی وجہ سے ان خیالات کو غیر معمولی مقبولیت حاصل ہوئی اور متمدن ممالک میں قیدیوں کی اصلاح کی طرف توجہ کی جانے لگی۔ ممالک محروسہ میں ۱۳۱۲ف سے "قانون محابس" نافذ ہے۔ اس قانون کی رو سے کسی قیدی کو جس کو قید با مشقت کی سزا دی گئی ہو یا وہ خود اپنی خوشی سے مشقت کرتا ہو ۹ گھنٹے روز سے زائد کام کرنے کی اجازت نہیں دی جاتی۔ نیز قیدیوں کو جرائم محابس کے سلسلہ میں جو سزائیں دی جاتی ہیں۔ مثلاً قید علیحدگی میں قیدی کو روزانہ کم از کم ایک گھنٹہ ورزش کے لئے دینا۔ یا اس کو ایک یا ایک سے زائد قیدیوں کے ساتھ کھانا کھانے کی اجازت دینا۔ نیز کسی حالت میں بھی مسلسل ۶ گھنٹے سے زائد غذا اسے نہ روکا جائے۔

محابس سرکار عالی میں مذہبی اور تمدنی لکچروں کا انتظام بھی ہے اور ۴۰ سال سے کم عمر کے قیدیوں کو ان کی مادری زبانیں اردو، تلنگی، مرہٹی، اور کنڑی سکھلائی جاتی ہیں۔ قیدیوں کو اس بات کا یقین دلانے کے لئے کہ وہ بے حس یا مردہ نہیں ہیں مختلف قسم کے کھیلوں کا انتظام ہے قیدیوں کی بہتری کے لئے امدادی انجمنیں قائم ہیں۔ محکمہ متعلقہ کے زیر غور یہ تجویز بھی ہے کہ محابس میں مختلف موضوعات مثلاً خانوادہ شاہی، اکابرین ملک، نظام حکومت، ملک و ممالک کے باہمی تعلقات، شہریت کے فرائض، حفظان صحت کے اصول، جغرافیہ، ابتدائی سائنس وغیرہ پر لکچروں اور تقریروں کا انتظام بھی کیا جائے۔

ماہ جنوری ۳۳ء کے اخبارات میں سررشتہ معلومات عامہ کی جانب سے ناظم صاحب کوتوالی اضلاع سرکار عالی کی حسب ذیل اطلاع شائع ہوئی۔

"تمام اضلاع میں انجمن ہائے امداد سزا یافتگان کی ایک اسکیم منظور کی گئی ہے۔ ان کی انجمنوں کی شاخیں تعلقوں میں بھی قائم کی جائیں گی، ان انجمنوں کا اصلی مقصد یہ ہوگا کہ وہ سزا یافتہ لوگوں کی قید سے رہائی کے بعد دیکھ بھال کریں اور ان کو دوبارہ جرائم کی طرف مائل ہونے سے باز رکھیں ——— عہدہ داران اضلاع کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ایسی انجمنوں کی تشکیل کی فوری کارروائی شروع کردیں، جن کے ارکان پبلک کے افراد ہوں، پیش نظر یہ تجویز ہے کہ مزدوروں سے کام لینے والے اصحاب مثلاً گرنیوں کے مالک، زمیندار، ٹھیکہ دار اور بڑے تاجروں کو ترغیب دلائی جائے کہ وہ سماج کے ان بدنصیب افراد کو ملازم رکھنے میں پس و پیش نہ کریں۔"

ان انجمنوں کا قیام اصلاح کی جانب ایک بڑا عمدہ قدم ہے، یہ واقعہ ہے کہ ہمارے مجرموں کی بڑی تعداد ایسی ہے جس میں جیل خانے جانے سے قبل ایک قسم کی حیا، حجاب، اور غیرت موجود ہوتی ہے، مگر جیل میں زندگی بسر کرنے کے بعد، اور وہاں کے ماحول سے متاثر ہونے کے بعد بری عادتیں ان کی سرشت میں داخل ہوجاتی ہیں، نیز وہ لوگ جو قید خانے سے نکلتے وقت یہ عہد کرکے نکلتے ہیں کہ آئندہ پاک دامنی کی زندگی بسر کریں گے، سماج ان کو مجبور کرتا ہے کہ وہ دوبارہ جرم کریں، کیونکہ ہر جگہ ان کی تحقیر ہوتی ہے کسی کارخانہ، دوکان، یا مکان میں ان کو ملازم رکھنے سے گریز کیا جاتا ہے، دوست احباب، اور عزیز و اقارب ان سے ملتے جلتے ہوئے گھبراتے ہیں، ظاہر ہے کہ یہ معاشرتی اور معاشی اسباب ان کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ اپنی توبہ کو توڑ دیں اور پھر وہی زندگی اختیار کریں جس کو چھوڑ دینے کا وہ عہد کرچکے تھے۔ ایسی صورت میں انجمن ہائے امداد سزا یافتگان کا قیام، اور ان کی اصلاحی کوششیں اگر کامیاب ہوں تو اس سے انسداد جرائم میں بڑی مدد ملے گی۔ نیز اس سلسلہ میں جیل خانوں کے قواعد و ضوابط میں بھی ترمیم کی ضرورت ہے، مثلاً طویل سزاؤں میں کمی، جیل کی اصلاح، قیدیوں کے ساتھ عمدہ سلوک، ان کو نیکی کی تلقین کرنا، اور سب سے اہم چیز یہ کہ ان اسباب کو دور کرنا جن کی وجہ سے متعدد جرائم ظہور پذیر ہوتے ہیں بہت ضروری اور لازمی ہے۔

نوعمر مجرموں کو تادیب خانے میں رکھنا لازم ہے۔ اور ۱۳۲۲ف سے قانون تادیب خانہ جات نافذ ہے۔ نوعمر مجرم سے مراد وہ لڑکا ہے جس کی عمر ۱۵ سال سے کم ہو۔ ان کے لئے حسب ذیل باتوں کا انتظام ہے۔

۱۔ رات کو علیحدہ سونے کا
۲۔ پانی، خوراک، اور بہتر حفظ صحت کا
۳۔ صنعت و حرفت یا کوئی مفید کام سکھانے کا
۴۔ بیماری کے زمانہ میں شفاخانہ میں علاج کرانے کا۔

تادیب خانہ میں رہنے کی مدت ۳ سال سے ۷ سال تک ہے اور ۱۸ سال سے زائد عمر کا کوئی لڑکا یہاں نہیں رہ سکتا۔

ہندوستان کے تقریباً تمام صوبوں اور دیسی ریاستوں میں ایسی اقوام آباد ہیں جو جرائم کرتی رہتی ہیں ان کی نگرانی کرنا اور نیک نفس افراد اور عام رعایا کو ان کی بداعمالیوں سے محفوظ رکھنا حکومت کے فرائض میں داخل ہے۔ چنانچہ ممالک محروسہ سرکار عالی میں بھی ۱۳۲۲ھ سے قانون اقوام جرائم پیشہ نافذ ہے۔ اس قانون کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ یہاں زراعت، صنعت، یا دیگر اصلاحی کاموں کے لئے تادیب خانے قائم ہیں۔ وہاں مشتہرہ اقوام جرائم پیشہ کو رکھا جاتا ہے۔ نیز بچوں کے لئے مدارس قائم کئے جاتے ہیں۔ اور بچوں کو جن کی عمر ۶ سال سے ۱۰ سال کے درمیان ہو والدین سے الگ رکھا جاتا ہے۔ ۱۳۲۶ھ میں ان ہی اصولوں کی وضاحت کے لئے "قواعد نوآبادیات جرائم پیشہ" مرتب ہوئے زرعی نوآبادیات میں ضعیف اور معذوروں کے علاوہ تمام باشندوں کو لازماً کام کرنا پڑتا ہے اور کام کے اوقات حسب ذیل ہیں۔

بچے (۱۲ سال سے کم) ۴ گھنٹے یومیہ
نوجوان (۱۸ سال سے کم) ۶ " "
جوان (۱۸ سال سے زائد) ۸ " "

دس سال سے کم عمر بچوں کو کام کرنے کی ممانعت ہے۔

صنعتی نوآبادیات میں آباد باشندگان کے لئے حسب ذیل کاموں میں سے کسی ایک کا انتظام ہوتا ہے ان نوآبادیات میں شرح اجرت جہاں تک ممکن ہو تکمیل شدہ کام کے لحاظ سے فرداً فرداً مقرر ہوتی ہے تاکہ محنت اور جفاکشی کی ترغیب اور صلہ پاتی ہوتی رہے۔

(۱) پارچہ بافی
(۲) دری و قالین بافی
(۳) سبد سازی یا بوریا بافی
(۴) سنگ شکنی، سنگ تراشی یا سنگ کنی۔

(۵) نجاری و آہن گری (۶) باغبانی

(۷) افزائش مویشی و مرغ (۸) تعمیر و ترمیم امکنہ

(۹) مٹی کا کام

جرائم پیشہ افراد کی ہر نوآبادی میں ایک مدرسہ قائم ہے جہاں نوآبادی کے جملہ ساکنین کے بچوں کی تعلیم کا انتظام ہوتا ہے۔ ہر بچہ کو جس کی عمر ۵ سال سے ۱۸ سال کے درمیان ہو اس مدرسہ میں تعلیم کا حاصل کرنا ضروری ہے۔

بیگار —— ہندوستان میں اس قسم کی غلامی کا دور تو کبھی نہیں گذرا جیسا کہ امریکہ یا دیگر ممالک میں رائج تھا مگر یہاں قدیم سے غلامی کی دوسری شکلوں کا رواج موجود رہا۔ ان ہی میں سے ایک صورت بیگار کی ہے۔ سرکاری عہدہ دار، جاگیردار، زمیندار اور دوسرے ذی اثر لوگ شہروں اور بالخصوص دیہات کے ان پڑھ اور ناواقف لوگوں سے سرکاری، غیر سرکاری اور خانگی کام لیا کرتے ہیں اول تو اس کام کا معاوضہ ادا ہی نہیں کیا جاتا اور اگر کبھی ادا بھی کیا جاتا ہے تو یہ اجرت برائے نام ہوتی ہے۔ حکومت سرکار عالی نے عہدہ داروں اور سرکاری ملازموں کی حد تک تو بیگار کے اس طریقہ کو اس طرح مسدود کیا کہ ضابطہ ملازمت سیول سرکار عالی کی دفعہ ۲۶۸ کی رو سے عہدہ داروں کے دورہ یا منتقلی میں جیسے اسباب سرکاری دفتر کی باربرداری کا نرخ بشرح ذیل مقرر کر دیا۔

(۱) قلی مرد جو ۱۲ سیر سے زائد وزن نہیں اٹھائے گا۔ فی میل ۱ر

(۲) عورت ۸ " " اٹھائے گی " ۴

(۳) بچہ ۶ " " اٹھائے گا " ۳ر

(۴) یابو یا خچر " ۱ر

(۵) گدھا " ۲ پائی

(۶) جفت بیل معہ آدمی " ۲ر

(۷) اونٹ " ۲ر

(۸) بغیر بیل کی بنڈی " ۶ پائی

(۹) بنڈی معہ بیل و آدمی " ۳ر

(۱۰) کھاچہ معہ بیل و آدمی " ۲ر

نیز سنہ ۱۳۲۲ف میں "قواعد شکار" کا نفاذ ہوا جس میں ہانکے والوں کے لئے شرح اجرت کی وضاحت کر دی گئی۔ یعنی اگر بڑے جانور کا شکار ہو تو ان کو روزانہ فی کس ۴ ر ادا کئے جائیں۔ چھوٹے جانوروں کی صورت میں ۲ ر یومیہ اجرت دینا چاہئے۔ اگر کسی دن شکار کیمپ میں ہانکہ والوں کو جمع کیا جائے مگر ان سے کام نہ لیا جائے تو ان کو ۱ ر یومیہ کے حساب سے اجرت ادا کرنا لازمی ہے۔ اجرت کسی غیر شخص کے ذریعہ سے نہ دی جائے بلکہ براہ راست ہانکہ والوں کو دی جائے اور اجرت فی الفور ادا کی جائے دوسرے دن کے لئے ملتوی نہیں کی جا سکتی۔ ان دونوں نکتوں کو مفید ہونے کا احساس غریب ہانکہ والوں کو بخوبی ہو سکتا ہے کیونکہ دنیا جانتی ہے کہ جب اجرت کسی تیسرے شخص کے ذریعہ سے ادا کی جاتی ہے تو اس کا کس قدر حصہ تقسیم کنندہ کی جیب میں جاتا ہے اور کسی قدر کام کرنے والوں کو ملتا ہے۔ اور فی الفور اجرت کی عدم ادائگی کی صورت میں اکثر یہی دیکھا جاتا ہے کہ گذشتہ ایام کی اجرت یا تو ادا ہی نہیں کی جاتی اور اگر ادا بھی کی جاتی ہے تو اس کی تعداد ضرور کم ہو جاتی ہے۔ مگر ان دونوں طریقوں کی وضاحت سے ان خرابیوں کے پیدا ہونے کے امکانات کم ہو گئے ہیں۔ نیز شکار کے سلسلہ میں شکار کرنے والوں کو جس قدر کھلگوں کی ضرورت ہو ان کو قطعی طور پر خرید لیا جائے۔ حکومت نے ان کی عمر کے لحاظ سے ان کی قیمت بھی مقرر کر دی ہے جو ۶ روپئے سے ۹ روپیہ تک ہے۔ مگر ۴ سال سے زیادہ عمر کے کھلگوں کو خریدنے کی ممانعت کر دی ہے کیونکہ اس سے کاشت کاروں کو نقصان ہوتا ہے کیونکہ ان کو زراعت وغیرہ میں استعمال کرتے ہیں۔

مگر ان قواعد کے باوجود یہ کہنا کہ ممالک محروسہ میں شکار کا قطعی انسداد ہو چکا تھا ہرگز صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ قانون بیگار کی صریحاً ممانعت نہ کی گئی تھی۔ اس سلسلہ ۱۳۴۲ف میں حسب ذیل فرمان مبارک بتقریب سالگرہ مبارک شایع ہوا۔

"ہمارے ممالک محروسہ میں بیگار کا طریق جو ابھی تک جاری تھا اس کو میں اپنی سالگرہ کی تقریب میں یکلخت موقوف کرتا ہوں کیونکہ اس سے رعایا کو سخت تکلیف ہوتی ہے اور آئندہ سے حکم دیتا ہوں کہ جو کوئی اس کی خلاف ورزی کرے گا وہ مستوجب سزا سمجھا جائے گا۔"

چیچک —— ہم جانتے ہیں کہ غذا کی کمی اور حفظان صحت کے اصولوں سے غفلت اور لاپروائی کی وجہ سے ہندوستانیوں کی جانداری اور سکت کس قدر ادنیٰ اور پست ہوتی جا رہی ہے۔ معمولی معمولی امراض بھی وباؤں کی طرح پھیلتے ہیں۔ "اور ہزاروں کی جان لیتے ہیں اور لاکھوں کی کارکردگی اور صحت کو خراب کر دیتے ہیں۔" "ٹائمس آف انڈیا" کی "انڈین ایر بک" بابتہ سنہ ۱۹۲۰-۲۱ء کے صفحہ (۵۹۵) برطانوی ہند کی سنہ ۱۹۲۳ء کی ان اموات کو ۱۰۰،۵۶،۲۴۲ بتایا ہے جو کالرہ، چیچک،

پلیگ، بخارات، پچش اور دیگر امراض سے ہوئیں صرف چیچک سے اس سال ۹۲۸ و ۳ ر ۸ اموات ہوئیں۔ حالانکہ چیچک سے بچنے کا بہت آسان طریقہ چیچک کا ٹیکہ لے لینا ہے۔ مگر ہماری نادانی اور لاپروائی کی اس سے زیادہ اور کیا انتہا ہو سکتی ہے کہ ہم اس پر بھی عمل نہیں کرتے۔ ممالک محروسہ سرکار عالی میں چیچک کے ٹیکہ کو دو طرح سے لازمی قرار دیا گیا ہے۔ اور ضابطہ ملازمت سیول کی دفعہ کی رو سے کوئی شخص اُس وقت تک ملازمت قسم اعلیٰ پر مستقل طور سے مامور نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ چند شرائط کا حامل نہ ہو اور ان میں سے ایک ضروری شرط یہ بھی ہے کہ وہ اپنی عمر و صحت کے متعلق ایک طبی صداقت نامہ پیش کرے جس میں بطور خاص چیچک کے متعلق حسب ذیل امور کی وضاحت ضروری ہے۔

مسمی ـــــــ

(۱) کو چیچک نکل چکی ہے۔

(۲) کے بازو پر ٹیکہ کا نشان نمایاں طور پر موجود ہے۔

(۳) کو نہ چیچک نکلی ہے اور نہ ٹیکہ لگایا گیا ہے جس کی وجہ سے وہ ٹیکہ لگانے کے بعد ملازمت میں شامل ہونے کے قابل ہوگا۔

گر چونکہ یہ پابندی صرف اعلیٰ ملازمتوں کے لئے محدود تھی۔ اس سے متوسط اور ادنیٰ طبقہ کس طرح متاثر ہو سکتا تھا حالانکہ ٹیکہ کی سب سے زیادہ ضرورت ان ہی دونوں طبقوں کے لئے ہے۔ اس لئے ۱۳۴۳ف میں "قواعد چیچک آری" نافذ ہوئے۔ جس کی رو سے ان تمام اطفال کے چیچک کا ٹیکہ لگانا لازمی قرار دیا گیا جن کی عمر ۶ ماہ سے ایک سال کے درمیان ہو۔

قوانین کارخانہ جات۔ ہندوستان میں انیسویں صدی کے آخر سے ایک نئے قسم کے قوانین کا سلسلہ جاری ہوا۔ اس سے میری مراد قوانین کارخانہ جات ہے۔ انگلستان میں جب اول اول کارخانے جاری ہوئے تو اُس وقت وہاں عدم مداخلت کی پالیسی کا دور تھا۔ سرکاری نگرانی نہ ہونے کی وجہ سے بڑی خرابیاں پیدا ہو گئیں مثلاً کارخانے تنگ و تاریک مکانات میں تھے، جہاں ہوا، روشنی اور صفائی کا کوئی معقول انتظام نہ تھا، مزدوروں کا ہجوم، مردوں اور عورتوں کا وقت بے وقت اجتماع، طویل اوقات کار، کمسن بچوں اور عورتوں سے ضرورت سے زائد کام، خطرناک کلوں کا استعمال، ادنیٰ اجرتیں، اور متعدد معاشرتی اور اخلاقی خرابیوں کا آغاز ہوا۔ ان سب

باتوں نے صحت و اخلاق کو جس قدر نقصان پہنچایا ہوگا وہ محتاج بیان نہیں۔ اگرچہ ہندوستان میں یہ خرابیاں اس قدر نمایاں نہ ہوسکیں کیونکہ یہاں کارخانوں کے قیام کے ساتھ ہی قوانین کارخانہ جات نافذ ہونے لگے۔ برطانوی ہند میں پہلا قانون کارخانہ جات ۱۸۸۱ء میں نافذ ہوا۔ اگرچہ یہ بہت ہی ناکمل اور ناقص تھا۔ مگر کارخانوں کے بعض معاملات میں پابندیاں عاید کرنے کا باعث ہوا۔ اس کے بعد جس طرح کارخانوں میں ترقی ہونے لگی اسی طرح ان قوانین میں بھی ترمیم و تنسیخ ہوتی گئی۔ ۱۳۳۷ف میں ممالک محروسہ میں بھی "قانون کارخانہ جات سرکار عالی" کا نفاذ ہوا جس کی چند اہم دفعات حسب ذیل ہیں۔

اس قانون کی رو سے کارخانہ سے مراد وہ جگہ ہے جہاں سال کے اندر کسی ایک دن کم از کم ۲۰ اشخاص ایک ساتھ کام پر لگائے جائیں۔ مگر سرکار عالی کو یہ بھی حق حاصل ہے کہ وہ ان مقامات کو بھی کارخانہ قرار دے سکتی ہے جہاں کم از کم ۱۰ آدمی کام کرتے ہوں۔ ہفتہ سے مراد وہ مدت لی گئی جو یوم پنجشنبہ گذرنے کے بعد رات کو ۱۲ بجے سے شروع ہو اور آئندہ پنجشنبہ کو ۱۲ بجے شب کو ختم ہو۔ ہر کارخانہ میں پینے کے لئے صاف پانی، بیت الخلاء اور پیشاب خانہ کا انتظام ضروری ہے۔ کسی عورت یا بچہ سے کارخانے میں کلوں کی صفائی کا کام نہ لیا جائے جبکہ وہ بھاپ یا پانی کی قوت سے یا برقی قوت یا قوت متحرکہ سے چل رہی ہوں۔

زیادہ سے زیادہ ۶ گھنٹے کے بعد ایک گھنٹہ کا وقفہ دیا جائے یا کام پر لگائے ہوئے اشخاص کی استدعا پر کم از کم نصف گھنٹہ کا وقفہ اسی طرح دیا جائے کہ کوئی شخص مسلسل ۵ گھنٹے سے زیادہ کام نہ کرسکے۔

اس قانون میں "طفل" سے مراد وہ لڑکا ہے جس کی عمر ۱۵ سال سے کم ہو۔ اور ان کے لئے ۵½ گھنٹہ کے بعد نصف گھنٹہ کا وقفہ لازمی قرار دیا گیا۔

کسی کارخانہ میں جمعہ کے روز کام نہ لیا جائے بجز اس کے کہ جمعہ کے قبل یا بعد کے تین دنوں میں سے کسی ایک دن اس کو پورے ایک دن کی تعطیل دی گئی ہو یا دی جانے والی ہو۔ تعطیل کا دن اسی طرح مقرر ہونا چاہئے کہ کسی شخص کو مسلسل دس دن سے زائد کام کئے بغیر ایک پورے دن کی تعطیل مل جائے۔

۱۲ سال سے کم عمر بچے کو کارخانہ میں ملازم نہ رکھا جائے۔ اور اس سے زائد عمر والے لڑکے کے لئے بھی صداقت نامہ طبی لازمی ہے۔ کسی لڑکے سے صبح ساڑھے ۵ بجے سے پہلے یا شام کو ۷ بجے کے بعد کام نہ لیا جائے کسی لڑکے سے روزانہ ۶ گھنٹے سے

زاید کام نہ لیا جائے۔

عورتوں کو بھی صبح ۵ بجے سے پہلے اور شام کو ۷ کے بعد کام کرنے کی ممانعت کر دی گئی نیز کسی عورت سے کسی دن ۱۰ گھنٹے سے زائد کام نہ لیا جائے۔ مردوں کے لئے ۶۰ گھنٹے فی ہفتہ مقرر کئے گئے مگر اس طرح کہ کسی ایک دن ان کو ۱۱ گھنٹے سے زائد کام نہ کرنا پڑے۔

کارخانہ کے عام راستہ پر ایک بورڈ لگا یا جائے جس پر حسب ذیل امور کی صراحت ہوا کرے

الف۔ ہر روز کام کے آغاز اور اختتام کا وقت

ب۔ وقفہ کا تعین اور وقت

ج۔ اگر باری باری سے کام کرنے کا انتظام ہو تو اس کے آغاز اور اختتام کا وقت

د۔ کام کرنے والوں کی مجموعی تعداد

ہ۔ ہفتہ واری تعطیلات

اگر کارخانہ میں کوئی حادثہ ہو تو منتظم کو چاہئے کہ مدت مقررہ کے اندر اس کی اطلاع عہدہ دار متعلقہ کو دے۔ نیز کسی بچہ کو اگر اس کا باپ یا ولی ایک دن میں دو کارخانوں میں کام کرنے پر مجبور کرے تو اس پر جرمانہ کیا جائے گا جس کی مقدار ۲۰ روپیہ تک ہو سکتی ہے۔

اس قانون میں انجن یا مشینوں کے گرد جنگلہ لگانے کی اس لئے توضیح نہیں کی گئی کہ اس سلسلہ میں ۱۳۱۹ھ میں ایک "قانون متعلقہ بائلرز و مشینری" نافذ ہو چکا ہے۔ اس کی رو سے کسی انجن یا بائلر یا مشینری کو بغیر انجینیر یا ماہر ناظر کی بغیر اجازت استعمال کرنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ ناظر کو یہ بھی اختیار ہے کہ اگر وہ کسی مشین کے گرد کٹہرا لگانے کا حکم دے اور مدت معینہ میں کٹہرا نہ لگایا جائے تو مشین بند کی جا سکتی ہے۔

۱۳۲۰ھ میں "قانون معادن" نافذ ہوا۔ جس کی رو سے ۱۲ سال سے کم عمر بچے کو زیر زمین کام کرنے کی ممانعت کر دی گئی ہے۔ اور معدنوں میں ناظروں کا تقرر ہوا۔ جن کا فرض ہے کہ وہ یہ دیکھیں کہ معدن کے ہر حصہ میں ہوا پہونچنے کا معقول انتظام ہے یا نہیں اور کسی شخص کو خطرہ کی جگہ تو کام نہیں کرنا پڑتا ہے۔ نیز جب کسی معدن میں کوئی حادثہ پیش آ جائے تو ایجنٹ یا منیجر فوراً اس کی اطلاع حکام متعلقہ کو دے گا۔

انسداد مسکرات۔ ممالک محروسہ کی آمدنی کا مالگذاری کے بعد دوسرا بڑا ذریعہ آبکاری ہے۔ چنانچہ ۱۳۴۷ف بجٹ کے موازنہ کے مطابق اس سررشتہ سے ایک کروڑ ۱۰ لاکھ روپیہ کی آمدنی ہونے کا امکان ہے[۵] لیکن اس کثیر آمدنی کے باوجود اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس سررشتہ کو توفیر آمدنی کے لئے توفیر مسکرات کا باعث نہ ہونا چاہئے۔ بلکہ انسداد مسکرات بھی اس کے لائحہ عمل میں داخل ہونا چاہئے۔ ممالک محروسہ میں مسکرات کے رواج کو بالکل بند کر دینا تو دانشمندی کے خلاف تھا کیونکہ ممالک محروسہ کے سامنے متمدن ممالک میں سے ریاست ہائے متحدہ امریکہ اور بقول بی۔ ایس۔ قولور، جے۔ پی، ہندوستان میں ایک اسلامی ریاست بھوپال کی مثالیں موجود تھیں جہاں مسکرات کو یک لخت ممنوع قرار دیا گیا۔ مگر بعد کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس لئے یہاں قطعی انسداد کے بجائے تحدید پر زیادہ زور دیا گیا۔ اور حکومت سرکار عالی نے ایک کمیشن مقرر کیا کہ وہ انسداد مسکرات کے لئے ایک مرکزی انجمن کے قیام پر غور کرے۔ کمیشن نے بالاتفاق تصفیہ کیا کہ اس انجمن کی سخت ضرورت ہے چنانچہ ۱۷ر رمضان ۱۳۵۱ھ کے فرمان مبارک کے ذریعہ "انجمن ترک مسکرات" کا قیام عمل میں آیا جو نواب مرزا یار جنگ بہادر صدر، دیوان بہادر ایس آر وامودو آئینگار نائب صدر، اور چار دیگر ارکان پر مشتمل ہے۔

کام جاری کرنے کے لئے حکومت نے ۱۳۴۵ف میں ۵ ہزار، ۱۳۴۶ف میں دس ہزار، اور ۱۳۴۷ف میں ۱۵ ہزار روپیہ دینے کا وعدہ کیا۔ کمیٹی نے بلدہ حیدرآباد کو نو محلوں میں تقسیم کیا ہے۔ اور ہر محلہ میں ایک اعزازی میر محلہ مقرر کیا ہے جس کے سپرد اس محلہ میں ایسے رضاکاروں کو بھرتی کرنا ہے جو اس کام میں اس کو مدد دے سکیں۔ کمیٹی کی جانب سے ایک دار المطالعہ اور ایک کتب خانہ بھی قائم کیا گیا ہے۔ کمیٹی مختلف جلسے کرتی ہے جس میں بیرونی اصحاب کو بھی مدعو کرتی ہے تاکہ وہ مسکرات کے مضر اثرات پر روشنی ڈالیں۔ اور طلسمی فانوسوں کی مدد سے بھی اپنے کام کی تبلیغ کرتی ہے کمیٹی کی جانب سے ہر سیندھی خانہ کے قریب امتناعی بورڈ لگائے گئے ہیں جن پر اردو اور تلنگی میں مسکرات کو کم کرنے کی استدعا کی گئی ہے۔ کمیٹی کے صدر نے ممالک محروسہ کا ایک دورہ بھی کیا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ گلبرگہ، ورنگل اور اورنگ آباد میں بھی اس انجمن کی شاخیں قائم ہو گئیں ہیں۔ نیز ۱۳۴۶ف سے انجمن کی جانب سے ایک ماہوار اردو اور تلنگی کا رسالہ بھی جاری کیا گیا ہے۔ عنقریب کمیٹی کی جانب سے اس سلسلہ میں اردو اور تلنگی کے ڈرامے بھی دکھلائے جانے والے

۵ ملاحظہ ہو کیفیت موازنہ ۱۳۴۷ف مرتبہ نواب فخر یار جنگ بہادر صفحہ ۳۰

ہیں۔ اور نشر و اشاعت کی دوسری تجاویز بھی زیر غور ہیں۔ انجمن ایک "نو آبادی" کی داغ بیل بھی ڈالنے والی ہے جو فی الحال ۵۰ مکانات پر مشتمل ہوگی۔ اس نو آبادی میں رہنے والے ہر فرد کو اس بات کا تحریری عہد کرنا پڑے گا کہ وہ تمام منشیات سے دور رہے گا۔ اور جو شخص اس کی خلاف ورزی کرے گا اس کو نو آبادی سے نکال دیا جائے گا۔ جاپان میں اس قسم کی نو آبادیوں سے بڑے اچھے نتائج پیدا ہوئے ہیں یہ انجمن ابھی ابتدائی حالت میں ہے، اس وجہ سے یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ اس نے کتنے افراد کو اس "لت" سے چھڑایا۔ لیکن یہ اگر اسی طرح کام کرتی رہی تو ممکن ہے کہ چند سال کے بعد اس کے اچھے نتائج برآمد ہوں۔ ایک طرف ترک مسکرات کی انتہائی کوشش کی جارہی ہے دوسری طرف بعض سرکاری یا نیم سرکاری تقاریب میں بلا تکلف ترک مسکرات کا استعمال ہوتا ہے۔ ضرورت ہے کہ انجمن اپنے اخلاقی اثر سے کام لے کر اس کو بھی حتی الامکان کم کرانے کی کوشش کرے۔ حکومت مدراس اپنے جس رقبہ میں انسداد منشیات کا قانون پاس کیا ہے وہاں کسی سرکاری یا نیم سرکاری تقریب میں کسی قسم کی نشہ آور شے کا استعمال بھی ممنوع قرار دیا ہے۔ افیون کے استعمال پر بھی پابندیاں عائد کی جارہی ہیں چنانچہ آج سے ۲۰ سال پہلے ممالک محروسہ میں ۵،۱۵ افیون کی دوکانیں تھیں مگر آج کی تعداد صرف ۹،۵ رہ گئی ہے۔ افیون کی تعداد میں بھی کمی ہوگئی ہے۔ ۲۰ سال قبل ۲۰،۰۰۰ اونس افیون سالانہ خرچ ہوتی تھی مگر اب اس کی تعداد صرف ۱۴،۰۰۰ اونس رہ گئی ہے۔ مقدار کی اس کمی کے باوجود آمدنی میں ۸۰ فیصد اضافہ ہوگیا ہے۔

بیمہ اور پراویڈنٹ فنڈ۔ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ ایسے گھرانے جو کافی متمول ہوتے ہیں مگر یا تو ان میں پیش بینی کی صلاحیت نہیں ہوتی یا وہ اپنے زائد اخراجات کی وجہ سے کچھ پس انداز نہیں کر سکتے ان کے بعد ان کے گھر بار پر مصیبت نازل ہو جاتی ہے۔ ہم کو متعدد ایسی مثالیں ملتی ہیں کہ جہاں اولاد کی معمولی معمولی تقریبات پر ہزاروں روپیہ صرف کیا گیا تھا مگر آج وہی اولاد نان شبینہ کو محتاج ہے۔ حکومت سرکار عالی نے ان ہی امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے "حیدرآباد اسٹیٹ لائف انشورنس پراویڈنٹ فنڈ" کے قانون کا یکم اسفندار ۱۳۳۲ف سے نفاذ فرمایا اور سرکار نے معتدبہ صرف برداشت کر کے بیمہ فنڈ قائم کیا۔ مستثنیاتی صورتوں کے علاوہ تمام ملازمین قسم اعلیٰ پر بیمہ فنڈ سرکار عالی میں چندہ ادا کرنا لازمی ہے۔ نیز اس میں منصب، ماہوار خاص، رعایتی لنگان پانے والوں کو بھی شریک ہونا پڑے گا۔ بیمہ کے دو طریقے رکھے گئے ہیں۔

(۱) حیدرآباد اسٹیٹ لائف انشورنس

(۲) پراویڈنٹ فنڈ

یہ ہر دو فنڈ ایک مجلس انتظامی کے زیر انتظام ہیں۔ جس کے صدر نشیں صدرالمہام فینانس ہوتے ہیں صدر محاسب اور دوسرے عہدہ دار اس کی مجلس انتظامی کے رکن ہوتے ہیں۔ اور ریاست کے تمام ملازمین درجہ اعلیٰ علاقہ سیول و فوج ماہوار یاب زائد از ۲۵ قابل وظیفہ جائدادوں کے ملازموں کو بیمہ کرانا لازمی ہے۔ بیمہ کی عمر ۲۱ سال سے ۵۵ سال کے درمیان رکھی گئی ہے مگر شرح چندہ میں عمر کے اعتبار سے فرق ہوتا ہے مگر عام طور پر شرح حسب ذیل ہے۔

۲۵ سے زائد	اور ۵۰ تک	کے لئے ماہوار	عمہ
۵۰ ″ ″	مار	″	عاہ
مار ″ ″	مار (۲۰۰)	″	للعہ
مار ″ ″	سما (۳۰۰)	″	سے
سمار ″ ″	الما (۴۰۰)	″	مے

اس کے بعد ہر زائد سو روپیہ یا اس کے حصہ پر عاہ

مقررہ رقم کی وضعات ہر ماہ کی تنخواہ کی ادائی کے وقت برآوردات سے ہو جایا کرے گی۔ اگر بیمہ شدہ ملازم ۵۵ سال سے قبل مرجائے تو رقم بیمہ اس کی بیوہ یا ہوگان میں بموجب اس کی درخواست کے تقسیم کی جائے گی۔

پراویڈنٹ فنڈ ان ملازمان کے لئے مخصوص ہے جو حیدرآباد اسٹیٹ لائف انشورنس فنڈ میں شرکت کا استحقاق نہ رکھتے ہوں۔ اس فنڈ میں چندہ دینا اختیاری امر ہے اور معائنہ طبی کی بھی ضرورت نہیں۔ اس فنڈ میں انشورنس فنڈ کے اراکین بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ نیز سرکار ان ملازمین کی بے وقت موت کے بعد ان کے متعلقین کو کسی حق یا وظیفہ یا انعام کا حقدار تصور نہیں کرتی جو اس فنڈ میں شامل نہ ہوں۔

تعمیر امکنہ۔ صنعتی ترقی کے ساتھ ساتھ شہروں کی آبادی میں اضافہ ہونے لگا اور دیہات و قصبات سے زیادہ مزدور آ آ کر بسنے لگے بلکہ شہروں کی دلچسپی اور رونق نے دیہات کے زمینداروں اور جاگیرداروں کو اپنی طرف کھینچنا شروع کیا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شہروں میں مکانات کی قلت محسوس ہونے لگی۔ معمولی معمولی مکانوں اور کمروں کے کرایوں میں

اضافہ ہو گیا کئی کئی خاندان ایک چھوٹے مکان میں یا متعدد افراد ایک ہی کمرہ میں زندگی گذارنے پر مجبور ہوئے۔ ہم جانتے ہیں کہ بعض مخصوص شہر محض اس وجہ سے بیماریوں اور وباؤں کا گھر بن جاتے ہیں کہ وہاں معمولی اور خراب مکانات کی کثرت ہوتی ہے۔ جن میں دھوپ، روشنی اور ہوا کا کافی گذر نہیں ہوتا غلیظ پانی کی نکاس کے لئے پختہ نالیاں نہیں ہوتیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے مکانات یا محلے غریب اور متوسط طبقوں کے لوگوں کے ہوتے ہیں اب ان میں اتنی سکت تو ہوتی نہیں کہ وہ اپنے مکان روشن اور ہوادار بنوائیں سڑکیں کشادہ کرائیں، نالیاں زمین دوز اور پختہ بنوائیں۔ حکومت کی بغیر امداد کے ان کی اصلاح ممکن نہیں۔ اس وجہ سے تمام متمدن ممالک میں تعمیر امکنہ کے مسئلہ کو حکومت نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ ممالک محروسہ میں ان ہی خرابیوں کی اصلاح کے پیش نظر محکمہ آرائش بلدہ قائم کیا گیا۔[5] جس کا مقصد جیسا کہ خود حضرت ظل سبحانی نے جشن سیمیں کے مبارک موقع پر آرائش بلدہ کے سپاسنامہ کا جواب دیتے ہوئے فرمایا تھا یہ ہے "مجھے اس سے بڑی خوشی ہوئی کہ میرے دارالخلافہ میں اس پیچیدہ مسئلہ کو حل کر لیا گیا ہے جو ہندوستان کے بڑے شہروں کے سامنے پیش ہے۔ محکمہ کو صرف بناوٹ اور دکھاوٹ کے کاموں کی طرف توجہ نہ کرنا چاہئے بلکہ اس کا نصب العین غریبوں کے لئے نئے مکانات بنانا اور خراب مکانات کو ختم کرنا ہو"۔

محکمہ نے کثیر الآباد اور غیر صحت بخش علاقوں کی صفائی کا انتظام اپنے ذمہ لیا۔ فیل خانہ جو شہر کا ایک کثیر الآباد حصہ تھا سینکڑوں بیماریوں کی پرورش گاہ بھی تھا۔ حالیہ رپورٹ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس محلہ کا تین چوتھائی حصہ صاف کر دیا گیا ہے، نئے مکانات، کشادہ سڑکیں اور پختہ زمین دوز نالیاں اس علاقہ میں بنوا دی گئیں ہیں۔ چودہ غریب وارڈ (slums) کو ۵ لاکھ پونڈ کے صرفہ سے ختم کر دیا گیا گیارہ مقامات پر نئے مکانات بنائے گئے ہیں جن کی تعداد ۲½ ہزار سے زائد ہو چکی ہے اور جن پر ۲½ لاکھ پونڈ کے قریب صرف ہو چکے ہیں۔ اور ان میں آج کل دس ہزار شہری زندگی بسر کر رہے ہیں۔ یہ مکانات کرایہ پر دیئے جاتے ہیں اور ان کا کرایہ بہت ہی قلیل رکھا گیا ہے۔ مگر بعض محلوں کے مکانات کے متعلق یہ شکایت عام ہے کہ ان پر معقول آمدنی پانے والے اصحاب نے قبضہ کر رکھا ہے اور ایک ایک فرد نے دوسروں کے ناموں سے متعدد مکانوں پر قبضہ کر لیا ہے اس کی وجہ سے غریب اور ادنیٰ متوسط طبقہ کو جن کے لئے در اصل یہ مکان بنائے گئے ہیں سخت نقصان ہوتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں ایک محلہ کے باشندوں کو محکمہ کی جانب سے اس

---

[5] ذیل کی معلومات مسٹر بی ایس آر ورجی پی کے مضمون "موجودہ حیدرآباد" سے لی گئی ہیں جو "اسلامک ریویو" میں ماہ جولائی ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا۔

قسم کا نوٹس دیا گیا ہے کہ ایک معینہ آمدنی پانے والے لوگ ہی ان مکانوں میں سکونت اختیار کرسکتے ہیں اور دوسرے لوگوں سے ان مکانات کا تخلیہ کرایا جارہا ہے۔ اگرچہ قابضین کو یہ امر بہت ناگوار گذرا مگر اصولی طور پر یہ چیز بالکل درست ہے اور میرے خیال میں کوئی سو روپئے سے زائد آمدنی حاصل کرنے والا شخص سات روپئے یا اس سے کم کے مکان میں نہ رہنے پائے۔

یمین السلطنة سر مہاراجہ بہادر کے دور صدر اعظمی کے زمانہ ہی سے ممالک محروسہ میں بہبودی اطفال کی تحریک شروع ہو چکی تھی اور حکومت معتدبہ رقم بہبودی اطفال کے مرکز ان کو بطور امداد دیتی ہے۔ شہر کے اکثر میدانوں اور حصوں میں بچوں کے لئے خوشنما چھوٹے چھوٹے پارک بنوادئے گئے ہیں جہاں کھیل کود کے مختلف سامان بھی موجود ہیں۔ ادنی طبقہ کی عورتوں کے لئے حمام خانے بھی بنوائے گئے ہیں۔

یہ مضمون نامکمل رہ جائے گا اگر اس میں ان کوششوں کا ذکر نہ کیا جائے جو سماجی اصلاح کے لئے بعض ذمہ دار اور درد مند حضرات کی جانب سے پیش کی گئیں یا پیش کی جانے والی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلی چیز قانون تحفظ اوقاف ہے۔ اس مسودہ کو نواب اختر یار جنگ بہادر سابق ناظم و معتمد امور مذہبی و رکن مجلس وضع قوانین نے پیش کیا تھا۔ آپ نے اپنی تقریر کے سلسلہ میں بتایا کہ مملکت حیدرآباد میں اہل اسلام و ہنود کے اکثر اوقاف ہیں اور شاہان حیدرآباد کے عطا کردہ مقطعے، جاگیریں، آراضیات زر نقد ماہانہ اور سالانہ کی تعداد بہت زیادہ ہے اور ایسی املاک ہیں جو معاش مشروط کے نام سے موسوم ہیں لیکن ان کا تحفظ اور انتظام جیسا ہونا چاہئے نہیں ہو رہا۔ اوقاف اور معاش ہائے مشروط خلاف مقاصد وقف و شرائط غلط متولیوں کے قبضہ و تصرف میں ہیں اور اکثر موقوفہ جائدادیں بیع اور رہن بھی ہو چکی ہیں اور ناجائز قبضہ میں ہیں۔ آگے چل کر آپ نے بیان کیا کہ ہر مہذب سلطنت اوقاف کے تحفظ کو اپنا اہم فریضہ سمجھتی ہے چنانچہ مسلمان شاہان ہند کے عہد میں صدر الصدور کا عہدہ جس کے متعلق اوقاف کی نگرانی تھی سلطنت کا سب سے بڑا عہدہ سمجھا جاتا تھا۔ اس کے بعد آپ نے سلاطین ترکی کے عہد کی مستقل وزارت تحفظ اوقاف و انگلستان کے قوانین اوقاف کا ذکر کرتے ہوئے برطانوی ہند کے "قانون وقف اہل اسلام ۱۹۲۳ء" کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ قانون تحفظ اوقاف کے لئے کافی نہیں ہے۔ اس قانون کا مقصد صرف اس قدر ہے کہ متولی جائداد موقوفہ کی آمدنی و خرچ کا سالانہ جانچ شدہ حساب عدالت میں پیش کردیا کریں۔ اس لئے آپ نے اوقاف حیدرآباد کے تحفظ کے لئے ایک باضابطہ محکمہ قائم کرنے کی طرف توجہ دلائی اور یہ مسودہ پیش کیا جن میں مختلف ممالک اور ریاستوں کے قوانین سے مدد لی گئی تھی۔

اس قانون کا مقصد یہ تھا کہ تمام اوقاف کا انتظام، تمام نگرانی اور پابندی احکام قانون ہذا ناظم امور مذہبی کو تفویض ہو جائے

تمام اوقاف کی فہرست مرتب کی جائے جس میں اس کی سالانہ آمدنی مقاصد وقف اور دیگر ضروری امور کی صراحت ہوگی۔ جو جائداد جس کام کے لئے وقف کی گئی ہو اس کے خلاف اس کی آمدنی کسی دوسری مد پر صرف نہ کی جاسکے گی جن اوقاف کے مقاصد معین نہ ہوں سرکار ان کے مقاصد معین کرے گی۔ قدیم اور پرانی موقوفہ عمارات کو فروخت کرکے ان کے معاوضہ میں نئی عمارات خریدی جائیں گی متولی کو یہ اختیار نہ ہوگا کہ وہ جائداد موقوفہ اپنے نفع کے لئے یا کسی اور غرض سے جو اغراض اوقاف کے خلاف ہوں استعمال کرسکے نیز وہ بطور مختار کسی دوسرے کو پٹہ لگان یا قول پر دینے کا مجاز بھی نہ ہوگا۔

اس میں شک نہیں کہ مسودہ بہت واضح اور تفصیلی تھا مگر یہ قانونی صورت اختیار نہ کرسکا۔ ریاست سرکار عالی میں پارسی ملت کے باشندگان کی کثرت ہے مگر ان کی وراثت کے متعلق کوئی قانون یا احکام مدون نہیں ہیں حتیٰ کہ یہ حکم بھی نہیں ہے کہ مثل اہل ہنود و اہل اسلام ان کی وراثت کا تصفیہ ان کے ذاتی قانون کے مطابق ہوگا۔ حکومت ہند نے ان ہی امور کو پیش نظر رکھتے ہوئے ۱۹۲۵ء میں بالصراحت وراثت پارسیان کا قانون نافذ کیا۔ ممالک محروسہ کی انجمن پارسیان نے یہاں بھی اس قسم کا مسودہ پیش کرنے کی تحریک کی۔ اور اسی بنا پر شیشو ناتھ صاحب رکن مجلس وضع قوانین نے "مسودہ قانون وراثت اشخاص ملت پارسی" پیش کیا۔ مگر اس مسودہ کو منظوری نہ مل سکی۔

جس طرح شوہر کا حق زوجہ پر ہے اسی طرح زوجہ کا حق شوہر پر بھی ہے۔ جس طرح شوہر جب چاہے اپنی زوجہ کو طلاق دے سکتا ہے اسی طرح زوجہ کو بھی یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ چند خاص وجوہ کے تحت طلاق حاصل کرسکے۔ مسلمان عورتوں کو یہ حق دلانے کے لئے ۱۳۴۳ف میں خلیل الزماں صاحب بیرسٹر رکن مجلس وضع قوانین حال رکن عدالت العالیہ نے مسودہ قانون ازدواج اہل اسلام پیش کیا۔ اس قانون کی رو سے زوجہ کو حسب ذیل صورتوں میں فسخ نکاح کا حق حاصل ہوسکتا تھا۔

الف۔ شوہر ناکارہ ہو

ب۔ مجذوم یا مبروص ہو، یا کسی ایک سال یا سے سخت مرض میں مبتلا ہو کر اعادہ حقوق زن و شوئی نہ کرسکے، یا تعلق برقرار رکھنا زوجہ کے لئے سخت مضرِ صحت ہو، اور ظلم کی حد تک پہونچتا ہو

ج۔ چار سال سے زائد سے شوہر مفقود الخبر ہو، بشرطیکہ اس مدت کا نان و نفقہ یا جائداد زوجہ کے قبضہ میں ہو یا طویل سزا پاگیا ہو۔

د۔ بدسلوکیاں کرتا ہو۔

آپ نے اس مسودہ کی حمایت میں جو تقریر کی تھی اس میں اس بات کو بھی طرح ثابت کر دیا تھا کہ مذہباً اور شرعاً عورت کو یہ حق پہونچتا ہے مگر اس کے باوجود یہ مسودہ پاس نہ ہو سکا۔

ملک کی ترقی کے لئے یہ ضروری ہے کہ تعلیم ابتدائی کی ترویج ہو لیکن اس کی ترویج کا معافی فیس سے کامل طور پر ہونا نہیں پایا جاتا چنانچہ دیگر ممالک کا تجربہ یہی ہے کہ محض ابتدائی تعلیم مفت قرار دئے جانے سے خاطرخواہ اس کی اشاعت عمل میں نہیں آتی اس لئے اس امر کی ضرورت محسوس ہوئی ہے کہ تعلیم ابتدائی کو نہ صرف بلافیس جاری بلکہ اس کو لازمی بھی قرار دیا جائے۔ چنانچہ اس خیال کو پیش نظر رکھتے ہوئے یکم تیر ۱۳۵۵ف کو میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر نے ابتدائی جبری تعلیم کا مسودہ پیش کیا۔ جس کی تمہید میں آپ نے بتایا کہ "لازمی تعلیم کے مسئلہ کی اہمیت کو سرکار عالی کے ذمہ دار عہدہ داروں نے بھی مختلف موقعوں پر تسلیم فرمایا ہے اور ملک کی رائے عامہ بھی اس کی ضرورت کو شدت کے ساتھ محسوس کر رہی ہے۔ اس مسودہ میں اس امر کی بھی کوشش کی گئی تھی کہ لازمی تعلیم کے اغراض کو پورا کرنے کے لئے اس کی مشینری جس قدر سہل ہو رکھی جائے اور مالی مشکلات کا جو سوال ایسے مسائل کے پیش رفت میں حائل ہوتا ہے اس کا حل بھی بتایا جائے۔ علاوہ ازیں لحاظ حالات مقامی وہ ناگزیر صورتیں جو زراعت پیشہ اشخاص کو اپنی اولاد سے زراعتی کام لینے کے متعلق پیش آتی ہیں ان کو بھی پیش نظر رکھا گیا ہے۔ یہ بھی مناسب سمجھا گیا کہ ممکنہ طور پر اختلافی مسائل کو اس قانون میں شریک نہ کیا جائے تاکہ ضمنی اختلافات سے اصل مقصد متاثر نہ ہو"۔

اس مسودہ میں "طفل" سے مراد وہ لڑکا لیا گیا جس کی عمر ۶ سال سے ۱۲ سال تک ہو، اور "ابتدائی تعلیم" میں لکھنے پڑھنے اور حساب کے اس نصاب کو شامل کیا گیا جو محکمہ تعلیمات کی جانب سے مقرر کیا جائے۔ اور ۴ سال کی تعلیم پر مشتمل ہو۔ تمام والدین پر یہ امر لازمی گردانا گیا کہ وہ اپنے لڑکوں کو مسلمہ مدرسوں میں روانہ کریں۔ نیز کسی شخص کو کسی ایسے لڑکے کو ملازم رکھنے کا حق نہ ہوگا جس پر قانون ہذا کے تحت مدرسہ جانا لازمی ہو۔ اس رقبہ میں جہاں یہ قانون نافذ ہوگا مجلس بلدیہ اور مجلس تعلیمی کا فرض ہوگا کہ وہ مدرسہ کے لئے جگہ فراہم کرے اور خاص "تعلیمی محصول" عائد کرنے کی مجاز بھی ہوگی۔ اور جو کچھ آمدنی اس محصول سے ہوگی وہ کلیتاً اس رقبہ میں رہنے والے لڑکوں کی ابتدائی تعلیم پر خرچ کی جائے گی۔

اسی سال وامن رام چندر نایک آنجہانی جاگیردار و رکن مجلس وضع قوانین نے ابتدائی جبری تعلیم کے متعلق

ایک دوسرا مسودہ پیش کیا تھا۔ ان دونوں مسودوں کو ایک ساتھ ہی پیش کیا گیا تھا۔ اور ان میں دونوں میں صرف جزوی اختلافات تھے مثلاً دوسرے مسودہ میں طفل سے مراد وہ لڑکا لیا گیا تھا جس کی عمر ۶ سال سے ۱۱ سال ہو۔ مگر بنیادی اصولوں میں دونوں صاحبان کو اتفاق تھا۔

ان سوالوں کو پیش ہونے سے پہلے ہی بعض حضرات نے حکومت سے درخواست کی کہ جبری تعلیم کے مسودہ کو پیش کرنے کی اجازت نہ مرحمت فرمائی جائے اور اس کے حسب ذیل وجوہ پیش کئے۔

(۱) زراعت، تجارت، اور دوسرے کاروبار سے لوگوں کا رجحان ملازمت کی طرف پھر گیا ہے مگر ملازمتیں کم ہیں اس وجہ سے مسئلہ بے روزگاری اور سخت ہو جائے گا۔ اور اس کا بھی امکان ہے کہ بنگال یا برطانوی ہند کے بعض صوبوں کی طرح یہاں بھی دہشت انگیزی کے طریقے پیدا ہو جائیں۔

(۲) کاشت کاروں کی اولاد ۶ سال کے لئے ان کے کام میں مدد نہ دے سکے گی اور اس سے ان کی آمدنی کو نقصان پہونچے گا۔

(۳) اس قانون کو نافذ کرنے کے لئے ۲ کروڑ روپیہ درکار ہوں گے۔ اگر یہ رقم ٹیکس سے وصول کی جائے تو رعایا پر ٹیکس کا بار بہت بڑھ جائے گا۔

(۴) ابتدائی تعلیم کے لئے چھ سال کی مدت بہت قلیل ہے اور اتنے قلیل عرصہ کی تعلیم سے ملک کو کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا اس لئے اس مدت کو نو سال ہونا چاہئے۔ مگر مدت کی توسیع سے مشکلات میں مزید اضافہ ہوگا۔

(۵) موجودہ تعلیم و نصاب دونوں ناقص ہیں اسوجہ سے ناقص تعلیم کی جبراً اشاعت کہاں تک مناسب قرار دی جاسکتی ہے۔

اس میں شک نہیں کہ معترض کے بعض اعتراضات معقول ہیں مگر معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے تصویر کے صرف ایک رخ کو پیش نظر رکھا ہے۔ اور اس کے نقصانات ہی گنا دیئے ہیں۔ اور فوائد سے قطع نظر کرلی ہے۔ بہر حال اس مخالفت کا نتیجہ کچھ نہ نکلا اور یہ دونوں مسودے مجلس وضع قوانین میں پیش ہوئے اور ان پر بحث و مباحثہ بھی ہوا۔ اس دوران میں معلوم ہوا کہ خود حکومت ابتدائی جبری تعلیم کے نفاذ پر غور کر رہی ہے اور عنقریب ایک مسودہ

پیش کرنے والی ہے۔ اس وجہ سے یہ دونوں مسودے واپس لے لئے گئے

۹۔ امرداد ۱۳۵۴ف کو میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر نے ایک اور مسودہ "قانون آزادی مذاہب" کے نام سے پیش کیا۔ جس کا مقصد یہ تھا کہ ہر شخص کو مذاہب کی آزادی کے ساتھ یہ حق بھی حاصل ہونا چاہئے کہ بصورت تبدیلی مذہب وہ اپنے ان حقوق سے جو بلحاظ قانون و رواج اس کو حاصل ہو سکتے تھے محروم نہ کیا جائے گا۔ اور وہ احکام جن سے کہ بوجہ تبدیلی مذہب کوئی شخص غیر مستحق قرار پاتا ہو منسوخ کئے جائیں۔ یہ مسودہ آج کل زیر بحث ہے۔

کیشو راو آنجہانی کا شمار ملک کے مصلحین معاشرت میں کیا جا سکتا ہو۔ آپ نے ۱۳۳۴ف میں حسب ذیل مسودات پیش کئے تھے۔

۱۔ مسودہ قانون ازدواج بیوگان ہندو

۲ مسودہ قانون شادی گوسائیاں

۳۔ مسودہ ترمیم امتناع جاج بازوجہ کم عمر

پہلے مسودہ کا تو ہم تفصیلی ذکر کر چکے ہیں اور اب اس کو قانونی حیثیت بھی حاصل ہو گئی ہے۔ دوسرا مسودہ گوسائیوں کی شادی کے متعلق تھا۔ ممالک محروسہ میں گوسائیوں کے دو فرقے پائے جاتے ہیں ایک تو وہ جو باقاعدہ شادی کرتے ہیں اور دوسرے وہ جو بغیر شادی کے کسی ایک عورت سے تعلقات قائم کرتے ہیں۔ غیر منکوحہ عورت سے جو اولاد ہوتی ہے وہ اولاد نہیں کہلاتی بلکہ اس کو "چیلا" کہا جاتا ہے اور قاعدہ یہ ہے کہ بڑا بیٹا باپ کا چیلا بنتا ہے اور اس سے چھوٹے لڑکے کو بڑے بھائی کا چیلا بننا پڑتا ہے۔ گرو (باپ) کے مرنے کے بعد پہلے اس کا چیلا (بڑا لڑکا) جائداد کا وارث ہوتا ہے اور اس کے بعد اس کا چیلا (دوسرا بیٹا)۔ اس مسودہ کا مقصد یہ تھا کہ گوسائیوں کو باقاعدہ شادی کا پابند کیا جائے اور اس کی اولاد کو حق وراثت عطا کیا جائے۔ تیسرا مسودہ برطانوی ہند کے اس قانون پر مبنی تھا جس کے رو سے ایک معینہ عمر کے اندر زوجہ سے زن و شوہر کے تعلقات قائم نہیں کئے جا سکتے۔ بات دراصل یہ ہے کہ کمسن عورتوں سے تعلقات زوجیت پیدا کرنے سے نہ صرف اولاد کمزور پیدا ہوتی ہے بلکہ خود عورت بھی مختلف جسمانی امراض میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ نیز ہندوستان میں زچاؤں کی کثرت اموات کی ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ ان کی شادیاں قبل از وقت ہو جاتی ہیں۔ اور ان کی اولاد اس وقت پیدا ہونے لگتی ہے۔ جب کہ خود ان کا جسمانی نظام بھی مکمل طور پر نشو و نما نہیں پایا ہوا ہوتا۔ بہر حال ان دونوں مسودات کا مقصد اصلاح تھا مگر

یہ قانونی صورت اختیار نہ کرسکے۔

رنگا ریڈی صاحب نے امتناع شادی نابالغان کا مسودہ پیش کیا یہ دراصل برطانوی ہند کے "قانون ازدواج اطفال کمسن" کی دوسری صورت تھی۔ اور اس قانون سے کمسن لڑکے اور لڑکیوں کی شادی کو روکنا تھا۔ مگر یہ مسودہ بھی کامیاب نہ ہوسکا۔ باوجود اس کے ملک کے اکثر طبقوں سے اس قانون کے نفاذ کی طرف توجہ دلائی جا رہی ہے چنانچہ گذشتہ کانفرنس خواتین حیدرآباد کی کانفرنس میں من جملہ اور تحریکات کے ایک تحریک یہ بھی پیش کی گئی تھی کہ یہ کانفرنس حکومت اور پبلک کی توجہ اس واقعہ کی طرف مبذول کرانا چاہتی ہے کہ اس ریاست کی خواتین گذشتہ ۱۰ سال سے ازدواج کمسنی کے مذموم رواج کے خلاف نہایت صبر سے متحدہ طور پر صدائے احتجاج بلند کر رہی ہیں اور پرزور استدعا کرتی ہیں ان اپیلوں کا جو ہر گوشہ سے فوری اور پر اثر قانون سازی کی نسبت دہرائی گئیں ہیں کامل اور فوری لحاظ کیا جائے گا۔

ہندوؤں میں مذہباً اپنے گوتر میں شادی کرنا جائز نہیں۔ اس اصول کا نتیجہ یہ ہونے لگا کہ ایک خاندان مسلسل دس پندرہ پشتوں کے گذرنے کے بعد بھی اس میں شادی بیاہ نہ کرسکتا تھا اب تک گوتر میں شادیوں کی مخالفت کی وجہ سے شادیاں ہمیشہ غیر خاندانوں میں ہوتی رہیں۔ ابتدا میں اس خیال سے کہ لڑکیوں کی شادی غیر خاندانوں میں ہوتی ہے اور ان کے نام پر جائداد کرنے سے وہ جائداد بھی غیر خاندانوں میں چلی جاتی تھی اس وجہ سے لڑکیوں کے نام جائداد نہ کی جاتی تھیں۔ مگر بعد میں رسوم و رواج سے یہ قانون سا بن گیا۔ اور لڑکیوں کو محروم الوراثت قرار دیا گیا۔ چونکہ یہ ایک صریحاً حق تلفی تھی اور مذہباً بھی جائز نہ تھا اس وجہ سے اس خرابی کو دور کرنے کے لئے مسٹر کاشی ناتھ راؤ صاحب ویدیا نے حال ہی میں ایک مسودہ "ترمیم قانون وراثت خواتین ہنود" پیش کیا ہے جو آج کل مجلس وضع قوانین میں زیر بحث ہے۔ اس کے چند دفعات حسب ذیل ہیں۔

(۱) گوتر صرف تین نسلوں تک محدود ہوگا۔

(۲) جائداد مشترکہ کی صورت میں کسی شخص کے مرنے کے بعد اس کی بیوی، اس کی غیر شادی شدہ یا بیوہ لڑکیاں بھی جائداد کی حق دار متصور ہوں گی۔ بھائی کی جائداد میں ماں اور غیر شادی شدہ یا بیوہ بہنوں کو حصہ ملے گا۔

(۳) اگر کوئی مشترکہ جائداد آپس میں تقسیم ہو تو بیوی کو بشرطیکہ اس کا شوہر زندہ ہو اپنے شوہر کے حصہ کا نصف ملے گا۔ اور بیٹے کی صورت میں ماں کو نصف حصہ ملے گا۔ بہن کی صورت میں بشرطیکہ اس کا بھائی زندہ ہو وہ بھائی کے حصہ کے ایک چوتھائی کی وارث تسلیم کی جائے گی۔

(۴) مشترکہ خاندانوں میں جہاں جائداد کافی ہو وہاں ایک مرد پر اپنی حسب ذیل اناث رشتہ داروں کی پرورش لازمی ہوگی

الف۔ سوتیلی ماں

ب۔ کنواری بہن کی جب تک شادی نہ ہو

(۵) حسب ذیل صورتوں میں زوجہ اپنے شوہر سے علحدہ رہنے کی حقدار تصور کی جاسکتی ہے اور اس کے نان نفقہ کی ذمہ داری شوہر پر عائد ہوگی۔

الف۔ جبکہ شوہر کسی متعدی مرض میں مبتلا ہو

ب۔ جبکہ اس نے گھر میں کسی عورت کو بطور داشتہ رکھ لیا ہو۔

ج۔ جبکہ اس نے دوسری شادی کرلی ہو

د۔ جبکہ وہ اپنی زوجہ پر اس قدر سختیاں کرتا ہو کہ اس کی صحت یا جان خطرہ میں ہو یا اس کی طرف سے بے پروائی اختیار کرے۔

ہ۔ جبکہ وہ ہندو مذہب کو ترک کرچکا ہو۔

اب ایک سوال یہ رہ جاتا ہے کہ ممالک محروسہ میں کن عمرانی قوانین کی ابھی سخت ضرورت ہے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ عرض کیا جاسکتا ہے کہ ان قوانین کے نفاذ کی شدت سے ضرورت ہے جو ابھی تک ناکام ہو چکے ہیں۔ اور بالخصوص انسداد ازدواج کمسن، اور تحفظ اوقاف کے متعلقہ قوانین کا نفاذ تو ملک کی سماجی، معاشی اصلاح کے لئے از حد ضروری ہے۔ چونکہ ان دونوں قوانین کے مسودات پیش ہو چکے ہیں اس لئے میں ان کے فوائد کے متعلق کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ البتہ چند امور کی جانب عوام اور پبلک کی توجہ منعطف کرانا ضروری معلوم ہوتا ہے۔ ذیل میں مختصراً ان امور کو پیش کیا گیا ہے

سب سے پہلی چیز تو گداگری کا انسداد ہے۔ گداگری کو ایک پیشہ تصور کیا جاتا ہے چنانچہ ۱۹۳۱ء کی ممالک محروسہ سرکار عالی کی رپورٹ مردم شماری میں ایسے افراد کی تعداد جنھوں نے گداگری کو بطور پیشہ اختیار کر رکھا تھا ۱۰۲۹۰۹۹۵ بتائی گئی ہے۔ جن میں

۳۴۸،۶۳ عورتیں اور ۲۱۲،۶۶۰ مرد شامل ہیں۔ صرف بلدہ حیدرآباد میں ان کی تعداد ۵۰،۰۸۰ تھی جس میں ۵۱ فیصدی اناث شامل ہیں۔ یہ تو صرف پیشہ ور گداگروں کی تعداد ہے اس کے علاوہ عارضی بھک منگوں اور شریف گداگروں کی بھی کوئی کمی نہیں۔ گداگری کے روک تھام کی کوشش نہ کرنا ہی خود گداگری کو فروغ دینے کے مترادف ہے۔ تندرست، توانا، ریاکار بھیک منگوں کی امداد کرنا خیرات کرنا نہیں ہے بلکہ قوم و ملک کے اجتماعی افلاس میں اضافہ کرنا ہے۔ اور ان افراد کو ان کے حقوق سے محروم کرنا ہے جو جائز طور پر اس کے مستحق ہیں۔ انسانیت کا تقاضہ یہی ہے کہ ہم صرف ان لوگوں کی امداد کریں جو بے ریا، بے بس اور مجبور ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ ملک میں فوراً ایک قانون انسداد گداگری نافذ کیا جائے۔ اور طاقتور، تندرست صحت مند افراد کو قطعی خیرات حاصل کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔ اور جو لوگ اس قانون کی خلاف ورزی کریں ان کو سخت اور باشقت قید کی سزائیں دی جائیں۔ البتہ بوڑھوں، معذوروں، اپاہجوں، جذامیوں یا دوسرے ناکارہ لوگوں کی امداد حکومت اور عوام دونوں پر فرض ہے۔ اور ایسے سرکاری و غیر سرکاری ادارے قائم ہونا چاہئے جہاں اس قسم کے افراد کی پرورش و نگہداشت کا انتظام ہو۔

موجودہ زمانہ میں کارخانوں میں جہاں برقی یا متحرکہ مشینیں استعمال کی جاتی ہیں۔ اکثر اس قسم کے حادثات پیش آتے رہتے ہیں جن میں یا تو مزدور ہلاک ہو جاتے ہیں یا عمر بھر کے لئے بیکار اور اپاہج بن جاتے ہیں گو اس میں نہ تو مزدوروں کا کوئی قصور اور نہ کارخانہ داروں کا۔ مگر ان کے مضر نتائج غریب مزدوروں یا ان کے پسماندگان کو برداشت کرنے پڑتے ہیں۔ اس لئے ضرورت ہے کہ برطانوی ہند کی طرح یہاں بھی "قانون معاوضہ مزدوران" کا نفاذ ہونا چاہئے۔ نیز کارخانوں میں مستقل کام کرنے والی عورتوں کو ایام زچگی سے پہلے اور بعد مع تنخواہ کے رخصت کا حق بھی ملنا ضروری ہے۔

بیمہ کے قانون میں بھی ترمیم کی ضرورت ہے اور جہاں اس پر عمل نہیں ہو رہا ہے وہاں عمل کرانے کی ضرورت ہے اور ادنیٰ ملازموں پر بھی اس فنڈ میں شرکت لازمی کر دی جانا چاہئے کیونکہ حقیقتاً امداد کے زیادہ محتاج تو ادنیٰ طبقہ اور اس کے پسماندگان ہی ہیں۔ البتہ ان کے لئے اقساط کی رقم کی مقدار کم کر دی جائے۔

بلدہ میں قانون "ضابطہ صفائی" نافذ ہے۔ جس کی رو سے ہر مالک مکان پر لازم ہے کہ وہ اپنے گھر کا کوڑا کرکٹ بجائے سڑک یا گلی کوچے میں پھینکنے کے کسی ٹوکری یا برتن وغیرہ میں بھر کر اپنے دروازہ کے باہر رکھ دے تاکہ جب بلدیہ کی بنڈی گذرے تو وہ اس کو جمع کرے۔ نیز جب کسی مکان میں کوئی شخص کسی متعدی مرض میں مبتلا ہو جائے تو اس کے اعزا کا یہ فرض ہے کہ وہ اس کی اطلاع عہدہ دار صفائی کو دے دیں۔ اس ضابطہ کے تحت ان اشیائے خوردنی کی فروخت ممنوع قرار دی گئی ہے

جو پرانی یا مضرِ صحت ہوں۔ ذبیحہ کے دو گھنٹے بعد گوشت فروخت نہ کیا جائے۔ نیز گھوڑے کا ذبیحہ اور اس کے گوشت کی فروخت کو بھی جرم قرار دیا گیا ہے۔ ضرورت ہے کہ حفظانِ صحت کی خاطر اس ضابطہ کا یا اس قسم کے دوسرے ضابطوں کا نفاذ تمام اضلاع میں کیا جائے۔

ایک اور چیز کا ذکر ضروری ہے جس کی طرف ملک کے بعض ممتاز اور اہل الرائے حضرات توجہ کر رہے ہیں اس سے میری مراد کمسن بچوں کی تمباکو نوشی سے ہے۔ چنانچہ مولوی کلیم الدین صاحب انصاری بی۔ اے ایل ایل بی نے طیلسانین عثمانیہ کی پانچویں سالانہ کانفرنس کے خطبہ صدارت میں مسکرات کا بذریعہ قانون سازی انسداد کے طریقہ پر زور دیتے ہوئے کہا "کہ یکایک قانون کے ذریعہ انسداد نا ممکن یا نامناسب ہو تو کم از کم اس چیز کو حکومت اپنے پروگرام میں تو شامل کرے اور رفتہ رفتہ اس پر عمل پیرا ہو، سب سے پہلا قدم فوری طور پر یہ اٹھایا جا سکتا ہے کہ اسکول کے طلبا اور کم عمر بچوں کی تمباکو نوشی قانونی طور پر جرم قرار دی جائے، اور اس کے لئے ان کے سرپرستوں اور اساتذہ سے بازپرس کی جائے"۔ اس میں شک نہیں کہ تجویز بہت اچھی ہے اور ہندوستان کے بعض حصوں یا ریاستوں میں بچوں کو تمباکو نوشی سے روکنے کے لئے انجمنیں قائم ہیں۔ اس سال کے ابتدائی حصہ میں ریاست کشمیر نے اپنے یہاں اس قسم کا ایک قانون نافذ کیا ہے جس کی رو سے تیرہ سال سے کم عمر کے بچوں کو سگریٹ بیڑی یا سگار وغیرہ پینے کی ممانعت کر دی گئی ہے اور ان بچوں کو یہ چیزیں فروخت بھی نہ کی جائیں گی۔ اور حکومت نے عوام اور سرکاری و غیر سرکاری ذمہ دار اصحاب سے اشتراکِ عمل کی درخواست کی ہے کہ وہ حکومت کی اس تجویز کو کامیاب بنانے میں ہاتھ بٹائیں میرے خیال میں ہمارے یہاں اس سے زیادہ پیچیدہ اور نازک ایک دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمارے ننھے ننھے سپوت، ہوٹلوں اور کافی خانوں میں جا کر ان منشیات کا استعمال کرتے ہیں جو سگریٹ اور بیڑی سے بدرجہا قیمتی اور بدرجہا زیادہ مضر صحت و اخلاق ہیں۔ کیا والدین اور اساتذہ کو اس ذمہ داری سے بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے کہ ان کی اولاد یا شاگرد ایسا کیوں کرتے ہیں۔ کیا ہم کو ان سے بازپرس کا حق حاصل نہیں ہے۔ کیا ہوٹلوں پر کوئی ایسی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی کہ جس کی وجہ سے وہ ایک مقررہ عمر سے کم عمر والے بچوں کے ہاتھ ہرگز ایسی منشیات فروخت نہ کر سکیں تاکہ آئندہ نسلیں جن پر ملک و قوم کی فلاح و بہبود کا انحصار ہے، جن کے ہاتھوں میں ملک کی باگ ڈور ہوگی، جو قوم کی قسمت کا فیصلہ کرنے والے ہوں گے اپنے اخلاق اور صحت کو خراب کر کے ملک کے اخلاق، معاشی، معاشرتی، اور سیاسی معیار کو نقصان نہ پہونچا سکیں۔

میں آخر میں ان تمام حضرات کا شکریہ ادا کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں جنہوں نے از راہ مہربانی اس مضمون کے سلسلہ میں ضروری مواد بہم پہونچایا۔ اور ذیل میں ان کتابوں اور مسودات کی تفصیل موجود ہے جن سے اس سلسلہ میں استفادہ کیا گیا۔

(۱) ضابطہ ملازمت سیول سرکار عالی۔ مطبوعہ اعظم اسٹیم پریس۔ حیدرآباد دکن ۱۳۳۵ف

(۲) مجموعہ قوانین سرکار عالی چہار حصہ (قوانین و قواعد مع ترمیمات تا آخر ۱۳۲۲ف) مرتبہ ونایک راؤ صاحب بیرسٹر و دلدار علی صاحب وکیل۔ دکن لاپورٹ پریس۔ چار باغ۔ حیدرآباد دکن

(۳) گنجینہ قوانین مختص الامر ممالک محروسہ سرکار عالی۔ جلد اول۔ مولفہ ویرپا صاحب وکیل مطبوعہ ۱۳۴۲ف حیدرآباد

(۴) مسودہ تحفظ اوقاف۔ مرتبہ نواب اختر یار جنگ بہادر۔ مطبوعہ۔

(۵) مسودہ ترمیم وراثت قوانین ہنود۔ کاشی ناتھ راؤ صاحب ویدیا۔ غیر مطبوعہ

(۶) مسودہ ابتدائی جبری تعلیم۔ از میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر غیر مطبوعہ

(۷) " " از وامن رام چندر صاحب نایک آنجہانی مطبوعہ

(۸) مسودہ قانون آزادی مذہب۔ از میر اکبر علی خاں صاحب بیرسٹر غیر مطبوعہ

(۹) مسودہ قانون ازدواج اہل اسلام۔ از خلیل الزماں صاحب بیرسٹر مطبوعہ

(۱۰) مسودہ قانون وراثت اشخاص ملت پارسی۔ از بشیشور ناتھ صاحب "

(۱۱) رپورٹ مرکزی انجمن ترک مسکرات بابت ۱۳۴۱-۴۲ف غیر مطبوعہ

(۱۲) رپورٹ مردم شماری ممالک محروسہ سرکار عالی بابت ۱۹۳۱ء۔ مرتبہ مولوی غلام احمد صاحب۔ دارالطبع سرکار عالی۔

محمد احمد سبزواری بی اے (جامعہ عثمانیہ)

درسِ عمل

کب تک رہے گا موردِ آفات و صد بلا؟ — او بے عمل! ہے کچھ تری پستی کی انتہا!!
پیغام ہے فنا کا تساہل کی زندگی — اک موت ہے جمود و تعطل کی زندگی

ہے اپنی پستیوں کا بھی احساس فاقہ مست — تو خود بھی پست، اور ترا حوصلہ بھی پست
او بد نصیب! غم سے ہی تو کس لئے نڈھال؟ — کیوں ہو گئی ہے تیرے لئے زندگی وبال؟
دل سے نکال طالعِ برگشتہ کا خیال! — کر چرخ کو اسیر، ستاروں کو پائمال!!
ہمت ہو گر تو ہے رہِ اک گام آسماں — پایاب ہے نظر میں تری بحرِ بیکراں!

تو اپنے بختِ خفتہ کو خود ہی جگائے جا　　دنیا کو زندگی کا طریقہ سکھائے جا
ایک ایک ہو نفس، نفسِ آتشیں ترا　　تڑپا دے اہل شوق کو نقش جبیں ترا
ہے شش جہت سے حسن عمل ہی تو جلوہ گر　　دنیا ہے کارگاہِ عمل، کاہلی سے ڈر
قائم اسی کے دم سے ہیں اعیان ممکنات
یعنی کہ ہے عمل ہی رگِ جانِ کائنات

افتخار الدین احمد فاخر (عثمانیہ)
متعلم سال دوم

سائنس سے متعلق چند غلط فہمیوں کا ازالہ

اجزاے کائنات و اشیاے عالم کی حقیقت جاننے اور ان کے تاثرات و تاثیرات معلوم کرنے کو سائنس کہتے ہیں ہمارا موجودہ علم جو ہزارہا سال کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ ہے یقیناً انسانی مشاہدات و تجربات کا ماحصل کہلانے کا مستحق ہے قدرت کی عجوبہ کاریاں اور بوقلمونیاں جس قدر بھی انسان کے علم و ادراک میں آتی جائیں اسی قدر اس کے لئے مفید اور کارآمد ہوں گی ان کو مضرت اور نقصان سے تعبیر کرنا عظیم الشان غلطی ہے

سائنس کے مفہوم سمجھنے میں اس قدر غلطی ہوئی ہے کہ اس کے صحیح مفہوم کے ذہن نشین کرانے میں بڑی دشواری رہی۔ اس سے میرا مقصد یہ ہے کہ ہمارے کچھ احباب و بزرگ تو سائنس کو مذہب اور روحانیت کے خلاف دہریت اور بیعقیدتی سے تعبیر کرتے ہیں۔ کچھ حضرات تو مذہب کے نام پر سائنس کو گالیاں تو نہیں دیتے۔ البتہ معاشرتی و اقتصادی و امن عام کے نقطۂ نظر سے برا سمجھتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ انھوں نے سائنس کا حقیقی مطلب نہیں سمجھا۔ میں نہایت آزادی کے ساتھ بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ سائنس کی مخالفت میں کوئی تقریر یا تحریر مدلل نہیں ہو سکتی۔ اس سے جو برائیاں منسوب کی جائیں گی وہ ہماری اور آپ کی برائیاں ہوں گی نہ کہ سائنس کی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ اگر کوئی شخص زبان سے بجائے خوش کلامی کے گالیاں دینے کا کام لیتا ہے تو وہ خود قصوروار اور مجرم ہے نہ کہ زبان اور

اگر ایسا ہی ہے یعنی زبان ہی قصوروار ہے اور گناہ کے ارتکاب میں ہمارے قصد و ارادے کو کوئی دخل نہیں اور ہم اپنے کاموں میں عقل کے تابع نہیں تو پھر ہمارے جتنے اعضا ہیں وہ اس قابل ہیں کہ ان کو جسم سے علیٰحدہ کر دیا جائے۔

یوں سمجھنا چاہئے کہ تہذیب و تمدن یعنی سوسائٹی ایک جسم ہے اور اس کے اعضا سائنس کے آلات ہیں۔ اگر ان سے کام لینے میں سوسائٹی غلطی کرتی ہے، جرائم اور خیالات مجرمانہ کی تخلیق اس کا دماغ کرتا ہے تو کیا یہ دانشمندی ہو کہ بجائے اپنی اصلاح کے اپنے ارکان تہذیب کو ڈھادیں۔ اپنے تمدن کی بنیادوں کو مسمار کر دیں؟ میں عقل و ادراک کے نام پر اپیل کروں گا کہ ذرا اپنے دماغوں اور دلوں کو جلد فیصلہ کرنے سے باز رکھئے۔ بلکہ اپنے دل و دماغ کو تفکر او تدبر کا موقع دیجئے۔ پھر دیکھئے کہ آپ کے دماغی دار الافتاء سے سائنس کے متعلق کیا فتویٰ صادر ہوتا ہے۔

اس مختصر مضمون میں تمام برکات سائنس کو بیان کر دینا میرے حیطۂ امکان سے باہر ہے۔ اور میں مناسب بھی نہیں سمجھتا کہ ان ایجادات کو کا تذکرہ پھر کروں جن کے فوائد عالم آشکار ہیں۔ اور جن سے عامۃ الناس بحیثیت اجتماعی اور بحیثیت انفرادی یکساں طور پر مستفید ہو رہے ہیں۔ بلکہ آپ کی توجہات کو اس جانب مبذول کرانا چاہتا ہوں کہ سائنس پر بے روزگاری، مفلسی اور تباہ حالی کا الزام لگایا جاتا ہے۔ مشنری کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جاتی ہے کہ اس نے مار ڈالا، برباد کر دیا لوٹ لیا اور نہ معلوم کیا کیا۔ اس کے جواب کی بھی مجھے اجازت دیجئے۔

میں تسلیم کرتا ہوں کہ سائنس نے انسانی اعمال کو بہت ہلکا کر دیا اور ایک وہ کام جس کو عظیم الشان جماعت انجام دیتی تھی اب تھوڑے سے آدمیوں کے باہمی تعاون اور اشتراک عمل سے پایۂ تکمیل کو پہونچ جاتا ہے، مگر اسی کے ساتھ ساتھ سائنس نے ان بیکار آدمیوں کے لئے ہزارہا قسم کے دوسرے وسائل معاش بہم پہونچا دئیے ہیں جن سے ہمارے آبا و اجداد قرون اولیٰ میں نا آشنا تھے ۔ سائنس پر یہ الزام قطعاً درست نہیں یہ ترقی کا سیلاب طلسم اپنی پوری رفتار کے ساتھ بہا چلا جا رہا ہے جو ہرگز ان غلط اور قدامت پسندانہ خیالات سے نہیں رک سکتا۔ آپ خس و خاشاک کی طرح اس سے ٹکرایا کیجئے وہ آپ کو اپنے ساتھ بہالے جائے گا۔

باخبر اور ذی ہوش انسان واقف ہیں کہ اس فلاکت و افلاس کا اصلی راز عدم ایثار، خود غرضی اور سرمایہ داری ہے۔ دولت مند اپنی دولت کو محفوظ رکھ کر اس کے اضافے کی نت نئی تدابیر سوچتے اور اختیار کرتے ہیں۔ انسانی ہمدردی ایثار عام دلوں سے معدوم ہو گیا۔ سرمایہ داری میں مقابلہ کیا جانے لگا۔ سرمایہ داروں کی فہرست شایع ہونے لگی۔



مسٹر محمد اقبال حسین خاں (عثمانیہ)
پہلے هندوستانی هیں جنهوں نے انگلستان میں محکمۂ پوسٹ آفس
اور ٹیلیفون کی عملی تعلیم پائی اور نمایاں کامیابی حاصل کی -

ایک گروہ کے سرمایہ دار کو اس بنا پر دوسرے گروہ کا مالک بن جانا شہرت عام کے لئے ضروری ہوا۔ کیا دولت اس لئے دی گئی ہے کہ جس شخص کے پاس چلی جائے وہ اس میں سے ایک حبہ بھی خرچ نہ کرے۔ کیا دولت محض اس لئے ہے کہ غیر معین اوقات تک اس کو جمع ہی کیا جاتا رہے۔ دنیا بھوک بھوک پکارتی رہے اور سرمایہ دار اپنے اصلی کیش کو جو ریکارڈ کے درجہ کو پہنچ رہا ہو کم نہ ہونے دیں

دولت قید و بند کے لئے پیدا نہیں کی گئی ہے۔ دولت کا فلسفہ تخلیق محض گشت یعنی لین دین ہے۔ ایک طرف سے داخل ہو اور دوسری طرف سے نکل جائے۔ یہ طریقہ کسی دور میں ثابت نہیں ہوتا کہ دولتمندی میں مسابقت کی گئی ہو۔ لیکن آج یہ تمام معانی اپنے معکوس مفہوم میں مستعمل ہو رہے ہیں۔ اب آپ ذرا غور فرمائیے کہ جب بڑے بڑے دریاؤں کے بہاؤ کو روک کر قبضہ کر لیا جائے گا تو وہ مخلوق جو ان کے پانی سے زندگی بسر کرتی تھی کیونکر زندہ رہ سکتی ہے؟

ہندوستان کی مصیبت اور بے روزگاری کا سبب سائنس نہیں آلات سائنس نہیں بلکہ ہماری جہالت اور خدمات سائنس کا فقدان ہے۔ اول تو ماشاءاللہ پڑھے لکھے لوگوں کی تعداد ہی بہت ہے۔ پھر جو کچھ تھوڑے بہت ہیں انھوں نے اپنی نظر کو اس قدر محدود اور تنگ بنا لیا ہے کہ سوائے تلاش ملازمت کے اور کسی ذریعہ معاش تک نظر ہی نہیں پہنچتی تی کہ خاندانی پیشہ ور بھی تعلیم حاصل کر کے ملازمت کی فکر میں پڑ گئے اور انھوں نے اپنے اپنے پیشوں کو خیرباد کہہ دیا۔ کیا یورپ کا طریق کار یہی ہے؟ کیا امریکہ میں ایسا ہی ہوتا ہے؟ کیا جاپان کا طرز عمل یہی ہے؟ آپ جاپان کو کیوں کوستے ہیں کہ ہندوستان کے بازاروں پر قبضہ کر لیا۔ آپ اپنے اندر خود جذبۂ عمل اور ولولہ کار کیوں نہیں پیدا کرتے؟

سائنس پر ایک اور الزام لگایا جاتا ہے کہ اس نے شاعرانہ احساسات اور مذہبی عقاید کو نقصان پہونچایا۔ میں عرض کروں گا کہ اگر شاعری اور احساسات لطیف اسی کا نام ہے کہ زمین اور آسمان کے قلابے ملائے جائیں۔ جذبات فاسد اور خیالات شیطانی کو برانگیختہ کیا جائے۔ تو سائنس نے جہاں تک ان کی بیخ کنی کی خوب کیا۔ ہم کو ایسے شعراء اور بیکار شاعری کی ضرورت نہیں۔ البتہ جو حقیقی شاعری ہے۔ جو ملک اور قوم کے لئے مفید ہے۔ اس میں سائنس کے اثرات نے اضافہ کر دیا۔ آپ کے یہاں حالیؔ، اقبالؔ اور ٹیگور اسی عصر سائنس کے پیداوار ہیں۔ اب گل و بلبل، خال و خد، سیب ذقن اور چاہ زنخداں کے تعریف کرنے والے شعرا کی ضرورت نہیں۔

مذہب اور عقائد دینیہ کی آڑ میں سائنس کو برا بتانا بھی سراسر غلط ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ سائنس کی ترقی سے

مذہبی لٹریچر کی اشاعت عام ہوگئی، اور تبلیغ مذاہب کے بہتر سے بہتر ذرائع مہیا ہوگئے۔ رہا بے دینی اور دہریت کا سوال تو یہ چیزیں عصر ما قبل سائنس میں بھی عام تھیں پہلے بھی دہریت کا چرچا تھا اور بے دین لوگ پہلے بھی تھے۔ مذہبی عقائد سے منحرف کرنے والوں کی پیشتر بھی کمی نہیں رہی۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ غالب نے جو موجودہ دور ترقی و تمدن سے پہلے گذر چکا ہے اور جس غریب کو ترقیات سائنس کی ہوا بھی نہیں لگی کیوں تنگ اعتقادات دینی کا مذاق اڑایا اس نے کیوں کہا کہ:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن
دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

اسی قسم کے اور بہت سے شواہد و نظائر پیش کئے جاسکتے ہیں۔

مرزا متین احمد بیگ
متعلم سال اول عثمانیہ کالج اورنگ آباد

افکارِ لطیف

(۱)
نغمۂ حیات

چاند ہے ——— اور وہ بھی چودھویں رات کا چاند! سہانی چاندنی ایسی چھٹکی ہوئی ہے جیسے چنبیلی چاروں طرف کھلی ہوئی ہو۔ نیلگوں آسمان پر چھوٹے چھوٹے ستارے نوری مشعلیں لئے ماہتاب کے گرد گھوم رہے ہیں ———

فضا میں سکوت مطلق چھایا ہوا ہے پھول مائل بہ تبسم ہیں اور ان کی ادائے شگفتگی پر دلنواز نغمے نثار ہو رہے ہیں۔

یہ منظر کتنا روح افزا ... ——— کس قدر جاذبِ نظر اور کیسا دل افروز ہے!!

میرا دل رنج و الم سے بیگانہ ہے میں سوچتی ہوں کہ تمام کائنات خدا جانے کیوں اس وقت خاموش ہے ساری دنیا کس لئے بے خود ... ... و مدہوش ہے؟ چاند کی ضیا پاش کرنیں نرگس، لالہ، چنبیلی اور بیلے پر پڑ رہی ہیں اور ان کا عکس رنگین پانی کی روانی میں حل ہو کر ایک عالمِ کیف و سرور پیدا کر رہا ہے ساری کائنات سو رہی ہے لیکن ایک میں بیدار ہوں اور ہستی کے ذرّہ ذرہ سے لطف اُٹھا رہی ہوں ——— اے میرے دل کے چاند! آ ——— روح سے قریب رہ کر اس قدر دور کیوں ہے مجھے اس چاندنی رات میں اپنا لطیف و شیریں نغمہ سُنا ———

اے نغمہ سنج! تو کہاں ہے! میرا دل تجھ سے ملنے کے لئے بیقرار ہے میری نگاہیں تیرے چاند سے مکھڑے کو ڈھونڈھ

رہی ہیں ... میں تری دلربا آواز سننے کے لئے مضطرب ہوں ———

آہ ——— تیرا نغمہ کیسا جادو اثر ہے؟ تیری تانیں کس قدر شعلہ ریز ہیں؟ اے غیرت ناہید تو میرے دل سے بہت قریب ہے میں سانس لیتی ہوں تو ہر تار نفس سے تیری محبت کا راگ پیدا ہوتا ہے تیرے ہی گیتوں کی آواز سنائی دیتی ہے؛ میرا وجود سراپا رباب اور میری روح یکسر نغمہ بن جاتی ہے ———

اے موسیقی کے دیوتا! آسمان تیرے نغموں سے معمور اور زمین تیرے راگوں سے مسحور ہے، تو جب کوئی راگ چھیڑتا ہے تو ستارے جھلمل جھلمل کرنے لگتے ہیں ———

تیری تانوں کے اثر سے مہر و ماہ لرزہ براندام ہونے لگتے ہیں۔ اے روح کائنات! تو نغمہ زندگی ہے! تیرے کیف نغموں سے دلوں کی سوئی ہوئی دنیا جاگ پڑتی ہے مردہ آرزوئیں، بےجان تمنائیں، انگڑائیاں لے کر پیدا ہونے لگتی ہیں ———

اے نغمہ نواز! تیری موسیقی اس دنیا سے بالاتر ہے تیرے حیات افروز نغمے مردہ روحوں میں جان ڈال دیتے ہیں ... تیرے نغموں سے روح تسکین پاتی ہے تیرا نغمہ سبب حیات ہے!

اے جان تمنا! تو فردوس محبت ہی؛ تیری یاد میرے کاشانۂ دل کی تاریکیوں کے لئے شمع سرمدی ہے

اے پیکر جمال! تیرا حسن دائمی اور غیر فانی ہے تیرے دلفریب نغموں سے دنیا کی فضائیں مترنم ہیں اور یہ تیرے ہی نغموں کی برق پاشیوں کا اثر ہے کہ کائنات اس طرح اضطراب حیات کی لہروں سے معمور ہے!!

(۲)
جب میں اداس ہوتی ہوں!

جب میں اداس ہوتی ہوں ——— اور کھیتوں میں دو گھڑی جی بہلانے کے لئے نکل جاتی ہوں، تو میں سوچتی ہوں کہ الٰہی یہ دنیا کے لوگ کیونکر خوش و شاد کام ہیں، جب کہ میں اس درجہ اداس ہوتی ہوں؟ یہ ہر روز کھیتوں پر جانے والے کسان کھیتوں کی کٹائی سے فارغ ہو کر مسرت و کامرانی کا راگ گانے لگتے ہیں میں ہر روز دیکھتی ہوں ——— کہ ہوائے جنوب کس آزادانہ بے تکلفی، کس محبوبانہ دلکشی سے حنا کی میانہ قد جھاڑیوں سے اٹھکیلیاں کرتی ہے اور اس کے ننھے ننھے شگوفوں کی خوشبو کو جنگل کی شفاف فضا میں کس طرح پھیلا دیتی ہے

یہ چھوٹی چھوٹی نازک اندام چڑیاں پھرتے ہوئے سمندروں کے سنسان ساحلوں پر بیٹھی کس جوش مسرت سے محبت کے گیت اور کامرانی کی تظمیں چیخ چیخ کر گایا کرتی ہیں —— !! مگر میں سوچتی ہوں کہ اے اللہ! کسی وقت مجھے بھی ایسی ہی آزادی ایسی ہی مسرت نصیب کیوں نہیں ہوتی؟ ——

جب میں برسات کی شور انگیز صبح میں کھیت کاٹنے والی دوشیزہ کا نغمہ سنتی ہوں، یا جب کسی خاموش چاندنی رات میں اس ملاح کے نغموں کی صدائیں جو اپنی کشتی میں بیٹھا گاتا چلا جا رہا ہو میرے کانوں میں آتی ہیں، جب کسی فوجی سپاہی کے بگل کی شوخ آواز مجھے چونکا دیتی ہے تو میں اپنے بربط روح کے ہر تار میں ایک ارتعاش آمیز سکون، ایک بیقرار نجات، ایک مضطرب آسودگی محسوس کرتی ہوں اور بے تاب ہو کر فطرت سے سوال کرتی ہوں کہ آخر میں بھی اسی طرح کیوں نہیں گاتی —— ؟

دوپہر کے دراز ہونے والے سایہ میں کس انداز سے مویشی سبز سبز گھاس چر رہے ہیں اور چرواہے، اونچے اونچے پہاڑوں کی پرسکون وادیوں میں درختوں کے گنجان سایہ میں بیٹھے اپنی بانسریوں سے کیسے کیسے سریلے اور دل دکھا دینے والے راگ نکال رہے ہیں ——

اے معبود! میرا دل پوچھتا ہے کہ میں بھی انھیں کی طرح مسرت کا ایک گیت —— اطمینان کا ایک راگ —— سکون کا ایک نغمہ کسی دن کیوں نہیں گاتی؟ —— اور امن کا ایک طویل اور حسین خواب کیوں نہیں دیکھتی؟

مگر فطرت میرے ان دیوانہ پن کے سوالوں کا جواب نہیں دیتی۔ وہ جواب دے ہی نہیں سکتی وہ بھی معرکی ممیوں کی طرح مسکراتی ہے اور میرا منہ تکتی ہے۔ "اور پھر میں کچھ نہیں کہہ سکتی —— میں اپنے کانوں سے اپنے دل کے دھڑکنے کی صدائیں سنتی ہوں —— اور —— محبت کے یہ نغمے، فطرت کے یہ راگ آہ کتنے پیارے ہیں!!!

میمونہ بیگم آہ

انگلستان میں ذرائع نقل و حمل

مسٹر محمد اقبال حسین خاں صاحب فاضل جامعہ عثمانیہ کے قدیم طالب علم ہیں ڈیڑھ سال قبل آپ محکمہ ڈاک و ٹیلیفون کی تعلیم حاصل کرنے انگلستان تشریف لے گئے تھے جہاں انھوں نے ڈاک خانہ سے متعلق تمام شعبوں کی تفصیلی تعلیم عملی طور پر حاصل کی ہے. مسٹر اقبال پہلے ہندوستانی ہیں جنھوں نے انگلستان جاکر ایسے اہم شعبہ کی تعلیم حاصل کی۔ ہائی کمشنر فار انڈیا نے آپ کی ذکاوت اور کارگذاری کی بہت ستائش کی ہے ۔ واپسی کے بعد سے آپ ڈاک خانہ سرکار عالی میں کارگذار ہیں۔ آپ کی کامیابی جامعہ عثمانیہ کے لئے قابل مبارکباد ہے۔

مدیر

پوسٹ آفس کا تصور جو عام پبلک کو ہوسکتا ہے جیسا کہ سابق پوسٹ ماسٹر جنرل لندن Sir Kingsley Wood نے بیان کیا ہے صرف اس قدر کہ "ایک خطوط رساں جو ان کے خطوط گھروں پر تقسیم کرے یا صندوق خطوط اندازی سے ان کو جمع کرے۔ اہلکار پشہ جو اسٹامپ فروخت کریں یا ان کے پارسل کا وزن کریں یا سیونگس بنک

کھاتوں کے لئے رقم لیں یا واپس کریں اور بس۔

لیکن وہ اس سے واقف نہیں کہ صندوق خطوط اندازی وغیرہ کے علاوہ اس محکمہ میں کس قدر اہم کام انجام پاتے ہیں۔ عام طور پر پبلک پوسٹ آفس کے کاروبار سے تقریباً لاعلم رہتی ہے جب تک کہ اس کو واقف نہ کرایا جائے۔

سرکاری محکمہ جات میں صرف ٹپہ ہی ایک ایسا محکمہ ہے جس سے بالراست پبلک کا تعلق ہوتا ہے جہاں وہ رقوم کی داد وستد کرتی ہے دوسرے معنوں میں ٹپہ ایک تجارتی سررشتہ ہے جو عوام بالخصوص تجارتی اصحاب کی اہم ضروریات کو آسان اور کمتر شرح اجرت پر کامل ذمہ داری سے تکمیل کرتا ہے۔

تمام حکومتوں کا متحدہ خیال ہے کہ ڈاک اور پولس ہی دو ایسے محکمہ جات ہیں جن سے کسی ملک کی انتہائی ترقی و حقیقی تمدن و شائستگی کا اندازہ ہو سکتا ہے سچ تو یہ ہے کہ سلطنت کی شوکت و عظمت کے دو ذمہ دار جزو ٹپہ سکہ ہیں۔ جس وقت میں بلڈینگ برانچ میں کام کر رہا تھا تو متعدد ایسی مسلیں دیکھنے کا موقع ملا جس میں نئے سرے سے ٹپہ خانہ جات کی تعمیر کے لئے منظوری یہ کہہ کر لی گئی تھی کہ ملک کے تمدن اور شائستگی کے مظاہرہ کا ٹپہ خانہ ذمہ دار ہے جن حضرات نے انگلینڈ کے جدید تعمیر شدہ ٹپہ خانہ جات کو ملاحظہ فرمایا ہوگا وہ بخوبی واقف ہوں گے کہ تجارتی مرکزوں میں ہر اعتبار سے خوبصورت پاک صاف عمارتیں ٹپہ خانہ جات کی ہیں۔

بادی النظر میں ٹپہ خانہ کے خدمات زیادہ اہم نہیں معلوم ہوتے لیکن حقیقت میں دنیا کے تمام متمدن ممالک کے لئے جو بڑی بڑی تجارت گاہیں ہیں ٹپہ خانہ ایک اہم ترین محکمہ ہے۔ ذرا آپ اس وقت پر غور کریں جبکہ آپ اپنے کسی عزیز کے حالات فوری معلوم کرنا چاہیں یا انھیں اپنے حالات سے مطلع کرنا مقصود ہو یا کسی دور دراز مقام سے ذریعہ منی آرڈر رقم کا انتظار ہو یا آسان اور کافی شرح منافع پر رقم محفوظ کروانا چاہیں تو آپ کو ٹپہ کی اہمیت معلوم ہو گی سچ تو یہ ہے کہ ملک کی خوش حالی کا محکمہ ڈاک بڑی حد تک ذمہ دار ہے۔

فی الحال میں لندن پوسٹ آفس کے پندرہ (۱۵) محکمہ جات اور نو سو (۹۰۰) صیغہ جات میں سے صرف ایک شاخ نقل و حمل (Transport Branch) کا ذکر کروں گا جس سے پوسٹ آفس لندن کے وسیع کاروبار اور اس کی عظمت کا اندازہ ہو سکے گا۔ اور یہ بھی معلوم ہوگا کہ پبلک کا ہر فرد ممنون ہو اور مطمئن خوشحال

ہو یا بھکاری ٹپہ سے کس طرحِ مستقل فائدہ حاصل کرسکتا ہے اور ساتھ ہی ٹپہ خانہ سے متعلق بعض ایسے حالات بھی بیان کروں گا جس کا مطالعہ یقینی طور پر پبلک کے لئے دلچسپ ہوگا

پوسٹ آفس نے ہزارہا موٹروں کی تعداد کو گھٹانے کے لئے جو صرف لندن خاص میں ٹپہ کے کاروبار کے لئے چلائی جاتی تھیں جن کا بڑھے ہوئے ٹرافک سے گذرتے وقت کافی وقت صرف ہوتا تھا بالخصوص جب کہ لندن کی فضا ناقابل گذر کہر (Fog) سے مکدر ہو جاتی ہے ایک خاص زمین دوز ریل کی تیاری کے لئے منتخب کمیٹی ہوز آف لارڈز منعقدہ ۱۹۱۳ء سے منظوری حاصل ہوئی جو 'پوسٹ آفس ریلوے' کہلاتی ہے۔ اس مقصد کے لئے ایک سرنگ فی الحال ایسٹرن ڈسٹرکٹ آفس، ریور پول ریلوے اسٹیشن رکنگ ایڈورڈ جنرل پوسٹ آفس، ماؤنٹ پلیزنٹ آفس، ویسٹرن سنٹرل ڈسٹرکٹ آفس، وسٹرن ڈسٹرکٹ آفس، ویسٹرن پارسل آفس، پیڈنگٹن ریلوے اسٹیشن کے درمیان لندن کے عظیم الشان عمارتوں کے نیچے جو کم از کم ۷۰ فٹ گہرائی میں واقع ہے بنائی گئی ہے۔ اس سرنگ کا قطر نو فٹ ہے جس میں بغیر ڈرائیور اور گارڈ کے برقی قوت سے ۴۸ گاڑیاں ہر روز دوڑتی ہیں جس کا اہم کام خطوط اور پارسل کے خریطوں کا حسب متذکرہ بالا مقامات کے درمیان لانا اور لے جانا ہے۔

اس سرنگ میں گاڑی کی آمد و رفت کے لئے دو پٹریاں جدا جدا بنائی گئی ہیں۔ اسٹیشن کے قریب سرنگ دو حصوں میں تقسیم کی گئی ہے جس میں سے ایک ایک پٹری گذر کر ان پلیٹ فارم تک پہونچتی ہے جو اسٹیشن میں بنائے گئے ہیں۔ پلاٹ فارم کی لمبائی دو ہزار تین سو تیرہ فٹ تک ہوتی ہے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے بغیر ڈرائیور اور گارڈ کے چلنے والی اس ریل کو قابو میں رکھنے کے لئے اسٹیشن پر سوئچ کیابن (Switch cabin) بنائے گئے ہیں جس پر صرف ایک آدمی کام کرتا ہے ہر ایک گاڑی کی لمبائی ۲۷ فٹ ہوتی ہے جس میں ۴ ڈبے لگے ہوتے ہیں۔ ہر ڈبہ میں ۱۵ خطوط کے خریطے اور ۴ پارسل کے خریطے رکھے جاسکتے ہیں۔ اس کی اوسط رفتار ۳۵ میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔ جب یہ اسٹیشن کے قریب پہونچ جاتی ہے تو خودبخود الکٹرک قوت گھٹنے لگتی ہے یہاں تک کہ اسٹیشن پر پہونچنے سے قبل بالکل رک جاتی ہے۔ اور پھر خودبخود حرکت کرتے ہوئے آٹھ میل فی گھنٹہ کی رفتار سے پلیٹ فارم پر داخل ہوتی ہے۔ اگر اس کو اسٹیشن پر ٹھیرنا ہوتا ہے تو آٹومیٹک بریک لگ جاتے ہیں اور یہ بالکل رک جاتی ہے ورنہ جب تک یہ پلیٹ فارم سے گذرے اپنی سست رفتار قائم رکھتی ہے اور جیسے ہی اسٹیشن سے سرنگ میں داخل

ہوتی ہے دوبارہ ۳۵ میل فی گھنٹہ کی رفتار اختیار کر لیتی ہے

خریطوں کو چڑھانے اور اتارنے کے لئے چند آدمی کام کرتے ہیں۔ سارٹنگ آفس سے اسٹیشن تک اور وہاں سے سارٹنگ آفس تک خریطوں کو منتقل کرنے کے لئے لفٹس اور (Band conveyors) لگے ہوتے ہیں۔ سارٹنگ آفس سے جو سطح زمین پر واقع ہیں اسٹیشن تک خریطوں کو منتقل کرنے کے لئے جب (conveyors) پر ڈال دئے جاتے ہیں تو یہ برقی قوت سے حرکت کرتا ہوا ان کو زمین دوز اسٹیشن کے پلیٹ فارم تک پہونچا دیتا ہے۔ جہاں پر ان کی سارٹنگ (Containers) (جو صندوق نما مستطیل شے ہے) میں کی جاتی ہے جن کو آسانی سے ڈھکیل کر ریل پر چڑھا دیتے ہیں۔ اور گاڑی دوسرے اسٹیشن کے لئے روانہ ہو جاتی ہے۔ دوسرے اسٹیشن پر Containers ریل گاڑی سے جدا کئے جاکر لفٹس کے ذریعہ سارٹنگ آفس میں پہونچا دئے جاتے ہیں اگر conveyor سے منتقل کرنا ہوتا ہے container ایک خاص آلہ پر چڑھا دیا جاتا ہے جو خود بخود برقی قوت کے تحت حرکت کرکے conveyor پر ان خریطوں کو انڈیل دیتا ہے۔ جو حرکت کرتے ہوئے سارٹنگ آفس میں پہونچ جاتے ہیں دنیا میں یہ اپنی نوعیت کی ایک ہی ریل گاڑی ہے جو سالانہ کم از کم چالیس لاکھ (۴۰۰۰۰۰۰) پارسل کے خریطے اور پینسٹھ لاکھ (۶۵۰۰۰۰۰) خطوط کے خریطے لاتی اور لے جاتی ہے۔ اس کے علاوہ اسٹور ڈیپارٹمنٹ کا کثیر المقدار سامان صادر اور یونی فارم بھی اس کے ذریعہ منتقل کیا جاتا ہے۔

ڈاک کو دور دراز مقامات تک لے جانے کے لئے پوسٹ آفس کی خاص ریل گاڑیاں ہوتی ہیں جو صرف خطوط اور پارسل کے لئے مخصوص ہوتی ہیں ان کو سفر کرنے والا ڈاک خانہ (Travelling Post office) کہتے ہیں اس گاڑی کی خصوصیت یہ ہے کہ بجز اُن بڑے مقامات کے جہاں سینکڑوں خریطے لینا اور دینا ہوتا ہے کسی اسٹیشن پر نہیں ٹھہرتیں مگر اس میں اس قسم کا انتظام ہوتا ہے کہ ہر اسٹیشن پر بغیر ٹھہرے یا رفتار سست کئے ڈاک لیتی ہے اور ساتھ ہی ساتھ اس اسٹیشن کا موسومہ ڈاک بھی دے جاتی ہے۔ اس کے ہر ایک ڈبہ کی لمبائی ۴۰ فٹ سے ۷۰ فٹ تک ہوتی ہے۔ اس میں ۱۲ سے ۱۶ ڈبے لگائے جاتے ہیں جن کا طول تقریباً (۹۶۰) نو سو ساٹھ فٹ ہوتا ہے جو دنیا میں خالص ڈاک کی طویل ترین گاڑی ہے جس کی اوسط رفتار اسی میل فی گھنٹہ ہوتی ہے۔

اس مختصر مضمون میں اُن تفصیلات کا بیان کرنا کہ یہ کس طرح بغیر ٹھہرے ڈاک لیتی اور دیتی ہے ممکن نہیں، البتہ آپ ایک سفر کرنے والی گاڑی سے جس کا ذکر ذیل میں کروں گا اندازہ لگا سکیں گے کہ کس قدر ڈاک صرف ایک سفر کرنیوالی

گاڑی لے جاتی ہے۔ لنڈن مڈلانڈ اسکاٹش ریلوے (London Midland Scottish railway) میں ایک ڈون (Travelling Post Office) گاڑی Euston سے آبرڈین Aberdeen تک پانسو چالیس (۵۴۰) میل فاصلہ طے کرتی ہے اس میں حسب ذیل مقامات کے لئے ڈبہ لگائے جاتے ہیں۔

ایک ڈبہ لیورپول (Liverpool) کے لئے ایک منچسٹر (Manchester) کے لئے ایک پرسٹن (Preston) کے لئے ایک Stranraer کے لئے دو آبرڈین Aberdeen کے لئے ایک گلاسگو (Glasgow) کے لئے ہوتا ہے ان کے علاوہ دو سارٹنگ ڈبے (Sorting carriages) ایرڈین کے لئے اور تین گلاسگو کے لئے لگے ہوتے ہیں۔ یہ گاڑی جس وقت لنڈن سے نکلتی ہے تو اس میں کثیر التعداد خطوط اور پارسل کے خریطے بالراست خاص خاص مقامات کے لئے ان کے مخصوص ڈبوں میں روانہ کئے جاتے ہیں ان کے علاوہ سیکڑوں خریطے جو صرف اس ریل کے موسومہ ہوتے ہیں ان کی سارٹنگ۔ سارٹنگ ڈبوں میں کی جاتی ہے جب یہ کسی بڑے اسٹیشن پر ٹھیرتی ہے تو اس کا موسومہ ڈبہ فوری جدا کرلیا جاتا ہے جو سیکڑوں خریطوں سے لدا ہوتا ہے اگر کسی اور مقام کے لئے جدید ڈبہ لگانا مقصود ہو تو فوری جوڑ دیا جاتا ہے۔ اور چند سکنڈ میں گاڑی روانہ ہوجاتی ہے۔ اس طرح کے ستر (۷۰) "سفر کرنے والے ٹپہ خانے" انگلینڈ میں ہر روز دوڑتے ہیں ان کے علاوہ بہت سے اور گاڑیوں میں جن میں مسافر بھی سفر کرتے ہیں ٹپہ روانہ کیا جاتا ہے۔

ان دونوں ریلوں کے علاوہ مختلف سائز کی چھوٹی بڑی ٹپہ کی موٹریں تمام انگلینڈ میں دوڑتی پھرتی ہیں جن کا کام صندوق خطوط اندازی سے خطوط کو جمع کرنا یا خطوط اور پارسل بھر کر سڑکوں پر تقسیم کے لئے جانا یا اسٹیشن سے سارٹنگ آفس تک یا وہاں سے اسٹیشن تک ٹپہ کا منتقل کرنا یا ٹیلیفون اشیاء کا لانا اور لے جانا ہوتا ہے۔ ٹپہ کی موٹریں جو تمام انگلینڈ میں ۲۴ گھنٹوں تک کام کرتی ہیں گیارہ ہزار پانسو پچپن ہیں (۱۱۵۵۵) جنہوں نے صرف ۱۹۳۶ء میں بارہ کروڑ پچاس لاکھ (۱۲۵۰۰۰۰۰۰) میل فاصلہ طے کیا اور ان کے چلانے میں باسٹھ لاکھ پچاس ہزار (۶۲۵۰۰۰۰) گیالن پیٹرول خرچ کیا گیا۔ ان موٹروں سے منتقل شدہ پارسل و خطوط کو ستر ہزار (۷۰۰۰۰) خطوط رساں تقسیم کرتے ہیں۔

ان کے علاوہ ٹپہ کے ہوائی جہازوں کا جو ۱۹۳۵ء میں ایک لاکھ چھیانوے ہزار (۱۹۶۰۰۰) پونڈ پارسل اور ایک کروڑ پانچ لاکھ (۱۰۵۰۰۰۰۰) خطوط لنڈن سے باہر گئے و نیز ہزارہا سیکلوں۔ ڈھکیلنے کے گاڑیوں اور گھوڑا گاڑیوں کا ذکر ہو تو طوالت سے خالی نہ ہوگا۔

محمد اقبال حسین خاں

نقد و نظر

جامعہ جنوری ۳۸ء

قومی تخیل کی تبدیلی کے ساتھ ادبی اور علمی رجحانات بدل جاتے ہیں۔ اگر آپ کسی قوم کے کسی خاص عہد کا مطالعہ کرنا چاہیں تو سب سے پہلے اس دور کے ادب کا مطالعہ کرنا ضروری ہے۔ ہندوستان میں قومیت کا تخیل پیدا ہونے کے ساتھ ہی اردو ادب میں بھی نئی زندگی کے آثار نظر آرہے ہیں اور اس کی ترقی کے لئے انفرادی اجتماعی طور پر کوششیں کی جارہی ہیں لیکن ایسے قابل فخر ادارے جو واقعی خلوص اور ایثار سے خدمت کر رہے ہوں گنتی کے چند ہیں ان اداروں میں "انجمن ترقی اردو" کے بعد سب سے ممتاز "جامعہ ملیہ" ہے جس کو خوش قسمتی سے دار المصنفین اعظم گڈھ کی طرح نہ صرف لایق اور مخلص کارکن مل گئے، بلکہ اس نے قوم کا اعتماد حاصل کرنے میں بھی کامیابی حاصل کرلی ہے جو بدقسمتی سے بہت کم اداروں اور رہنماؤں کو حاصل ہے۔ جامعہ ملیہ کے ارکان نہ صرف علوم جدیدہ سے واقف ہیں بلکہ علوم قدیم سے بھی ان کی انگلیاں زمانہ کی نبض پر ہیں اور وہ اچھی طرح محسوس کرتے ہیں کہ اس وقت بیمار کو کس قسم کا علاج اور اس کو کونسی دوا کی ضرورت ہے۔

سیاسیات کے عملی میدان سے قدرے ہٹ کر انھوں نے قومی تعلیم اور تربیت پر توجہ کی معاشیات، عمرانیات وغیرہ پر مضامین اور تصانیف کے ذریعہ قوم کو بیدار کرنا ضروری سمجھا اور کوشش کر رہے ہیں کہ قوم کے اس بگڑے ہوے مذاق کو سدھاریں جو دور تنزل میں انتہائی پستی تک پہونچ گیا تھا۔

گذشتہ چند برسوں میں جامعہ ملیہ نے نہایت بلند پایہ تصانیف ترجمے اور تالیفیں شائع کیں۔ یہ کتابیں نہ صرف علمی و ادبی لحاظ سے انقلاب آفریں ہیں بلکہ اتنی دیدہ و زیب چھپی ہیں کہ دیگر ناشرین کتب اپنی مطبوعات بہتر اور نفیس تر طباعت و کتابت کے ساتھ شایع کرنے پر مجبور ہو رہے ہیں جس سے قوم کا جمالیاتی ذوق سدھرنے کی امید ہے۔

اس وقت جامعہ ملیہ سے تین رسالے، یعنی جامعہ، پیام تعلیم اور کتب نما شایع ہو رہے ہیں۔ پیام تعلیم بچوں کے لیے بہترین رسالہ ہے، کتب نما میں اردو ادب کی نئی کتابوں پر تبصرے ہوتے ہیں اور جامعہ علمی رسالہ ہے جو کئی سال سے بہترین علمی و ادبی خدمت انجام دے رہا ہے کہنے کو تو اس کے اڈیٹر ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب ہیں لیکن اس کے ادارہ میں دیگر ارکین اور اساتذہ جامعہ بھی شامل ہیں جو اپنی بلند نظری اور اصابت رائے کے لئے ممتاز ہیں۔

گذشتہ چند سال سے جامعہ نے معاشیات، سیاسیات اور عمرانیات پر خاص توجہ مبذول کی ہے اور بلا تکلف کہا جا سکتا ہے کہ جامعہ نہ صرف اردو بلکہ ہندوستان کی دیگر زبانوں کے چوٹی کے رسائل کے صف اول میں ہے۔

گذشتہ چند ماہ سے تعمیری تعلیم کی طرف ملک کی توجہ مبذول ہے اس مقصد کے لئے واردھا میں ایک جماعت ماہرین تعلیم کی غور و خوض کرنے کے لئے جمع ہوئی تھی۔ جامعہ نے اس پر خاص توجہ کی اور گذشتہ چند ماہ میں کئی بلند پایہ مضامین شائع کئے۔ ڈاکٹر ذاکر حسین اس کمیٹی کے صدر تھے انھوں نے اس موقع پر اپنے ذاتی تعلیمی تجربات پیش کئے۔ اس سے قبل موصوف ایک کتاب مشہور تعلیمی مفکر پستالوزی اور اس کے اصول تعلیم پر شایع کر چکے ہیں اس کانفرنس میں بھی موصوف نے پستالوزی اور گاندھی جی کے تعلیمی اصول میں یکسانیت کا اظہار کیا تھا لیکن بعض حلقوں میں اس کو خاص جذبات کی بنا پر پسندیدگی کی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔

جنوری ۳۸ء کے جامعہ کو ۳۷ء کے عنوان کے تحت ہندوستان ممالک غیر اور اسلامی دنیا پر تقسیم کیا ہے اس کے بعد چند بلند پایہ معاشی مضامین اور اس کے بعد رفتار عالم کے تحت اسپین برطانیہ اٹلی، جرمنی جنوبی امریکہ مصر، حجاز مراکش، سوئیلینی اور اسلامی دنیا، چین و جاپان کی جنگ وغیرہ پر مختصر نوٹ ہیں جن کے بعد چند صفحات تعلیمی دنیا کے لئے وقف کر کے آخر میں وردھا ایجوکیشنل کی کمیٹی کی رپورٹ کا بیس صفحی ضمیمہ ہے جو علحدہ بھی ۲ میں مل سکتا ہے۔ ضرورت ہے کہ رہنمایان قوم اس ضمیمہ پر خاص طور پر غور کریں کیونکہ ہمارے تنزل اور بربادی کا ایک بڑا سبب ہمارا ناقص طریقہ تعلیم ہے

جامعہ ملیہ نے ترقی ادب کے لئے ایک اکیڈمی بھی قائم کی ہے جس کا سالانہ چندہ صرف ۵؍ ہے اس چندہ کے

عوض جامعہ ملیہ اسی قیمت کی کتابیں رسالہ جامعہ مفت دیتا ہے۔ اس لحاظ سے خاص طور پر علم دوست احباب کے لئے اس کی رکنیت مستحق توجہ ہے۔

ہم کارکنان جامعہ کو مبارک باد دیتے اور دعا کرتے ہیں کہ جن مفید کاموں کا سلسلہ انھوں نے شروع کیا ہے ان میں خدا انھیں کامیاب کرے۔

حیدر علی یہ ایک مختصر سا دلکش تاریخی ناول ہے جو جناب محمود بنگلوری نے کوثر پریس بنگلور سے شائع کیا ہے۔ موصوف کا نام ان کی وسیع اور بلند مرتبہ کتاب "تاریخ سلطنت خداداد میسور" کی وجہ سے اردو دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔

ہندوستان کے اسلامی عہد کی تاریخ اتنی غلط لکھی گئی ہے کہ اسے دوبارہ لکھنے کی ضرورت ہے۔ ایک غیر جانبدار شخص ٹاڈ جیسے مورخوں کو معاف کر سکتا ہے جو خود ساختہ اور جعلی دستاویزیں پیش کر کے مختلف فرقوں کے معاشرتی تعلقات خراب ہونے کا باعث ہوئے لیکن ان ہندوستانی مورخوں کو معاف نہیں کر سکتا جو ان افسانوں کی شہرت کا باعث ہوئے بدقسمتی سے ان لوگوں میں سے اکثر کچھ تو اصلی ماخذات سے مستفید نہ ہو سکے اور کچھ اکسائے ہوئے جذبات سے برانگیختہ ہو کر تعصب اور منافرت کی آگ کو اور بھڑکا دیا۔

تاریخوں کے بعد افسانوں اور ناولوں کا دور آیا اور ان میں بھی انہی جذبات کو جگہ دی گئی چنانچہ اس معاملہ میں بنگالی اور مرہٹہ مصنف بہت زیادہ قابل الزام ہیں جنہوں نے دلکش الفاظ میں مسلمان سلاطین اور بیگمات کے متعلق بالکل بے بنیاد لیکن نہایت شرمناک من گھڑت افسانے پیش کئے ان افسانوں کا جادو ایسا چلا کہ لوگ انہی کو واقعات سمجھنے لگے چنانچہ آج بھی اکثر اوقات بار بار اسلامی دور کا لطیف و جمیل مرقع نہایت کریہہ لباس میں ہمارے سامنے آتا ہے جس سے قومی منافرت میں اضافہ ہو رہا ہے۔ لہذا ضرورت ہے کہ اس قسم کے افسانوں سے جن میں کسی فرقہ کے کسی فرد کی داستان حیات بیان کی گئی ہو خصوصاً اگر اس میں اس کردار کی زندگی کا کوئی تاریک پہلو پیش کیا گیا ہو اجتناب کیا جائے۔ ہندوستانی قومیت کی تعمیر کے لئے ضروری ہے کہ ملک کے مختلف فرقے اپنے محدود نظریہ قومیت میں، جسے درحقیقت فرقہ پروری کہنا چاہئے، تبدیلی کریں۔ مسلمانوں کو چاہئے کہ عہد قدیم کے تہذیب و تمدن پر اسی طرح فخر کریں جس طرح قرون وسطیٰ کے تہذیب و تمدن پر کرتے ہیں اور اسی طرح ہندوؤں کا فرض ہے کہ قرون وسطیٰ کی اسلامی سلطنت کو اسی طرح اپنا سمجھیں جس طرح عہد قدیم کی حکومتوں کو سمجھتے ہیں۔

مصنف نے کتاب کو غالباً جاذب نظر بنانے کے لئے ناول کا نام "حیدر علی" رکھا ہے لیکن درحقیقت اس کا ہیرو حیدر علی نہیں۔ اگر اسے بدنور کی مہارانی ویرماجی کی ہوس رانیوں کی داستان کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا۔ اسی سلسلہ میں حیدر علی کی ترکتازیوں، مرٹیوں اور مندروں کی زبوں حالی کا ذکر بھی آگیا ہے جو اس زمانے میں فحاشی اور عیاشی کے اڈے بن گئے تھے۔ جن واقعات پر افسانے کی بنیاد رکھی گئی ہے تاریخوں میں موجود ہیں اور مصنف نے ملک کے حالات دیکھتے ہوئے احتیاطاً دیباچہ میں اقتباسات کے ساتھ ان کا حوالہ بھی دے دیا ہے۔ یہ دیباچہ شاید اس لئے اور بھی ضروری تھا کہ وہ ناظرین جو تاریخ میسور سے واقف نہیں افسانے کے پس منظر سے واقف ہو جائیں۔

فتح بدنور کے سلسلے میں معلوم ہوتا ہے کہ لطف علی اور مرزا خاں کی داستان عشق، شرر مرحوم کے ناول منصور موہنا کے پلاٹ سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ زبان صاف اور شستہ ہے اور اگرچہ کہیں کہیں زبان اور محاورے کی غلطیاں رہ گئیں ہیں لیکن اس سے افسانہ کی دلچسپی میں کمی نہیں آتی۔

کاغذ معمولی، کتابت اور طباعت صاف اور عمدہ ہے صفحات ۲۰۴ قیمت صرف ۸ر

پتہ:- محمد سراج الدین بک سیلر و پبلشر۔ ڈکنسن روڈ بنگلور۔ (م)

ماہنامہ سب رس

نگران ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ، مدیر صاحبزادہ میر محمد علیخاں صاحب میکش مہتمم خواجہ حمید الدین صاحب۔ اشتراک سالانہ چار روپیہ، بیرون حیدرآباد کے لئے چار روپیہ آٹھ آنہ۔ دفتر "ادارہ" رفعت منزل خیریت آباد۔ حیدرآباد دکن

یہ ماہنامہ ادارہ ادبیات اردو حیدرآباد دکن کا آرگن ہے۔ جس کے جنوری اور فروری کے شمارے اب تک شایع ہو چکے ہیں۔ جنوری کا شمارہ مضامین کی ترتیب اور تنوع کے اعتبار سے دلچسپ ہے اور بعض مضامین نظم و نثر غور و فکر کے ساتھ پڑھے جانے کے لایق ہیں۔ سرورق چغتائی آرٹ کے ان نقوش کا رہین منت ہے جو عام طور پر نگاہوں کو تو بھلے نہیں لگتے، مگر دماغ، طویل غور و فکر کے بعد ان کی قدردانی کے لئے آمادہ ہو جاتا ہے۔ فروری کے شمارہ پر جو اس رسالہ کا دوسرا پرچہ ہے، ہم قدرے تفصیل کے ساتھ تبصرہ کرتے ہیں۔

"ادارہ" سب رس کے افتتاحیہ کا عنوان ہے جو اکیس بائیس سطروں پر مشتمل ہے۔ اسی اداریہ کا ایک جملہ یہ ہے:-

"اس سال اسلامک کلچر سوسائٹی نے یوم اقبال مناکر موجودہ زمانہ کے،

"ایک پیام بر" اور "مستقبلی شاعر کا خراج تحسین ادا کیا"

خط کشیدہ الفاظ کے چونکا دینے والے "ربط باہمی" سے قطع نظر کی جاسکتی ہے اگر اس "مستقبلی شاعر" کو وجدان کس طرح گوارا کرے گا، "شاعر مستقبل" نہایت ہی مانوس اور فصیح لفظ پہلے ہی سے موجود ہے۔ ادارہ سب رس کو غالباً اس ترکیب میں ثقل نظر آیا۔

تبصرہ کے عنوان سے الموسی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا گیا ہے:۔

"اور اس میں بھی ہمیشہ کی طرح اپنی صلاحیتوں کا اظہار کیا ہے:۔

"مستقبلی شاعر" کے بعد "اپنی صلاحیتوں کو پڑھکر ہم حیران رہ گئے کہ یہ کیا ہو رہا ہے؟ ہم ادارہ ادبیات اردو کے فاضل ارکان کی خدمات میں ادب کے ساتھ عرض کرتے ہیں، کہ وہ اس نوع کی عجیب و غریب ترکیبیں تراش کر اردو زبان کو "بازیچہ" نہ بنائیں، اور اپنی "اپنی صلاحیتوں" کو منظر عام پر لانے کی کوشش نہ فرمائیں۔

ادارہ کے بعد سب سے پہلے "علامہ راشد الخیری کی یاد" کو درج کیا گیا ہے، یہ مضمون صرف ایک صفحہ پر مشتمل ہے جس کا ایک حصہ خواجہ حسن نظامی صاحب کے "منادی" سے لیا گیا ہے۔ اب چند سطریں جو خود مضمون نگار کی لکھی ہوئی باقی رہتی ہیں ان کا حال یہ ہے:۔

لہ "جب کہ ہماری صنف لطیف کی تمام علمی سطح بام عروج"

"پر گامزن ہو کر اوہام و خرافات سے بچ رہی تھی"

لہ "آج دنیائے ادب میں مصور غم کی دلآویز انشاپردازی"

"اور بہترین افسانہ نگاری کا ڈنکا بج چکا ہے"

لہ "یہ امتیاز علامہ مرحوم ہی کو حاصل ہے کہ جہالت اور غیر ضروری"

"آداب زندگی میں جکڑی ہوئی افسردہ عورتوں کے لئے ہنسانے اور"

"خوش کرنے والا ذخیرہ کافی مقدار میں بہم پہونچایا"

طرز بیان کی اسی "سادگی اور دلآویزی سے متاثر ہو کر، ادارہ سب رس نے اس مضمون کو سب سے پہلے جگہ دی ہے۔

"فطرت" کو ہم نے کئی مرتبہ غور و خوض کے ساتھ پڑھا، مگر کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ مضمون نگار آخر کیا کہنا چاہتا ہے۔

اس مضمون کا ایک جملہ یہ ہے:۔

"اس نے لکنت لیتے ہوئے دبی زبان سے کہا"

یہ پورا مضمون کوئی جدید آرٹ معلوم ہوتا ہے۔

بچوں کے صفحات میں "چار مینار" جس مضمون کا عنوان ہے، اس کی دوسری سطر کا آخری جملہ یہ ہے:۔

"جس کی تاریخ اس پریمی شہر کی

وہ گزشتہ اور موجودہ عظمت کو ایک رشتہ میں پرو دیتی ہے"

پریمی نا لبّا (Romantic) کا ترجمہ ہے جو صحیح نہیں ہے۔

عربی ادب خلفائے راشدین کے عہد میں، زندگی کے مظاہر، اور ناسکیو کے سیاسی نظریات وغیرہ مضامین قابل قدر ہیں، اور "حسن و دل" اس شمارہ کا سب سے زیادہ کامیاب اور دلچسپ مضمون ہے۔

حصہ نظم میں نواب عزیز یار جنگ بہادر کی غزل کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:۔

نہ لگا ٹھوکریں ظالم نہ لگا رستے میں — گر پڑا ہے دل رنجور پڑا رہنے دے

چارہ گر دیکھتا ہی ان کو اسی ڈر سے — دل مجروح میں ناسور پڑا رہنے دے

یہ وہی فصیح الملک داغ کے "تلمیذ رشید" نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز ہیں جنہوں نے باقیات فانی کے سیکڑوں اشعار کو "غلط، مہمل اور لغو" بنا کر چھوڑ دیا ہے، (خط کشیدہ مصرعوں اور الفاظ پر قارئین کا وجدان بہتر طور پر تنقید کر سکے گا)۔ اسی غزل کا ایک شعر ہے:۔

ہم سمجھ لیں کہ یہی ہے ترے کشتہ کا کفن — پرتوے عارض پر نور پڑا رہنے دے

"پرتوے عارض" نہ معلوم شاعر کے قلم کی لغزش ہے یا کاتب صاحب کا فیض اثر۔

جس نظم کا عنوان "بیوی کی یاد میں" ہے اس کی اشاعت سے کارکنان ادارہ کا مقصد، شاعر کے غم میں شریک ہو کر انسانی ہمدردی کا ثبوت دینا معلوم ہوتا ہے، یہ جذبہ بہر حال قابل قدر ہے۔

"نیا پل اور شام میں" "چغتائی آرٹ" جیسی "حسن کارانہ" کشش پائی جاتی ہے، اس نظم کا آخری شعر ہے:۔

ایسے خوش منظر میں میری ذات ہی کھوئی ہوئی
جاگتی ہے آنکھ اور تقدیر ہے کھوئی ہوئی

"میری ذات ہے کھوئی ہوئی" کا صحیح لطف کوئی "فنا فی الذات" صوفی ہی اٹھا سکتا ہے۔

"ساون" پر ادارہ نے ایک نوٹ سپرد قلم فرماتے ہوئے اظہار خیال کیا ہے:-

"سادگی اور پرکاری" اس نظم کی خصوصیت ہے"

اس نظم کی ابتدا اس طرح ہوتی ہے:-

"سب درختوں نے ہے سبز جوبن لیا، گونجتی ہے پپیہے کی پیہو"
"دیکھ کالی گھٹا میرے سندر پیا۔ یاد آنے لگے تیرے گیسو"

پوری نظم اسی "صنعت سادگی و پرکاری" میں فرمائی گئی ہے۔ "سبز جوبن لیا" کی سادگی اور پرکاری کی صحیح داد "اونچی صلاحیتوں" والے حضرات ہی دے سکتے ہیں تشبیہات میں بھی خاص ندرت کا لحاظ رکھا گیا ہے۔ "آنکھوں کو "دیدے" کہہ کر "روپہلی کٹوروں" سے اور پلکوں کی "چھوئی موئی" سے تشبیہہ دی گئی ہے۔ نظم کے چوتھے بند کا پہلا مصرعہ یہ ہے:

"چپ کے چپ کے کٹاری چلانے لگیں"

"چپکے" کے بجائے "چپ کے" لکھنا اردو رسم الخط کے لئے کیا عجب ہے کوئی فال نیک ہو ——!

گیارہویں بند میں "موسم" کو "عالم" کے قافیہ کے ساتھ نظم کیا گیا ہے۔ اسی نظم کے "نوٹ" کو پڑھ کر اس عجیب حقیقت کا بھی اظہار ہوا کہ جناب باپر کی نظم "ہائی سو" "علمی طبقوں" میں بہت مقبول ہوئی۔

تصاویر میں کوئی گورسرن لال صاحب آزاد بھی اپنی ایک رباعی کے ساتھ جلوہ فرما نظر آتے ہیں۔ کارکنان سب رس غالباً شعراء کی گریڈ ([illegible] Research) فرما رہے ہیں۔

ہم آخر میں کارکنان سب رس کی ادبی کاوشوں اور علمی سرگرمیوں کا صدق دل سے اعتراف کرتے ہیں یقین ہے کہ ملک اپنے نوخیز مجلہ کا فراخدلی کے ساتھ خیر مقدم کرے گا۔ ہم سب رس کو پھولتا پھلتا دیکھنے کے متمنی ہیں۔

اُردو مسعود نمبر | اڈیٹر، مولوی عبدالحق صاحب بی۔اے (علیگ) آنریری سکریٹری انجمن ترقی اُردو، اورنگ آباد (دکن)

نواب مسعود جنگ سر سید راس مسعود مرحوم اُس علمی اور معزز خاندان کے چشم و چراغ تھے، جس کے کارنامے دنیا پر آفتاب کی طرح روشن ہیں۔ مسعود کے بچپن کے ابتدائی سال اُس عظیم المرتبت انسان کی آغوش میں گذرے، جو عل کے اعتبار سے سن رسیدہ، موج اور وقار و تمکین کے لحاظ سے پہاڑ کی چٹان تھا۔ راس مسعود کو سر سید احمد خاں جیسا شفیق سرپرست ملا، کتنا خوش نصیب تھا مسعود کا بچپن! — مسعود جنگ کی ذات، اپنے نامور دادا سر سید احمد خاں کے جوشِ عمل اور اپنے لایق باپ جسٹس محمود کی ذکاوت و ذہانت کا سنگم تھی۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ تعلیمی دلچسپیوں میں گذرا، عثمانیہ یونیورسٹی کی محرابیں اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے بام و در راس مسعود کے احسان سے جھکے رہیں گے مسعود جنگ کو ہم سے اُس وقت جدا ہونا پڑا، جبکہ اُن کی ہم کو بڑی ضرورت تھی۔ قوم میں مفکر اور علمی انسانوں کا قحط ہے، جانے والا، اپنا جانشین چھوڑ کر نہیں جاتا۔ افسوس کہ مسعود بھی اپنے تعلیمی تجربات اور عظمت و خودداری کو لے کر موت کی نیند سو گئے۔ اب وہ وہاں ہیں، جہاں اُن کو "مسعود جنگ" اور "سر راس مسعود" نہیں بلکہ صرف مسعود کی حیثیت سے دیکھا جائے گا، جہاں اُن کی ڈگریوں اور خطابات پر نہیں، بلکہ اُن کی "سیرتِ مسعود" اور "اعمالِ حسنہ" پر حصہ ملے گا —

انجمن ترقی اُردو اورنگ آباد دکن کے مشہور آرگن "اُردو" نے اسی محبوب و مسعود ہستی کی یادگار میں اپنا خاص شمارہ نکالا ہے، جس پر ہم ذیل میں تبصرہ کرتے ہیں:۔

"مسعود نمبر" کے قریب قریب تمام مضامین دلچسپ اور بلند پایہ ہیں، جن کے پڑھنے سے مسعود جنگ مرحوم کی زندگی کے بہت سے گوشے روشنی میں آجاتے ہیں۔ یہ تمام مضامین سر راس مسعود کے احباب و شناسا حضرات کے لکھے ہوئے ہیں جو سنے سنائے نہیں بلکہ تجربہ اور مشاہدات کے واقعات پر مشتمل ہیں "چند روز مسعود" "علی گڑھ میں سید راس مسعود کا کام" "مسعود مرحوم کی زندہ دلی" جن مضامین کے عنوانات ہیں، وہ مختلف اعتبارات سے قابل قدر ہیں۔ ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے "زندہ دلی" پر فلسفیانہ انداز میں تبصرہ فرما کر مضمون کو بہت زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے۔ جناب مولوی عبدالحق صاحب کا مضمون "سر راس مسعود" اس شمارہ کی جان ہے۔ مولوی صاحب قبلہ نے آنسوؤں

کے ساتھ ساتھ موتی بھی برسائے ہیں، اور یہ مضمون سیرت نگاری کا شاہکار ہے۔

اس مضمون کے آخر میں، راس مسعود مرحوم کے بعض انگریز احباب کے انگریزی مضامین ہیں، جن کا اردو ترجمہ بھی ساتھ ہی دے دیا گیا ہے۔ ان مضامین سے مرحوم کی شخصیت اور مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ پروفیسر ای۔ ای۔ اسپیٹ کا مضمون، ان میں سب سے بہتر اور دلچسپ ہے۔ مسعود جنگ مرحوم ہی، پروفیسر صاحب موصوف کو عثمانیہ یونیورسٹی میں لائے تھے۔ پروفیسر اسپیٹ کا یہ مضمون "احسان شناسی" کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ انگریزی مضامین کے سلسلہ میں صفحہ ۱۵۰ (اردو ترجمہ کی سطر ۵) پر جرمنی (Germany) کا ترجمہ ہانیہ کیا گیا ہے، جس پر ہماری نگاہ نے خفیف سی ٹھوکر کھائی، عربی میں جرمنی کو "المانیہ" کہتے ہیں، غالباً اسی وزن پر "جرمانیہ" بنایا گیا ہے۔

مسعود نمبر کے مضامین نثر کے پڑھنے سے ہم کو یہ معلوم کرکے مسرت ہوئی کہ سر راس مسعود مرحوم، انگریزی عہدہ داروں سے کبھی جھک کر نہ ملتے تھے۔ وہ جس طرح شکل و صورت کے اعتبار سے وجیہہ تھے، اسی طرح قلب و ضمیر کے لحاظ سے خود دار اور حوصلہ مند تھے، ان کے دل و دماغ "مغرب زدگی" کے طوفان سے متاثر نہیں ہوئے۔ راس مسعود مرحوم کی زندگی کا یہ پہلو ہندوستانی عہدہ داروں اور ذی مقدرت اصحاب کے لئے اپنے اندر عبرت و نصیحت کا درس رکھتا ہے ـــــــ کاش! اس حقیقت پر غور کیا جائے ـــــــ!

حصۂ نظم میں سب سے پہلے علامہ سر اقبال کی نظم درج کی گئی ہے۔ جس کا ابتدائی بند تو مسعود مرحوم سے متعلق ہے، باقی حصہ میں شاعر نے فلسفۂ موت و حیات بیان کیا ہے۔ علامہ اقبال کی شاعرانہ عظمت سے کس کو انکار ہے، لیکن یہ نظم ان کے رتبہ سے قدرے فروتر ہے۔ اقبال کی دوسری المیہ نظموں (مرثیوں) میں جو سوز و گداز پایا جاتا ہے، وہ اس نظم میں مفقود ہے، ممکن ہے دوسری نظمیں از خود کہی گئی ہوں، اور یہ نظم "فرمایش" کا نتیجہ ہو۔ تاہم اس شعر کا حافظہ سے محو ہونا مشکل ہے:۔

نہ مجھ سے پوچھ کہ عمر گریز پا کیا ہے؟
کسے خبر کہ یہ نیرنگ و سیمیا کیا ہے؟

سید ہاشمی صاحب فرید آبادی کی غزل کا ایک شعر ہے:۔

چشمِ مست ساقی کے فیض سے گاہوں میں
بوند بوند پانی کی بادۂ معظم ہے

یہ " بادۂ معظم " " بنت العنب " کا شوہر معلوم ہوتا ہے۔

چودھری خوشی محمد صاحب ناظر اور جلیل قدوائی کی نظمیں دردانگیز ہیں ان کے پڑھنے سے طبیعت پر اثر ہوتا ہے، یہ نظمیں " مرثیہ " کی حیثیت رکھتی ہیں " فلسفہ " بن کر نہیں رہ گئیں۔

محترمی مولوی عبدالحق صاحب کی یہ کوشش یقیناً مستحق تہنیت و تحسین ہے، " مسعود نمبر " اپنے طرز کا واحد شمارہ ہے۔ جو عامیانہ مضامین اور سوقیانہ خیالات سے پاک و صاف ہے، جو حضرات راس مسعود مرحوم کی زندگی کا مطالعہ کرنے کے خواہشمند ہوں، وہ اس نمبر کو ضرور پڑھیں۔

نذرِ ولی | سلسلہ مطبوعات ادارۂ ادبیات اُردو شمارہ (۴۰) از طالبات جامعہ عثمانیہ ناشر :۔ ادارۂ ادبیات اُردو، رفعت منزل، خیریت آباد، حیدرآباد دکن

ادارۂ ادبیات اُردو حیدرآباد دکن نے اپنا چودھواں قابل قدر کارنامہ " نذرِ ولی " کے نام سے پیش کیا ہے۔ جس کی تقریب ڈاکٹر سید محی الدین صاحب قادری زورؔ پروفیسر عثمانیہ یونیورسٹی کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے۔ یوم ولیؔ کے حسن قبول اور اہمیت سے بحث کرنے کے بعد ڈاکٹر صاحب موصوف تحریر فرماتے ہیں :۔

" ان (ولی) کے کلام کی بعض خصوصیات جواب پھر اُردو شاعری میں جگہ حاصل کر رہی ہیں، اور یہ ثابت کرتی ہیں کہ انھوں نے اس نازک دور میں، فارسی کے مقابلہ میں اُردو کو بچانے کی جو سعی بلیغ کی تھی، وہ کتنی مستحکم بنیادوں پر مبنی تھی کیونکہ آج ہندی کے مقابلہ میں اردو کو بچانے کے لئے جو تدابیر اختیار کی جارہی ہیں اور زبان کو اصلاح کی طرف جو توجہ ہے، وہ ان ہی اصولوں پر مشتمل ہے، جن پر ولی نے عمل کیا تھا "

ولی کے زمانہ میں ریختہ اور فارسی میں نہ کوئی آویزش تھی، اور نہ اس قسم کی " مدافعت و اقدام " کا کوئی تصو

پایا جاتا تھا۔ اردو، ہندی کی موجودہ سیاسی کشمکش کو عہد ولی کے لسانی اور ادبی انقلابات سے دور کا واسطہ بھی نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی یہ رائے نہ معلوم کن "قدیم مخطوطات" سے ماخوذ ہے۔ جناب زور آگے چل کر ایک حقیقت ثابتہ کا اظہار فرماتے ہیں :-

"ولی نے اُردو کو تمام ہندوستان میں عام فہم بنانے کی خاطر اس کو صوبجاتی قید و بند سے آزاد کیا۔ دکنی عنصر کم کرکے شمال کے روزمرہ کو بھی شامل کرلیا۔"

کوئی شک نہیں کہ شمالی ہند کے روزمرہ نے دکن کی اُردو میں نزاکت اور حلاوت پیدا کردی۔ اہل دکن ولی کے اس احسان کو فراموش نہیں کرسکتے۔ اُردو کو صوبجاتی قید و بند سے آزاد کرکے مرکزیت اور ہمہ گیری پیدا کرنے کی آج بھی ضرورت ہے۔ ولی کی پاک روح اس خصوص میں اپنے اقدام کو تکمیلی شان کے ساتھ دیکھنا چاہتی ہے۔

یہ کتاب چار (۴) مضامین پر مشتمل ہے۔ جو سب کے سب جامعہ عثمانیہ کی فاضل طالبات کی نگارش جمیل کے رہین منت ہیں۔ اردو ادب میں اس نوع کی یہ پہلی کتاب شائع ہوئی ہے، شاعری "فن لطیف" ہے، جس سے "صنف لطیف" کو یقیناً دلچسپی ہونی چاہئے، یہ کتاب اسی دلچسپی کا ایک خوش جمال مرقع ہے۔ فاضل خواتین نے اپنے اپنے موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے، اسلوب نگارش شگفتہ، اور قوت استدلال پُرزور ہے۔ ان مضامین کے پڑھنے کے بعد، مضمون نگاروں کے تفکر دقیق اور وسعت نظر کی بے اختیار داد دینی پڑتی ہے۔ تصوف اور شاعری پر جو فنی انداز میں بحث کی گئی ہے، اس کو پڑھ کر محترم خواتین کی وسعت معلومات پر حیرت ہوتی ہے۔ ان مضامین کے طرز بیان میں قدرے ژولیدگی پیدا ہوگئی ہے لیکن محاسن کا پلہ بہرحال بھاری ہے۔

لطیف النساء صاحبہ بی اے نے ولی کے بعض اشعار کو "حسن محبوب، چشم فسوں ساز، مژگاں، نگاہ ناز، ابروے رنگیں، دہن نازک، لب لعلیں، زلف عنبریں، قد رعنا، خال زیبا، خط دلبر، رخسار، ناز و انداز، میان معشوق اور رفتار مستانہ" کے عنوانات کے تحت پیش فرماکر، کتاب کو بہت زیادہ دلچسپ بنا دیا ہے ——— ادارہ ادبیات اردو کی ادبی سرگرمیاں بہرحال لائق توصیف ہیں۔ کاش، ملک کو ان کی صحیح طور پر قدر کرنے کی توفیق نصیب ہو۔ سرورق پر حضرت ولی کو "باباے ریختہ" لکھا گیا ہے، اس ترکیب میں طنز و مزاح کا ایک پہلو نکلتا ہے۔ اور ثانی معانی ولی کے نام کے ساتھ مزاح و ذم کی جہت سے بعید، اور خفیف سے خفیف وابستگی کو بھی ہم برداشت نہیں کرسکتے

ولی کی شاعرانہ عظمت، ہمارے خطابات و القاب کی محتاج نہیں ہے، اور اگر یہ ضرورت ناگزیر ہو گئی ہے، تو پھر اُردو ادب میں شگفتہ اور پاکیزہ ترکیبوں کی کمی نہیں ہے ہم کو امید ہے کہ ادارۂ ادبیات اُردو، کے فاضل ارکان اپنی ترکیب پر اصرار نہ فرمائیں گے۔

دو سو اڑتالیس صفحات کی یہ مجلد کتاب، طباعت و کتابت کے اعتبار سے بھی دیدہ زیب ہے مکتبہ ابراہیمیہ مشین پریس حیدرآباد نے نہایت محنت کے ساتھ کتاب کو چھاپا ہے قیمت کا کہیں ذکر نہیں ہے۔

"ادارہ"

غزل

نہ ہنسانا مجھے چاہا نہ رلانا چاہا غم نے اک پیکرِ تصویر بنانا چاہا
حُسن بنکر ہی رہی چاکِ گریباں کی ادا جوشِ وحشت نے بہت عیب لگانا چاہا
کیا تماشا ہی کہ تدبیر سے عاجز ہیں ہمیں موت نے بھی کوئی آنے کا بہانا چاہا
مجھ پہ اک اور شبِ غم یہ قیامت ٹوٹی مسکراتے ہوئے تاروں نے ہنسانا چاہا
دلِ محروم سا دیکھا نہیں پابندِ وفا جان پر کھیل کے ایمان بچانا چاہا
ڈوبتے کے لئے تنکے کا سہارا تھا بہت تم نے خود میری طرف ہاتھ بڑھانا چاہا

برمحل ان کی نگاہوں میں تبسم دیکھا
ہم نے جب درد کا احساس چھپانا چاہا

کون اس عالم تخئیل میں رہبر تھا مرا
راہ بھولا تو مجھے کس نے بتانا چاہا

بیٹھے بٹھلائے لیا مفت کا جھگڑا زیبا
دل دیوانہ کو کیوں راہ پہ لانا چاہا

زیبا

وفاؔ

محمد عمر خان وفاؔ خلف نواب برق الدولہ بہادر ملک کے اُن شعرا میں سے ہیں جنہیں امتداد زمانہ نے گمنامی کا شکار بنایا ہے۔ ان کے جد امجد عمر بن عوض نواب ناصرالدولہ بہادر کے عہد حکومت میں حیدرآباد آئے۔ اولاً راجہ شیو پرشاد کی ماتحتی میں ۱۰۰ نفر عروب کی جمعداری پر تقرر ہوا۔ قومی شجاعت اور وفاداری کے مدنظر مہاراجہ چندولعل بہادر کے دور میں اس جمعیت میں ۵۰۰ عروب کا اضافہ ہوا۔ انکے فرزند صالح خدمت جمعداری کے علاوہ خطاب (برق جنگ بہادر) سے سرفراز تھے۔ برق جنگ اول کے بعد انکے فرزند محسن بھی آبائی خدمات اور خطاب سے ممتاز رہے۔ وفاؔ انہیں برق جنگ ثانی کے فرزند ارجمند ہیں جنہیں دربار سخن سے شاعری کا خلعت عطا ہوا۔

وفاؔ کا سال ولادت ۱۲۹۸ھ ہے۔ کمسنی ہی سے انھوں نے اپنی اعلیٰ دماغی توتوں اور ذہنی صلاحیتوں کا ثبوت دینا شروع کیا۔ آٹھ سال کی عمر میں اسلامیات کی تعلیم سے فراغت پائی۔ دسویں سال میں اردو اور فارسی میں دستگاہ حاصل کی۔ عربی گو مادری زبان تھی لیکن اسمیں بھی کافی دلچسپی لیکر کامل مہارت پیدا کرلی۔ مرہٹی اور گجراتی کا آپکو بہت شوق تھا اور اسطرف کچھ توجہ بھی کی مگر انگریزی میں مبتدی ہی رہے فارسی اور اردو میں میر بہادر علی صفیؔ سے تلمذ تھا۔ یہ غضب کے طباع اور ذہین تھے۔ طبیعت موزوں تھی۔ فی البدیہہ اشعار کہنے کی

خاصی مہارت تھی ۔ کم عمری میں انکی شادی کرنل افسرالملک بہادر کی صاحبزادی سے ہوئی ۔ جلسۂ عقد میں اتنے سہرے پڑھے گئے کہ انکا مجموعہ "ترانۂ شادی" کے نام سے شایع ہوا ۔ فصاحت جنگ جلیل کے سہرے کا مقطع یہ ہے :-

دونوں کی جلیل آنکھوں سے لیلو نہیں بلائیں　　بھولا میرا نوشاہ ہے نادان ہے سہرا

یوں تو وفا نے بچپن ہی سے شعر و شاعری کی رنگین دنیا میں قدم رکھا لیکن پندرہ سال کی عمر سے اس فن میں جو لانیاں دکھانی شروع کیں ۔ دکن کے قدیم اخبار المحبوب میں ان کے علمی و ادبی مشاغل کا ذکر " دکن کے ہونہار بچے " کے عنوان سے ملتا ہے ۔ تین چار سال بعد انکی غزلیں مقامی رسائل کے علاوہ بیرون ملک کے بعض اعلیٰ ادبی پرچوں میں شایع ہوتی رہیں ۔ پہلی مرتبہ انکی جو غزل چھپی تھی اسکے چند شعر یہ ہیں :-

کی وفا میں نے تو یہ طرز جفا بھی آئی　　دل میرا آپ پہ آیا تو ادا بھی آئی
اشک بہتے ہیں اگر دل میں جلن ہوتی ہے　　درد کے ساتھ ہی دنیا میں دوا بھی آئی
تیرے آنے سے ہوئی اور ہی گلشن کی ہوا　　آج اٹھلاتی ہوئی باد صبا بھی آئی
ملتے رہتے ہیں وہ ارباب وفا سے اکثر　　کوئی پوچھے تو سہی قدر وفا بھی آئی

وفا کے کلام میں کہیں غالب کی چاشنی ہے تو کہیں داغ کی روانی ۔ کسی جگہ امیر کا اثر کارفرما ہے تو کسی جگہ آتش کی رنگ آمیزی ۔ باوجود ان اثرات کے شاعر کی انفرادیت ، مخصوص رنگ اور خاص طرز بیان پورے کلام حاوی ہے ۔ عربی انکی مادری زبان تھی اسلئے خال خال قومی استعارے ——— برق وادی ایمن ، کوس لمن الملکی ، شکل کلیم ، صحرا نوردی قیس ، ناقۂ لیلیٰ وغیرہ نظر آتے ہیں ۔

وفا عشق کی دل نوازیوں اور جذبات کی رنگینیوں کو مسحور کن انداز میں پیش کرتے ہیں ۔ انکی شاعری ایک سریلا راگ ہے جس سے محبت کے نغمے نکل کر فضائے بسیط میں منتشر ہوجاتے ہیں ۔ انکا قلم حسن و جمال کی ہنگامہ آرائیوں اور حسن و محبت کی منتہائی گہرائیوں کی تصویریں کھینچتا ہے ۔ انکا بیکر تخیل طائر بلند پرواز کی طرح عشق کے آسمان رموز تک پہنچتا ہے اور غیر فانی نقوش سامع کے صفحہ دماغ پر مترسم کرتا چلا جاتا ہے ۔ گو مضمون حسن و عشق پامال و فرسودہ ہوچکا ہے مگر وفا کی قوت بیانیہ اور مرصع کاری مردہ مضامین میں ایسی جان ڈالتی

ہے کہ سننے والے کے قلب کو گرما دیتی ہے اور روح کو تڑپا دیتی ہے۔

مثالاً ولیں بھی دردِ عشق جگر میں بھی دردِ عشق — کیونکر بتاؤں یہ کہ کہاں ہے کہاں نہیں
جنت سے کم نہیں دل پُرداغ کا چمن — گلچین کا یاں گذر نہیں خوف خزاں نہیں
دیر و حرم میں گلشن و صحرا میں کوہ میں — آنکھیں جو ہوں تو یار کا جلوہ کہاں نہیں
جوشِ وحشت کا تو جب لطف ہے کے دست جنوں — ٹکڑے داماں و گریباں بھی ہوں زنجیر کیساتھ
کیا کیا ملا ہے عشق کی سرکار سے ہمیں — پر آب چشم خستہ جگر بیقرار دل
اک دل کی اصل کیا ہے محبت کے سامنے — کرتے نثار تم پہ جو ہوتے ہزار دل
گل اسطرف چمن میں کھلائے بہار نے — داغوں سے اسطرف ہے میرا لالہ زار دل

شاعر ——— نوجوان شاعر شباب کے سرشار سمندر میں جب قدم رکھتا ہے تو مستانہ لہریں اسکی نظر کو دعوت کیف دیتی ہیں اور نسیم روح افزا کے خوشگوار جھونکے اسکے تخیل کو بام عروج تک پہونچا دیتے ہیں۔ وہ عیش و نشاط اور حسن و محبت کی رومان آفریں دنیا میں جگہ پاتا ہے جہاں کا ہر ذرہ بہار و نور، سرور و خمار میں ڈوبا ہوا ہے۔ شاعر کیلئے اسکا محبوب پیکر جمیل و مجسمہ حسن و رعنائی ہے۔ وہ اسکی پرستش کا مرکز، احساسات کا جولانگاہ اور حسین خیالات کا سرچشمہ ہوتا ہے۔

عاشق کے قلبی کیفیات، ذہنی رجحانات، روحانی احساسات کو احاطۂ تحریر میں لانا شاعری کا ایک نازک مقام ہے۔ مگر جس سادگی و روانی کیساتھ وہ دلکی گہرائیوں تک پہنچکر دلکش پیرائے میں اپنے تاثرات کو بیان کرتے ہیں۔ اسی سے انکی دقتِ نظر، سلامتی طبع، جودت فکر اور ذوق فن کا پتہ چلتا ہے۔ وفا معشوق کی تعریف میں اسطرح کہوئے جاتے ہیں ———

بارش مضمون ہے کیا کیا وصف روئے یار میں — یوں کبھی برسا نہو گا ابر گوہر بار صبح
وصف گیسو گر کروں ہوجائے عالم شام کا — ذکر ہو رخ کا تو پیدا ہوں ابھی آثار صبح

تری تلوار کا سایہ عجب سایہ ہے اے قاتل — ملا آرام ایسا نیند سی طاری ہے بسمل پر

میرے صیاد کا عالم کوئی دیکھے گلستان میں — نظر ہے روئے گل پر کان آوازِ عنادل پر
اثرمیرے تڑپنے کا ہوا اتنا تو قاتل پر — کہ تھی جس ہاتھ میں تلوار اب وہ ہاتھ ہے دل پر

معشوق کی تیغ جور و تعدی کے عاشق بسمل ہوا ہی کرتے ہیں۔ کبھی تیر نظر سے گھائل تو کبھی خنجر ادا سے زخمی—— کبھی تبسم کی بجلی خرمن صبر کو آن واحد میں تباہ کرتی ہے تو کبھی نسیم التفات کے جھونکے اور جلا تے ہیں لیکن عاشق ہے کہ زندگی کا ہر لمحہ اور اپنے بس کی ہر چیز ہر وقت قربان کرنے کو حاضر!

صبح کی معصوم فضاؤں میں، صبا کے دلربا جھونکوں میں، خوش گلو پرندوں کے دلفریب چہچہوں میں عاشق بے خود ہو جاتا ہے۔ ابر کی محشر آزیں چال، ساون کی مدہوش گھٹائیں، شفق کی بوقلموں سحر طرازیاں اُسے پیغام سرشاری سناتی ہیں۔ گلشن میں کلیوں کی چٹک، پھولوں کی مہک، کوئل کی کوکو، بلبل کا ترانا اسے رہ رہ کر کسی کی یاد دلاتا ہے۔ بادل کی گرج اور بجلی کی چمک میں اسکے لئے فردوس گوش اور جنت نظر کے سامان مہیا رہتے ہیں—— وہ جلووں کی ضیاپاشی سے پروانہ وار کسی کے شمع حسن پر قربان ہونا چاہتا جب وہ زماں و مکان کے قیود سے آزاد—— داخلی کائنات کا جائزہ لیتا ہے تو داغہائے دل گل ہائے لالہ زار کی طرح درخشاں نظر آتے ہیں اور انکا ہر ذرہ مجسمہ سرور و زمزمہ اور مرقع خمار و کیف نظر آتا ہے۔

عاشق کی ناکامی، شاعری کا ایک اہم عنصر ہے۔ اسکی نامرادی کے چرچے ایسے مشہور ہو جاتے ہیں کہ حسن وعشق کے افسانے بھی ماند پڑ جاتے ہیں۔ جفا محبوب کا مقبول حربہ ہے۔ جو اوس سے وفا کرتا ہے وہ اوس غریب سے ہمیشہ ترش روئی، تلون اور اغماض سے کام لیتا ہے۔ اپنے چاہنے والوں سے نہ صرف بدمزاجی سے پیش آتا ہے بلکہ اسکا دل جلانیکے لئے رقیب روسیاہ کے ساتھ محبت، مروت اور دوستی سے ملتا ہے۔ فراق کے اضطراب اور کسک کو کس شاعر نے بیان نہیں کیا مگر جس ندرت سے وفا ہجر کے اضطراب کو بیان کرتے ہیں اُسے ایک عجیب لطف حاصل ہوتا ہے۔ وفا ہجر، ناکامی، رقابت اور اسی قبیل کے تاثرات کو نئے نئے لباس میں اور انتہائی شگفتہ انداز میں اسطرح پیش کرتے ہیں :-

پامال کر دیا تیری رفتار شوخ نے — یوں ٹھوکروں سے دلکو نہ ظالم کچل کے چل
تم اور ترک جفا یہ خیال بھی نہ کرو — گذر ہی جائینگے ہر حال میں ہمارے دن

شب فراق میں یوں دل ہے مضطرب میرا — فلک پہ برق کو جسطرح اضطراب رہے

گرفتاران الفت کی عجب حالت ہے فرقت میں — کبھی آہیں کبھی نالے کبھی فریاد کرتے ہیں

کون سُنتا ہے شبِ ہجر کہانی میری — کوئی مونس ہے نہ ہمراز نہ ہمدم پیدا

کچھ اس ڈھب سے شہیدان محبت کے علم نکلے — تماشائی بھی گھر سے نوحہ گر با چشم نم نکلے

کب الجھ سکتے ہیں اب سلسلۂ دہر میں ہم — دل لگا بیٹھے ہیں جب زلف گرہگیر کے ساتھ

چالیں یہ سب رقیب کی ہیں ورنہ کیا سبب — تیری نگاہ لطف میرے حال پر نہو

وفاؔ کی پیدایش اس زمانہ میں ہوئی تھی جبکہ محسنات معنوی و لفظی کی کلام میں بھرمار تھی۔ ہر شاعر و ناشاعر انکو آزادی سے استعمال کرتا تھا۔ کلام کی خوبی زیادہ تر لفظی الٹ پھیر، ترکیب و ترتیب میں سمجھی جاتی تھی۔ مگر جس زمانہ میں وفاؔ کی ادبی نشو نما ہو رہی تھی شاعرانہ رجحانات سادگی کی طرف مائل ہو رہے تھے۔ اہل ذوق صنعتوں کی افراط سے کسی قدر برداشتہ خاطر ہوگئے تھے اور فطری شاعری کی طرف توجہ کر رہے تھے۔ بناوٹ، تصنع، مشکل پسندی سے احتراز کیا جانے لگا۔ مگر دبستان قدیم کے اساتذہ کا ذوق تغزل ارادی یا غیر ارادی طور پر پرانی ڈگر پر قایم تھا۔ لیکن جنھوں نے نئے دور میں سانس لی، پھولے اور پھلے وہ ماضی کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے، حال کو سمجھنے کی کوشش کر رہے تھے اور مستقبل کی تاریکی میں امید و بیم کی کرنوں کے متلاشی تھے۔

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ استعارہ، کنایہ، تشبیہ وغیرہ کا مناسب استعمال شعر کی خارجی خوبیوں میں اضافہ کرتا ہے۔ جب دقیق مطالب، غامض مسائل اور باریک نکات پیچیدگی پیدا کرتے ہیں تو شاعر ان ہی سے مدد لیکر الجھی ہوئی گتھیوں کو سلجھاتا ہے جس سے نہ صرف ادائے مطالب میں غیر معمولی سہولت پیدا ہوتی ہے بلکہ شعر میں برجستگی و لطافت بھی پیدا ہوتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قصیدہ اور مثنوی میں انکا استعمال زیادہ ہوتا ہے، اور غزل میں کمتر۔

بعض شعرا کے کلام میں سادگی کی بجائے تصنع، روانی یا بے ساختگی کی بجائے بناوٹ، سلاست کی بجائے آرائشگی ملحوظ خاطر رہتی ہے۔ پھر معنی سے معنی آفرینی کافی گنجلک پیدا کرتی ہے۔ لیکن وفاؔ کا کلام چند مستثنیات سے ہے اور شاید اسی لئے زیادہ دلکش اور جاذب نظر ہے۔ انکے کلام کی بڑی خوبی زبان کی صفائی اور بیان کی سلاست ہے

وہ حتیٰ الامکان مناسب الفاظ سے شعر میں موسیقیت پیدا کرتے ہیں۔ انکا کلام بڑی حد تک صنایع بدایع سے پاک ہے اور معنوی خوبیوں کے ساتھ عاشقانہ رنگ میں شرابور۔

ہماری شاعری پر ردو قدح اور نکتہ چینی بڑی حد تک اس وجہ سے ہوتی ہے کہ اسمیں سوائے تقلید کے کچھ نہیں۔ وہ خیالات جو زمانہ گذشتہ کے شعرا باندھ چکے ہیں ——— معشوق کی بے وفائی —— عاشق کا پاس وفا ——— رقیب کی رقابت وغیرہ بلاکم وکاست ابتک جاری ہیں لیکن اہل ذوق اس امر سے واقف ہیں کہ حقیقی شعرا نے ان ہی خیالات کو اسطرح بیان کیا ہے کہ انمیں ندرت، جدت، اور انتہائی دلچسپی پیدا ہوگئی ہے۔ جسطرح صانع قدرت کے مظاہرات فطرت میں سے کسی دو میں خواہ وہ ایک ہی طبقہ، جنس یا خاندان سے تعلق رکھتے ہوں تطابق نظر نہیں آتا ——— اسی طرح شاعر کا تخیل بھی بعض نئے کرشمے اسطرح دکھاتا ہے کہ انمیں بہت کم تعلق نظر آتا ہے ——— مگر ایک بلند پایہ شاعر کا تصور ایسی چیزیں پیش کرتا ہے جو نہ پہلے تھیں اور نہ اب ہیں۔ چنانچہ وفاؔ کے حسب ذیل اشعار سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے :—

تم سلامت رہو او جان کے لینے والے ہم بھلا موت کے شرمندۂ احسان ہونگے

جدت خرام ناز میں اے یار تا کجا رکھ چھوڑ کوئی چال قیامت کے واسطے

صحرائے قیس دیکھ کے دل نے مرے کہا کافی نہیں جگہ میری وحشت کے واسطے

نجد میں پھرتا رہا مجنوں بقدر حوصلہ میرے دیوانے کو اک عالم بیاباں چاہئے

حیدرآبادی نغموں میں وفاؔ کا قابل لحاظ حصہ ہے۔ انکی بعض غزلیں زبان زد خاص و عام ہیں گر بہت کم لوگ اس سے واقف ہیں کہ یہ وفاؔ کے فکر سخن کا نتیجہ ہیں۔ دکن کی گلی کوچوں، محلسراوں اور محفلوں سے کبھی کبھی انکی صدائے بازگشت اب بھی سنائی دیگی۔ انمیں سے صرف دو نمونتاً یہاں درج کئے جاتے ہیں :—

وہ ستم ترا وہ میری وفا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
گلے شکوے ہوتے تھے پر ملا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو
کبھی ہم سے نامہ پیام تھا کبھی ذکر غیر حرام تھا
یہ ابھی ابھی کا ہے ماجرا تمہیں یاد ہو کہ نہ یاد ہو

غریق بحر محبت کا سن لے افسانہ
ہمیشہ زیست کی کشتی رواں رہے نہ رہے
شباب ہو گیا رخصت ہے آمد پیری
سحر کو دیکھئے یہ کارواں رہے نہ رہے

ہندوستان کی قومی تحریکات میں ادباء و شعرا کا کافی حصہ رہا ہے۔ غدر کے بعد سرسید "آزاد" حالی، شبلی واکبر کی کاوشوں نے ہندوستانی قومیت کے جسد خاکی میں برقی لہر دوڑادی۔ زمانہ حال کے شعرا اور نثر نگاروں میں حسن نظامی، ابوالکلام آزاد، سلیمان ندوی، ڈاکٹر اقبال، جوش ملیح آبادی اور حفیظ جالندھری اپنی ملی اور قومی جد و جہد کے باعث مشہور نام ہیں۔

وفا کی پرورش دکن کے ایسے خاندان میں ہوئی تھی جو قومی اور مذہبی روایات کے اعتبار سے نہایت راسخ العقیدہ تھا۔ وہ خود بھی اپنے سینہ میں درد مند دل رکھتے تھے۔ پھر مولوی عبدالقادر اور زمان خان کی صحبتوں نے سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ اسی وجہ سے وہ کہیں خود غرض رہبران ملت پر برس پڑتے ہیں۔ کہیں ننگ قومی کا پاس دلاتے ہیں تو کہیں یورپ زدگی اور فیشن پرستی کی دھجیاں اڑاتے ہیں۔ قومی اور مذہبی تحریکات اور معاشرتی جلسوں سے انہیں خاص دلچسپی تھی۔ وہ نہایت خلیق اور ملنسار تھے۔ اخبار بینی کا بے حد ذوق تھا۔ روزنامچہ پابندی سے لکھنے کی عادت تھی۔ حلقۂ احباب گو محدود تھا لیکن ذی اثر و پرخلوص۔ اس سلسلہ میں لیاقت جنگ، نواب ماہر جنگ، نواب وزیر جنگ، نواب حامد یار جنگ، خسرو جنگ، نواب ممتاز یار الدولہ، محسن بن سعید، علی بن حسین اور محمد بن عیسے کے نام قابل ذکر ہیں۔

وفا کی والدہ کے قبل از وقت انتقال (۲۵ھ) نے انکی نوجوان مسرتوں پر پانی پھیر دیا۔ چند سال بعد والد کی وفات نے زندگی کے ایک پریشان کن باب کا آغاز کیا۔ اب وراثت کے جھگڑوں نے وہ سر اٹھایا کہ ۱۹ خورداد ۱۳۲۸ف کو ذریعہ فرمان خسروی شاہی کمیشن کا حکم صادر ہوا تاکہ تنازعات کی تحقیق اور وراثتی مسائل کی تدقیق کرے۔ مقدمہ بازی کی بھول بھلیوں کا ایک عبرت ناک اور افسوس ناک پہلو ہے کہ آج

وفاؔ کے انتقال کے ۱۴ سال بعد بھی اس امر کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ کون لوگ جمعداری اور جاگیرات کے مستحق ہیں۔ ان ہی پریشانیوں کے متعلق وفاؔ لکھتے ہیں کہ " ۱۹۱۹ء میں میرے لئے بہت سی عبرتیں۔ بہت سی مصیبتیں تھیں۔ جو اس جانے والے سال کی طرح سب فنا ہو گئیں۔ اب صرف انکا احساس باقی رہگیا ہے۔ اس سال کا نصف میرے لئے تو بہت ہی نامبارک اور منحوس ثابت ہوا۔ حضرت والد مرحوم کی وفات حسرت آیات کا ناقابل برداشت صدمہ مجھے زندہ درگور کر گیا اور اس سال مجھے ایسی تکلیفیں پہونچیں جنکی تلافی قیامت تک نہیں ہو سکتی۔ الٰہی تو اپنے فضل سے آنے والی گھڑیوں اور آنے والے سال کو میرے اور میری اولاد کیلئے سبب کامرانی اور وجھہ شادمانی بنا"۔

والد کا سایہ عاطفت سر سے اُٹھنے کے بعد وفاؔ بالکل آزاد تھے۔ آزادی کا نشہ اتنا ہی خطرناک ہو سکتا ہے جتنا کہ مفید ——— مگر خصوصاً ایک نوجوان شاعر کے لئے انتہائی دلکش اور بے باک!

شباب، شعر اور شراب کے امتزاج نے وفاؔ کو وہ بنا دیا جنکی کسی کو توقع نہ تھی ——— اور شاید یہ نہوتے تو حافظ کا دیوان اور خیام کی رباعیات بھی نہ ہوتیں۔ ساغر و مینا کے متعلق خود وفاؔ کی زبان سے خمریات کا لطف دوبالا ہوتا ہے:———

اب تو دے مئے کی اجازت اے شیخ — دیکھ رحمت کی گھٹا چھائی ہے

———

خدا وہ دن بھی دکھائے کہ اے فصل بہار — بساط عیش ہو ساقی رہے شراب رہے

———

اُمنگیں جوش زن ہیں جلد بھر دے جام و پیمانہ — رہے آباد ساقی حشر تک یہ تیرا میخانہ

———

بہار آئی ہے جلسے ہو رہے ہیں بادہ خواروں میں — کرم ساقی کا ہو مدت سے ہوں اُمیدواروں میں

وفاؔ کی طبیعت کی افتاد کچھ ایسی واقع ہوئی تھی کہ وہ جلد سنبھل گئے۔ ماحول کی پابندیاں، والد مرحوم کی دیرینہ تربیت اور ذاتی جوہر نے آخر غلبہ پایا۔ جب نشہ ہرن ہوئے تو اُنہوں نے دیکھا کہ زمانہ کئی کروٹیں بدل چکا

بعض خود غرض احباب کی جھوٹی محبت کے دعوے، وراثت کے جھگڑے اور معاشی مشکلات نے انکی آنکھیں کھول دیں۔ اب انکے لئے سوائے اسکے کچھ نہ تھا کہ مبدائے فیض کی طرف خشوع وخضوع کے ساتھ رجوع ہوں۔ یہاں انہیں وہ اطمینان حاصل ہوا اور ایسی آسودگی نصیب ہوئی کہ دنیا کی نعمتیں اور لذائذ ہیچ نظر آنے لگے۔ سرکار مدینہ کی یاد، بیابان مدینہ میں آبلہ پائی کی خواہش، روضۂ نبوی پر پروانہ وار قربان ہونے کی حسرت ——— یہ وہ جذبات تھے جو وفاؔ کے دل میں موجزن تھے۔ مداحیہ اور نعتیہ اشعار و قصائد کی فراوانی ہونے لگی۔ افسوس کہ زمانہ نے وفا نہ کی۔ آخر دم تک انہوں نے اپنی حرمان نصیبی کو سکون نما اضطراب میں چھپائے رکھا۔ مگر مقدس تمناوں کے یہ شاعرانہ مرقع ادبیات کا سرمایہ بنے رہیں گے۔ ———

اک عمر سے یارب ہوں میں بیمار مدینہ — اب جلد دکھا دے مجھے گلزار مدینہ
جاونگا سر و چشم سے جب یاد کرینگے — آقا مرے مولیٰ مرے سرکار مدینہ
دم بھر میں گداؤں کو بنا دیتے ہیں سلطان — سلطانوں کے سلطان ہے سلطان مدینہ
یہ سیر بھی آنکھوں سے دکھا دو مرے مولیٰ — ہو صبح وطن شام غریبان مدینہ
ہر دم ہو مری آبلہ پائی کی تراوش — سیراب رہیں خار بیابان مدینہ

نبی کے جلوۂ عارض کی ہو یوں جلوہ فرمائی — مری بزم تصور ہو مرا دل شمع محفل ہو

منور کیوں نہ ہو جلوے سے تیرے اپنا غمخانہ — برنگ شمع روشن دل میں ہے داغ الم تیرا
ترے گھر کے ہزاروں نام ہیں اور تو مکین تنہا — کلیسہ، صومعہ، بیت الحرم، بیت الصنم تیرا
نہیں ہے انتہا دونوں کی دونوں حد سے بیحد ہیں — گنہ میرے تری بخشش مرے عصیان کرم تیرا

زندگی کے تلخ حقایق، بڑھتی ہوئی خوش اعتقادی، پاکیزہ مذاق نے وفاؔ کے کلام میں سوز و گداز، مستانہ و رندانہ پن اور صوفیانہ رنگ بخشا۔ وہ اس عالم آب و گل کی ہر ایک شئے کو اب باطن کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ انکی نظر چیزوں کی سطح پر نہیں بلکہ انکی اندرونی ماہیت پر پڑتی ہے۔ وفاؔ شوق وصال کی تکمیل کی

خاطر روح کو بدن کو خیرباد کرنے کا پیغام دیتے ہیں اور اس غیر فانی مسرت سے لطف اندوز ہونے کیلئے وہ ایسے سکوت کے طالب ہیں جسپر شور و غوغا نثار! زندگی کے مسحورکن خواب سے بیدار ہونے اور عمر رواں کا زاد راہ مہیا کرنیکی وہ لوگوں کو پُر درد الفاظ میں تلقین کرتے ہیں۔ کلی کے نور، گل کے خمار، غنچہ کے سکوت اور مصنوعات فطرت کے نقش و نگار میں انہیں ایک بہار و کیف، سرور و زمزمہ، سرشاری و تجلی محسوس ہوتی ہے۔ صنمکدہ، مے خانہ، خانقاہ، مندر و مسجد انکے لئے ایک ہیں ——— فنا و بقا کی پابندیاں ——— ہستی و نیستی کی تفریق ——— مضحکہ خیز!! فرماتے ہیں:—

شوق وصال کا یہ تقاضہ ہے بار بار
اے روح کیا بدن میں پڑی ہے بدنکو چھوڑ

خواب غفلت سے اٹھا سر چھوڑ دے طول عمل
کوچ کا سامان کر عمر رواں کچھ بھی نہیں

صنمکدیکے جو جلوے مری نگاہ میں ہیں
نہ وہ حرم میں ہیں زاہد نہ خانقاہ میں ہیں

اک خدائی کا تماشہ نظر آیا اسمیں
سیر جو وادئ دل میں ہے گلستاں میں نہیں

مرنیکے بعد نام و نشان سے مفاد کیا
روح مزار کیا ہے نشان مزار ہیچ

افسوس کہ وفا کی عمر نے وفا نہ کی۔ صرف ۳۵ سال کا سن تھا کہ ۱۳۳۲ف میں یہ ہونہار شاعر دو لڑکیاں اور ایک لڑکا چھوڑ کر ہمیشہ کیلئے خاموش ہوگیا۔

محمد بن عمر بی۔ اے (عثمانیہ)

مۓ عرفاں

حریمِ عقل میں ملتی نہیں صہبائے بیداری
شرابِ بیخودی پی لے ہے اگر جویائے بیداری

یہ فردوسِ تخیل جس سے دل بہلا رہا ہے تو
سرابِ آرزو ہی دیکھ دھوکا کھا رہا ہے تو

جنھیں تو بے خبر سمجھا ہے سرشارِ محبت ہیں
یہ دیوانے نہیں ہیں محرمِ رازِ حقیقت ہیں

فریبِ حسن بینش ہی جسے تو ہوش سمجھا ہے
تری نامحرمی نے نیش کو بھی نوش سمجھا ہے

اُٹھ اور اوہام کے پردوں کو ناداں چاک کرتا جا
یہ داغِ نارسی ہیں ان سے دل کو پاک کرتا جا

یہ نادانی کہاں تک اکتسابِ معرفت کرلے
بہت تھوڑی ہے تیری عمر فکرِ عاقبت کرلے

پیامِ بیخودی ہر ذرہ دنیا کو سناتا ہے
نگاہوں کو ہجومِ رنگ و بو بیخود بناتا ہے

رہیگا یہ غم و اندیشۂ سود و زیاں کب تک ؟ تجھے ملنا ہی اک دن خاک میں یہ حفظِ جاں کبتک ؟

غلط یہ آسماں سے شکوۂ بیداد ہے ناداں !

تو اپنی نارسی کی زد میں خود برباد ہے ناداں !!

متاعِ عمرِ فانی، گنجِ حکمت سے نہیں بڑھکر جنونِ شوق ہے حسن خرد سے بھی کہیں بڑھکر

مقامِ شوق میں انسان خود کو بھول جاتا ہی جب آنکھیں بند ہوتی ہیں یہاں تب ہوش آتا ہی

جو مستِ ہوش ہیں وہ لوگ مدہوشی کو کیا سمجھیں ؟ خودی میں جو مگن ہیں خود فراموشی کو کیا سمجھیں ؟

شرابِ بے خودی کے جام پی کیسے غم و حرماں

وہ زندہ ہے جو ہی نا آشنائے تلخیٔ دوراں

خواجہ معین الدین جمیل (عثمانیہ)

متعلم سال دوم

سہ ماہی رپورٹ کارگذاری انجمن اتحاد
۹ ستمبر تا ۹ دسمبر ۳۸ء

انجمن اتحاد طلبا، جامعہ عثمانیہ کا جائزہ ۹ ستمبر ۳۸ء مطابق ۴ آبان ۱۳۴۶ف کو حاصل کیا گیا۔ جائزہ سے اس وقت تک یعنی تقریباً تین ماہ کے دوران میں انجمن اتحاد کی جو کچھ مصروفیات رہیں اس کا مختصر سا خاکہ ذیل میں پیش کیا گیا ہے۔

ہماری کابینہ کا سب سے اہم نصب العین طلبا، برادری کو انجمن سے قریب سے قریب تر کر دینا تھا۔ اس سلسلے میں ہماری کوشش برابر جاری ہے اور طلبا کی اکثریت انجمن اتحاد سے گہری دلچسپی کا ثبوت دے رہی ہے۔ اس قلیل عرصہ میں ہم نے باقاعدہ انجمن اتحاد کے تقریری جلسے منعقد کرنے کی کوشش کی چند ہی ہفتے تعطیلات کے باعث ایسے گذرے جن میں مباحثے منعقد نہ ہو سکے۔ اس وقت تک ۵ معمولی اور ۵ غیر معمولی جلسے ہو چکے ہیں۔ غیر معمولی جلسوں میں بابا صاحب کا پڑوے سابق وزیر تعلیمات صوبہ متوسط و برار اور مسٹر ڈیوس سالٹر رکن وفد نیو ایجوکیشن فیلوشپ کی تقاریر بھی شامل ہیں۔ انجمن کے معمولی و غیر معمولی تقاریری جلسوں کے علاوہ دو کار درباری اور ایک تعزیتی جلسہ بھی انجمن کی طرف سے اس عرصہ میں منعقد کیا گیا۔ اس طرح اب تک انجمن کے جملہ عام جلسوں کی تعداد ۱۳ ہوتی ہے۔ ہمیں اس امر کا اظہار کرتے ہوئے خوشی ہوتی ہے کہ ہماری برادری نے انجمن کی مصروفیات

اور سرگرمی میں کافی دلچسپی کا ثبوت دیا اور جلسوں میں کثیر تعداد میں شریک ہوکر ان کو کامیاب بنانے کی کوشش کرتے رہے ہماری کابینہ کی دوسری کامیاب سعی محترم اساتذہ اور طلباء جامعہ کے تعلقات میں ہم آہنگی اور یگانگت پیدا کرنے کی رہی۔ اس سلسلہ میں ہم اپنے محترم اساتذہ بالخصوص ڈاکٹر اوزاقبال صاحب قریشی ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم صاحب مولوی صلاح الدین صاحب مولوی ہارون خانصاحب شروانی۔ ڈاکٹر مظفر الدین صاحب قریشی اور ڈاکٹر حمید اللہ صاحب کے شکر گذار ہیں کہ ان حضرات نے اپنی مصروفیات کے با وجود ہماری اس تمنا کو عملی جامہ پہنانے میں بڑی مدد فرمائی۔

یہ سال سالہائے گذشتہ کے مقابلہ میں اس وجہ سے ممتاز خیال کیا جاسکتا ہے کہ ہمارے پروفیسر حضرات نے تین ماہ کے قلیل عرصہ ہی میں کئی مرتبہ انجمن اتحاد کے پلیٹ فارم پر تشریف لانے کی زحمت گوارا فرمائی۔ اور سال کے بقیہ پروگرام میں آئندہ بھی ایسے کثیر مواقع کا امکان ہے کہ ہمیں قابل اساتذہ کا تعاون انجمن کے معاملات میں حاصل رہے گا۔ جامعہ کے طلباء قدیم و طلباء حال کے خوشگوار تعلقات کی اہمیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے۔ اس علمی برادری میں خلوص بڑھانے کی مختلف تدبیریں ہماری کابینہ کے زیر غور ہیں۔ ان میں سے ایک ایسے مخلوط مباحثہ کی اسکیم بھی ہے جس میں جامعہ کے قدیم طلبہ حصہ لیں گے اس کے علاوہ یوم جامعہ کے سلسلہ میں اس سال بعض ایسی مصروفیات کا اضافہ بھی زیر غور تھا جو اس قدیم برادری کو کہ بظاہر جامعہ سے علحدہ ہو جاتی ہے لیکن اصل معنوں میں کبھی بھی علحدہ نہیں ہوسکتی۔ مادر جامعہ کے آغوش سے قریب سے قریب تر کردیا جائے۔

انجمن کے تقریری جلسوں کا نظام نامہ شایع ہوچکا ہے۔ اور اس کی سختی کے ساتھ پابندی کی جارہی ہے۔

مباحثی جماعتیں

اس سال نظام کالج کے جشن طلائی کے موقع پر اردو انگریزی مقابلے منعقد کئے گئے تھے ہماری مباحثی جماعتوں نے بھی ان میں شرکت کی اور اردو تقریری مقابلہ میں اول آنے کے صلہ میں سالار جنگ رولنگ کپ کے مستحق قرار دی گئی۔ اس کے علاوہ اردو مباحثی جماعتوں نے جناب احمد خانصاحب سال سوم جناب ابو الحسن خانصاحب سال سوم۔ محمد عمر صاحب مہاجر سال چہارم اور انگریزی میں جناب پدمنابھ چاری متعلم ایم۔ اے انفرادی انعامات کے مستحق قرار پائے۔

کھیل

ان مصروفیات اور امتیازی کاموں کے ساتھ ساتھ اندرون خانہ کئی قسم کے کھیلوں کا حسب سابق معقول انتظام کیا گیا تھا تعلیمی مصروفیت اور دماغی محنت کے بعد برادران جامعہ جب انجمن تشریف لاتے ہیں تو ان کے لئے سب سے زیادہ مفرح جگہ کھیل کے کمرے ہوتے ہیں۔ طلبا کی ایک بہت ہی کثیر تعداد انجمن کے کھیل سے مستفید ہورہی ہے۔

اس وقت انجمن میں پنگ پانگ، رنگ، بلیرڈ، شطرنج، ڈرافٹس اور اسی قسم کے بعض دلچسپ کھیلوں کا باقاعدہ انتظام ہے

انجمن کا کتب خانہ

بہ نسبت سالہائے سابق انجمن کے کتب خانے نے بھی اس سال اعلیٰ کارکردگی کا ایک نہایت ہی نظر افروز نمونہ پیش کیا ہے۔ اب تک ۸۴ کتب حصہ انگریزی اور ۱۲۵ کتب حصۂ اردو میں اضافہ کی جا چکی ہیں، اور تقریباً اس سے دگنی کتب خرید کر اضافہ کی جانے والی ہیں۔ کتب خانہ سے تقریباً ۳۰۰ برادران جامعہ مستفید ہو رہے ہیں۔ دار المطالعہ میں آنے والے روزانہ اخبارات و رسائل کی فہرست حسب ذیل ہے۔

اردو اخبارات و رسائل:- رہبر دکن، پیام، مدینہ، جامعہ، نگار، ہمایوں، کلیم، شاہکار

انگریزی اخبارات و رسائل:- ہندو، بمبئی کرانیکل، ورلڈ ریویو، اسپکٹیٹر، پنچ، جان او لندن، انڈین اکانومسٹ، انڈین ریویو، اسٹیٹس مین، نیشن، نائنٹینتھ سنچوری، دی مانچسٹر گارڈین۔

انجمن کی عمارت

ہم اپنے نائب معین امیر جامعہ قاضی محمد حسین صاحب کے ممنون ہیں کہ انھوں نے انجمن کی موجودہ جگہ کو بالکل ناکافی محسوس فرماتے ہوئے قدیم کمروں کے متصل مزید دو کمروں کا انتظام فرما کر انجمن سے اپنی عملی دلچسپی کا ثبوت بہم پہونچایا۔ ہم اپنے محبوب نائب معین امیر کا دلی شکریہ ادا کرتے ہیں۔ کہ ان کے دو کمروں سے انجمن کی مشکلات میں بہت کچھ کمی ہوگئی کیا عجب کہ ہمارے محترم سرپرست کی مزید توجہ سے انجمن کی یہ شکایت بالکل رفع ہو جائے۔

ملازمین انجمن

اس سال انجمن کے ملازموں میں ایک چپراسی اور ایک اہلکار کا اضافہ کیا گیا۔ مدت سے کتب خانے کے لئے ایک علحدہ چپراسی کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی اس کے علاوہ ایک ہمہ وقتی کلرک کی موجودگی دفتر کی تنظیم کے لئے ناگزیر تھی۔ ان دونوں نئے ملازمین کی تنخواہ بھی انجمن کے بجٹ سے دی جاتی ہے۔

مجلس انتظامی

مجلس انتظامی اس دوران میں پوری پوری تیزی سے مصروف عمل رہی چنانچہ اس وقت تک ۱۲ انتظامی جلسے ہو چکے ہیں۔

بجٹ

اس وقت تک انجمن کے بجٹ سے مفصلہ ذیل رقوم متذکرہ مدات سے خرچ ہوئی ہیں۔

(۱) انتظام دفتر سے خرچ ۔۔۔۔۔۔ ما ۱۱ر

(۲) صادر و طباعت ۔۔۔۔۔۔ ۵ر۶ ۴

(۳) کتب خانہ ۔۔۔۔۔۔ ۱۰ر ۱۲ ۴

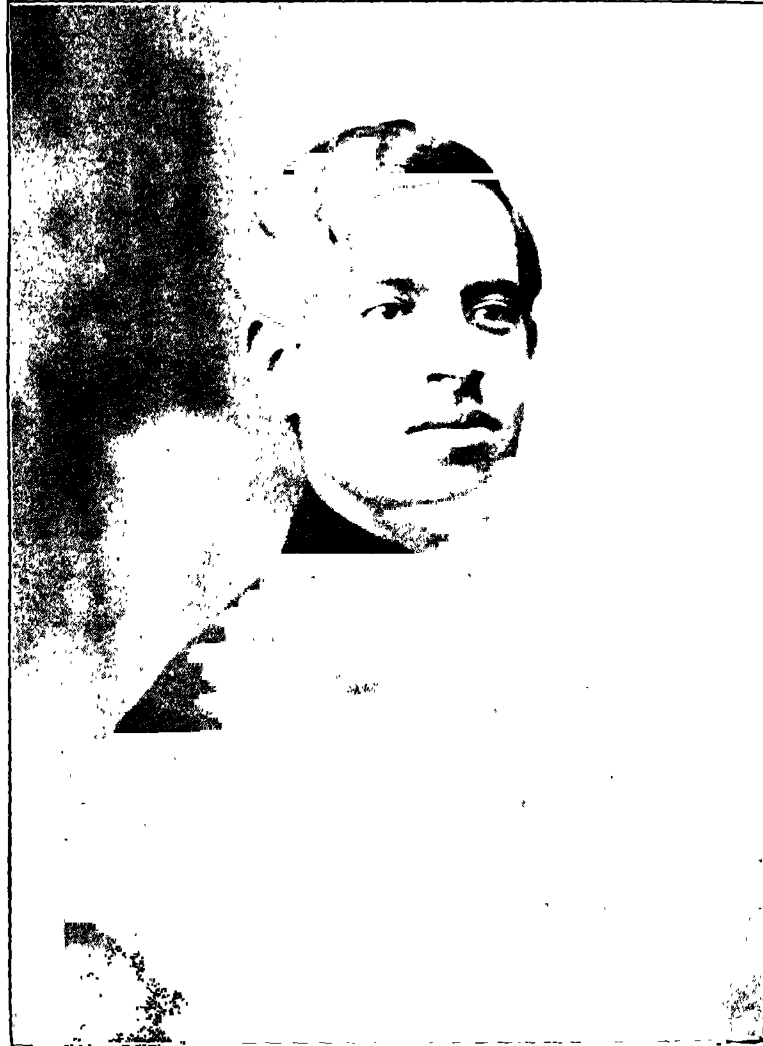
(۴) کمیل . . . . ۲ ر

(۵) متفرقات . . . . ۲ ر ۱۰ پ

جملہ خرچ تین ماہ کا . . . . ۱۰ ر

شکریہ آخر میں میں تمام اراکین کابینہ۔ صدر انجمن۔ مولوی وحید الرحمن صاحب خازن اعزازی ونائب معین امیسہ کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ ان کی دلچسپی کی وجہ سے انجمن نہایت گرمجوشی کے ساتھ مصروف عمل رہی۔ مجھے پورا پورا وثوق ہے کہ آئندہ بھی ان تمام حضرات کی ہمدردیاں انجمن کے ساتھ ہوں گی میں مولوی محمد بن عمر عطا صدر انجمن کا خاص طور پر ممنون ہوں۔ اگر صاحب موصوف کی عملی دلچسپی میری معاون نہ ہوتی تو میں اس رپورٹ کے پیش کرنے کے قابل نہ ہوتا۔

ابو الخیر صدیقی معتمد انجمن



Mr. M. Y. SALEEM, B. A. (Osman.)

Managing Editor and Editor of Urdu Section.

scientific learning that has ever appeared in India. It is a great honour for any institution or government to entertain forty-two Fellows of the Royal Society on one day. We were also greatly privileged to hear Sir Arthur Eddington and Sir James Jeans. The other events, a little dimmed perhaps by the splendour of the first, were the All-India Economic Congress and the Road Congress. The former was especially of interest to the University and it is with satisfaction that we record that Hyderabad economists played a great part in the discussions.

College News.

The present year has been one of great importance in the history of the University. Our degrees have been recognised by three English Universities, Oxford, Cambridge and London. This should be a source of satisfaction to all members of the University and we shall be interested to see whether it has any influence on the attitude of other Indian universities.

We offer our hearty congratulations to Moulvi Abdul Haq and Mrs. Sarojini Naidu upon whom Allahabad University conferred its honorary degree of LL. D. during its jubilee celebrations. We are particularly gratified at this recognition of Moulvi Abdul Haq's services to Urdu scholarship. We have just learnt that Dr. Raziuddin Siddiqi had been awarded the Education Minister's Gold Medal for the best paper contributed to the journal of Academic Science, Allahabad, during this year. We hasten to offer our congratulations.

At its last convocation the University conferred honorary doctorates upon four eminent persons Maharajah Sir Kishen Pershad, Sir Tej Bahadur Sapru, Sir Mohammed Iqbal and Dr. Rabindranath Tagore. In honouring them, the University honoured itself.

This year has been almost unique in the number of opportunities it has given us of meeting distinguished personalities from outside the State. The visit to Hyderabad of the delegation of the British Association to the All India Science Congress brought into our midst the greatest body of

I may illustrate this truth in this way; two persons fall in love with each other and each imagines, nay more than imagines, feels deeply to the inmost core of his or her being that other would remain for ever and ever the same attractive, charming and obliging person—a beauty that will be a joy for ever. Of course all married people know that this is not in reality the case, that change overtakes sooner or later, generally much sooner than imagined, and not always for the better. And yet at the time of falling in love, this idea of possible change, though intellectually it may be perceived as a fact or rather a possibility, is not and cannot be felt as a reality, but the feeling and the entire soul's reaction ***at the time*** and for the time being proceeds on the the basis of eternal youth and eternal beauty. Waves echo the ocean; moments reflect eternity.

It has been well said that man proceeds to acquire wealth as though he will never know old age and death. This Illusion of Eternity, granting that it is not an objective fact, is a very powerful and abiding factor in our life. I wonder if it is an intimation of immortality, akin to those famous and profound intimations, of which Wordsworth sang in one of the sublimest of English Odes and in the moving little piece so touching in its pathos and simplicity "We are Seven". It seems to me that here is a positive approach based on felt experience, felt not merely by isolated individuals but by widest commonalty, to ideas of God and Immortality. The cultivation of this sense of God and Immortality is the highest inspiration that human nature is capable of and the firmest support in all its trials and tribulations. May this sense be an abiding and growing regulation of your lives, and may you all conduct yourselves and act as Immortals in the hands of the almighty.

C. R. Reddy;
Hon. D. Litt., M.L.C.

and new situations are adequately faced. Enthusiasm which cannot survive the impact of facts and the test of realities is mere froth which betrays shallowness of the soul. You must have heard of the strike fever, which seems to have seized some of the students in British India. I trust guidance by teachers and parents will not suffer impairment in this Dominion as it has to some extent in the provinces outside. A sense of modesty is more often a truer sign of profundity than assertiveness and dogmatism. Socrates was called wise, because he claimed that he was only a lover of wisdom and not its possessor like the Sophists. Owing to this very modest manner in which he rated his own deep knowledge and wisdom, he has been elevated to the throne of Philosophy. Nor like the Athenians be volatile and lovers of change for its own sake. Those who grow from within, as a result of their felt needs and experiences and struggles, change more slowly than imitators of foreign fashions and the latest developments of Europe. A love of novelties and hollow echoing of other people's latest revolutions in the economic or political field, ignoring the fact that these revolutions are the products of ***their*** history and ***their*** conditions, does not bespeak a sure aptitude for real enduring progress or its safe foundation.

The felt presence of the Eternal is the most sustaining power for righteous conduct. It is not necessary to have recourse to supernatural arguments to prove that such a felt presence is a positive fact of life.

The great Philosopher Spinoza taught us to conceive things ***Sub-species eternatatis.*** He was a Pantheist like the Adwaitees of the Hindu fold and the Sufis of Muslim. Whether this Eternal is an objective fact or not, a little reflection will show that it is an almost permanent subjective feeling, a form of perception, as the Philosopher Kant would have put it, and therefore, at any rate, a fact for us.

field where no contentions are possible and in which harmony and identity of interest so naturally prevail. How that may be achieved is a problem to be solved, but I do not despair of a solution. We must re-unite the broken threads of history and restore unity of spirit. To mention a possible instance, if in the matter of Sanskrit and Telugu publications to be brought out by the Dominion Government, the agency of the Andhra is invoked, it will be readily accepted as a duty and honour.

Graduates and students. I heartily congratulate you on the degrees you have obtained, which mark, I beleive, a high standard of real and practical knowledge, for which you ought to feel deeply devoted to the munificent patronage of His Exalted Highness. I hope going through a college and graduating will not fill you with an undue sense of self-importance. Reverence to your elders is a quality which you cannot dispense with so easily or so soon in your careers. As an English writer of great power has put it, "remember thou art a chicken just hatched with the shell still on thy head", the shell I suppose being represented by the Academic cap. Life's sterner trials are ahead of you and they cannot be faced without a serious course of apprenticeship in the school of experience and under persons of ripe wisdom. Even politics to be an useful pursuit cannot dispense with the necessity of apprenticeship. Alexander the Great is credited with the saying "for my physical life I am indebted to my father but for my spiritual to my teacher". I wonder if that sense of reverence for the teacher is as strong today as it should be and as it has been traditionally amongst us. "It is not enough that you have gone through a college" as Mr. Chapin put it. It is more to the purpose "if a college has been through you" *i.e.*, if you have acquired not merely knowledge but the disciplined faculties by which new discoveries and inventions are made

Members, rich in literary qualities and more attractive to the general reader and the regular students than translations however good can ever be. Then will Urdu reach the fruition of its potentialities as a medium of modern education, and in reaching that status enable all the sister languages of India, by example and helping hand, to reach equal heights of value and importance.

There are certain fields of modern scientific research—pure and applied - which are in my opinion possible only for the Osmania University to organize in view of the heavy finances involved. Only the generous and enlightened Government of His Exalted Highness can find the moneys required and the moral enthusiasm. For instance a laboratory for Atomic Physics. If such institutes are established the Osmania University will even now and immediately become an All-India attraction to researchers in science and applied science, the Nalanda of modern scientific culture. When we realise how discoveries in Agriculture and applied Chemistry have redounded to the fabulous prosperity of Western countries and how the field of developments in this direction is by no means exhausted and nature still calls for exploitation, the contribution that the Dominion can make to the cultural standing and the material progress of the country appears to be boundless in its magnitude.

I would like to say one word before passing on to address the graduates more directly. It is not enough that the Dominion should cast an eye of kindly favour, love and benevolence on the Andhra University. Even unions of hearts and the grace of love has to be institutionalised in marriage as otherwise it would work havoc on society. So also the present gracious contact between His Exalted Highness' Dominion and the Andhra Desa will have to be given an institutional form in the cultural field—the one

college buildings known to India and memorable triumphs of Indian architecture—are designed with Akbaresque imagination in a Hindu-Muslim style, being an original and impressive combination of the Saracenic and the Ajanta models. They are a visual demonstration of what could be achieved by a happy blend of the two civilizations.

I seem to be carrying coals to Newcastle. Yesterday at a lunch I suggested that Hyderabad should do pioneer work in another field by establishing a Domestic Science College of University grade teaching upto B. Sc., B. Sc., (Honours) and the M. Sc. standards. I was informed by Miss Pope and the Vice-Chancellor that they had already a fully drawn up scheme which has been approved by the Faculty. If this College on really uptodate lines is established, it will be a big institution, most useful and also of scientific and cultural value and the only one of its kind in India.

Ancient books deserve no less attention than ancient monuments. In 1927 I organized an expedition of Pandits for collection of Telugu manuscripts in the Dominion and within a short time they brought back over 600 Palmirah-leaf books. Whereas in the case of an ancient monument people have to go to the locality where it is situated to enjoy the sight, the books can go where the people are and their reach is larger and more facile. I am happy to be able to say that Government have already thought of this and are considering measures for organizing publications of this kind.

The Translation Bureau of the Osmania University has already developed into a general publications department. Your Pro-Vice-Chancellor is fully alive to the need of bringing out original treatises embodying the lectures delivered and the researches conducted. In a few years there will be books impregnated with the personality of the Faculty

There is one point which I have for years felt to be one of the defects of Indian administration in general. Women's progress and women's needs have not received the attention due. Their education, general as well as special, such as Domestic Sciences and Arts, the extensive organization of separate hospitals for women and children and a widespread system of Women's Technical Schools for teaching, child-welfare and hygiene, first-aid, values of foods, scientific cooking, dressmaking, laundry, music and painting; and in the higher collegiate grades of education, Sciences and application of Sciences required to make the home efficient, all these must be organised; and I would even recommend the organization of a special department for these purposes. Unless for a half century at least such a department is organized to function, the necessary motives and pressure for providing funds and promoting these measures will not be forthcoming.

In pride and fullness of heart as an Educationist I beg to congratulate the Sovereign, the Government and the Dominion on the success achieved by the Osmania University. The band of young, accomplished and enthusiastic teachers composing the different faculties are a team which the greatest Educationist in India would be proud to captain. The researches accomplished and going on and the investigations in the theoretical and applied fields of Science including Zoology, Physics, Chemistry and Civil Engineering and History augur not merely an All-India but an international future for the Osmania. To be the first to recognize an Indian language as a fit medium for University culture and to have made the University founded on that principle a centre of modern research, these are the accomplishments for which India must be eternally grateful to the Dominion.

It is a matter for profound national gratification that the grand buildings of the Osmania University—the grandest

which not merely Hyderabad but the entire country could take legitimate pride. As an Andhra, I may be permitted to rejoice specially in the fact that its location bears a Telugu name "Adhika Metta" meaning the supreme height, whilst the capital of the Dominion itself is in the Telingana; and we Andhras are proud that we are the location for all the metropolitan activities of this great Dominion.

The chief credit for the organisation of the Osmania University on lines of courageous originality belongs, if I may recall a historical fact within my personal knowledge, to my Right Hon'ble friend Sir Akbar Hydari and I trust that it won't be regarded as a sign of vanity and that most incurable of all vanities—senile vanity—if I recall how I was consulted by Mr. Hydari as he then was, frequently during the inception of the scheme and more especially in regard to making Urdu the medium of instruction, which I strongly supported. I remember the pride that Mr. Hydari took in the Translation Department which he instituted and the way he used to draw my attention to the various publications, and how I on my part felt that whatever was possible in Urdu today would be equally possible in Hindi, Telugu and every other Indian language the very next day and that therefore the Osmania University was making no local but an All-India contribution of the highest and most fundamental value to our culture. I have no doubt that this originality of outlook, breathing faith and confidence in the future of Indian languages and culture, well actuate and is actuating the various departments organized here and that research and creative activities will in consequence find memorable illustration.

The way in which this University is fostered by His Exalted Highness and the Government should be an object lesson to every person and to every Government in India.

people also, whatever their creed and mother-tongue, whether Andhras or Mahrattas or Muslims, should take a patriotic pride in the Dominion and see to it that its integrity and historic personality are maintained and promoted. I would want the people of this Dominion bound in mutual love and in common loyalty to His Exalted Highness to promote the economic prosperity and the cultural advancement of the State and to become, in finer measure than now, a voice in their own right, which will carry its message of hope to all India and evoke echoes of admiration from the world outside.

The Dominion has a great mission to fulfil in justice to its own history as well as the future of India. It is the custodian of the Moghul tradition of Hindu-Muslim Unity and their partnership in the secular field of citizenship. The greatest safeguard of a constitution is not its form, but the identity of interest between the Rulers and the Ruled and their devotion to the good of the State and its progress and strength, for a progress which does not increase the strength of the race is no progress but a disease leading to decay and degeneration. The mirror of Hyderabad must reflect the light of Akbar the Great all over India.

Already through the Archaeological Department the Dominion has done sublime service to ancient Art and Sculpture and has acquired an international status as a guardian of Indian culture.

I expect Hyderabad to be a firm promoter of University education in all its Departments. It is to me as to all Educationists a matter of the deepest gratification that the Osmania University, which has struck an independent line of its own and has added a new note of impressive grandeur to our system of University education, has been a success, in

posts in the Golconda State. One of them was Gopanna, the immortal Ramdas of Bhadrachellam fame. Even today visitors to Golconda are shown a particular room in the Fort as having been the scene of the imprisonment of Ramdas for having embezzled State moneys in order to beautify the temple at Bhadrachellam and decorate the holy images with costly jewellery. The legend has it that Rama and Lakshmana appeared before Tana Shah in the guise of the messengers of Ramdas and paid him the moneys due, and that Tana Shah, realising afterwards the Divinities in human form that had appeared before him, blessed his good fortune and praised the Almighty in ecstatic joy for the great favour shown to him - an instance of how closely Hindus and Muslims began to blend into one spiritual shape. And Tana Shah's name has passed into the large receptive catalogue of Hindu veneration.

To have become in ever increasing measure the confluence or Holy Sangam of Hindu-Muslim civilization must serve as an inspiration for greater achievements in the future and I have no doubt that the present policy of His Exalted Highness and his Government under the Rt. Hon'ble Sir Akbar Hydari is steadily and broad-mindedly marching towards that unity of the dissevered soul of India, which is our goal.

It is now, as I said before, almost exactly 30 years since I first visited Hyderabad as the guest of Mr. Hydari. Impressive as Hyderabad then was, it has beaten the most optimistic anticipations of progress by the achievement of the succeeding years. Today from every point of view, Hyderabad is in the van of substantial moral and material progress in India and may be regarded as one of its Flag-bearing States. But the increasing association of the people with the Government must be pursued steadily and the

synthesis. Pothuluri Veerabrahmam, who caught the Islamic spirit of Monotheism and its social democracy, fiercely denounced caste among the Hindus—"What caste shall I describe myself as belonging to, to these worldly men and fools? My caste is co-extensive with Universe." The Mahal at Chandragiri situated about 40 miles from my native place of Chittoor, reveals the influence of Muhammadan architecture. I am told that the corridor of Ibrahim II's tomb at Bijapur is essentially Hindu in style.

Addanki Gangadhara Kavi dedicated his ***Tapati Samvarana Upakyanam*** to Ibrahim Kutubshah of Golconda and, in his description of the Court of Ibrahim, he refers not merely to the ambassadors of the Gajapathi and Narapathi Monarchs, but to the Poets versed in the eight languages and to the Pandits who were authorities in the Vedas, Sastras and Puranas. Ibrahim becomes in Telugu ***Mulk Ibha Ram*** and he is described as being very fond of listening to the Epics and Legends of Hindu India. It is of peculiar interest to note that the first poem written in ***pure*** Telugu, without any admixture of Sanskrit or derivatives from Sanskrit, namely ***Yayati Charitra,*** is dedicated by its author Ponniganti Telganna to Amir Khan, an officer of Ibrahim Kutubshah. Malla Reddy, the famous poet and author of "***Shad Chakravorthi Charitra,***" described himself as having visited the Court of Ibrahim Mulk by invitation, and in a laudatory verse compares him to the moon at which the dogs keep braying, meaning rival poets and kings, a verse the spirit of which is more commendable than its poetry.

Akkanna and Madanna are famous names in Dakkani history. *They were the Prime Minister and Commander-in-Chief respectively of Tana Shah, the last of the Golconda Sultans. Akkanna's three nephews occupied responsible*

co-operation and fraternity. It is a racy product rooted in our soil and deriving its sustenance from that Hindu-Muslim Unity conceived and promoted by Moghul Emperors, like Akbar the Great. The history of Hyderabad is one in which Hindus and Muslims could take equal pride. Hindus have occupied very high places in the administration of the Dominion, both Civil and Military. The armies that fought for its integrity were largely composed of Hindus and more especially, if I may be permitted to say it, Andhras and Reddies. Hindu temples have received full protection and patronage and it is general knowledge that some of the Nizams paid devotion to Hindu Sanyasis as to their own holy men.

The Dominion occupies the heart of India. It is from certain points of view the heart of India, something higher than a mere geographical centre. It has evolved a new civilization, which might properly be called Dakkani civilization, and in later years His Exalted Highness' Government have spent enormous amounts for the preservation of the glorious Buddhist vestiges and sovereign triumphs of art, which are the wonder of the world,—Ajanta and Ellora, rock-out temples decorated with the most delicately drawn frescoes inside, the rock-cutting typifying the strength of giants and the engineering skill of supermen and the frescoes the infinite and delicate grace of the Divine feminine in human civilization.

In tracing the lineaments of this Dakkani civilization, symbolic of what the heart of India would have achieved had it not suffered arrest and diversion, I may be permitted to mentian the special affinities between the Muslims and the Andhras. Architecture and Art took a synthetic turn and even religion did not escape this process of this higher

Waltair, described with what enthusiasm their benevolence has been received by the Andhra public. I venture to think that this generous guardianship, grounded in the ethnical affinities binding the Dominion and the Desa, will be found to be well deserved. I have no doubt that it is based on His Exalted Highness' deep sympathy with the Andhras who form the majority of his loyal subjects. And it is only as a token of that sympathy and its expression that I have been called to be here today.

Hyderabad occupies a most important place in the cultural, the social and the political history of India more especially in relation to the Andhra people. Until the fickle fortune of history brought about the separation, the Ceded Districts and the Northern Circars were a part of this Dominion; and if they had continued to be still a part, Hyderabad would have been almost completely and at any rate in majestic predominance an Andhra State. Eeven today Telingana forms a major portion of the Dominion and the Andhras the majority of the citizens owing devoted and loyal allegiance to His Exalted Highness. The sources of the Andhra history are now within your frontiers. Warangal was the capital of Kakatiya dynasty and it was the watershed from which three streams of history have flown, the great Empire of Vijianagar, the Reddy Kingdom of Kondivedu and Rajahmundry, and the Velema States. In literary history Warangal remains immortal as the scene of the great poet Pothanna's translation of the Bhagwat Purana.

Hyderabad has justified its pride of premier position by the progress it has achieved. It is not a mere imitation of the British Raj or other Western models. It is a Swadeshi product—constitutional Khaddar if you like, woven by Indian hands, fashioned by Indian History and Indian genius, and shot with the colours and glory of Hindu-Muslim

first visited this Capital as the guest of Mr. Hydari as he then was. Having filled myself with the social and cultural delights of this Metropolis, I refilled the cup no less than four times subsequently and every visit enabled me to watch with pride and gratitude the progress that the Dominion has been continuously making. Thanks to the consideration shown by His Exalted Highness and the authorities of the University, I am enabled once again to renew the hearty friendships of old, including those which have their source in my Baroda days and which have been of peculiar and most intimate value in my life. I am thankful that in the evening of my life I have been enabled to occupy this colourful scene.

I beg to convey the cordial greetings of the Andhra University, over which I preside, to the Osmania University which bids fair to become, in a much shorter time than perhaps people anticipate, one of the great centres of learning and research in our country. I shall always treasure the memory of the warm welcome given to me on my arrival by my noble colleague Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur, the Pro-Vice-Chancellor and Members of the Osmania Faculties, who, by their cordial reception, however undeserving the particular individual might have been, have shown how alive here the traditions of academic brotherhood are and how actual the idea of a republic of letters is. An Academic fraternity, which knows no creed or community, is no negligible light in a world in which the mists still hang thick and persistent.

The Andhra University is under a deep debt of gratitude to His Exalted Highness, the greatest patron of learning inside and outside the State, and his Government for the practical interest they are taking in its welfare and prosperity. I have already in my Convocation Address at

Convocation Address

Mr. CHANCELLOR, Mr. VICE-CHANCELLOR, GRADUATES, LADIES AND GENTLEMEN:

My first duty is to tender my deep dutiful obligations to His Exalted Highness the Nizam for the gracious consideration shown to me which has enabled me to associate myself with this festival of degrees. I am specially beholden also to my Right Hon'ble friend Sir Akbar Hydari and to the Vice-Chancellor Nawab Mahdi Yar Jung Bahadur for the honour of this invitation to me which they had initiated. Before I proceed further, I would like to be permitted to offer my most respectful compliments and congratulations to Maharaja Sir Kishen Pershad, the grand seigneur of Indian Statesmanship, on the honorary degree which he has just received at the hands of the University. The Maharaja Bahadur, one of the finest embodiments of our historic culture, was a notable figure and Prime Minister as early as my Cambridge days and the span of time that has succeeded has but enhanced his fine reputation and raised him to a higher pinnacle than ever amongst the illustrious men of our country. Let me also congratulate the poets Rabindranath Tagore and Sir Mahomed Iqbal and the statesman Sir Tej Bahadur Sapru on the recognition accorded to them on this occasion of their pre-eminent standing in the country.

If I am here today, I do not flatter myself that it is due to my individual standing or merit; I am here as Andhra Vice-Chancellor. It is not that I have no personal associations with Hyderabad. It is almost exactly 30 years since I

positive programme of reconstruction with the central aim of increasing production and raising the standard of living. This cannot be done in a haphazard manner; it requires careful study and diligent enquiry into local conditions, and in this difficult task, it will be the duty and privilege of economists to give wholehearted support.

India is at a critical stage in her history. By the long operation of an unsound economic system, the resources of the country remain undeveloped, and large sections of the common people are immersed in poverty and misery. They are no longer in a state of pathetic content; under various influences there has been a popular awakening and great expectations have been roused by the introduction of provincial autonomy and the assumption of government by a party which is noted for its rugged idealism. There is a tide in the affairs of nations as well as of men. If we do not seriously tackle our economic ills at this juncture, great discontent and worse consequences may follow. But if the eleven provincial Governments and the larger States to-day make an earnest effort at rebuilding our economic system on sound lines, the popular awakening may be directed into constructive channels and this country may soon be on the way to solid economic progress. Let it be remembered that any rise in the standard of living of the masses in India will not only increase the economic welfare of a fifth of the human race but will also contribute substantially to the well-being of the world as a whole.

P. J. Thomas,
M.A., B Litt., D.Phil. (Oxon).

us. We have to rebuild our economic system without destroying the foundations. What Russia sought to do and did in a monstrous way we must do in a peaceful manner. It is for us economists to show the way. If we fail, the masses may be misled by interested propagandists.

There are no short-cuts to economic prosperity. Many people believe that India's purchasing power could be raised overnight by a slight change in the exchange ratio. Countries in desperate plight have been driven to a devaluation of their currencies as a last resort, but the consequences they reaped were not all that they desired. It is chimerical to expect that, in the peculiar rural conditions of India, a slight change in the exchange ratio would raise prices, and that even if prices rise the advantage thereof would reach the ultimate producer without hitting him and the country. In dull times it is desirable to give a push to economic activity, but this can be done more effectively and less injuriously by a carefully devised public works programme. To raise prices somehow is not our aim; recent experience shows that attempts at artificially raising prices may do more harm than good. The causes as well as the effects of changes in the pricelevel are so obscure that the greatest caution is needed in tampering with it. This must be borne in mind by people who seek to raise prices by currency manipulation.

The economic rebuilding of India to-day rests lergely with the provincial Governments and the Durbars of Indian States. They have nearly all the powers needed to remove the maladjustments which keep purchasing power and standard of living at a low ebb. They have already started on the campaign for debt relief and agrarian reform. It is expected that after removing the obstacles which now stand in the way of economic progress they will commence a

United States or New Zealand; because, in my opinion, the social, economic and political conditions of this country are not such as to call for, or facilitate the carrying out of, any such plan. Greater social solidarity, a more complete economic unification, stable political conditions and above all a more solid national character are needed if any such plan is to be put through. We have to go slowly; ours is an uphill task.

Nor can the continuance of ***laissez-faire*** in the economic sphere be justified. International liberalism is recommended as the way out of the present ***impasse*** by a neo-Liberal school of economists, but such a system cannot work until some international authority arises to locate industries and apportion markets in an equitable manner. In the meantime, we need a rgulated economy, which would eliminate the wastes and rectify the inequities inevitable under individualism. The Keynesian approach is of some practical value in solving our economic problem, but even that only shows the way to maintain full employment irrespective of the trend of the trade cycle. Ours is a different problem, and the environment is also different. We have to create employment in a land where under-employment has been normal and to give new purchasing power to classes that never had it. Economic progress has to be worked up in a land where an unjust economic system has led to stagnation. The problem is very complex, and economic theory as evolved in the West can only give us a very general guidance. Therefore we have to develop an economic synthesis of our own, and this work to-day challenges our subtlest brains.

It is true that in the field of currency and exchange considerable help can be obtained from Western theory and experience for shaping policy in India, but this plays only a minor (although necessary) part in the great task before

will also offer a steady market to the products of Western industries. It is true that the imports of ordinary consumption goods have lately fallen much, but the large increase in capital goods will greatly make up the loss. The rapid rise in recent years in the imports (*inter alia*) of machinery and mill-work—which now takes the first place—is significant and ought largely to allay the fears of Western industrialists about the consequences of Eastern industrial development. Nor is this increase temporary; for with every increase in industrial production in India, there will be a greater demand here for capital goods, both quantitatively and qualitatively. With a rise in the standard of living, there will be a great increase in the demand for high-grade consumption goods also. Thus, eastern industrialization may have beneficial repercussions on Western industry at a time when its local markets are stationary or shrinking. Some of the leading Western industrialists have realized this. Henry Ford was asked at a dinner what in his opinion was the way to a stable world recovery. He took his pencil and wrote on the table-cloth the numbers '160', '350', '400', meaning thereby the potential purchasing power of the vast populations of Russia, India and China. Had this been more fully realized, benevolent trusts like the Rockefeller and the Carnegie might have spent more money on the economic improvement of India.

10. The Prospect.

I have tried to show that the low level of economic welfare in India is due to a persistent under-production which has kept down the standard of living, and that production can only be increased along with an improvement in distribution. For this, a complete rebuilding of our economic edifice is necessary. I do not recommend a Gosplan, not even a sectional plan like that lately carried out in the

times. In 1798, Robert Malthus alarmed England by expounding the 'revolting ratios' of population and food supply, but when he was forging his theory, England was forging ahead with a technical efficiency the like of which had never been known before, and in spite of his gloomy forebodings, England came to maintain a rapidly growing population on a rising standard of comfort. India's position to-day is in many ways like that of England in the time of Malthus. Industrial production has started, but there is still much misery and a low standard of living, and many are alarmed at the growth of population. The first advances in economic development are the slowest, but once the foundations are laid, the pace will quicken. Population has lately been increasing fast, but "a growing population with growing resources represents a growing market".[10] India's greatest wealth to-day is its large population, and our duty is not to control births, but to increase the health and productive efficiency of our population and thus utilize our labour force fully, so that the mass standard of living may be raised and along with it the economic welfare of the nation.[11] When productive activity quickens, India's large population will be found to be a great asset. It is significant that the largest increases in population to-day are taking place in Russia, Japan and India. With a substantial rise in the standard of living, the rate of population increase is bound to slow down, as has lately happened in the West. Therefore those who want a smaller population in India would do well to concentrate on the all-important task of raising the standard of living.

When India's purchasing power rises, our growing population will not only be a boon to our home industry, but

10. Dr. T. E. Gregory, in Hubbard's *Eastern Industrialization and its effects on the West* p. 365.

11. See my paper 'Is India Overpopulated'? *New Review*, March and April 1936.

a balance between agriculture and industry in order that we may avoid some of the evils rampant in industrial countries. Secondly, our agriculture itself must be a balanced one. That is to say, the diversified cropping which is already a feature of our agricultural economy must be maintained intact and wherever possible there must be a balance between food-crops and other crops. In America, where crop-specialization has been pushed to extremes, a diversification of crops is now sought as a bulwark against slumps. Thirdly, there must be a balance between the different industries so far as possible. The production of an article like cotton cloth or sugar need not be concentrated in one province or area. The indiscriminate springing up of factories must not be permitted ; recent tendencies in the Indian sugar industry clearly point to the need for State regulation. The location, size and labour conditions of new factories must be prescribed carefully in the national interest. It would be disastrous to leave industry to the play of unbridled individualism. When protective tariffs are imposed, the State must see that the conditions of production and employment are such as to increase the purchasing power of the primary producers and labouring classes. Otherwise, industrial production might lead to more evil than good. In all these matters, careful co-ordination by the State is essential.

9. The Menace of Growing Population?

Considering the economic trends in the West, India's large population and its recent increase need not cause alarm to us or to other countries. After the Industrial Revolution, population increased rapidly in the West; and although not immediately, an increase in the ***per capita*** standard of living also followed. Between 1801 and 1901, the population of England and Wales rose from 8.8 millions to 32.5 millions, but production and national income increased many more

of our cotton, 53 per cent of our jute and 49 per cent of our linseed are exported, but even these cover only 7 per cent of the area, and a good deal more of these commodities will be used up at home when productive activity in this country quickens. Our position is therefore comparatively strong and it is essential that we should maintain this position intact by regulating our production mainly according to internal requirements. In the past, India set too much store on external trade, and this involved a comparative neglect of internal trade. This was disapproved by economists like Ranade in the last century, but the lure of overseas markets was too powerful to resist. Now that this demand is slowing down, it is time we reshape our whole commercial policy. No doubt external trade must still be our anxious concern, but our productive energy must in future be directed more with reference to internal needs and requirements. Absolute self-sufficiency is not a suitable goal for any nation, not even for a subcontinent like India with all her varied resources. We have to pay our dues abroad by means of our export trade, and even if these diminish, we shall need various goods from outside and we must exchange them for the produce of our labour. The present reckless drive for self-sufficiency will not only weaken world economy but may undermine the foundations of civilized economic life.

India must aviod both the extremes. In other words, we must have a co-ordinated economic system within the country so that we may not be hit when foreign trade fails. Firstly, there must be a balance between industrial and agricultural production. The extreme dependence on agriculture must cease and a larger proportion of people than the present 10.2 per cent must be able to draw their sustenance from industrial occupations. Not only in the whole country but in every province and even district, there must be

At this juncture, India's interest lies in safeguarding her trade with a few steady markets and in developing the internal demand. In order that we may have secure markets, we must (1) improve the quality of our produce by adopting better methods of production and processing, (2) modernise our marketing methods, and (3) enter into trade agreements with our principal customers. It is worth our while, in particular, to secure an increasing hold over the markets in Great Britain (which has been our steadiest market) and the Dominions (whose future possibilities are great). However, a sub-continent like India will always have to depend largely on internal demand. In future, this dependence may unavoidably become more complete, and fortunately, India has a large potential market within the country. Our population is already large and has lately begun to increase rather fast. Our internal market can be greatly extended by increasing the purchasing power of the masses on the lines suggested above.

8. *A More Balanced Economy.*

In view of the tendencies just described, it must be considered fortunate that, unlike some other primary producing countries (*e.g.* Java, Australia), India has not evolved a productive system too dependent on external markets. In the 19th century, a growing demand arose for our primary products, and a large increase in the production of rice, wheat, cotton, jute, and oilseeds took place. But fortunately no part of the country has specialized in the production entirely of export staples; in almost every area there is a wise mingling of food crops with 'cash' crops. Nearly all our cereals, pulses and sugar are consumed at home—and these crops cover 82 per cent of the total cultivated area. The crops raised chiefly for export are tea (84 per cent), coffee (58 per cent) and rubber (82 per cent) but they occupy less than ½ per cent of the total area. It is true that 59 per cent

day this is being threatened by the growing practice of bulk-handling and the more extended use of paper bags in place of the gunny. India is to-day the largest grower of tea, but its culture has lately been spreading apace and Russia now threatens to flood the world with cheap tea. The chief outlet for our raw cotton is Japan, but that country is trying to make itself independent of Indian cotton. Recent developments abroad have weakened the position of India's cotton and this has already caused some anxiety. Further, India's competitive position among primary producers is not strong, due partly to our high production costs and partly to our neglect of quality. These tendencies are not such as to encourage optimism about the future of India as a producer for the world market.

The declining trend of population in Western Europe is another feature which ought to cause some concern. Till lately, "the rising tide of general consumption supported by increasing population and improving standards of living in the rest of the world always came along to float the producer's ship off the shoals of temporary maladjustments".[9] But now that population is fast declining and autarchy becoming rampant, demand in Western countries for food and raw materials is bound to slow down, and world trade may become stagnant. The population of Western Europe increased rapidly in the last century, when production was also growing fast; but lately the tendencies have changed and a large decline is expected in the coming decades. Therefore, in every way, the prospects of a growth in our exports to Western markets are far from bright.

9. Sir George Schuster's Sir George Birdwood Memorial Lectures (*Royal Society of Arts*, March 1935).

Departments of Agriculture Industries and Co-operation are useful in giving technical advice, but for carrying out the policy in the districts there is no better agency than the District Officer and his assistants. With this purpose in view, the recruits to the civil services must be given a more specialized training than is now provided. The shaping of the general economic policy must be done by the Federal and Provincial governments under the advice of competent general staffs. With such an organisation functioning in the country, economic progress can be quickened and efficiency can be secured without the adoption of totalitarian principles.

7. *India's Policy in regard to Foreign Trade.*

If internal requirements call for an active economic policy, even more pressing is the call from external circumstances. Foremost among these is the persistent tendency to economic nationalism and the drive towards economic self-sufficiency, which to-day are narrowing the scope for India's export trade. Industrial countries in the West are straining every nerve to grow their own foodstuffs and raw materials, partly as a measure of defence and partly with a view to restoring a balance in foreign trade. France which formerly imported much wheat is to-day able to export wheat. Italy and Germany are struggling hard to produce at home synthetic substitutes for various raw materials, and the ablest scientists have been employed by their Governments to achieve this object. India is one of the foremost amomg the world's primary producers, and raw materials form the mainstay of her export trade. In the last century, indigo was one of our chief export staples; it has disappeared owing to the German invention of artificial dyes. Lac-dye and safflower also met with a similar fate. In other cases, rival products are narrowing down our monopoly. Jute has been a valued monopoly of India; to-

"Agriculture is not merely a way of making money by raising crops; it is not merely an industry or a business; it is essentially a public function or service performed by private individuals for the care and use of the land in national interest, and farmers in the course of their pursuit of a living and private profit are the custodians of the basis of the national life."

In India, agriculture is not pursued as a business for making money but is the only way of living available to illiterate persons, and therefore if our agriculturists are to fulfil their high public duty, their business must be placed on an economic footing and must give them ample sustenance. This must be the State's immediate task in this country.

A carefully co-ordinated administrative organisation is necessary for carrying out such an active economic policy. The unit of the reconstructed economic life must be the village, or a group of villages. The village school, the co-operative society and the panchayat must become the three pillars of the reformed rural life. Over a wider area will operate the land mortgage bank. As an improvement in the standard of living is our prime need, the co-operative society must be the pivotal institution and must engage itself in the many-sided activities connected with rural uplift. For discharging such responsible duties, a full-time rural guide is necessary in every village, or at least in a group of villages, and men with initiative and character must be carefully selected and trained for this purpose. There are now various departments interested in rural uplift; a more co-ordinated policy and unified direction are needed if rural uplift is to proceed rapidly. In the present circumstances this is only possible if the District Officer and his assistants are charged with rural welfare as their principal duty. The

the unwary of their rights. Laws were later made to protect the debtor from usurious moneylending, but such laws are easily evaded. Co-operative societies were established for the same purpose, but their mode of working did not suit the habits of the agriculturists, and rural credit has continued to be largely managed by the private lender in the traditional manner. Agricultural Departments were instituted in all Provinces, and subsequently Industries Departments also, but their sphere of operations remained very narrow till lately and improvements in the methods of the ryot and the artisan have so far been very meagre. Since the establishment of the Imperial Council of Agricultural Research, valuable experiments have been carried out, and it is hoped that arrangements will soon be made so that the ryot may profit by them. The benefits of civilized Government have been reaped mostly by urban classes—merchants, bankers, lawyers, professional men and Government servants—and the rural masses still remain steeped in ignorance and poverty.

It is the small producer and labourer that need the protection of the State. Large industries and plantations may be expected to look after their own interests, but the small producer, whether agriculturist or artisan, cannot be left to the mercy of the middleman. The State has a special duty not only to control all moneylending and marketing transactions affecting these classes, but also directly to provide such facilities. Takavi is a time-honoured practice and can be expanded to fulfil a wider purpose, and warehousing facilities must also be supplied by the State. Even in England and the U.S.A., where the farmers are more substantial and resourceful, the State is now taking upon itself responsibilities in respect of credit and marketing. As the Businessmen's Commission of the U.S.A. has pertinently pointed out :—

of India. Owing to an effete economic and social organisation, all the money that the tax-payer pays does not reach the treasury, nor does all the expenditure undertaken by the Government reach the masses. A readjustment of the economic mechanisn is therefore necessary.

A good part of the money required for this new policy must come from loans. The loan policy of the Government in India is very conservative. The result is the comparatively light burden of public debt. But the country is crying for drinking water and roads and irrigation works, and it is necessary to quicken the progress of such productive works. The best time to launch such a policy was in 1933 and 1934, when the depression reached the bottom. This would have enabled Government to maintain purchasing power in a time of dire depression and to carry out works at the lowest cost. The Government was sceptical of it, and the commercial bodies were engrossed in the demand for a return to the 16d. ratio, which was in their eyes the sovereign remedy for all the economic ills of this country. Therefore the few economists who recommended a public works programme were not heeded. There is still need for a reconstruction scheme for slightly different objects.

6. *Need for an Active Economic Policy.*

For bringing about such a reorganisation of our economic life, the Government will have to follow a much more energetic policy. From the middle of the last century, the Government pursued for long a policy of ***laissez-faire*** in economic matters, largely under the influence of current English ideas, and this was modified only when famine or other extraordinary disturbances to economic life occurred. The law and the courts were expected to protect the week against the strong, but, on the other hand, they became agencies in the hands of the resourceful classes to deprive

expenditure as a means of toning down inequalities. At present the bulk of the revenue is spent on security services and their benefits are unequally distributed between the different sections and groups. The defence expenditure may be a great burden to India as a whole, but it is an asset to those Provinces where the bulk of it is expended. Our public expenditure has been bringing about an unfair re-distribution of income between economic groups and Provinces, and this must also be rectified.

We have now come to a stage at which the improvement of economic conditions largely depends on a bold increase of expenditure. As Sir Walter Layton points out: "it should be possible to stimulate production and to increase the welfare of the people by public expenditure designed to give greater economic security (by irrigation works, etc), better physical well-being (sanitation, water-supply, etc.) and education." Taxation for these puposes will not take away money fron the people but will add to their purchasing power in many ways. It is strange in these circumstances to hear repetitions of the Gladstonian maxim about leaving money to fructify in the pockets of the people Kalidasa says that the revenue taken by Dilipa from his subjects went back to them a thousand-fold, even as the vapour from the sea comes back to the earth as fertilising showers.

प्रजानामेव भूत्यर्थं स ताभ्यो बलिमग्रहीत् ।

सहस्रगुणमुत्स्रष्टुमादत्ते हि रसं रविः ॥

This ancient conception of public finance is more in conformity wtih the latest economic theory than 'the penny-wisdom of Gladstonian finance.' One great difficulty in carrying out such a purpose is the leakage both in taxation and in expenditure inevitable in the peculiar circumstances

and various other things are necessary to raise the standard of living. This cannot be forced; but a proper education can do much. Hence the importance of the village teacher and the need for training him, so that he can regain his old status in the village.

5. *Amelioration through Financial Policy.*

The financial policy of the Government can do a great deal to lighten the burdens on the rural population and to tone down the inequities of distribution. It is generally admitted that the system of land tax obtaining in India is regressive seeing that it takes no account of the tax-payer's ability. It presses too heavily on the small-holder and rather lightly on others; and its burdens are much lighter on certain commercial crops than on cereals. The whole system has been vitiated by the recurrence of booms and slumps. Being based on an average of prices for certain years, the assessments become light in periods of rising prices but heavy in periods of falling prices. In order that these anomalies may be removed, the revenue assessment must be regulated according to the crops grown and the level of prices. A readjustment of the burdens according to ability may not greatly reduce the total collection. Nor need this change be unduly inconvenient for budgeting purposes; if income-tax receipts can vary, there is no reason why land revenue should be the same every year.

Not only land revenue, but our financial system as a whole, stands in need of readjustment in order that it may be approximated to the ideal of maximum social advantage. Various ingrained prejudices and vested interests stand in the way of the adoption of a more equitable system of taxation. This is all the greater reason for using public

economies of the large-scale can be secured for agriculture and handicrafts. Bold measures of colonisation on co-operative lines would greatly relieve rural congestion and middle class unemployment. Not only agricultural colonies but industrial colonies are needed, and the example of Dayalbagh deserves to be widely imitated all over India. In all these ways the labour of the unemployed can be mobilized and an increase in production and national income carried out.

4. *Raising the Standard of Living.*

An increase of national income is not sufficient to raise the standard of living. The experience of England in the first half of the 19th century shows that a large rise in national income may not bring about a ***pro tanto*** increase in economic welfare. Income must be more equitably distributed, so that the masses may have greater purchasing power than hitherto. More of the national dividend must stay with the producing and labouring classes. The system of rural credit and marketing suggested above is calculated to improve distribution as well as increase production, seeing that the producer is himself the labourer in most cases. Better tenancy laws are also necessary; the tiller of the soil deserves our concern more than the numerous intermediaries who have come to encumber the land in a ***laissez-faire*** regime. In industry, statutory provision is needed for assuring to the labourers a minimum standard. A comprehensive scheme of social insurance is needed, and the cultivator must not be left out of it.

Nor is it sufficient to distribute income equitably; we must also see that it is used for better living. The level of living of even well-to-do rural folk is generally very low. Cleaner houses, a more varied diet, better use of leisure,

parts of South India and has been found successful. A campaign for agricultural improvement and the adoption of controlled credit is highly necessary. When the agriculturist becomes creditworthy, interest rates will fall, rural credit function properly and the aid of the Reserve Bank will be readily available to him.

Thus by curtailing the price of credit and by eliminating the wastes in agricultural production, we may reduce costs and maximize income. But the increase of income cannot be very great, unless the agriculturist is enabled to use his spare time productively. It is well known to those who have the least acquaintance with the rural parts that only those agriculturists who have a second string to the bow are able to save anything. It is therefore necessary to devise suitable subsidiary occupations for each area and to give facilities for pursuing them.

Some people believe that all these improvements are only possible by following Soviet or Fascist methods. A totalitarian State would destroy the valuable cultural and spiritual foundations of India and would subject this country to a drab materialism. No doubt a much greater discipline is needed if our people are to advance economically, and a certain amount of compulsion will also be required as a temporary measure; as a British statesman said, it is 'better to sacrifice a certain amount of liberty for a reasonable amount of security'. But this can be done without stamping out freedom. In my opinion, the co-operative method is best suited for improving Indian economic life. Of course, its operations must be extended over a wider sphere than mere credit or consumption. There is great scope in this country for co-operative production, by which many of the

rural purchasing power, the scope for industrial development is extremely limited. On the present basis of consumption, India is rapidly becaming self-sufficient in regard to a good many articles. For raising rural purchasing power, agricultural production must become more efficient and the distribution of agricultural income must become more equitable.

The low productivity in Indian agriculture arises chiefly from certain imperfections in the system of land tenure, rural credit and marketing. By bringing more land under irrigation and by introducing improved methods of agriculture and cattle-breeding, production can be largely increased in India. The use of improved seeds and manures, consolidation of holdings, and the use of electricity will greatly help oʇ make production efficient. For long-term credit, the land mortgage bank must be the chief agency. The high cost of seasonal credit can be reduced and wasteful marketing methods eliminated by the introduction of a system of controlled credit, operated by the co-operatve societies under the careful supervision of the Government. The real obstacle to making credit cheap is not merely the moneylender or merchant, but the ryot himself with all his wasteful habits and improvident ways of living and borrowing. Only by resorting to the harsh methods of the professional moneylender can loans be recovered from many of the agriculturists. Therefore in order to help the ryot, we must cure him of his improvident ways; but this will take time. In the meantime, we must give adequate relief to the burden of debt and devise a system by which loans will be given almost entirely for productive purposes, and repayment will be provided for through the co-operative marketing of the produce raised. Thus credit must be linked up with marketing. This will reduce the cost of credit and enable the agriculturist to increase production and obtain a larger part of the product. A system of controlled credit has been tried in

No doubt, a certain number of key industries will have to be conducted on the mass production basis in large factories with all the up-to-date equipment, but in the case of ordinary industries nearly as much efficiency can be secured in small units, especially if chief electric power can be distributed and provision made for efficient marketing. Recent hydro-electric developments and improvements in transport enable such scattered units to obtain the external economies which hitherto were available ony to large factories. It is the cherished aspiration of our best minds that this country must be saved from the moral and physical ills resulting from industrialism, and Mahatma Gandhi's lead in this respect may with advantage be accepted in other countries also. Machine has had the better of man; it must be brought under stringent control.

That an efficient industrial development is possible on this basis has been demonstrated by Japan, where the bulk of the industrial labourers are employed in small production units. Japan's largest export industry, silk-reeling, is carried on in little workshops all over the country, or in homes during leisure hours. The chief industrial asset of Japan, as of India, is labour. In fact her resources are scantier than those of India, but by mobilizing—and perhaps exploiting—her large labour force, she has built up a thriving industry and an expanding foreign trade. Even in Europe—especially France and Germany—small industries still play a large part in the economic system. In Germany half the number of industrial workers are employed in handicrafts.

(b) *Agricultural Improvement.* However rapid our industrialization may be, the majority of people in this country will have to draw their sustenance from agriculture. Further, industrial development in this country is necessarily dependent on agricultural improvement. Without a rise in

(a) ***Industrialization.*** We will take industrial production first. A good many persons think that the immediate need of India is the rapid expansion of large-scale Industries. Few will deny that the present economic system of India is over-weighted on the agricultural side and that a larger proportion of the population must be made to depend on industries, but all will not agree that wholesale mechanisation will solve our problem. On the mass production basis, all the requirements of India in the way of finished goods can be met by a few factories congregated in one or two centres, but on this basis we cannot give employment to a fraction of those who need work. Textiles, sugar, iron and steel goods—these are the consumption goods needed by this country in large quantities. In these, we now produce almost enough to supply our internal market, and yet all the industrial establishments employing more than twenty persons have absorbed only an infinitesimal part of the large labour force in this country. Consumption may increase in future, but judging from the rate at which labourers have been absorbed in the past and considering also the fast grawth of technological improvements, the prospects for full employment in this country on the mass production basis are very gloomy. There are also other circumstances which must be taken into account. The workers whose labour is now wasted are primarily agriculturists, and, on many grounds, it is not advisable to transplant them from their rural habitat to crowded cities. Recent village surveys in South India have disclosed the fact that more of the artisan classes, being deprived of their hereditary occupations by cheap imports from abroad, have lately changed over to agriculture, thus increasing the pressure on land. These people, being tied to land, may not migrate to factories; factories must be brought near them.

still the principal problem; we have a large potential market for all kinds of consumption goods and therefore production must be increased, in order that there may be more goods and more purchasing power to buy them. Further, the producer in India whether agriculturist or artisan largely supplies his own labour, and to that extent, distribution has a narrower scope than in the capitalistic agricultural or industrial systems. Indeed a better distribution is necessary between the producer and his sleeping partners (landlord and moneylender) if production is to increase. Yet, as an American economist says about his country: "We are not interested in maintaining a static situation in which the total income, even if equally distributed, would be altogether inadequate; we are interested rather in producing a dynamic situation in which increasing quantities of newly created goods and services would become available for every one".[8] This is much more true of India than of America. We have so small an aggregate income to be distributed that all talk of equalization is somewhat premature. Social justice is needed, but its claims must not be so urged as to deflect us from our main purpose.

Further, in devising the plan for rebuilding our economic system, our national genius and cultural heritage must also be taken into account. A steam-roller or automobile will do its work equally well in Berlin or Bombay, but certain economic or social systems found suitable in the West need not to be so far us, as the social fabric of this country is materially different frdm theirs. Our attempts at increasing production and improving distribution must take all this into account. Our agriculture and industry must develop in accordance with our own social and economic environ-

8. Moulton: *Income and Economic Progress* (1935), p. 83.

common people and it is in the interest of all concerned to satisfy them in some way.

Therefore, from every point of view, national or international, social or economic, selfish or altruistic, it is necessary to raise the standard of living of the Indian masses to a higher level, and this must be the prime consideration in our future policy.

3. *The Increase of Production and Purchasing Power.*

How is this to be done ? The standard of living depends on income and its utilization ; income depends upon production, which in turn is the result of the utilization of labour and natural resources. Therefore in order to raise the standard of living, the labour now wasted and the material resources lying idle must be mobilized for productive activity, and the fruits of such activity must be equitably distributed. Throughout the country, especially in rural areas, there are workers who are unemployed or inadequately employed during a large part of the year. Further, their labour is not efficient enough, and too small a part of of the fruits of their labour goes to themselves. This inefficient system of production must be set right, and in doing so, the present inequitable system of distribution can also be rectified. A larger production and better distribution,—this, in short, is ***the*** problem of India, to-day.

It is clear from the above that our economic problem is somewhat different from that of most Western countries. Many of them have developed their productive resources to the utmost, depending on foreign markets, and some are now trying to curtail rather than increase production, as those markets are proving unsteady and as population is on the decline. To many of those countries the problem is chiefly one of distribution. For us in India, production is

ments. This has made them bad producers as well as bad consumers; for in the absence of equitable distribution, there cannot be an efficient system of production.[6] Thus a vicious circle went on operating all the time and has committed havoc on our economic system.

Not only has this baneful system kept India poor and undeveloped; it has also upset the balance world economy.[7] Had the purchasing power of the teeming millions of India and China been higher, economic internationalism would have functioned more harmoniously and food-stuffs would not have been destroyed in one part of the world while the other part was hungering for food. Nor is this *impass* likely to be rectified without an increase in consumption ir Asiatic countries.

There are still some people in India who, on one groun or other, disapprove of an increase in material comfort: They forget that the large numbers of people who are belo the poverty line and a good many of the job-less educate persons are not asking for comforts but for enough to satisf elemental needs. It will have to be conceded that for th 'good life' which Aristotle postulates as the object of polit cal society and even for the attainment of the highe spiritual ends, a modicum of material comfort is essentia ***Primum est vivere, deinde philosophare***. Further, the in terests of social security to-day require that the economi condition of the masses in India should be improved. Tl yearnings for a better life have lately spread among th

6. Cf. "from the want of a proper distribution of the actual produce, adequate motiv are not furnished to continued production." (Letter of Malthus to Ricardo, 7 July, 1821).

7. Cole, G. D. H., *The Intelligent Man's Guide through World Chaos*, pp. 50-1.

As the savings of the country were so largely hoarded, labourers found little opportunity at home and sold their labour abroad, an such unfavourable terms and with such undesirable results as to make Indian coolie labour an object of contempt. Nor had educated persons any chance for suitable employment, and those who received education in the new schools crowded into the government services or became lawyers. It must be admitted that the influx of British capital into the railways, jute mills and tea plantations of India from about 1860 did something to relieve the persistent paucity of purchasing power in this country. But such investments slowed down during the war and have almost ceased since. Year after year, increasing numbers of eligible persons have been sent out by the Universities, and with all the elaborations of the administrative machinery, the Government have found it impossible to employ them all. Thus has arisen the serious problem of unemployment among educated persons, a problem in some ways more alarming than the under-employment which is keeping down the standard of living in rural areas.

The state of things explained above seems to lend support to some of the familiar under-consumption theories. Too large a proportion of the income derived from production has been going to the capitalist classes, while the producing and labouring classes have been living on the subsistence level. Unfair tenancy conditions, unjust loan transactions and inequitable modes of marketing have been instrumental in bringing about this condition. The result has been under-consumption, which in turn has led to under-production. Owing to the largely unproductive use of savings year after year, little increase of investment has taken place, and the common people have been always under-employed and have been living on minimum require-

nounced in this way, and the purchasing power of the masses continued to be low.

Had the people who obtained the bulk of the profits from agriculture and handicrafts invested their earnings in productive enterprises, the economic system would have functioned better. This is what happens in all advanced countries, including Japan. In 1868, when Japan was opened to foreign trade, the landlord and trader put their savings into productive enterprise and thus the country developed rapidly. But in India, the habits of moneyed persons have not been conductive to productive activity. They bought gold or lands or gave out money at high rates of interest to needy persons--all more or less sterile pursuits. Year after year, a large part of the trade balances in favour of India came in the form of gold or silver mostly for hoarding purposes. Between 1835 and 1925, as much as Rs 1,300 crores or 52 per cent., of our merchandise balances were converted into gold and silver, and thus got sterilised. Such an unproductive use of the annual surplus was hardly calculated to increase employment or circulate purchasing power. Further, the classes in whose hands the profits accumulated were those noted for their parsimonious ways of living. As a well-known English economist wrote in 1820, "the principles of saving, pushed to excess, would destroy the motive to production".[5] This is particularly so when savings are converted into gold or lands. In Bombay and elsewhere, a few Indian capitalists ventured into industry long ago, but the growth of such enterprise has been slow and the type of industrial organisation adopted was not the most conducive to the national welfare.

5. Malthus, *Principles of Political Economy* (1820). p. 8. 9.

world, but our economic and social system denied them the right of obtaining in society the position they deserved, and the fruits of their industry went into the pockets of middlemen. Thus the bulk of the purchasing power generated in the course of production remained with the employing classes, and the masses were kept in a miserable condition.

With the dawn of modern economic conditions in India—a money economy, statutory rights in land, registration of of money claims, laws of contract and civil procedure and courts to administer them—the lot of the agricultrists only became worse. Their credit increased when land laws were enacted, but facile credit proved a curse to most of them. As Gide puts it, ' credit holds up the landholder as the rope holds the hanged man '.[3] Landholders freely used their credit to borrow, mostly for non-productive purposes; but repayment was dificult and the new law courts, unlike the old panchayats, gave all facilities to the creditor to recover his claims. Thus land alienation became common and the condition of the agricuturists became worse. The new laws and courts were no doubt suited to a commercial society but they proved injurious to our rural population.[4] With the increase of foreign trade after 1860, towns grew in size, an urban middle class arose and professional men carved out largr incomes, but the rural masses who made all this possible benefited little by it. The balance of trade in favour of India went on increasing year after year, and much money flowed into the country, but the bulk of it went into the pockets of merchants, moneylenders, and other middlemen. The unequal distribution of income, already a feature of the Indian productive system, became even more pro-

3. *Political Economy*, (Archibald's Edition), p 394

4. Thorburn *Muhammadans aad Moneylenders* (1886), pp. 73-92; Calvert, *The Wealth and Welfare of the Punjab*, p. 123.

cost price for the last 100 years, if one takes into account the proper elements of costs'.[1] The position is worst in India, because here the middleman makes profit not only by handling agricultural produce but by advancing money to the agriculturist on unconscionable terms. Contrary to the expectations of the British administrators who carrried out the early land settlements in India, a large number of middlemen have come to posses rights in land and therefore claim a share of the income arising from it, with the result that the share of the actual tiller has become small, especially in parts where the competition between cultivators is keen. From this meagre share, the ryot has to meet the claims of the moneylender, who may be the landlord himself, and in many places all this sharing takes place on the threshing floor itself. In the ryotwari areas, the Government too gets a good slice of the income from land. What is left to the cultivator is hardly a living wage, and he has soon to borrow for maintaining himself and family. Thus even in normal times, the agriculturist is in want and in debt; and when crops fail or cattle die, he has to mortgage his land, and mortgages generally end in loss of land. Thus the position of the ryot is like that of 'a man standing permanently up to the neck in water, so that even a ripple is sufficient to drown him'.[2]

Nearly the same conditions obtain in the handicrafts; and the artisans are everywhere steeped in poverty and debt. India formerly possessed weavers and other artisans whose skill was unsurpassed, but even they had to work under conditions of semi-slavery for a bare pittance. The muslins and chintzes they made were the marvel of the

1. *A World Agriculture* (Royal Institute of international Affairs), p. 260

2. Tawney, *Land and Labour in China* (1932) p. 77.

economic activity are therefore available in ample measure, and yet the resources remain untapped and man remains poor. For this state of things, various causes have been assigned. In my opinion, it is due to two factors: (1) inefficient and inadequate production and (2) inequitable distribution. These two causes interact on each other at many points. Owing to technical inefficiency and a colossal waste of labour and resources, Indian production is at a low ebb, and therefore the share of income available to each person is also very small. India needs much more of consumable commodities if the standard of living of its teeming millions is to rise to a satisfactory level. The purchasing power needed for effecting this increase of commodities must be generated in the productive process itself. But the productive system of India is vitiated by many serious evils. It never distributed purchasing power equitably and it has been clogged by an unjust system of distribution. Too small a share of the purchasing power resulting from production has been going into the hands of the producing and labouring classes and too large a share into the pockets of certain classes which are economically sterile. This needs some explanation.

In India, the producer, whether he be a cultivator or an artisan, depends on moneylenders and traders for capital and marketing, and 'the nature of the bargain is generally such that he seldom gets any reasonable share of the fruits of his labour. All over the world, even in Soviet Russia and the U.S.A., agriculturists obtain a much smaller portion of the national income than their labour entitles them to. The agencies that trade in agricultural produce obtain with less effort a much larger share of the income from land. Sir Josiah Stamp says that 'the world as a whole and over a given length of time has almost certainly been fed below

the matter of sugar also. A distressingly low standard of living has been persisting in this country for a long time.

It has lately been customary to impute the economic ills of India to the trade depression. In many countries, especially those narrowly specialising in certain kinds of industry or agriculture, there has been a severe setback in production, trade and employment; but in India, on the other hand, the years of the depression coincided with a large expansion in industrial production, thanks largely to the Government's tariff policy. Since 1928-29, the production of cotton piecegoods has increased by 89 per cent, sugar by 1016 per cent, pig-iron by 213 per cent, and steel by 151 per cent. Nor has export trade fallen, in quantum. There has been a large increase in the exports of raw jute, raw cotton and oil-seeds, which are the mainstay of our commercial agriculture. The increase between the post-war period and 1936-37 was 50 per cent in cotton, 67 per cent in raw juite, and 380 per cent in groundnut. No doubt the terms of trade turned against India by a large disparity between export and import prices (22 points) between 1929 and 1931, but the disparity got narrowed down to 4 points in 1936-37. All this helped in maintaining purchasing power in the country. Rural debt is still a serious problem, but it was crying evil even in 1928, and no degree of recovery will wipe it out. It can only be cured by a reconstruction of rural economy. Therefore, the problem of India, to-day, is not merely one of recovery, but of solving our perennial problem of proverty and a low standard of living.

2. India's low standard of living is largely due to Inefficient Production and Inequitable Distribution.

India has abundant natural resources and a large labour supply to utilize them. The two prime essentials for

country almost all our sugar and matches, about 83 per cent of the cotton cloth and a large proportion of our iron and steel goods. In 1920, India imported cotton piecegoods worth about Rs. 58 crores and sugar worth Rs. 15 crores, but in 1936-37, the import values of these goods came to only Rs. 13 crores and Rs. 23 lakhs respectively. Nor has this industrial advance been achieved at the expense of our agriculture; in food-crops, production has kept pace with the growing population and in 'cash' crops like sugarcane a large increase of production has taken place.

In spite of all this advance in production and trade, the economic condition of the masses still remains unsatisfactory. With all the increase in production, labourers in organised industries still number only 1·6 millions or less than ½ per cent of the total population. Our information about income and standard of living is inadequate, but we have enough evidence to show that living standards, even of urban labourers, remain very low. According to a recent report of the Bombay Labour Office, certain classes of industrial labourers consume the maximum of cereals allowed by the Famine Code, but less than the diet allowed by the Bombay Jail Manual. Sir John Megaw estimated that about 41 per cent of the people of India are 'poorly nourished' and 20 per cent 'very badly nourished'. This is no wonder, seeing that the average rural incomes in India are between Rs. 50 and Rs. 70 per annum and that even in our cities there are classes of labourers whose monthly income does not exced Rs. 10. In a country like India, any rise in the standard of living is bound to be reflected in the consumption of such articles as cotton cloth and factory sugar. Between 1913-14 and 1936-37, the *per capita* consumption of cotton piece-goods ranged between 13 yards and 16 yards per annum, and there has been no definite improvement. The same tendency is more or less seen in

The Central Problem of Indian Economy

Ladies and Gentlemen,

I am thankful to the Indian Economic Association for choosing me to preside over its deliberations this year. Twenty years ago, I had the privilege of attending the first session of the Conference held at Calcutta. It met in a room in the Calcutta University Buildings and not many persons were present. Since then the Association has grown in number and influence, thanks to the solicitude of our older economists, some of whom I see before me here to-day. A momentous step in self-government has lately been taken in the Provinces of India, and the Association is expected to give the lead in economic matters to these Governments. It is for persons of riper age and mellowed wisdom to give such a lead. I shall only perform the ***nandi*** by giving a brief analysis of what I consider to be our fundamental economic problem to-day.

I. The Problem of India is not merely one of Recovery

The most distressing feature of India's economic position is that in spite of the large increase in foreign trade and industrial production in the last seventy years, there has not been any appreciable improvement in the standard of living of the masses. Before the War, India depended on Lancashire for about 75 per cent of its cotton cloth, and nearly all the refined sugar, matches and iron goods consumed here came from outside; but to-day we produce in this

Many learned philosophers and religious men of this age are of the opinion, that throughout the world people are becoming more or less materialistic and their morality and spirituality are not developing with their material development. People are generally irreligious; they think religion as the "opium of people". The age of science may have done away with religious persecution, torture, slavery, and evils of olden times. But it has created new evils which are at least as bad if not worse than the old ones. Religious wars have given birth to economic wars, domestic slavery has given place to factory slavery.

The age of science has made modern peoples time-slaves. The watch and clock have become their gods. And this time-slavery has made them restless and neurotic—thus making them incapable of proper moral and spiritual development. That shows that they have got no moral or spiritual goal before them.

S. K. Bakshi

Senior B. Sc.

deprived of their work, now, they are passing their lives half-fed and half-clothed. Moreover, the health of those men and women who work in factories and mines is destroyed.

Numerous inventions and discoveries instead of putting an end to wars, have increased their speed and made them more dangerous. Life is not safe in the modern age of science. Many innocent girls and boys, men and women are breathing their last in the present Sino-Japanese and Spanish civil wars.

Religion and science both aim at providing something that people want. Both are ways of obtaining results, but their methods are different. The religious man worships, the scientific man enquires.

The ideal of blind faith lost the supreme value which it had maintained earlier. In the course of the necessary growth to clear selfconsciousness of the mind of the modern world, that ideal seemed to involve an inner contradiction. Mere faith is not sufficient by itself; it has an end to attain. The end is for faith to become seasoned with intelligence. Accordingly a transformed ideal, the ideal of reflective faith normally arises. A praise worthy character is now contemplated as one becomes acquainted with the rational grounds of conviction. It is but an obedient response to the injunction of St. Paul to "give a reason for the faith that is in you;" that God exists, for example, is accepted as certain, but it is important to see why belief in his existence justified. For the assumption with which the age began, it is important to seek a reason; but if the reason cannot be found, the seeking becomes irrational and the foundations of all faith are jeopardized anew. Thus in the age of science, superstitions and blind faiths have no place.

Life and Religion in the Age of Science

The modern age is the age of science. It reigns supreme in the world. It has produced wonder after wonder and an endless pageant of discovery and invention have dazzled people's eyes. Nature herself has yielded in submission to science. The evidence of this function of science is noisily thrust upon us in the railway, the telegraph, the radio, the aeroplane, the automobile and a still more startling extension is promised us by the preliminary experiments with television. By the aid of science, the impossible will be made possible. It has added immeasurably to the comfort, ease and convenience of humanity. It has lessened the drudgery of man and life has become easier for millions. "Science has restored eyes to the blind and hearing to the deaf. It has lengthened life and minimised danger, it has controlled madness and trampled on disease". In the world of medicine it has achieved a remarkable progress and has improved surgery beyond imagination. In short, the age of science has brought along with it innumerable comforts to the lives of human beings.

When we think of the infinite benefit of science, we forget the evil which attends it. It has its own peculiar dark side. Life is often not so comfortable as it is thought to be. It has made men lazy. It is the chief cause of unemployment, a problem which is engaging the best minds of the world. Big machines have replaced millions of workers, and destroyed the cunning of their hands. Being

suit. We thanked Prof. Kapa once more for the hospitality shown us and for his kindness in taking us round the city. We slapped the necks of the Martains present—this was the fashion of welcome and leave-taking—who slapped ours in return. We said with one voice, " Give our respects to the Chief Martian" and opening the door of "Mariam" we entered it. We waited for the return journey. Dr. Roy first switched on the invisible ray. Then he pushed a button controlling the explosives chamber (this acted as a Space Gun) which emerged out of the outer cylinder. We strapped ourselves as before to the walls of the inner cylinder. Dr. Roy pushed a lever which set fire to the explosives in the Space Gun and the next moment we found ourselves to be blown sky high.

"We sailed through the air with the greatest ease, like the daring young man on the flying trapeze". The flight was uneventful and we landed on the Earth near the Space Gun house. And what happened next was a nightmare to us.

Readers, you may picture to yourselvss, the crowd roaring itself hoarse. Prominent among these shouts were:— "Bravo", "Well Done", "Three Cheers", "Congratulations". One familiar voice said, "Shabash", another "Wah! Wah".

Just imagine a battery of cameras clicking at you from all angles and newspaper men clamouring for news. But, finally, we found ourselves carried shoulder high from the Begumpet observatory to Seethapalmandi and back from Seethapalmandi to the Begumpet observatory, and by the time we reached home, evey joint of our body was aching and called out for rest.

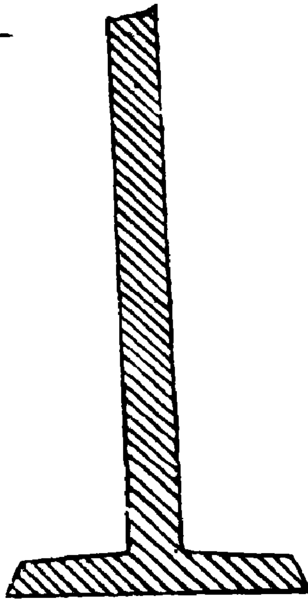
Syed Wasif Azam

during which to interview the Chief Martian, so I would like you to take me to his residence." We thanked Dr. Keuntz and proceeded with Prof. Kapa to the Chief Martian's house.

We were shown into a kind of visitors' room where there was a Television receiver with which to interview the Chief Martian. Prof. Kapa returned and informed us that we could talk to the Chief. Dr. Roy said, " As it is something official and important, I would request you gentlemen to wait for me a few minutes outside." Prof. Kapa took me with him down to the car where we waited for him. Dr. Roy returned after an hour. From his face I could conclude that the interview must have been very pleasant and profitable, for he wanted to secure some commercial rights on Mars. " Have you secured them ?" I asked. "Yes," he replied, " the Chief Martian is a jolly good fellow, Prof. Kapa. He was very polite and considerate towards me. Well, we must return to our rocket now. I have to go back to arrange for a transplanetary service between Mars and the Earth. I have secured some radium deposits here and in return we are giving you an equal value of coal mines on the Earth." Prof. Kapa said, "That is good; then I shall be seeing you soon. Come along now, I will take you back to your rocket." Dr. Roy replied, "Thanks very much, but why do you trouble yourself so much." "No, it is no trouble at all I received you and I must see you off" said Prof. Kapa.

We took our places in the car and soon arrived at the gates. We donned the oxygen masks and the thick suit. Prof. Kapa opened the gates and climbing the steps we emerged into the open once more. We found the Martians on guard wearing oxygen masks the Martian can stay for a short time only on the surface without a mask-and a warm

" Well, " he continued, " I will take this one near you for explanation. " We turned round tosee a huge machine about 7 ft. high and 10 ft. long standing on six legs. The legs resembled inverted nails, though much thicker in the stem and broader in the head. The metals used in the construction of the body of the robots were Kensium, Marsanium, Turnium, Pentium, Sorus, etc. This robot was made of Kensium though there were others of many other metals They used metals which could withstand radium rays, and, in fact, every kind of ray that could possibly be used against them in Jupiter. Dr. Keuntz said, " Once we find out which ray is being used we can wear a suit of such metal as is safe from the effects of those rays and then coming out of our rocket we can give battle to the inhabitants of Jupiter." The main body of this robot was rectangular and its head was covered with lenses and the Tele-eye. Dr. Keuntz brought a ladder and propped it against the platform which the Martians had left round the robot. We climbed on to the platform and Dr. Keuntz took of its cover or radiator. We looked into a jumbled mass of fantastically designed machines and contrivances for driving the robot which was quite beyond our comprehension. Dr. Keuntz didactically proceeded to explain its mechanism but we stopped him. Dr. Roy said, "What is the use of explaining when we can make neither head nor tail of what you are saying ?" And we got down from the platform.

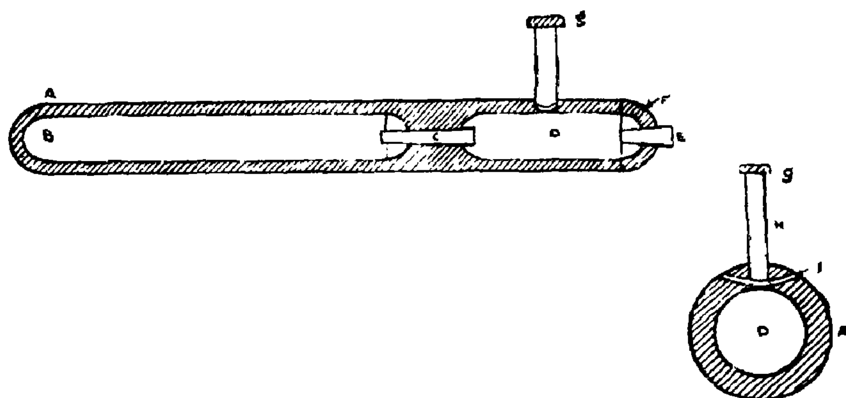


Prof. Kapa began, " Now, Sir, shall we visit the flats of Martians ?" Dr. Roy replied, " I am afraid, Prof. Kapa, I haven't much time to spare. I have got only two hours

About an inch or so from the mouth of the barrel was a button connected to a stem about one and a half inches long. To the lower end of the stem was a semi-circular piece of Kensium band (see national figure). A Kensium stopper is supplied to plug the hole in the detachable head. When in use, it is taken off and inclining the gun a little—if the gun were kept horizontal the liquid radium would flow out of the tube—the button is pressed. It presses the tube containing radium and some radium spurts out of the barrel and it discharges rays which have a parabolic flight and fall near the objective with a dazzling light and explode. On releasing the button, the tube sucks in radium from the container.

Dr. Keuntz next took us to the Robot building section of the laboratories. Dr. Keuntz said, "The various stages the manufacture of a robot are too tedious and puzzling to be explained as well as understood in a short space of time, so I will show you a completed robot". He led us through a brilliantly lit passage. I looked here and I looked there, but I could not find the source of light anywhere. The passage led to a big hall in which there were many curiously constructed contrivances. Dr. Keuntz said, "These are robots." "What," I cried, completely taken back by the curiously constructed contrivances. "I I I I—b-b-beg y-your p-p-pardon." I managed to stammer out. He asked "Why, don't you have robots on the Earth?" Dr. Roy replied, "We have, but our robots are shaped more like ourselves." "I see ! so, that is why you were so surprised."

admit the radium container. After being bored, they made the closed end of the cylinder spherical in shape.



A—Barrel of Kensium
B—Radium container of Kensium
C—Nozzle of Kensium
D—Tube of animal hide (see below)
E—Stopper of Kensium
F—Detachable head
G—Button
H—Stem
I—Semi-circular piece of Kensium

A detachable semi-circular lid with a hole in it was being made for the open end. The radium container was 9" long and 1.5" in diameter. It is very similar to the ba rel. It has also a detachable head. After filling it with liquid radium at 960° C, the detachable head was screwed on. A small nozzle of Kensium was put into the hole in the detachable head of the radium container. The nozzle was connected to a tube made of the same material as the gloves worn by the Martians. I asked, "Dr. Keuntz, do you get this material from trees?" He replied, "No. This is the hide of an animal which lives in the neighbourhood of the Radium deposits and is well adapted to bear the radium emanations." The tube had a small hole bored in it which came in juxtaposition with the hole in the detachable head of the barrel.

your case. So we hope to conquer them by means of the Radium Guns. In another section of this factory we are preparing robots for fighting the enemy. They are to be controlled from the 'rockets' by means of television and wireless." The manager received us and was introduced all round as Dr, Keuntz.

In the first section of the factory, we came across a number of Martians at work on the outer covering of the Radium Gun. I tested one of them and found it to be very hard ; it was black in colour and the colour was permanent. I asked Dr. Keuntz, "Pray, excuse me, but I would like to know something about this metal." Dr. Keuntz began "This is a metal found near the radium deposits. It resists the ravages of radium emanations for a considerable period. The blackness is in the metal itself and not coloured as you might suppose it to be. This blackness is very suitable because it has the power of stopping the radium emanations and, since radium is used in liquid form in guns, it controls the radiation of heat. It is called Kensium, after its discoverer, Dr. Kens."

The barrel or outer covering of the gun is just like a test—tube in shape though not in size. Its mouth is small, about the size of a pencil. The gun is about a foot long and two inches in diameter. The Martians were making cylinders of Kensium out of big blocks and then smoothing it. In another part of the room, the cylinders were being bored to

clothing for us, and after treating it with some chemicals, we use it in the walls of our workshops to make them sound-proof and fire-proof". I had a chance of seeing this animal when we moved on to the Research Laboratories. The way led by a farm and on this farm a number of them were grazing. They are a cross between a rhinoceros and a hippopotamus and are about 5 ft. high and 7 ft. long. They have short tails, short legs, small ears, big eyes, long noses, with a short cone-shaped tusk. They run very fast and are difficult to catch.

We next passed by the Research Laboratories. Prof. Kapa said, "We are building a rocket here by means of which we hope to reach Jupiter". This place was the most guarded of all, even more closely than the Power House. The martian engineers who were making it were considered very precious and the death of even one would mean the wreck of their plans, for it would take many more years to build the rocket. We requested Prof. Kapa to take us in but he replied, "No one is allowed to enter the laboratories except the engineers. I am also not allowed to enter. Only those who have a pass from the Chief Martian can enter." We were disappointed, but there was no helping it.

Meanwhile, we were approaching the arms factory on the outskirts of the city. Radium Guns are manufactured here. "Though there are many fights taking place here," said Prof. Kapa, "yet we use the Radium Gun only as a last resort." "But," I asked, "where is the necessity for manufacturing so many radium guns, when a few hundred will do?" He said, "You see, our theory is that Jupiter is inhabited by a very hostile race whose civilisation is millions and millions of years ahead of ours, and probably more in

engineers during the day and two during the night were required. They controlled the consumption of Bunseum and if necessary conducted some minor repairs or the oiling of some part of the dynamo with the oil of an animal. Since the 'rocket' workshop and the Television Exchange were the two most important departments in the city, I found the Power House to be very zealously guarded. The Power House was surrounded by a wall built of a shining, hard metal—though, not so hard as Marsanium--known as Arsium. This metal is very durable and would be quite capable of withstanding battering rams and even bullets and cannon balls, if there were such things on Mars.

We then passed on to the storage department, situated at some distance from the Power House but very near to the Martians' flats. Two things struck me as model of Martian civilisation during my visit, and these are the iron discipline controlling the Martians and their wonderful organizing capacities, rather, the organizing capacities of the Chief Martian. No one has ever seen his face, not even his personal assistants. While the Martians are at work, their wives come and take a week's rations with them. They take the rations, sign a book and go away happy and contented. The manager of the Stores informed us as to the nature of the food of the Martians. "It consists of a kind of cereal, taken with milk from trees". I was much surprised and asked, "Do trees yield milk on Mars?". He said, "Yes! the trees are grown and cultivated by the young boys and girls whose duty it is to gather milk from them". Dr. Roy said, "I would very much like to taste it". The manager asked one of his assistants to bring some milk. We tasted it or rather we drank the whole lot of it, because it was so sweet and well flavoured. The manager continued, "They eat the flesh of an animal named "Kaukutra" which also yields an oil used in engines. Its hide is used to make thick

night Martian's shed just opposite the flat and flash a picture on to the television screen of the scene of disturbance in his shed. The alarm wires are connected not only to his shed but also to the Emergency Unit, next door to the Television Exchange. The emergency Martians make for that particular locality in the fastest electric car. The secret service Martian, meanwhile, keeps the law-breakers at bay with the Radium Gun. The erring Martians are caught easily and they are brought before the Chief Martian who is the supreme judge and sentences them accordingly. There is little or no danger from the other Martians who are civilians, traders, architects, etc., because they are under the eyes of their chiefs during the day time, while, at night, they are watched by the secret service agents. The chiefs of these various departments are chosen by the Chief Martin himself". Thanking the Director for all this valuable information, we drove on to the Power House.

The Power House was situated in the middle of the city and housed the gigantic dynamos which supplied the television apparatus and other workshop engines with power. The dinamos, we were told, were made of a metal called 'Marsanium' and we found this to be ten times as hard as 'Manzelonite'. The manager informed us that the making of such dynamos took endless trouble, energy and patience. The fuel of these engines was an oil (Bunseum) found in the oil fields of Mars. Its vapour had a smell very similar to that of coal gas. It is lighter than petrol. But, were told that, whereas other oils are found in abundance on Mars, there is a great scarcity of this particular oil and they, therefore, use it only for the dynamo supplying power to the 'rocket' workshop and the Television Exchange. For other workshops they use another dynamo, using inferior oils as fuel. The dynamo using Benseum worked day and night, and to drive this two

us, for the Martians' knowledge of the cosmic rays was considerable and on that account I thought they must have turned out some creditable work. Television had replaced the telephone. The Martians holding a conversation could see each other. We entered a big room where a number of television operators were sitting with a pair of ear-phones over their ears. In front of each were two screens with silvered surfaces and beneath each screen were knobs with numbers on them. The director explained that, when two Martians were speaking, their faces would appear on the screens, automatically focused by the adjustment of the knobs in accordance with the numbers given

Their conversation could, of course, be heard by the operators. This was one example of the wonderful organization of the Martians. They were controlled by an iron discipline, which the average Martian feared very much more than the assistants of the Chief Martian. I asked, "Why are the Martians not allowed privacy?" The Director, Dr. Serum, replied, "If we did give them privacy, they would turn traitors in the twinkling of an eye. In order to eliminate the possibility of an organised revolt, we employ our operators from the Secret Service. A Secret Service Martian tracks all Martians in the workshops. For every five Martians, there is one Secret Service Martian who is himself working in the same division. All six of them leave for their flat after working hours, and, during their leisure hours, they are under the constant vigilance of another Secret Service Martian. This Martian is on duty throughout the night, while the workshop Secret Service Martian takes rest. As soon as the five working Martians enter the flat—this is generally 7 o'clock—the day-Martian gives over charge to the night-Martian who goes about the flat setting up the television alarm wires. These wires, if disturbed, ring a bell in the

He led the way down the stairs after allotting the task of guarding "Mariam" to four of his followers. We entered a brilliantly lit rooom which was warmer than the atmosphere above and where breathing too was easier. So, we took off our oxygen helmet and our thick suit. He said, "This is the capital of Mars. We have only seven cities left now and each has a population of about 2000 men and women". Dr. Roy asked, "May I have the honour of knowing your name?" He replied, "Most certainly. I am known as Kapa—Professor Kapa you know!--and am one of the personal assistants of the Chief Martian. But, shall we start now" Dr. Roy then introduced me, and the three of us moved to a very nice stream-lined car. We were told that it was controlled by electricity. Professor Kapa switched on the electric dynamo and putting the car on its course he locked its steering-wheel, thus doing away with all difficulties pertaining to the driving of a car. He then gave out instructions to the various directors and managers concerned to prepare to receive visitors.

Professor Kapa then began, "I congratulate you on your most successful flight, Dr. Roy, and still more on your wonderful invention." Dr. Roy, replied, "I thank you for it, but you must know that building such a thing is not so easy." He was far too wary to fall into the trap of revealing the mysteries of his rocket, for he knew that, if he did so, the Martians with their superior intellectual powers would make use of it to invade the Earth and carry off human beings as slaves. We were nearing the first of a number of huge workshops.

This was the Television Exchange. Indeed, Television here was in a much more advanced state than on the Earth. We were received by the Director of the Exchange who took us round. The television room was of particular interest to

We unstrapped ourselves and put on oxygen masks and special warm suits; for Mars was very cold ond oxygen scarce. We opened the door and stepped out on Mars—perhaps the only human beings who had ever set foot upon the planet. We found the land to be strangely desolate, absolutely devoid of trees or vegetation and with no signs of life of any kind whatsover. According to Dr. Roy, Mars was inhabited, but of habitation we found no sign, at least, on the face of it there was none. Suddenly we heard a deep purring noise as of some machinery in motion, and right in front of us in the soil a deep cavity opened, the soil sinking and sliding to one side. There were steps leading down, and upon these a number of queer creatures were climbing with the agility of cats. They were the Martians.

A queer type of people were they indeed. They had heads twice as large as ours but absolutely bald. They had a pair of huge ears and their eyes were as big as tea-cups giving one the idea that they were quite ready to jump out of the sockets. Their noses were long and thin. Their lips were thin but firm and they had strong square jaws which spoke of a determination and courage not to be questioned or trifled with. They had thick necks and big, broad chests but small stomachs. They had long legs and hands. They wore only loin cloths made of the hide of an animal, and they wore some kind of rubber and were also encased in rubber boots.

One of them, perhaps their leader, wore a bracelet of a metal unknown to us. He led the party towards us and Dr. Roy addressed him in the Martian language with which I had become quite familiar. The Martians had sent a rocket which had fallen on the Earth and in it we found an invitation to Mars couched in their own language, with a dictionary of pictures representing words. The Martian replied courteously and undertook to take us round the city.

A Visit to Mars

I stood with my friend, Dr. Roy, in his Space Machine, "Mariam". The "Mariam" consisted of a bullet-shaped, cylindrical rocket, about 60 ft. long by 15 ft. wide. It contained another cylinder which rested on gigantic springs to withstand the concussion of the Space Gun and a severe shake up on Mars. The inner and outer cylinders were made of a new metal discovered by Dr. Roy which he named 'Manzelonite'. It is harder than anything on the Earth. He also discovered a ray which made both cylinders transparent, and this greatly facilitated steering because he could see other objects clearly.

We strapped ourselves to the walls of the inner cylinder by means of three leather straps, one across our feet, one over our stomachs and another across our chests, leaving our hands free to manipulate the instruments and steer the machine. The time given for clearance was one hour, and this was quite sufficient for us to strap ourselves and dispose of other necessary prelliminaries.

Exactly at 11 A.M. (G.M.T.), we were shot out into space. This is done by reacting certain explosives in the Space Gun. The speed of the Space Machine is five times that of light (speed of light is 186,000 miles per second); so it took us less than a minute to reach Mars (Mars is 48,000,000 miles from the Begumpet Observatory), and there Mariam landed. The shock was scarcely felt inside, perhaps on account of the springs and the speed which had been controlled by Dr. Roy.

Did you discover who my friend is? God is great but he has not created being but he came from the work of a man. It is a book. You can feel it, here, very near to my heart, in my pocket.

Md. Mahmood Hussain

V Year (English)

despised and I "beweep my outcast state and curse my lot"—at such a crisis there comes my friend with a twinkle in his eye and a smile on his lips. And lo! a free man with renewed fervour and renaissant hopes, I take my leave of my colleague.

When in the darkness of self-delusion I go astray, my friend comes with a torch in his hand. Evil has thrown her net, her grisly gang waits ready to pull it, I stand with one leg in, a step more and I am trapped,—but I feel the presence of my friend. I am saved.

I care not for anybody. Let the poor die of hunger, let their children be frozen for want of rags. If any body is poor it is his own fault or his father's. Why should we trouble ourselves and disturb our peace. Let the authority of providence who made them all, be disputed. I have no belief in these puerile laws which in the name of humanity appeal for these abominabe things. Beggars are impostors. The meek, why should I help them, the weak, why should I succour them. What have I to do with the losers! Have I any hand in their bereavements, let them not sympathise with me when I lose.

So thinking, I sit as if ready to pounce on him, whoever he may be, that comes before me. My eyes are hideously red, my hands beat the table, and the magnified echo equally matches with the thunderbolt. Some one arrives on the scene, but who is he? My friend. My strained veins are loosened, the delirium of festered thoughts passes away, my heart is melted, the impurities are burne and the temper flows out with the tears. Like a true needle I turn towards the magnet of my friend.

One Of My Friends

We have become inseparable. I doubt whether you would agree with me in calling it a being. It has length and breadth, height and weight, volume and colour, even class too. My friend is very handsome to look at and extremely noble to look into. If you try to discern my friend's interior, you will be wonder-stricken, your mind will be saturated with glory and life unfit for any criticism. In demeanour my friend is gentle towards everyone, alike to a king and a peasant, to a boy of nine and to an old man of ninety, to a haughty Mussolini and to a benevolent Friar Laurence.

I befriended my companion long ago. Now his countenance has grown weather-beaten and rough, his colour is changed. You can see crow's feet on the whole of his body, but I can assure you that the spirit remains unaffected by time or tide.

My friend can please you when you need pleasure, can add more to your happiness when you are already in it, can console you when you lose something, can cool you down when you are hot tempered, can incite you when you are dull, can wake you up when in dishonourable sleep you lie, and can encourage you when you are disheartened.

I am driven and reproached, rebuked and rejected, every door is shut upon me, and every way barred; I listen to nothing, but harsh and unkind words, I look at nothing but mishaps and dismay. I am disdained, disparaged and

Yet I maintained an optimistic attitude, and became a social being. This optimism caused me to suffer more. A multitude of men who were themselves living in a prison came to me for diversion demanding consolation at the cost of my life. Even to that I consented expecting that my grief would be consoled in the company of their grief, but I could not find that serenity which I sought. It was my folly to hope for a return to my former state. I am grieved the more to hear the remarks of those non-smokers, who question my behaviour and character; had they pitied me, I should have realised that commiseration comes out of nobility, and reprobation out of insincerity.

I have such long experience of your inscrutable heart, and inconsistent brain, that it seems preposterous to believe any more in your wisdom. It was because of fashion that you selected my company, and your affection is all pretence. There are many who assure me of the constancy of their habit, so much as to call it adoration, but I am confident that even an obnoxious liquor could replace me, and I may suffer desuetude at any moment. I was denied the esteem that I deserve. I was made a plaything as if I did not possess a heart, and had no feelings.

I live hoping that your lips will never betray me. I burn anticipating that my ashes will be significant in making you realise the ways of true love. Such is my sacrifice—it should not be customary to make sacrifices only at the altar of virtue. Alas! I am said to have stained your fingers, and spoiled your lungs. Are such criticisms to be expected of one who is dear.

Mustaba Yar Khan,

(Senior Inter)

Nicotiana Responds

I know well the human discrepancies in the recognition of values. I know well the human criteria. Yet I am thankful for the compliments that I have received, the very fashion of which assures me that they have come from a misconception either of myself or yourself.

I was flourishing in an undiscovered land, fighting an innocent struggle for existence, cautious of my career but unconcious of my doom. I was untouched ; even the lips of my flowers were virgin, as my innocent insect friends never thought of polluting them. But I was drawn out of that secure obscurity by one who is perhaps called a hero amongst you. All the sublimity of my life was tainted, by bringing me into a widerness of selfish souls, who are also self-concious like religious men. Was it fair on your part—dubious architect of your own fortune—to pollute the innocence of one's destinies? How unfair of you to be indifferent to my flowers—the result and termination of my life. Am I to live but to see my flowers disdained, and my leaves burned.

It was not only a change, but practically an end. I was assured that it would be for the better I was assured of the propagation of my fame. It was my vanity to have anticipated a luxury in fame, but a blatant publicity is my lot. Since then I have always regretted the narrowness of human assurance. Anyhow the colourful days are gone. I suffer so rude a process, as to lose my shapeliness, and the very essence of my life is burnt to ashes. Such is you devotion, lord of creation.

its revenue on armaments. In Japan today militarism is a religion, perhaps the only religion that is accepted by every good Japanese citizen, old and young. Thus we see that the political atmosphere of the world is darkened by war clouds and a world war, more fierce and destructive than the last great war, is imminent. In it, all the nations of the world will be involved and the whole world may sink deep into the unfathomable abyss of terrorism, and barbarism and disorder will prevail in the world.

The tendency of the nations today is such that they innoeently plead for peace and at the same time prepare for war and, as a matter of fact, it seems that peace cannot be restored unless it is supported by strong armaments. If all the nations of the world grow strong scientifically then the world will be safe from the nuisance of war.

Alla Yar Khan,

IVth Year B. Sc.

and infinite sea of knowledge and erudition. He has a hunger that grows more ravenous as he feeds it.

From time immemorial the world has produced many great scientists of outstanding ability and fame and it will give birth to many more.

But science has contributed more to the modern methods of horrible and nerve-racking warfare, at the same time it has increased the amenities of our life. The achievements of science which have created new means for the devastation and anihilation of mankind have produced havoc in the political world.

The two biggest continents of the world are in the throes of war. The year 1936 will be a memorable year for Italy in which she swallowed up the age-long, independent Ethiopian Empire.

Again in the same year, civil war broke out in Spain and this sanguinary battle is continuing to this day. The war-torn West has affected the Orient and the spirit of war has penetrated to China and Japan. So in July 1937 the Sino-Japanese war broke out in the Far East. Since 1935 the world has seen three undeclared wars. Now blood shed and terror are rampant and humanity is massacred like brutes. Japan is rejoicing over the fact that she is blowing up innocent woman and children and other non-combatants. In a moment the innocent children playing in the fields, men working in the mills and factories and women and mothers feeding and nursing their children are reduced to ashes.

The strength of a nation is directly proportional to the extent of its armament. A country well equipped with machine-guns, aeroplanes, poison gas, arms, ammunitions and a strong navy, fearlessly challenges the other countries and each year every country is spending a large proportion of

The World We Live In

" For sluggard's brow the laurel never grows.
Renown is not the child of indolent repose."

The advent of the twentieth century brought into the realm of science many novel things and this scientific age is replete with various inventions and discoveries. We are breathing in a scientific atmosphere. The world and especially the European world has made great progress in the field of scientific learning. It has progressed a lot; it is progressing and it will do so in future.

The glorious achievements of science have left the world spell-bound and they have produced consternation and amazement in the hearts of men. If a man of the eighteenth or nineteenth century came to life, he would be awe-struck at the marvellous progress of his fellow men. Indeed, we do not need to call up a dead person when a villager of the twentieth century, who has not seen the outside world will serve our purpose as well.

The natural instinct of man is for an inquisitive search for truth and knowledge. Man, who is the head of all creation is endowed with such a natural gift that he has attained mastery over land, sea and air.

The more he knows, the more he desires to know. The field of his research is vast and limitless. He says that he is like a man gathering pebbles on the shore of a huge

'Why is my own and who is not when I am invited
by all,

When my lord is awakened within myself.
Which is my hall ?'

No poet has till now been able to take the universe as his own. There is a strain, unheard of before, of universal love, which is ringing in the lute of the poet.

In his "Provat Sangit" we find the importunity of the poet to unite the universe with himself :—

'I shall pour the fount of mercy down
I shall break the stone wall down' etc.

In "Manashi", too, we find the same importunity :—

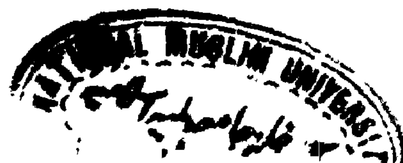
The dewdrop screams to quench the thirst of the
earth,

The world knocks at the door of Rabindranath
everyday.

He says, "every atom calls me". "From all sides in this wide world thousands, and more hands knock at my door."

What an acute perception! Tagore has been creating a wide imaginary world of equality and friendship with mankind in its entirety. We know not when his imagination will become a reality.

Shanker Mohan Lal Mathur,
B. A. (Senior), Osmania University.



Vaishnana literature, Shelley, Byron, Swinburne and Browning in English literature. Tagore will be the last person to deny the blessings of western education.

Rabindranath is the great idealistic poet. He sings of the sorrows of mankind. There is universality in all his poems. He tries to break down the barrier between heaven and earth. He tries to bring close the far away and very close, the nearest.

In a particular poem of his, we find how he realised the infinite in the finite. In his literature we find him trying to make the endless appear within the limit. He shows how the endless is akin to the limited in the following lines:—

'Conception desires to take its own form,
The form wants freedom in conception,
The boundless desires to the assimilated with the limit,
The limit wants to lose itself amidst the endless'.

In his 'Praktor Porisad' the poet has bridged the chasm which separated the Sanyasi from the household. The Sanyasi was ultimately united with the household, and the boundless was mingled with the limited.

The same idea he expressed in his old age :

'Deliverance by renunciation is not of mine,
Amidst strings without number in great glee
I shall enjoy the taste of deliverance
Filling up the earthenware of this earth over and over again
Of varied scented hue'.

The cosmopolitanism of Tagore is unique and can seldom be found in any other poet. He expresses the idea :—

The Poetry of Tagore

The deep mystery which hid itself in this known world has been explored by Tagore. We attain the goal, through his poetry, where the hungry human soul has attained the peak of perfection by being united with its desired objects. Deep down in the human heart there is a keen feeling of separation of which we find echoes in the poetry of Rabindranath Tagore.

How the Lord of the Universe has mingled His existence with the mass of the varied beauty of this world, how men noticing His revelation as years roll by, are eager to be united with him—these things are still dim and obscure to us. Tagore has opened the doors of our hearts and has explained all these happenings. The purpose of the Lord's advent in the midst of the world is clear to him. The poet causes us to understand that he whom we try to keep aloof, is dearer to us than one who is close by.

The life of Rabindranath is a drama of four acts. The first begins from the ninth year of his life, up to the composition of 'Provat-Sangit'. The second begins from the composition of "Chobi-o-gun" up to his forty-fifth year. This is the most glorious part of his life. The third commences from the forty-fifth year of his life up to his sixtieth year when he composed "Gitanjili", 'Gita Malya', 'Balaka' etc. The fourth begins from the sixtieth year of his life, when he composed "Purabi" and "Mahooa".

A great deal of influence was exercised over Tagore by Kalidasa the Sanskrit poet, Chandidas in

Climbing upon the bund I plunged headlong into the dark water. I did not know how to swim and the impact of my face and chest on the surface of the lake left me unconscious. In a few moments I came to and all I recollect is the going down of my body to the bottom and the going up of something out of me to the world beyond. Just then my head struck a rock, and the next moment I was up in bed, my heart still thumping with the remembrance of the night mare and of my death.

The sound of my head striking the rock was again heard —it was a knock. "Is that you Shanker?" I asked. "Yes Sir, your morning cup of coffee, Sir."

S. M. Abbas,

No. 166, IVth Year B.

was going, I went on walking, my brain perplexed and my mind filled with the horrors and difficulties that would ensue. I was thinking of my constant failures in the same examination for the last four years and of how that affected my relations and friends. My younger sister had passed her exam. and had received a scholarship, my younger brother had entered government service, and I was the only unfortunate member of our little family who depended upon my parents. Although able to afford bread for an idler, my father had talked to me sometime before the exam, and had said that if I did not pass this year he would have me turned out of his house to earn a living for myself.

Apart from all this, the remarks of my friends and relatives haunted my thoughts, and the unlimited flow of satiric statements they would direct towards me after hearing of yet another failure. My heart sank at the prospect of wrath at home and comment wherever I went. I was thinking of escaping from these difficulties somehow but no definite plan had yet taken shape when my running into a tree awoke me from my deep meditations. It had grown dark and I was unable to trace whither I had wandered. A flickering flame ahead of me turned my steps towards itself. On getting close I found it to be a little stone structure built in the form a small temple with a wick burning in front of a stone striped with varied colours. This temple was situated on the outer side of a tank bund.

Not a sound was heard in this lonely place. My brain worked fast and I planned my deliverance from the world and its miseries, from my home which gave me comfort only when the examination approached, and from my friends who cared not to look upon one who had been so far left behind in the struggle for existence.

A Dream

The first day of our examinations had passed, and I lay on my bed reading the text book, as was usually my method of perusal. The very first paper had been spoilt. I took up the book on which the next paper was to come with the more concentration, but the worry about the day's bad luck could not but come in between my own self and the book I read. I got more and more confused as my train of thought led me to undesirable presumptions.

The night was fairly advanced when in the midst of all confusion and perplexity I found myself plying my way with difficulty among a large body of students heading for the university on a hot and sunny afternoon. All faces wore smiles but I knew the return journey would be a mixed affair of smiles and tears—we were going to see our results that were to be announced that afternoon.

The mob stopped in front of a big notice board, and one after the other the students satisfied themselves with a look at it. I pressed into the first row pushing with vigour all those who blocked my way. The board was full in my view and I searched for my name all through the columns. My heart beating fast, I realized as I read the last name, that I had failed in the exam.

The world darkened in my eyes. I rushed out of the thick gathering, and, with tears in my eyes, walked along a pathway. Not knowing or caring to know which way I

and philosophy. Deeper than this we catch new streams of industrial revolutions, machines, the great inventions whose sources and laws we have still to discover.

Is this all idealism or realism? If so has evolution in every field of life really brought progress? And are we to hope for the realisation of that one Being or power which has pushed life slowly onwards, towards more life, more mind, more power and more happiness? We hope to see that greater and fairer creation of which we have been dreaming so long.

What more evolution will bring before the world in the near feature is not known. Change is the order of the day though the current of evolution is slow but steady. It cannot be stopped; ours is simply to bow, and the wave of evolution may pass on. To put the whole thing in a nutshell in the words of Huxley, "It is not enough to hope or fear the rising of new forms, but we must concentrate to uphold the forms and ideals which have been hither-to the basis of human life and progress"

V. K. Purohit
(Senior Inter)

Darwin opened a wide field for research; there are thousands of fossils still to be studied. This many sided theory of evolution has many riddles to solve. It has given much opportunity to idealistic thinkers to revise their relation to the real world. It has brought before in the world new possibilities for the future.

All organisms are pushing towards a great change and progress. This is the age of human unrest; we are moving in a changing world. In other branches of scientific knowledge, evolution has brought about a new state of affairs altogether. It has showed us the study of sociology, by which we can learn and trace the growth and development of human life. It shows us how man adjusts himself according to his surroundings——social, political or economic. We hope that the so-called social evolution may bring better days; the success to which we have already reached is known. The great war of 1914, the Italo-Abyssian war, the civil war in Spain, the Sino-Japanese war, the doings of men in high places in Russia and Germany have opened our eyes. We at once desire peace --a better political evolution.

We are seeing glimpses of the new revelations of science, which have traced the growth of organic life. Man who has discovered many secrets of nature for the benefit of the world is paving the way to a high plane and hopes to rise still higher. This is all the latent influence of evolution. It tends to elevate the human race.

At such melting points many 'isms' are raising their heads and playing great havoc in the world. The development of the human brain has come to the stage of, to be or not to be; great, thinkers of the world have left their own ideals for a great wrestle; and which ideal will turn the balance is doubtful. This is how evolution has influenced even ethics

the great struggle for existence. It is seen in nature that new species are produced while old ones disappear. In nature there is rapid multiplication and it is seen always that the offspring vary slightly from the parents and they always exceed the parents in number. If this huge increase were not checked the world would have no space to hold them. Some organisms die before reaching naturity they kill each other to have their own place. Nature also destroys some of them. Thus the vast increase is checked. Only those that are hale and healthy live and those that are weak and not fit will perish. This is how Darwin sets forth his assertion of "survival of the fittest" on which rests his evolution theory.

His theory of evolution has shown the world the idea of struggle for existence and the idea of natural continuity and the idea of the advancement of life step by step. Although it deals with the single branch of science (mainly the development of all organisms) at the same time this motive power has infused the idea into other fields of thought. It is with this theory only, that great scientists and other leaders of thought are diverting their energy to trace origin and growth in all the organic world. It has brought a great revolution in biology, thousands of animals and plants have been classified under the head of this theory only.

The theory was studied in the development of life at different stages in different aspects. From the results of this only, he suggests that the present human being is the result of thousands of years of evolutionary advancement. He tries to prove that the ancestors of the present human beings were monkeys or ape-men. Whether it is a fact or fiction cannot be discovered. Many critics have given different opinions, and they will always do so. This much can be proved that with the evolutionary process we find the greatest progress.

Evolution.

The greatest change that is taking place in every field of life is evolution. It is not in one thing, one organism but in the whole universe that this change is taking place there is change in body, mind, energy, idea, and even in each cell of the body. This vast change that is taking place in all the organic and inorganic world is really a great question.

Life is not fresh but always springs from the pre-existing state. So cities and nations, as well as other organisms, whether plant or animal have their cycles of birth and death; and out of death alone comes fair and fresh life.

The idea of progress from a lower to higher form of existence is not a new one. From time immemorial the life of the race is pressing towards a great change and reconstruction. We live in a peculiar and critical character of the age. It is a period of immense and rapid change. Nature knows the perfection towards which it moves and the greatness of which it is capable.

At such a time a Newton of Biology, Darwin brought his great theory of evolution into the world. His theory has shed a flood of light over the whole scientific world. It was the result of his many years of practical experiments, his burning desire for science, above all, his great and patient research that his "Origin of Species" was brought before the world. He proves in it the gradual development of all organisms, whether plant or animal. He has shown in it that there is keen competition between all organisms in

for the opportunity you have kindly given me to stand before you today but I am afraid that I am not in a position to do full justice to the subject because the Secretary, in spite of my request, did not inform me of the exact date of the lecture. Therefore I request you to excuse my inability and judge kindly my extempore talk." (If anybody cares to search his pockets, I am sure, copious notes can be found). Thus he goes on shifting all the blame to the head of the poor Secretary and taking all credit to himself.

Thus emerging from all odds, the Secretary's last effort will be to conduct the Union day celebrations successfully. But even there he is not allowed to carry off the laurels. After all, one worthy friend is certain to turn up and say, "As a friend, I sincerely advise you to return our subscriptions. Do you know that I at least, did not get a single cup of tea in your wonderful Social Gathering?" Another will remark, "To give the devil his due, I drank only a dozen cups of tea, but I am sorry to say, sufficient sugar was not put in it. After all, the Secretary should keep a strict eye on all such grave matters".

What a responsible job? And what a thankless one for the unfortunate Secretary. Let him console himself that—

"Honour and shame from no condition rise,
Act well thy part and there all th'honour lies".

"Socrates"
M. A. Class.

"I say, by-the-by, when do you mean to hold the installation ceremony and arrange debates ? Well, if you delay, you will be condemned for being idle"—will be the threatening words which a secretary may often hear, perhaps even on the day of his taking charge. His fate and office lie in everybody's hand and he is in constant fear of all. He is everybody's servant and nobody's master.

If it is held this week, will you propose a subject for debate ?" requests the Secretary.

"Oh ! Heaven forbid ! We come to the debates not to work but to amuse ourselves."

"In what way ?" will be the question. "Don't joke at my expense. Why, we giggle, and amuse ourselves at the tomfoolery of our venerable college orators who come to the platform with all the pride of a Cicero or a Demosthenes, and not knowing what or how to speak prove themselves to be baffoons in a circus. What will the audience in a circus derive from those lobby spirits ?

Of extraordinary meetings and more important than those, the public lecturers much can be said. Yes, their benevolent condescension and extempore erudition are worth mentioning. Generally the speakers hardly understand what amount of help the secretaries render them by giving them a chance to address distinguished gatherings where they may earn a name for themselves. Yet they trouble the secretaries by asking them to come over once to discover the subject of their lecture, another time to let them know the chairman, a third time to remind them of the date and the hour and lastly to convey them to the hall in a taxi.

In the end, do you know what the lecturer usually does in the Address Hall ? At the very outset he prefaces his speech thus :—"Ladies and Gentlemen, I must thank you

Mr. Secretary

"Hullo, Secretary! Congratulations, when can we expect a party?" will be the first salutation of friends after the election day.

"Thanks, and why should I give you a party?" will be the reply.

"Then, is it for nothing that we elected you Secretary? You earn all the name and popularity in the College because of our votes."

Thus is he obliged to everybody, and in trying to please all displeases every one. This will be the beginning of the end of his dreams. But if he really understands the duties and responsibilities of his office (which in fact, is not always the case) brushing aside for a while his dreams of popularity, he must at once enter into the real work. Without assuming superiority over the students (in truth, he puts on airs and thus becomes unpopular) he will serve everybody and have a pleasant word to say to everyone.

"Good morning, Secretary Sahib, how goes the world with you?" may often be an ironical question put to him.

"Why round and round. Thank you for your kindness."

Absurd. (The Secretary is startled and stares at him thinking that something unnatural has happened either in his conduct or in that of the world.) Not at all extraordinary if it goes topsy-turvey with a secretary" will be the reply.

whereas no pack contained a queen that had then on !—A mischievous friend suggested that he would look so if they were removed and he was angered; but if it is just to call a spade a spade, it would be equally so to call a queen a queen, eyeglasses or no eyeglasses.

Then there is a gander who floats like a swan and was furious when he was called a duck.

Then we meet a nabob who reminds us of the elephant in its infancy, when, according to some fairy stories, it has not grown its trunk.

Then the another finds that he has brought in almost all those personalities whom he knows to be famous and that his writing has come to an end.

S. M. Abbas,

IVth Year Class.

Then there are two brothers one of whom goes east while the other goes west, but the twain meet in the hearts of their common admirers—a pretty place to live in all by oneself, but not to share with another.

Then there is a young man who has grown too tall for his appearance and is hence called "the double-storied beloved."

Then we come accross several pairs of young men, always together when they have no classes, also when one has not—the other comes out of his own—and each leaving the other as far as his classroom and returning from his own to find him when the period is over: this in the case of both being obliged to attend.

Then of such, one deserves mention whose name only would serve our purpose: it is called "the international pair", but the pity is that the admirer is a fresher whereas the admired is in the B.A. class and has never had any experience of being really appreciated.

Then a list of the heroes end and a list of such as are popular for their peculiarities begins.

Then there is an old woman, so called for his sympathetic habit of adopting and protecting teasable newcomers; who is proud of his wisdom but always makes of himself a big fool; who is hooted on the platform but never fails to make his appearance at a big gathering; who is always defeated in pingpong but seldom fails to bet; who is over zealous in politics but is ignorant of his own policy; who is obstinate and is never willing to be corrected.

Then a story is told of a student who complained because his brother was called the "queen of spades", and he ridiculed the idea arguing that his brother wore spectacles

Then an example of " nearness ceases to attract " is set by a good looking young man of the second year class, who has thought it wise to mingle freely with the admirers to attract their attention towards him; and his aloofness and reserve of last year, which made the crowd stare at him as he stepped down from his uncle's car to walk the distance to his class, has disappeared, much to his own satisfaction, perhaps;—still he would never be disregarded by those who admired him then, and still do, but are yet far away from his favours. Once those are granted the interest fades.

Than there is a comely young boy who has been repeatedly warned by his admirers not to walk in the hostel corridors in a shirt barely reaching his hips, and heaven only knows whether or not the last warning and the suggested punishment in case of disobedience has done any good.

Then we come across a young man whose slanting cap would never conceal his curly hair; he apreciates distant admiration but rejects closer ties; is always rapt in thought—often gloomy and full of pessimism, and talks seldom; he shared a room, when in hostel, with a prominent figure well known for his late rising in spite of his early call, for his rejection in a certain competetive examination in spite of his strenuous labour, and for his bringing upon himself the opprobrium of a nickname in spite of his suggestion of the same for some other person ;—he is a cock, but crows too late.

Then there are a number of second classes, to give a detailed list of whom space does not permit ; and it must suffice to say that they always try to attract—even more so than the members of the first list—but naturally fail, and the greater the distance kept from them the less is the substantial loss : they make their admirers pay for their comforts and reward them with seorn.

Personalities

The college bell rings and a stately form emerges from the liberary doorway followed by aclatter of footsteps. Then each individual of the group rushes forward so that he may be the nearest to the handsome young boy renowned for his straight and slim figure, uncapped head, erect neck, raised chin, graceful gait and dancing steps, and cheeks hopping with every. Then all eyes, near and far, turn towards him to trace his way to the Biology Department. Then at every bell this demonstration is repeated until he disappears into his classroom—and whispers ensue, and petnames and nick-names fill the atmosphere.

Then a mischievous set of seniors passes the window where he sits and hands over to him a verse one of them had composed overnight, or calls his name aloud that he may turn and they may have a chance of meeting his steady gaze, and of winking before it is too late.

Then a host of others is standing at the adjoining department teasing another boy who has already had one year's experience at the institution and who was sure his day would pass with his first academic year; but that is not so, for, one day or one year, beauty will always be admired, and distance and lack of intimacy always have a great fascination. Then he leaves his classroom at the end of the period with a little dark boy, and the hunters begin their game. Then a shower of tiny bits of stone falls on the curly white and a shower of heavy ones falls on the not-at-all-respectable black.

The time is ripe, now, to take steps to promote a system of complementary production and co-operation of Central Banks for an international co-ordination of credit. Future economic policy should discourage the less and encourage the more efficient forms of production in each country. Thus the world can realise its long cherished desire of obtaining an economic equilibrium and everlasting peace.

In short, there is no reason to despair of. The centuries that followed the fall of the Roman Empire were a far worse experience than any-thing we are facing to-day. The duty of every citizen is to keep up his spirits, try to rehabilitate the position of man and ameliorate the condition of the dumb masses. He should co-operate in defence of justice and peace, learn to sacrifice himself for his fellow-beings and foster the spirit of inter-nationalism. Thus equipped we are in view of a bright future which would weld together the separated brethren. And brotherly love would bridge the gulf of difference between nation and nation; peace and prosperity would reign and make the world a 'fit abode' for humanity.

Muslehuddin,

Hyderabadad-Deccan.

federal bond would take the world half-way towards an ever-lasting peace. "It is not necessary to convert all the nations of the world to free trade and world controls, before world controls are established. At most Britain, the United States, Germany, France and Russia need be converted" says Mr. H .G. Wells. The league should include all the States of the world and its members, specially the Great Powers, must be prepared to make sacrifices for its sake, refer all important issues to it and agree to abide by its dicisions. This can be achieved more successfully by a system of education well devised to create the international habit of mind among the peoples of the world. Thus equipped the league can work wonders by its work in the economic field with its economic organisation which would serve to rehabilitate it in the eyes of the world and go a fair way to establish peace and prosperity. Time is, now, to exert its influence and benefit by the trend of modern economic events.

FUTURE PROSPECTS

Certain tendencies of the present-day-world may indicate the direction in which the world economy is moving. The world has abandoned its policy of 'Laissez faire' but still there are ever widening circles of free trade. The inter-imperial conference of Ottawa marks a tendency of the Common wealth of Nations towards lowering the tariff walls within its dominions. America has realised the folly of sticking to the 'New Deal' and it is not opposed to internationalism. Japan and Germany, in order to promote external trade, are ready for international co-operation. France is following in the foot-steps of Great Britain and is craving for peace and internationalism. Above all the interdependence of the financial mechanism of the world itself would sooner or later make for an international agreement. All the existing circumstances suggest that the competitive system, in future, may be tempered.

THE REMEDY

Nostrums proposed for this economic crisis are man and the solutions offered by economists are different. Some put forward an earnest and sincere plea to overhaul our economic structure and condemn the evils of the industrial system. The real remedy, however, lies in the complementary system, the cancellation of war-debts and the willingness of the creditor nations to buy and to lend. Organised labour, minimum of work and maximum of wages, can eliminate the evils resulting from the unequal distribution of wealth and unemployment. Delayed marriages and free influx of immigrants, on the basis of mutual understanding into countries with large tracts of land, may put an end to the problem of over-population—a potent cause of war. The restoration of the relative freedom of trade by lowering tariff walls and co-operation between the central banks to stabilise the value of gold, would lead to the solution of the gold standard problem and unbalanced trade. The external and the internal consolidation of the 'sterling group,' would have the effect of helping the world in proper economic thinking and the stabilisation of an international gold standard would be conducive to economic prosperity and world peace.

Last but not least are the resolutions adopted at the Paris Congress of the International Chamber of Commerce—the stability of exchanges and the lowering of tariff barriers. These resolutions, if translated into action, would dispel the clouds of economic depression and root out economic nationalism which has been the bane of human society.

The lasting peace of the world depends upon treaty revision and the restoration of the prestige of the League of Nations. Not only should it be strengthened but the covenant recast on the lines of a World Federation. "A federation of world shipping and over-land transport by a

remained unbalanced. The National Industrial Conference Board announces that the number of unemployed in the United States rose in may, 1935, to 97,11,000, a increase of 5,10,000 over the total in May 1934.

Is it not strange that over-production should starve the world and make the problem of unemployment more acute ; that the dazzling progress of science and the astounding increase in wealth should render humanity penniless ?

The penetration into the root cause of this grave situation and the careful diagnosis of this debilitating malady besetting every nation and the finding of proper remedies would restore the world to its healthy condition. What is that malady? It is Economic Nationalism.

THE VERY WORD—ECONOMIC NATIONALISM—

Conjures up an idea of a spirit detrimental to internationalism, destructive to humanity and suicidal to the world itself. In this new economic craze the interdependence of world economic order has been ignored. To provide for economic self-sufficiency at any cost seems to be the most popular of party cries at the present moment.

The spirit of economic nationalism is reflected in post war currency depreciation and state support to develop internal as opposed to the external trade ; in the abandonment of the gold standard and the substitution of a managed currency to solve the problems of foreign exchange. The tendency of the United States and Great Britain to raise prices by depreciating the external value of the dollar or the sterling and failure to return to the gold standard make it obvious that nationalism is the dominent fact of the present economic life.

Revolutionaries in different countries of Europe became disgusted with democracy and have begun to make experiments in methods of more rapid and more direct action. They have no regard for public opinion. Half Europe is ruled by dictators who scoff at democracy and create a servile type of humanity.

Dictatorship stands for subjugation while democracy is based upon freedom; dictatorship breaks heads while democracy counts them ; while democracy stands for force of argument, dictatorship stands for force and tyranny. But with all its vices dictatorship is gaining ground because the modern dictators have adopted new methods of attracting people. 'The countries under the heel of modern Caesarism' says ***Bailor***, "have developed a new psychological insight : they know that morons in glittering uniforms, parading in fatuous swagger, are a more convincing appeal to the youth of the country to join its colours than any cogent and reasoned presentation of political exigencies.

Economic depression hangs like a blight upon the world which is in its ever tightening grip. The failure of the world economic conference forebods an evil day. The gold standard has been abolished and this has shattered the monetary system and as a consequence fluctuations in currencies have have led to unbalanced trade. War debts have compelled the debtor nations to produce more and consume little which has brought about over production.'

The recent report of the economic committee of the League of Nations on "The Present Evolution of Agricultural Protectionism," proves that the present policy of the world has created artificial price differences which hinder exchange, has interfered with the normal functions of international trade and tended to prolong depression. The budgets of France, Italy, Germany and the United States have

them has no parallel in their history. The Nazi movement has become the terror of Europe, it over-took Austria and poor Dollfuss succumbed to its onslaught.

Look at the Chines nation struggling for liberation and trampled down by Japan then a member of the League, by the signatory of the Kellogg Pact, by the only civilised nation of Asia. Although the revolutionary doctrine of communism has gone deep into every stratum of the Chinese Government and the wrecking of the South Manchurian Railway track under Japanese protection proved the last straw, yet the Chinese action never amounted to any violation of or inter-meddling with the Japanese rule, nor was it any encroachment upon its territory. But Japan, the great nation of the so called civilised world would not tolerate the least interference; it dealt its neighbour a fatal blow, bombarded its population and laid waste its towns. Not satisfied even with massacre, the blood thirsty monster—Japan—has spread its gready mouth to engulf the whole of China.

Again the rabid monster of nationalism reared its head and one more country of Europe is under its thraldom. Mussolini, under the pretext of civilising the Abyssinians, laid his hands upon their country. His actions are in flat contradiction of the ideas on which the League is based. He mobilised his forces and trampled to dust the sons of that land.

Pacifistic France, one with Italy in denouncing the resistance offered by Abbyssinia, has affirmed the principle of aggression. In the absence of collective responsibility, the efforts of Britain to save Abyssinia from the iron clutches of Mussolini were fruitless.

tactics. We have become lovers of Mammon and the golden principle of 'low living and high thinking' is no more. "Inflated with success", says Rudolph Eucken, "we have become the mere tools and instruments of an impersonal civilisation which rides rough-shod over nations and individuals alike, ruthless of life or death, knowing neither plan nor reason, void of all love or care of Man".

The fundamentals of civilisation-service of humanity, self-sacrifice and fear of God have paled into insignificance before the glamour of materialism. Bolshevik Russia, a devotee of the all-devouring Mammon, has no faith in religion. "Banish God from Heaven", is the national cry. Germany, because of her crushing defeat in the Great War has renounced her faith in Christianity. "Only through the complete renunciation of Christianity will the German people achieve the unity which it needs and which would have saved it in the trying days of 1918," says General Ludendorff. Italy cares more for her expansion than her religion, and feels no compunction even in slaughter to gain her ends.

Other aspects of the world are still darker and call for a separate elucidation. The world has, at present, been rent ascender and divided into numerous small water-tight compartments by high tariff walls raised between nation and nation. Instead of transcending the barriers of nationalism, there is an ever-widening gulf of difference between man and man.

The revolutions of modern times have been generated by political or economic forces. The Nazi uprising has been fired and dominated throughout by race hatred. Crushing disabilities imposed upon the Jews and the galling limitations heaped upon them signify a reversion to the intolerance and barbarism of the Middle Ages. Never was Jew-hatred preached with such vitriolic fury and the calamity which befell

What Man Has Made of Man!

The world in which we live is drifting fast towards the Slough of Despond, but Ferrero affirm "The modern world is great, rich, powerful, wise : it can boast of having created the most humane civilisation in history In spite of all the defects with which we can reproach ourselves, never in history have the relations between men and classes been so full of a spirit of kindliness and justice." How far is this true? Are we soaring high towards etherial spheres or falling back to our ape-like ancestry in atavistic retrogression? Alas! the latter seems to be the case.

Behold the march of the times and the irony of fate : human beings preying upon one another some rolling in luxury whilst others, groan under the pinch of poverty. The great powers are armed to the teeth ready to pounce upon one another as birds of prey and only waiting for an occasion. World expenditure on unproductive things is enormous and national wealth is being squandered on armaments. The great nations have been madly seized with this hysteria despite the alarming numbers of the unemployed. All the efforts at ending war seem to be wrecked before the selfish motives of man and an ever growing desire for capturing new markets.

MODERN CIVILISATION :

Our civilisation has lost its real charm and value. The interior of the so called civilised man is far different from his exterior and politics have become synonymous with

can be utilised not only for ushering a new era in Hyderabad but also for their effective representation in life.

We should not expect a millennium waiting for us but do our best towards the creation of a new and more perfect world.

Mohammed Bin Omer *B.A.* (*Osmania*).

of the world should be a fight between capital and labour at our very door and should rouse us to the help of the oppressed against the aggressor, from a moral sense of duty. If there is no need of making students conscious of the political developments taking place in his own country and if there is no necessity for him to be alive to the important questions of public importance on which not only his future but the welfare of the whole country or nationality depends, then the books on politics should be set on fire, and newspapers banned.

There seem to be nothing so objectionable as imparting a similar education to boys and girls knowing well and believing for certain that they have to fulfill different responsibilities. Education must be adopted to serve the needs of students' community and not the community itself be made to adopt itself to a system of education. It should be a matter of grave concern to the authorities concerned that the number of girls going to schools and colleges is seven times less than that of boys. This state of affairs is highly unsatisfactory, for in the making of modern Hyderabad educated and enlightened women are of as much importance and signifcance as men.

Changes cannot be wrought in any country by doing nothing while hoping for the best. It is necessary to come down for lofty intellectual heights of philosophic contemplation to survey the practical difficulties of the children of the soil; and it is equally essential for the students themselves to realise their own vitality and dynamic potentiality absolutely dependent upon unity, consciousness and solidarity, which

pleasures of a student's life while a few border on boisterous vociferation and hilarity displeasing to a sense of propriety. Though irresistible chains of brotherhood bind us together yet there is no genuine feeling of sacrifice of that sensation of all being in the same boat which helps human beings to rise with one voice, to fight with one mind and adequately to safeguard their rights.

Gradual westernisation in costumes, habits and thinking seem to be the most glaring defects of modern education, giving birth to an imitative and slavish mentality, marking a regrettable departure from all that is best in eastern civilization and culture. Demonstration of religious indifference, showy ignorance of long practised ethical codes and light treatment of names held sacred in the religious world are the germs that are stealthily poisoning the student's life. This is all the more pitiable in face of the frantic efforts of repentant Europe at moral and religious resuscitation.

This is a time when deeds of heroism and patriotism have taken the place of sweet lullaby and fairy songs over infant's cradles in Europe. At school and out of school, children are made to understand the rise of Il Duce, the Fuhrer and Stalin by means of simple stories and charming songs. With the increase in age comes in the explanation of the economic and political docrines of democracy and dictatorship. By the time they become young they are able to grasp the currents and cross-currents of the sea of politics, intellectually and spiritually alert to political problems, and capable of associating themselves with what they conscientiously believe to be right and prepared to sacrifice their all at the national call. The fight between Fascism and Bolshevism, Imperialism and Communism in any part

as a scheme inaugurated with the best of intentions but with the worst of results.

The students themselves cannot escape censure for their fortitude and suicidal indifference towards such essentially momentous problems on whose solution hang their future prospects. It is one of their most sacred duties constantly to revert to them without fear of criticism or thought of favour.

It is indeed painful to expose the apathy and unconsciousness of responsibilities, and the tragedy of indifference silently eating into the very vitals of students' lives. We have no definite aim of education to lead us through thick and thin, like a guiding angel beckoning from high. A young student goes through the routine of a prescribed syllabus as a hack, dreadfully approaches the examination hall to get rid as early as possible of what the teachers have directed him to cram; secures a degree if he is fortunate, not by his initiative or resourcefulness but by the art of photographic reproduction. No sooner does he wear the gown, then he forgets all about Sciences and Arts! The course of time sees him swelling either the rank of educated unemployed or toiling over a heap of files in some dirty corner of an ordinary office under an officer who has never been to a college in his life; making a laughing stock of himself by ignorance and inexperience and brooding over those years of life when he had no anxiety for the morrow or any thought of future. Marriage comes to the relief of the dulness of office-boredom but brings in its train inordinate expenses, inextricable cares, dominating debts. The time of retirement finds him disgusted with service, tired of life and wearily waiting for death.

Our social life has become more or less lethargic. Most of us live a life of seclusion away from the activities, joys and

(and who more often creates hatred of rather than interest in a subject) nor taxed his brains in finding out the peculiar bent of mind of the pupil in charge, often commits a fatal mistake which leads to disillusionment, where he heaps curses on his choice, teachers and the system of education itself! Many students have fallen a prey to this fundamental error of our so-called system of education which has outgrown its utility and efficiency.

The machinery of limitation in absence of a collateral arrangement for the proper consumption of not a few outcasts from the temple of learning, is bound to do more harm than good; for only a limited number of them can join the college classes and the rest are left to their own fate. Government offices slam their doors against their faces, parents chide them for having wasted time, money and energy over useless pursuits; and society does not lag behind, sneers at their miserable plight. Their education neither equips them to earn a livelihood nor helps them in any profession. Absence of agricultural, industrial and technical education prepares them for nothing but government services, for which they are whole-heartedly condemned for no fault of their own. Had the government started vocational training before launching this experiment, they would have been harassed neither with the problem of unemployed educated people nor the spasmodic cries of disapprobation raised from platform and the press against the universally condemned policy of limitation of higher education as the students interested in machinery and industry would naturally flock to various callings, leaving those who are so gifted to plod the labourious way of academic honours. The policy of discouraging University education without making paralled arrangements for the consumption of students in practical departments of life will go down in the history of education

Hyderabad Calling

I feel a wave of enthusiasm running through my body when I hear somebody speaking, " Hyderabad calling ", on the microphone of H.E.H. the Nizam's Broadcasting Station. Yes, it is Hyderabad calling in unequivocal terms to the spirit of enlightenment and regeneration in the youths of the country. But the youths appear to be shrouded in callousness. They are bankrupt of that spirit whose flames have saved tottering countries, whose bursts have given life and vigour to paralysed nations. They seem to be unconscious of the great responsibility which they owe to their country, their families and themselves. With the exception of a few sporadic flickers of misguided zeal ending in smoke there is nothing but calmness on the surface where these should be heaving currents. They are like a sheep without a shepherd blindly led anywhere and everywhere by insidious propaganda without scrutiny or analysis, or even considering the pros and cons.

Schools and colleges do not prepare them to face the grim realities of life. They are accustomed to live in a fool's paradise. The school career which generally imparts colour to the tastes and aptitude of a student in sufficiently advanced countries, and strengthens his sense of judgement in determing subjects for specialisation, ignominiously fails to render the requisite service for us. The immature mind of a young student brought up under the educationally unconscious minds of parents and under the tutelage of a teacher who has neither devoted his attention

LOOKING 'FORWARD'.

But Iqbal does not fall into despair. He believes that the Islamic humanism is still a living force and will work for freeing the outlook of man from geographical limitations, and that "it is itself destiny and will not suffer a a destiny". He feels that Europe is gradually realising the initial mistake it made in trampling over the moral and religious convictions of Christianity and resolving itself into a set of mutually ill-adjusted states dominated by interests not human but racial and territorial. He feels that even these mutually ill-adjusted states are to-day subconsciously feeling the need of a federated Europe, feeling the need of a unity which the Christian church organisation originally had given them, but which instead of reconstructing in the light of Christ's vision of human brother hood, they considered it fit to destroy under the inspiration of Luther. Iqbal, therefore, feels certain that as the modern world will pass through the throes of its own civilization and see its own handwork shattered by its own hands piecemeal will it betake itself to the humanism that should prevail to unite mankind.

Till then he would insist that wherever even a semblance of that humanism exists, whether in the East or in the West, and by whatever name it goes by, it should be preserved, at all costs, as a noble heritage of mankind.

In the materia medica of the West are but sweet
narcotics.

The heated discussions at Peace conferences,

Are but the camouflage of capitalists.

Thou takest mere illusion for a garden,

O thou fool! a cage for the nest"!

The above outburst is due to the fact that the democracy of the Western states of Europe does not fit into his humanism. Nor has he any gentle word for the Communistic order of life in Soviet Russia, or for Fascism or Nazism. Marx, he thinks, would like to idealize equality of bellies, and Nietzche, the inspirer of modern Germany, would exult at the elimination of the weak. Even the League of Nations, he thinks, is a society formed to parcel between themselves the shrouds of dead bodies. Iqbal's humanism would have none of these. He fully recognises the immense value of the sciences that Europe has developed. But he bewails the fact that the human touch is lacking. In moments of trial, they betray humanity, in the name of territorial nationalism! He also would heartily appreciate the life of action which characterises Europe, but is grieved to see that action does not express itself in the universal good of all mankind. His faith therefore holds anchor in the humanism he identifies with Islam; and even when he looks at the condition of those who are the recipients of this heritage, viz., the Mussalmans of Arabia, Egypt, Syria, Turkey, and Iran, he fails, to see that humanism existing in their midst in any striking form. The European sense of nationalism has cast its snare so powerfully all round that he fears that it may racialize ***even their outlook.***

and soul is the humanism of the Semitic land, standing midway between the East and the West, the humanism which has given to the world a Christ and a Muhammed, a humanism that brushes aside all barriers of colour and race and country that stand in the way of the fullest fellowship between man and man all over the globe.

PRESENT DEPRESSION.

It is under the searchlight of this humanism that he looks at the world and ponders over its problems. The talk of nationality in India seems to him but a hollow talk. The basis for that common moral consciousness which alone could bind a people is absent here, he thinks. India is to him Asia in miniature, a congerie of caste units showing no inclination to remove the divisional basis of their several group-lives and sink their respective individualities in a composite larger whole. He thinks that true democracy cannot thrive on a foundation such as this. The formation of a common moral consciousness calling for social equality which is the essence of a nations; demands a price, which Iqbal thinks, the people of India are not, at this moment, prepared to pay.

Under the same searchlight, he looks at Europe, and the sight fills him with grief. Says he in the '***Khizr-i-Rah***'.

"The democracy of the West is the same old organ,
Which strikes the selfsame note of Imperialism;
That which thou regard'st as the fairy Queen of Freedom.
In reality is the demon of autocracy clothed in the garb of democracy.
Legislature, reforms, concessions and rights

And to me, at every stage of his poetic growth, he has appealed pre-eminently as a humanist. Humanism serves as a perennial background to all his utterance. Sometimes it is so pointedly in the fore-ground that it will be sheer unkindness not to recognise it as the mainspring of his genius. If, as in the spiritual vision of his ***Jawidnama***, India interests him, if it pleases or displeases him in this or that aspect of its life, it is because he allows himself to react to it as a humanist; if he feels distressed over the present day condition of the Muslims all over the world, it is his humanism that feels afflicted; if Europe to-day looks to him a wilderness of aggressively selfish nationalities, it is the humanism in him that revolts.

Iqbal stands for all that is beautiful in life and holy and of good report: and he is anxious to see the world fashion itself out under its living inspiration. He wants to see human life take a stand on its own human dignity, and set itself free from narrow tribal, racial, class or territorial temptations, and evolve a brotherhood extending to the ends of the earth which howsoever distributed into groups by the exigencies of time and space should hold together a common moral conciousness, and be linked to each other by the ties of common humanity. That is the order that he would like to see established on earth and to which he has dedicated all his Muse.

Iqbal's humanism is a matter of conviction to him. As a student of world history he has been inspired by humanistic movements throughout the ages. His writings reveal the influences of the classic humanism of the West, glowing in the course of history into Christian impulses; they reveal also the influences of the humanism of India, and even of ancient Iran. But the humanism that has captured his mind

"THE HUMANIST"

People have called him by all sorts of names. It is so easy to give names—without knowing! Some call him a communalist, a reactionary. Some go a step further and use better language! They say that he started as an Indian nationalist and developed into a pan-Islamist; they even call him a champion of aggressive Islam.

Gentlemen, if you belive me, Iqbal will outlive the momentary use of all these terms, because none of them really reflects the truth about him. As every young man, he at first liked the Immediate. That is the feeling of every one who passes from childhood into adolescence and from adolescence into youth; it is the Immediate that attracts. Knowledge and life are at this stage circumscribed, and one begins to think that the best in life is in himself and in that which he finds near about him, and he idealizes his own home and he fancies that the rest of the world is of no consequence and is necessarily of an inferior order. So has it been with Iqbal. Before he grew into manhood, he sang of India. That was a time when a wave of nationalistic thought was mildly touching the intellectual classes in India; and Iqbal sang of the land of his birth and of the beauty that he fancied it possessed. And then begins his manhood. It opens its eyes in the atmosphere of Europe. The time of manhood is one of experience, of adjustment of values, and this experience he brings with him as he returns home. And then follow reactions to this experience pushing him forward into a state of maturity. If you want to understand Iqbal, you have to bring the whole of his life under review. You cannot cut him into sections and subject him to indifferent evaluation under the stress of unkind political catchwords.

I have tried to understand the mind of this poet and have followed, at times, a very searching line of analysis.

day. Only recently, I had occasion to dwell with him for a little while under the same roof at Lahore and catch something of his look and listen to something of his plaintive morning note. What is that look like and that note? Try to review his entire poetic output in one quick glance and you can visualize somthing of that look and inwardly listen to something of that note even from here.

The look is that of a political mystic born to poetry. The note is the note of humanism drawing inspiration from the eternal verities of human life. Wearied in body, and weariness reflecting itself from every feature of his countenance, he retains that glance of his eye which has kept him company all through his life, the glance of a political mystic piercing into the dark spots on the life of nations to comprehend a life to come, a life of emancipation for humanity from the self-imposed shackles of social, intellectual, economic and consequent political thraldom. That is the glance of Iqbal. Now note the voice that proceeds from him. A malignant disease of the throat has rendered that voice somewhat hoarse of late; but its hoarseness cannot conceal the sharpness of the painful ring that it strikes echoing all round the disturbance gathering in his soul by the fearful reaction of his external world divided into jarring political creeds, born of narrow racial or territorial nationalism bent, as he thinks, on its own destruction. That glance of his eye and that ring of his morning voice will live in his poetry to warn and inspire the coming generations because the glance is rivetted on the primary weaknesses of human nature, selfishness, and greed, and exploitation of the weak, and because the voice speaks but the truth which alone will save human life, the truth as handed down to him by a successive order of sages and prophets who have worked for the unification of the human race.

mediate interest and I propose to give you only a synopsis of it.

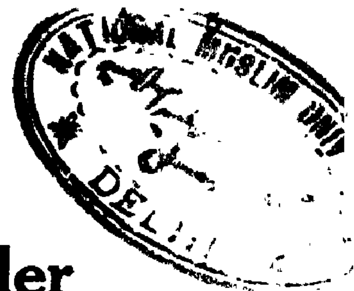
'POLITICAL MYSTICISM'.

I have used the expression 'Political Mysticism' to designate the effect Iqbal has left on me. That expression, I should think, sums up his contribution to world thought at this moment, and I have no doubt in my mind that posterity will judge and remember him by that contribution. It points to an eternal message of life such as has always dwelts in the very soul of nature; and holds out an ideal of corporate life for mankind such as is so sorely missed at this hour every where.

I know, in this great gathering there must be scores of men and women, who have read the poems of Iqbal times out of number and they will bear me out that the poet is spiritually averse to speaking out his mind in clear matter of fact language. In the ***Jawidnama*** he himself confesses:

> This artifice of words is of no avail;
> It does not at all express what my heart contains.
> I have disclosed many a secret;
> But one there is which words never sustain,
> The more I speak of it, the more intricate it grows.
> The word and its sound drown it into deeper obscurity.
> Catch it from the glance of my eye!
> Catch it from my plaintive mornig note!

So, you and I have to catch the meaning of his painful music, his poetry, from his own look or from the plaintive half suppressed note that goes out from him every morning the moment he opens his eyes to the realities of the opening



Iqbal and World Order

Addressing a distinguished gathering on the Iqbal Day held at Hyderabad-Deccan on the 7th January under the presidency of His Highness the Prince of Berar, Dr. Syed Abdul Latif said:—

Iqbal is not merely a great poet but a great philosopher; and I have wondered whether I could lay emphasis on any one of the two roles more than the other. There was a time when I read his poetry with enthusiasm and tried to catch its strains and follow him into the depths of his feelings or soar with him along the flights of his imagination or fancy. But that was when I could feel poetry for its own sake. As years have advanced, interest in life's poetic expression has had to demand something more than mere aesthetic self-satisfaction. And there have been moments when I have tried to catch the strains of his philosophy as well, and to look at the world, its history, its problems, its very future through the inspirational vision that his philosophy has supplied. That poetry I could still feel to-day and the voice of that philosophy still hear; but sectional approach to him seems for me now well-nigh impossible. The two are so inextricably intermixed that his utterance appears to me neither pure poetry nor pure philosophy. It is a mixture of the two blended into a political mysticism transcending them both. And so, as I look back at this hour on all his poetic achievements and inwardly wade through the entire range of his poetic experience, what picture of a poet does he flash across my mind? What does he stand for through all his utterance? That is the subject of my im-

2. 'The individual composed of contradictory characters like a mythological monster'—that is the object that Pirandello prefers to study.

3. Quotation from Pirandello: 'We are all drops on the brink of the river of life, splashed out of the eternal stream, permanently fixed in death. For a little while the movement of the eternal river continues within each separate drop of water, but soon the movement subsides, the flame cools, the form shrivels, and at length all movement ceases. We have achieved death. That is what we call life?,

Until that hour I knew nothing of Pirandello.

If any reader of this magazine is interested in such coincidences, let him at once get that remarkable book by the aviator J. W. Dunne, called ***An Experiment with Time*** in which the author shows how his dream-images which related to the near future were about equal in number to those which pertained to the immediate past. And why only in dreams? he asks.

E. E. Speight.

More Coincidence

On a morning of Christmas ten years ago, a hundred miles worth of Hyderabad, I wrote the follwing lines.

O, if men only knew how wide the bounds
Of life attain, how vast our liberty,
How far beyond the incarcerating rounds
Of human reason nature makes us free,—
How little way our meagre efforts count
Within the eternal,—but a drop of spray
That threads the sunrays by the ceaseless fount
Of all creation, falls and melts away,—
Then would the soul pass unto revelation
As never dreams of a new birth foretold,
Each heart encountered we should know a nation
Greater than any of the worlds of old,
And on the waves of tumult find our rest,
Safe as the seabird, strengthened for high quest.

The same day I motored back to Hyderabad, passing a along the nineteen miles of new jungle road from Ganpur to Wadiaram, and in the evening I was reading an article by Daniel Rops on Pirandello, in which the following passages occur.

1. It is not two people, but ten, a hundred, a thousand different personalities, that the writers of to-day feel stirring within them.

The postman brings a letter from a friend
Gathering strength in Kashmir; at the end
This piece of information.

'Thanks for you inquiries. My poor wife
Has been bedridden all this year. Her life
Is one long tribulation.

Two days ago there came a wire to say
A baby boy was born; So any way
Four sons willl gather round me.

Four sons are mine; it makes me feel so old
And yet I am so young.' What he had told
So simply did astound me.

What could they mean, those things that in one hour
Invaded me, compelling with such power
The secret springs of wonder?

Had they been five or seven in a trice,
No miracle. But four things falling thrice
Is a new kind of thunder.

E. E. Speight.



Coincidences

What can they mean, these mystic answerings
Of circumstance,—there strangely congruous things
That seem so accidental?

Julian Huxley, entertainingly,
Declares the steps of evolution three,
Material, vital, mental.

But my rebellious thought insists on four,
Matter, then life, then mind, and still one more,
Soul, with its dream of Heaven.

And yet I feel such symmetry is wrong,
Too squarely tower-like to stand for long;
There should be five or seven.

Idly I turn the pages of a book
And am arrested; pityingly I look
On words that throb with sorrow.

'A mother had four sons who went to fight
On different fronts, and all were shot one night
And died before the morrow.'

The selfsame day the selfsame anguish wrings
Her lonely heart four times; four times the wings
Of death above her hover.

And yet they pass, leaving her worse than dead,
Stricken with pain of life, uncomforted,
And never to recover.

the dormant spirit of Indian Muslims than has been generally recognised. Dr. Iqbal is a poet with a mission and he has infused a dynamic energy into the hearts of the Muslims of India. May he be spared long to serve the cause he so dearly cherishes !

Before concluding we offer our hearty thanks to all the contributors of this issue, and especially to the past students of this university. We hope that more will come forward with original and intresting articles for the next number so that the English section may really be representative. All articles are welcome. They should normally be of a journalistic nature and limited to about a thousand words. It will greatly assist in the production of the magazine if the contributions are ***type written on one side of the paper only***.

EDITOR.

Hyderabad Civil Service.

We were sorry to learn the results of the recent Civil Service examination. We should like to see greater facilities for coaching for the examination and hope that candidates from this university will meet with better success next year. In connection with employment in the public services generally, we are grateful to our Chancellor for his promise to see that Osmania graduates are fairly treated in the matter of appointments. We attach great importance promise and wish to make it clear that we do not ask for preferential treatment but for equality only.

The Hostels.

We feel very happy to see our esteemed Pro-Vice-Chancellor, accompanied by the professors, paying occasional visits to the dining hall and thus giving the students an opportunity to come into contact with him.

In this connection we may be permitted to say that we feel the need of a provost, or some similar official so that all the hostel functions and activities may be made unified under his guidance.

Contributors to the present Number.

Our ex-adviser to the English section, Professor E. E. Speight, at our request has kindly contributed two poems for the current issue, for which we offer him our sincere thanks.

Our thanks are also due to Dr. A. Latif, formerly Professor of English, for the article which he has contributed on "Iqbal and World Order" which was read in the Town Hall at the occasion of the "Iqbal day" under the presidentship of Prince Walla Shan Nawab Azam Jah Bahadur. "The Iqbal day" was a gracious tribute paid to the world renowned poet, Dr. Iqbal, who has done more to awaken

Editorial.

It is difficult for the editor of a College Magazine to collect articles for issue within a prescribed time especially when the examination is fast approaching. Thanks to the co-operation that was extended to us by all we could collect a fairly good number of articles for the present issue.

The Union.

For the first time in the history of our union, due to some slight misunderstanding, an attempt was made to move a vote of No Confidence in the present ministry, by some members of the cabinet who subsequently resigned. After many efforts and considerable disorder the movers withdrew the motion. We sincerely sympathise with the members who resigned and congratulate the ministry on the success which it achieved at this critical juncture.

Sports.

It is a pity that the standard of sports is day by day going down, and we request the authorities to take immediate action to stop this tendency. Some suggestions may not be out of place. The captains may be made members of games committees, so that they may explain their requirements and propose beneficial measures. Facilities might be given to the day students and some concessions with regard to attendance might be shown to sportsmen. We feel that such measures would have a good effect.



Mr. Mohamed Bin Omar

B. A. (Osmania)
President, Osmania University
Student's Union.

THE
OSMANIA MAGAZINE

BEING

THE JOURNAL OF THE STUDENTS

OF

The Osmania University

HYDERABAD-DECCAN.



EDITOR

M. A. JABBAR, B.A., (Osman)

JOINT EDITOR

PADMANABH, B.Sc., (Osman)

Vol. XI 1938 Nos. 1 & 2



Printed at
THE OSMANIA PRINTING WORKS,
87-E & 87-F Kingsway, Sec'bad.

The Osmania Magazine

Vol. XI Nos. 1 & 2

Annual Subscription.

		Rs.
From	Government	12
,,	Universities, other Institutions and State Officials ..	8
,,	General Subscribers	6
,,	Old Boys, Aided Societies and Reading Rooms ..	5
,,	Present Students, Osmania University ..	4
,,	Abroad	Fifteeen Shillings.
,,	Old Students, Abroad ..	Ten Shillings.
,,	Single Copy	Two Rupees.

Note:—Registrations and V.P.P. Charges Extra.

Can be had of :

OSMANIA MAGAZINE OFFICE,
OSMANIA UNIVERSITY.
HYDERABAD-DECCAN.

CONTENTS.

The Osmania Magazine

Vol. XI Nos. 1 & 2

Annual Subscription.

	Rs.
From Government	12
,, Universities, other Institutions and State Officials ..	8
,, General Subscribers	6
,, Old Boys, Aided Societies and Reading Rooms ..	5
,, Present Students, Osmania University ..	4
,, Abroad	Fifteeen Shillings.
,, Old Students, Abroad ..	Ten Shillings.
,, Single Copy	Two Rupees.

Note:—Registrations and V.P.P. Charges Extra.

Can be had of :

OSMANIA MAGAZINE OFFICE,
OSMANIA UNIVERSITY.
HYDERABAD-DECCAN.

THE
OSMANIA MAGAZINE

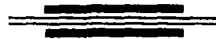
BEING

THE JOURNAL OF THE STUDENTS

OF

The Osmania University

HYDERABAD-DECCAN.





EDITOR

M. A. JABBAR, B.A., (Osman)

JOINT EDITOR

PADMANABH, B.Sc., (Osman)

Vol. XI 1938 Nos. 1 & 2



Printed at

THE OSMANIA PRINTING WORKS,

87-E & 87-F Kingsway, Sec'bad.

مجلّۂ عثمانیہ

طلبۂ جامعۂ عثمانیہ حیدرآباد دکن کا سہ ماہی رسالہ

مدیر:۔ محمد فضل الدین

بی۔ اے (عثمانیہ)

مطبوعہ شمس المطابع مشین پریس نظام شاہی روڈ حیدرآباد دکن

مجلس انتظامی

جلد (۱۱) — سال تعلیمی ۱۳۴۶-۴۷ف — شمارہ ۳ اور ۴

صدر

قاضی محمد حسین صاحب

ایم۔ اے۔ ال ال بی (کینٹب)، نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

مشیران حصہ اردو

ڈاکٹر مولوی عبد الحق بی۔ اے (علیگ) ڈی لٹ
پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ام۔ اے پی ایچ۔ ڈی (لندن)
مددگار پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ

مشیر حصہ انگریزی

مسٹر ایف۔ جے۔ اے ہارڈنگ ام۔ اے (آکسن) پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ

خازن اعزازی

مولوی وحید الرحمن صاحب بی۔ ایس سی پروفیسر طبیعیات جامعہ عثمانیہ

معتمد

محمد عبد الجبار صاحب بی۔ اے، ال۔ بی (عثمانیہ) مہتمم مدیر، مدیر حصہ انگریزی مجلہ عثمانیہ

اراکین

محمد بن عمر صاحب بی۔ اے صدر انجمن اتحاد

محمد فضل الدین صاحب بی۔ اے مدیر حصہ اردو

مسٹر مدپنابھ نائب مدیر حصہ انگریزی متعلم ام۔ ایس سی (آخری)



مجلۂ عثمانیہ

جلد (۱۱)، شمارہ (۳) اور (۴)

مجلس مشاورت

صدر

قاضی محمد حسین صاحب

ایم۔اے۔ ال ال۔بی (کینٹب)

نائب معین امیر جامعہ عثمانیہ

مشیران حصۂ اردو

ڈاکٹر مولوی عبدالحق بی۔اے (علیگ)، ڈی لٹ پروفیسر اُردو جامعہ عثمانیہ

ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور ایم۔اے۔ پی ایچ ڈی (لندن) مددگار پروفیسر اردو جامعہ ع

مشیر حصۂ انگریزی

مسٹر ایف۔ جے۔ اے ہارڈنگ ام۔اے (آکسن) پروفیسر انگریزی جامعہ عثمانیہ

خازن اعزازی

مولوی وحید الرحمن صاحب بی۔ایس سی پروفیسر طبیعیات

چندہ سالانہ پیشگی

(۱) سرکار آصفیہ و برطانیہ سے	۱۲ عہ روپیہ
(۲) ارباب جامعۂ اصحاب مقتدر اور اداروں سے	شہ ″
(۳) عام خریداروں سے	۶ ″
(۴) طلبائے قدیم" رفاہیہ انجمنوں اور دار المطالعوں سے	صہ ″
(۵) طلبائے جامعہ عثمانیہ سے	للعہ ۳ ″
(۶) ممالک بیرون ہند سے	۱۵ شلنگ
(۷) بلاد یورپ کے طلبائے قدیم جامعہ عثمانیہ سے	۱۰ شلنگ
(۸) فی رسالہ	عاں روپیہ

ملنے کا پتہ

دفتر "مجلہ عثمانیہ" جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن

فہرست مضامین مجلۂ عثمانیہ

جلد (۱۱) شمارہ ۳ و ۴

آہ اقبال!

اقبال کی موت ہندوستان اورخصوصاً مسلمانانِ ہند کے لئے ایک سانحہ عظیم ہے۔ اس نقصان کی تلافی پوری ہوتی نظر نہیں آتی۔ ایسا شاعر جس کو تلمیذالرحمٰن کہا جائے اور جس کی شاعری جزءے پیغمبری تصور ہوتی ہو صدیوں میں کہیں پیدا ہوتا ہے۔

دنیائے اسلام میں دو شاعر ایسے پیدا ہوئے جنھوں نے اپنی شاعری سے حقیقی کام لیا جن کی شاعری نے جذبات سے افسردگی، خیالات سے جمود اور زیست سے خوابیدگی دور کر کے عمل، جوش اور احساس خودی کے جذبات پیدا کر دیئے۔ جلال الدین رومیؒ اور شیخ محمد اقبال دنیائے ادب کی وہ زندہ جاوید یادگاریں ہیں جن پر اسلامی دنیا ہمیشہ ہمیشہ کے لئے فخر کرتی رہے گی۔

اس شخص کا پیغام جو یہ کہتا ہوا جان دے کہ "مسلمان کی نشانی یہ ہے کہ موت آئے تو اسے مسکراتا دیکھے" دلوں سے کبھی نہیں بھلایا جا سکتا اور ایسی موت جو دوسروں کو زندہ کر دے فنا سے تعبیر نہیں کی جا سکتی بلکہ وہ دنیا میں ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور یہی وہ بقائے دوام ہے جس کے لئے لاکھوں جتن کئے جاتے ہیں لیکن میسر نہیں آتی۔

اقبال اس اطمینان سے دنیا سے گزر گئے "جیسے کوئی ایک کام ختم کر کے دوسری جگہ جاتا ہے" اب یہ ہمارا کام کہ اس شمع کو فروزاں رکھیں جسے اقبال نے ہمارے سپرد کیا ہے۔ اگر

یہ کام واقعی ہم سے ہو سکا تو گویا ہم نے اقبال کی ایسی خدمت کی جس کی ایک پیشوا اپنی قوم سے توقع رکھتا ہے۔

اُردو شاعری جس کا خود اقبال نے اس طرح ماتم کیا تھا۔

گیسوے اُردو ابھی منت پذیر شانہ ہے

انھیں کے ہاتھوں بڑی حد تک سنور چکی ہے، اس وقت اُردو ادب میں ایسے سینکڑوں الفاظ ترکیبیں اور بندشیں ہیں جو سب کی سب اقبال کی رہین منت ہیں یہ اقبال ہی کی شاعری تھی جو وطن اور جغرافی حدود سے بلند ہو کر انسانوں کو ایسے منظر پر پہونچا دیا جہاں قومی اور ملی مسایل بالکل نئی روشنی میں دیکھے جانے لگے۔

اقبال کے شعر و فکر کی دنیا میں ایسے بے شمار خیالات ہیں جو ایک مردہ اور مفلوج قوم کو حیات تازہ بخش سکتے ہیں اردو شاعری میں ان کی جگہ اس ممتاز صف میں ہے جہاں میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، انیسؔ اور حالیؔ صف آرا ہیں، ممکن ہے زبان اور قدیم فن شعر کے لحاظ سے میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، انیسؔ اور حالیؔ کو اقبال پر ترجیح حاصل ہو لیکن افکار تخیل، ندرت بیان، پیغام بری اور فلسفیانہ بلند پروازی کے لحاظ سے وہ ان سب سے آگے ہیں، ان کی شاعری زندگی ہے اس لئے وہ اس وقت تک زندہ رہے گی جب تک کہ اس دنیائے آب و گل میں حیات کے آثار پائے جائیں گے۔

محمد افضل الدین

عرضِ حال

"ہوئی تاخیر تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا"

مجلے کے متعلق ہمیشہ یہ اعتراض ہوتا رہا کہ وقت پر اس کی اشاعت نہیں ہوتی، اور مدیر کو اس کے لئے احباب اور برادران جامعہ کی سخت سست باتیں سننی پڑتی ہیں۔ پھر میں اس روایتی تلخ نوائی سے کیسے بچ سکتا تھا! لیکن میری سمجھ میں نہیں آتا اس میں بے چارے مدیر کی کیا خطا ہوتی ہے؟ وہ ہر ایک کے سامنے مضامین، افسانوں اور نظموں کے لئے دست سوال پھیلاتا ہے کوئی تو صرف مسکرا کر خاموش ہو جاتا ہے، کوئی صاحب نہایت انکسار کے ساتھ انکار کر دیتے ہیں، کوئی عدیم الفرصتی کا عذر پیش کرتا ہے اور اکثر احباب وعدے کرتے ہیں لیکن ہماری کوتاہی قسمت کو کیا کیجئے وہ کبھی ایفا نہیں ہوتے۔

برادران جامعہ اس بارے میں دلچسپی لیں تو مجلے کی بروقت اشاعت کا خاطر خواہ انتظام ہو سکتا ہے۔

تماشائے اہلِ کرم"

اس سے زیادہ خطرناک منزل تو وہ ہوتی ہے جب مضامین، مقالے، افسانے، نظمیں، ترکیب بند

مرثیے اور غزلیں غرض سبھی ہوتے ہیں لیکن ان کے ساتھ مضمون نگار بھی تشریف لاتے ہیں اور ہر ایک کی یہی خواہش ہوتی ہے کہ مضمون ضرور شائع ہو کیوں کہ مضمون بڑی محنت سے تیار ہوا ہے اور بہت دلچسپ بھی ہے !" اور پھر یہ کیا کم احسان ہے کہ ہمارے تقاضوں پر اور صرف ہمارے ہی لئے لکھا گیا ہے ۔

میرے ایک نازک اندام دوست خاص انداز میں مسکراتے ہوئے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے "لیجئے مضمون حاضر ہے ،" اُف وہ بڑی محنت اُٹھانی پڑی ! اس میں سب بزرگواروں کا ذکر ہے نہایت ظریفانہ انداز میں ان کی زندگی پر روشنی ڈالی ہے ، دل کھول کر تعریف کی ہے ، اصل بات یہ ہے ان لوگوں کو منظر عام پر لانا ہے اشتہا دینا ہی پڑتا ہے ...... ہاں ہاں .... صاحب سے مشورہ کر چکا ہوں بہت محظوظ ہوئے" اب وہ مجھ سے اس وجہ سے برہم ہیں کہ اُن کا مضمون جس کو وہ "انشائے عالیہ کا بے بدل نمونہ" تصور کرتے تھے شایع نہ ہو سکا ذرا انصاف کیجئے اس قسم کے تقاضوں کا کیا حل ہو سکتا ہے ؛ مضامین دیکھنے سے پیشتر اشاعت کے وعدے لئے جاتے ہیں خاموش رہئے تو برہم ہو جاتے ہیں اور وعدہ کر لیجے لیکن پورا نہ ہو سکے تو سبھوں کے نزدیک گنہ گار میں اپنے اُن تمام دوستوں سے معافی کا خواست گار ہوں جن کے مضمون شائع نہ ہو سکے ۔

"سخنے چند"

چند باتیں زیر نظر مجلے کے متعلق کہنی ہیں ۔

مضامین کی ترتیب جس طرح میں چاہتا تھا نہ ہو سکی اس کی بڑی وجہ برادران جامعہ کا تساہل ہے اچھے مضمون بڑی دیر میں وصول ہوتے تھے اور اشاعت کی جلدی میں اُنھیں پریس بھیج دینا پڑتا تھا ۔ ایسی حالت میں کیا خاک ترتیب کا لحاظ ہو سکتا تھا ، وقت پر سب مضامین اکٹھے جمع ہو جائیں تو پھر وہ ترتیب بھی دیئے جا سکتے ہیں ۔

اس مرتبہ مجھے تنہا مجلے کا کام سنبھالنا پڑا کوئی شریک نہ تھا کہ میرے بوجھ کو ہلکا کرتا ۔ مضامین کا وصول کرنا ان کی اصلاح ، کاپیوں اور پروفوں کا دیکھنا نہایت تکلیف دہ کام ہے ۔ مضمون نگار رسم الخط کی طرف بہت کم توجہ کرتے ہیں ۔ اُردو رسم الخط یوں ہی بہت پیچیدہ ہے چنانچہ اس کوتاہی کو مخالفین اُردو بڑے شد و مد سے پیش کرتے ہیں ، اس پر مضمون نگاروں کا عدم التفات ذرا قابل غور ہے !

میرے لئے سب سے زیادہ مشکل کام زیرِ نظر مجلے کے مضامین پر تبصرہ کرنا ہے۔ پہلے تو یہ خیال ہوا کہ ان مضامین کے متعلق کچھ نہ لکھوں کیوں کہ محاسن کے ساتھ ساتھ بعض جگہ معایب بھی ہیں، لیکن کوتاہیوں کا اعتراف نہ کرنا ضمیر فروشی ہے۔ اس لئے میں نے یہی مناسب سمجھا کہ محاسن کے ساتھ ساتھ معایب کا بھی اعتراف کردوں۔

صفحہ (۱) پر جناب خلیفہ عبدالحکیم صاحب کی نظم ہے اور یہیں سے گویا مجلے کے مضامین کی ابتدا ہوتی ہے۔ میں اس کو اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ اس مرتبہ ڈاکٹر صاحب نے مجلے پر غیر معمولی عنایت کی، نظم کے علاوہ صاحب موصوف کا ایک مضمون بھی ہے۔ یہ نظم اقبال کے مرگ بے ہنگام کا مرثیہ ہے، ڈاکٹر صاحب کو اقبال کی زندگی کا مطالعہ کرنے اور ان کے فلسفے کو سمجھنے کے متعدد مواقع حاصل ہوئے، یہی وجہ ہے کہ نظم اور مضمون دونوں میں اقبال کی حیات کا مکمل خاکہ موجود ہے۔ مجلے کی اشاعت سے پیشتر ہی یہ نظم کتاب کی شکل میں طبع ہو چکی تھی لیکن برادرانِ جامعہ کے اصرار پر اس کو پھر مجلے میں شائع کیا جا رہا ہے۔

"حیدرآباد کی آبادی کے چند مسایل" کے عنوان سے سبزواری صاحب کا مضمون شائع ہو رہا ہے۔ یہ مضمون نہایت تحقیقی ہے۔ بڑی محنت اور تلاش سے مضمون تیار کیا گیا ہے، زبان سلیس اور طریقۂ بیان دل چسپ ہے۔ سبزواری صاحب ہماری جامعہ کے اچھے اہل قلم حضرات میں سے ہیں معاشی مسایل پر اکثر آپ کے تحقیقی مضامین شائع ہوتے ہیں۔ خدا کرے آپ کا یہ ذوق نام و نمود کی آلودگی سے پاک رہے اور تصنیفات کے خبط میں آپ اپنی راہ گم نہ کریں

ظہیرالدین صاحب رونق کا افسانہ "موت سے جنگ" واقعی تعریف کا مستحق ہے، عموماً ہمیں جو افسانے بھول ہوئے ان کا خلاصہ یہ تھا:-

> "ایک نوجوان کا کہیں اتفاقاً یا راستے میں کسی مہ جبین (اور عموماً کنواری) کا دیکھ لینا، دونوں کا بے ہوش ہو کر گرتے گرتے رہ جانا یا بعض وقت گر پڑنا، بہ یک وقت دونوں کے سر پر عشق کا جنون سوار ہونا۔ ادھر احباب کی تسلیاں اور طعنے، ادھر ہمجولیوں کی غم خواری اور چہل، پھر کسی بڑھیا کی پیغام رسانی پر آمادگی، کبھی کبھی پوشیدہ ملاقاتیں کبھی صرف وعدے ہی وعدے اشک باری اور ہجر کی کلفتیں، پھر غیبی امداد اور شادی ورنہ خودکشی اور خانہ بربادی۔

غرض اسی قسم کے بہت سے افسانے وصول ہوئے اور ہمیں اُنھیں مجبوراً واپس کر دینا پڑا۔ ظہیر صاحب کی یہ اولین کوشش ہر طرح قابل ستایش ہے، زبان کو سادہ اور گفتگو کو تصنع سے دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے پلاٹ خاصہ دل چسپ ہے۔ ہمیں اُمید ہے کہ برادران جامعہ اس قسم کے افسانوں کی طرف توجہ کریں گے۔ ظہیر صاحب سے اتنی عرض ہے کہ دوسرے نومشق نوجوانوں کی طرح "مجموعہ" کی اشاعت کا خیال نہ باندھیں۔

"تویاما"، اوج صاحب کی زود ترجمہ نگاری کا نتیجہ ہے۔ اس مضمون میں آپ ایک ایسی عجیب وغریب ہستی سے روشناس ہوں گے جس نے جاپان کی تعمیر جدید میں بڑا اعلیٰ حصہ لیا، مضمون معلومات آفریں ہے۔

"یاد" مظفر صاحب کی نظم ہے، یہ ایک نومشق اور نوجوان شاعر ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ تکمیل وزن کے لئے اکثر الفاظ بھرتی کے ہیں۔ اگر کوتاہیوں کی طرف نظر رہے تو بہت کچھ اصلاح کی اُمید ہے۔

"سرگذشت شاعر"، ایک نہایت ہی کم سن شاعر کی نظم ہے، یہ نوعمر شاعر جماعت مڈل میں تعلیم پا رہا ہے۔ اس لحاظ سے اگر نظم کا مطالعہ کیا جائے تو داد وتحسین کی مستحق ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کی طبیعت دقت پسند ہے یہی وجہ ہے کہ ترکیبیں پیچیدہ ہیں اور زبان سہل نہیں۔ بہر حال کم سن سلیم کی کوشش قابل مبارک باد ہے۔

دیہی بنک Reserve Bank of Indian Agricultural credit Debt کے ایک پمفلٹ کا ترجمہ ہے۔ جو ۱۹۳۷ء میں شائع ہوا تھا، اس کے بعد اب تک کوئی دوسرا پمفلٹ نہیں نکلا۔ اس لحاظ سے اس کو تازہ پمفلٹ کہا جاسکتا ہے، اس کا مقدمہ ہز اکسلنسی جے۔ بی۔ ٹیلر نے لکھا ہے اور بڑی تعریف کی ہے اس مضمون کے مترجم جناب میر حسن صاحب ام، اے مجلے کے مدیر بھی رہ چکے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ترجمہ کی زبان کو بہت سہل بنانے کی کوشش کی گئی ہے لیکن اکثر جگہ ایسی بے ربطی ہے کہ مضمون کا سمجھنا دشوار ہو جاتا ہے اور بعض بعض جگہ اردو کی مروجہ علمی اصطلاحات کی جگہ انگریزی اصطلاحات کا لفظی ترجمہ کر دیا گیا ہے۔

"دوشیزۂ جمال"، عظیم صاحب کے افکار کا نتیجہ ہے۔ کہیں کہیں عریانی اور ابتذال ہے۔

"حیدرآباد کی آبادی کے ذرائع حمل ونقل"، تحقیقی مضمون ہے، معلومات کے لحاظ سے یہ مضمون خاصہ دل چسپ ہے۔

"ہوسٹل"، دکن کے نوعمر مشہور شاعر جناب میکش کی شاعرانہ بلند پروازیوں کی ایک ادنیٰ مثال ہے۔
قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا۔ جناب میکش کی ہستی تعارف کی محتاج نہیں آپ مجلے کے مدیر رہ چکے ہیں اور خیر سے

بھی تو آپ کے کلام کا صرف ایک مجموعہ شائع ہوا ہے۔ اقبال ڈے کے سلسلے میں آپ بمبئی تشریف لے گئے تھے اور وہ پُر مغز مقالہ (جو افسوس ہے کہ آپ بمبئی میں تنگیٔ وقت کی وجہ سے سُنا نہ سکے) رہبرِ دکن کی حالیہ اشاعت میں آپ کی تصویر کے ساتھ چھاپا گیا ہے۔

ہمیں اُمید ہے کہ "گریہ و تبسم" جیسے کئی اور مجموعے شائع ہوں گے، اردو شاعری کو ایسے ہی نوجوان تنا ور وں کی ضرورت ہے۔ اقبال کے بعد ہماری نظریں بار بار میکش کی طرف اُٹھتی ہیں!! ہاں آپ ایک کامیاب اداکار بھی ہیں!

ہم حضرت میکش کی بارگاہ رفعت میں اس نظم کے لئے ہدیۂ تشکر پیش کرتے ہیں۔

"فلسفۂ ابن خلدون" افسوس ہے کہ اس اشاعت میں بھی یہ مضمون پورا نہ ہوسکا وہ تو حضرت حمادی کی مہربانی تھی کہ باوجود مصروفیت کے ہماری درخواست کو درخورِ التفات سمجھا۔ اس تکلیف دہی کے لئے ہم علامہ سے معافی کے خواستگار ہیں لیکن اتنی درخواست ہے کہ آئندہ اشاعت میں یہ مضمون تکمیل کر دیا جائے۔

پہلی دفعہ مجلے میں مسعود الحسن صاحب تابش کی غزل شائع ہو رہی ہے، تابش صاحب مدرسہ فوقانیہ عثمانیہ دارالعلوم کے قدیم طالب علم رہ چکے ہیں، آپ ایک نوعمر مگر کہنہ مشق شاعر ہیں۔ جو کہتے ہیں سمجھ کر کہتے ہیں طبیعت غزل کی طرف زیادہ مائل معلوم ہوتی ہے، آج کل غزل گو اور نظم گو شعرا آپس میں دست و گریباں ہیں، بجائے اس کے کہ بحث پر سنجیدگی سے غور کیا جاتا دونوں فریق انتہا پسندی کی طرف رجوع ہیں ہم اس انتہا پسندی کی مخالفت کرتے ہیں، اصلاح ضرور ہونی چاہئے، مگر اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ غزل کو سرے سے اُردو ادب سے نکال باہر ہی کر دیا جائے۔

تابش صاحب کی غزلیں درد، سوز اور گھلاوٹ لئے ہوتی ہیں اور اس لحاظ سے ان کو فانی اسکول کا شاعر کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

وارثی صاحب کا مضمون "جدید جاپان" یقیناً بہ غرض طباعت ہی روانہ کیا گیا ہوگا چنانچہ ہم نے یہی خیال کر کے مضمون کو ممکنہ اصلاح کے بعد پریس بھیج دیا لیکن سخت تعجب ہے کہ چند دن ہوئے اس کو ایک مقامی اخبار میں شائع کرایا گیا مضمون نگار صاحب کی یہ جلد بازی کہ جلد سے جلد مضمون شائع ہو جائے کچھ ٹھیک نہیں معلوم ہوتی پھر اس صورت میں جب کہ انھیں اس کا علم ہو چکا تھا کہ مجلے میں اس کی اشاعت ہو رہی ہے۔

مضمون میں اس کا کہیں ذکر نہیں کہ آخر اس کا ماخذ کیا ہے۔ غالباً مواد "ساقی" کے جاپان نمبر سے حاصل کیا گیا ہے۔ اکثر جگہ غیر ضروری تفصیلیں داخل ہوگئی ہیں، مضمون کا عنوان جدید جاپان ہے لیکن عنوان کو مضمون سے کوئی تعلق نہیں

جناب وہاج الدین صاحب شمیم کی نظم "چاندنی رات" بڑی لاجواب نظم ہے، نظم میں غضب کی روانی ہے، تشبیہوں کی نزاکت اور الفاظ کی دروبست اس نظم کی سب سے بڑی خوبی ہے۔ ذیل کے شعر ملاحظہ ہوں ان کی تعریف نہیں ہوسکتی۔

وہ سہانے جھٹ پٹے میں نقرئی کرنوں کے تار — جس طرح ساون کی بدلی میں ہوں بگلوں کی قطار

وہ نکلنا بادلوں سے چاند کا باآب و تاب — جس طرح گھبرا کے کوئی کھول دے بندِ نقاب

خاک پر بکھرے ہوئے کچھ برگ ہائے چاک چاک — انقلابِ زندگی کی داستانِ دردناک

آخری شعر میں زندگی کی بے ثباتی اور انقلاب روزگار کا وہی نقشہ ہے جو نظامی نے دارا کی شکست کے موقع پر کھینچا تھا، دارا جو کیانی سلسلے کا آخری شہنشاہ ہے، جنگ میں زخمی ہو کر نیچے گرا ہے اور سکندر جب اس کے قریب پہونچتا ہے تو کلاہ کیانی کو سرنگوں اور خاک و خون میں آغشتہ دیکھتا ہے۔ دیکھئے اس منظر کو نظامی نے کس انداز میں ادا کیا ہے

بہارِ فریدوں و گلزارِ جم — زبادِ خزاں گشت تاراجِ غم

نسب نامہ دولتِ کیقباد — ورق بر ورق ہر سوئے برد باد

جناب شمیم کی پوری نظم میں ایسی متعدد مرکب تشبیہات ہیں کہ بار بار نظامی کا کلام یاد آتا ہے۔

"رفیقِ شفیق" رسکن کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے، محمود صاحب نے ترجمے کو اس قدر شگفتہ بنا دیا ہے کہ ترجمہ نہیں معلوم ہوتا۔ ترجمے کی زبان اور طرز بیان دونوں قابل ستائش ہیں۔

جامعہ کے ایک اور قدیم طالب علم، مخدوم محی الدین صاحب کی نظم جو بچے کی موت پر لکھی گئی ہے، شائع کی جا رہی ہے۔ اہل ذوق ہی اس نظم کے متعلق کچھ کہہ سکیں گے، مشتے از خروارے، دو شعر ملاحظہ ہوں!

بہاروں کو لوٹانے والی ہوائیں — نہ تیری ہوائیں نہ میری ہوائیں

مرادوں کو برلانے والی دعائیں — نہ تیری دعائیں نہ میری دعائیں

گرما کی چھٹیوں میں اردو مضمون نویسی کے مقابلے کے لئے "اقبال کی خدمات" عنوان تجویز کیا گیا تھا، اس وقت

اقبال بہ قید حیات تھے عنوان کا اعلان کیا گیا لیکن چھٹیوں میں کوئی مضمون وصول نہ ہوا۔ کالج کھلنے کے بعد جناب نائب معین امیر کے مشورے سے حسب ذیل حضرات ممتحن قرار دئے گئے۔

(۱) نواب کیقباد جنگ بہادر

(۲) ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صدر شعبہ فلسفہ

(۳) ڈاکٹر غلام محی الدین قادری زور پروفیسر ادبیات اردو

دوبارہ عنوان کا اعلان کیا گیا اور بڑی مشکل سے صرف (۲) مضمون وصول ہوئے، جامعہ کے اہل قلم حضرات نے اس طرف توجہ نہ کی اور جو مضامین وصول ہوئے ان کو دیکھ کر ہمارے حوصلے پست ہوئے جاتے تھے۔ بہرحال ان مضامین کو ممتحین کے پاس روانہ کر دیا گیا۔

اس کے بعد نائب معین امیر کی مرضی سے ان مضامین کو جناب مولوی عبدالحق صاحب صدر شعبہ اردو کی خدمت میں روانہ کر دیا گیا۔ ممتحین کی رائے میں فخرالحسن صاحب کا مضمون سب سے بہتر خیال کیا گیا اور مقابلے میں اول رہنے اس اشاعت میں یہ مضمون شائع کیا جا رہا ہے۔

محی الدین صاحب دوسرے انعام کے مستحق قرار پائے، صاحب موصوف کا مضمون غالباً مجلے کی آئندہ اشاعت میں شائع ہوگا کیوں کہ ایک ہی عنوان پر دو مضمون پڑھنے والوں کے لئے دوبھر ہو جاتے ہیں اور پھر مضامین اس قدر طویل تھے کہ بہ خوف طوالت ایک ساتھ شائع نہیں کئے گئے۔

میرے خیال میں عنوان کا انتخاب ٹھیک نہیں ہوا۔ "اقبال کی خدمات"، یہ عنوان اس قدر وسیع ہے کہ اس پر مختصر مضمون کا لکھنا ممکن نہ تھا ہاں خدمات کی فہرست ضرور مرتب کی جا سکتی تھی! غالباً یہی وجہ تھی کہ جامعہ کے اچھے لکھنے والوں نے اس کی طرف توجہ نہ کی۔

ہم محترم ممتحین سے تکلیف دہی کی معافی چاہتے ہوئے اظہار سپاس گزاری کرتے ہیں۔

سلیم صاحب کی ادارت میں جو مجلہ شائع ہوا تھا اس پر اکثر اعتراضات ہوئے ہیں لیکن ان کا بیشتر حصہ خرافات سے پر ہے اور بعض پرچوں نے محض اس لئے اعتراض کیا ہے کہ ان پر جو تنقیدیں مجلے میں شائع ہوئی تھیں ان کا لہجہ ذرا

درشت ہوگیا تھا، لیکن بجائے اس کے کہ ان اعتراضات کا جواب دیا جاتا اور کوتاہیوں کی طرف توجہ کی جاتی سلیم صاحب پر شخصی اعتراضات کئے گئے جو اصول تنقید کے بالکل منافی ہے۔

ہمیں اس بارے میں سب سے زیادہ شکایت مجلہ طیلسانین سے ہے، جلد دوم بابتہ ۱۳۴۲ف میں جو اعتراضات مجلہ عثمانیہ پر کئے گئے ہیں وہ حد درجہ افسوس ناک ہیں، تعجب ہے کہ ایسا موقر پرچہ اس قسم کے غلط اعتراضات اور بے تکی باتیں بھی کرسکتا ہے، مجلہ کے معیار پر اعتراض کیا گیا ہے لیکن اپنی چاک دامنی پر نظر نہ پڑی۔ مجلہ طیلسانین کا موجودہ معیار بہت زیادہ اصلاح کا محتاج ہے۔ اس پرچے میں جس قسم کے مضامین اور نظمیں شائع ہوتی ہیں اس سے کوئی شخص یہ اندازہ نہیں لگا سکتا کہ یہ طیلسانین کا مجلہ ہے۔

معلوم ہوتا ہے معترضین اس وجہ سے چراغ پا ہیں کہ مجلۂ زیر بحث کی ابتدا احباب فانی کے کلام سے ہوئی ہر اس قسم کی تنگ نظری اور کور ذوقی کا بھلا کیا جواب ہوسکتا ہے!

آج کل ہمارے جامعہ کے اقامت خانوں کی فضا ذرا مکدر معلوم ہوتی ہے۔ طلبا کے آپس کے اختلافات بہت جلد ختم ہو جانے چاہئیں۔ ارباب جامعہ یقیناً اس کی طرف متوجہ ہوں گے اور ہمیں ارباب جامعہ کی اصابت رائے سے قوی توقع ہے کہ اس کش مکش کا کوئی بہتر حل نکل آئے گا۔

مسابقت کا جذبہ واقعی ستائش کے قابل ہے لیکن مسابقت ایسی نہ ہونی چاہئے کہ تسکر رنجی اور نااتفاقی پر نتیج ہو اور اگر مسابقت میں دولت و امارت کا سوال پیدا ہو جائے تو ایسی مسابقت کا ختم ہوجانا ہی بہتر ہے۔ طلبا برادری میں اس قسم کی تفریق ذہنی پستی کو بے نقاب کرتی ہے۔

بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس سال ہمارے جامعہ نے مختلف کھیلوں میں شان دار کامیابی حاصل کی، فٹ بال اور کرکٹ کے آخری مقابلے ہر اعتبار سے دل چسپ تھے۔

فٹ بال کے آخری مقابلے میں مسٹر مقصود شاہ خاں، مسٹر عبدالکریم اور مسٹر اشرف خاں (کپتان) کا کھیل داد و تحسین کا مستحق تھا، ہم مسٹر اشرف کو اس کامیابی پر مبارک باد دیتے ہیں۔

کرکٹ کا مقابلہ اور پھر نظام کالج سے ــــــ جب کہ یہ حال ہو۔

حیراں ہوں دل کو روؤں کہ پیٹوں جگر کو میں

ذرا مشکل ہی ہوتا ہے۔ شکر ہے اس کٹھن آزمائش میں ہمارے کھلاڑی کام یاب رہے۔ اس دل چسپ مقابلے میں مسٹر محمد حسین، مسٹر عباس حسین، مسٹر جواد حسین، مسٹر قطب اور مسٹر ریاست علی مرزا (کپتان) نے بہترین کھیل کا مظاہرہ کیا۔ اس کام یابی میں سب سے بڑا حصہ مسٹر محمد حسین کا ہے۔ مسٹر جواد کی کام یاب گیند آزادی کی یاد ہمیشہ گوشۂ قلب میں محفوظ رہے گی۔ ہم مسٹر ریاست علی مرزا کو ان کی دانشمندانہ قیادت پر پُر خلوص مبارک باد پیش کرتے ہیں۔

ناشکری ہوگی اگر میں علامہ عبداللہ عمادی، جناب ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، جناب وہاج الدین صاحب شمیم اور جناب عبدالمجید صاحب صدیقی کی عنایات کا اعتراف نہ کروں۔ ان حضرات نے مجلہ کی اشاعت میں بڑی دل چسپی لی ہیں اپنے عزیز دوست ابومحمود صاحب بی۔اے (عثمانیہ) کا بھی دل سے شکر گزار ہوں کہ صاحب موصوف کی امداد اور توجہ ہمیشہ شریک حال رہی

محمد افضل الدین



Mr Davood — Police Constable. Mr N. Hashmi — Postman

Mr G M Omar — Tutor. Mr Babanlal — Make up expert. Mr M S Khan — Arab. Mr S H Razvi — Dallal. Mr Kaleel — Peromushid's Kaliff. Mr Waheed — Frontier's Pathan

Mr M A Taher. Mr S A Waheb. Mr H Rahman. Mr Muteeb. Mr Muktar. Mr. Mazhar. Mr M Ali. Mr. Iqbal. Mr Kurshid

علامہ اقبال

سینہ تھا ترا مشرق و مغرب کا خزینہ ‏ ‏ دل تھا ترا اسرار و معارف کا دفینہ
ہر شعر ترا بامِ ترقی کا ہے زینہ ‏ ‏ مانندِ مہِ نو تھا فلک سیر سفینہ
اس ساز کے پردے میں تھی عرفان کی آواز
کیا عرش سے ٹکرائی ہے انسان کی آواز

ہیچ تلخ تھا لیکن اسے شیریں کیا تونے ‏ ‏ تلخابۂ غم کو شکر آگیں کیا تونے
تعلیم خودی دے کے خدا بیں کیا تونے ‏ ‏ کنجشکِ فرو مایہ کو شاہیں کیا تونے
پر ٹوٹے تھے جن کے انھیں پرواز عطا کی
گونگے تھے جو انساں انھیں آواز عطا کی

دل تیرا مئے عشق سے لبریز تھا ساقی
اور درد کی لذت سے طرب خیز تھا ساقی
قطرہ تری مے کا شرر انگیز تھا ساقی
ساغر ترا گل بیز و گہر ریز تھا ساقی

تف مے پہ جو سنبھلے ہوئے انساں کو گرا لے
وہ مے تھی ترے خم میں جو گرتوں کو سنبھالے

وہ عشق جو انسان کی ہمت کو ابھارے
وہ عشق جو دنیا میں بگڑتے کو سنوارے
جس عشق سے اغیار بھی بن جاتے ہیں پیارے
جس عشق کے اشکوں سے فلک پر بنے تارے

وہ عشق تھا تیرے دل و جاں میں گئے پے میں
جس طرح نشہ مے میں ہے اور نغمہ ہے نے میں

منزل ہی نہیں جس کی کہیں پر وہ ترا شوق
سیارۂ گردوں کو نہ ہے تحت نہ ہے فوق
آزادیٔ انساں کا ترے دل میں تھا کیا ذوق
زنجیر علائق نہ تو ہے رسم کا کوئی طوق

وہ بحر تفکر کہ نہیں جس کا کنارا
سیلاب نہیں ڈھونڈتا ساحل کا سہارا

حکمت ہمیں دی شعر کی صہبا میں ڈبو کر
حق پیش کیا سوز نہانی میں سمو کر
جس نخل کا دنیا میں گیا بیج تو بو کر
اک روز رہے گا وہ فلک بوس ہی ہو کر

رس عشق کا اس نخل کی رگ رگ میں چلے گا
ہر سمت میں وہ پھولے گا پھیلے گا پھلے گا

سمجھایا ہمیں، کیا ہے بری چیز غلامی ہے جس سے زبوں ہو کوئی گمنام کہ نامی
محکوم ہے تو، تو تری فطرت کی ہے خامی آزادیٔ افکار سے انساں ہے گرامی

آزاد ہی دنیا میں ہے اللہ کا شہکار
ہر بندۂ آزاد ہے تقدیر کا معمار

ہندی تھے غلامی کے نشے میں سبھی مدہوش تھے سر پہ رکھے فخر سے اغیار کی پاپوش
جیوانوں کا مقصد تھا فقط خواب و خور و نوش بے عزت و بے غیرت و بے ہمت و بے جوش

رسوائی میں جو مست تھے ہشیار ہوئے ہیں
صدیوں سے جو سوتے تھے وہ بیدار ہوئے ہیں

ڈھانچا جو غلط تھا تہ و بالا کیا تو نے دنیا کے اندھیرے میں اجالا کیا تو نے
اس قوم میں کیا کام نرالا کیا تو نے منہ جھوٹ کا اور مکر کا کالا کیا تو نے

تہذیب و سیاست کی طلسمات کو توڑا
سچائی سے ہر جھوٹی کرامات کو توڑا

اقبالؔ! تو پیغامبرِ عشق و عمل ہے ‌ ‌ ‌ انساں کی ترقی کا یہ قانون اٹل ہے
یہ نغمۂ جاوید ہے یہ سازِ ازل ہے ‌ ‌ ‌ ہاں زیست کی مشکل کا فقط ایک ہی حل ہے

جاں صرفِ عمل اور ہو دل عشق سے لبریز
اُٹھتا ہے یونہی جادۂ ہستی میں قدم تیز

عاقل تھا مگر عقل کے پیچاک سے آزاد ‌ ‌ ‌ اور حکمتِ افرنگ کے فتراک سے آزاد
دُنیا میں تھا دُنیا کے غم و باک سے آزاد ‌ ‌ ‌ خاکی تو وہ بے شک تھا مگر خاک سے آزاد

ہے دِل کی جگہ دُور کہیں ارض و سما سے
ہوتا ہے جہاں بندہ ہم آغوش خُدا سے

ہادی ہو وہ، انساں کو جو آگے کو بڑھادے ‌ ‌ ‌ تاریکی میں انسان کے ہاتھوں میں دِیا دے
جو عقل پہ پردے ہیں پڑے اُن کو ہٹا دے ‌ ‌ ‌ صیقل کرے آئینۂ دل اِس کو جِلا دے

ہر قلب کو تقدیرِ حقیقی نظر آئے
اور آنکھ کو تصویرِ حقیقی نظر آئے

اقوام ہوں جس بانگ سے بیدار وہ پیغام ‌ ‌ ‌ انساں ہوں مئے عشق سے سرشار وہ پیغام
ہو بارِ امانت سے گراں بار وہ پیغام ‌ ‌ ‌ ہر رُوح حقیقت سے ہو دوچار وہ پیغام

وہ جوش کہ انسان اُبھر جاتے ہیں جس سے
کھوٹے بھی کھرے بن کے نکھر جاتے ہیں جس سے

کہتے ہیں سخنور کہ تھا شاہِ سخن اقبال — ظاہر میں فقط شعر میں تھا اہلِ فن اقبال
ہے اصل حقیقت یہ کہ تھا بُت شکن اقبال — مولا کو وطن کہتا تھا یہ بے وطن اقبال

اس جسم میں تھا رُوح کی معراج کا طالب
انساں کے لئے دل کے سوا راج کا طالب

عارف کی نظر اپنے وطن تک نہیں محدُود — کیوں اس کی نظر ہو در و دیوار میں مسدُود
گو حُبِّ وطن اس میں تھی اک جذبۂ محمُود — اقبال نے دھرتی کو بنایا نہیں معبُود

خاکی جو نہیں کرتا ہے افلاک کی پُوجا
کس طرح سے کرسکتا ہے وہ خاک کی پُوجا

عارف کی نظر گاہ، وہی اِس کا وطن ہے — پُورب ہے نہ پچھّم ہے نہ اُتّر نہ دکن ہے
ندی کوئی اس میں ہے نہ پربت ہے نہ بن ہے — نَے دیر و حرم کی کوئی تعمیرِ کہن ہے

نے شرق کا گرویدہ نہ افرنگ کا عاشق
کس طرح سے ہو وہ جمن و گنگ کا عاشق

کم کوئی ہے اس غمکدۂ دہر میں آیا　　جس نے وطن اپنا دلِ انساں میں بنایا
انساں کی توقیر کا وہ راگ ہے گایا　　موسیقیٔ جاں بن کے جو جانوں میں سمایا
یہ راگ ہے وہ کون و مکاں ساز ہے جس کا
روحوں میں نہاں اور عیاں راز ہے جس کا

تو شیخ سے بیزار برہمن سے بھی بیزار　　نے اس کا پرستار نہ تو اس کا گرفتار
دولت کا نہ سکار اور نہ سیاست کا گنہگار　　افکار سے مستقبلِ اقوام کا معمار
جن ابلہ فریبوں میں ہے مُکتی کا اجارہ
تعلیم سے تیری ہے بہت ان کو خسارہ

ہر شعر سے اُٹھتا ہے صدا نعرۂ تکبیر　　خوں تیری سیاہی ہے قلم تیری ہے شمشیر
اشعار ترے کاتبِ تقدیر کی تحریر　　آئینہ بکف جس میں ہے اقوام کی تقدیر
مضراب ترے شعر ہیں انساں کا دل، ساز
فطرت ترے نغموں پہ رہی گوش بر آواز

یہ شعر ہے، کہتے ہیں جسے جزوِ نبوت　　یہ شعر ہے شاگردیٔ رحمٰن کی آیت
یہ شعر بدل دیتا ہے انساں کی حالت　　اس شعر میں ہے عالمِ لاہوت کی دولت

یہ شعر حقیقت میں ہے پروردۂ الہام
نعمت ہے بہت خاص مگر فیض بہت عام

جس کا ہو کلام ایسا، کلیم اِس کو ہیں کہتے
حکمت سے ہو لبریز، حکیم اس کو ہیں کہتے
افکار کی جنّت ہی، نعیم اِس کو ہیں کہتے
اے ضیاؔ دلِ طبع سلیم اس کو ہیں کہتے

انسان ہے اللہ کا معشوق اِسی سے
خاکی، یہ ہوا اشرفِ مخلوق اِسی سے

اقبالؔ کے ہیں شعر، سخنداں کی زباں پر
اقبالؔ کے اقوال ہوئے نقش ہیں جاں پر
اقبالؔ کے ہیں تیر سیاست کی کماں پر
تیغوں کو جِلا دیتے ہیں اِس سنگِ فساں پر

اقبالؔ نے رنگ اپنا ادیبوں پہ چڑھایا
رنگ اپنی خطابت کا خطیبوں پہ چڑھایا

اب دل میں، ہی ہر ایک کے پیدا وہی انداز
اب قوم کی آواز بنی ہے تری آواز
الفاظ میں تیرے ہے کوئی سحر کہ اعجاز
بجتا ہے ہر اک رنگ کی محفل میں وہی ساز

اشعار ترے پیر و جواں سب کو ہیں ازبر
محفل کی ہیں رونق تو کہیں گرمیٔ منبر

تھے صاحبِ دل رومیؔ و عطارؔ و سنائیؔ
تھی جن کی خودی آئینۂ رازِ خدائی
لے عالمِ ارواح کی انساں کو سنائی
کچھ لذتِ وصل اس میں ہے کچھ دردِ جدائی

ایسے ہی فقیروں کا ہم آہنگ تھا اقبالؔ
مردانِ خدادوست کا ہم رنگ تھا اقبالؔ

انساں کا کیا قحط ہے اس دیرِ کہن میں!
قرنوں ہی میں آتا ہے اویس ایک قرن میں
سمجھائے اُنھیں کون جو یاں مست ہیں دھن میں
دولت جو حقیقی ہے وہ انساں کے ہے من میں

اس دولتِ سرمد کا شہنشاہ تھا اقبالؔ
فطرت کی گواہی ہے حق آگاہ تھا اقبالؔ

کام ایسا جو کرتا ہے وہ مرتا نہیں ہرگز
ایسے جو جیے موت سے ڈرتا نہیں ہرگز
دنیا سے گیا، دل سے گزرتا نہیں ہرگز
اس صفحہ سے یہ نقش اُترتا نہیں ہرگز

جب تک کہ دل افروز یہ پیغام ہے باقی
عالم کے جریدے پہ ترا نام ہے باقی

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم
پروفیسر فلسفہ جامعہ عثمانیہ

حیدرآباد کی آبادی کے چند مسائل

ہر ملک میں دولت کی فراوانی اور مرفہ الحالی کا انحصار جن عاملوں پر ہے ان میں سے انسان کو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے۔ کیونکہ وسائل قدرت سے دولت پیدا کرنا اسی کا کام ہے۔ جس ملک میں انسانوں کی تعداد زیادہ ہوگی وہاں اسی نسبت سے دولت پیدا کرنے کے امکانات زیادہ ہوں گے اور مادی نقطۂ نظر سے اس ملک کو مرفہ الحال ہونا چاہئے۔ لیکن دوسری جانب اگر نظر ڈالیں تو پتہ چلتا ہے کہ پیدا شدہ دولت انسانوں ہی میں تقسیم ہوتی ہے۔ اس لئے جس ملک میں انسانوں کی تعداد کم ہوگی اتنا ہی وہاں ہر فرد کے حصے میں دولت زیادہ آئے گی۔ گویا ملک کی مرفہ الحالی کے لئے آبادی کا کم رہنا زیادہ مفید ہے۔

اس بیان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ معاشی نقطۂ نظر سے آبادی کا بڑھنا بھی مفید ہے اور گھٹنا بھی۔ بظاہر یہ دو متضاد باتیں بے معنی سی معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن اگر ہم ذرا غور کریں تو معلوم ہوگا کہ یہ خیال ایسا مہمل نہیں ہے جیسا کہ نظر آتا ہے کیونکہ ہم ان دونوں حیثیتوں پر نظر ڈالتے ہوئے بہ آسانی ایسی صورت حال کا تخیل کر سکتے ہیں جس میں نہ آبادی اتنی زیادہ ہو کہ تقسیم دولت کے نقطۂ نظر سے مضر ثابت ہو اور نہ اس قدر قلیل ہو کہ پیدائش دولت کے نقطۂ نظر سے نقصان دہ ہو۔ ان دونوں متضاد کیفیتوں کے درمیان ایک ایسا نقطہ ہو سکتا ہے

جس پر کسی ملک کی حقیقی ترقی کا انحصار ہو اور اُس سے اضافہ یا تخفیف دونوں مضر ثابت ہوں۔

آبادی کے سلسلے میں ہمیں اپنی تحقیق کا دایرہ صرف انسانوں کی تعداد تک محدود نہ کرلینا چاہئے بلکہ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ آبادی ملک کے کن حصّوں میں گنجان ہے اور کن حصّوں میں کم، آبادی کی صحت کا میعار کیا ہے۔ اکثریت کس میعار پر زندگی بسر کر رہی ہے۔ عمروں کا اوسط کیا ہے، مردوں کی تعداد زیادہ ہے یا عورتوں کی شرح پیدایش اور شرح اموات کا کیا حال ہے، آبادی کن پیشوں میں منقسم ہے، مختلف پیشوں میں اُجرتیں کیا ہیں۔ ان کی تعلیمی حالت کیسی ہے، کارکردگی کا کیا حال ہے، آبادی کا زیادہ حصّہ شہروں میں رہتا ہے یا دیہات میں، آبادی میں اضافہ ہو رہا ہے یا تخفیف، اگر اضافہ ہو رہا ہے تو کیا اس کے ساتھ ساتھ ذرائع معاش میں بھی اسی تناسب سے اضافہ ہو رہا ہے غرض یہ کہ بحیثیت مجموعی ملک ان سب اسباب سے متاثر ہوتا ہے۔ ذیل میں ہم نے حیدرآباد کی آبادی پر ان ہی مختلف پہلوؤں سے روشنی ڈالنے کی کوشش کی ہے۔

ممالک محروسہ سرکار عالی کا رقبہ ۸۲۶۹۸ مربع میل ہے جو صوبہ بنگال کی وسعت کے برابر ہے۔ انگلستان اور ویلز کا رقبہ ممالک محروسہ سرکار عالی کے مساوی ہے۔ سویزرلینڈ کی جمہوری ریاست اس کے پانچویں حصّہ سے بھی چھوٹی ہے۔

ممالک محروسہ سرکار عالی میں سنہ ۱۸۸۱ء سے قبل کوئی باضابطہ طریق مردم شماری رائج نہ تھا۔ پٹیل پٹواری متفرق اوقات میں لوگوں کا شمار کر کے قصبات و مواضعات میں اعداد فراہم کر لیا کرتے تھے۔ سنہ ۱۸۶۷ء میں سر رچرڈ ٹمپل نے اپنی سیاسی ڈایری میں ان اعداد کے شمار کے مطابق کل آبادی کی تعداد ایک کرور تبلائی تھی۔ سنہ ۱۸۸۱ء میں پہلی مرتبہ مردم شماری ہوئی اس کے بعد سے ہر دسویں سال باضابطہ مردم شماری ہونے لگی۔ ملک میں نسبتاً امن وامان کے استحکام، آبپاشی، نقل وحمل کے ذرائع اور شوارع کی ترقی کے ساتھ ساتھ آبادی میں بھی اضافہ ہونے لگا۔ ان جملہ مردم شماریوں کے اعداد ملاحظہ ہوں۔

سنہ ۱۸۸۱ء سے سنہ ۱۹۳۱ء تک ممالک محروسہ کی آبادی

سال	آبادی	فیصد کمی یا بیشی	گنجانیت فی مربع میل
سنہ ۱۸۸۱ء	۹۸ لاکھ سے زائد	.	۱۱۹

سال	آبادی	فیصد کمی یا بیشی	گنجانیت فی مربع میل
سنہ ۱۸۹۱ء	ایک کروڑ ۱۵ لاکھ	+۱۷٫۱	۱۴۰
سنہ ۱۹۰۱ء	ایک کروڑ ۱۱ لاکھ	-۳٫۵	۱۳۵
سنہ ۱۹۱۱ء	ایک کروڑ ۳۳ لاکھ	+۲۰٫۰	۱۶۲
سنہ ۱۹۲۱ء	ایک کروڑ ۲۴ لاکھ	-۶٫۸	۱۵۱
سنہ ۱۹۳۱ء	ایک کروڑ ۴۴ لاکھ	+۱۵٫۸	۱۷۵

ان پنجاہ سالہ اعداد پر نظر ڈالیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۹۱ء میں ۱۷٫۱ فیصد اضافہ ہوا۔ مگر سنہ ۱۹۰۱ء میں ۳٫۵ فیصد کمی ہوئی۔ سنہ ۱۹۱۱ء میں غیر معمولی اضافہ ہوا اور آبادی ۲۰ فی صد بڑھ گئی۔ سنہ ۱۹۲۱ء میں پھر ۶٫۸ فی صد کی تخفیف ہوئی۔ اس دس سال کے عرصے میں آبادی کی تخفیف کے مختلف اسباب تھے مثلاً سنہ ۱۲-۱۹۱۱ء میں طاعون کی گرم بازاری رہی اور صرف بلدہ میں ۱۶ ہزار سے زاید نفوس ہلاک ہوئے سنہ ۱۴-۱۹۱۳ء میں موسم کی خرابی کی وجہ سے بکثرت اموات ہوئیں سنہ ۱۷-۱۹۱۶ء میں طاعون کی شدت رہی اور ۵۰ ہزار کے قریب اموات ہوئیں۔ سنہ ۱۹-۱۹۱۸ء میں انفلوئینزہ کی وبا سے ۳½ لاکھ افراد ہلاک ہوئے۔ سنہ ۲۱-۱۹۲۰ء میں ملیریا۔ طاعون سے بھی زیادہ مہلک ثابت ہوا۔ اور ۸۰ ہزار انسان اس کی نذر ہوئے اس کے علاوہ قحط اور دوسرے معمولی اور موسمی امراض نے بھی شرح پیدائش میں تخفیف کردی مگر سنہ ۳۱-۱۹۲۱ء کے عشرہ میں پھر ۱۵٫۸ فی صد کا اضافہ ہوا اگر ہم اس دس سال کے عرصہ میں ہندوستان میں بحیثیت مجموعی جو اضافہ ہوا ہے اور مختلف صوبوں اور بڑی دیسی ریاستوں میں جو اضافہ ہوا ہے اس کا مقابلہ ممالک محروسہ سے کریں تو غالباً بیجا نہ ہوگا۔

سنہ ۳۱-۱۹۲۱ء کے درمیان ہندوستان، اس کے صوبوں اور ریاستوں کا اضافہ آبادی

ممالک محروسہ سرکار عالی	۱۵٫۸ فی صد	بنگال	۷٫۳ فی صد
ہندوستان	۱۰٫۶ "	صوبجات متحدہ	۶٫۷ "
پنجاب	۱۴٫۰ "	ٹراونکور	۲۷٫۲ "
بمبئی	۱۱٫۳	بڑودہ	۱۴٫۹ "

صوبہ متوسط و برار	۱۱ء۵ فی صد	گوالیار	۱۰ء۳ فی صد		
بہار و اڑیسہ	۱۱ء۰ "	کشمیر	۹ء۸ "		
مدراس	۱۰ء۴ "	میسور	۹ء۷ "		

اس عشرے میں سوائے ریاست ٹراونکور کے ہندوستان کے کسی صوبہ یا دیسی ریاست میں اضافے کی رفتار ممالک محروسہ سے بڑھ نہ سکی۔ مجموعی طور پر ہندوستان اور ممالک محروسہ میں جو پنجاہ سالہ میں کمی و بیشی ہوئی ہے اس کو ذیل میں آسانی کی خاطر پیش کیا جاتا ہے۔

ہندوستان اور ممالک محروسہ کی پنجاہ سالہ آبادی کی کمی و بیشی

نام ملک	سنہ ۱۸۸۱-۹۱ء	سنہ ۱۸۹۱-۱۹۰۱ء	سنہ ۱۹۰۱-۱۱ء	سنہ ۱۹۱۱-۲۱ء	سنہ ۱۹۲۱-۳۱ء
ہندوستان	۹ء۴	۱ء۴	۶ء۴	۱ء۲	۱۰ء۶
ممالک محروسہ	۱۷ء۱	۳ء۵	۲۰ء۰	۶ء۸	۱۵ء۸

ان اعداد کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پچاس سال کے عرصے میں ہندوستان کی آبادی میں تخفیف نہیں ہوئی اگرچہ جن عشروں میں ہمارے یہاں تخفیف رہی ہے وہاں بھی اضافہ آبادی کی رفتار بہت قلیل رہی۔ لیکن اگر ان اعداد کو مجموعی حیثیت سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ سنہ ۱۸۸۱ء سے ۱۹۳۱ء تک برطانوی ہند کی آبادی میں ۳۰ء۵ فی صد اضافہ ہوا اور ممالک محروسہ سرکار عالی کی آبادی میں ۶ء۶۴ فیصد۔ گویا ہمارے یہاں باوجود دو عشروں میں ۱۰ء۳ فی صد تخفیف ہونے کے ۱۶ء۱ فی صد اضافہ ہوا۔

اس عشرے میں جو غیر معمولی اضافہ ہوا اس کے مختلف اسباب ہیں مثلاً سب سے پہلے تو دس سال میں تین سال اچھے گذرے۔ چھ سال متوسط اور ایک سال خراب گذرا۔ کوئی قحط نہیں پڑا زراعت کی ترقی کے لئے مختلف مزرعے قایم کئے گئے۔ اسی زمانہ میں آبپاشی کے لئے مختلف تالاب مثلاً پوچارم ضلع میدک۔ نظام ساگر تالاب پالیر ضلع ورنگل اور دیگر چھوٹے چھوٹے تالاب تیار ہوئے۔ پارچہ بافی کی سابقہ تین گرنیوں میں مزید دو گرنیوں کا اضافہ ہوا سمینٹ سگریٹ اور بٹنوں کی صنعت کی ہمت افزائی کی گئی اس کے علاوہ صنعتی دار التجربہ۔ گھریلو صنعتوں کا ادارہ۔ گھریلو

صنعتوں کی فروخت گاہ۔ کارخانہ، کارخانہ صابن سازی سرکاری کارخانہ صابن سازی حیدرآباد۔ تجرباتی کارخانہ قالین ورنگل وغیرہ قایم ہوئے ہیں حکومت نے صنعتی کاموں میں امداد دینے کے علاوہ ایک کروڑ کی رقم بڑی صنعتوں اور حکومت کی کفالتوں میں مشغول کرنے کے لئے عطا کی اور اس کا منافع گھریلو اور چھوٹی صنعتوں کے لئے مختص کردیا۔

کثرت آبادی کثرت آبادی سے مراد اشخاص کی ایسی تعداد ہے جو ایک معینہ رقبہ میں آباد ہو۔ چنانچہ ممالک محروسہ کی آبادی میں برابر اضافہ ہو رہا ہے۔ ۱۹۳۱ء میں اس کا اوسط ۱۷۵ افراد فی مربع میل تھا جس میں گذشتہ عشرے کے لحاظ سے ۱۵ر۵ فی صد کا اضافہ ہوا۔ ذیل میں مقابلے کی خاطر ہندوستان کے چند صوبوں اور دیسی ریاستوں کی کثرت آبادی کو ظاہر کیا گیا ہے۔

۱۹۳۱ء میں ہندوستان، اس کے صوبوں اور ریاستوں کی کثرت آبادی فی مربع میل

ممالک محروسہ	۱۷۵	مدراس	۳۲۸	بڑودہ	۲۹۹
ہندوستان	۱۹۵	صوبہ متحدہ	۴۳۸	میسور	۲۲۴
بنگال	۶۴۶	پنجاب	۱۷۹	گوالیار	۱۷۵
بمبئی	۱۴۳	آسام	۱۵۷	جموں وکشمیر	۴۳
بہار و اڑیسہ	۴۵۴	صوبہ متوسط	۱۵۵		

نقائص جسمانی ممالک محروسہ سرکار عالی میں کتنے افراد جسمانی نقطۂ نظر سے بیکار ہیں اور پیدائش دولت میں حصہ نہیں لے سکتے ان کے صحیح اعداد شمار معلوم ہوئے۔ رپورٹ مردم شماری میں جن نقایص کو شامل کیا گیا وہ جنون۔ جذام نابینائی اور ثقل سماعت ہے۔ چنانچہ ۱۹۳۱ء میں ان افراد کی تعداد حسب ذیل تھی۔

مجنون	۲۲۰۰	بہرے اور گونگے	۴۷۴۲
نابینا	۱۲۵۱۶	جذامی	۳۷۳۸

مجموعہ ۲۳۱۹۶

۱۹۰۱ء میں ان کی مجموعی تعداد ۲۶ ہزار ۱۹۱۱ء میں ۲۷ ہزار اور ۱۹۲۱ء میں ۲۹ ہزار تھی۔ آبادی کے اضافے کے ساتھ ساتھ ان کی تعداد میں کمی۔ علاج معالجے کے جدید انتظامات پر روشنی ڈالتی ہے۔ مگر صحت کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان افراد کی تعداد صحیح درج ہوئی ہے یا نہیں ہندوستان جیسے ملک میں جہاں افراد اپنی صحیح عمر بھی نہ بتاتے ہوں ان سے یہ امید رکھنا کہ وہ اپنے امراض کو صحت کے ساتھ بتلادیں گے ایک دل خوش کن خیال ہے۔ بالخصوص عورتوں اور لڑکیوں کی صحیح تعداد تو معلوم ہی نہیں ہوسکتی کیونکہ ان کی بڑی تعداد پردے میں رہتی ہے۔ عورتوں کو تو چھوڑیئے جذام اور جنون تو ابتدائی حالت میں مرد بھی چھپا سکتے ہیں اور یہ انسان کی فطرت ہے کہ وہ اپنی حقیقی یا متصورہ خوبیوں کی ضرورت سے زیادہ تشہیر کرتا ہے مگر اپنے نقایص خواہ وہ فطری ہی کیوں نہ ہوں حتی الامکان چھپانے کی کوشش کرتا ہے۔ بہرحال ان اعداد سے یہ اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کہ ملک میں اس قسم کے مریضوں کی حقیقی تعداد کیا ہے۔

جنون برہمنوں میں زیادہ ہے۔ نابینائی ثقل سماعت۔ گنگ جینیوں میں زیادہ نظر آتا ہے وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس فرقے میں خیرات اور امداد کی کثرت ہوتی ہے وہاں معذورین کا کافی تعداد میں جمع ہوجانا مسلم ہے۔ ان امراض کے اسباب و علل پر صحت و قطعیت کے ساتھ تو ایک ماہر طب ہی روشنی ڈال سکتا ہے۔ معاشیات کا طالب علم تو صرف یہ جانتا ہے کہ دراصل ان امراض کی کثرت والدین کی غلط کاریوں کا نتیجہ ہے۔ اس لئے ضروری ہے کہ ان امراض کے اعداد شمار فراہم کئے جائیں جن کی بدولت یہ امراض پیدا ہوتے ہیں اور مریضوں پر ایسی پابندیاں عائد کی جائیں کہ وہ آبادی میں اضافہ نہ کرسکیں تاکہ ملک کو معاشی اور عمرانی نقطۂ نظر سے نقصان نہ پہنچے۔ نیز جو معمولی امراض ملک میں عام ہیں ان کو بھی اسی فہرست میں شامل کیا جائے۔ اور ساتھ ہی ساتھ ان امراض کی طرف خصوصیت سے توجہ کی جائے جو چھوٹے چھوٹے اسباب کی بنا پر پیدا ہوجاتے ہیں شلاً نارو کی ان علاقوں میں زیادہ شدت ہے جہاں پختہ باولیوں کی قلت ہے نیز اس کا علاج بھی بہت آسانی سے کیا جاسکتا ہے۔

آبادی بلحاظ مذہب ممالک محروسہ کی آبادی جن مذاہب میں منقسم ہے اس کی تفصیل آئندہ صفحہ (۱۵) پر ملاحظہ فرمائیے۔

مذہب	مجموعی آبادی سنہ ۱۹۲۱ء	مجموعی آبادی سنہ ۱۹۳۱ء	فی ہزار آبادی سنہ ۱۹۲۱ء	فی ہزار آبادی سنہ ۱۹۳۱ء
جملہ ہندو	۱۰۶۵۶۴۵۳	۱۲۱۷۶۷۲۷	۸۵۵	۸۴۴
برہمنی ہندو	۸۳۱۶۷۶۱	۹۶۹۹۶۱۵	۶۶۷	۶۷۲
آری ہندو	۲۳۳۸۹۸۹	۲۴۷۳۲۳۰	۱۸۸	۱۷۱
مسلمان	۱۲۹۸۲۷۷	۱۵۳۴۶۶۶	۱۰۴	۱۰۶
قدیم اقوام	۴۳۰۷۴۸	۵۴۴۷۰۹	۳۴	۳۸
عیسائی	۶۲۶۵۶	۱۵۱۳۸۲	۵	۱۱
جین	۱۸۵۸۴	۲۱۵۴۳	۰	۱

اس جدول میں پارسیوں۔ سکھوں۔ یہودیوں۔ آریہ۔ برہمو ی جیون اور بدھ مت والوں کا ذکر نہیں کیا گیا کیونکہ ان کی اقلیت ہے۔ سنہ ۱۸۸۱ء میں ممالک محروسہ میں عیسائیوں کی تعداد صرف ۱۳½ ہزار تھی مگر سنہ ۱۹۳۱ء میں ان کی تعداد ۱½ لاکھ کے قریب ہوگئی۔ اس کی بڑی وجہ ان کی مذہبی تبلیغ ہے۔ ملک میں اکثر مقامات پر ان کے تبلیغی ادارے قائم ہیں۔

کام کرنے والے ممالک محروسہ میں جو افراد پیدائش دولت کر رہے ہیں اور جو اس میں کوئی حصہ نہیں لیتے ہیں ان کی تعداد حسب ذیل ہے۔

	ذکور	اناث
جملہ کمانے والے	۳۲۶۲۲۰۸	۱۵۶۱۶۷۴
جملہ کام کرنے والے زیر پرورش	۹۸۷۲۵۹	۹۹۱۲۲۰
جملہ کام نہ کرنے والے زیر پرورش	۳۱۲۰۵۴۳	۴۵۱۳۲۴۴
میزان	۷۳۷۰۰۱۰	۶۰۶۶۱۳۸

اس جدول پر نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ملک میں ۴۴ فی صد کمانے والے ذکور اور ۲۲ فیصد کمانے والی

اناث ہیں۔

پیشوں کے لحاظ سے کام کرنے والی آبادی کی تقسیم

ممالک محروسہ کی ۶۸ لاکھ آبادی جن پیشوں میں مصروف ہے وہ حسب ذیل ہیں۔

جماعت	جملہ کمانے اور کام کرنے والے زیر پرورش
پیداوار اشیائے خام	۳۹۰۴۲۰۶
تیاری و سربراہی اشیار مادی	۱۸۱۴۱۳۴
نظم ونسق عامہ وآزاد پیشے	۲۶۷۱۲۷
متفرق	۸۱۷۸۹۷
میزان	۶۸۰۲۵۱۴

اب دیکھنا یہ چاہئے کہ آبادی کا کتنا فیصد کن کن بڑے بڑے پیشوں میں مصروف ہے۔ ذیل کی جدول میں اس کو پیش کیا گیا ہے۔

استفادہ حیوانات ونباتات	۷۵	فی صد
تجارت	۱۱	"
صنعت وحرفت	۱۰	"
خانگی ملازمت	۷	"
ذرائع حمل ونقل	۴	"
آزاد پیشے	۲	"
غیر واضح پیشے	۲	"
نظم ونسق	۱٫۳	"
فوج	۰٫۸	"

مردم شماری کے وقت ۲ کرور ۸۰ لاکھ ایکڑ رقبہ زیر کاشت تھا۔ جو ممالک محروسہ کی جملہ آبادی کے لحاظ سے فی کس ۲ ایکڑ

ہوتا ہے ۔ اور فی کاشتکار ۷ء۱۱ ایکڑ کا اوسط پڑتا ہے ۔ اس سلسلے میں جو تحقیقات کی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرہٹواڑے کے تین اضلاع میں اس وسعت کا اوسط ۲۱ ایکڑ فی کاشتکار ہے اور تلنگانے کے ایک ضلع میں تری کے ۳ ایکڑ اور خشکی کے ۱۱ ایکڑ فی کاشتکار اوسط پڑتا ہے صدر ناظم صاحب صنعت و حرفت اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں :-

" اگرچہ قطعی اعداد و شمار فراہم نہیں ہوسکے تاہم اس کا امکان پایا جاتا ہے کہ کاشتکاروں کی بڑی جماعت اپنی اور اپنے خاندان کی ایک مناسب معیار پر زندگی گذارنے کے لئے کافی زمین رکھتی ہے بشرطیکہ وہ مناسب حد تک قرض سے سبکدوش کردیئے جائیں اور ان کی زمینات پر اس کا بوجھ نہ ہو "

صنعت پارچہ بافی کے کام کرنے والوں کی تعداد ۱۹۴۰۶۳ ہے ۔ اس میں کارخانوں اور گھروں دونوں جگہ کے کام کرنے والے شامل ہیں مگر ۱۹۲۱ء میں ان کی تعداد ۲۲۰۵۹۲ تھی ۔ اس آبادی میں جو ۱۵ فی صد کی کمی واقع ہوئی وہ گذشتہ عشرے کے معاشی حالات کی پستی تھی جس کا اثر تمام صنعتوں اور تجارتوں پر پڑا ۔

زرعی مزدوروں میں عورتوں کی تعداد فی ۱۰ ذکور ۶ ہے تجارتی باغبانی اور پھل اور پھولوں کی کاشت میں بھی ان کا کافی حصہ ہے ۔ چنانچہ اول الذکر پیشے میں بھی فی سو ذکور (۱۰۷) اور آخر الذکر میں (۱۰۲) اناث ہیں ۔ معدن ہائے زغال میں ہر دس ذکور میں چھ عورتیں ہیں ۔ روئی کا بنولہ نکالنے ۔ روئی کاتنے ۔ کلف دینے اور سینے میں ان کا حصہ فی سو ذکور (۳۰۷) ہے ۔ جالی ۔ رنگریزی اور تیار رئی لباس میں بھی ان کا کافی حصہ ہے ۔ کھلونا سازی کی صنعتیں فی دس ذکور ۱۳ ۔ اناث کا اوسط ہے ۔ چینی کے برتنوں ۔ چوڑیوں ۔ انڈوں اور پالتو پرندوں کی تجارت کا تو انھیں تقریباً اجارہ حاصل ہے ۔ بعض آزاد پیشوں مثلاً قانون ۔ طب ۔ تعلیم وغیرہ میں اناث کا کافی حصہ ہے مگر یہ پیشے بعض فرقوں کی اناث کے لئے مخصوص ہوگئے ہیں مثلاً اینگلو انڈین اناث طب اور تعلیم میں سب سے آگے ہیں اور مسلمان اناث اس شعبہ میں سب سے پیچھے ۔ آیندہ صفحہ (۱۰۸) کے نقشے سے مختلف فرقوں میں کام کرنے والی اناث کی تعداد کا علم ہوسکتا ہے مگر یہ صرف چند پیشوں تک محدود ہے ۔

طب، قانون اور تعلیم میں اناث کی تعداد

فرقہ	تعدادِ اناث فی ہزار کام کرنے والے ذکور
اینگلو انڈین	۱۵۰۰
دیسی عیسائی	۱۰۴۰
یوریشین	۵۷۱
برہمن	۱۳۴
مسلمان	۵۸

آبادی بلحاظِ جنس ۱۹۳۱ء کی مردم شماری کی رو سے ممالک محروسہ میں مجموعی طور پر ذکور کے مقابلے میں اناث کی تعداد ۳ لاکھ سے کم ہے مختلف سالوں میں جو تناسبِ اناث رہا ہے اس کو ذیل میں ظاہر کیا گیا ہے

تناسبِ اناث فی ہزار ذکور

سال	کل ممالک محروسہ	مرہٹواڑی	تلنگانہ
۱۹۰۱ء	۹۶۴	۹۸۹	۹۳۸
۱۹۱۱ء	۹۶۸	۹۸۱	۹۵۵
۱۹۲۱ء	۹۶۶	۹۷۱	۹۶۱
۱۹۳۱ء	۹۵۸	۹۶۱	۹۵۵

مگر مختلف ذاتوں میں یہ تناسب مختلف ہے ہم نے بعض خاص خاص ذاتوں کے اس تناسب کو ذیل میں ظاہر کیا ہے۔

مختلف ذاتوں میں عورتوں کی تعداد فی ہزار ذکور

ذات	تعداد اناث
مسلمان (مرہٹواڑی)	۱۰۸۷

ذات	تعداد اناث
چنچو (قدیم اقوام)	۱۰۷۷
بھوئی (کہار)	۱۰۱۱
اپارا	۱۰۰۹
مادیگا	۱۰۰۴
گونڈ	۹۸۶
مسلمان (تلنگانہ)	۹۷۴
لمباڑہ (بنجارہ)	۹۵۲
دھیڑ (چمار)	۹۴۸
یرکل	۸۴۹
کولی	۷۹۳

گو مرہٹواڑی کے مسلمان تلنگانے کے مسلمانوں کے مقابلے میں عورتیں زیادہ رکھتے ہیں مگر ۳۰ سال کی عمر میں یہ اوسط ۹۹۲ اور ۹۷۷ اناث فی ہزار ذکور رہتا ہے۔ عورتوں کی کمی کے مختلف اسباب ہیں مثلاً سب سے پہلے تو یہ نفسیاتی خواہش ہی کام کرتی نظر آتی ہے کہ ہمارے لڑکا ہو۔ ہندو خاندانوں میں لڑکے کی پیدائش لازمی خیال کی جاتی ہے تاکہ وہ خاندان کا نام رکھ سکے اور باپ کی وفات پر مذہبی رسوم ادا کرسکے عورتوں کی کمی کا ایک سبب یہ بھی ہے کہ باہر سے آنے والے لوگ اپنے ساتھ یہاں عورتوں کو لے کر نہیں آتے توطن کا بھی یہاں کی آبادی پر نمایاں اثر پڑتا ہے چنانچہ مختلف سالوں میں توطن خارجی و داخلی کی نوعیت حسب ذیل رہی۔

ممالک محروسہ کا توطن

سنہ	حقیقی آبادی	آکر بسنے والے	تارکان وطن
۱۹۱۱ء	ایک کروڑ ۳۳ لاکھ	۲ لاکھ ۶۰ ہزار	۳ لاکھ ۶ ہزار

سنہ	حقیقی آبادی	آکر بسنے والے	تارکان وطن
سنہ ۱۹۲۱ء	ایک کروڑ ۴۲ لاکھ	۲ لاکھ ۲ ہزار	۳ لاکھ ۶۵ ہزار
سنہ ۱۹۳۱ء	ایک کروڑ ۴۴ لاکھ	۲ لاکھ ۷۴ ہزار	۳ لاکھ ۳۴ ہزار

اس قسم کے اعداد موجود نہیں ہیں کہ آکر بسنے والے اپنے ساتھ عورتوں کو لاتے ہیں یا نہیں اور تارکانِ وطن اپنے ساتھ لے جاتے ہیں یا نہیں مگر ان اعداد کو دیکھتے ہوئے اس بات کا پتا چلتا ہے کہ ممالک محروسہ سے جانے والے عموماً اپنے قریبی علاقوں میں جاتے ہیں اس وجہ سے وہ اپنے ساتھ اپنی عورتوں کو بھی لے جاتے ہیں اور آکر بسنے والوں میں اگرچہ زیادہ تعداد مدراس سے آنے والوں کی ہوتی ہے۔ مگر عرب اور افغانستان سے بھی کافی تعداد آتی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ لوگ اتنی دور سے اپنے ساتھ عورتوں کو لے کر سفر نہیں کرسکتے اس وجہ سے مجموعی طور پر عورتوں کی تعداد کم ہو جاتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہونا چاہئے تھا کیونکہ تارکانِ وطن کی تعداد ہمیشہ زیادہ رہتی ہے۔

قصباتی اور دیہی آبادی مردم شماری کے تحت ”شہر“ کی جو تعریف کی گئی ہے اس کی رو سے تو ممالک محروسہ میں سوائے بلدے کے اور کوئی شہر ہی نہیں ہے۔ نیز ”قصبے“ کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ مقام جہاں کی آبادی ۵ ہزار سے زاید اور ایک لاکھ سے کم ہو۔ اور اس تعریف کے تحت مختلف قصبات آجاتے ہیں اس وجہ سے یہاں کی آبادی کو بجائے شہر اور دیہات کے قصبے اور دیہات میں تقسیم کرنا زیادہ موزوں ہے۔ مختلف سنین میں اس آبادی کا جو اوسط رہا ہے وہ حسب ذیل ہے

دیہی اور قصباتی آبادی

سال	قصباتی	دیہی
سنہ ۱۸۸۱ء	۸ر۹ فیصد	۱ر۹۱ فیصد
سنہ ۱۸۹۱ء	۲ر۹ ”	۸ر۹۰ ”
سنہ ۱۹۰۱ء	۱ر۱۰ ”	۹ر۸۹ ”

سال	قصباتی	دیہی
سنہ ۱۹۱۱ء	۹٫۷ فیصد	۹۰٫۳ فیصد
سنہ ۱۹۲۱ء	۹٫۵ "	۹۰٫۵ "
سنہ ۱۹۳۱ء	۱۱٫۲ "	۸۸٫۸ "

قصباتی آبادی میں مختلف مذاہب کا تناسب حسب ذیل ہے ۔

مسلمان	برہمنی ہندو	آریہ ہندو	عیسائی	دیگر
۴۱٫۲	۳۶٫۹	۱۷٫۱	۳٫۴	۱٫۴

ممالک محروسہ کے کل مسلمانوں کی تعداد کا ۱۲٫۵ فی صد قصبات میں مقیم ہے ۔ گزشتہ دس سال میں ان کی تعداد میں ۱۰ فی صد کا اضافہ ہوا ۔ ہندوؤں ۔ عیسائیوں اور پارسیوں میں بھی علی الترتیب ۱۸، ۱۷ اور ۲۰ فیصد اضافہ ہوا ۔

ہندوستان کی شہری آبادی بھی ہمارے ہاں کے قصباتی آبادی کے لگ بھگ ہے ۔ قصبات اور دیہات میں اس غیر مساوی تقسیم سے ایک وسیع خلیج حائل ہو جاتی ہے جو معاشی ترقی کی راہ میں رکاوٹیں پیدا کرتی ہے تہذیب و ترقی ہمیشہ شہروں سے شروع ہوتی ہے ۔ دیہات ہمیشہ حالتِ جمود میں رہتے ہیں ۔ ضرورت ہے کہ ملک میں اس غیر مساویانہ تقسیم کو کم کرنے کی کوشش کی جائے اور یہ صنعت و حرفت کی ترقی اور ذرائع آمد و رفت کی سہولتوں کے بعد ہی ممکن ہے ۔

اوسط عمر | مختلف سنین میں جو ذکور اور اناث کا اوسط عمر رہا وہ حسب ذیل ہے ۔

سال	ذکور	اناث
سنہ ۱۸۹۱ء	۲۴٫۶ سال	۲۴٫۳ سال
سنہ ۱۹۰۱ء	۲۵٫۲ "	۲۵٫۱ "
سنہ ۱۹۱۱ء	۲۵٫۵	۲۵٫۰ "
سنہ ۱۹۲۱ء	۲۵٫۸ "	۲۵٫۳ "
سنہ ۱۹۳۱ء	۲۶٫۰ "	۲۵٫۸ "

۱۹۳۱ء میں مختلف فرقوں میں اوسطِ عمر حسب ذیل رہا۔

نام فرقہ	ذکور	اناث
مسلمان	۲۶/۴ سال	۲۵/۹ سال
ہندو	۲۶/۰ ″	۲۵/۸ ″
عیسائی	۲۵/۷ ″	۲۳/۸ ″
جین	۲۶/۳ ″	۲۶/۳ ″
قدیم اقوام	۲۴/۰ ″	۲۳/۰ ″

مردوں میں مسلمانوں کی عمر کا اوسط اور اناث میں جین عورتوں کی عمر کا اوسط سب سے بڑھا ہوا ہے۔ عیسائیوں میں کمی عمر کا باعث ان پنچ اقوام کا داخلہ ہے جو کثرتِ تولید کے لئے مشہور ہیں۔ ایک عام خیال ہے کہ کثرتِ تولید درازی عمر پر اثر ڈالتی ہے۔

اگرچہ ممالک محروسہ کے ذکور و اناث کا اوسطِ عمر بڑھ رہا ہے مگر یہ قابل اطمینان نہیں کہا جاسکتا یورپ کے اکثر ممالک میں اوسط عمر اس سے دگنے کے قریب ہے معقول عمر کی کمی سے ملک کو اپنے کارگزاروں کے تجربوں پختہ کاری اور اعلیٰ قابلیت سے محروم رہنا پڑتا ہے۔ بقول پروفیسر برنی صاحب "جس چمن کے غنچے نیم شگفتہ کھلائیں جس باغ کے پھل نیم رس جھڑجائیں اُس کی اصلاح پر باغبان کو توجہ کرنی لازمی ہے۔"

اب ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا ممالک محروسہ سرکار عالی کثیر الآباد ہے، کثیر الآبادی کی مختلف تعریفیں کی گئیں ہیں اور اس کو جانچنے کے مختلف طریقے ہیں مگر بعض معیارات ایسے ہیں کہ ان کو جانچنے کے لئے ہمارے پاس اعداد و شمار موجود نہیں اس وجہ سے فی الوقت ہم ان سے بحث نہیں کرنا چاہتے۔ متوازن آبادی سے مراد وہ آبادی ہے جو کسی ملک میں حقیقی حالات کے تحت انسانوں کے شایانِ شان معقول معیارِ آرام پر زندگی گزارتی ہو۔ پھر "انسانوں کے شایانِ شان معقول معیارِ آرام" خود ایک تشریح طلب بحث ہے مگر مختصراً یہ کہا جاسکتا ہے کہ اس سے مراد وہ حالت ہے جہاں افراد اپنی تمام لابدی، متعدد تمدنی۔ اور چند تعیشاتی احتیاجات پوری کرسکتے ہوں۔ اس اصول کو سامنے رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ ممالک محروسہ کی آبادی متوازن تو نہیں۔ جب متوازن نہیں تو اس کو

کثیر ہونا چاہئے یا قلیل، قلیل اس لئے نہیں یہاں لاکھوں افراد ایسے ہیں جو پیدائش دولت میں حصہ نہیں لے رہے ہیں۔ بے روزگاری بھی موجود ہے۔ ایسے بھی خاندان ہیں جن کو زندگی کی ناگزیر احتیاجات کے لئے ذرائع میسر نہیں نیز اس کے علاوہ کثیر الآبادی کی دوسری علامات بھی موجود نہیں مثلاً شرح اموات کی زیادتی۔ ان کا حال ذیل کی جدول سے معلوم ہوتا ہے۔

شرح پیدائش و شرح اموات ہر دو جنس فی ہزار

سال	شرح پیدائش	شرح اموات
۱۹۲۲ء	۹٫۲	۸٫۵
۱۹۲۳ء	۸٫۸	۱۰٫۹
۱۹۲۴ء	۹٫۱	۱۱٫۵
۱۹۲۵ء	۹٫۱	۹٫۷
۱۹۲۶ء	۱۰٫۱	۹٫۷
۱۹۲۷ء	۱۱٫۰	۱۰٫۱
۱۹۲۸ء	۱۰٫۱	۱۰٫۱
۱۹۲۹ء	۱۰٫۳	۹٫۱
۱۹۳۰ء	۱۰٫۱	۱۲٫۰

اگر ہم ان نو سالہ اعداد پر نظر ڈالیں تو صرف تین سال ایسے نظر آتے ہیں جہاں شرح پیدائش بڑھی ہوئی ہے ورنہ یا تو شرح اموات شرح پیدائش کے مساوی ہے یا اس سے زیادہ ہے۔ شرح اموات کی زیادتی خود کثیر الآبادی کو ظاہر کرتی ہے۔ بات دراصل یہ ہوتی ہے کہ جب آبادی زیادہ ہو جاتی ہے تو اجرتیں کم ہو جاتی ہیں الا بعض مزدوروں کو تو اجرتیں اس قدر قلیل ملتی ہیں کہ وہ اپنی ناگزیر ضروریات بھی فراہم نہیں کر سکتے اس کا نتیجہ [illegible] پڑتا ہے اور نسلیں روز بروز کمزور ہوتی جاتی ہیں ان کی جانداری اور کارکردگی میں کمی آنے لگتی ہے [illegible]

آسانی سے پھیلنے لگتی ہیں معمولی معمولی امراض بھی وبا کی طرح پھیلتے ہیں اور ہزاروں کی جان لے کر ٹلتے ہیں۔ پھر کثیرالآباد ممالک میں گداگروں۔ بے کاروں مہلک جنگوں کی بھی کمی نہیں ہوتی چنانچہ ممالک محروسہ میں ان لوگوں کے اعداد بھی ملاحظہ ہوں۔

ممالک محروسہ کے گداگر اور بھکاری

ذکور	۶۳۴۸۳
اناث	۶۶۲۱۲
میزان	۱۲۹۶۹۵

صرف بلدہ حیدرآباد ہی میں ۸۵۰۸ گداگر ہیں۔ اور ان میں ۱۵ فیصدی اناث شامل ہیں یہ صرف ان افراد کے اعداد ہیں ہیں جنھوں نے گداگری کو بطور پیشہ اختیار کر رکھا ہے۔ اس کے علاوہ عارضی بھک منگوں اور شریف گداگروں کی بھی کوئی کمی نہیں۔

ملک میں اضافۂ آبادی کے رجحانات اب تک ہم نے جن چیزوں سے بحث کی وہ صرف یہ تھیں کہ کیا ملک کثیرالآباد ہے؟ مگر یہ مسئلہ اس وقت اور زیادہ شدید ہو جاتا ہے جب ہم کو اس بات کا پتا چلتا ہے کہ ملک میں اضافۂ آبادی کے ابھی مزید امکانات موجود ہیں اگرچہ جن رجحانات سے اس قسم کے امکانات کا پتا لگایا جا رہا ہے ان کے متعلق قطعی طور پر فیصلہ نہیں کیا جا سکتا تاہم یہ ضرور کہا جا سکتا ہے کہ اگر ایجابی مواضعات کام نہ کریں تو حسب ذیل وجوہ کی بنا پر آبادی میں فرق نہ ہونے کا امکان ہے۔

(۱) افلاس افلاس بذات خود شرح پیدائش میں اضافہ کا باعث ہے جب مفلس طبقے کے سامنے افلاس سے نجات پانے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو متواتر مایوسی بالآخر اس کے اخلاق کو گرا دیتی ہے جب مستقبل کسی طرح اُمید افزا نہ ہو تو پھر اس کا لحاظ کرنے کی کیا ضرورت باقی رہتی ہے لہذا تعداد خوب بڑھتی ہے موجودہ زمانہ میں ملک میں اس خطرہ کے عام ہونے کا اس لئے اور زیادہ امکان ہے کہ نئے نئے صنعتی کارخانے کھل رہے ہیں اور کھلنے کی اُمید ہے اور چونکہ ان کارخانوں میں عورتوں اور بچوں سے بھی کام لینے کے مواقع حاصل

ہوتے ہیں اس لئے خاندانی آمدنی میں اضافہ کی خاطر اضافہ تعداد کی طرف رغبت ہوتی ہے اور اگر تھوڑی دیر کے لئے یہ فرض کر لیا جائے کہ یہ خیال کارفرما نہ ہو تب بھی تعداد بلاقصد و ارادہ بڑھتی ہے کیونکہ اس وقت یہ فکر نہیں ہوتی کہ زائد اولاد کا کیا حشر ہوگا اور یہ یقین ہوتا ہے کہ خاندان کا ہر فرد کم ازکم اپنی گزر اوقات کے لائق کچھ نہ کچھ کما ہی لے گا۔

(۲) تعلیم کی کمی — موجودہ زمانے کی تحقیقات سے کوئی کلیہ تو نہیں البتہ ایک اصول وضع کیا گیا ہے کہ جیسے جیسے انسان دماغی ترقی کرتا جا رہا ہے اس کی قوت تولید نسبتاً کم ہوتی جارہی ہے عورتوں کی تعلیم کا بھی آبادی کو کم کرنے میں بڑا حصہ ہے مگر ممالک محروسہ میں تعلیم یافتہ افراد اور خصوصاً تعلیم یافتہ اناث کی بہت ہی کمی ہے چنانچہ ذیل کے نقشہ میں ہم نے ممالک محروسہ کے تعلیمی اعداد اور ہندوستانی صوبوں اور ریاستوں کے اعداد پیش کئے ہیں

تعداد خواندہ افراد فی ہزار نفوس عمرہ ۵ سال و زائد

نام مقام	ذکور		اناث	
	سنہ ۱۹۲۱ء	سنہ ۱۹۳۱ء	سنہ ۱۹۲۱ء	سنہ ۱۹۳۱ء
بنگال	۱۸۱	۱۸۸	۲۱	۲۲
مدراس	۱۷۳	۲۱۹	۲۴	۲۵
بمبئی	۱۳۸	۱۴۹	۲۴	۲۳
ٹراونکور		۴۰۸	۰	۱۶۸
میسور	۱۴۳	۱۴۷	۲۲	۳۳
بڑودہ	۲۷۷ ۱؎	۳۳۱	۱۵ ۱؎	۷۹
حیدرآباد	۵۷	۸۵	۸	۱۲

اگرچہ سنہ ۱۹۱۰ء کے مقابلہ میں ممالک محروسہ میں خواندہ ذکور کی تعداد ۱۲ فی ہزار اور اناث کی تعداد ۵ فی ہزار سے بڑھ کر علی الترتیب ۸۵ اور ۱۲ تک پہنچ گئی جو نتیجہ ہے ممالک محروسہ کی تعلیمی سرگرمیوں کا مگر ابھی ہمارا معیار تعلیم بہت ہی

۱؎ عمرہ ۱۰ سال و زائد۔

پست ہے اور خواتین میں تو تعلیم نہ ہونے کے مماثل ہے نیز اس سلسلہ میں یہ خیال رکھنا چاہیئے کہ "خواندہ" اور "تعلیم یافتہ" میں بڑا فرق ہے۔ محض خواندہ افراد سے یہ توقع رکھنا کہ امتناعی تدابیر پر عمل کریں گے یا ان کی بدولت آبادی میں کمی ہوگی غلط ہے۔

(۳) کمسنی کی شادیاں اگرچہ ابھی ملک میں سرکاری طور پر شادی کی عمر مقرر نہیں کی گئی ہے مگر یہ عام رجحان پیدا ہوتا جارہا ہے کہ کمسنی میں شادیاں نہ کی جائیں اس سے بھی اضافۂ آبادی پر اثر پڑ رہا ہے پہلے شادی کمسنی میں ہوتی تھی اور چونکہ ماں باپ خود پوری طرح جوان نہ ہوتے تھے اس وجہ سے اولاد کمزور اور منحنی پیدا ہوتی تھی اور پیدائش کے پہلے ہفتے۔ مہینے یا سال میں ان کی بڑی تعداد مرجاتی تھی مگر اب یہ بات نہیں رہی اس سے میرا مقصد یہ نہیں کہ میں کمسنی کی شادیوں پر زور دے رہا ہوں بلکہ میں صرف ایک رجحان کو ظاہر کررہا ہوں اور میں تو اس خیال کا حامی ہوں کہ گو اولاد پیدا کم ہو مگر پیدا شدہ اولاد کا زیادہ حصہ زندہ رہے۔

(۴) عقد بیوگان مسلمانوں میں مذہباً عقد بیوگان جائز تھا مگر رسم و رواج کی وجہ سے اس پر عمل بہت شاذ و نادر ہوتا رہا۔ ہندوؤں میں اس کی قطعاً ممانعت کردی گئی تھی اس وجہ سے ملک کے ہر طبقے میں ان عورتوں کی بڑی تعداد ملتی تھی جن میں اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت تو ہوتی تھی مگر بیوہ ہونے کی وجہ سے وہ اولاد پیدا نہ کرسکتی تھیں۔ مگر اب مسلمانوں اور بالخصوص ہندوؤں میں عقد بیوگان کی طرف رجحان بڑھ رہا ہے تعلیم اور نئی روشنی پرانے بندھنوں کو توڑ رہی ہے اس سے اضافۂ آبادی کے ایک رجحان کا پتا چلتا ہے۔

(۵) شادی کی عمومیت ممالک محروسہ سرکار عالی پر ہی کیا منحصر ہے سارے ہندوستان میں شادی عام ہے مذہبی عقاید اور معاشرتی رسم و رواج کے تحت ہر فرد کے لئے شادی کرنا لازمی ہوگیا ہے اشتراک خاندان اور اشتراک جائداد کے اصولوں نے بھی اسی رسم کو تقویت دی۔ یعنی کسی مرد کے لئے یہ ضروری نہیں رہا کہ وہ اسی وقت شادی کرے جب وہ کچھ کمانے لگے۔ یہی وجہ ہے کہ اب تک بھی لڑکے کی حقیقی آمدنی کی بجائے لڑکے کے والدین کی آمدنی کو پیش نظر رکھ کر شادی کی جاتی ہے۔ قدیم عورتیں اور بچے اپنے کھیتوں پر کام کرکے یا دوسروں کے کھیتوں پر مزدوری کرکے خاندان کی آمدنی میں اضافے کا باعث ہوا کرتے تھے۔ شہروں میں جہاں عورتوں اور بچوں کو کام کرنے کے مواقع حاصل ہوتے ہیں وہاں شادی اور اولاد معاشی نقطۂ نظر سے مفید ہی نظر آتی ہے۔ نہ

پہلے ملک میں ایسے ادارے تھے اور نہ اب ہیں جو انسان کے خانگی کاموں کو بسہولت انجام دے دیا کریں۔ اس لئے گھر کا کام کاج چلانے اور مرد کو آرام پہنچانے کے لئے عورت کی ضرورت ہے اور چونکہ ان فرائض کو بیوی ہی بدرجہ اتم انجام دے سکتی ہے اس وجہ سے ہمیشہ شادی کی طرف رجحان رہا۔ مگر شادی کی اس عمومیت کا نتیجہ ہمیشہ اضافۂ آبادی کی شکل ہی میں نمودار ہوا۔

مذہب سے بیگانگی بھی اضافۂ آبادی کا سبب ہو رہی ہے ہر مذہب میں ضبط نفس کی تعلیم موجود تھی۔ مگر جوں جوں ہم مذہب سے بیگانہ ہوتے جا رہے ہیں ہماری اخلاقی حالت بھی کمزور ہوتی جا رہی ہے۔ قحطوں خشک سالیوں اور طغیانیوں کے موقعوں پر اب حکومت کی امداد سے قحطِ غذا کی صورت نمودار نہیں ہوتی۔ اور اس طرح ہزاروں جانیں تلف ہونے سے بچ جاتی ہیں۔ علاج معالجے کے جدید طریقوں نے اکثر ان امراض کا علاج آسان کر دیا ہے جو پہلے لاعلاج سمجھے جاتے تھے۔ ضبطِ تولید کے جدید طریقوں سے ملک ناواقف ہے نیز قدیم طریقے مثلاً استقاط وغیرہ چونکہ اب قانوناً جرم قرار دیئے جا چکے ہیں اس وجہ سے وہ بھی مفقود ہو گئے ہیں بہر حال ان مختلف چیزوں کے اثرات پڑ رہے ہیں اور آبادی متاثر ہو رہی ہے اور اس میں مزید اضافے کا امکان پایا جاتا ہے۔

اب آخر میں میں مختصراً ان تدابیر کو پیش کروں گا جن کی بدولت آبادی کی تحدید ہو گی اور موجودہ آبادی کا معیار زندگی بڑھ سکے گا۔ اس سلسلے میں سب سے پہلی اور اہم چیز تعلیم ہے۔ سینکڑوں برائیوں اور لاعلاج خرابیوں کا واحد علاج تعلیم ہی ہے ابتدائی تعلیم کا جبری ہونا لازمی ہے۔ ابتدائی تعلیم کے بعد صنعتی۔ زراعتی۔ فنی۔ پیشہ وری اور ادبی تعلیم کا معقول انتظام ہونا چاہیے۔

پیدا شدہ انسانوں کو ہلاکت سے بچانے کے لئے سب سے ضروری چیز حفظانِ صحت کے اصولوں کی تعمیم ہے خصوصاً امواتِ اطفال کو روکنے کے لئے تربیت یافتہ دائیوں اور تعلیم یافتہ نرسوں کی سخت ضرورت ہے کمسنی کی شادیوں کو قطعاً روک دیا جائے تاکہ جب تک والدین کے جسمانی اعضا مکمل طور پر نشو و نما نہ پالیں وہ اولاد پیدا نہ کر سکیں اسی طرح نسلیں جاندار اور تنومند بن سکتی ہیں۔ عوام کو ضبط نفس کی تعلیم دی جائے اور ان کے ذہن نشین کرایا جائے کہ کثیر اولادی کے کیا نقصانات ہیں خصوصاً ادنیٰ اور پنچ ذاتوں میں اس کی تبلیغ کی شدید ضرورت ہے کیونکہ سب سے زیادہ اولاد انھیں کے ہاں پیدا ہوتی ہے۔ عوام کے معیار زندگی کو بلند کرنے کی کوشش بھی

ضروری ہے کیونکہ معیار زندگی کے بلند ہونے سے لوگ خود بخود کثرت تولید سے احتراز کرنے لگتے ہیں اول تو یہ خیال ہوتا ہے کہ کثرت اولاد سے خود ان کا معیار زندگی متاثر ہوگا دوسرے یہ کہ اگر زاید اولاد پیدا ہوگی تو کیا وہ اس معیار پر زندگی گزار سکے گی جس پر اس کے والدین گزار رہے ہیں۔ اس سلسلے میں ذرائع معاش میں اضافہ بھی لازمی ہے اور ملک میں صنعتی کارخانے کھولنے کی ضرورت ہے مگر صرف صنعت وحرفت کی ترقی سے ملک کی ترقی ممکن نہیں۔ ممالک محروسہ کا بڑا پیشہ زراعت ہے۔ اور جب تک اس کو ترقی نہ دی جائے عوام کی ترقی اور ملک کی خوشحالی کی توقع نہیں رکھی جاسکتی خود صنعت وحرفت کا دارومدار زراعت کی ترقی پر ہے کیونکہ جب کاشتکاروں کی قوت خرید کم ہوگی تو اس وقت نہ صنعت ترقی کرے گی اور نہ تجارت۔ اور حکومت کو ریل۔ کروڑگیری اور محصول آمدنی یا دوسرے محاصل سے بھی کوئی خاطر خواہ آمدنی حاصل نہ ہوگی نیز آبادی کو مساویانہ طور پر بھی تقسیم کرنا چاہئے۔ یعنی جن علاقوں میں آبادی زیادہ گنجان ہے۔ اس کو ان علاقوں میں منتقل کیا جائے جہاں کی گنجانی کم ہے۔ گنجانی کو بڑھانے کے لئے غیر گنجان علاقوں میں مختلف قسم کی سہولتیں بہم پہونچانا پڑیں گی۔ نیز قصباتی اور دیہی آبادی کے تناسب میں بھی اصلاح کی ضرورت ہے اور قصباتی آبادی کی تعداد بڑھانے سے ملک کی خوشحالی میں اضافہ ہونے کا امکان ہے

اس سلسلے میں ایک اور تجویز میں پیش کروں گا اور وہ "مخلوط شادیاں" ہیں اس سے میری مراد بین المذاہب نہیں بلکہ "بین الذات" شادیاں ہیں ممالک محروسہ پر ہی کیا منحصر ہے سارے ہندوستان میں مذاہب کی جتنی کثرت ہے وہ دنیا کے اور کسی ملک میں موجود نہیں۔ پھر ہر مذہب مختلف ذاتوں میں منقسم ہے اور بعض خاص خاص پیشوں نے ذاتوں کی نوعیت اختیار کرلی ہے اور یہ ایک قدرتی امر ہے کہ بعض نسلوں اور ذاتوں میں فطری استعداد اور قدرتی صلاحیت زیادہ اور بعض میں کم ہوتی ہے۔ اب اگر مخلوط شادیوں کو رواج دیا جائے تو قدرتی استعداد اور فطری صلاحیت رکھنے والی نسلوں کی تعداد محدود نہ ہوگی بلکہ ان کی وسعت ہوگی دوسرے اس قسم کی شادیوں سے یہ بھی فائدہ ہوگا کہ جن مخصوص ذاتوں میں عورتوں کی قلت یا کثرت ہے وہ مجموعی طور پر مساوی ہوجایا کرے گی تیسرے ایسے خون کے اختلاط سے نسلیں صحت مند اور طاقتور پیدا ہوتی ہیں اور نسلوں کے معیار صحت کو برقرار رکھنے کے لئے اس میں دوسرے خون کی آمیزش ضروری ہے عمرانیات کا ایک قانون ہے کہ مختلف تمدنوں کے باہمی اختلاط سے جو نئی تہذیب شائستگی پیدا ہوتی ہے وہ اکثر قومی فلاح وبہبود کے لئے بہتر ہوتی ہے۔ بلکہ اصلاح معاشرت کے لئے مختلف تمدنوں کا

لہ چنگی

اختلاط ناگزیر ہے۔ مخلوط شادیوں سے یہ فائدہ بھی حاصل ہو جائے گا۔

ان افراد کے ساتھ کیا سلوک کرنا چاہیے جو مخبوط الحواس اور مجنون ہوں اور جن کے متعلق یہ ثابت ہو چکا ہو کہ وہ لاعلاج ہیں۔ سلوک کا انحصار ہر انسان کے ذاتی رجحان پر ہے۔ مذہبی نقطۂ نظر سے ہر انسان کو اس وقت تک زندہ رہنے کا حق ہے جب تک اس میں ایک سانس بھی باقی ہے لیکن معاشی اور معاشرتی نقطۂ نظر سے معلوم ہوگا کہ یہ افراد سماج پر بار ہیں اور بجائے فائدے کے نقصان ہی پہنچاتے ہیں کیونکہ اپنے جیسی اولاد پیدا کر کے سماج میں "غیر معاشی انسانوں" کی تعداد میں اضافے کا باعث ہوتے ہیں۔ بہرحال میں ان کے متعلق کچھ اس لئے عرض نہیں کرنا چاہتا کہ ممالک محروسہ میں ان کی تعداد بہت قلیل ہے۔ مگر یہ تو ضرور عرض کروں گا کہ ملک متعدی امراض کے مریضوں کو اولاد پیدا کرنے سے باز رکھا جائے چنانچہ جرمنی اور ریاستہائے متحدہ امریکہ کی بعض ریاستوں میں اس قسم کے قانون نافذ ہیں جن کی بدولت ناپسندیدہ عادات اور متعدی امراض والے افراد یا تو شادی ہی نہیں کر سکتے اور اگر شادی کی اجازت بھی دے دی جاتی ہے تو اولاد پیدا کرنے کی قطعاً اجازت نہیں ہوتی۔ اس کا مقصد یہی ہے کہ ملک میں ان جیسے مریضوں کی تعداد میں اور اضافہ نہ ہو۔ نیز ملک میں علم یوجینکس ("Eugenics") کی طرف بھی خاص توجہ کی ضرورت ہے۔ تعجب ہے کہ انسان پودوں اور جانوروں کی نسلیں سدھارنے کا تو معقول انتظام کرے اور ان کی تحقیق و تجربے پر اپنی عمر کے بیش ترین حصہ کو ضائع کر دے مگر خود اپنی نسلوں کی اصلاح سے غافل رہے۔ بہرحال یہ تھیں چند وہ مختصر تجاویز جن پر عمل کر کے ہم ملک کی جسمانی اور دماغی قابلیت دونوں کا معیار کافی بلند کر سکتے ہیں۔[1]

سید محمد احمد سبزواری بی۔ اے (عثمانیہ)

---

[1] اس مضمون میں جو اعداد درج ہیں وہ حسب ذیل کتابوں سے لئے گئے ہیں۔

(۱) رپورٹ مردم شماری ممالک محروسہ سرکار عالی بابتہ ۱۹۲۱ء مطبوعہ مکتبہ ابراہیمیہ امداد باہمی (محدود)

(۲) رپورٹ مردم شماری ممالک محروسہ سرکار عالی بابتہ ۱۹۳۱ء مولفہ مولوی غلام احمد خاں صاحب دارالطبع سرکار عالی۔

(۳) معاشیات ہند۔ مولفہ جی۔ بی۔ جتھار اور ایس۔ جی بیری جلد اول آکسفورڈ یونیورسٹی پریس ایڈیشن (۱۹۳۰ء)

شاعر مشرق

قیامت ہی ہوا پنہاں کفن میں شاعرِ مشرق
رہے گا یاد صدیوں تک وطن میں شاعرِ مشرق

سنا جب ہو گیا دنیا سے رخصت شاعرِ اعظم
مری دنیائے دل کا اور ہی کچھ ہو گیا عالم

جگایا تھا نوائے آتشیں سے کاروانوں کو
کیا تھا گامزن راہِ عمل پر نوجوانوں کو

اخوت اور ملت کا نرالا پاسباں وہ تھا
رموزِ حریت کا بے بدل اک رازداں وہ تھا

پیامِ حریت اس نے دیا ہندی غلاموں کو
کیا زندہ کر دیا اپنے سلف کے کارناموں کو

ہمارے دل میں اُس نے شعلۂ غیرت کو بھڑکایا — سُنا کر عہدِ ماضی کا ترانہ سب کو تڑپایا

نہ بھولیں گے کبھی ہم اُس کے زریں کارناموں کو — دیا درسِ خودی اس نے جہاں کے رہنے والوں کو

الٰہی پھر کوئی اقبال سا آتش نوا نکلے — وطن کی خاک سے پھر کوئی ایسا رہنما نکلے

جدائی پر تری ماتم کناں ہے مادرِ گیتی — مگر شاداں ہوا ہے مل کے تجھ سے خالقِ ہستی

نہیں مٹ سکتا اے اقبال تیرا نام ہستی سے — حیاتِ جاوداں تجھ کو ملی ملت پرستی سے

مئے علم و عمل کا دور ہوگا تا ابد ساقی
حیاتِ دائمی کی شکل میں اقبال ہے باقی

محمد علی نیّر (عثمانیہ) متعلم سال دوم

موسیٰ جنگ

(افسانہ)

(۱)

ایک صبح میں گھر سے نکلا۔ موٹر سائیکل لی اور ڈاکٹر ہارلے کے مکان کی جانب روانہ ہوا۔ میری تیز رفتار موٹر سائیکل نے مجھے نصف گھنٹے میں وہاں پہونچا دیا۔ یہ مکان ایک ایسے مقام پر واقع تھا جہاں سڑک دو حصوں میں بٹ جاتی تھی۔ شہر کا کھلا اور کم آباد حصہ یہی تھا۔ موٹر سائیکل سے اتر کر میں زینے پر سے ہوتا ہوا دروازے تک پہنچ گیا۔

تختی پر "ڈاکٹر ولیم ہارلے موجود" (Dr William Harley. In.) لکھا پاکر اطمینان ہوا کیوں کہ ڈاکٹر ہارلے کا گھر پر ملنا آنے والے کی خوش قسمتی خیال کی جاتی تھی۔ وجہ یہ تھی کہ ہارلے ایک لائق اور تجربہ کار ڈاکٹر تھا۔ پورے فرانس میں اس کی شہرت تھی۔ اس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا کہ جب کسی مریض کی زندگی سے تمام ڈاکٹر مایوسی ظاہر کرچکے ہوں ڈاکٹر ہارلے کے علاج سے شفا کی امید کی جاسکتی ہے۔ اسی وجہ سے ڈاکٹر ہمیشہ عدیم الفرصت رہا کرتا تھا۔ آمدنی بھی معقول تھی۔ باوجود مسرف ہونے کے وہ شہر کے بڑے بڑے رئیسوں میں شمار ہوتا تھا لیکن خود اس کے لئے سب سے بڑی دولت اس کی غیر معمولی حسین بیوی تھی۔

میں نے دیوار پر لگے ہوئے سیاہ بٹن کو دبایا جس کے جواب میں ایک خوش پوش ملازم باہر نکلا اُس کے ہاتھوں میں ایک خوبصورت چھوٹی سی کشتی تھی۔ میں نے اپنے نام کا کارڈ اُس میں رکھ دیا۔ وہ چلا گیا۔ چند منٹ بعد واپس آکر اُس نے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا ایک دروازے کے قریب پہنچا ہی تھا کہ دروازہ کھلا اور خود ڈاکٹر ہارسے باہر آیا۔

ڈاکٹر ہارسے دراز قامت ادھیڑ عمر کا شخص تھا۔ چوڑی پیشانی موتی جیسے دانت۔ چوڑا سینہ اور مضبوط جسم رکھتا تھا اُس وقت وہ سیاہ لباس میں ملبوس تھا۔ اُس نے مُسکراتے ہوئے سلام کیا اور میری طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے مصافحہ کرتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور اُس کے ساتھ کمرے میں داخل ہوا۔

یہ کمرہ ڈاکٹر کا تجربہ خانہ تھا۔ اس کے دو حصّے کر دیئے گئے تھے۔ درمیان میں ایک اسکرین کھڑی تھی۔ ایک حصّے میں دوا کی شیشیوں سے بھری ہوئی چند الماریاں تھیں اور دوسرے حصّے میں چند سوفے بچھے ہوئے تھے ایک طرف غسل خانے کا دروازہ تھا۔ اسی دروازے کے برابر ایک میز رکھی ہوئی تھی جو تقریباً پانچ فیٹ لمبی اور ڈھائی فیٹ چوڑی تھی۔ دیوار میں ایک نل لگا ہوا تھا جس کی ٹونٹی وسط میز کے اوپر تک پہنچتی تھی۔ ٹھیک ٹونٹی کے نیچے چینی کا ایک مکعب نما برتن رکھا ہوا تھا۔ میز پر ایک گیس چولھا جل رہا تھا اور چولھے پر ایک قرنبیق رکھا ہوا تھا جس میں کوئی سیال چیز گرم ہو رہی تھی۔ قرنبیق کی نلی ایک منفرے پر جھکی ہوئی تھی جس سے کچھ قطرے ٹپک رہے تھے۔

ہم دونوں الگ الگ سوفوں پر بیٹھ گئے۔

"لارل!" ڈاکٹر نے مُسکراتے ہوئے مُہر سکوت کو توڑا "آج سویرے ہی کدھر نکل پڑے؟"

"آپ ہی کے درشن کو" میں نے جواب دیا، دونوں ہنسنے لگے۔

"یہ کیا ہو رہا ہے ڈاکٹر؟" میں نے میز پر رکھے ہوئے آلات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے سوال کیا اور جیب سے دستی نکال کر عینک صاف کرنے لگا۔

"یہ میرے روز کے تجربات میں سے ایک تجربہ ہے"۔ ڈاکٹر نے ایک ہلکے تبسم کے ساتھ جواب دیا۔

"وہ" میں نے کہا "یہ تو میں جانتا ہوں۔ مگر اس کے بارے میں کچھ تفصیلات معلوم کرنا چاہتا تھا۔"

ڈاکٹر اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ ایک دفعہ کمرے کا چکر لگا کر پھر اپنے سوفے پر بیٹھ گیا۔

"اس قرنبیق میں ایک قسم کے نمک کا محلول ہے" اس نے کہنا شروع کیا۔ "یہ نمک اسکراپ دو ہے، کروڈ پٹاش جانوروں کے سینگ اور سموں کو ملا کر گرم کرنے اور پھر پانی میں ٹھنڈا کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ اس کو کیمیائی زبان میں پٹاشیم فیرو سائنائیڈ کہتے ہیں۔

اس کے بعد وہ میز کی طرف گیا اور چولھے کے شعلے کو کسی قدر کم کرتے ہوئے بولا

"حرارت کی زیادتی میں اس نمک کے اپنی نوعیت بدل دینے کا ڈر ہے" ڈاکٹر تھوڑی دیر خاموش رہا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

"اس کے آگے"؟ میں نے استفسار کیا۔

"آگے جو ہوگا دیکھ لینا" اس نے جواب دیا۔

"لیکن تم کرنا کیا چاہتے ہو"؟ میں نے اصرار کے ساتھ دریافت کیا۔

"لارل!" ڈاکٹر نے منھ بگاڑتے ہوئے جواب دیا۔ "تم جانتے ہو کہ میں اپنے تجربے کا اظہار اس وقت تک نہیں کرتا جب تک کہ اس کا صحیح ہونا ثابت ہو جائے لیکن چونکہ تم اصرار کر رہے ہو اس لئے تمھیں اور صرف تمھیں کو بتلاتا ہوں میں ایک زہر تیار کر رہا ہوں۔ یہ کوئی انوکھا زہر نہیں ہے دنیا اس سے واقف ہے۔ یہ پٹاشیم دھات، کوئلے اور ہوا کے ایک غیر عامل حصے پر مشتمل ہوتا ہے" اتنا کہہ کر ڈاکٹر اٹھا اور الماری میں سے ایک چوڑے دہانے کی شیشی لے آیا جس میں زرد رنگ کا کوئی تیل بھرا تھا۔ اور اس میں کچھ ٹکڑے ڈوبے ہوئے تھے۔ پھر اس نے ایک چینی کی کٹوری لی اور اس میں نل سے کچھ پانی بھرا۔ پھر تیل میں سے ایک ٹکڑا نکال کر پانی پر ڈال دیا جیسے ہی ٹکڑا پانی پر گرا ایک سنسناہٹ پیدا ہوئی اور ٹکڑے نے گولی کی شکل اختیار کر کے سطح آب پر تیز تیز ناچنا شروع کیا۔ ساتھ ہی پانی پر ایک شعلہ نمودار ہوا تھوڑی ہی دیر میں سب غائب ہو گیا اور صرف پانی رہ گیا۔ اب اس نے کاغذ کی ایک سرخ چٹ لی اور اس پانی میں ڈبو دی۔ کاغذ کا رنگ فوراً نیلا ہو گیا۔

"یہ پٹاشیم دھات تھی" اس نے کہنا شروع کیا "دیکھا؟ پانی کے ساتھ اس کا عمل! اس باہمی عمل سے یہ کاوی پٹاش میں تبدیل ہو گیا ہے جو ایک ایلکلی ہے اور اس کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ سرخ لٹمس کو نیلا کر دیتا ہے۔ متذکرہ زہر کا خاص جزو یہی پٹاشیم دھات ہے۔ اس زہر کو کیمیائی زبان میں پٹاشیم سائنائیڈ کہتے ہیں۔ اگر کوئی [illegible] اس کی

کم سے کم مقدار بھی چکھ لے تو وہ بمشکل چار سکنڈ زندہ رہ سکتا ہے"۔

"میں اس کے نام سے واقف ہوں"، میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

"میرے خیال میں اس کے دریافت کرنے والے نے اچھا بھی کیا اور برا بھی"، ڈاکٹر نے پھر کہنا شروع کیا۔ "لارل! دیکھو دنیا کیسی ظالم ہے۔ کیسے کیسے زہر ایجاد کرتی ہے۔ لیکن جہاں دنیا نئے نئے زہر ایجاد کرنے کی کوشش کرتی ہے وہاں ہمارے ان کے تریاق بنانے کی فکر میں ہے۔ تم نہیں جانتے ہو لارل میں کیا کرنے والا ہوں، وہ دوا بنانے والا ہوں جو زہر سے مرے ہوئے آدمی کے جسم میں اگر موت کے بعد دو گھنٹے گزرنے سے قبل بذریعہ انجکشن داخل کردی جائے تو وہ پھر جی اٹھے۔

ابھی ڈاکٹر کے الفاظ پوری طرح ختم بھی نہ ہونے پائے تھے کہ دروازہ کھلا اور ملازم داخل ہوا۔

"باہر ایک موٹر کار آئی ہے"۔ اس نے کہا۔ "موسیو لیبان کرڈریتی کی حالت بہت خراب ہے۔ آپ کو یاد کیا گیا ہے"

میں اس اچانک مداخلت سے بہت بے لطف ہوا۔

"معاف کرنا لارل!" ڈاکٹر نے کہا "میں آج تمہیں پوری تفصیلات نہ سنا سکا۔ موقعہ ملا تو پھر کبھی بتلاؤں گا"۔ ڈاکٹر نے کوٹ پہن لیا اور ہیٹ سر پر رکھا۔ میں نے بھی اپنا ہیٹ لیا اور ہم دونوں باہر نکل گئے۔

"ڈاکٹر کی خدمات بھی کتنی ذمہ داری کی ہوتی ہیں"، اس نے پھر کہنا شروع کیا۔ "ملک الموت سے ہمیشہ جنگ کرتے رہنا واقعی کتنا بڑا کام ہے!"، اتنے میں ہم زینے تک پہنچ گئے۔ ڈاکٹر نے اپنا سلسلۂ کلام جاری رکھتے ہوئے کہا۔

"موت کے بارے میں میرا نظریہ اوروں سے مختلف ہے۔ میرا خیال ہے کہ عین اس وقت جب کہ دنیا انسان کو مردہ تصور کرلیتی ہے وہ مردہ نہیں ہوتا بلکہ توجہ نہ کرنے کے سبب چند گھنٹوں میں وہ واقعی مردہ ہوجاتا ہے، جس وقت ہم یہ سمجھتے ہیں کہ روح قفس عنصری سے پرواز کررہی ہے۔ وہ ایسا وقت ہوتا ہے کہ موت طاری ہوتی شروع ہوتی ہے اور اس کا دماغ ماؤف ہوجاتا ہے۔ اس وقت اگر کوئی ڈاکٹر موت سے جنگ کرسکے تو انسان پھر جی .... نہیں بلکہ میرے خیال سے بچ جائے۔ جس وقت کہ انسان مردہ تصور کیا جاتا ہے اور اس کا جسم سرد پڑجاتا ہے اس وقت اگر کوئی نہایت حساس تپش پیما موجود ہو تو مشاہدہ سے معلوم ہوگا کہ جسم کی اوسط تپش سے اس کی کھوپڑی کی تپش کچھ زیادہ ہوجاتی ہے اور اس سے بھی کچھ زیادہ اس کی بائیں جانب چھوٹی پسلی کے نیچے جہاں دل واقع ہے"۔

اس عرصے میں ہم کار تک پہنچ گئے۔ ملازم نے ہینڈ بیگ موٹر میں رکھ دیا۔ ڈاکٹر نے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔
"اگر میرا یہ تجربہ دنیا کے سامنے کامیاب طریقے سے پیش ہو جائے تو پھر دنیائے طب میں ایک زبردست انقلاب ہو جائے گا ہر مردہ آدمی کو مکرر زندہ کرنا ممکن ہو جائے گا۔"

ڈاکٹر نے خدا حافظ کہا اور موٹر میں سوار ہو گیا۔ موٹر روانہ ہو گئی۔ میں بھی وہاں سے سیدھے اپنے دفتر پہنچا۔ وہاں پہنچنے پر اطلاع ملی کہ ایک واردات کی تفتیش کا کام میرے سپرد کیا گیا ہے۔ میرے تمام خیالات پر فرض کا احساس مستولی ہو گیا اور میں فوراً اپنے کام کی طرف متوجہ ہو گیا۔

(۲)

میرے سپرد جو کام ہوا اس کی تفصیل یہ تھی کہ پیرس کا لکھ پتی تاجر موسیو جوزف ڈی وائیٹ چند روز سے بیمار تھا اور اپنے فیملی ڈاکٹر ہوریس کے زیر علاج تھا۔ کہا جاتا تھا کہ وہ روبہ صحت ہے مگر یکایک اس کا انتقال ہو گیا اور دوسرے ہی دن نہایت خاموشی کے ساتھ تجہیز و تکفین عمل میں لائی گئی۔ موسیو جوزف ڈی وائیٹ کے دو لڑکے تھے۔ بڑے لڑکے سیموئل ڈی وائیٹ کی شادی نہیں ہوئی تھی لیکن چھوٹے لڑکے پال ڈی وائیٹ نے سات سال قبل اپنے والد کی مرضی کے خلاف ایک غریب لڑکی سے شادی کر لی جس پر جوزف اس سے ناخوش ہو گیا اور وہ ورثہ سے محروم کر دیا گیا۔ لیکن سال بھر کا عرصہ ہوا کہ باپ بیٹے میں صفائی ہو گئی۔ جوزف کے انتقال کے بعد سیموئل جو وصیت نامہ پیش کر رہا تھا اس کی رو سے ساری جائداد کا وہی اکیلا وارث تھا۔ پال ڈی وائیٹ کا دعویٰ تھا کہ سیموئل اور ڈاکٹر ہوریس نے مل کر جوزف ڈی وائیٹ کو زہر دیا۔ اور جو وصیت نامہ پیش کیا جا رہا تھا وہ باطل تھا۔ اصلی وصیت نامہ جس کی رو سے جائداد دونوں بھائیوں میں برابر تقسیم ہونا چاہیے تھی یا تو پوشیدہ رکھا گیا یا ضائع کر دیا گیا۔ دوسری بات یہ کہ جوزف کی موت کے وقت نہ پال موجود تھا نہ اُس کا کوئی وکیل۔ اور یہ لوگ بلوائے بھی نہیں گئے اور نہ ان کو جوزف کی موت کی اطلاع دی گئی تھی۔ بلکہ ان کو اس وقت معلوم ہوا جب کفن دفن کی تیاری کی جا رہی تھی۔ چونکہ پال الگ مکان میں رہتا تھا اس لئے اس کو کسی اور ذریعے سے بھی اطلاع نہ مل سکی۔

میں ڈاکٹر ہوریس کے بارے میں اس سے قبل بھی کئی افواہیں سن چکا تھا۔ ایک دفعہ وہ کسی معاملہ میں گرفتار بھی ہوا تھا لیکن جوزف مرحوم کی ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ میری نظروں میں وہ ایک مشتبہ شخص تھا۔ اس کی ذات پر مجھے

اچھی طرح یقین ہو گیا کہ یہ اسی کی کارستانی ہے۔ اس لئے میری کار روائی شروع ہی سے کسی قدر ہورلیں اور سیموئل کے خلاف رہی۔ دن بھر میں اسی معاملے میں اُلجھا رہا اور بڑی رات گئے گھر لوٹا۔

(۳)

دوسرے دن میں پھر ڈاکٹر ہارے کے گھر پہنچا۔ تختی پر "موجود نہیں" out دیکھ کر بہت مایوسی ہوئی لیکن پھر خیال آیا کہ مسز ہارے ہی سے ملتا چلوں۔ کیونکہ اُن سے مل کر بھی بہت دن ہو گئے تھے۔ یہ سوچ کر میں نے گھنٹی بجائی ملازم آیا اور میرا کارڈ لے کر چلا گیا۔ تھوڑی دیر میں وہ برآمد ہوا اور مجھ سے باہر ہی کچھ دیر انتظار کرنے کی درخواست کی۔ میں برآمدے میں ٹہل رہا تھا۔ یکایک کسی کے قدموں کی چاپ سُن کر میں نے دروازے کی طرف نگاہ اُٹھائی۔ میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ ڈاکٹر ہورلیں نمودار ہوا اور مجھ سے کترا کر تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا نکل گیا جیسے مجھ سے ڈر کر بھاگ رہا ہو۔ میں نے لاکھ غور کیا لیکن اُس کے یہاں آنے کی غایت سمجھ میں نہ آئی۔

تھوڑی دیر بعد ملازم نے مجھ سے اندر آنے کو کہا اور میں داخل ہوا۔

ملاقاتی کمرے میں مسز ہارے ایک قیمتی پوشاک میں ملبوس بیٹھی تھیں۔ لباس سے ظاہر ہو رہا تھا کہ کہیں باہر جانے والی ہیں۔ میں نے ہیٹ اتارتے ہوئے سلام کیا۔ اُنھوں نے میرے سلام کا جواب دیتے ہوئے مصافحہ کیا اور ہم دونوں الگ الگ سوفوں پر بیٹھ گئے۔

مسز ہارے بہت حسین عورت تھی بن بھی ایسا زیادہ نہ تھا۔ ڈاکٹر ہارے کو اس سے جتنی محبت ہوتی کم تھی۔

تھوڑی دیر تک مختلف موضوعوں پر گفتگو ہوتی رہی۔ آخر میں نے سوال کیا۔

ڈاکٹر ہارے کے تجربات اب کس نوبت پر پہنچ چکے ہیں؟"

"جانے کب ختم ہوں" مسز ہارے نے ٹھنڈی سانس بھرتے ہوئے کہا "خدا کرے یہ تجربہ کامیاب ہو جائے۔ اُنھیں کو تو اپنے تجربات کے پیچھے کھانے پینے کا بھی ہوش نہیں رہا"

"لیکن" میں نے بات کاٹتے ہوئے دریافت کیا "ان کے تجربے کے ختم ہونے میں اب کتنا عرصہ ہے؟"

"خدا جانے" مسز ہارے نے منہ پھیرتے ہوئے جواب دیا۔

"میں سمجھتا ہوں مجھے آج ڈاکٹر سے ملنے کا موقع نہ ملے گا" میں نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔

ہاں" مسز ہارے نے بے پروائی سے جواب دیا "شاید آج وہ جلد نہ لوٹ سکیں"
"غالباً آپ بھی کہیں تشریف لے جارہی ہیں" میں نے ہیٹ اُٹھاتے ہوئے کہا۔
"نہیں نہیں!" مسز ہارے نے اپنے کپڑوں کو دیکھتے ہوئے بوکھلائے انداز میں کہا "مجھے .... مجھے تو کہیں جانا نہیں ہے"

میں اُٹھا اور مسز ہارے کو خدا حافظ کہتا ہوا باہر نکل گیا۔ لیکن یہ دیکھ کر میں اور متحیر ہوا کہ سڑک کی دوسری جانب کسی قدر فاصلے پر ہوریس ٹہل رہا تھا گویا میرے باہر نکلنے کا منتظر ہے۔ موٹر سائیکل کی آواز پر اُس نے میری طرف دیکھا اور ایک برقی کھمبے کی آڑ میں چھپنے کی کوشش کرنے لگا۔

(۴)

ایک ہفتے تک مجھے ڈاکٹر سے ملنے کا موقع نہیں ملا لیکن ایک دن جب کہ اتفاقیہ ایک زہر خورانی کی واردات دفتر میں پیش ہوئی مجھے ڈاکٹر کے تجربے کا خیال آیا۔ میں نے فوراً ٹیلیفون سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صبح سے مکان پر نہیں ہے لیکن گھنٹے بھر میں واپس آئے گا۔ میں دوپہر کا کھانا کھا کر ڈاکٹر کی طرف چلا گھنٹی دیکھنے سے معلوم ہوا کہ وہ ابھی تک واپس نہیں آیا ہے پھر بھی میں نے اطلاع کرادی۔ مجھے ملاقاتی کمرے میں بیٹھنے کو کہا گیا۔ تھوڑی دیر میں مسز ہارے آئیں۔ بہت بنی سنوری تھیں۔ لباس بھی خاص پہن رکھا تھا جیسے کسی ناچ پارٹی میں جارہی ہوں۔ سلام کرکے ایک تبسم کے ساتھ سوفے پر بیٹھ گئیں۔

"ہارے کب تک آجائیں گے؟" میں نے بے چینی کے ساتھ دریافت کیا۔

"ابھی ابھی انھوں نے فون کیا ہے کہ شام تک نہ آسکیں گے" مسز ہارے نے دونوں انگوٹھوں کے ناخنوں کو ایک دوسرے پر رگڑتے ہوئے جواب دیا۔

"تو پھر" میں نے ہیٹ ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا "میرا آنا بیکار رہا"
میں اتنا ہی کہہ پایا تھا کہ ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ میں نے اُٹھ کر آلہ کان سے لگایا۔

"ہلو!" میں نے کہا۔

"ہلو!" آواز آئی "تم کون ہو؟ میں ڈاکٹر ہارے ہوں"

"ہو ہو!" میں نے زور سے چلاتے ہوئے کہا "تم ہو ڈاکٹر۔ کہو کام ختم ہوا یا نہیں؟"

"ہلو! لارل" ڈاکٹر نے جواب دیا "تم کب سے آئے ہوئے ہو۔ دیکھو میں آرہا ہوں۔ غالباً پالن (مسز ہارے) نے ابھی کھانا نہیں کھایا ہوگا مجھے یقین ہے کہ وہ میرا انتظار کر رہی ہوگی اس سے کہو کہ میں ابھی دس منٹ میں آیا۔ اچھا خدا حافظ"

"مادام!" میں نے آلہ رکھتے ہوئے کہا "ڈاکٹر آرہا ہے۔ دس منٹ میں وہ یہاں پہنچ جائے گا"

"کیا؟" مسز ہارے نے سر میری طرف بڑھا کر آنکھیں اوپر اٹھاتے ہوئے کہا "کیا ہارے آرہا ہے؟"

"ہاں" میں نے جواب دیا اور سوفے پر جا بیٹھا۔

"ایک منٹ" مسز ہارے نے ایک انگلی کے اشارے سے کہا۔

"ہاں ہاں شوق سے" میں نے جواب دیا اور وہ اندر چلی گئیں۔

میں نے ایک سگریٹ سلگایا اور پینا شروع کیا۔ سگریٹ ابھی ختم بھی نہ ہونے پایا تھا کہ مسز ہارے باہر آئیں اور بیٹھ گئیں۔ مجھے یہ دیکھ کر کسی قدر حیرت ہوئی کہ انھوں نے لباس تبدیل کر لیا تھا اور اب وہ ایک معمولی لباس میں ملبوس تھیں۔ بال بھی معمولی وضع میں تبدیل کر لئے گئے تھے فوری تبدیلی کی کوئی وجہ میری سمجھ میں نہ آئی۔

تھوڑی دیر بعد موٹر کے ہارن کی آواز سنائی دی۔ میں فوراً اٹھ کر باہر آگیا میرا قیاس صحیح تھا۔ ڈاکٹر ہارے آگیا تھا اُس نے موٹر گیارج میں کھڑی کر دی جسے وہ خود چلا رہا تھا۔ اور ہنستے ہوئے اتر پڑا خلاف معمول آج اُس نے اپنا ہینڈ بیگ اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ دور ہی سے چلا کر اُس نے مجھے سلام کیا۔ پھر تیز تیز قدم بڑھاتا ہوا میری طرف آیا میں نے بھی آگے بڑھ کر مصافحہ کیا اور ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔

"کیوں ڈاکٹر" میں نے دریافت کیا۔ "کیا بات ہے آج تم غیر معمولی طور پر خوش نظر آرہے ہو"؟

"اوہ!" ڈاکٹر نے آنکھیں جھپکاتے ہوئے کہا "آج ایک مریض کے علاج پر میرا مقابلہ ایک دوسرے ڈاکٹر سے پڑ گیا۔ وہ کہتا تھا کہ مریض تین گھنٹے میں مر جائے گا اور اس بات پر اُس نے بیس ہزار فرانکس کی شرط باندھی۔ میں نے دو ہی انجکشنوں میں مریض کی کایا پلٹ دی۔ کیوں لارل کیسی رہی؟"

"تمہارے کیا کہنے" میں نے جواب دیا "فرانس تو فرانس سارے یورپ میں کوئی تمہارا مقابل نہیں"

"اس بیچارے کو چپ چاپ بیس ہزار فرانکس حوالے کرنے ہی بنی" ڈاکٹر نے فاتحانہ مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

"وہ ہوریس تو نہیں تھا؟" میں نے خاص طور پر دریافت کیا۔

"ہوریس!" ڈاکٹر نے تعجب کے لہجے میں کہا۔ "کون ہوریس؟ .... اچھا وہ بدمعاش۔ ارے اس کے پاس کیا دھرا ہے۔ مرحوم جوزف کی زندگی میں اس کی کچھ عزت تھی بھی، اب تو کتا بھی نہیں پوچھتا۔ میرے خیال میں اُس آوارہ بزدل کے سوا کوئی اس کو سلام بھی نہ کرتا ہوگا، یہاں آج تو فرانس کے مشہور ڈاکٹر روسیو سے مقابلہ آن پڑا تھا"

ہوریس کے بارے میں ڈاکٹر ہارے کے یہ خیالات معلوم کرکے میں نے مناسب نہیں سمجھا کہ ہوریس اور مسز ہارے کی ملاقات کا تذکرہ کروں۔

اس عرصے میں ہم ڈاکٹر کے تجربے خانے پر پہنچ چکے تھے۔ ڈاکٹر نے دروازہ کھولتے ہوئے مجھے اندر آنے کا اشارہ کیا اور ہم دونوں اندر داخل ہوئے۔ ڈاکٹر نے ہینڈ بیگ ایک کرسی پر رکھ دیا اور میرے کندھوں پر دونوں ہاتھوں سے زور ڈالتے ہوئے مجھے سوفے پر بٹھادیا۔

آرے!" ڈاکٹر نے میز کی طرف آنکھیں پھاڑ کر دیکھتے ہوئے کہا "میری بیاض کیا ہوئی؟ میں نے جاتے ہوئے میز ہی پر چھوڑ دی تھی"

"کیسی بیاض؟" میں نے دریافت کیا۔

میرے سوال کا جواب دیئے بغیر ڈاکٹر نے ملازم کو پکارا۔ دریافت کرنے پر اُس نے لاعلمی ظاہر کی۔

"شاید پالن نے اُٹھائی ہو" ڈاکٹر نے پلٹتے ہوئے کہا اور ادھر ادھر تھوڑی دیر تک تلاش کرتا رہا۔ اس اثنا میں ملازم نے آکر اطلاع دی کہ طعام خانے میں کھانا آچکا ہے اور میز پر مسز ہارے انتظار کر رہی ہیں۔ ڈاکٹر مجھ سے معذرت چاہتا ہوا کھانا کھانے چلا گیا۔

میں نے کمرے کا جایزہ لینا شروع کیا۔ مجھے اب یہاں ایک نیا انتظام نظر آرہا تھا۔ میز پر کئی شیشیاں تھیں۔ کسی میں کوئی مایع اور کسی میں کوئی سفوف رکھا ہوا تھا۔ دو کیمیں چولہے بھی بجھے ہوئے رکھے تھے۔

بہت ہی جلد ڈاکٹر کھانے سے فارغ ہوکر آگیا اور مجھ سے معافی چاہی کہ مجھے دیر تک انتظار کرنا پڑا۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا۔

"میرے لئے اتنا ہی کافی ہے کہ آپ تشریف لے آئے۔"

"ہاں بھائی" ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا" اب فرصت ملی ہے. معاف کرنا اُس وقت جلدی میں تم سے کچھ گفتگو نہ کرسکا کہئے مزاج تو اچھے ہیں"

"تو کیا" میں نے دریافت کیا "آپ کے پاس صرف بیمار ہی آسکتے ہیں؟"

میرے اس جملے پر ڈاکٹر ہنس پڑا۔

"خیر دوست!" میں نے کہنا شروع کیا "میں یہ معلوم کرنے کے لئے بہت بے چین ہوں کہ آخر تمہارا تجربہ کس منزل پہ پہنچا ہے؟"

"خدا معلوم میری بیاض کیا ہوگئی؟" اُس نے میرے سوال کا جواب دیئے بغیر غمگین صورت بنا کر کہا "یا لن نے بھی نہیں اٹھائی۔ اس میں میرے تجربے کی تفصیلی یادداشتیں تھیں مگر صرف اس حد تک جہاں تک میں نے کیا ہے تاکہ عمل دُہراتے ہوئے کہیں کچھ بھول نہ ہو جائے"

"ہاں تو" میں نے پھر استفسار کیا "آپ نے بتلایا نہیں کہ آپ کا تجربہ کس نوبت پر ہے"

"ہارسے نے بھی کسی کام کو ادھورا چھوڑا ہے؟"

میں چونک پڑا۔ دفعتاً مجھے مختلف خیالات نے آگھیرا۔ کیا وہ چیز جس کو ساری دنیا ناممکن کہتی ہے ممکن ہوگئی؟ کیا تریاق تیار ہوگیا؟ کیا ڈاکٹر اب مُردوں کو زندہ کرے گا؟ غرض اسی قسم کے خیالات کا ایک دم ہجوم ہوگیا اور میں کچھ نہ سمجھ سکا۔

"میں نے وہ دوا تیار کرلی ہے" ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا "اب میں تجربہ کروں گا۔ میرے نزدیک مرتے ہوئے آدمی کی جان بچانا زیادہ اہم تھا بہ نسبت اپنے تجربے کے۔ اسی وجہ سے میں اب تک اپنی مصروفیات میں سے کوئی وقت اس تجربے کو نہ دے سکا۔ آج میں سب سے پہلے اپنے کتے پر تجربہ کروں گا۔ ابھی میں اتنی ہمت نہیں کرسکتا کہ کسی آدمی کو زہر کھلا کر اس پر تجربہ کروں۔ اچھا سپرنٹنڈنٹ صاحب کیا مجھے اجازت ہے کہ میں اپنے کتے پر تجربہ کروں؟" ہم دونوں ہنسنے لگے۔

"ڈاکٹر!" میں نے کہا "تم نے بہت بُرا کیا۔ اب کسی زہرخورانی کی واردات پر بجائے ہمارے تمہیں بلوایا جائے گا"

اس پر ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا اور گھنٹی بجائی۔ ملازم آیا۔ ڈاکٹر نے اُس سے اپنا کتا لانے کو کہا۔ کتا لایا گیا۔ یہ ایک خوبصورت سر سے پاؤں تک سفید لانبے بالوں والا کتا تھا۔ چھوٹا قد۔ لومڑی کا سا پتلا منہ اور پھولی ہوئی دُم بڑی بھلی معلوم ہوتی تھی۔ ڈاکٹر نے میز پر کی شیشیوں اور برتنوں کو ایک طرف ہٹا کر کتے کو اُس پر بٹھا دیا۔ پھر ایک پنیر کا ٹکڑا منگوایا اور

اس پر اپنا تیار کردہ زہر ٹپکایا اور کتے کے سامنے رکھ دیا۔ کتا ایک ہی زاوے میں اس کو ہڑپ کر گیا۔ مشکل سے وہ ٹکڑا حلق سے نیچے اترا ہوگا کہ اُس نے پیر پھیلانا شروع کیے۔ گردن تانی۔ جبڑے کھولے اور آنکھیں بند کرلیں۔ اس کے بعد وہ ساکت ہوگیا ڈاکٹر نے ایک ٹانگ پکڑ کر اُس کو جھنجوڑا۔ پھر کر پکڑ کر ہلایا پھر سینے اور گلے پر ہاتھ رکھ کر دیکھا۔

"اب یہ مردہ ہے" اس نے کہا "دنیا کی نظروں میں۔ لیکن میری نظروں میں یہ ابھی زندہ ہے اور زندہ رہ سکتا ہے" یہ کہکر اُس نے چولھا روشن کیا اور اس پر ایک چھوٹی سی کٹوری میں کچھ تیل ڈال کر رکھ دیا۔ دس منٹ تک وہ کچھ دوائیں ملاتا رہا اور اُس کے بعد یوں گویا ہوا۔

"یہ دیکھو" اُس نے ایک شیشی بلند کی "یہی وہ زہر ہے جو کتے کو کھلایا گیا ہے۔ اب میں پہلے یہ بتلائے دیتا ہوں کہ اس زہر کا کیا عمل ہوگا"

یہ کہہ کر اس نے ایک امتحانی نلی لی۔ اُس میں کچھ سرخ گاڑھا مائع بھر دیا۔ پھر اُس کو چولھے کے قریب رکھ کر گرم کرنا شروع کیا جب وہ کسی قدر گرم ہوگیا تو وہاں سے ہٹا کر اُس نے نلی کو ایک ایستادے پر نصب کر دیا۔

"فرض کرو کہ یہ خون ہے" اس نے کہنا شروع کیا "کیوں کہ یہ خون تو ہے ہی۔ گو مصنوعی ہے۔ اب میں اس میں وہ زہر ملاتا ہوں جو کتے کو کھلایا گیا ہے۔ دیکھو کیا حالت ہوتی ہے"

یہ کہہ کر اُس نے نلی میں تھوڑا سا زہر ڈال دیا۔ مصنوعی خون کا رنگ فوراً سیاہ ہوگیا اور اس میں کچھ اُبال پیدا ہوا۔ "اس اُبال کو دیکھ کر شاید تم یہ سمجھ رہے ہو کہ یہ گرم ہوگیا ہے۔ مگر ہاتھ لگا کر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ ٹھنڈا ہے"

اب اس نے علیحدہ رکھے ہوئے تریاق کی ایک دو بوندیں اس میں ٹپکائیں اور کسی قدر گرم کیا۔ تھوڑی دیر بعد ہی نلی میں پہلے کی طرح سُرخ رنگ کا مائع اور تہ در تہ سیاہ رسوب تیرتا ہوا نظر آیا۔ پھر اس نے ایک نلی اور لی اور اس پر ایک قیف رکھی پھر قیف میں ایک تقطیری کاغذ ڈالا اور اوپر سے مائع انڈیل دیا۔ صاف سرخ مائع دوسری نلی میں پہنچ گیا اور سیاہ ذرات کاغذ پر رہ گئے۔

"یوں صاف ہوتا ہے خون" ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا "اب تقریباً آدھا گھنٹہ ہونے کو آیا ہے۔ ہمیں اپنا عمل شروع کرنا چاہئے اور ہاں میں یہ بتانا تو بھول گیا کہ میں نے اپنے تجربے کے لئے اس زہر کا انتخاب اس لئے کیا کہ یہ دنیا کے سب زہروں سے زیادہ قاتل زہر ہے"

یہ کہہ کر وہ اٹھا اور ادویات کے کمرے میں سے کاٹھ کا ایک چھوٹا سا صندوقچہ اٹھالایا اس پر ایک چھوٹا سا گھڑی کا سا گول آلہ بھی رکھا ہوا تھا۔ اس آلے میں ایک سوئی لگی ہوئی تھی اور کچھ نشان اور نمبر پڑے ہوئے تھے۔ اس کے نیچے دو بٹن قریب قریب ہی لگے ہوئے تھے۔ صندوقچے کی ایک طرف ایک تار اور دوسری طرف دو تار لگے ہوئے تھے جن پر ریشم لپٹا ہوا تھا۔ دو تاروں کے سروں پر دو دھاتی سلاخیں لگی ہوئی تھیں جن میں لکڑی کے دستے تھے۔ تیسرے تار کو بجلی کے کھٹکے سے لگانے کے لئے کیلیں لگی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر نے اس ایک تار کو کھٹکے سے ملادیا اور صندوقچے کا ڈھکنا کھول دیا۔ پھر ایک خاص جگہ پر اس گھڑی کے سے آلے کو نصب کرتے ہوئے میرے ہاتھ میں ایک سیاہ لکڑی کا ٹکڑا دے دیا۔

"یہ دیکھو" ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا۔ "اگر یہ سوئی سرخ لکیر پر آجائے تو اس بٹن کو لکڑی کے ٹکڑے سے دبا دینا اور اگر یہ مقناطیسی تختی ہٹ جائے تو اسی لکڑی سے ملادینا لیکن خیال رہے کہ کسی حصے کو ہاتھ نہ لگنے پائے۔

اب اس نے دونوں لکڑی کے دستوں کو ہاتھوں میں پکڑا اور ایک بٹن کی طرف اشارہ کرکے مجھے دبانے کے لئے کہا۔ میں نے لکڑی سے اس بٹن کو دبادیا۔ ساتھ ہی ایک گڑگڑاہٹ شروع ہوئی۔ اب ڈاکٹر نے دونوں دھاتی سلاخوں کو ایک دوسرے کے قریب کیا ایک آواز کے ساتھ ان کے درمیان ایک شرارہ نمودار ہوا۔

"ٹھیک ہے" ڈاکٹر نے کہا۔ پھر اس نے ایک سلاخ کو کتے کے سر پر اور دوسری کو گردن پر آہستہ آہستہ پھیرنا شروع کیا۔ میں نے سوئی کی طرف دیکھا وہ سرخ نشان تک پہنچ رہی تھی۔ میں نے فوراً ڈاکٹر کو متوجہ کیا۔

"کچھ پرواہ نہیں" ڈاکٹر نے کہا۔ "سوئی ابھی پہنچی نہیں اگر پہنچ جائے تو بغیر مجھ سے کہے اس بٹن کو لکڑی سے ذرا سا دبا دینا۔ اتنا دبانا کہ سوئی کسی قدر پیچھے کو ہٹ جائے"۔ اب اس نے دھاتی سلاخوں کو کتے کے جسم پر مختلف جگہ پھیرنا شروع کیا۔ یہ عمل تقریباً بیس منٹ تک خاموشی کے ساتھ جاری رہا اس کے بعد ڈاکٹر نے وقت دیکھا پھر ایک سلاخ کو سر سے مس کرتے ہوئے رکھ دیا اور دوسرے کو کمر سے پھر میری طرف مڑکر کہنے لگا۔

"میرا تجربہ اپنی سادگی اور عمل کی آسانی کی وجہ سے زیادہ قابل تعریف ہے۔ اس کو ایک بچہ بھی بہ آسانی سیکھ سکتا ہے .... مگر تم اپنے کام سے غافل نہ ہونا"

پھر اس نے ایک پچکاری اٹھائی۔ تریاق سے بھری اور کتے کی گردن میں چبھوکر تریاق اس کے جسم میں داخل کردیا۔ اب ڈاکٹر جاکر صوفے پر بیٹھ گیا۔ مجھ پر گویا کسی نے جادو کردیا تھا میں خاموشی کے ساتھ لکڑی پکڑے ہوئے کھڑا تھا

کبھی کُتّے کو دیکھتا کبھی آلے کی سوئی کو۔ اس اثنا میں ایک دفعہ سوئی سُرخ نشان پر آگئی تھی لیکن بٹن کو دبا دینے سے پھر واپس چلی گئی۔

"اچھا" ڈاکٹر نے کہنا شروع کیا "ذرا میں اس تریاق کی تشریح بھی کر دوں۔ گو تم سمجھ نہ سکوگے۔ یہ کہہ کر وہ سوچنے لگا۔

میں نے کہا ڈاکٹر بتلا بھی دو شاید میں سمجھ جاؤں"

ڈاکٹر راضی ہوگیا اور کہنے لگا۔ اس میں کئی چیزیں شامل ہیں جن کے ناموں سے تم ناآشنا ہو۔ پھر بھی دو ایک چیزیں تمھیں بتلاتا ہوں۔ اس میں ایک مرکب پلاٹینم کلورائیڈ ہے جو ایک قیمتی مرکب ہے۔ یہ پٹاشیم سائنائیڈ کو خون سے جدا کر دیتا ہے اور خون سے پٹاشیم کو چھین کر اپنے ساتھ مرکب کر لیتا ہے۔ اسی طرح ایک گیس بھی حل ہے جو عموماً فضلے سے خارج ہوتی ہے یا بطور تجربہ چونا اور نوسادر ملانے سے پیدا ہوتی ہے اُس کی بو تیز چبھتی ہوئی ہوتی ہے اس کو امونیا کہتے ہیں۔ ایک اور مرکب ہے جو سوڈیم ہیڈراکسائیڈ جس کو عام طور پر کاسٹک سوڈا کہا جاتا ہے۔ یہ تانبے سے تیار شدہ زہروں کا تریاق ہے اسی طرح سیسے کا ایک مرکب ہے جو گندھک کے زہروں کا تریاق ہے۔ غرض ایسی بہت سی چیزیں ہیں جن کو باہم ملا کر بعض خاص عمل کرنے سے یہ تریاق تیار ہوا ہے۔ چونکہ کتے کے جسم میں پٹاشیم سائنائیڈ ہے اور پلاٹینم اس کی تحلیل کر سکتا ہے لیکن چونکہ سائنوجن کے تمام مرکبات زہر ہوتے ہیں۔ اس لئے ایک زہر کی تحلیل سے دوسرا زہر تیار ہوگا۔ اسی وجہ سے مجھے ایک اور ترکیب کرنی پڑے گی کہ یہ سائنوجن کا مرکب غیر عاملانہ صورت میں آنتوں میں چلا جائے اور فضلے میں مل جائے"

اتنا کہہ کر ڈاکٹر اٹھا اور اندر سے ایک لوہے کی پٹی اور چند مرتبان لے آیا۔ پھر اس نے لوہے کی پٹی سے کتے کا منہ کھولا اور ایک شیشی میں سے چند قطرے اس میں ٹپکا دیئے اس طرح کہ دوا سیدھے اس کے حلق میں اترے۔ پھر اس کے بعد ایک اور شیشے میں سے کچھ تیل اس کے منہ میں ڈالا اور منہ بند کر دیا۔ پھر ایک کپڑے کو کسی مائع میں تر کر کے اس کی آنکھوں پر ڈال دیا اور کوئی دوسری دوا ایک پچکاری میں لے کر اس کے نتھنوں میں زور سے چڑھائی۔

"ریڈی کا تیل اس کے پیٹ میں پہنچایا گیا ہے" اس نے کہنا شروع کیا "اب دس منٹ میں کتے کو زندہ ہو جانا چاہیئے" دس منٹ گزر گئے مگر کتے نے جنبش نہ کی پندرہ منٹ ہو گئے مگر کتے میں زندگی کے کوئی آثار نظر نہ آئے۔ اب ڈاکٹر بھی پریشان ہوا۔

"اب تک تو کتے کو زندہ ہو جانا چاہیئے تھا" اس نے متفکرانہ لہجے میں کہا اور اسی دوا کے چند اور قطرے جو تھوڑی

دیر پہلے اس کے منہ میں ڈالی گئی تھی پھر پکائے اور بجلی کے آلے کا جائزہ لینا شروع کیا جو ہر طرح اطمینان بخش طریقے پر کام کر رہا تھا۔

پانچ منٹ بعد میری حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب کہ کتے نے آہستہ آہستہ سانس لینا شروع کر دی۔ ڈاکٹر نے لپک کر وہ کپڑا جو اس کی آنکھوں پر پڑا تھا ہٹا دیا اور کسی دوا کا انجکشن اُس کی بائیں جانب سینہ میں دیا۔ تھوڑی دیر بعد کتے نے آنکھیں کھول دیں۔ جھٹکے کے ساتھ برقی سلاخیں ہٹا دیں اور اُٹھ بیٹھا۔ منہ کھول کر ایک انگڑائی لی گویا ابھی سوتے سے اُٹھا ہے اس کی ناک سے کوئی رطوبت بہہ رہی تھی۔ پھر اُس نے میز ہی پر غلاظت کر دی۔

ایک فاتحانہ قہقہے کے ساتھ ڈاکٹر دوڑ کر مجھ سے لپٹ گیا۔ میں بھی حیران و ششدر کھڑا مسکرا رہا تھا۔

"یہ ہارے کا تجربہ ہے لارل" اس نے فاخرانہ لہجے میں کہنا شروع کیا " اس میں غلطی کا امکان بہت کم ہوتا ہے میں سمجھ رہا تھا کہ مجھے مصنوعی تنفس پہنچانے کی ضرورت ہو گی لیکن نہ ہوئی۔ بجلی کے ذریعے میں نے مصنوعی دوران خون پیدا کیا تھا"

اس کے بعد ڈاکٹر نے گھنٹی بجائی۔ ملازم آیا اُس سے میز صاف کرنے اور کتے لے جانے کے لئے کہا گیا ساتھ ہی مسز ہارے کو بلانے کو بھی۔ تھوڑی دیر بعد ملازم نے اطلاع دی کہ مسز ہارے کلب چلی گئی ہیں۔

"لارل! کہیں اس تجربے کی رپورٹ کو ابھی سے اخباروں تک نہ پہنچا دینا" یہ کہتے ہوئے وہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ بھی کلب جانا چاہتا ہے۔ میں چلا آیا۔

(۵)

دو تین روز کی مصروفیات کے بعد ایک روز اتفاقاً ڈاکٹر ہارے سے بازار میں مٹ بھیڑ ہو گئی جہاں اُس نے افسوس کے ساتھ سنایا کہ اُس کا کتا دوسرے دن مردہ پایا گیا۔ وہ رات کے پہلے ہی پہر میں مر چکا تھا۔

"تو یہ علاج کی خامی تھی ڈاکٹر؟"

"اور نہیں تو کیا" اس نے جواب دیا "مجھے اس کا احساس ہوا۔ زہر کی کامل ترسیب کے لئے مجھے الکحل سے مدد لینا چاہیے تھی"

اس ملاقات کے بعد کئی دن تک مجھے ڈاکٹر سے ملنے کا اتفاق نہیں ہوا لیکن ایک دن جب کہ میں دفتر میں بیٹھا ہوا تھا مجھے ٹیلیفون پر طلب کیا گیا۔ ڈاکٹر ہارے گفتگو کر رہا تھا۔ رسمی سلام علیک کے بعد ڈاکٹر ہارے نے بتلایا کہ اپنی خامیاں

دور کرکے اس نے ایک اور کتے پر تجربہ کیا جو بارہ دن سے اچھا تھا اور حیوانات کے ڈاکٹر نے اس کی صحت کی تصدیق بھی کردی کہ اب اس کے مرنے کا امکان نہیں۔ ساتھ ہی ایک بندر پر بھی تجربہ کیا گیا اور وہ بھی کامیاب رہا۔ بندر پر اس لئے تجربہ کیا گیا کہ وہ بلحاظ ساخت جسمانی انسان سے بہت مشابہ ہے۔ اس نے تبلایا کہ زہر کی ترسیب کے بعد اس کو چاہئے تھا کہ کسی طرح حاصل شدہ رسوب کے ہر ذرے کو خون سے علیحدہ کرلے۔ اس کے لئے بھی بجلی کا ایک طریقہ معلوم کرلیا گیا۔ ساتھ ہی ڈاکٹر نے مجھ سے استدعا کی کہ اگر کوئی زہر خورانی کی تازہ واردات پیش ہو تو اس کو مطلع کردوں۔

اس گفتگو کے تھوڑی دیر بعد میں اخبار دیکھ رہا تھا کہ ایک صفحے پر نظر پڑتے ہی حیرت سے اخبار میرے ہاتھ سے چھوٹ کر گر پڑا۔ لکھا تھا:-

موت سے جنگ

"سنا جاتا ہے کہ ڈاکٹر ہوریس ایک عرصے سے خفیہ طور پر زہر خوردہ انسان کو اس وقت جب کہ وہ دم توڑ رہا ہو بچانے کے لئے تجربے کررہے تھے کئی تجربے جو انھوں نے جانوروں پر کئے بہت حد تک کامیاب رہے۔ اب انھیں کامل کامیابی ہوگئی ہے۔ عنقریب وہ اپنے تجربات دنیا کے سامنے پیش کرنے والے ہیں۔ علم طب پر ان کا زبردست احسان ہے۔"

میں نے فوراً ڈاکٹر کو فون کیا۔ ڈاکٹر نے میرے کہنے سے اخبار دیکھا اور جواب دیا کہ اس کو جلد از جلد اپنی ایجاد مشتہر کردینی چاہئے۔

(۶)

دوسرے دن تقریباً دوپہر کے وقت ڈاکٹر نے مجھے فون پر اطلاع دی کہ خوش قسمتی سے ایک آدمی اس کے پاس لایا گیا ہے جو زہر کھا چکا ہے اور اس پر تجربہ کیا جانے والا ہے۔

یہ سنتے ہی میں نے جلد از جلد کام ختم کرلیا اور سیدھا ڈاکٹر ہارے کے پاس پہنچ گیا۔ ڈاکٹر نے مجھے فوراً اندر بلوا لیا۔ تجربہ شروع ہوچکا تھا۔ پچکاری دیدی جاچکی تھی اور دوسرے عمل بھی کئے جاچکے تھے اب بجلی کا عمل ہورہا تھا مریض کے گلے پر ایک تار کا پھار رکھا ہوا تھا جس کا الحاق بجلی کے ڈبے سے تھا اور منہ پر بھیگا ہوا کپڑا پڑا ہوا تھا۔ تھوڑی دیر بعد مریض کے گلے کی ایک رگ پھولنے لگی۔ جہاں تار کا پھار رکھا تھا جب رگ کافی پھول گئی تو ڈاکٹر نے کلرا می کے

چمٹے سے تار ہٹا دیا اور نشتر سے گلے کے اس حصے میں چھوٹا سا شگاف کیا۔ کوئی گاڑھا اودے رنگ کا مائع نکلا تھوڑی دیر تک وہ اس جگہ کو دبا دبا کر وہ مادہ نکالتا رہا۔ جب خون آنا شروع ہوا تو اس نے گیلے کپڑے سے زخم صاف کر کے اس پر دوا لگائی اور نہایت احتیاط سے ٹانکے دیئے اور اطراف ایک کپڑا لپیٹ دیا۔ کچھ دیر بعد مریض نے سانس لینا شروع کی۔ ڈاکٹر نے چہرے پر کا کپڑا ہٹا دیا اور ایک انجکشن دے دیا۔ رفتہ رفتہ تنفس تیز ہوتا گیا۔ ڈاکٹر نے پھر طاقت کی ایک دوا کا انجکشن دیا جس کے تھوڑی دیر بعد مریض اُٹھ بیٹھا اور دھاتی سلاخیں جو اس کے جسم سے لگی ہوئی تھیں اٹھا کر پھینک دیں۔ پھر ایک انگڑائی لی اور پریشانی کے ساتھ اِدھر اُدھر دیکھنا شروع کیا۔ پھر یکایک چیخ اُٹھا:۔

"میں کہاں ہوں؟ تم کون ہو؟ کیا ہوا؟" غرض اسی قسم کے بے تکے سوالات شروع کر دیئے۔

"شور مت مچاؤ" ڈاکٹر نے تحکمانہ لہجے میں کہا "تم ایک مجرم ہو۔ تم نے خودکشی کرنا چاہی تھی لیکن میں نے تمھیں موت سے چھین لیا ہے۔ میرے سوالوں کا جواب دو۔ بتاؤ کیا تمھارا سر چکر ا رہا ہے؟ کیا تمھیں کمزوری محسوس ہو رہی ہے؟ بتلاؤ بولو"

"نہیں" مریض نے بالکل مری ہوئی آواز میں ڈاکٹر کی صورت دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

"اچھا اب تم جا سکتے ہو"

ڈاکٹر نے ان لوگوں کو بلایا جو مریض کے ہمراہ آئے تھے اور تجربے کے اختتام کا بہت بےچینی کے ساتھ ملاقاتی کمرے میں انتظار کر رہے تھے۔ وہ دیوانہ وار دوڑے آئے اور مریض کو گلے سے لگا لیا۔ ڈاکٹر نے ان سے کہا کہ مریض کو ایک اجابت ہوگی۔ اس کے بعد اسے تھوڑی سی برانڈی پلا دی جائے۔ ان لوگوں نے مریض کو موٹر میں بٹھا لیا اور چلے گئے۔

"اُس نے نیلا تھوتھا کھا لیا تھا" ڈاکٹر نے کہا "اس پر کیفیتِ انتشار اُس وقت طاری ہوئی جب اس کو یہاں پہنچا یا گیا میرا مطلب اُس کیفیت سے ہے جس کو عرف عام میں "موت" کہتے ہیں۔ یہ میرے تجربے کے صحیح ہونے کا کافی ثبوت ہے"

"اب تو میرے پیٹ میں درد ہونے لگا ہے ڈاکٹر" میں نے ہنستے ہوئے کہا "اب میں تمھارے تجربات کا راز دل میں نہیں رہ سکتا۔ کسی نہ کسی کے سامنے ضرور کہہ دوں گا"

"گھبراؤ نہیں ارل" ڈاکٹر نے کہا "میں کل اپنی ایجاد کو مشتہر کر دوں گا۔ ہو سکے تو تم بھی معمل خانے پر آ جانا"

میں وہاں سے عالم استعجاب و حیرت میں نکلا اور اپنے دفتر کی جانب روانہ ہوا۔ وہاں پہنچ کر ایک اطلاع ملی کہ جس کے سنتے ہی میں اچھل پڑا۔ جس مریض کو ابھی ابھی ڈاکٹر ایسے نے موت سے بچایا تھا وہ موٹر میں سے ایک ٹرام کے

سامنے کو دیڑا جس سے اس کا سر اور ایک ہاتھ کٹ کر جدا ہوگیا اور وہ فوراً مرگیا۔ میں نے ڈاکٹر کو فون کیا تو اس نے اپنی واقفیت ظاہر کی کہ اس کو اطلاع مل چکی تھی۔ ساتھ ہی اس نے کہا کہ وہ پریشان نہیں ہے صرف افسوس کر رہا ہے اور دوسرے دن وہ اپنا تجربہ فرانس کے تمام مشہور ڈاکٹروں کے سامنے کرنے والا ہے جس کی اطلاع ان لوگوں کو دے دی گئی ہے

(۷)

میں دوسری صبح کا بہت بے چینی کے ساتھ انتظار کر رہا تھا لیکن سویرے ہی پال ڈی می وائیٹ نے مجھے فون کرکے بلوایا۔ وہاں پہنچنے پر پال نے تبلایا کہ رات میں ہوریس نے مکان میں خفیہ طریقے سے داخل ہوکر اس پر قاتلانہ حملہ کیا۔ پال نے اتفاقاً اپنے چاقو سے اس کے ہاتھ کو زخمی کردیا اور اس کا پستول چھین لیا۔ وہ بھاگ گیا۔ گھبراہٹ میں ایک جوتا اور رومال بھول گیا۔ رومال کے کونے پر اس کے نام کے سرحرف لکھے تھے۔ پستول بھی ہوریس کا تھا۔ یہ اس کے خلاف کافی ثبوت تھا۔ دوسرے جوزف مرحوم کے قتل کا الزام بھی پولیس نے ہوریس اور سیموئل ڈی می وائیٹ پر لگایا تھا۔ ان کی گرفتاری کا وارنٹ لے کر معہ دو کانسٹبلوں اور ایک سب انسپکٹر کے میں نکلا۔ میرا قیاس تھا کہ وہ معمل خانے پر ہی ہوگا۔ اس لئے وہاں پہنچا۔ وہاں پہنچنے پر معلوم ہوا کہ ڈاکٹر ہارلے نے تمام ڈاکٹروں کے سامنے ایک کتے پر تجربہ کیا جو کامیاب ثابت ہوا۔ دوسرے تجربے کے لئے معمول بننے کو کوئی تیار نہ تھا۔ اس لئے ڈاکٹر نے اپنی بیوی پر تجربہ کرنا چاہا۔ لیکن اس کی بیوی موجود نہ تھی۔ عین اسی وقت ٹیلیفون کی گھنٹی بجی۔ فون پر اس کی بیوی نے اسے فوراً ۳، ماؤنٹ شان زلیزی روش نمبر ۱۲۴ پر آنے کو کہا۔ ڈاکٹر ہارلے نے دوسرے ڈاکٹروں سے معافی کے ساتھ اجازت طلب کی کہ وہ اپنی بیوی کو لے کر جلد از جلد واپس آئے گا۔ اور وہ چلا گیا۔ جاتے جاتے اپنی نوٹ بک اور تریاق کی بوتل بھی لے گیا۔

یہ سن کر میری حیرت اور پریشانی کی کوئی انتہا نہ رہی کیوں کہ ۳، ماؤنٹ شان زلیزی روش نمبر ۱۲۴ ڈاکٹر ہوریس کا پتہ تھا۔ مسز ہارلے کا وہاں سے فون کرنا اور ہارلے کا وہاں جانا ایک پریشان کن معمہ معلوم ہو رہا تھا۔ میں نے واقعہ کی اہمیت کا اظہار کرکے دو ڈاکٹروں کو ہمراہ لے لیا اور ہوریس کے مکان کی جانب روانہ ہوا۔ وہاں باہر ڈاکٹر ہارلے کی موٹر کھڑی ہوئی تھی جسے وہ خود چلایا کرتا تھا۔ وہاں پہنچتے ہی ہم سب بلا اجازت اندر داخل ہوگئے۔

حیرت و استعجاب سے میرے منہ سے چیخ نکل گئی میرے ساتھی بھی پریشان ہوگئے۔ ڈاکٹر ہارلے خون میں لتھڑا ہوا فرش پر دم توڑ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ بمشکل اپنی کہنی کا سہارا لے کر سیدھا ہوا۔ میں نے اس کا سر اپنے زانو پر رکھ لیا۔

اس نے رُکتے رُکتے کہنا شروع کیا:

"لارل ...... اچھا ہوا کہ تم آگئے ...... ہوریس ...... بدمعاش ...... ہوریس نے مجھ سے دغا کی ...... میری بیوی ...... آہ! میری حسین بیوی ...... میری پالن ...... جس کو میں جان سے بھی زیادہ عزیز رکھتا تھا ...... آہ! ...... بیوفا ثابت ہوئی۔ وہ ہوریس سے ...... ملی ہوئی تھی ...... میری بیاض بھی ...... اسی نے ہوریس تک پہنچائی ...... اس نے فون کرکے ...... مجھے یہاں بلوایا ...... میں بے کھٹکے چلا آیا ...... یہاں آکر دیکھا ...... پالن اور سیوال ...... اُف ...... ہوریس ایک طرف کرسی پر بیٹھا ہوا تھا ...... وہ مجھے میری ایجاد ...... کے مشتہر ہونے سے قبل لڑوانا چاہتا تھا ...... مجھ پر اُس نے ...... یکایک ...... فائر کردیا ...... قبل اس کے کہ میں کچھ کرسکتا ...... وہ تینوں فرار ہوگئے جاتے ہوئے ہوریس ...... میری بیاض اور تریاق کی بوتل بھی لے گیا ...... افسوس ...... پالن نے بیوفائی کی ...... میرا دنیا میں رہنا فضول ہی ہے ...... میں مر رہا ہوں ...... لارل! دیکھو ...... میں مردوں کو زندہ کرنے کا دعویٰ کرتا تھا ...... اب موت نے مجھے ہی پکڑ لیا ...... مسیح مجھے معاف کردو ...... لارل! عورتوں کے مکر سے بچے رہو ...... خدا تمہیں خوش رکھے ...... خدا ...... حافظ"

اتنا کہہ کر ڈاکٹر ہارلے نے دو دفعہ مسیح اور پاک مریم کو پکارا اور آنکھیں بند کرلیں۔ طائر روح قفس عنصری سے پرواز کرگیا۔ میری آنکھوں سے آنسو ٹپکنے لگے۔ میرے ساتھی بھی آبدیدہ ہوگئے۔ دونوں ڈاکٹروں نے ہارلے کے جسم کا معاینہ کیا۔ وہ سرد ہوچکا تھا۔ گولی اس کے سینے کے پار ہوچکی تھی۔ میں نے اپنے ساتھیوں کو ملزمین کا کھوج لگانے کے لئے روانہ کیا اور فون سے تمام واقعات کی اطلاع دفتر میں کردی۔ اور لاش اٹھوا کر ہارلے کے مکان پر لے آیا لاش کو اس کے ملازموں کے حوالے کرکے میں گھر چلا آیا۔

دوسرے دن بڑے تزک و احتشام کے ساتھ ہارلے کی لاش سپرد خاک کردی گئی۔ اسی دن شام کو اسٹیشن پر ہوریس، سیوال ڈی وائیٹ اور مسز ہارلے بھیس بدلے ہوئے فرار ہونے کی تیاری میں گرفتار کرلئے گئے۔ جوتا جو سیوال ڈی وائیٹ کے مکان میں حملہ آور نے چھوڑ دیا تھا۔ ہوریس کے پاؤں میں ٹھیک ہوتا تھا۔ مزید تفتیش پر مسز ہارلے نے تمام واقعات ظاہر کردیئے۔

(۸)

مسز ہارلے کو سیوال ڈی وائیٹ سے محبت تھی لیکن حالات نے اس کی شادی ڈاکٹر ہارلے سے کرادی مگر

شادی کے بعد بھی ، خفیہ طور سے وہ سیموئل سے ملتی رہی ۔

جوزف نے دوسرے وصیت نامے میں دونوں بیٹوں میں نصف نصف جائداد تقسیم کی تھی لیکن وہ وصیت نامہ مخفی رکھا گیا تھا۔ سیموئل اور ہوریس نے مل کر مسز ہارلے کی رائے سے جوزف کو زہر دیا۔ ہارلے مرحوم کے تجربات کی تفصیل مسز ہارلے کے ذریعے ہوریس کو مل جایا کرتی تھی۔ ہوریس چاہتا تھا کہ ہارلے کی ایجاد سے خود فائدہ اٹھائے۔ پال پر اُسی نے قاتلانہ حملہ کیا تھا تاکہ سیموئل کے لئے راستہ صاف ہو جائے۔ مسز ہارلے کو یقین تھا کہ اُس کے بلانے پر ہارلے بلا سوچے سمجھے آجائے گا۔ اس لئے اس نے ہوریس کے مکان سے ڈاکٹر کو فون کیا۔ ہارلے بے کھٹکے چلا گیا۔

ہوریس نے جب دیکھا کہ ہارلے اپنی ایجاد کو مشتہر کر رہا ہے تو اس کو گولی مار دی اور تریاق کی بوتل اور بیاض لے کر فرار ہو گیا۔ سیموئل نے مسز ہارلے کو مشورہ دیا تھا کہ وہ قانوناً ہارلے مرحوم کی دولت پر قبضہ کرکے اس سے شادی کرلے لیکن جب اُن کو خبر ہوئی کہ راز فاش ہو گیا تو سب نے فرار ہونے کی ٹھانی لیکن گرفتار کر لئے گئے۔ عدالت نے ہوریس کو عمر قید۔ سیموئل کو ۲۰ سال قید اور باپ کے ورثے سے مجوبی اور مسز ہارلے کو پانچ سال قید اور شوہر کے ورثے سے محرومی کی سزا سنائی۔

ہارلے مرحوم کی وصیت تھی کہ اس کی نصف دولت پیرس جنرل سائنس لیبرٹیری کو ملے لیکن پوری جائداد لیبرٹیری کے حوالے کر دی گئی۔

ہارلے مرحوم کے تریاق اور بیاض کو ہوریس نے ضائع کر دیا تھا۔ ہارلے نے اپنی عادت کی بموجب کسی کو تریاق کی تفصیل نہ بتلائی تھی۔ مجھ سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا جو کچھ بھی مجھے معلوم تھا میں نے بتلایا۔ لیکن یہ تریاق تو بقول ڈاکٹر ہارلے مرحوم اور کئی چیزوں سے مل کر بنا تھا۔ مرحوم ڈاکٹر نے اپنے تجربے کی نشانی کے طور پر ایک کتے کی جوڑی اور ایک بندر چھوڑا تھا۔

سنا ہے کہ دوسرے ڈاکٹروں نے کتوں اور بندر کے خون کے ذریعے جو کہ ڈاکٹر ہارلے مرحوم کے تجربے کی نشانی تھے اس تریاق کی تحقیق کا ارادہ کیا ہے۔ اچھا ہے اگر وہ ایسا کر سکیں۔

سید ظہیر الدین حسین رونق متعلم بی۔ ایس سی (عثمانیہ)

حسنِ معصوم

ایک جھلکی ہے ترے رخسار کی ماہِ تمام
تیری آنکھیں بادۂ اُلفت کے دو لبریز جام

روضۂ جنّت کی تو اک نو شگفتہ ہے کلی
شبنمِ اُلفت نے برسوں آبیاری جس کی کی

تیری قامت گلشنِ فردوس کا سروِ سہی
آئینہ کلیوں کو دکھلاتی ہے تیری سادگی

تیرے ہونٹوں کا تبسّم روکشِ صبحِ بہار
تیری آنکھوں کی کشش ہے عشق کی پروردگار

تیرے آویزوں کی جنبش میں ہے رقصانِ برقِ طور
چاند کی تابندگی بھی ماند ہے تیرے حضور

تیری باتوں میں عجب موسیقیاں ہیں جلوہ گر
چھیڑتی ہیں ٹھمریاں حوریں خوشی میں جھوم کر

تو مجازی بھیس میں ہے پرتوِ پروردگار
صنعتِ قدرت کا تو ہے اِک مکمل شاہکار

تیرے رنگیں حسن کا صدقہ ہے اے حورِ جناں!
بن گیا ہوں میں جہاں میں شاعرِ رنگیں بیاں

"تویاما"

جاپان کی خونی انجمن کے بانی اعظم کے دلچسپ حالات

آج ہم قارئین مجلہ کا تعارف دنیا کی ایک عظیم الشان اور عجیب وغریب ہستی تویاما سے کراتے ہیں جو جاپان کی مشہور علم خونی انجمن "سیہ اژدر" کا صدر اور بانی ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ تویاما کے حالات لکھنے سے قبل اس انجمن کے اغراض ومقاصد پر روشنی ڈالی جائے۔

بیرونی دنیا نے شاید ہی "کوکوریوکائی" یا جاپان کی انجمن سیہ اژدر کا نام سنا ہو لیکن جو لوگ اس انجمن سے واقف ہیں وہ اسے جاپان کا سب سے طاقتور سیاسی ادارہ خیال کرتے ہیں۔ بحری وبری طاقتوں کی طرح یہ بھی جاپان کی ایک اہم سیاسی طاقت ہے "سیہ اژدر" جاپانی سرفروش محبان وطن کا ایک عظیم الشان ادارہ ہے۔ اس انجمن کا واحد مقصد یہ ہے کہ جاپان کے مفاد میں جو کوئی حایل ہو اس کا سدباب کیا جائے۔ اور اگر ضرورت محسوس ہو تو قتل سے بھی دریغ نہ کیا جائے۔ مختصر یہ کہ اس انجمن کے ذریعے غدار عہدہ داروں کا خاتمہ کردیا جاتا ہے۔

اس انجمن کے جملہ اراکین کی تعداد کا اندازہ نہیں لگایا گیا لیکن کہا جاتا ہے کہ آج کل ان کی تعداد لاکھوں تک

پہنچ گئی ہے۔ اس انجمن میں نہ صرف کثیر التعداد کسان فوجی سپاہی اور طلبار شامل ہیں بلکہ ذی اقتدار وطن پرست عہدہ دار بھی اس کے رکن ہونے کو باعث فخر سمجھتے ہیں۔ اس انجمن کی شاخیں جاپان کے تقریباً ہر شہر میں پھیلی ہوئی ہیں اور صدر مقام جاپان کا مشہور تجارتی شہر "اوکاسا" ہے اس انجمن کے نمایندے جاپان کے تقریباً تمام تجارتی و سرکاری محکموں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ اس انجمن کا آغاز ۱۸۹۵ء میں ہوا۔ اور یہ انجمن حیرت انگیز سرعت کے ساتھ ترقی کر گئی اس وقت اس انجمن نے حکومت پر زور ڈالا کہ وہ چین کے ساتھ فوراً جنگ کا آغاز کردے۔ چنانچہ اس انجمن نے منچوریا کو روس کے چنگل سے چھین کر جاپان کے حوالے کر دیا۔ اس انجمن کا عجیب و غریب نام اس دریا کے نام پر رکھا گیا ہے جو منچوریا اور روس کے درمیان بہتا ہے۔

اس انجمن کے جلسے اس قدر راز میں ہوتے ہیں کہ کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ راز داری کا تو یہ عالم ہے کہ ہر ایک رکن جلسے میں شریک ہوتے وقت اپنے چہرے پر ایک سیاہ نقاب ڈال لیتا ہے جس کی وجہ سے ایک رکن دوسرے کا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ یوم آغاز ہی سے اس انجمن کا مقصد یہ رہا ہے کہ جاپان کو بین الاقوامی شہرت دلوائے۔ یہ انجمن زیادہ تر اپنا تعلق جاپان کی بری و بحری افواج سے رکھتی ہے اور ہر دم ان طاقتوں کے فروغ میں کوشاں رہتی ہے اور جب کبھی کوئی ہستی ان کے کام میں رکاوٹ پیدا کرتی ہے اس کا خاتمہ کر دیا جاتا ہے چنانچہ حال ہی میں اسی وجہ سے مشہور سیاسی مدبر "کاہاشی" اور "معاشی ماہر" "برن ڈان" ٹوکیو کے بازار میں پر اسرار طریقے سے قتل کر دیئے گئے۔

واقعات شاہد ہیں کہ بعض اہم اور نازک موقعوں پر اس انجمن نے بڑے بڑے کام سرانجام دیئے ہیں۔ صدر کے صرف ایک اشارے پر اس انجمن کا ہر ایک رکن ریوالور، تلوار، بم، خنجر وغیرہ سے مسلح ہو کر مارنے اور مرنے کے لئے تیار رہتا ہے۔ چنانچہ حال ہی میں جاپان میں فوجی بغاوت کے وقت متعدد فوجی افسر پر اسرار طریقے پر قتل کر دیے گئے بہر حال یہ انجمن "سیاہ اژدہا" اگر ایک طرف مفاد وطن کی محافظت کا کام سرانجام دیتی ہے تو دوسری طرف اُن غداران وطن کا قلع قمع کیا جاتا ہے جو ملک کے سب سے بدترین دشمن ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جاپانی قوم اس کو صحیح معنوں میں اپنے جذبۂ حب الوطنی کا حقیقی مظہر سمجھتی ہے۔ اس انجمن کے اثر اور اقتدار کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ حکومت بغیر اس انجمن کی رضامندی کے کوئی کارروائی نہیں کر سکتی بعض مشہور اور صاحب اقتدار عہدہ دار جو اب تک پر اسرار طریقے پر قتل ہو چکے ہیں وہ یہ ہیں:۔

جنرل جوتا، وزرت، کپتان میٹو ھارا (وزیر اعظم جنھوں نے جاپان کے مفاد کے خلاف واشنگٹن کا بحری معاہدہ ۱۹۲۱ء میں قبول کیا تھا)

ہاما (وزیر اعظم جنھوں نے کثیر رقم رشوت میں لے کر بحری معاہدۂ لندن قبول کیا تھا)

تویوشی وانوکائی (وزیر اعظم جنھوں نے چین سے مصالحت کرنی چاہی)

کون کہہ سکتا ہے کہ مذکورۂ بالا عہدہ داروں کے قتل میں اس انجمن کا ہاتھ نہ تھا؟

اس انجمن کے بانی اور صدر ایک اسی سالہ معمر لیڈر تویاما ہیں۔ جن کا آج جاپان کی اہم ترین شخصیتوں میں شمار ہوتا ہے کہا جاتا ہے کہ تویاما اپنی اس انجمن کے ذریعے جو گذشتہ چالیس سال سے قایم ہے۔ اب تک سینکڑوں غداروں کو قتل کرا چکا ہے وہ جاپان کے مفاد کی خاطر دوست یا عزیز کسی کو خاطر میں نہیں لاتا۔ اس کا عقیدہ ہے کہ ایشیا صرف جاپان کے لئے ہے اور جاپانی ہی اس پر حکمرانی کا پورا پورا حق رکھتے ہیں۔

حال ہی میں اس عجیب وغریب ہستی سے ایک مشہور ہندوستانی سیاح مسٹر دھرماویرام۔ اے سے ان کی سیاحت جاپان کے دوران میں ملاقات ہوئی تھی۔ اس ملاقات کی تفصیلی کیفیت اور تویاما کی دلچسپ کہانی بہتر ہے کہ آپ خود صاحب موصوف کی زبانی سنیں۔ آپ نے اپنے تاثرات "ماڈرن ریویو" کی ایک حالیہ اشاعت میں شائع کروائے جن کا ترجمہ غالباً یہاں خالی از دلچسپی نہ ہوگا۔

"کوکوریوکائی" میں نے برف میں ٹھنڈی کی ہوئی کافی کی پیالی کو ایک لمحہ کے لئے ایک طرف ہٹاتے ہوئے کہا

"ہاں! کوکوریوکائی" اس نے لاپروائی سے جواب دیا۔

"لیکن اس کا صحیح تلفظ کیا ہے؟" میں نے سوال کیا۔

"کو۔کو۔ریو۔کائی" اس نے اس لفظ کے ٹکڑے کرتے ہوئے جواب دیا۔

میں نے دقت کے ساتھ اس لفظ کو دہرایا جس کو سن کر میرے جاپانی دوست نے مطمئن لہجے میں جواب دیا۔

"بالکل صحیح"

مسٹر آگیسٹو نے اپنی کافی ختم کر لی اور تھوڑی دیر بعد مجھ سے "خونی برادری" کی تحریک کے متعلق جو عام طور پر "بسیہ اژدر" کی انجمن کے نام سے موسوم ہے تفصیلات بیان کرنے شروع کئے۔

روس اور جاپان کی لڑائی میں جاپانیوں کی فتح کی وجہ صرف ان کی حسنِ تنظیم اور اعلیٰ فوجی قابلیت ہی نہ تھی بلکہ ایک روحانی طاقت بھی تھی جو اس فوج کے پس پردہ کام کرتی رہی۔ ایک وطن پرست مسٹر تویاما نے غالباً ۱۹۰۱ء میں یہ محسوس کیا کہ روسی سپاہیوں کے روبرو جاپانی سپاہی بالکل بونے اور کمزور معلوم ہوتے ہیں۔ اس نے ایک نوجوانوں کی انجمن کی تنظیم کی جن میں زیادہ تر طلبا شامل تھے اس نے اس کا نام "کوکوریوکائی" رکھا جس کے معنی ہیں "دریائے امور کے پرے"۔ روسیوں کی یہ کوشش تھی کہ وہ اپنے مشرقی سرحد کو وسیع کریں۔ منچوریا پران کی آنکھیں تھیں۔ جاپانی اس بے جا مداخلت کو برداشت نہیں کرسکتے تھے۔ محض مشرق میں روس کے اس بڑھتے ہوئے سیلاب کے انسداد کے لئے اس ادارے کا آغاز ہوا۔ جب کوئی نوجوان اس برادری میں شامل ہوتا ہے تو وہ مقدس طریقے پر قسم کھاتا ہے کہ اگر اسے حکم دیا جائے گا تو وہ مادر وطن کے قدموں پر اپنی جان قربان کردے گا۔ قربانی کا طریقہ ہراکری (خودکشی) مقرر کیا گیا ہے۔ بھینٹ چڑھنے والا نوجوان کسی مندر میں داخل ہوتا ہے اور سیدھے ہاتھ میں خنجر لے کر اپنا پیٹ چاک کرلیتا ہے۔ جس شخص کا معدہ بھی کٹ جائے وہی شہید تصور کیا جاتا ہے۔ ہراکری کو ہر رکن اپنی حقیر خدمت تصور کرتا ہے "۔

"قطع کلام کے لئے مجھے معاف فرمایئے۔ لیکن مسٹر تویاما کی کیا عمر ہوگی"؟ میں نے اپنے دوست سے سوال کیا۔

"آپ اپنے اندازے سے فرمایئے کہ ان کی کیا عمر ہوگی"؟ میرے دوست نے اُلٹا مجھ سے سوال کیا۔

"میں نہیں کہہ سکتا"، میں نے جواب دیا۔ "غالباً پچاس کے قریب ہوگی"۔

"اکیسٹو نے سنجیدہ لہجے میں جواب "ان کی عمر اسی سال سے متجاوز ہے"۔

"کاش میں اُن سے مل سکتا"، میں نے کہا۔

"مجھے یقین تھا کہ تم ان سے ملنے کے ضرور شایق ہوگے" اکیسٹو نے جواب دیا۔

میں نے پہلے ہی سے اس کا انتظام کر رکھا ہے۔ ہمارے دوست مسٹر ڈومو نے ہمارے لئے سب کچھ کر رکھا ہے ہم دو بجے تک وہاں پہنچ جائیں گے۔ آج آپ میرے مہمان نہیں ہیں بلکہ ہم دونوں کو ڈومو نے مدعو کیا ہے۔ وہاں سے ہم تویاما سے ملنے جائیں گے"۔

ہم ایک مخصوص جاپانی مکان کے سامنے کھڑے تھے۔ رواج کے مطابق ہم بغیر جوتے نکالے اندر داخل نہیں ہوسکتے تھے

جوتا اتارتے ہوئے میری نظر اٹھا گئی میری گھڑی پر پڑی۔ مقررہ وقت سے ہم ایک منٹ قبل آ گئے تھے۔ اوسط عمر کی ایک خاتون نے دروازے پر ہمارا استقبال کیا اور اندر لے گئی۔ وسط دالان میں چٹائی پر ایک معمر شخص بیٹھا ہوا تھا جس کی سفید اور لانبی داڑھی بالکل ٹالسٹائی کے مشابہ تھی۔ سیاہ فریم والے چشمے میں سے اس کی چھوٹی اور عقابی آنکھیں نظر آ رہی تھیں۔ اس کے چہرے پر جھریوں کے کوئی نشانات نہ تھے سوائے ماتھے کے جہاں دو تین شکنیں نظر آئیں۔ اس کا چہرہ منگولیا کے باشندوں کا سا تھا۔ ہمارے داخل ہونے کے بعد اس نے فوراً بدھا اور سنٹ نکرین کی بارگاہ میں عبادت شروع کر دی۔ اس کی آواز میں گو کوئی خاص بات نہ تھی لیکن دوسروں سے الگ پہچانی جا سکتی تھی۔ عبادت کے اختتام پر اس نے ہمارا مسکراتے ہوئے استقبال کیا۔ اس نے آکیسٹو کے ذریعے جاپان کے متعلق میری رائے دریافت کی۔ میں نے شکریہ ادا کرتے ہوئے موزوں الفاظ میں جواب دیا۔ میں نے آکیسٹو کے ذریعے اُن سے دریافت کیا کہ کیا وہ ہندوستان آنے کے خواہشمند ہیں۔ "ہاں ضرور ضرور"، اس نے ہاتھ ملتے ہوئے جواب دیا۔ "ہندوستان ہمارے لئے ایک مقدس سرزمین ہے۔ مہاتما بدھ وہیں پیدا ہوئے۔

"عہد شباب میں میرا ارادہ ہندوستان آنے کا تھا۔ لیکن اب میرے خیال میں .... اب میں جوان نہیں رہا" اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

وہ خاتون، جو غالباً اس کی معتقد تھی، ہمارے لئے سبز چائے اور بسکٹ خوبصورت پیالیوں میں لے آئی بسکٹ غالباً مکان ہی میں تیار کئے ہوئے تھے۔ بہرحال وہ بے حد خوش ذائقہ اور لذیذ تھے چائے کا ذائقہ ذرا بدلا ہوا تھا جس کی وجہ سے ہم میں سے ایک نے تھوڑی سی پیالی ہی میں بچا دی تھی جس پر تویاما کی عقابی نظر پڑ گئی۔ خاتون کے کان میں اس نے کچھ الفاظ کہے۔ تھوڑی دیر بعد وہ خاتون ہمارے لئے برف میں سرد کی ہوئی چائے تیار کر لائی اُن صاحب نے جو تھوڑی چار چھوڑی تھی معذرت چاہتے ہوئے کہا کہ ان کی وجہ سے یہ سب تکلیف برداشت کرنی پڑی۔ "نہیں تکلیف کی کوئی بات نہیں۔ وہ چائے "چائے" نہیں جس سے طبیعت پوری طرح سیر نہ ہو" مسٹر تویاما نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

کمرے کے ایک کونے میں کتابوں کا ایک بڑا ڈھیر پڑا ہوا تھا۔ میں یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آیا تویاما اب بھی کتابیں پڑھا کرتے ہیں۔ اس نے جواب دیا کہ گو اس کی عمر اس بات کی متقاضی نہیں لیکن پھر بھی مطالعہ کا شغل جاری

ہے۔ اس کے بعد کچھ ہندوستانی، جاپانی، اور بین الاقوامی سیاسیات پر بحث چھڑ گئی۔ اختتام بحث پر مسٹر تویاما نے ہمیں منچوریا بھی جانے کی تاکید کی اور وہاں کے محکمۂ ریلوے کے وزیر مسٹر ٹومیو کے نام ایک رقعہ بھی دیا جو ہمارے سفر منچوریا میں بے حد کارآمد ثابت ہوا۔

ہم نے تین بجے رخصت چاہی ہمارے بے حد اصرار کے باوجود مسٹر تویاما ہمیں دروازے تک چھوڑنے آئے۔

"ہاں! تو یہ تویاما ہی کا مکان ہے"؟ میں نے چھٹتے ہی اپنے دوست سے سوال کیا۔

"ہاں یہ مکان اُسی کا ہے بلکہ صحیح معنوں میں انجمن کا ہے" میرے دوست نے کہا۔

"انجمن کا؟ یعنی خونی انجمن کا؟ لیکن اس انجمن کے کاروبار کیسے چلتے ہیں؟"

"ابتداً اس نے چند غریب طلبا کے قیام و طعام کا انتظام کیا۔ جو اسی کے ساتھ رہ کر مختلف فنوں کی تعلیم حاصل کیا کرتے تھے گھر کا سارا کاروبار بھی لڑکے کیا کرتے تھے۔ اس طرح تویاما کو کوئی خاص دقت اُٹھانی نہ پڑی۔ جاپانی اپنے مالک کے بڑے وفادار ہوتے ہیں۔ آگے چل کر یہی لڑکے بڑے عہدوں پر فائز ہو گئے لیکن اپنے "روحانی گرو" کے احکام کی تعمیل کو اپنا مقدم فرض سمجھتے تھے۔ وہ اس کی مالی امداد بھی کرنے لگے۔ گذشتہ تیس سال میں مسٹر تویاما نے سینکڑوں نوجوانوں کی امداد اسی طرح کی۔ چنانچہ آج کوئی ساٹھ ہزار اشخاص اس کے زیر اثر ہیں۔ آج کل جاپان کی ہر وزارت مسٹر تویاما کی عزت کرتی ہے۔ بعض وزرا اس سے کانپتے ہیں اور بعض اس کی امداد کے خواہاں ہیں۔

دیگر ذرائع سے بھی مجھے مسٹر تویاما اور ان کی برادری کی نسبت بہت کچھ معلومات حاصل ہوئیں۔ ان کے اقتدار کی نسبت ایک دلچسپ واقعہ مشہور ہے کہ کئی سال قبل جب موجودہ بادشاہ ولیعہد تھا اور مرحوم شہنشاہ زندہ تھا ولیعہد کی نسبت ایک جاگیردار کی لڑکی سے قرار پائی۔ ایک عہدہ دار اس رشتے کو حسد کی نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ اس لڑکی کی شادی ولیعہد سے قرار پائے۔ اس نے لڑکی کے خلاف بادشاہ کے کان بھر دیئے۔ اور نسبت ٹوٹ گئی۔ جب تویاما کو اس واقعے کی اطلاع ملی تو وہ بے حد برانگیختہ ہوا "یہ محض بداعتقادی ہے" اس نے اپنی جماعت کو مخاطب کرتے ہوئے کہا "اور بادشاہ کی جانب سے بداعتقادی ایک گناہ ہے۔ قومی گناہ"

اس نے اس بارے میں شہنشاہ کی خدمت میں عرضداشت پیش کی کہ شہنشاہ سے ایسی حرکت نہ ہونی چاہئے لیکن اس کی آواز صدا بصحرا ثابت ہوئی۔

یہ دیکھ کر تویاما نے اپنے ایک ہزار مریدوں کو ہراکری کا حکم دیا۔ یہ قافلہ اپنے گرو کی صدارت میں مندر روانہ ہوا مسٹر تویاما جھک کر ان الفاظ میں دُعا کرنے لگے "ایک عالی قدر شخصیت ایک بڑے گناہ کی مرتکب ہو رہی ہے اس گناہ سے اس کو باز رکھنے کے لئے یہ نوجوان اپنی جان قربان کرنے آئے ہیں۔ ان کے اس حقیر پیش کش کو قبول کر"

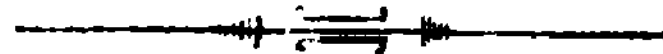
جوں ہی یہ الفاظ ادا ہوئے ایک نوجوان نے آگے بڑھ کر خنجر سے اپنا پیٹ چاک کر لیا۔ دوسرے نے اس کی تقلید کی اور اسی طرح سلسلہ بندھ گیا۔ جب شہنشاہ کو ہراکری کی اطلاع ملی تو وہ خوف سے حیران و ششدر رہ گیا۔ فوراً ایک نمائندہ شاہی پیغام لئے ہوئے مندر پہنچا۔ بادشاہ نے وعدہ کر لیا تھا کہ نسبت برقرار رہے گی۔ ہراکری روک دی گئی اور یہ جماعت اپنی قیام گاہ کو واپس آگئی۔

بیس سال قبل لالہ لاجپت رائے آنجہانی امریکہ سے جاپان آئے ہوئے تھے۔ اس وقت ان سے لوگ پوری طرح واقف نہ تھے۔ تھوڑے عرصے کے بعد وہ جاپان میں تنہائی سے اس قدر اکتا گئے کہ انھوں نے دوبارہ امریکہ جانے کا تہیہ کر لیا۔ ایک ہندوستانی طالب علم نے صاحب موصوف کا مسٹر تویاما سے تعارف کرایا۔ مسٹر تویاما نے ان کے اعزاز میں ایک شاندار دعوت ترتیب دی جس میں مشہور و معزز جریدہ نگار مدعو کئے گئے تھے۔ آپ نے لالہ لاجپت رائے کے کارناموں کا ان سب سے تعارف کرایا۔ دوسرے دن جاپان کے تقریباً ہر اخبار میں لالہ لاجپت رائے ہی کا ذکر خیر تھا۔ اس طرح ایک دن ہی میں لالہ لاجپت رائے کا نام ہر ایک کی زبان پر تھا۔ اس کے بعد لالہ جی کوئی آٹھ مہینے کے قریب جاپان میں ٹھیرے رہے

غالباً لالہ لاجپت رائے اس زمانے میں جاپان میں مقیم تھے جب مسٹر راش بہاری بوس وہاں پہنچے مسٹر بوس ہندوستانی طالب علموں سے ملتے رہتے تھے۔ مسٹر تویاما سے بھی ان کی ملاقات ہوتی رہتی تھی۔ مسٹر بوس وہاں دو سال مقیم رہے ٹوکیو کے مقیم برطانوی قونصل کو یہ معلوم ہوا کہ یہ انقلابی راش بہاری بوس ہیں۔ اس وقت جاپان اور انگلستان میں بے حد دوستانہ تعلقات تھے۔ گو جاپانی وزیر خارجہ کو ہندوستانی طالب علموں کے ساتھ بے حد ہمدردی تھی لیکن جب ان پر زور ڈالا گیا تو انھوں نے مسٹر بوس کے شہر بدری کے احکام جاری کئے۔ وجہ یہ بیان کی گئی کہ مسٹر بوس جرمن جاسوس ہیں۔ انھیں دس دن کی مہلت دی گئی تھی اس مدت میں صرف ایک ہی جہاز ہانگ کانگ کی طرف روانہ ہوتا تھا جہاں برطانوی پولیس انھیں آسانی سے گرفتار کرسکتی تھی۔ مسٹر بوس نے جاپانی حکومت کے احکام خلاف ورزی کا تہیہ کر لیا۔ پندرہ جاپانی پولیس افسروں نے مسٹر بوس کے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ مسٹر بوس نے باہر آکر

علی الاعلان کہا کہ وہ خود کو جاپانی حکام کے رحم و کرم پر چھوڑ دینا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپیل کی کہ انھیں شہر بدر نہ کیا جائے لیکن وزیر ذی مقتدر کے حکم کے سامنے پولیس کچھ نہ کر سکتی تھی۔ ایسے موقع پر مسٹر تویاما پہنچ گئے۔ کسی نہ کسی طرح وہ مسٹر بوس کو وہاں سے نکال لے جانے میں کامیاب ہوگئے۔ کسی کو پتہ تک نہیں چلا کہ مسٹر بوس یکایک کہاں غایب ہوگئے۔ اگر کسی کو پتہ چل بھی جاتا تو تویاما کے سامنے کسی کی دال نہیں گل سکتی تھی۔ متواتر تین سال تک بوس کمین گاہ ہی میں پوشیدہ رہے اس کے بعد وزارت میں تبدیلی واقع ہوئی تب کہیں جا کر مسٹر بوس کو آزادی نصیب ہوئی۔ مسٹر بوس نے ایک جاپانی خاتون سے شادی کر لی ہے جس سے اولاد بھی ہوئی ہے۔ جاپان میں ہندوستانی حلقے میں آج کل بھی مسٹر بوس کا شہرہ ہے وہاں کا ہر شخص جانتا ہے کہ مسٹر بوس کی گلوخلاصی مسٹر تویاما کی زیر بار منت ہے۔ اس کے لئے مسٹر بوس صاحب موصوف کے بے حد شکر گزار ہیں۔

محمد حبیب اللہ اوج
متعلم بی ایس سی (عثمانیہ)



"سوزِ مضطرب"

نہ پوچھو میرے سوزِ مضطرب کی حشر سامانی
ہزاروں کر دیئے ہیں میں نے پتھر کے سے دل پانی

گیا ہوں ماورائے حدِ محسوسات بھی اکثر
تقدس آشنا میرے تخیل کی ہے جولانی

مجھے پھونکا ہے خود میری ہی شمعِ سوزِ عرفاں نے
مرے طرزِ تعشق پہ ہے پروانوں کو حیرانی

مرے جذبات رہ جاتے ہیں اکثر تشنۂ معنی
ہے کتنی دل شکن الفاظ کی یہ تنگ دامانی

منور ہے مری راہِ عمل امید کی ضو سے
ہے بازارِ عمل میں گرچہ ناکامی کی ارزانی

مری دنیا میں ہے جوشِ عمل کی کارفرمائی
مرے مذہب میں بدتر کفر سے ذوقِ تن آسانی

جگر ٹکڑے مگر پیہم تبسم میرے ہونٹوں پر
زباں خاموش لیکن دل ہے محوِ آتش افشانی

تعجب کیا ہے ان قطروں سے دوزخ سرد ہو جائے
ہمارے ہر بنِ مو سے ٹپکتی ہے پشیمانی

مرے افلاس کی ٹھوکر پہ ہے قارونیت قرباں
مرے پائے گدائی پر نگوں ثروت کی پیشانی

خس و خاشاک نے برقِ تپاں کو جذب کر کے اب
زمانے کی ہوا کا رُخ بدل دینے کی ہے ٹھانی

خلیل آساں ہے جو ئے شیر لانا سعی سے اپنی
اگر ہو دستگیر اس سعی میں تائیدِ یزدانی

خلیل الرحمٰن [illegible]

رُوحِ انسانی کا عقیدہ اسلام میں

قرآن شریف کو مسلمان ایک ایسی کتاب سمجھتے ہیں جو تمام خلق کے لئے شمع ہدایت ہے اور اُسی کی ضیا پاشی کی بدولت ان کا خیال ہے کہ یورپ میں نشاۃ جدیدہ کا آغاز ہوا۔ گو اس کو اہلِ یورپ یونان کی تباہی اور علمائے یونان کی جلا وطنی کا نتیجہ بتاتے ہیں۔ جہاں اسلام نے دنیا کو علم و فضل سے واقف کرایا ہے اسی طرح مسلمانوں نے اپنی ابعدالطبیعات بھی پیش کی ہے۔ لیکن انھوں نے ایسے نظریئے پیش نہیں کئے جو قابلِ اعتراض قرار پاتے۔ جب کوئی طباع دربارِ رسالت میں حاضر ہوتا تو اُس کو روح کا تو کیا ذاتِ خداوندی کا بھی درس دیا جاتا تھا۔ جس کا شرف صحابۂ کرام کو حاصل تھا لیکن جب کوئی مفسد یا منافق آتا اور دریافت کرتا "اے محمد! یہ تو بتاؤ کہ روح کیا چیز ہے"۔ تو جواب ملتا "قل الروح من امر ربی" اور اس معترض اور کم فہم کو بلا کسی عذر کے واپس ہو جانا پڑتا۔ اس کے علاوہ یہی وہ جواب ہے جو حضور کی نبوت کو ثابت کر دیتا ہے

اکثر علماء کا خیال ہے کہ جب یہ کہہ دیا گیا کہ روح حکم ربی ہے اور وہ غیوب میں سے ایک غیب ہے تو پھر ہمارا اس کے متعلق حجت میں پڑنا بڑا ہے۔ لیکن امام غزالیؒ کا خیال اس کے خلاف ہے اور وہ اس آیۃ کریمہ کی تفسیر یوں کرتے ہیں کہ خدا نے مذکورہ بالا آیۃ کریمہ سے یہ درس نہیں دیا کہ تم اس سے نابلد رہو۔ بلکہ وہ جواب صرف معترضین کے لئے ہے اور ایک حد تک امام غزالیؒ کا خیال درست ہے۔ کیوں کہ خدا جب اپنے متعلق خود فرماتا ہو کہ "الرحمٰن فسئل بہ خبیرا" تو

پھر روح جو ایک حکم رب ہے اس کے جان لینے سے منع فرمانا صحیح معلوم نہیں ہوتا۔ اگر واقعی خدا کو روح یا امر رب کے جاننے روکنا مقصود ہوتا تو وہ پھر مزید آیات مثلاً "واذا ضرب احدکم فلیجتنب الوجہ فان صورتہ الانسان علیٰ صورتہ الرحمن وغیرہ نازل کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ کیونکہ رحمن صفت ہماری روح سے متصف ہو جاتی ہے نہ کہ اس جسد خاکی سے اور جب ان احادیث کے ذریعے جگہ بہ جگہ درس دیا گیا ہے تو پھر ہمیں اس کی ماہیت مذہب کی روشنی میں دیکھنی چاہئے۔

روح کے متعلق مختلف تصورات زمانہ سابق کی مانند اب بھی پائے جاتے ہیں۔ روح کو قوتِ حیات کا مرکز مان لیا گیا ہے۔ اسی بنا پر بعض لوگوں کا خیال ہے کہ "روح خون ہے"، کیونکہ جب تک انسان کے جسم میں تیزی سے خون کا دوران ہوتا ہے۔ اس وقت تک انسان چست و چالاک زندگی بسر کرتا ہے۔ لیکن جب اس کی روانی میں انحطاط آتا ہے تو انسان میں ضعف پیدا ہو جاتا ہے اور جب وہ بالکلیہ رک جاتا ہے تو انسان کی موت واقع ہو جاتی ہے۔ اسی طرح بعض لوگ عناصر اربعہ کے اتصال ہی کے نتیجہ کو روح اور اس کے انفراق کو موت تصور کرتے ہیں۔ اگر ایسا ہو گا تو اس کے معنٰی یہ ہوں گے کہ روح ایک مادی چیز ہے۔ جو اجزائے مادی سے ترکیب پاتی ہے اور اس کے جدا ہونے پر وہ فنا ہو جاتی ہے ؎

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہورِ ترتیب موت کیا ہے انہی اجزا کا پریشاں ہونا

لیکن یہ بھی غلط ہے اور اس کی غلطی بدیہی ہے۔ چنانچہ نظام سیار جو ایک زبردست فلسفی گذرا ہے اور جس کا فلسفہ ارسطو سے ماخوذ ہے اس کے نزدیک روح کوئی غیر مادی شئے نہیں ہے لیکن وہ روح کو ایک لطیف ترین جوہر تصور کرتا ہے اور انسان کی اصل حقیقت روح کو مانتا ہے جسم کو اس کا آلہ کار قرار دیتا ہے۔ روح کو جسم کے ساتھ رکھتا ہے۔ کیوں کہ جب اس کو جدا کیا جائے تو غالباً روح باقی نہیں رہتی۔ اس کے نزدیک کوئی شئے اپنے عرض سے علیحدہ ہو کر اپنی ذات باقی نہیں رکھ سکتی۔ جس طرح گلاب کی روح گلاب میں ہے۔ اسی طرح انسان کی روح انسان کے اندر جاری و ساری ہو۔ افکار و جذبات اس جوہر لطیف کے حرکات کے نام ہیں۔ اس روح کے نظریے کو نظام اپنے ذات و صفات کے نظریے کے تحت رکھ کر بحث کرتا ہے۔ جس کی وجہ سے روح بھی ایک حاسہ بن جاتی ہے۔ کیوں کہ جذبات اور افکار اس کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ جان لاک میں (جو عہد جدید کا فلاسفر ہے) نظام کے خیالات کا عکس پایا جاتا ہے اس لحاظ سے ان دونوں میں ایک گونہ مماثلت پیدا ہو گئی ہے۔ اور اسی بنا پر نظام کو لاک کا پیشرو خیال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ روح کو ذہن یا دماغ بھی خیال کیا جاتا ہے۔ یہ خیال مغربی فلاسفہ میں بہت زیادہ نظر آتا ہے۔

معمر ابن عباد جس کا ذکر کلامی مسائل میں آتا ہے ۔ اور جس نے اعتزال اختیار کیا ۔ وہ بھی روح کو انسان کی اصلیت و ماہیت مانتا ہے ۔ اس کی نوعیت اُس کے نزدیک ایک تصور یا غیر مادی جوہر کی سی ہے ۔ روح کے متعلق صرف اتنا اور کہہ دینا ہے کہ وہ علم و ارادہ رکھتی ہے اور عمل و ادراک جسم کا فعل ہے ۔ اور یہ قالب ہماری روح کے غلاف کا کام دیتا ہے ۔ یہ تین تصورات بالکل عام ہیں اور اہل مذہب بھی ان تصورات میں سے کسی ایک تصور کی طرف مائل ہوتے ہیں اگر وہ مذہب کی بتلائی ہوئی روح سے بے بہرہ ہوں ۔

نظریۂ غزالی روح کو حضرت امام غزالیؒ ایک خالد جوہر فرض کرتے ہیں ۔ یہ جوہر عرض نہیں ہے ۔ کیوں کہ عرض علم ہے جو عالم میں حلول کرجاتا ہے ۔ لیکن جوہر کی ایسی حقیقت نہیں ہے ۔ روح ایک ناقابلِ تجزیہ جوہر ہے یعنی روح "جزو لایتجزیٰ" ہے ۔ یہ لامکان ہے ۔ کیوں کہ مکان میں رہنے کی صورت میں شئے قابلِ تقسیم ہوتی ہے ۔ لیکن روح ناقابلِ انقسام ہے ۔ "جزو لایتجزیٰ" کہنے سے ایک اور بات لازم آتی ہے کہ روح اگر جزو ہے تو اس کا کُل ہونا ضروری ہے ۔ اور جب کُل ہوگا تو یہ قابلِ انقسام ٹھیرے گی ۔ اگر نہیں تو پھر جزو کے کیا معنیٰ ؟ غزالی خود اس کی توضیح فرماتے ہیں ۔ اور بتلاتے ہیں کہ انسان ایک فرد ہے ۔ جو تصور انسان کا جزو ہے اور اسی رشتے کو قایم رکھ کر لفظِ جزو استعمال کیا ہے ۔ لفظِ جزو کی وضاحت کے بعد وہ روح کے لایتجزیٰ ہونے کا ثبوت دیتے ہیں ۔ اگر فرض کریں کہ روح قابلِ تقسیم ہے تو ہوسکتا ہے کہ میری روح کے ایک حصّے کا زید کو جو کہ میرا دوست ہے ۔ علم ہو اور اس کا دوسرا حصّہ اِس کی دوستی سے ناواقف ہو لیکن یہ علم و جہل یعنی تناقضات روح میں نہیں پائے جاتے اور جب تناقضات نہ پائے جائیں تو ظاہر ہے کہ روح واحد ہے ۔ جو قابلِ انقسام نہیں ہے ۔ البتہ دو اشخاص میں ایسی صورت ممکن ہے ۔

روح کی وضاحت میں لفظ جوہر استعمال کیا گیا ہے ۔ اب ضرورت اس امر کی ہو کہ ہم اس جوہر کی حقیقت کو پیش کریں ۔ جوہر سے مراد امام غزالیؒ کے نزدیک ایک ایسی حقیقت ہے جو نہ بدن انسانی میں شامل ہے اور نہ خارج "جوہر" نہ جسم سے متصل ہے اور نہ منفصل جیسا کہ معمر ابنِ عباد کا خیال ہے ۔ یہاں ایک قابلِ اعتراض بات یہ پیدا ہوتی ہے کہ ان مندرجہ بالا تناقضات میں صرف ایک ہی کا صحیح ہونا ضروری ہے ۔ لیکن غزالی کا خیال ہے کہ یہ اس وقت ہوگا جب کہ شئے متعلقہ ہو ۔ جب یہ روح عالمِ خلق کا جوہر نہیں ہے ۔ بلکہ اس کا تعلق عالمِ

سے ہے۔ تو پھر متناقضات میں سے ایک کی صحت کا لازم آنا ضروری نہیں رہتا۔ جہت میں بھی یہ نہیں پائی جا سکتی۔ کیوں کہ وہ لامکان ہے۔ اور جسم کے جملہ شرائط سے بالاتر ہے۔ لہذا اس جوہر کی حقیقت یہ ہوئی کہ یہ ایک عالم امر کی شئے ہے جس کی "تقدیر" نہیں ہو سکتی۔ جس چیز کی "تقدیر" ہو سکے وہ عالم اجسام یا عالم عوارض میں سے ہے۔ جس کو عالم خلق کہتے ہیں۔ خلق کے معنی اصل میں تقدیر و اندازے کے ہیں نہ کہ ایجاد کے جیسا کہ "خلق الشیٔ ای قدرہ" سے ظاہر ہے۔ اسی طرح جس چیز کا اندازہ یا تخمینہ نہ کیا جا سکے۔ ہم اس کو عالم امر کا جوہر کہیں گے اور ایسی چیز جس کی تقدیر ناممکن ہو وہ امر رب ہے عالم امر سے مراد ایسی چیزیں ہیں جو حس و مکان و جہات و خیال سے خارج ہوں۔

یہاں پر ایک اعتراض پیدا ہوتا ہے کہ انسان میں روح ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ارشاد ہوتا ہے کہ "انی خالق بشراً من طین" اور بشر کو مٹی سے نسبت دی جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ اپنے کو نفخت من روحی کہہ کر روح سے نسبت دیتا ہے۔ تو پھر یہ تناقض کہ بشر میں روح ہے۔ کہنے کے بعد مٹی سے نسبت دینا کیا معنی؟ لیکن یہ سوال کوئی عقدۂ لاینحل نہیں ہے۔ یہ اختلاف محض لاعلمی کا نتیجہ ہے۔ اگر سورج یہ کہے کہ میں ساری دنیا پر نور کا فیضان کر رہا ہوں تو سورج کی روشنی میں کیا خاص کمی اس فیضان سے واقع ہو رہی ہے۔ پس انسان خاکی فرد ہے جس پر روح کا فیضان ہونے کے بعد اس کی یہ صورت پیدا ہو جاتی ہے۔ پس "فاذا سویتہ ونفخت فیہ من روحی" بھی صحیح ہے اور "انی خالق بشراً من طین" بھی صحیح ہے

اب سوال جو قابل غور ہے وہ یہ ہے کہ کیا روح ازلی ہے اور ابدی ہے؟ بادی النظر میں اوپر کے استدلال کے بموجب ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ کیوں کہ وہ امر ربی ہے اور اس کے ساتھ ہی ساتھ عوارض سے خارج ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ روح انسانی میں یہ عوارض نہیں پائے جاتے اس کو ہم عالم خلق کی چیز نہیں قرار دے سکتے۔ یعنی روح کو ہم غیر مخلوق کہہ سکتے ہیں لیکن جب حادث اور قدیم کی بحث اٹھائی جائے کہ جتنی مخلوق ہے سب حادث ہے تو ایسی صورت میں روح کو ہم مخلوق میں شامل کریں گے۔

پیدائش روح انسانی حضرت امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ جب شکم مادر میں نطفہ قرار پاتا ہے۔ اور اس میں تدریجی ارتقا ہوتا ہے اور وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ نور الٰہی یعنی روح کو قبول کر سکے۔ تو اس وقت ظل الٰہی اس پر پڑتا ہے اور روح انسانی اس میں جاری و ساری ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال انھوں نے ایک آئینے سے دی ہے

جو فولاد سے بنایا جاتا ہے۔ فولاد کو صیقل کیا جاتا ہے۔ اور جب وہ اس قدر جلا پا جاتا ہے کہ مطلوب کے عکس کو ظاہر کرسکے تو اس وقت اس کو مطلوب کے روبرو رکھا جاتا ہے۔ تاکہ عکس حاصل ہو۔ لیکن اس عمل کی وجہ سے اس مطلوب میں کسی قسم کی نہ کمی ہوتی ہے اور نہ زیادتی۔ مگر آئینے کو عکس حاصل ہوجاتا ہے۔ جو اس کا مقصد ہے۔ اسی طرح یہاں بھی سورج کی مثال صحیح ہے کہ اس کا نور تو دنیا کو منور کئے ہوئے ہے۔ لیکن اس کی ذات میں کوئی کمی واقع نہیں ہورہی ہے۔

(رباعی)

چون نور کہ ز فروغ خود جہاں آراید — بر ہر پاک و پلید کہ بتابد شاید
نے نور او ز ہیچ پلید آراید — نے پاکیٔ او ز ہیچ پاک افزاید

روح انسانی کو بعض لوگ ازلی و ابدی خیال کرتے ہیں۔ اور حیران ہوتے ہیں۔ اگر یہ فرض کرلیا جائے کہ ارواح ازلی اور ابدی ہیں تو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یا تو ان میں وحدت ہے یا کثرت۔ اگر وحدت ہے تو اس وقت دنیا کے ہر کس و ناکس کا علم یکساں ہونا چاہئے۔ اگر زید یہ کہے کہ میں نے اس دنیا کے خالق کو دیکھا ہے تو بکر کا بھی یہی دعویٰ ہونا چاہئے۔ کیوں کہ ان کی ارواح میں وحدت ہے۔ اور یہ محال ہے۔ اس لئے روح واحد نہیں۔ علاوہ ازیں روح انسانی لامکانی ہے تو اس میں یہ تقسیم اور تجزیہ کس طرح ممکن ہوا؟ اگر کثرت ارواح کو مانا جائے۔ تو ہم کو معلوم ہے کثرت تب ہی فرض کی جاسکتی ہے کہ ان اشیاء میں مابہ الامتیاز خصوصیات موجود ہوں اور باہم متماثل ہوں۔ باہم متماثل ہونے میں بھی تخالف ضروری ہے۔ خواہ وہ کسی قسم کا ہو زید اور بکر دو بھائی ہوتے ہیں جن میں علاوہ صورت کے تشابہ کے اخلاق و عادات میں بھی مماثلت ہوتی ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان میں تخالف پایا جاتا ہے۔ یعنی ان دونوں کے جداگانہ قالب ہوتے ہیں۔ اور یہی تفریق انھیں کثیر بناتی ہے۔ بہرحال مغائرت جسمانی ضرور پائی جاتی ہے۔ لیکن روح میں مغائرت ہی نہیں تمام ارواح بشری کی ماہیت اور حقیقت ایک ہے۔ اب اختلاف عوارض بھی ناممکن ہے۔ کیوں کہ ارواح جوہر ہیں۔ جو ان اعراض سے مبرا و منزہ ہیں۔ اس لئے روح میں اختلاف نہیں پایا جاتا۔ بناءً علیہ روح کا قدیم ہونا قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ گو روح قدیم نہیں لیکن اس کا خلود ضروری ہے کیوں کہ جب روح اس جسد خاکی سے پرواز کرتی ہے تو ان مختلف افعال خیر و شر کا اثر اس میں باقی رہتا ہے جو فرد نے اپنی زندگی میں کئے تھے۔ جسد اگر مٹی میں مل گیا تو اس کے یہ معنی نہیں کہ روح بھی خاک میں مل کر خاک ہوگئی کیوں کہ وہ مادی شئے نہیں اور نہ خدا میں شامل ہوسکتی ہے۔ کیونکہ عکس کبھی اصل میں شامل نہیں ہوسکتا۔ لہذا اب ارواح کی کثرت لازم آتی ہے کیوں کہ تعلقات بھی پیدا ہوچکے ہیں۔ اور یہ ارواح روز قیامت تک باقی رہیں گی۔ لیکن یہ ازل سے موجود نہیں ہیں۔

یہ سوال ہو سکتا ہے کہ اگر روح عوارض سے پاک ہے اور اس کی کوئی صورت نہیں ہے تو پھر "خلق اللہ آدم علی صورتہ" اور "علی صورۃ الرحمن" کے کیا معنیٰ ہیں۔ تھوڑے سے غور و فکر کے بعد معلوم ہو سکتا ہے کہ صورت دو قسم کی ہو سکتی ہے ایک صورت تو ظاہری اور شکلی صورت ہے اور دوسری صورت معنوی۔ جب روح جوہر ہے اور عوارض سے پاک تو پہلی صورت مراد لینا صحیح نہیں ہے اس کو معنوی لحاظ سے سمجھنا چاہیے۔ لہٰذا ان آیات کے معنیٰ یہ ہوں گے کہ انسان میں یا انسان کی روح میں اور ذات باری تعالیٰ میں چند صفات مشترکہ پائی جاتی ہیں جس طرح خداوند عز و جل تمام کائنات پر قدرت رکھتا ہے۔ اسی طرح روح بھی اپنے قالب پر قادر ہے۔ خدا کا تصرف عالم اکبر پر ہے اور انسان کا تصرف عالم اصغر پر۔ اسی بنا پر انسان کو خلیفۃ اللہ اور اشرف المخلوقات کے نام سے موسوم کیا گیا ہے۔

مذکورۂ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ خدا نے پہلے نطفے یعنی مادے کی بالیدگی کی۔ اس کے بعد اس میں روح پھونکی یعنی اس سے اس بات کا استخراج ہوتا ہے کہ پہلے خالق نے جسم بنایا اور بعد میں روح پھونکی اور واقعہ بھی ایسا ہی ہو اس کا ثبوت نص قرآنی ہے۔

"فاذا سویتہ ونفخت فیہ من روحی فقعوا لہ ساجدین" (الحجر)

"جب اس کو (صورت انسانی میں) درست کیا اور اس میں اپنی (بے بہا چیز یعنی) روح پھونک دی تو اس کے آگے سجدے میں گر پڑے"

خلاصہ یہ ہے کہ روح ایک امر رب ہے، یہ جوہر ہے جس میں عوارض نہیں پائے جاتے؛ یہ ازلی نہیں ہے لیکن ابدی ضرور ہے، اللہ تعالیٰ نے انسان کا قالب پہلے بنایا اور اس کے بعد روح اس میں پھونکی؛ ارواح انسانوں کے مرنے کے بعد اُن انسانوں کے اوصاف کے اثرات کے ساتھ باقی رہتی ہیں، روح فیضان باری ہے اور حادث نہیں ہے اور روح حس، جہات اور خیال سے ماورا ہے۔ کیوں کہ عالم امر کی پیداوار ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(ماخوذ از امام غزالیؒ)

عبدالحمید عثمانی متعلم بی۔ اے (آخری)

یاد

شب تاریک ہے تارے فلک پر جگمگاتے ہیں
سر گردوں سیہ بادل بھی کچھ کچھ آتے جاتے ہیں

خموشی ہر طرف چھائی ہے محوِ خواب ہے دنیا
کنارے جھیل کے بیٹھا ہوا ہوں ایک میں تنہا

کبھی وہ جھیل کا پانی ہوا کے تند جھونکوں سے
تلاطم خیز ہے جیسے کسی کی زلف لہرائے

وہ پانی جھیل کا ٹکرا کے اس صورت اچھلتا ہے
کسی کی یاد میں جیسے دل مضطر مچلتا ہے

جھلکتے آب پر تارے جو چھپ کر پھر ابھرتے ہیں
وہ یوں معلوم ہوتے ہیں کہ گویا رقص کرتے ہیں

یہاں بیٹھا ہوا دل میں کسی کو یاد کرتا ہوں
کبھی آنسو بہاتا ہوں کبھی میں آہ بھرتا ہوں

سرِ آغازِ شناسائی میں مجھ سے خود ہی ملتے تھے
مرے اشعار سنتے تھے تو غنچے دل کے کھلتے تھے

وہ تنہائی میں اکثر شعر میرے گنگناتے تھے
کبھی کچھ غور کرتے تھے کبھی کچھ مسکراتے تھے

وہ اکثر آ کے میرے پاس پہروں بیٹھے رہتے تھے
مگر خاموش رہتے تھے میں کچھ کہتا تو کہتے تھے

کبھی پُرشوق نظروں سے جو اُن کو دیکھ لیتا تھا
وہ شرما کر جو نیچی آنکھ کرتے میں تڑپ جاتا

کبھی غمگین جو مجھ کو دیکھتے تو وہ ہنسا دیتے
میرے بے کیف غم کو راحت افزا وہ بنا دیتے

خوشی تھی کیف تھا سرشاریاں تھیں وہ بھی کیا دن تھے
کہ جب واقف نہ تھے آزار سے تکلیف سے غم سے

وہ سب گزری ہوئی باتیں مظفرؔ یاد آتی ہیں
دلِ پُردرد کو تڑپاتی ہیں مجھ کو رلاتی ہیں

محمد مظفر الدین مظفرؔ
متعلم سال دوم

دُودھ

میں چاہتا تھا کہ غذا اور صحتِ عامہ کے موضوع پر کچھ تحریر کروں لیکن یہ بحث اس قدر بسیط ہے کہ مضمون بہت زیادہ طویل ہو جائے گا اسی لئے میں نے غذاؤں میں سے صرف دودھ کو اپنی بحث کا موضوع قرار دے لیا ہے تاکہ ایک ہی چیز پیش کی جائے لیکن تفصیل کے ساتھ۔ آج کل دودھ کے خواص اور اس کی ماہیت کے علم کی وجہ سے اس کی حیثیت اغذیہ میں سب سے اول ہے یہ گویا حقیقی معنی میں ہماری زندگی کے لئے آبِ حیات ہے۔ خصوصًا ہندوستان اس معاملے میں بہت خوش قسمت ہے کہ یہاں دودھ دینے والے جانوروں کی کمی نہیں تقریبًا ہر گھر خدا کی اس نعمت سے محروم نہیں لیکن سخت افسوس ہے کہ ہماری آبادی کا صرف ایک بہت ہی حقیر حصہ دودھ کے صحیح استعمال سے واقف ہے۔ ورنہ عام طور پر اسے نہ تو اچھی غذا تصور کیا جاتا ہے اور نہ اسے استعمال کیا جاتا ہے۔ اس دور میں بھی بعض گھرانے آپ کو ایسے ملیں گے جہاں صرف بیماری کے موقعے پر دودھ کی شکل نظر آتی ہے۔ کیوں کہ اسے بیماروں کی غذا سمجھا جاتا ہے۔ اس خام خیالی کی وجہ سے بہت سے گھرانے قدرت کے اس گراں قدر عطیہ سے محروم ہیں۔

دودھ ایک ایسی اعلیٰ غذا ہے جو بچے سے لے کر بوڑھے اور تندرست سے لے کر بیمار تک کے لئے ضروری ہے اس میں کافی سے زیادہ غذائیت موجود ہوتی ہے۔ یہ ہماری خوش قسمتی ہے کہ ہمارے ملک میں اس کی افراط ہے

اگر ہم اس کی اہمیت پر غور کریں اور دودھ کو زیادہ مقدار میں حاصل کرنے کے وسائل اختیار کریں تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ ہر گھر سے دودھ کی گنگا بہہ سکتی ہے لیکن اس کے لئے ضرورت ہے کہ ہم اپنی نمایشی طرز معاشرت کو چھوڑ کر حقیقی اور ذاتی فایدے کی طرف توجہ کریں۔

دودھ سے بے اعتنائی کی سب سے بڑی وجہ جو میں نے محسوس کی وہ یہی ہے کہ عام طور پر لوگ دودھ کے خواص اور اس کی ماہیت اور اس کی ہر جہتی فوائد سے واقف نہیں۔ اگر یہ چیزیں معلوم ہو جائیں تو میں سمجھتا ہوں کہ وہ لوگ جو اب دودھ کو بیماروں کی غذا سمجھتے ہیں پانی کی بجائے دودھ ہی پینا پسند کریں۔ اس اہم چیز کے متعلق چند اساسی اور ضروری باتوں کو پیش کرنے کی کوشش کروں گا۔

یہ ایک عام بات ہے کہ دور اولین میں انسان کی زندگی مصنوعی چیزوں سے بے نیاز ہوتی ہے۔ یہی حال غذا کا بھی ہوتا ہے اس وجہ سے قدیم زمانے کے لوگوں کی عمریں کافی طویل ہوتی تھیں۔ وہ بہت تندرست اور توانا ہوتے تھے۔ بجائے مصنوعی غذاؤں کے دودھ کا زیادہ استعمال ہوتا تھا اور سچ پوچھو تو اسی میں ان کی تندرستی اور درازی عمر کا راز پنہاں تھا۔

دودھ ایک قسم کا ہلکا سا زرد سیال مادہ ہے۔ مزہ نمکین ہے اور خاصیت ہلکے ترشی سی ہے۔ گرم کرنے پر گاڑھا ہوتا ہے۔ اس کی کثافت اضافی ۱۰۲۹ء۱ - ۱۰۳۴ء۱ تک بدلتی رہتی ہے۔ مزاج میں معتدل اور ہلکا سا دست آور ہے۔ دودھ ہر لحاظ سے مکمل غذا ہے۔ کیوں کہ اس میں کافی حیاتین ہوتے ہیں۔ یہ رگ پٹھوں کو طاقت بخشتا ہے۔ اس میں چونا کافی مقدار میں ہوتا ہے جو ہماری ہڈیوں کے لئے ضروری ہے۔ دماغی کام کرنے والوں کے لئے یہ ایک بہترین غذا ہے۔ گائے کے دودھ میں شکر اور نمک کم ہوتا ہے۔ بھینس کی نسبت گائے کا دودھ زود ہضم ہوتا ہے۔ بھینس کے دودھ میں بمقابل گائے کے دودھ کے دہنیت زیادہ ہوتی ہے۔ بکری کا زیادہ زود ہضم ہوتا ہے۔ اور اس میں بڑی خوبی یہ ہوتی ہے کہ وہ دق اور سل کے جراثیم سے پاک ہوتا ہے۔

دودھ کے ان خواص کا سرسری ذکر کرنے کے بعد اب ایسی چند چیزیں پیش کی جاتی ہیں جو اچھے دودھ کے لئے ضروری ہیں۔

(۱) سب سے اول ہمیں دودھ دینے والے جانوروں کی نسل کا خیال [illegible] افزایش نسل کے لئے جو جانور منتخب کئے جائیں وہ اچھے ہوں یعنی اول تو ان کی صحت اچھی ہو اور دوسرے وہ [illegible] دینے ہوں جس سے ان کے دودھ میں لازماً دہنیت زیادہ ہوگی۔

(۲) دودھ دینے والے جانور کی صحت کے ساتھ ساتھ آب وہوا کا بھی خیال رکھا جانا ضروری ہے۔ خراب آب وہوا
سے جانور کے دودھ میں نہ صرف کمی ہوتی ہے۔ بلکہ اس میں غذائیت کا عنصر بھی کم ہو جاتا ہے۔

(۳) دن میں صرف دو مرتبہ یعنی صبح و شام دودھ دوہنا چاہئے۔ ہمارے یہاں یہ بڑی بُری رسم پڑ گئی ہے کہ
دوالے دودھ کے لئے جانوروں کو گھر گھر لئے پھرتے ہیں۔ اس کی وجہ بے اعتمادی ہے۔ اس کا جانور کے دودھ پر بُرا اثر
پڑتا ہے اور دودھ کی مقدار کم ہو جاتی ہے۔ اور جانوروں کے امراض میں مبتلا ہو جانے کے مواقع بڑھ جاتے ہیں اسی بات
نہایت ضروری ہے کہ دودھ کسی خاص مقام پر جہاں کافی صفائی ہو دوہا جائے تاکہ بیماریوں کے جراثیم نہ پھوٹ سکیں
دوسری بات یہ ہو کہ زیادہ دودھ کی حرص میں مختلف ذرائع اختیار کرکے حسب خواہش دودھ دوہنے کی کوشش قرین مصلحت نہیں۔ بلکہ ہمیشہ
دودھ ایک ہی مقدار میں نکالنا چاہئے اور کتنا نکالنا چاہئے اس کا اندازہ آپ کو جانور کی عام حالت اور اپنے تجربے سے ہو سکتا ہے

(۴) غذا۔ جانوروں کی خوراک کا مسئلہ بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ ہمارے ملک میں چارے کی کمی نہیں۔ لیکن اس کے
باوجود ہم دیکھتے ہیں کہ دودھ دینے والے جانوروں کو کبھی تو عدم واقفیت کی وجہ سے اور زیادہ تر اخراجات کو کم کرکے
زیادہ فائدہ اُٹھانے کے مدنظر خراب غذائیں دی جاتی ہیں۔ جس سے دودھ کی نوعیت اور افادیت میں فرق آجاتا ہے
اور دودھ سے ہم جو حقیقی فائدہ اُٹھا سکتے ہیں محروم ہو جاتے ہیں۔ اس لئے اس امر کا کافی خیال رکھا جانا چاہئے کہ دودھ دینے
والے جانوروں کو ایسی خوراک دی جائے جو مناسب ہو مثلاً Dehao ہری گھانس۔ بنولہ۔ کڑبی۔ کلتھی کھلی وغیرہ وغیرہ خصوصاً
موسم گرما میں غذا کا مسئلہ بہت زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے۔ جانور دُبلے ہونے لگتے ہیں اور دودھ پتلا پڑ جاتا اور کم ہو جاتا ہے اس
موسم میں خصوصیت کے ساتھ جانور کو ایسی غذا دی جائے کہ وہ اپنی توانائی کو برقرار رکھ سکے۔

(۵) برتاؤ۔ مثل مشہور ہے۔ "مزدور خوش دل کند کار بیش" یہی مقولہ دودھ دینے والے جانوروں پر بھی
صادق آتا ہے۔ اگر جانوروں کے ساتھ سخت سلوک کیا جائے اور بلاوجہ زدوکوب کی جائے تو جانور میں ایک طرح کا
نفسی ہیجان پیدا ہو کر اس کے عصبی نظام کو متاثر کرتا ہے۔ جس سے دودھ پر ہر طرح کا بُرا اثر پڑتا ہے۔

(۶) جانوروں کے رہنے کی جگہ۔ میں نے اکثر اس بات کو محسوس کیا کہ ہمارے پاس جانوروں کے رکھنے کی
طرف خاص توجہ نہیں کی جاتی۔ بلکہ کئی جانور گلے کی شکل میں ایک چھوٹی سی جگہ میں بھر دیئے جاتے ہیں۔ جس سے انھیں
صاف ہوا نہیں مل سکتی۔ صاف ہوا نہ ملنے سے ان کا نفسی نظام بھی اس طرح متاثر ہوتا ہے جس طرح انسان کا۔ نتیجہ یہ

ہوتا ہے کہ جانور بیمار ہو جاتے اور دُبلے ہونے لگتے ہیں۔ اس کے علاوہ اگر جگہ کھلی نہ ہو تو گوبر اور جانوروں کے پیشاب سے عفونت پیدا ہو جاتی ہے۔ طرح طرح کے جراثیم پیدا ہوتے اور جانور کے جسم کو گھن کی طرح کھانے لگتے ہیں۔ اس لئے جانوروں کے رہنے کی جگہ کو صاف ستھرا رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ اور ہر جانور کو کافی جگہ دی جانی چاہئے۔

علاوہ ازیں ایسی جگہوں پر دودھ دوہنا بھی مناسب نہیں کیوں کہ دودھ میں بو کو قبول کرنے کی خاصیت موجود ہوتی ہے اسی باعث ان مقامات پر دوہے ہوئے دودھ کا مزا خراب ہو جاتا ہے۔ یہ تجربے کی بات ہے کہ اگر جانور کو دودھ دوہنے سے کچھ عرصے پہلے پیاز کھلا دی جائے تو دودھ میں پیاز کی بو آئے گی۔ اس سے آپ اس کی حساسیت کا اندازہ کرسکتے ہیں

(۶) **صحت** - جانور کی صحت کا ہمیں ہر وقت خیال رکھنا چاہئے۔ بیماری انسان کو بھی ہوتی ہے اور حیوان کو بھی۔ لیکن ان میں ایک ناطق ہے اور دوسرا بے زبان۔ جانوروں کے امراض کا حال ان کی مخصوص علامات سے معلوم ہو سکتا ہے سب سے بڑی علامت اس کا سُست ہو جانا ہے۔ جانور کے سُست ہوتے ہی ہمیں سمجھ لینا چاہئے کہ اس کی صحت میں کچھ نہ کچھ خرابی پیدا ہو گئی ہے۔ یہ دیکھتے ہی ہمیں چاہئے کہ فوراً اس کے علاج کی طرف رجوع ہو جائیں ورنہ مرض بڑھ کر اور مشکلات پیدا کرے گا۔

جانور کا دودھ جو انسان کے لئے ایک طرح کی رحمت ہے۔ لیکن اگر اس میں خرابی پیدا ہو جائے تو انسان مختلف بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے اور خاص طور پہ چند امراض ایسے ہیں جو دودھ کی وجہ سے انسان کو متاثر کرتے ہیں۔

جانوروں کی وہ بیماریاں جو دودھ کے ذریعے انسان کو متاثر کرتی ہیں۔

(۱) **دق** - یہ ایک مرض ہے جو انسان اور حیوان دونوں کو ہوتا ہے - اگر کسی جانور کو دق ہو اور اس کا دودھ استعمال کیا جائے تو لازماً وہ بھی دق میں مبتلا ہو جائے گا لیکن اس کا پتہ ظاہری حالت سے نہیں بتایا جا سکتا۔ بلکہ دُبلے جانور کا T.B. یعنی دق کا امتحان کرا لیا جانے پر ظاہر ہو سکتا ہے

(۲) **منھ اور پاؤں کی بیماریاں** - اگر کوئی جانور منھ اور پاؤں (کُھر) کی بیماری میں مبتلا ہو تو اس کا دودھ استعمال نہ کیا جائے کیوں کہ اس مرض کے جراثیم دودھ میں بھی موجود ہوتے ہیں اور انسان کو بھی متاثر کر دیتے ہیں۔ مغربی ممالک میں تو اس کی سخت احتیاط کی جاتی ہے اور ان جانوروں کا دودھ پھینک دیا جاتا ہے پھر تندرست ہونے پر ان کا دودھ استعمال کیا جا سکتا ہے۔

(۳) ہ چیچک۔ جانوروں کو چیچک بھی ہوتی ہے۔ اس کے علامات تھن پر نمودار ہوتے ہیں۔ جیسے ہی یہ علامات ظاہر ہوں ان کا دودھ استعمال نہ کرایا جائے۔ ایسے جانوروں کا دودھ یوں تو سب کے لئے نقصان دہ ہے لیکن بالخصوص ان بچوں کے لئے بے حد مضر ہے جنھیں چیچک کا ٹیکہ نہیں لگایا گیا ہے۔

(۴) Rabies (سگ گزیدگی) دودھ دینے والے جانور کے دیوانہ کتّا کاٹ لے تو اس کا دودھ بہت خطرناک ہوتا ہے۔ کیونکہ یہ جراثیم دودھ کے ذریعے انسان میں داخل ہوتے ہیں۔

میں نے صرف چند ایسی بیماریوں کا ذکر کیا ہے جو دودھ کے ذریعے انسان کے جسم میں داخل ہوتی ہیں لیکن چند بیماریاں ایسی بھی ہیں جو ایک بیمار انسان سے دودھ کے ذریعے دوسرے تندرست انسانوں میں منتقل ہوتی ہیں۔ چنانچہ اگر دودھ دوہنے والا کسی ایسی بیماری میں مبتلا ہو جس کے جراثیم متعدی قسم کے ہوں تو دودھ ان جراثیم کا حامل ہو کر دوسرے انسان کو مضرت پہونچاتا ہے۔ مثلاً میعادی بخار کے جراثیم کی پرورش کے لئے دودھ بہت موزوں ہے۔ اس لئے اگر دودھ دوہنے والا اس مرض میں مبتلا ہو تو اس کے تھوک یا سانس سے جو جراثیم نکلیں گے وہ دودھ یا دودھ کے برتن پر پرورش پاکر دوسرے انسان کو متاثر کریں گے۔ اسی طرح حلق اور ناک کے بیماریوں کے جراثیم کی دودھ کے ذریعے اشاعت ہوتی ہے۔ ان امور کی بنا پر ہمیں دودھ دینے والے جانور کے ساتھ ساتھ دودھ دوہنے والے کی صحت پر بھی نگاہ رکھنی چاہیئے۔ ورنہ دودھ کا جو حقیقی فائدہ ہونا چاہیئے نظر ہی حاصل نہ ہوسکیگی

باوجود ان تمام احتیاطوں کے پھر بھی لغزش کے بہت سے امکانات ہیں۔ چنانچہ یہی دقت مغرب کے ماہرین فن کو پیش آئی۔ اور انھوں نے اس کا ایک سائینٹفک حل دریافت کیا یہ Pasteurism[1] پاسچری طریقہ ہے۔ اس طریقے میں دودھ کو ایک معینہ تپش پر گرم کیا جاتا ہے یہ تپش اتنی نہیں ہوتی کہ دودھ جوش کھانے لگے۔ کیونکہ دودھ کو جوش دینے سے اس کا جوہر چلا جاتا ہے اس لئے اس کو ایک ایسی تپش تک گرم کیا جاتا ہے کہ اس کی غذائی خوبیوں پہ اثر نہ پڑے۔ اس کے بعد دودھ کو ایک خاص مشین پر ٹھنڈا کیا جاتا ہے۔ یہ دودھ جراثیم سے پاک ہوتا ہے اور دوسری خوبی یہ ہے کہ جلدی خراب ہونے نہیں پاتا اور نہ اسے دوبارہ گرم کرنے کی ضرورت پیش آتی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس طریقے میں طول عمل بھی ہے اور اخراجات بھی زیادہ ہوتے ہیں۔ لیکن اگر کثیر مقدار میں دودھ خرچ ہونے لگے تو مجموعی طور پر اخراجات گھٹ جاتے ہیں یہ صرف اس صورت میں ممکن ہے جب کہ ہماری آبادی کا ایک کثیر حصہ دودھ کا استعمال کرنے لگے اور جگہ بجگہ ڈیری فارمس قایم کئے جائیں۔

اس مختصر بحث کے بعد میں یہ ضرور کہوں گا کہ صرف معلومات حاصل کرنے سے کام نہیں چلتا بلکہ ہم کو ان پر عمل بھی کرنا چاہیئے

---

[1] یہ لفظ (Pasteur) سے بنا ہے (Pasteur) فرانس کا مشہور سائنس داں گزرا ہے (۱۸۲۲ء تا ۱۸۹۵ء)

ہم میں اکثر ایسے لوگ ہیں جو کم و بیش ان امور سے واقف ہیں لیکن ان پر پابندی سے کاربند نہیں ہوتے حالانکہ ہماری نظامِ حکومت نے ان معلومات کی اشاعت کے لئے ایک ڈیری فارم قایم کیا ہے ہمیں چاہئے کہ نہ صرف وہاں سے دودھ خریدیں بلکہ وہاں جاکر دودھ سے متعلقہ تفصیلات کو عملی طور پر اپنی آنکھوں سے دیکھیں اور اپنے گھروں میں اسی طرح کا عمل کریں۔

آخر میں ہم کو ایک اور اہم مسئلہ کی طرف متوجہ ہونا چاہئے وہ یہ ہے کہ عرصہ سے دودھ کی تجارت ایک ایسے طبقے کے ہاتھ میں ہے جو دودھ سے متعلق بہت کم صحیح معلومات رکھتا ہے۔ لیکن اگر پڑھے لکھے لوگ اس کو اپنا پیشہ قرار دیں تو میرے خیال میں یہ سب مشکلات رفع ہو جائیں گی۔ اس کے ساتھ ہی اگر بلدیہ اس خصوص میں توجہ کرے اور جانوروں پر نگرانی رکھے۔ اس کی غذا سے متعلق ہدایت دے۔ دودھ دوہنے والوں کی صحت کا وقتاً فوقتاً معاینہ کرے۔ جانور کے رہنے سہنے کی جگہ کے انتظام کو دیکھے اور دودھ کا ایک اوسط معیار قایم کر دے تو اس سے شہر کی صحت عامہ پر اچھا اثر مترتب ہو سکتا ہے۔ اسی کے ساتھ بلدیہ اور عوام کی جانب سے دودھ اور دوسری اغذیہ سے مختلف زبانوں میں اشتہار تقسیم کئے جائیں اور جدید اصول پر پروپگنڈا کیا جائے تو عوام بڑی حد تک مستفید ہو سکتے ہیں۔ ایسی کوشش سے صحت عامہ پر بڑا اچھا اثر ہوگا اور خصوصاً غربا کا طبقہ، جو اکثر جہالت اور عدم واقفیت کی وجہ سے مختلف امراض میں مبتلا ہو کر نذرِ اجل ہو جاتا ہے صحت اور تندرستی سے زندگی بسر کر سکے گا۔

عبدالغفار بیگ (عثمانیہ)

جی، ایم وی اسی (مدراس)، وٹنری سرجن

سرگزشتِ شاعر

ستارہ صبح کا بن کر فلک پر جلوہ آرا ہے — نمودِ خسروِ خاور کا کیا دلکش نظارا ہے
کبھی آغوشِ شبنم میں ترانہ حسن کا گایا — نسیمِ صبح بن کر ہے کبھی غنچوں کو چٹکایا
کبھی پھر عشق کی لے میں جنوں کا گیت گایا ہے — کبھی اندازِ الفت میں دلوں پر کیف چھایا ہے
کبھی رونق فزا نوخیز کلیوں کے تبسم میں — کبھی ہے صورتِ نغمہ عنادل کے ترنم میں
کبھی ہے جلوہ گستر وہ شمیمِ گل صفت بن کر — کبھی ہے نغمہ زاروں میں مجسم شعریت بن کر
کبھی ہے صورتِ مضطر فسانہ دل کی دھڑکن کا — کبھی لالہ کبھی نرگس کبھی غنچہ کبھی کانٹا
کبودی آسماں پر ہے سفینہ نور کا بن کر — کبھی اندازِ وحشت میں شفق کا خونچکاں منظر

جہانِ رنگ و بو بن کر سرور آگیں ہواؤں میں
تبسم ریز ہوتا ہی جوانِ شب کی اداؤں میں

کبھی دوشیزگیٔ ناز کا دلکش ترانہ ہے
کبھی رنگینیٔ فطرت میں اک برقی خزانہ ہے

صدائے شہپرِ جبریل کے جاں بخش نغموں میں
کبھی روپوش ہوتا ہے تعطر خیز جھونکوں میں

کبھی محوِ خرامِ ناز شاخِ گل پہ ہو جانا
نہاں ہو کر گھٹاؤں میں کبھی گوہر فشاں آنا

کبھی لمعہ فگن ہے طور پر برقِ تجلی سا
کسی کو جلوۂ رنگیں کے آگے ہے گرا دیتا

کبھی کرتا ہے پیدا لحن موسیقار ساغر سے
فضا کو وجد آئے ایسی ہو جھنکار ساغر سے

نمودِ حسن قایم ہے غرض شاعر کی ہستی سے
بہت سرشار رہتا ہی مئے فطرت کی مستی سے

ابو الواحد وہاب الدین سلیم

حیدرآباد میں مسئلہ حمل و نقل

سڑک اور ریل کی ہم آہنگی

ریاست حیدرآباد ہندوستان کی سب سے بڑی سلطنت ہے۔ ہماری ریاست رقبے کی وسعت، آبادی کی کثرت آمدنی کی فراوانی، تہذیب و تمدن کی رفعت، علوم و فنون کی ترقی، مذہبی آزادی، اور سب سے زیادہ ہمارے فرماں روا کی دانش مندی کی وجہ سے پورے ہندوستان میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا رقبہ اگر انگلستان اور اسکاٹ لینڈ دونوں کے مجموعی رقبے سے بڑھ کر ہے تو انگلستان اور ویلز کے رقبے سے بھی بمقدار $\frac{2}{5}$ زیادہ، آئرستان کے رقبے کا ڈھائی گنا، میسور کے رقبے سے سہ چند سے کچھ کم اور ٹراونکور سے دس گنا بڑھا ہوا ہے جو عظمت و اقتدار اور مخصوص اختیارات اس کو حاصل ہیں وہ کسی ہمسایہ ریاست کو نصیب نہیں۔

حیدرآباد کے اس زرین عہد میں یوں تو بہت سارے کامیاب تجربات کے مظاہرے ہوتے رہے لیکن ریلوں کا انفکاک اور اس سے زیادہ ریل اور سڑک کے میکانی حمل و نقل کا ارتباط ایک قابل تقلید اور کامیاب تجربہ ہے۔ بقول ناظم صاحب[1] معلومات عامہ، ریل اور سڑک کے تعاون حمل کا حیدرآباد میں تجربہ پورے ہندوستان کے لئے قابل تقلید اور سبق آموز ہے

---

[1] حبیب الرحمن صاحب کے ایک مضمون "ریل اور سڑک کی ہم آہنگی" سے لیا گیا ہے۔

ممالک محروسہ سرکار عالی میں ریلوے لائنوں کا سلسلہ تمام دیسی ریاستوں کے مقابل بڑھا ہوا ہے۔ ملک کے طول و عرض میں ریلوں کا ایک جال پھیلا ہوا ہے۔ لائنوں کا مجموعی طول (۱۶۶۲) میل ہے جس میں ۱۷۱ میل لائن حکومت ہند یا کسی خانگی کمپنی کی ملکیت ہے۔ سررشتہ ریلوے سرکار عالی کے تحت ریاست کی جملہ لائنوں کا طول اس وقت (۱۳۴۷) میل ہے جس کے منجملہ ۶۸۸ میل چوڑی پٹری اور ۶۵۹ میل چھوٹی پٹری ہے۔ یہ ہر دو لائن متصل ریلوے لائنوں سے ۵ جنکشنوں پر ملتی ہیں جو ممالک محروسہ سرکار عالی کی سرحدوں پر یا اس سے قریب واقع ہیں یہ الحاقات مسافرین اور تجارت درآمد برآمد کے لئے بہترین سہولتیں مہیا کرتے ہیں اور اس کے علاوہ شمالی و جنوبی ہندوستان اور مشرقی و مغربی سواحل کے مسلسل راستوں کے درمیانی مقاموں کی حیثیت بھی رکھتے ہیں۔

ریلوں کی قدیم تاریخ

آج سے کوئی ۶۰ سال پہلے حیدرآباد میں ریلیں جاری کرنے کا مسئلہ حکومت کے پیش نظر رہا۔ صوبہ بمبئی اور صوبہ مدراس کے ریلوں کے ذریعے الحاق کے تصفیے کے بعد ہی یعنی سنہ ۱۸۷۴ء میں یہاں ریلوں کی داغ بیل سکندرآباد میں ریلوے لائنوں کی ترویج سے ڈالی گئی جس کا طول ۱۱۷ میل تھا۔ اس کے دس سال بعد ہی ۲۰۰ میل لمبی لائن کا اضافہ ہوا اس طرح آج ریلوے لائنوں کا طول ۱۶۶۴ میل تک پہونچ گیا۔

ریلوں کی جدید تاریخ

موجودہ دور حکومت میں اُن چھوٹی بڑی شاخوں کے علاوہ دو اہم لائنوں کا اضافہ ہوا سکندرآباد۔ ڈورناچلم ریلوے لائن کی ترویج کے باعث جنوبی ہند سے نقل و حمل کی حد درجہ سہولت ہوگئی۔ دوسری بڑی لائن سنہ ۱۹۲۸ء میں قاضی پیٹھ تا بلہار شاہ کے اضافے نے شمالی ہندوستان اور جنوبی صوبوں کے لئے ایک قریبی راستہ فراہم کر دیا۔ معادن لائنوں کی تکمیل کا مسئلہ بھی متعلقاً پیش نظر رہا ہے۔ اس ضمن میں ایک قابل ذکر بات یہ ہے کہ سنہ ۱۹۳۰ء میں حکومت سرکار عالی نے کمپنی سے ریلوں کو حاصل کیا یہ امر واقع ہے کہ وہ اجارے جو مفاد عامہ کے خلاف ہوتے ہیں ان کا حکومت کی مِلک بن جانا اور حکومت کے نظم و نسق میں آجانا عوام الناس کے لئے بے حد مفید ثابت ہوتے ہیں۔ اس اہم نکتے کو پیش نظر رکھتے ہوئے سنہ ۱۹۲۰ء میں The Ack کمیٹی نے ہندوستانی حکومت کی توجہ ریل جیسے کاروبار کو خالص قومی ملکیت بنانے کی طرف منعطف کرائی۔ ہماری حکومت سرکار عالی نے جلد اس مسئلہ کی طرف توجہ کی چنانچہ ریلوں کے انفکاک کے بعد ہی کا ذکر ہے کہ وقارآباد بیدر ریلوے لائن کی پرلی وبجناتھ تک (۱۱۰) میل کی توسیع عمل میں آئی۔ اس کی افتتاح خود حضرت اقدس و اعلیٰ بندگان عالی نے بہ نفس نفیس فرمایا۔ اس کے علاوہ موجودہ بڑی لائنوں کی

شاخیں نکالی گئیں اور دور افتادہ مقامات کو اس سلسلے میں منسلک کیا گیا تاکہ قحط سالیوں کا شائبہ باقی نہ رہے۔ حکومت کی کوشش ہمیشہ ریلوں کی توسیع کی طرف مائل رہی ہے۔ چنانچہ جگتیال، اورنگ آباد، بیڑ اور عادل آباد کی معادن لائنوں کی پیمائش کی گئی۔ ان کے علاوہ ناندیڑ عادل آباد اور پرلی بیڑ اورنگ آباد (۲۵۶) میل لائنوں کی مختلف اسکیمیں زیر غور رہیں علاوہ ازیں ایک چھوٹی لائن جانکیم پیٹ اور بودھن جہاں حال میں شکر کا کارخانہ قایم ہوا ہے ریلوے لاین سے متصل کرکے آمد و رفت میں یک گونہ سہولت مہیا کی گئی ہے تاکہ کارخانہ ہذا کو حمل و نقل کی صعوبتوں اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑے۔

تجارت کی توسیع اور مسافرین کی غیر معمولی کثرت نے حکومت کو ریلوے کے متعلقہ امور میں سہولتیں بہم پہنچانے پر مجبور کیا۔ چنانچہ چھوٹی لائن پر دہری پٹریوں کے نصب کرنے کے بعد مقامی ریل گاڑیاں ہر آدھ گھنٹے کے عرصے سے بلا رکاوٹ دوڑنے لگیں حیدرآباد قاضی پیٹھ پورنا ڈورناکل جیسے اسٹیشنوں کی تجدید عمل میں آئی جدید وضع کے ورک شاپ کھولے گئے اس کے ساتھ ہی لالہ گوڑہ کے ریلوے دواخانہ کی توسیع کی گئی اور جدید آلات سے اس کو سنوارا گیا۔

ریلوے مالیہ[۱] اواخر ادی بہشت ۱۳۴۶ف ختم مارچ ۱۹۳۷ء تک اپنی ریلوے لائنوں پر سرکار عالی نے جتنا سرمایہ لگایا ہے اس کی مقدار (۱۴۶۴۶۵۶۲۷) روپے دوران سال مختتمہ اواخر ادی بہشت ۱۳۴۶ف م ۳۱ مارچ ۱۹۳۷ء (۲۲۸۰۳۰۷) روپے خام آمدنی ہوئی اور خالص آمدنی (۱۱۴۷۵۲۳۹) روپے جو اصل زر سرمایہ ۸ر ۵ فی صدی بابتہ ۱۳۴۲ف م ۱۹۳۳ء کے مقابل ۶ر ۷ فی صد منافع کے مساوی ہے اس طرح ہمارے کاروبار ہندوستان کے اعلیٰ درجے کے ریلوے کاروبار کے مقابلے میں طمانیت بخش اور حوصلہ افزا ہیں (Goods traffic) مال کی نقل و حمل سے جو منافع حاصل ہوا وہ واقعی آپ اپنا نظیر ہے۔

بلا شبہ خیر خواہان ریاست کے لئے یہ ذی وقعت معاملت جو کہ کمپنی اور حکومت کے مابین ہوئی ہے موجب مسرت ہے۔ سرکار کی بالغ نظری اور حکمت عملی سے اس معاملے کے احسن تصفیے پر عوام نے بڑا اطمینان محسوس کیا کہ یکم اپریل ۱۹۳۰ء میں حکومت نے (۸۳) لاکھ پونڈ کمپنی کو ادا کرکے ریلوے کو اپنی ملکیت میں داخل کرلیا اس ریلوے کا نام بجائے ین، جی، ایس، آر کے ین، یس، آر۔ رکھا گیا۔

ریل اور بس کی ہم آہنگی اس موقع پر ریاست کی اس پیش قدمی کا تذکرہ بھی مناسب معلوم ہوتا ہے جو ریل اور سڑک

[۱] مندرجہ ذیل اعداد The Economic life of Hyderabad سے حاصل کئے گئے ہیں۔

کے میکانی ذرائع نقل و حمل کے جامع ارتباط سے متعلق ہے کمپنی کے دست برد سے ریلوں کو نجات دلانے کے بعد حکومت کی توجہ سڑکوں کی طرف مبذول ہوئی جہاں ریلوں اور خانگی موٹر لاریوں میں غیر معاشی مسابقت پیدا ہوگئی تھی اس کی بیخ کنی کرنا گویا ریلوے کے موازنے میں سے ٹیکس کے اُٹھا دینے کا مترادف تھا۔ بلا شبہ ریل سے حکومت کو ۱۰۶ لاکھ روپیے سالانہ آمدنی ہوئی تھی لیکن اس غیر مفید اور مضرت رساں مقابلے کے باعث یہ خدشہ لگا ہوا تھا کہ کہیں ریل کے منظم کاروبار درہم برہم نہ ہوجائیں نیز خانگی بسوں کے مالکوں نے جو ظلم و تشدد روا رکھا تھا اس میں روزافزوں ترقی ہو رہی تھی اور یہ تلخ حقیقت تھی کہ ان افراد کا دائرہ عمل بھی بڑھتا جا رہا تھا چنانچہ رعایا کی گلو خلاصی اور موازنے کی غیر یقینی حالت کو رفع کرنے کے لئے ریل اور سڑک میں اشتراک عمل پیدا کرنے کی کوشش کی گئی تاکہ رعایا کی تکالیف اور دشواریوں میں ایک گونہ کمی ہو۔ انہی اسباب پر سڑک کا اجارہ بھی حکومت نے اپنے تسلط میں لے لیا۔ محکمہ ریلوے کا اعتراض صرف خانگی اجاروں کی حد تک تھا جو سڑکوں پر قابض تھے یہ ضروری نہیں کہ اجارے ہر طریق پیدائش میں نقصان رساں ثابت ہوں۔ موجودہ دور کے ان اداروں سے جن کا تعلق براہ راست عوام سے ہو زیادہ سے زیادہ فائدہ صرف اسی صورت میں حاصل ہو سکتا ہے کہ وہ خانگی ملکیت سے نکل کر سرکاری اقتدار کے تحت آجائیں۔ اس زمانے میں اور بھی ایسے اجارے ہیں جن سے عوام کا براہ راست تعلق ہے۔ بہرنوع محکمہ ریلوے، بسوں کے اشتراک عمل سے ایک نئے اجارے کی بنیاد نہیں ڈال رہا ہے بلکہ مختلف اور منتشر خانگی اجاروں کو ایک جا جمع کرکے ایک اجارے دار کی حیثیت سے خود اس کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھنا چاہتا ہے تاکہ مفاد عامہ کا خیال ہمیشہ سامنے رہے۔ سرکاری بسوں کی ترقی کی راہ میں خانگی لاریوں کی غیر معاشی مسابقت ایک رکاوٹ ثابت ہوئی اس نوعیت کے کاروبار میں توسیع و فروغ اُسی وقت ممکن ہے جب کہ راستے میں کوئی حریف حارج نہ ہو۔ اصل میں یہی خیال ریل اور بس کے تعاون عمل کا محرک ثابت ہوا۔

(Mitchel Kirk-ness) کی رپورٹ میں اس امر پر خاص طور سے روشنی ڈالی گئی ہے کہ حتی الامکان ایسے اجاروں کا قلع قمع کرنے کی ممکنہ کوشش کی جائے جو براہ راست عوام کو نقصان پہنچاتے ہوں" آگے لکھا ہے "اگر اس قسم کی مسابقت پر حکومت کی جانب سے کوئی تحدید عاید نہ کی جائے تو عوام کی زبوں حالی اور پریشانی کی کوئی انتہا باقی نہ رہے گی"

مختصر یہ ہے کہ انتہائی غور و فکر کے بعد یہ تصفیہ کیا گیا کہ ریلوے محکمہ کے تحت بس کے اشتراک عمل کی آزمائش چند

مخصوص سڑکوں پر کی جائے جہاں کرایوں کی شرح اور دوسرے امور کلیتہً سررشتہ ریلوے کے اختیار میں ہیں۔ جب یہ تجربہ کامیاب ہوا تو حکومت نے اطمینان کا سانس لیا اور ۴ ½ لاکھ روپیے کا سرمایہ اس کام کے لئے منظور فرمایا اس رقم سے ۴۰۰ میل اضلاع میں اور اندرون شہر و سکندرآباد بس سرویس کا انعقاد عمل میں آیا۔ اس کا آغاز ۱۵ر جون ۱۹۳۲ء ایس ۲۷ موٹربسوں سے ہوا۔ شرح کرایہ کی یکسانیت اوقات کی پابندی رعایا کی آسایش و آرام کا خیال اور کاروبار میں تنظیم ایسے امور ہیں جنھوں نے خانگی بسوں کے کاروبار کے بازار کو سرد کردیا۔ سرکاری بس سرویس کی کامیابی کا مزید اطمینان اس وقت ہوا جب اضلاع میں توسیع کاروبار کے مطالبات پر وقتاً فوقتاً لحاظ ہوتا رہا اور روز افزوں سرکاری بسوں کی مقبولیت بڑھتی گئی چنانچہ سنہ ۱۹۳۶ء میں حکومت نے اضلاع کے بسنے والوں کی خواہش کے مدنظر بجائے ۲۷ بسوں کے ان کی تعداد ۱۱۸ کردی اور گذرگاہوں کی مسافت میں ۱۳۶۴ میل کا اضافہ ہوا سرکاری کاروبار کی ہردل عزیزی اور ترقی کا مزید ثبوت اس سے ملتا ہے کہ آخر مارچ سنہ ۱۹۳۷ء میں بسوں کی مجموعی تعداد ۳۱۸ تھی اور گذرگاہوں کی انتہائی مسافت ۳۹۰۰ میل یعنی ممالک محروسہ سرکار عالی کی اہم شاہ راہوں کے ¾ حصے پر مبنی تھی۔ اضلاع میں جب خانگی کاروبار سرد پڑگیا تو اکثر افراد شہر میں جا کر بسنے لگے اور ابتدا میں حکومت سے یہ اجازت حاصل کی کہ قلب شہر میں سرکاری بسوں کے دوش بدوش اپنا کاروبار جاری رکھیں۔ بعض بجائے مسافروں کی خدمت کے اپنی لاریوں کو زیادہ تر سامان کے نقل و حمل کے لئے استعمال کرنے لگے۔ سچ پوچھو تو یہاں سے خانگی لاریوں اور سرکاری ریلوے بسوں میں شدید مسابقت کے علاوہ ایک نئے قسم کے مقابلے کا آغاز ہوتا ہے۔ اب تک سامان کی نقل و حمل سے ریلوں کا فائدہ ہوتا تھا لیکن ان خانگی موٹر لاریوں کے دخل درمعقولات نے مقابلے کا ایک نیا راستہ کھول دیا۔ اس صورت حال پر حکومت نے مختلف قوانین و ضوابط سے قابو پایا۔ (۲۴۰۰) میل سڑک پر جو دو رعایتی اجارے اضلاع میں کاروبار پر جاری تھے سنہ ۱۹۳۶ء میں ان کا خاتمہ کردیا گیا۔ گذشتہ چار سال کے تجربے نے حکومت کو مطمئن کردیا کہ سامان کی نقل و حمل میں اور کرایوں کے نسبتاً کم شرح سے معتدبہ منافع بہتر نظم و نسق کے ذریعے کمایا جاسکتا ہے۔ سرکاری بس فی میل فی کس چھ پائی حالی جو پانچ پائی کلدار کے برابر ہے وصول کرتی ہے چونکہ خانگی اجارے داروں کا یہ مطمح نظر تھا کہ جس طرح ہو ریلوے موٹر بس کو میدان سے ہٹادیا جائے۔ اس لئے ان سڑکوں پر جو ریلوے لائن کے متوازی ہیں خانگی افراد چار پائی وصول کرنے لگے تھے (Mitchel Kirkness) کی رپورٹ میں یہ واضح کردیا گیا ہے کہ خانگی لاریوں کے مالک جو چار پائی فی میل

فی کس وصول کرتے ہیں وہ واقعی ایک غیر معاشی شرح ہے اور ریلوے کے انتظام کے لئے ایک مضرت رساں مسابقت ہے جہاں تک محکمہ ریلوے کے نظم و نسق کا تعلق ہے وہ اس امر کو مناسب سمجھتا ہے کہ ممکنہ طور پر کرایوں کی معاشی شرح مقرر کی جائے ورنہ اس کا قوی احتمال ہے کہ نقصان کی وجہ سے تنظیم کار و بار میں فرق پیدا ہو جائے گا" اس خانگی کاروبار میں بہت ایسے افراد تھے جو تھوڑے سے سرمائے سے اس کاروبار کو انجام دیتے تھے۔ ان کا مقصد بہتر معاملت و تنظیم سے کاروبار کی توسیع نہیں تھا بلکہ وہ حصول معاش کے لئے قلیل آمدنی پر بھی اکتفا کر لیتے تھے جو کسی طرح معاشی نقطۂ نظر سے نفع بخش نہیں۔ اس قسم کا رجحان جس میں ترقی اور توسیع کاروبار کی اُمنگ نہ ہو ہر قسم کی تجارت اور پیشے میں بہت خطرناک ہے جیسا کہ ناظم صاحب[1] معلومات عامہ نے کہا ہے کہ غیر معاشی مقابلہ جو کبھی پائدار نہیں ہوتا اس کا بہت جلد ختم ہو جانا اور کرایوں کی شرح کا معاشی پیمانے پر آجانا ایک فطری بات ہے"

حیدرآباد موٹر بس سرویس کے قوانین

سرکاری ریلوے بس کے کاروبار کو غیر معاشی مسابقت سے محفوظ رکھنے کے لئے حکومت کو یہ ضرورت داعی ہوئی کہ باضابطہ قوانین نافذ کئے جائیں جن کے باعث مقابلے کے امکانات اور بدعنوانیاں دور ہوسکیں اس کے علاوہ خانگی اجاروں کی مدت میں آیندہ سے توسیع کی اجازت قطعی بند کردی گئی۔ ایک کمیٹی مختلف محکمہ جات کے نمائندوں سے تشکیل پائی۔ جن میں محکمہ پولس، ریلوے، مالگزاری اور تعمیرات عامہ شامل ہیں۔ ۶ اکتوبر ۱۹۳۶ء میں اس کمیٹی کی سفارشات نے قانونی صورت اختیار کرلی۔ ریلوے محکمہ کو اس کا مجاز گردانا کہ بس سرویس کے کاروبار کلیتہً اس کے انتظام کے تابع رہیں۔ اسی خاطر سڑکوں کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا۔
(۱) Scheduled roads (۲) Non scheduled roads

پہلی قسم کی سڑکیں بہت اہم ہیں اور تقریباً تمام کی تمام سررشتہ ریلوے کے انتظام کے تحت ہیں۔ ان کا طول (۴۶۲۵) میل ہے جس میں سے چار ہزار میل لمبی سڑکیں ریلوے کی ہیں اور (۲۶۰) میل اجاروں کے تحت بقیہ (۳۶۵) میل سڑک پر محکمہ متعلقہ سے اجازت نامہ حاصل کرنے کے بعد بس چلانے کا اختیار ہے۔

Non scheduled roads (۲۰۹) میل پر مشتمل ہیں جو زیادہ اہم نہیں ان سڑکوں پر اجرائی اجازت نامہ کا جہاں تک تعلق ہے وہ ضلع کے تعلقداروں کے ذمہ ہے۔ صاحبان ضلع ضرورت کے اعتبار سے

[1] دیکھئے حبیب الرحمن صاحب کا مضمون "ریل اور سڑک کی ہم آہنگی"

بسوں کی نقل وحرکت کی اجازت دینے کے مجاز ہوتے ہیں اور جہاں تک کہ مضافاتی سڑکوں کا تعلق ہے ۔ رفتہ رفتہ محکمہ ریلوے کو اجارہ حاصل ہو جائے گا یہاں خاص طور سے اس امر کو ملحوظ رکھا گیا ہے کہ کسی خانگی لاری کے لئے اجازت نامہ اجرا نہ کیا جائے اجازت نامے اسی شرط پر حاصل کئے جاسکتے ہیں کہ ان لاریوں کا معیار خاصہ بلند ہو۔ بہر حال اجازت یافتہ خانگی بسوں کو میدان سے ہٹانے کی اس طرح کوشش کی جا رہی ہے کہ حکومت اور ان خانگی افراد میں کسی قسم کی کوئی رنجش یا کشیدگی پیدا نہ ہو گو اس کے لئے چھ سال درکار ہیں لیکن شروع شروع میں ایک یا دو خانگی کمپنیوں کے کاروبار مثلاً ”دکن موٹر سرویس“ کا کاروبار ختم کرکے اس کا تقریباً پورا اثاثہ بصرف زر کثیر حکومت نے خود خرلیا۔ اور عملہ جو کام سے بے دخل ہو گیا تھا محکمہ ریلوے بس میں ان سکے لئے کاروبار فراہم کر دیا گیا چنانچہ اب اضلاع کی بس سرویس میں اکثر ڈرائیور اور رہبر (conductors) اُسی خانگی کمپنیوں کے ہیں۔ غرض اس طریقہ عمل سے حکومت حرف گیری سے بچ گئی اور بہ آسانی سے اپنا مقصد بھی حاصل کرلیا اس کے علاوہ حکومت نے یہ بڑی دانشمندی اور رعایا پروری کی کہ (scheduled roads) اور (non scheduled roads) میں بنڈیوں کا راستہ شامل نہیں کیا جو دیہاتوں میں بڑا اہم ذریعہ نقل وحمل ہے وہاں بسوں کے کاروبار کو اس لئے زیادہ وسعت نہیں دی گئی کہ بے چارے غریب دہقان اپنے اس سستے طریق حمل ونقل کو جاری رکھ سکیں۔

فوائد ریل اور بس کی نقل وحمل کے میکانی ارتباط سے قبل یہ منافع محدود سے چند افراد کے ہاتھ آتا تھا۔ اب حکومت بہ حیثیت اجارہ دار خود منافع حاصل کرتی ہے اور اس طرح ہمیں قوی اُمید ہے کہ عوام الناس زیادہ سے زیادہ مستفید ہوسکیں گے۔ اس پر آشوب زمانے میں نقل وحمل کا معاشرے کی تنظیم اور اقتصادی حالت کے بہتر بنانے میں جو حصہ ہے وہ ہماری نظر و فکر سے پوشیدہ نہیں۔ اس نوعیت کے کاروبار میں اگر مسابقت ہو تو عوام کو بجائے فائدے کے نقصان ہوتا ہے۔ اسی لئے معاشین کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وسائل نقل وحمل جہاں تک ممکن ہو تیز رفتار کم خرچ اور منظم ہوں تاکہ وقتاً فوقتاً گلوتراش مسابقت کا مقابلہ کرسکیں اور حصول مفاد عامہ میں دشواریاں نہ پیدا ہوں وہ تمام اجارے جن سے مفاد عامہ کا تصادم ہوتا ہے حکومتوں کے تسلط میں آنے چاہئیں۔ تجارتی مرکزوں میں یہ خانگی لاریاں مال کی نقل وحمل کی حد تک ۲۵ میل سے زیادہ نہیں بڑھ سکتیں مگر تاجروں کی مال کی لاریوں پر کوئی تحدید حکومت کی طرف سے عائد نہیں کی گئی نقل وحمل کا جہاں تک تعلق ہے وہ آزاد ہیں مگر جن کا پیشہ حمل ونقل میں گاڑیوں کو کرایہ پر دینا ہے ان کے ذریعہ عمل کو تنگ کرنا ایک قدرتی عمل ہے حمل ونقل کے اس ارتباط کے باعث رعایا اور حکومت دونوں کو سا

ساتھ گوناگوں فوائد حاصل ہو رہے ہیں۔ منافع کی رقم بجائے خانگی افراد کے سرکاری خزانے میں وصول ہونے لگی جس سے بہ حیثیت مجموعی تمام رعایا مستفید ہو رہی ہے، سر الف ڈڈ جوڈ کے الفاظ میں "ہم اس کی تصدیق کرتے ہیں کہ ایسے تجارتی محکمے کی توسیع کے باعث حکومت کی آمدنی میں معتدبہ اضافہ ہوتا ہے" ۱۹۳۲ء سے ۱۹۳۶ء کے بس سرویس کا موازنہ دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس کاروبار میں حکومت کو اپنے مشغول سرمایے پر آٹھ فی صد سالانہ فایدہ۔ اور ہر سال اس منافع میں اضافہ ہوتا رہا۔ چنانچہ اس تجربے کے ارتقا کا اندازہ جو شاید اپنی نوعیت کے لحاظ سے ہندوستان کا پہلا تجربہ ہے۔ حسب ذیل جدول سے کیا جا سکتا ہے۔

نمبر	تفصیلات		۱۹۳۲-۳۳ء	۱۹۳۳-۳۴ء	۱۹۳۴-۳۵ء	۱۹۳۵-۳۶ء
۱	میلانہ		۲۸۳٫۷	۵۹۴٫۵	۱۲۳۲٫۰	۱۳۵۰٫۰
۲	مشغول سرمایہ	روپیہ	۴۱۹۴۷۳	۷۴۷۱۲۵	۱۵۶۲۶۰۰	۲۲۵۰۶۹۶
۳	سواری کی گاڑیوں کی تعداد		۲۷	۴۸	۸۶	۱۱۸
۴	مسافرین کی تعداد جنھوں نے سفر کیا		۱۴۷۷۹۰۷	۳۳۹۷۰۷۷	۵۲۰۰۱۰۶	۷۰۰۸۷۱۵
۵	مجموعی خام آمدنی	(روپیہ)	۲۸۳۸۲۲	۵۷۵۷۸۱	۹۸۱۸۸۶	۱۳۳۳۹۳۹
۶	کل مصارف مع مطالبات فرسودگی	(روپیہ)	۲۴۷۹۳۲۰	۵۰۰۹۴۷	۸۲۵۶۲۶	۱۰۹۲۹۱۴
۷	خالص آمدنی	(روپیہ)	۳۵۸۹۰	۷۴۸۳۴	۱۵۶۲۶۰	۲۴۱۰۲۵
۸	مشغول اصل پر آمدنی خالص کی شرح فی صد		۸٫۵۶	۱۰٫۰	۱۰٫۰	۱۰٫۷

اس سرکاری سال کے اختتام پر ایک مراسلے میں ناظم صاحب معلومات عامہ نے یہ لکھا ہے کہ بسوں کی تعداد ۲۳۵ تک پہونچ گئی ہے اور رگذرگاہوں کا طول ۲۰۲۴ میل ہے اور سرمایے کی مقدار تقریباً ۵۰ لاکھ روپیہ سکہ عثمانیہ ہوتی ہے۔ مختلف نمونوں اور ڈھانچوں کی بجائے ایک ہی وضع کی بس استعمال ہوتی ہے۔ اس سے مضر اور غیر معاشی مقابلے کا استیصال ہوتا ہے نسبتاً کرایہ کی کم شرح پر بہتر سرویس سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ کرایوں میں یکسانیت اور کم شرح نیز سفر میں مسافرین

کے آرام و راحت کا خیال حکومت کے ہمیشہ پیش نظر ہے۔ اس میکانی حمل و نقل کی ہم آہنگی کے باعث محکمہ ریلوے، تعمیرات عامہ اور محکمہ مالگزاری میں بہت قریبی رشتہ پیدا ہو گیا ہے جو سڑکوں کی تعمیر و ترمیم میں ممد و معاون ہے نیز جدید موٹر ٹیکس اور اجازت ناموں کی رقم سے رفاہ عام کے کاروبار بالخصوص سڑکوں کی تیاری کے لئے سرکاری آمدنی کی ایک مد میں اضافہ ہوا۔

اس سلسلے میں حکومت نے تفریحی پروگرام جو میلوں، جاتراؤں، نمائشوں اور نیز تاریخی مقامات پر مشتمل ہوتا ہے ترتیب دے کر عوام کو اپنے وطن کی قدیم یادگاروں کو دیکھنے اور اپنے اسلاف کے کارہائے نمایاں سے سبق حاصل کرکے بہتر سے بہتر موقع فراہم کیا۔ حیدرآبادی پبلک میں محکمہ ریلوے کے حسن انتظام کے باعث سفر کا شوق پیدا ہو چلا ہے اور ہمیں سب سے زیادہ اطمینان اس بات سے ہوتا ہے کہ اس محکمہ میں پبلک کی آواز صدا بصحرا ثابت نہیں ہوتی اور اکثر شکایتوں کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔

ایسے رقبوں میں جہاں اب تک ریلوے کا گزر نہیں ہوا وہاں ریلوے شاخ کی تعمیر سے ذرائع حمل و نقل کی ترقی کی مناسب اسکیم ارباب محکمہ کے پیش نظر ہے وہ دن دور نہیں ہے کہ مختلف وسایل نقل و حمل کو ایک وفاقی تنظیم میں منسلک کرکے ایک ہی نظام کے سپرد کیا جائے جس کے باعث یہ قوی امید ہو سکتی ہے کہ بے کار و غیر معاشی مسابقت کا خاتمہ ہو جائے گا، اچھے اور کم خرچ ذرائع نقل و حمل کی وجہ سے تجارت اور آمد و رفت میں سہولتیں پیدا ہو جائیں گی۔

نقل و حمل کے تمام ذریعوں میں یکساں نظم و نسق کے تحت ارتباط کی مزید تکمیل اس وقت ہوگی جب کہ ریاست کی خاص ہوائی سٹریس کا آغاز ہوگا اس سلسلے میں حیدرآباد میں ایک مطار کے قیام اور آموزگار دار ہنی اسٹاف کے تقرر سے پہلا قدم اٹھایا گیا ہے اور ضروری مشینوں کی خریدی کا انتظام بھی ہوا ہے اور ہوائی کاروبار کی ترقی کے لیے دیگر مطاروں کی افتتاح کے متعلق مزید تجاویز زیر غور ہیں۔

میر قادر علی خاں متعلم بی۔ اے (عثمانیہ)

ملہ معلومات Economic life of Hyderabad سے حاصل کی گئی ہیں۔

ہوشیار!

(۱)

تاک میں ہے دیر سے گردوں کی چشمِ فتنہ بار
اپنی غفلت سے وطن کے پاسبانو ہوشیار!

یہ گراں خوابی تمہاری ٹھوکریں کھلوائے گی
پھولتی پھلتی بہارِ زندگی لُٹ جائے گی

حیف ہے معلوم ہی تم کو نہیں جینے کے ڈھنگ
ایک عالم اس زبون و خستہ حالت پر ہے دنگ

تیغ کے جوہر ہیں اوروں کو دکھانے کے لئے
دشمنانِ دہر کی گردن جھکانے کے لئے

ایک ہو کر کیوں جدا ہونے کو تم تیار ہو
کس لئے نااتفاقی کے علم بردار ہو

ایک ہی تسبیح کے بکھرے ہوئے دانے ہو تم
کچھ سمجھتے ہی نہیں اُف کیسے دیوانے ہو تم

دو کا لڑنا تیسرے کی فتح مندی کی دلیل — اپنے ہاتھوں کیوں کئے جاتے ہو اپنے کو ذلیل
راس کیوں تم کو زمانے کی ہوا آتی نہیں — اپنے نازیبا عمل پر کیوں حیا آتی نہیں
خون رلوائے گی یہ غفلت شعاری ایک دن — بد مزاجی زنگ لائے گی تمھاری ایک دن
تُل گئے ہو کس لئے بے موت مرنے کے لئے — عظمتِ دیرینہ کو برباد کرنے کے لئے
یاد رکھنا خون پانی کی طرح بہہ جائے گا — اک سیہ دھبہ جبینِ زیست پر رہ جائے گا

(۲)

کیوں نظر سے اُٹھ نہیں جاتا حجابِ زندگی — کیا نظر آتی نہیں تعبیرِ خوابِ زندگی
پڑ نہ جائے سینۂ احساسِ آزادی پہ داغ — گُل نہ ہو جائے کہیں طاقِ اخوت کا چراغ
آتشِ کینۂ زمانے کی ہوا بھڑکا نہ جائے — دامنِ عظمت کی رنگینی پہ دھبہ آ نہ جائے
آندھیوں کی زد میں آ جائے نہ کشتیٔ حیات — چھا نہ جائے روزِ روشن پر کہیں تاریک رات

خود تمھارے ہاتھ میں ہے ملک و ملت کا وقار
ہوشیار اے قومیت کے پاسبانو ہوشیار!

رشید احمد رشید متعلم بی۔اے

فلسفہ ابن خلدون

خطائے نظر و لغزش قدم

واقعات اور ملاحظات

(بسلسلۂ گزشتہ)

(۵)

ابن خلدون کے بعض حکیمانہ نظریات کی تحلیل قابل نظر ہے، اعتراض مقصود نہیں، صرف یہ دکھانا ہے کہ کیا حالات پیش آئے جن کے ماحول نے ہمارے سب سے بڑے فلسفی پر اثر ڈالا تھا۔

تبابعہ — یمن عرب کا نہایت شاداب حصہ تھا، عہد قدیم میں یہاں بڑی بڑی سلطنتیں قائم تھیں جن میں تبابعہ واذواء کی حکومتیں زیادہ مشہور رہیں۔

اہل عرب کا بیان ہے کہ ان سلطنتوں نے بسا اوقات ممالک غیر مثلاً افریقہ، موصل، آذربایجان، سمرقند، چین اور روم (یعنی ایشائے کوچک، اناضول، اناطولیہ) پر فاتحانہ فوج کشی کی ہے۔

ابن خلدون کو اس سے انکار ہے اور سختی کے ساتھ انکار ہے۔

(۱) انکار یہ ہے کہ افریقیہ کے راستے میں شام و مصر حائل ہیں جہاں عمالقہ اور قبطیوں کی سلطنتیں تھیں، جب تک یہ ممالک فتح نہ کرلئے جائیں مزید پیش قدمی کیوں کر ممکن ہے، موصل و آذربائیجان میں ایران کی حکومت تھی اور سمرقند ترکوں کے قبضے میں تھا، کسی تاریخ سے یہ ثابت نہیں کہ اہل عرب نے ایران و ترکستان و چین و روم کی عظیم الشان سلطنتوں سے جنگ کی ہو یا ان کو فتح ہوئی ہو۔

بحث کی تحلیل روم و توران و چین کی قدیم تاریخوں سے ہم کو واقفیت نہیں ہے، ہم اس کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتے افریقیہ پر فوج کشی بے شک دشوار تھی، لیکن مقدونیہ سے فوج لے کر ہندوستان پر حملہ کرنا اس سے بھی زیادہ دشوار تھا۔

پرانی تاریخوں میں اگر اس واقعے کی تفصیل نہ ہوتی تو آج کس کو یقین آسکتا تھا کہ سکندر کا لشکر یورپ سے بڑھتا ہوا قنوج تک پہونچ گیا اور یہاں آکر اس نے فوز ہندی (راجہ پورس) کو شکست دی۔

ہم کو تسلیم ہے کہ افریقیہ کی تاریخ قدیم میں عربی فتوح کا تذکرہ نہ ہوگا، لیکن ہم پوچھتے ہیں کہ عہد قدیم کی کوئی تاریخ افریقیہ موجود بھی ہے جس سے آج استدلال کیا جاسکے؟

جن ممالک کی تاریخیں ملتی بھی ہیں وہ بھی ناقص ہیں، بجز علم الآثار کے اب کوئی دوسرا ذریعہ نہیں کہ قدیم حکومتوں اور قوموں کے حالات دریافت ہوسکیں،

افریقیہ میں اہل عرب کے آثار قدیمہ قدامت کی تاریخ میں گم ہیں، لیکن قوم بربر کے عادات و اطوار شکل و شباہت میں عربوں کے خال و خط صاف طور پر موجود ہیں، اور زبان میں عربیت کا انداز بھی نمایاں ہے تاہم اصل مسئلہ کی جانب یہ نشانات راہنمائی نہیں کرسکتے، اس لئے کہ ممکن ہے کہ اسلامی فتوح کے بعد یہ کیفیت لاحق ہوئی ہو۔

قدیم عرب سلطنتیں لیکن موجودہ تحقیقات سے جب ہم کو یہ ثابت ہے کہ مصر و شام میں اُن دنوں جو سلطنتیں تھیں وہ خود اہل عرب کی تھیں، اور عمالقہ جن کا نام خاص طور پر ابن خلدون نے لیا ہے، اصل عرب تھے تو ایک حد تک مسئلہ صاف ہوجاتا ہے، اور پھر یہ شبہ باقی نہیں رہتا کہ افریقیہ پر فوج کشی کرنے میں یہ سلطنتیں سد راہ ہوئی ہوں۔

(۵)

وادی النمل وادی النمل جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ اہل عرب کا لشکر وہیں تباہ ہوا تھا، افریقیہ میں کہیں اس کا نام و

نشان نہیں۔

پہلی صدی ہجری میں مسلمانوں نے سندھ میں منصورہ کے نام سے ایک عظیم الشان شہر آباد کیا تھا، یہ شہر سلطان محمود غزنوی کے عہد تک مشہور تھا، اب سات سو برس سے گمنام ہے اور ایسا گمنام ہے کہ بہت کم لوگ اس کے موقع و محل سے واقف ہیں، وادی النمل کا واقعہ ہزاروں برس قبل کا ہے، آج اگر کوئی اس کو نہ جانتا ہو تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے ؟

یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ وادی النمل عربی نام ہے، یہ نام اہل عرب نے رکھا ہوگا، اصل نام کچھ اور ہوگا، ممکن ہے اسی اصل نام سے وہ مقام مشہور رہا ہو۔

(۶)

ایران قدیم ایرانی روایات کے مطابق ایران کا پہلا بادشاہ "مہ آباد" تھا اس کے خاندان میں تیرہ پشت تک سلطنت رہی، یہ خاندان سلطنت آبادگان کے نام سے مشہور ہے۔

اس کے بعد خاندان جہانیاں کی حکومت ہوئی جس کا پہلا فرماں روا "جی افرام" تھا۔

اس سلطنت کے تباہ ہونے پر تاج و تخت کلیو شاہ کے قبضے میں آیا،

ایک زمانے تک اس کے سلسلے نے بھی حکومت کی، جس کے خاتمے پر "یاسان" حاکم ہوا، یہ خاندان "یاسانیاں" کے نام سے مشہور ہے،

اس کا آخری تاجدار "یاسان آجام" تھا جس سے کیومرث نے عنان حکومت ہاتھ میں لی، کیومرث کی شہرت ایرانیوں میں گل شاہ کے نام سے ہے اور وہی پیش دادیوں کی سلطنت کا بانی ہے،

اس کے بعد "کیانیوں" کا دورہ ہوا جن کو "ہخامانی" لکھتے ہیں اور "کیانی" پڑھتے ہیں، پھر اشکانیوں اور ساسانیوں کی حکومت قایم ہوئی جس کے آخری فرمانروا یزدگرد نے تاج شاہی کو فاتحان اسلام کی تلوار پر قربان کیا،

پیش دادیوں اور کیانیوں سے پہلے کی سلطنتوں کے آثار بالکل ناپید ہیں، پیش دادی و کیانی خاندان کے واقعات ایرانی افسانوں میں مفصل مذکور ہیں۔

ایران پر عرب کا تسلط اس زمانے میں صاف نظر آرہا ہے کہ اہل عرب نے ایران پر بارہا حملے کئے ہیں، جمشید کا سر ضحاک (بادشاہ یمن) کے زیر قدم ہے، انگشتری اور جام جم عرب فاتحوں کے مال غنیمت

میں شامل ہے، کیکاؤس شاہ یمن کی قید میں ہے، رستم کو اُس کی رہائی کے لئے افواج عرب سے مقابلہ کرنا پڑا ہو۔ ایرانیوں کا بیان ہے کہ رستم کی فتح ہوئی مگر اہل عرب کی روایتیں بتا رہی ہیں کہ ایران میں کئی برس تک شاہ یمن کا جس کا نام ذی الاذعار تھا قبضہ رہا، اس واقعے کا ایک حصہ شاہنامہ میں بھی مذکور ہے۔ ابوکرب جس کو اہل عرب تبع اصغر کہتے ہیں شہنشاہ گشتاسپ کے مقابلے میں حملہ آور ہوا تھا۔

آخری زمانے میں اہل عرب کی سلطنت برائے نام رہ گئی تھی، تاہم عربوں کی فوج کشی ایران پر برابر جاری تھی، اردشیر، ہرمز اور خسرو پرویز کے ابتدائی عہد میں ایران پر اہل عرب کے حملے تاریخوں میں مشہور ہیں۔

عرب و عراق عراق میں اہل عرب کی کئی حکومتیں تھیں، ان میں ایک کا دارالحکومت قلعہ حضر تھا جس کا دوسرا نام خلم ہے، اس کا حکمراں شاہ ذی یزن تھا، شاپور سے اس سے مقابلہ ہوا اور جب فتح نہ ہوسکی تو ایک خاص حیلہ کرکے شرمناک طریقے سے شاپور نے اس کو قتل کرادیا۔

مُعد کی سلطنت مادیوں کی مشہور و معروف سلطنت جس کو عوام میدیا کہتے ہیں ایران ہی میں واقع تھی اور حسب تحقیق سرجان مالکم اس کا پائے تخت تبریز تھا[1]، کیا یہ سلطنت خاص عمالقہ کی سلطنت نہ تھی؟

ان تمام واقعات کے ترتیب دینے سے کیا یہ نتیجہ نہیں نکلتا ہے کہ ایران پر تبابعہ یمن کا فاتحانہ فوج کشی کرنا خلاف قیاس نہیں ہے؟

لطف یہ ہے کہ خود ابن خلدون نے اس موضوع میں "اذا کانت الامة وحشیة کان ملکها اوسع[2]" یعنی جب قوم وحشی ہوگی تو اُس کی سلطنت بہت زیادہ وسیع ہوتی ہے، سلاطین یمن کو اس کی مثال میں پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ دیکھو عرب کی وحشی قوم ہندوستان و عراق وغیرہ ممالک پر حملہ کیا کرتی تھی۔

اُن کے خاص الفاظ یہ ہیں،

واعتبر ذلک بحال العرب السالفة من قبل مثل التبابعة وحمیر کیف کانوا یخطون من الیمن الی المغرب، الی العراق والهند اخری، ولم یکن ذلک لغیر العرب من الامم۔

---

[1] تاریخ ایران از سرجان مالکم، جلد (۱) صفحہ (۹۱)

[2] تاریخ ابن خلدون، جلد (۱) ص (۱۲۲)

گزشتہ قوم عرب کے واقعات سے اس کو ملاؤ اور عبرت کی نظر سے دیکھو کہ مثلاً تبابعہ و حمیر کیوں کر یمن سے نکل کر کبھی تو ارض مغرب میں پیش قدمی کرتے تھے اور کبھی عراق و ہندوستان میں یہ شان عرب کے سوا اور کسی قوم میں نہ تھی

(۷)

بہشت ارم ارم ایک مشہور عربی قبیلہ تھا جس نے ارض یمن میں بہت زمانے تک حکومت کی ہے، اس سلسلے کا ایک رکن شداد تھا جس نے دربیان کیا جاتا ہے کہ ایک عجیب و غریب شہر آباد کیا تھا، خاندانی لحاظ سے اس شہر کا نام ارم رکھا گیا۔ اور اس میں عیش و عشرت کے اس قدر فوق العادہ سامان فراہم کئے گئے جس کی وجہ سے اس کو بہشت ارم کہنے لگے۔ مورخین اس کی زیب و زینت میں بے حد مبالغہ کرتے ہیں اور اس حیثیت سے ابن خلدون کا اس شہر کے وجود سے انکار کرنا حق بجانب ہے۔ لیکن اگر مبالغے کے سارے پہلو ایک کر دیئے جائیں اور صرف مان لیا جائے کہ یمن میں ایک شاندار شہر آباد ہوا تھا تو روایت میں کوئی غرابت باقی نہیں رہتی، اس شہر کا تذکرہ دنیا کی اکثر زبانوں میں موجود ہے۔ یونانی زبان میں اس کو ہدورام کہتے ہیں جو عادارم کی تحریف ہے، پہلوی میں اس کا نام ارم بن ہے اور سنسکرت میں آرام بن ہے، موجودہ فارسی میں آرام اسی ارم سے ماخوذ ہے۔

(۸)

بدویت ابن خلدون کی رائے میں اہل عرب طبعاً بدوی اور جنگلی مزاج کے ہیں، اسی وجہ سے جب کسی ملک پر اُن کا قبضہ ہوتا ہے تو وہاں تباہی و بربادی کے سامان بہت جلد پیدا ہو جاتے ہیں۔ مثال میں بطور تمہید کے شام و عراق کو پیش کر کے کہتے ہیں کہ قیصر و کسریٰ کے عہد میں یہاں جس قدر آبادی تھی اسلام کے بعد روز بروز اس میں تنزل آ گیا۔

ناواقفیت کا اعتراف مورخ مذکور کا یہ بیان اثری تحقیقات کے بالکل برعکس ہے، علم الآثار نے اب اس مسئلے کو اس قدر صاف کر دیا ہے کہ شک و شبہ کی کوئی گنجائش باقی ہی نہیں رہی، یہ غلطی اس لئے پیدا ہوئی کہ شام و عراق سے وہ خود ناواقف تھے، فرماتے ہیں۔

انا اذکر فی کتابی ھذا ما امکننی منہ ای منہ الاحوال الخاصۃ فی ھذا القطر المغربی ...

اس کتاب میں جہاں تک مجھ سے ہو سکے گا ارض مغرب یعنی ممالک افریقیہ کی موجودہ حالت میں بیان کروں گا۔

لاختصاص قصدی فی التالیف بالمغرب ...... عدم اطلاعی علی احوال المشرق واممہا۔[۱]

اس لئے کہ میرا خاص مقصد اس کتاب کی تالیف سے ممالک مغرب کے حالات بیان کرنا ہے۔ کیوں کہ مشرق اور اقوام مشرق کی حالت سے مجھ کو واقفیت نہیں ہے۔

شام مغرب دوسری مثال وہ اندلس و تونس و مراکش کی حالت سے پیش کرتے ہیں جو خود ان کی دیکھی ہوئی ہے یہ استدلال صحیح ہے اور ہم کو اس میں کچھ بھی کلام نہیں ہے، اصل یہ ہے کہ اُن دنوں بلاد مغرب کی حالت نہایت خراب وخستہ تھی، انقلاب سلطنت اور باہمی خانہ جنگیاں ترقی پذیر تھیں، امن عام مفقود تھا، تمدن کی حالت گئی گزری ہو چکی تھی، جَو اور جوار اور زیتون یہی تمام مسلمانوں کی خوراک رہ گئی تھی، خود لکھتے ہیں۔

اھل افریقیہ لھذا العھد غالب عیشھم الشعیر والزیت واھل الاندلس لھذا العھد الذرۃ والزیت۔[۲]

اس زمانے میں باشندگان افریقیہ کی بیشتر خوراک جَو اور زیتون ہے، اور باشندگان اندلس کی جوار اور روغن زیتون۔

فرنگی تسلط یورپ کی ہمسایہ قوموں کا دباؤ رؤسائے اسلام پر بڑھتا جاتا تھا مستحکم قلعے اور آباد اضلاع روز بروز مسلمان ریاستوں سے نکل نکل کر فرنگی حکومتوں کے قبضے میں آتے جاتے تھے، چھٹی اور ساتویں جلدیں واقعات خود انھوں نے نہایت بسط اور تفصیل سے بیان کئے ہیں، مقدمے میں جہاں قاضیوں کے متعلق گفتگو کی ہے لکھتے ہیں

ذلت کی زندگی اکثر ما یقع فی ھذا الغلط ضعفاء البصائر من اھل الاندلس لھذا العھد لفقدان العصبیۃ فی مواطنھم منذ اعصار بعیدۃ لفناء العرب ودولتھم بھا وخروجھم من ملکۃ اھل العصبیات من البربر فبقیت انسابھم العربیۃ محفوظۃ والذریعۃ الی العزّ من العصبیۃ والتناصر مفقودۃ بل صاروا من

اندلس کے ضعیف العقل باشندے اکثر اس غلطی میں پڑتے ہیں سبب یہ ہو کہ ان کے ملکوں میں (یعنی اندلس وغیرہ میں) بہت زمانے سے عصبیت یعنی اپنی قوم کو مدد دینے کا طبعی جوش مفقود ہے، اس لئے کہ عرب فنا ہوگئے، عربی سلطنتیں مٹ گئیں، جن بربری قوموں میں عصبیت باقی تھی باشندے اُن کی حکومت سے نکل گئے، اب یہ حال ہے کہ لوگوں کے خاندانی انساب تو محفوظ ہیں اور عزت حاصل کرنے کا ذریعہ

---

[۱] مقدمہ ابن خلدون، صفحہ ۴

[۲] مقدمہ ابن خلدون صفحہ ۵

جملة الرعايا المتخاذلين الذين تعبدهم القهر موالمذلة۔[1]

جو عصبیت اور باہمی معاونت سے مفقود ہے، ان پریشان روزگاروں کی حالت اب اُن رعایا کی سی ہے جن کو خارجی غلبے نے غلام بنا رکھا ہو اور وہ ذلت میں گرفتار ہوں۔

تباہی کا اثر اس ذلیل حالت کی ابتدا پانچویں صدی ہجری کے شروع سے ہوئی ہے جب کہ ممالک مغرب میں بنی سلیم اور بنی ہلال کی حکومت قایم ہوئی، ان خاندانوں کے طویل عہد حکومت میں روز بروز ملک تباہ ہوتا گیا، فرماتے ہیں۔

وافريقية والمغرب لما جاز اليها بنو هلال و بنو سليم منذ اول المائة الخامسة وتمرسوا بها لثلاث مائة وخمسين من السنين قد لحق بها الدمار وعادت بسائطها خرابا كلها[2]

جب سے افریقیہ و مغرب میں پانچویں صدی کے شروع سے ہلال و بنی سلیم کا گزر ہوا اور ساڑھے تین سو برس تک یہاں ان کی سلطنت رہی ان ممالک میں تباہی لاحق ہوگئی اور تمام آبادیاں ویران ہوکر رہ گئیں۔

منشائے غلط کیا تھا جس ملک میں ایسی افسوس ناک تباہی چھائی ہو اور دوسرے ممالک کے حالات سے اُس کو واقفیت نہ ہو اگر تمام دنیا اس کی نظروں میں ویران اور کھنڈر محسوس ہو تو اس کو الزام نہیں دیا جاسکتا۔

عربی عمرانی عہد اسلامی تمدن کے عہد میں مشرقی شہروں کی کیا حالت تھی؟ اس کے متعلق خود ابن خلدون کی شہادت جو اُنھوں نے خطیب بغدادی کے حوالے سے دی ہے زیادہ زوردار ہوگی، فرماتے ہیں۔

ذكر الخطيب في تاريخه ان الحمامات بلغ عددها ببغداد لعهد المامون خمسة وستين الف حمام وكانت مشتملة على مدن وامصار متلاصقة و متقاربة تجاوز الاربعين ولم تكن مدينة واحدة مايجمعها سور واحد لافراط العمران

خطیب نے تاریخ بغداد میں بیان کیا ہے کہ بغداد میں ۶۵ ہزار حمام مامون رشید کے عہد میں تھے۔ اُن کے ساتھ بہت سے شہر شامل تھے جو ایک دوسرے سے ملے ہوئے اور قریب قریب تھے، جن کا شمار چالیس سے زائد تھا، ان میں اس قدر کثیر آبادی تھی کہ کوئی شہر ایسا نہ تھا جس کو صرف ایک شہر پناہ کافی ہوجائے

---

[1] مقدمہ، صفحہ ۱۲۶

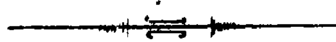
[2] مقدمہ، صفحہ ۱۲۶

بظاہر اس تعداد میں اغراق نظر آتا ہے، لیکن جو مقام کہ پانسو برس تک اسلام کے عالگیر تمدن کا مرکز اور دنیا بھر کے اسلامی ممالک کا (باستثنائے اندلس) دارالخلافت رہا ہو اس قدر وسیع آبادی اس کے لئے تعجب خیز نہیں ہوسکتی، بغداد سے ملے ہوئے بہت سے شہروں کے نشانات آج بھی زبان حال سے اُس کی عظمت کا فسانہ سنا رہے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ابن خلدون کو اس واقعے کی صحت میں شبہ نہیں ہوا، وہ اس کو تسلیم کرکے آگے لکھتے ہیں۔

وکذا حال القیروان وقرطبۃ والمھدیۃ فی الملۃ الاسلامیۃ وحال مصر القاھرۃ بعدھا فیما یبلغنا الھذا العھد (پہلے اسلامی حکومتوں میں قیروان و قرطبہ و مہدیہ کا بھی یہی حال تھا، اور مصر میں قاہرہ کی اب بھی وہی شان و شوکت ہے (یہ ظاہر ہے کہ ان ممالک میں خاص عرب حکومتیں تھیں)

تبصرے کی مزید تفصیل کے لئے آیندہ اشاعت کا انتظار فرمائیے۔ وباللہ التوفیق۔

عمادی



ہزار رنگ تماشاست چشمِ بینا را

بیا بہ بزم و بدہ جلوہ روئے زیبا را
ببر ز خاطرِ ما حسرتِ تماشا را

بیا و روئے تو تسکینِ دل تواں کرد
ولے چہ چارہ کنم چشمِ ناشکیبا را

ز بختِ خویش چہ گویم کہ سجدہ درِ تو
بسانِ حرفِ غلط محو کرد سیما را

بہ تنگیٔ دل و وسعِ خیال حیرانم
بقطرہ چوں بہم آوردہ اند دریا را

ہزار رنگ تماشا شکستہ اند و ہنوز
ہزار رنگ تماشاست چشمِ بینا را

امید و یاس ز صافی دلاں چہ می پرسی
گزشتہ اند ز دل نقشِ ہر تمنا را

مکن ہوس کہ رسی تا حریمِ کعبۂ دل
نکردہ طے سفرِ جاں گدازِ صحرا را

بکوے دوست بہر خطوہ ہست جائے نماز — بخاکِ کعبہ چہ می گستری مُصلا را

تفاوتے نکند شاہ عشق در زن و مرد — بیک کمند کشد وامق و زلیخا را

دریں زمانہ اگر کس رہِ وفا پرسد — نشان دہند باو آشیانِ عنقا را

سبک گزشت ہراں مرد عاقبت اندیش — کہ ہر چہ یافت ز دنیا، بداد دنیا را

نشستنِ من بے چارہ از قناعت نیست — زبس دویدہ ام و رنجہ کردہ ام پا را

نوائے تازہ سرایم باین ادا کہ کشم
زچار سوئے چمن بلبلانِ شیدا را

روحی

عدم مساواتِ آمدنی

آمدنی کا مفہوم | مشہور ماہر اقتصادیات پروفیسر ڈالٹن کا بیان ہے کہ آمدنی سے پہلے پہل جو مفہوم ہمارے ذہن میں پیدا ہوتا ہے وہ "زر" ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ زر بہ حیثیت خود کوئی نہایت اہم چیز نہیں ہے۔ اس کی جو کچھ قدر و منزلت ہے وہ بہ حیثیت آلۂ مبادلہ کے ہے یعنی اس کے معاوضے میں ہم اپنی ضرورت کی جو چیز چاہیں حاصل کرسکتے ہیں۔ اصل میں جو چیز اہم ہے وہ ہماری احتیاج اور اُس کا رفع ہونا ہے۔ لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ ہماری ضروریات زر یا دولت ہی کے ذریعے رفع ہوتی ہیں۔ اور پھر ہم اپنی احتیاجات کے رفع کرنے کے لئے جن اشیا کو حاصل کرتے ہیں ان کا تخمینہ بلحاظ زر کرنا آسان بھی ہے۔ بہرحال آمدنی کا لفظ جب استعمال ہوتا ہے تو ابتداءً ہم اس سے زر مراد لیتے ہیں لیکن کسی شخص کے پاس کچھ رقم دیکھ کر یہ کہنا کہ اس کی اتنی آمدنی ہے۔ بالکلیہ صحیح نہیں ہے۔ دراصل دیکھنا یہ چاہئے کہ وہ اس رقم سے اپنی کتنی ضروریات پوری کرسکتا ہے۔ مثلاً اس کی آمدنی پر جو ٹیکس لگایا جائے وہ اس کی آمدنی کا جزو نہیں ہوگا۔ اس لئے کہ اس سے اس کی اپنی معاشی خوش حالی میں اضافہ نہیں ہوگا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ ایک شخص کے پاس جس قدر رقم ہو اس سے زیادہ اس کی آمدنی ہو۔ مثلاً خود کا تیار کردہ سامان جو ایک شخص اپنے استعمال میں لاتا ہے اس کی آمدنی کا جزو ہے۔ اسی طرح ایک ڈاکٹر جو بیمار پڑنے پر اپنا آپ علاج کرتا ہے، یہ خدمات بھی اس کی آمدنی میں شامل ہیں۔ بہرحال آمدنی

سے مراد زر کی ایک خاص مقدار نہیں ہے بلکہ اس سے ہر وہ چیز مراد ہے جو ایک شخص کی مادی خوش حالی کا باعث ہو اور اس میں اضافہ کرے۔

عدم مساوات آمدنی کی حالت یہ ثابت کرنے کے لئے کہ اس وقت دنیا میں آمدنی کے لحاظ سے لوگوں میں بہت بڑا فرق موجود ہے صحیح اعداد و شمار موجود نہیں ہیں لیکن اس وجہ سے عدم مساوات آمدنی کو بے بنیاد قرار دینا غلطی ہے۔ عدم مساوات آمدنی کے ثبوت کے لئے ہمارا روزمرہ کا مشاہدہ کافی ہے ہماری سائٹی میں علی العموم ایک طبقہ دولت مندوں کا ہے دوسرا متوسط الحال اشخاص کا اور تیسرا غربا کا۔ ترقی یافتہ ممالک کے بعض اعداد و شمار ہم یہاں پیش کرتے ہیں جہاں اس مسئلہ کی چھان بین کی گئی ہے۔ برطانیہ میں ۹ میں سے ایک بالغ فرد اپنی موت کے بعد سو پونڈ اور ۲۰ میں سے ایک بالغ فرد ۱۰۰۰ پونڈ چھوڑ مرتا ہے۔ پروشیا میں ۷ افراد میں سے ایک فرد چھ ہزار مارک اپنے پاس رکھتا ہے۔ امریکہ جیسے دولتمند ملک میں ۱ ۱/۲ فی صد آبادی ۷۰ فی صد آبادی سے زیادہ مالدار ہے۔ برطانیہ عظمیٰ کے دارالسلطنت لندن کی یہ حالت ہے کہ اگر اس کے مغربی حصے میں دل فریب عمارتیں ہیں تو اس کے مشرقی حصے میں کچے جھونپڑوں کا دلخراش منظر نظر آتا ہے۔ الغرض عدم مساوات آمدنی دنیا کی ایک تلخ حقیقت ہے جس سے انکار نہیں کیا جاسکتا

عدم مساوات آمدنی کے اسباب عدم مساوات آمدنی کے اسباب پر غور کرنے سے پہلے دیکھنا یہ ہے کہ آمدنی کس طرح حاصل کی جاتی ہے۔ آمدنی حاصل کرنے کے علی العموم دو ذرائع بتلائے جاتے ہیں ایک محنت (Income from labour) اور دوسرا جائداد (Income from property)

عدم مساوات آمدنی کے حسب ذیل اسباب ہو سکتے ہیں:۔

(۱) فطری اختلاف:۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جو اشخاص محنت کرکے آمدنی حاصل کرتے ہیں ان کی آمدنی میں کافی فرق ہوتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ جو اشخاص ایک ہی قسم کی محنت کرتے ہیں۔ ان کی آمدنی کا بھی یہی حال ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انسانوں کی فطری قابلیتیں ایک سی نہیں ہیں۔ اور یہی فطری اختلاف عدم مساوات کی بنیاد ہے۔ دو وکلاء ایک ہی وقت میں ایک ہی امتحان کامیاب کرکے وکالت شروع کرتے ہیں لیکن ایک تو اپنی فطری ذہانت و جودت طبع کے باعث چند سال میں سینکڑوں روپیہ کماتا ہے اور دوسرے کا کاروبار بمشکل چلتا ہے۔ اس کی اصلی وجہ یہ ہے کہ فطرت نے اس شخص میں خاص قسم کی قابلیت ودیعت کی ہے جس سے دوسرا محروم ہے۔ اور یہ تو عام طور سے مشہور ہے کہ

انسان انسان یکساں نہیں ہوتے۔ دو لڑکے جن کو تعلیم و تربیت کے یکساں مواقع ملے ہوں بلحاظ ذہانت و ہوشیاری ایک سے نہیں ہوتے ایک غبی ہوتا ہے تو دوسرا ذہین یہ فطری اختلاف ہے۔ وحشیوں میں مضبوط اور ہوشیار شخص ان کا سرگروہ بن جاتا ہے اور یہی حالت متمدن اقوام کی ہے جو اشخاص فطرت کی طرف سے خاص قوتوں کے مالک ہوتے ہیں وہ زندگی کی دوڑ میں آگے نکل جاتے ہیں۔ الغرض اس فطری اختلاف کے باعث آمدنی میں مساوات باقی نہیں رہتی۔

(۲) عدم مساوات آمدنی کی ایک اور وجہ یکساں مواقع کی عدم دستیابی ہے۔ فطری قابلیت و استعداد کے باوجود اگر کسی شخص کو مناسب مواقع نہ ملیں تو ظاہر ہے کہ وہ اپنی فطری قابلیت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا صرف فطری استعداد کا ہونا کافی نہیں ہے بلکہ اس سے استفادہ کرنے کے لئے تعلیم کی سخت ضرورت ہے۔ لیکن موجودہ معاشرے میں تعلیم حاصل کرنے کے ہر شخص کو یکساں مواقع حاصل نہیں ہیں مثلاً ایک شخص نہایت قابل ہونے کے باوجود سیاسی پابندیوں کی وجہ سے بالکل بے دست و پا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح سماجی قیود کا رجحان بھی اسی طرف ہے کہ عدم مساوات آمدنی موجود رہے مثلاً ایک پنچ قوم کا شخص باوجود اپنی فطری ذہانت کے مجبور ہے کہ اپنا آبائی پیشہ انجام دے۔ غرض سیاسی، سماجی اور قانونی قیود اور بعض وقت مناسب مواقع کی عدم دستیابی بڑی حد تک عدم مساوات آمدنی کی ذمہ دار ہیں۔

(۳) خانگی ملکیت و وراثت:- ہم نے پہلے ہی بیان کر دیا ہے کہ لوگ آمدنی جائیداد سے بھی حاصل کرتے ہیں۔ ایک شخص اپنی فطری قابلیت سے کام لے کر محنت کرتا اور اس طرح آمدنی حاصل کرتا ہے پھر اس آمدنی میں سے وہ کچھ پس انداز کرتا ہے۔ پھر اس پس انداز کی ہوئی رقم کو مختلف کاروبار میں لگاتا ہے مثلاً کسی کارخانے کا حصہ خرید لیتا ہے یا کسی بنک میں جمع کرا دیتا ہے۔ اور یوں اپنی خانگی جائداد سے زیادہ سے زیادہ مالدار بنتا جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اپنی خانگی جائداد سے جو مزید آمدنی وہ حاصل کر رہا ہے وہ حقیقتاً اس کی محنت کا کوئی معاوضہ نہیں بلکہ یہ سارا کرشمہ خانگی جائداد کا ہے۔ اس شخص کے انتقال کے بعد یہ جائداد بطور ورثہ اس لڑکے کو ملتی ہے اور وہ اس جائداد سے بغیر محنت کئے آمدنی حاصل کرتا ہے اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتا ہے۔ گویا ایک شخص خواہ وہ کتنا ہی کاہل اور بدچلن کیوں نہ ہو خانگی ملکیت اور قانون وراثت کے باعث نہایت آرام و آسایش کی زندگی بسر کرسکتا ہے۔ کینن (Cannan) کا خیال ہے کہ عدم مساوات آمدنی کی وجہ وراثت ہے۔ غور کرنے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ فطری قابلیت اگرچہ عدم مساوات کی بنیادی وجہ ہے لیکن خانگی ملکیت و وراثت بھی اس عدم مساوات کو سوسائٹی میں برابر جاری رکھتی ہے۔

بالعموم وراثت کے ساتھ ساتھ مواقع بھی حاصل ہو جاتے ہیں مثلاً اس شخص کی اولاد کو جس نے محنت کرکے خانگی جائداد پیدا کی ہے نہ صرف ورثے میں جائداد ملتی ہے بلکہ اچھی تعلیم اور تربیت کے امکانات اور پھر اس جائداد سے مختلف کام لینے کے مواقع بھی حاصل رہتے ہیں۔

(۴) نظام سرمایہ داری:۔ عدم مساوات آمدنی کا ایک اور سبب سرمایہ داری نظام ہے۔ اس نظام کے تحت، اصل زمین اور محنت مختلف طبقوں میں بنٹ گئی ہیں۔ ایک طرف زمینداروں کا گروہ ہے جو اپنی زمینات کو لگان پر اٹھا دیتا ہے اور خود شہر میں بیٹھ کر لگان کی آمدنی سے گل چھرے اڑاتا ہے یہ طبقہ آمدنی حاصل کرنے کے لئے علی العموم کسی قسم کی محنت نہیں نہیں کرتا لیکن باوجود اس کاہلی، بداخلاقی اور بدچلنی کے وہ بڑے عیش سے زندگی بسر کرتا ہے۔ اس کے برخلاف مزدور دن رات محنت کرکے اطمینان کا سانس بھی نہیں لے سکتے۔ یہی حال اصل دار کا ہے کہ وہ بھی بغیر محنت کئے وافر آمدنی حاصل کرتا ہے۔ آجر اگرچہ تھوڑی بہت محنت ضرور کرتا ہے لیکن اپنی محنت کے معاوضے سے بھی زیادہ آمدنی بشکل منافع وصول کر لیتا ہے۔ پھر دیکھا جائے تو زمینداروں، اصل داروں اور آجروں کا گروہ نسبتاً چھوٹا ہے اور مزدوروں کا گروہ وسیع۔ لیکن اس کے باوجود لگان، سود منافع چھوٹی چھوٹی جماعتوں میں چلا جاتا ہے اور صرف اجرت جیسی قلیل رقم بڑی جماعت میں تقسیم ہوتی ہے۔ معاشی ترقیوں مثلاً اضافۂ آبادی، پیدائش برپیمانہ کبیر، شہری، نت نئے ایجادات وغیرہ سے بھی زیادہ تر اصل دار، زمیندار اور آجر مستفید ہوتے ہیں اور ان سے مزدوروں کی اجرت میں اتنا اضافہ نہیں ہوتا جتنا کہ ہونا چاہئے۔ گویا چھوٹی چھوٹی جماعتوں کو زیادہ آمدنی حاصل ہوتی ہے اور ان کو مواقع بھی زیادہ ملتے ہیں اس سلسلے میں ایک اور واقعے کی جانب اشارہ کرنا بھی ضروری ہے۔ پیدائش برپیمانہ کبیر نظام سرمایہ داری کی ایک خصوصیت ہے۔ اس طرز پیدائش کے سامنے چھوٹے کاروبار مشکل ہی سے ٹھیرتے ہیں۔ بڑے پیمانے پر کاروبار کرنے کے لئے کثیر سرمایہ کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے ظاہر ہے کہ مزدور بطور خود اس قسم کے کاروبار چلا نہیں سکتے۔ پھر لطف یہ کہ چھوٹے کاروبار میں بھی وہ حصہ نہیں لے سکتے کیونکہ ایسے کاروبار کا موجودہ نظام کے تحت چلنا علی العموم دشوار ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام کے تحت مزدور بطور خود کوئی کاروبار نہیں کرسکتے ان کے لئے ایک ہی راہ کھلی ہوئی ہے کہ اپنے ہاتھ پاؤں سے کام لیں، کئی گھنٹے سخت محنت کریں اور معاوضے میں معمولی اجرت پائیں۔ ان کی عرق ریزی سے پیدا کردہ دولت کا بڑا حصہ اصل دار اور آجر، سود اور منافع کے نام سے ہتھیا لیتے ہیں۔ مزدوروں کی یہ غربت اور

بھی دردناک ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ انہی کی ضروریات مثلاً زمین، یا زرعی پیداوار یں گراں ہوتی جا رہی ہیں۔ اس تمام تفصیل کا لب لباب یہ ہے کہ نظام سرمایہ داری کا رجحان یہ ہے کہ بڑی بڑی رقمیں زمینداروں اصل داروں اور اجیروں کے چھوٹے چھوٹے طبقوں میں تقسیم ہوتی رہیں اور صرف اجرت مزدوروں کے کثیر گروہ میں تقسیم ہو۔ یہاں اس امر کا اظہار ضروری معلوم ہوتا ہے کہ نظام سرمایہ داری اصل میں اپنے وجود کے لئے اسی عدم مساوات آمدنی کا مرہون منت ہے لیکن اس نظام کا قیام عدم مساوات آمدنی کو قوی تر بناتا ہے افراد معاشرہ میں آمدنی مساوی نہ ہونے کے باعث زمینداروں، اصل داروں اجیروں اور مزدوروں کے مختلف گروہ وجود میں آتے ہیں اور نظام سرمایہ داری کے تحت ان گروہوں کو پیدائش دولت کے لئے یکجا کیا جاتا ہے۔ اب یہ نظام، جیسا کہ اس سے پہلے واضح کیا جا چکا ہے۔ ان گروہوں کے مالی اختلافات کو نہ صرف قائم رکھتا ہے بلکہ قوی بناتا ہے۔ بالفاظ دیگر عدم مساوات آمدنی کی وجہ سے نظام سرمایہ داری عالم وجود میں آتا ہے اور پھر یہ نتیجۃً خود عدم مساوات آمدنی کی وجہ بن جاتا ہے۔

عدم مساوات آمدنی کو مٹانے اور اس کی شدت کو کم کرنے کے لئے جو مختلف تجویزیں پیش کی جاتی ہیں ان کو ذیل میں درج کیا جاتا ہے

خانگی ملکیت، وراثت اور سرمایہ داری کا خاتمہ:۔ عدم مساوات کو مٹانے، اور سرمایہ داری کا خاتمہ کرنے کے لے جو تجویز پیش کی جاتی ہے اس کو تحریک اشتراکیت کہتے ہیں۔ انتہائی اشتراکیین کا خیال ہے کہ درا صل عامل پیدائش صرف ایک "محنت" ہے۔ زمین قدرت کا عطیہ ہے اس لئے وہ کسی ایک کی ملک قرار نہیں دی جا سکتی بلکہ وہ تمام قوم کی مشترکہ ملک ہے۔ اب رہا اصل تو یہ خود محنت کا آفریدہ ہے گویا حقیقتاً نہ "زمین عامل پیدائش ہے اور نہ اصل" بلکہ محنت ہی عامل پیدائش ہے۔ بدیں وجہ دولت کی تقسیم مزدوروں میں ہونی چاہیئے اور زمیندار، اصل دار وغیرہ کا وجود غیر ضروری بلکہ غیر منصفانہ ہے۔ ان کی تجویز ہے کہ زمین اور اصل کو سرکاری ملک قرار دینا چاہیے۔ تمام باشندے زمین پر کھیتوں میں یا کارخانوں میں کام کریں اور ان کی کمائی سرکاری بیت المال میں جمع کی جائے۔ پھر تمام لوگ اس بیت المال سے اپنی ضروریات کے لئے خرچ لیں۔ کاروبار سے جو کچھ ماحصل زائد حاصل ہو وہ حکومت لے اور قوم کی مشترکہ ملک قرار پائے۔ لوگ صرف اپنی اپنی اجرت لیں اور بس۔ بعض اشتراکیین یہ بھی کہتے ہیں کہ اگر وہ کچھ بچانا چاہتے ہوں تو وہ بھی صرف اتنا ہو کہ ان کے آڑے وقت کام آسکے لیکن وہ اپنے اندوختے سے بطور اصل کوئی کام نہ تو خود لیں اور نہ اس کو بطور ورثہ منتقل کریں۔ مختصراً

یہ کہ خانگی ملکیت اور نظام سرمایہ داری کو مٹا دیا جائے لوگوں میں مساوی آمدنی تقسیم ہو اور امیر و غریب کا سوال باقی نہ رہے۔

اس تحریک پر سخت تنقیدیں کی جاتی ہیں بعض تو اس قسم کی سوسائٹی کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ان تمام تنقیدوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اس تحریک میں فطرت انسانی کو نظر انداز کر دیا گیا ہے اور یہ کہ اس سے معاشی ترقی کے رک جانے کا اندیشہ ہے۔ اعتراض یہ ہے کہ خانگی ملکیت اور وراثت کو مٹانے اور اندوختوں کو بطور اہل استعمال کرنے کی ممانعت کر دینے سے لوگوں میں پس اندازی کا خیال ہی پیدا نہ ہوگا۔ اگر کوئی شخص پس انداز بھی کرے تو بے کار ہے کیونکہ اس سے وہ کوئی مزید آمدنی پیدا نہیں کر سکتا۔ اور اس طرح وہ چاہے گا کہ جو کچھ اندوختہ ہے اس کو اپنی زندگی ہی میں صرف کر دے کیونکہ وراثت تو ہے نہیں کہ وہ اپنی اولاد کی فلاح و بہبود کی خاطر اس کو چھوڑ جائے۔ اگر وراثت کو قایم بھی رکھا جائے، جیسا کہ بعض کا خیال ہے، تو بھی پس اندازی کا محرک کمزور رہے گا اس لئے کہ مزید آمدنی پیدا کرنے کے مواقع ہی نہیں ہیں اس طرح قومی ملکیت میں انحطاط کے باعث خاطر خواہ معاشی ترقی نہ ہو سکے گی۔ ایک اور نقص اس تحریک کا یہ بیان کیا جاتا ہے کہ کاروبار میں وہ انہماک باقی نہ رہے گا جو خانگی انفرادی کاروبار میں رہتا ہے۔ جب تمام کاروبار سرکاری قرار دیئے جائیں گے تو لوگ اس تندہی سے اس میں حصہ نہیں لیں گے جس کی توقع کی جاتی ہے کیونکہ ان کو اس سے کوئی معتدبہ فائدہ نہیں ہوگا

اس طریقے کو اختیار کرنے میں ایک دقت تقسیم آمدنی کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس طرح کی پیدا کردہ دولت کس طرح تقسیم ہوگی؛ مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ سب میں آمدنی بلالحاظ محنت مساوی مساوی تقسیم ہو۔ دوسرے یہ کہ آمدنی بلحاظ ضروریات تقسیم ہو یا یہ کہ آمدنی کی تقسیم بلحاظ کار ہو۔ لیکن اس صورت میں ایک دقت یہ ہے کہ تقسیم عمل کی گوناگوں پیچیدگی کے باعث آمدنی کی اس طرح تقسیم تقریباً ناممکن ہے۔

اشتراک سرکاری:۔ نظام سرمایہ داری عدم مساوات آمدنی کا ممد و معاون ہے۔ اور تحریک اشتراکیت پر عمل کرنے سے معاشی انحطاط کا اندیشہ ہے اس لئے ان دونوں کے درمیان ایک راہ نکالی گئی ہے جس کو "اشتراک سرکاری" کہا جاتا ہے مقصد یہ ہے کہ اصول عدم مداخلت میں ترمیم کر کے حکومت ملک کی معاشی حالت کو بہتر بنانے کی خاطر کاروبار پر نگرانی رکھے۔ ایسے کاروبار جن کا ملکی فلاح سے قریبی تعلق ہے، ان کو حکومت بالکلیہ اپنے قبضے میں لے لے مثلاً ریل، ڈاک، نہریں وغیرہ۔ افتادہ زمینات، جنگل، سرکاری ملک قرار پائیں۔ زمینداروں سے مالگذاری وصول کی جائے اور ان کی آمدنی پر ٹیکس لگایا جائے۔ اصل اراضی اور اجر کی آمدنیوں کا بھی ایک حصہ بطور ٹیکس لیا جائے۔ ایک تجویز یہ بھی ہے کہ وراثت پر بھی ٹیکس لگایا جائے لیکن

یہ طریقہ معینہ حدود کے اندر ہو ورنہ اندیشہ ہے کہ ٹیکس کہیں ملکیت موروثی کا جزو بن کر ملکیت کو فوراً ختم نہ کردے۔ لہٰذا اس طرح سے ٹیکس لگایا جائے کہ تین پشتوں میں جاکر ختم ہوجائے۔ حکومت افراد ملک کے لئے یکساں مواقع فراہم کرے مثلاً یہ کہ ابتدائی تعلیم مفت اور لازمی کردی جائے۔

عدم مساوات آمدنی کی موجودہ زمانے میں اہمیت کا اندازہ اس تمام مفصل بحث سے واضح ہے۔ اسی کی بدولت آج دنیا میں ایک ہل چل مچی ہوئی ہے نظام سرمایہ داری اسی کا آفریدہ ہے۔ اور اس نظام سے جو کچھ معاشی، معاشرتی ترقیاں ظہور پذیر ہوئی ہیں وہ بھی بڑی حد تک بالواسطہ عدم مساوات آمدنی کا نتیجہ ہیں۔

مزدوروں کی تحریک کو عدم مساوات کے خلاف ایک قسم کا ردعمل کہا جا سکتا ہے۔ آجروں اور مزدوروں میں جو کشمکش آج کل ہو رہی ہے اس کی تہہ میں بھی تلخ حقیقت کار فرما ہے۔ مزدوروں کا اپنے آپ کو منظم کرنا، بلکہ سیاسی طاقت کا حاصل کرنا، یہ تمام امور اس رجحان کو واضح کر رہے ہیں کہ وہ عدم مساوات آمدنی کو اگر مٹانا نہیں چاہتے تو کم کرنا ضرور چاہتے ہیں۔

عدم مساوات آمدنی کو ہم دنیا کی ایک حد تک حیرت انگیز تحریک اشتراکیت کا باعث قرار دے سکتے ہیں۔ امیر و غریب کے فرق کو اٹھا دینے کا خیال جو اشتراکیت کی علت نمائی ہے۔ عدم مساوات آمدنی کے احساس کا نتیجہ ہے۔

الغرض نظام سرمایہ داری، تحریک مزدوران اور اشتراکیت جیسے مسائل کی اہمیت ظاہر ہے اور ان کی اہمیت سے عدم مساوات آمدنی کی اہمیت واضح ہوتی ہے۔

احمد خاں متعلم بی۔ اے (آخری)

"ہوسٹل"

بیتے ہوئے دنوں کی یاد

یہیں میری نگاہوں نے ادائے جستجو پائی	یہیں میری جوانی نے بہارِ رنگ و بو پائی
مرے دل نے یہیں اک کائناتِ آرزو پائی	یہیں بے تاب ہو کر زندگی نے آبرو پائی
یہیں میری اُمنگوں سے کھنچی تصویرِ آزادی
مرے خوابِ تمنّا کو ملی تعبیرِ آزادی

یہیں مہتاب کی کرنیں نگاہوں کو جھلاتی تھیں	یہیں دل کو محبت بن کے لہریں گدگداتی تھیں

یہیں بے تابیاں ہر سانس کو نغمہ بناتی تھیں ہوائیں گنگناتی تھیں، فضائیں مسکراتی تھیں
یہیں ہر سانس، ہونٹوں پر تبسم ہو کے آتا تھا
مرا نالہ بھی پابندِ ترنم ہو کے آتا تھا

مجھے پہروں جگاتی تھیں، یہیں بھیگی ہوئی راتیں مرے دل میں یہیں اک موج سی لاتی تھیں برساتیں
یہیں ہوتی تھیں غرقِ آرزو بہکی ہوئی باتیں تصنع کو دیا کرتی تھی میری سادگی، ماتیں
سکوتِ لب کو وہ رنگیں فسانہ یاد ہے اب تک
مری بے کیفیوں کو وہ زمانہ یاد ہے اب تک

یہیں سرسبز ٹیلوں نے مجھے نغمہ سنایا تھا یہیں رنگیں فضاؤں نے مجھے شاعر بنایا تھا
یہیں بے باکیِ دل نے مجھے جینا سکھایا تھا یہیں طوفان نے میرے سفینے کو بہایا تھا
یہیں قسمت کے چہرے نے نقابِ بیش و کم اُلٹا
مرے جامِ تہی میں بے خودی نے جامِ جم اُلٹا

میکش

دیہی بنک

اس ملیٹن میں ہم اپنی تمام تر توجہ دیہی اتحادی بنک پر مرکوز کرنا چاہتے ہیں۔ زرعی آبادی کے موجودہ جمود میں دیہی اتحادی انجمن کو غالبًا مدرسے اور پنچایت سے اور بھی زیادہ اہمیت حاصل ہے، اور یہ اس مسئلے کے تمام پہلوؤں کو حل کرنے کے لئے زیادہ موزوں ہے۔ تاکہ یہ اپنے مقصد میں کامیاب رہے، جس اساس پر وہ کام کرتا ہے اُس کو، جیسا کہ ہمارے پہلے ملیٹن میں وضاحت کی گئی ہے، وسعت دینے کی ضرورت ہے۔ اگر یہ صرف سستے قرضے کی فراہمی کے لئے محض ایک ایجنسی کی خدمت انجام دے تو اُسے بڑی حد تک کسانوں کی حالت کے سدھارنے میں کامیابی نہیں ہوگی، اس لئے کہ، جیسا کہ بیان کیا جا چکا ہے۔ قرض کی گرانی اُن کی ابتری کا تنہا سبب ہے۔ جو دوسری معاشی رکاوٹیں اُن کے راستے میں حایل ہیں اُن پر بھی ساتھ ہی ساتھ غور کرنا چاہئے۔ اور اُن سماجی اور مذہبی رسوم کو بھی جو ئی وسایل آمدنی کو زیر بار کرتے ہیں، اس کے دائرۂ عمل سے باہر نہیں رکھا جا سکتا۔ چونکہ اتحادی انجمن قرض ایک ایسا ادارہ سمجھا جا رہا ہے جس کا اہم ترین کام قرض دینا ہے اس لئے اس مجوزہ کثیر المقاصد انجمن کو یہاں "اتحادی دیہی بنک" کہنے میں سہولت ہوگی۔ دیہی بنک کے لئے دیہی صورتِ حال درپیش ہے، جو تحریک اتحادی کے لئے ہے۔ دیہی مسئلے پر اتحادی اصول کے عمل کی ضرورت کا بیان کرنا جو کچھ اس وقت تک کہا جا چکا ہے اُسے دُہرانے کے برابر ہے، جس سے وہ اصحاب جنھوں نے اس موضوع

کا مطالعہ کیا ہے، بخوبی واقف ہیں۔ لیکن چونکہ اس کا امکان ہے کہ ان اصولوں کی پوری اہمیت محسوس نہ کی جاسکے، اس لئے ان امور کا پیش کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے جن کی وجہ سے دیہات سدھار کے لئے تحریک اتحادی مناسب ترین وسیلہ بن جاتی ہے۔

نکلسن کی رپورٹ

دیہی زندگی میں تحریک اتحادی کی حیثیت کے بیان سے قبل اس امر کی طرف توجہ کرنا ضروری ہو کہ دیہی بنک کی اصطلاح سر فریڈرک نکلسن کی رپورٹ بابتہ ۱۸۹۵ء میں استعمال کی گئی جس میں ہندوستان میں پہلی دفعہ انجمن ہائے اتحادی کے قیام کی تجویز کسانوں کی دقتوں کو دور کرنے کے بہترین ذریعے کی حیثیت سے پیش کی گئی تھی۔ اس یادگار رپورٹ میں، جو اب بہت کم پڑھی جاتی ہے، بلکہ تقریباً بھلا دی گئی ہے، دیہی مسئلہ کا ہر ایک پہلو درج ہے، اور اس کے حل کے لئے تحریک اتحادی کے اصولوں پر عمل کی ضرورت کو پیش کیا گیا ہے، اس طریقے پر کہ جس پر اب چالیس سال کے تجربے کے بعد بھی کوئی اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ اس لئے ذیل کے پاروں میں اس کے استعمال کے لئے کسی معذرت کی ضرورت نہیں۔

شرائط قرض

اولاً اُن حالات پر غور کرنا ضروری ہے جن میں کاشتکار زیادہ سے زیادہ فائدے کے ساتھ قرض لے سکتے ہیں نکلسن[1] نے ان کا خلاصہ حسب ذیل الفاظ میں پیش کیا ہے:- "قرض دینے والے اور قرض لینے والے کی مکمل قربت؛ پیش کردہ بنک کی حقیقت کے بارے میں قرض دینے والے کو مکمل ضمانت؛ اُس کا سابقہ کفالتوں سے بری ہونا؛ اس کے اصل اور سود کی ایسی مقررہ رقوم میں ادائی جس میں سہولت ہو؛ بقایا کی صورت میں اس قسم کی بازیافت کے عمل کی سہولت کے ساتھ قرض لینے والے کے لئے پوری سلامتی اور آسانی، کسی وقت ارزاں شرح سے قرض لے سکتے ہیں، جو ضمانت وہ پیش کرسکے اُس کے مطابق رقم حاصل کرنے میں، اور ایسی شرائط پر جو بجائے خود اس حد تک منصفانہ ہوں، ادائی کی

---

[1] بعد کے سارے پاروں میں جو اقتباسات درج کئے گئے ہیں وہ صوبہ مدراس میں زرعی اور یا اضیاتی بنکوں کے رواج سے متعلقہ "نکلسن کی رپورٹ ۱۸۹۵ء سے لئے گئے ہیں۔

حد تک اس قدر سہولت بخش ہوں، جانے بوجھے اُلجھاؤ کے تمام خطرات سے اس قدر محفوظ ہوں، مشتہرہ اصولوں پر اس طرح مبنی ہوں، سوائے ایک واجبی بیمے کے، ضرورت یا فوری حاجت پر منہائیوں کا عمل کرنے کے ہر طرح کے رجحان سے اس قدر بری ہوں کہ قرض لینے والے کو اپنی پیش بینی کا پورا پھل ملنے کا اعتماد ہو جائے، اور قرض میں وہ اپنی پیداآور قوتوں اور اپنے استحکام کے لئے ایک زبردست امدادی قوت محسوس کرے۔ ادائی قرض کی شرائط خاص طور پر ایسی ہونی چاہئیں کہ کسان کاروبار کے فائدے سے قرض ادا کر سکے۔ اراضی کی ترقی کے لئے جو قرض لیا جائے کئی اقساط میں ادا طلب ہونا چاہئے۔ فصلوں یا گذران کے لئے پیشگیات بلحاظ سہولت یکمشت یا با اقساط ادا طلب ہونی چاہئیں۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ وہ قرضے جو ایسی ترقیاتی مہموں پر لگائے گئے ہوں جن میں فائدہ رفتہ رفتہ ہوتا ہو ادا نہیں کئے جانے چاہئیں سوائے ایسی اقساط کی شکل میں جو اس مہم کی مدت کے مطابق ہوں"۔

مہاجنوں کے فراہم کردہ قرضوں کے نقایص

"اُن دلایل سے جانچا جائے تو افراد سے قرض لینے میں نقصان ہے۔ مہاجن وقت پر قرض ضرورت کے مطابق دیتا تو ہے، لیکن چوں کہ خانگی سرمایے پر تجارت کرتا ہے جس میں کبھی کبھی قرضے لے کر اضافہ کیا جاتا ہے، اس لئے اس کے لئے جس وقت اور جس قدر قرض طلب کیا جائے اس کا ایصال ناممکن ہے۔ مہاجن سوائے اپنے ضمیر کے جو اُس کی مرضی کے مطابق بدلتا رہتا ہے کسی اور اصول کی پابندی نہیں کرتا۔ وہ ہمیشہ قرض لینے والے کی شدید ضرورت کے لحاظ سے اونچی شرائط پیش کرتا ہے نہ کہ پیش کردہ ضمانت کے موافق۔ یہ انسانی فطرت کا نقص ہے کہ وہ لوٹ کی طرف مایل رہتی ہے۔ اس کے حسابات اگر وہ رکھتا بھی ہے تو وہی ہوتے ہیں جو وہ لکھنا چاہتا ہے، اور بس، جن پر کوئی پابندی یا تنقیح نہیں ہوتی اس کے رقم یا قوت کے لالچ میں بہ جانے کا امکان ہے وہ اپنے اصل کو ایک بڑی مدت تک متقفل رکھنے یا چھوٹی چھوٹی ان گنت اقساط میں واپس لینے (اُس سود کے لگ بھگ جس پر وہ قرض دیا گیا تھا) پر راضی نہیں ہو سکتا برخلاف اس کے چوں کہ مہاجن پر اعتماد کرنا ناممکن ہے، جس کو قرقی یا دوسری سرسری وصول یابی کے اختیارات حاصل ہیں، اس لئے اُس کو اپنے قرضوں کی بازیافت میں قابلِ لحاظ حد تک اخراجات تعویق، خسارہ اور فریب کا شکار بنایا جاتا ہے، ایسا خسارہ جس کی تلافی وہ اپنے اہلِ معاملے سے ایک کافی حد تک زیادہ رقم وصول کر کے کرتا ہے۔ اس طرح کہ

پابندی کے ساتھ ادا کرنے والوں اور معزز قرض گیروں کو خلاف ورزی کرنے والوں کی غلطیوں کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ اس لئے یہ یقینی ہے کہ مہاجن کے قرضوں کی جگہ منظم قرضوں کی دیہی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ انفرادی نظام صرف ایک ابتدائی منزل ہے جس کو دولت عامہ، امن و امان، ساکھ اور شرکت انجمن کی عادت کی ترقی کے ساتھ چھوڑ دینا چاہیے"

قرض کی تنظیم مقروضیت کا علاج نہیں

دوسرا امر جس کا خیال رکھنا چاہیے یہ ہے کہ اگرچہ قرض گیری جو صرف سرمایے کی عارضی نقل و حرکت کی وجہ سے عمل میں آتی ہے، قابلِ اعتراض یا کمزوری کی علامت نہیں ہے۔ اور درحقیقت مزارعین کی ایک عالمی ضرورت ہے، اُن کی مقروضیت کی وجہ زیادہ تر زراعت کے مطالبات سے باہر- افلاس و جہالت، ناعاقبت اندیشی، بے پرواہی، موسمی تباہیاں، اور متعدی امراض، سماجی اور مذہبی رسوم و رواج، غصب اور ربا کے مطالبات ہیں۔ اس لئے اگرچہ کاشتکار کو تباہ کن شرح سود اور مہاجنوں کے غصب سے محفوظ رکھنے کی غرض سے منظم قرض کے رواج کی ضرورت ہے، یہ صاف ظاہر ہے کہ "چوں کہ مقروضیت محض غاصب کے عمل کا نتیجہ نہیں، اس لئے محض قرض کے انتظامات میں تبدیلی بجائے خود کوئی بنیادی علاج نہیں کر سکتی۔ مقروضیت کا اصل سبب مہاجن ہیں، وہ اس کے بار میں اضافہ کرتا اور اس کی دقتوں کی شدت اور طوالت میں اضافہ کر دیتا ہو، لیکن وہ اس کا اصل سبب نہیں۔ عام طور پر کہا جا سکتا ہے کہ مقروضیت کی اصل کے کئی عناصر ہیں۔ اس کا سبب قومی اور شخصی خصوصیات اور ساتھ ہی ساتھ افراد کی ذات سے خارج اسباب جیسے قوانین، سماجی رسم و رواج، وراثت کے طریقے، موسمی دقتیں اور اسی قسم کی چیزیں ہیں۔ اس لئے یہ فرض کرنا بڑی غلطی ہے کہ مقروضیت کا مسئلہ صرف قرض دینے والوں کے بدل دینے سے حل ہو جائے گا۔ مہاجن کی جگہ بنک کو دینا مقروض کاشتکاروں کو قرض ادا کرنے کے قابل بنانے کے برابر نہیں ہے بر خلاف اس کے جب تک مقروضیت کے اسباب دور نہ کئے جائیں، قرض گیری کی سہولتوں اور آسان شرائط کی وجہ سے قرض کا بار آسانی سے بڑھ سکتا ہے، قرض کی خصوصی سنگینی گھٹ سکتی ہے لیکن اس کی مقدار میں تناسب سے زیادہ اضافہ ہو جائے گا۔ اگر یہ مناسب رائے جو بہ نسبت واقعات کے زراعت کی ضروریات کے معقول مطالعے پر مبنی ہو کہ رعایا اور زر اور سرمایے کی خواہش مند اس لئے ہے کہ وہ اُسے زمین پر بہانا چاہتی ہے، اگر، دوسرے الفاظ میں ترقی اراضی کے

بنک رعایا کی تمناؤں کے مرکز نہ ہوتے۔ اگر ارزاں اصل کی جستجو صرف کسی قسم کے عملی طور پر پیدا آور قرض دینے والے بنک کے لئے کی جاتی جو ارزاں سرمایہ فراہم کرے، ضرورت پوری کرے گا اور متقروض کے قرض میں جس قدر اضافہ ہوگا۔ ان پیدا آوری اور خوش حالی میں اسی قدر اضافہ ہوگا، لیکن یہ ایسا نہیں ہے راست اخراجات اراضی و ترقی زراعت آخری چیز ہوگی جس کے لئے قرض کی جستجو کی جاتی ہے۔ اس وجہ سے قرض آسانیوں سے زیر بار کن، اور غیر پیدا آور قرض کی مقدار میں اضافہ ہوجانے کا اندیشہ ہے یہ مفروضہ محض ایک خواب کی سی نوعیت رکھتا ہے کہ جونہی بنکوں کے ذریعے ارزاں قرض کا طریقہ رائج کیا جائے گا کاشتکاروں کی مشکلات دور ہو جائیں گی۔ انھیں محض ارزاں قرض یا قرض کی سہولتیں دور نہیں کرسکتیں، بلکہ اس کے لئے کفایت، آیندہ کے لئے پس انداز، اور قرض لینے میں احتیاط میں اضافہ بلکہ اس کو قانونی طور پر نافذ کرنے کی ضرورت ہوگی۔ شرائط تو آسان کردی جانی چاہئیں لیکن قرض لینے کی عادت کو بھی محدود کردینا چاہیے۔

قرض فائدہ بخش اور تعلیم دہ ہونا چاہیے

اس لئے یہ ضروری ہوجاتا ہے کہ جو قرض کاشتکار لیتا ہے جہاں تک ہمیشہ اس کی رسائی میں رہنے کا تعلق ہے، بے شک ارزاں اور آسان ہونا چاہیے، لیکن یہ ایسا قرض ہونا چاہیے جو اس طرح مل سکے کہ اس کو حاصل کرنے کا عمل اور اس کے لئے کوشش، قرض لینے والے کو تعلیم دے، ضبط سکھائے اور اس کی ہدایت کرے۔ یہ صرف ایسے افراد کے نام منظور کیا جانا چاہیے جنھوں نے سوچنے منصوبے بنانے اور کفایت شعاری کی قابلیت بہم پہنچائی ہو۔ اس کی فراہمی کا طریقہ اپنی آپ اور باہمی امداد سکھانے والا ہونا چاہیے اور اس طریقے کی توسیع قرض کے مسایل کے باہر کرنے کا میلان پیدا کرنا چاہیے۔ اس کو نہ صرف غصب کے خطرات کو دور کرنے میں محفوظ ہونا چاہیے، بلکہ پابند، محتاط اور پیدا آور ہونے کی حد تک بھی۔ جس چیز کی ضرورت ہے وہ ارزاں اصل کا محض لنڈھا دینا ہرگز نہیں، ایسے طبقوں کو جو اس نعمت کے لئے تیار نہ ہوں محض ارزاں اور سہل الحصول قرضوں کی منظوری نہیں۔ ضرورت ہیں اندوختگی سہولتوں میں اضافہ، بنک میں رقمیں امانت رکھوانے پر لوگوں کو اکسانے یا دوسرے الفاظ میں کفایت شعاری، دور بینی اور خود اعانتی کی خوبیوں کو ان مقاصد کے تحت منظم کردہ اداروں کے ذریعے ترقی دینے کی ہے۔"

اتحادی دیہی بنک بہترین انجمنی ہے

ایسے بنک جو ،، کفایت شعاری اور قرض دونوں کی ضروریات کو بہ یک وقت پورا کرتے ہیں اور ساتھ ہی ساتھ اُن صفات کو بھی بڑی حد تک ترقی دیتے ہیں جو اعلیٰ قومی سیرت کے لئے ناگزیر ہیں، اتحادی دیہی بنک ہیں۔ یہ ایسے سرمایہ داروں کی جانب سے قایم نہیں کئے جاتے جو اپنی رقوم پر مقسوم حاصل کرنے کی اُمید میں روپیہ لگانے کی جستجو کرتے ہیں۔ اور اس لئے قرض لینے والوں پر اس کے اثرات کا خیال کئے بغیر کاروبار کو وسعت دیتے ہیں۔ بلکہ یہ لوگوں کی چھوٹی چھوٹی جماعتیں ہیں جو سب کے سب ایک ہی پڑوس سے تعلق رکھتے ہیں، جو اپنے پس انداز کو یکجا کرتے ہیں، کفایت شعاری اور پیش بینی کے ذریعے سرمایہ حاصل کرتے ہیں، اور پیدا آور استعمال کی غرض سے فروخت کی رقم کو واجبی شرائط پر خود قرض لیتے ہیں۔ رہنما اصول کفایت شعاری، اپنی مدد آپ کرنا اور باہمی امداد ہیں۔ کفایت شعار پیش بین اور سنجیدہ افراد اور نسبتاً کم محتاط اور بے پرواہ افراد یکجا ہوتے ہیں؛ اور ایک دوسرے کے اثر سے انھیں کفایت شعاری اور احتیاط کے خیالات اور عادات اختیار کرنے کی ترغیب دیتے ہیں۔ رقم احتیاط کے ساتھ پس انداز کی جاتی ہے اور اس سے بھی زیادہ احتیاط کے ساتھ صرف کی جاتی ہے۔ بنک ایسے افراد کی ایک انجمن ہے، جن میں سے ہر ایک دوسرے پر پیش بینی اور پیدا آوری کے اثرات ڈالتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بنک نہ صرف باہمی موزونیت اور سہولت کی مسلمہ ضروریات کی تشفی کرتا ہے، بلکہ سب سے زیادہ نمایاں طور پر سلامتی کے مقصد کو بھی پورا کرتا ہے“

دیہی بنک کے فایدے

نکلسن نے دیہی بنک کے فایدے حسب ذیل بیان کئے ہیں :۔

(۱) قرض گیرندہ کے لئے ان کی مکمل باہمی موزونیت“ (۲) اُن کے مقامی اعتماد کو اُبھارنے اور اس کے نتیجے کے طور پر مقامی اصل حاصل کرنے کی قابلیت۔ (۳) اپنے اہل غرض کے متعلق اُن کی صحیح صحیح معلومات اور بہ حیثیت ہم قریہ کے ان پر اثر، اس کے نتیجے کے طور پر فریب کو روکنے اور دفتر رجسٹریشن میں چھان بین کو غیر ضروری قرار دینے کی قابلیت (۴) چھوٹے سے چھوٹے قرضے ایصال کرنے کا اختیار، اور کوئی کام جو گاؤں کے رواج اور انفرادی ضرورت کے مطابق ہو، چاہے کتنا

ہی معمولی کیوں نہ ہو اپنے ذمے لینے کا اختیار۔ اور درحقیقت چھوٹے کاروبار کو ترجیح دینے کا اختیار (۵) کسی سابقہ قرض کی عام ادائی کو غیر ضروری قرار دینے کا اختیار، ایسی ادائی جس کا مطالبہ ایک تعلقہ بنک کے قیام کی تمہید کے طور پر بھی کیا جائے بنک ہر صورت میں قرض گیرندہ کے سابقہ قرضوں کی مقدار معلوم کریں گے، قرض خواہ سے نقد ادائی کے لئے کسی خاطر خواہ تصفیے کی غرض سے بہ حیثیت ثالث گفتگو کریں گے۔ طے شدہ رقم ادا کریں گے اور بقیہ رقم کو اپنی جانب واجب الادا تسلیم کریں گے (۶) اُن کی ارزاں طور پر بلکہ بہت بڑی حد تک بغیر کسی معاوضے کے مفت کام کرنے اور اس طرح ارزاں قرض فراہم کرنے کی صلاحیت۔ (۷) اُن کا مقامی اصل اور اُس کے سارے منافع کو گاؤں کے اندر رکھ سکنا اور اتحادی انجمنوں کے خصوص میں اُن کا اراکین اور قرض گیروں کے لئے سارے منافع کو اپنے پاس محفوظ رکھنا۔ (۸) پیداوار کی فروخت اور ضروریات کی خرید میں اپنے اراکین کے لئے بہ حیثیت ایجنٹ اور دلال کے کام کرنے کی قابلیت (۹) دیہی اجناس خانوں کی طرح کام کرنے کی قابلیت، جو عام سالوں میں خود اپنے وسایل سے خوراک اور بیج کے لئے اجناس قرض دیتے اور مصیبت کے زمانے میں ان وسایل سے قرض دینے کے علاوہ سرکاری یا دوسری منظوریوں سے اُس میں اضافہ کرتے ہیں (۱۰) ریاست اور زرد کے مابین واسطے کے طور پر کام کرنے کی قابلیت، ترقی اراضی۔ مویشی وغیرہ کے لئے قرضوں کے معاملے میں ہو یا دوسری زرعی یا صنعتی ترقیوں کے بارے میں۔ یا سخت موسمی دباؤ کے موقع پر (۱۱) قرضوں کے صحیح استعمال کے بارے میں قرض گیروں کو متاثر کرنے اور معاہدے کے مطابق قرضوں کے استعمال پر نظر رکھنے کا اختیار (۱۲) فریب آمیز خلاف ورزیوں اور املاک کی سازشی فروخت کو روکنے کی قابلیت اور خلاف ورزی کی صورتوں میں ان چھوٹی چھوٹی املاک کو جو ضمانت کے طور پر پیش کی گئی ہوں مفید طور پر استعمال کرنے کی قابلیت (۱۳) باہمی ترقی، باہمی عمل، معائنہ اور تنقیح حسابات کی غرض سے ان کا اپنے آپ کو انجمنوں کی شکل دینے کا رجحان (۱۴) کفایت شعاری کا باہمی میل جول اور اپنی آپ امداد کے بارے میں اُن کے متعلق تعلیم دہ اثرات، گاؤں میں اُن کی مسلسل موجودگی، مسلسل موضوعی اسباق، اور اپنے اراکین کی مصروفیات خیالات اور خدمت سے اُن کی پیہم اگرچہ معمولی اپیل (۱۵) انفرادی اہلیت کے دونوں پہلوؤں یعنی پبلک زندگی اور قومی سیرت کو ترقی دینے کا رجحان۔

دیہی بنک کے مسایل

مختصر یہ کہ مقروضیت کا بنیادی علاج قرض کی تنظیم میں نہیں بلکہ کسانوں کی ساری غیر ضروری مجبوریوں کو

دور کرنے، اور ہر قسم کی ترقی کو آگے بڑھانے میں ہے، چاہے وہ رسم و رواج میں ہو، سماجی خصوصیات میں، بازارات کے کھولنے میں، معقول تعلیم کی اشاعت میں، زرعی اور صنعتی طریقوں کو ترقی دینے میں۔ الخ۔ قرض کی تنظیم بذات خود ایک اہم تسکین بخش چارہ کار ہے، اس لئے کہ ضروری اصل کی قیمت اس طرح بڑی حد تک کم کردی جاسکتی ہے، جس کی وجہ سے کسان دائمی بے بسی اور ساری عمر کی پریشانی کے بغیر قرض لے سکتا ہے۔ لیکن محض سود میں تخفیف کے معنی ضروری طور پر یا عام طور پر مقروضیت میں تخفیف کے نہیں ہوں گے، بلکہ ایک حد تک جیسا کہ عام معاشی تاریخ ہمیں بتاتی ہے اس کی وجہ سے قرض کی مقدار میں اضافہ ہوجائے گا۔ رقم کے ارزاں ہوجانے کی وجہ سے قرض زیادہ لیا جائے گا۔ سالانہ خرچ تو وہی رہے گا لیکن مقدار دگنی ہوجائے گی۔ اس لئے قرض کے ایسے طریقوں کی دریافت ضروری ہے، جو نہ صرف موجودہ سے نصف شرح پر اصل فراہم کرسکیں بلکہ اسی حد تک مقروضیت کو گھٹانے کی طرف بھی مایل ہوں۔ اتحادی انجمن ہائے قرض یا دیہی بنک نہ صرف یہ مقاصد پورے کریں گے، یا ان کے حصول کی طرف مایل رہیں گے بلکہ ساتھ ہی ساتھ متعدد پسندیدہ بلکہ نہایت اہم خصوصیات جیسے کفایت شعاری، پیش بینی اور باہمی امداد کے جذبے کو ترقی دیں گے۔ اتحاد کی ایسی صورتیں پیدا کریں گے، جو ہر شخص کو اس کی محنت کا صحیح معاوضہ دلانے کی طرف مایل ہوں، اور ترقی کے ایسے اکسانے والے خیالات پیدا کریں گے جن کی کسانوں کی قدامت اور تنہائی پسند جماعت کو اس قدر سخت ضرورت ہے۔ ایسی انجمنیں ہر جگہ معاشی اور اخلاقی ترقی کے مراکز قایم کریں گی جیسا کہ جرمنی اور اطالیہ میں قایم کئے گئے ہیں۔

پانچ لازمی شرایط

یہ ایک عملی حقیقت ہے کہ ہندوستان میں اتحادی انجمنوں نے اس اعلیٰ مقصد کو سامنے نہیں رکھا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دیہی زندگی کے معیار کو بہتر نہیں بناسکیں، جس کی ان سے توقع تھی اگر اس تحریک کو دوبارہ تقویت دینا ہو تو ان انجمنوں کو اس وسیع مفہوم میں جس میں نکلسن نے "دیہی بنک" کی اصطلاح استعمال کی ہے دیہی بنک بن جانا چاہئے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے موجودہ طریقۂ کار میں پانچ سمتوں میں ترمیمات کی جانی چاہئیں:-

(۱) بنک کو چاہئے کہ ساری دیہی زندگی کو اپنے دائرۂ عمل میں داخل کرلے (۲) اس کا مقصد گاؤں کے ہر فرد کو شامل ہونا چاہئے (۳) اہم اور ضروری اتحادی اصولوں کی زیادہ پابندی کی جانی چاہئے (۴) اراکین سے

باہم معاملت اور مسلسل تعلق ہونا چاہیے اور (۵) متعدد اور منتشر اراضی کی جگہ بعض منتخب رقبوں پر توجہات کو مبذول کرنا اس کا مقصد ہونا چاہیے۔ ان میں سے ہر ایک نکتہ کے لوازم کو قدرے تفصیل کے ساتھ سمجھنا ضروری ہے۔

(۱) ساری دیہی زندگی کو اپنا موضوع بنانا چاہیے

پہلا نکتہ، جو پہلے بلیٹن کا اصل موضوع تھا دیہی زندگی کے ہمارے تجربے کی روشنی میں مزید وضاحت چاہتا ہے جن پانچ شرائط کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اُن سے عام طور پر بحث کرنے کے بعد اس کو تفصیل کے ساتھ سمجھانے میں زیادہ سہولت ہوگی۔ مختصر یہ کہ دیہی بنک کی حیثیت صرف ایک قرض کے منبع کی نہیں ہونی چاہیے، بلکہ اس کو اجناس کی فروخت کے کاروبار اور ضروریات کی خرید میں مدد دینا چاہیے، زرعی اور صنعتی ترقی میں مستعدی کے ساتھ حصہ لینا چاہیے، سماجی اور مذہبی رسم و رواج کو متاثر کرنا اور انھیں بہتر بنانا چاہیے۔ اس کو چاہیے کہ اجتماعی زندگی کو ترقی دینے، اور ہر سمت میں مددگار اور کارآمد ہونے میں خاص طور پر کوشش کرے۔ اتلاف کے سارے راستے بند کر دیے جانے چاہییں، اور پیداوار میں اضافے کے سارے طریقوں کو ترقی دینی چاہیے۔ یہ اعلیٰ مقاصد پہلے ہی سے قائم کیے جانے چاہییں، انھیں کسی بعد کی منزل میں یکایک داخل نہیں کیا جا سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جب ایک دفعہ اس ادارہ کا کام تنگ شکنجوں میں کس چکتا ہو اُس میں وسعت پیدا کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ اراکین کو شروع ہی سے اس نصب العین کی تعلیم دی جانی چاہیے، جن پر مستعدی کے ساتھ عمل کیا جانا چاہیے۔ بنک کو ایک نظام عمل کا پابند ہونا چاہیے، اور مصروفیات یکے بعد دیگرے شروع کی جانی چاہییں۔ سال بہ سال نتائج پر تبصرہ کیا جانا چاہیے، اور اپنے کارناموں کی بنیاد پر نیا پروگرام مرتب کرنا چاہیے۔ اس معاملے میں انجمن بکاری اور محکمہ جاتی عملہ مفید مدد کر سکتا ہے۔ انجمن بکاری کو جس کی تنظیم پہلے بلیٹن میں مصرحہ طریقوں پر عمل میں آنی چاہیے دیہی بنک سے زیادہ سے زیادہ تعلق رکھنا اور اس کی باہم رہبری کرنی چاہیے۔ ان دو کا ایک قریبی تعلق دیہی بنک کو تیزی کے ساتھ ترقی کرنے اور دیہی زندگی سے تعلق رکھنے والی مختلف مصروفیات کو اپنے ذمے لینے کا موقع دے گا

(۲) گاؤں کے ہر شخص کو شریک کرنا چاہیے

دوسری شرط پہلی شرط کا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر بنک کو دیہی زندگی کے سارے امور کو کامیابی کے ساتھ سرانجام

کرنا ہو تو اُس کی رکنیت جہاں تک ہو سکے وسیع ہونی چاہیئے، اور گاؤں کا ہر کارندہ اس میں شریک ہونا چاہئے۔ رکنیت پر قیود کے بارے میں عام طور پر جو وجوہات بیان کی جاتی ہیں یہ ہیں کہ گاؤں میں ہر شخص ایک حیثیت کا نہیں ہوتا اور زورآوروں اور کم زوروں کے یکجا ہو جانے سے نتیجہ اول الذکر کی اپنے مقاصد میں کامیابی اور ثانی الذکر کے مفاد کی طرف سے بے توجہی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ لیکن رکنیت کی تحدید نے بھی اس کو ہمیشہ نہیں روکا، اور موجودہ انجمن ہائے اتحادی کے خلاف ایک عام شکایت یہ ہے کہ معدودے چند متمول اراکین قرض کی ایک بڑی مقدار اپنے لئے مخصوص کر لیتے ہیں۔ اس کے علاوہ واحد تحفظ معقول دیکھ بھال، نگرانی اور بنک کے کام سے ہر رکن کی نسبتاً زیادہ دلچسپی ہے۔ بنک کا مقصد سب سے گرے ہوئے کو بڑھا کر زیادہ سے زیادہ کارکردگی رکھنے والے کے درجے تک پہونچانا ہے۔ اس لئے یہاں ہر شخص کے لئے گنجایش ہونی چاہیئے۔ بنک ہر شخص کی ضروریات، ساکھ یا حیثیت کے مطابق خدمت کرے گا۔ مفلس ترین آدمی بھی جو کسی قسم کا قرض لینے کے قابل نہیں بنک سے دوسرے فایدے اُٹھا سکتا ہے مثلاً ارزاں خرید، سماجی اور مذہبی اخراجات کو گھٹانے میں اخلاقی تائید کاروبار اتحادی میں تربیت۔ دیہی اقتصاد میں نہ صرف غذا پیدا کرنے والا شامل ہے بلکہ لوہار، بڑھائی، جولاہہ، چرم ساز، خاکروب اور متعدد دوسرے دیہی خدمت گذار شامل ہیں۔ ان میں سے ہر ایک سماجی اور مذہبی رکاوٹوں کا شکار بنا ہوا ہے جن کی فراہمی اصل، اس کے کام کی تنظیم وغیرہ کے امور میں بنک مفید طور پر مدد کر سکتا ہے۔ سماج کے ہر شخص کو ایک مسئلہ درپیش ہوتا ہے، اور بنک ہمہ گیر حل کے ذریعے اُس کے حل میں خاطر خواہ حصہ لے سکتا ہے۔ جوں جوں انتظامی عملہ تجربہ کار ہوتا جائے اور زیادہ ساکھ قایم کرلے بنک اپنی رکنیت میں اضافہ کرکے ان میں سے اس قدر زیادہ مسایل کو حل کر سکتا ہے جس قدر کہ اس سے ممکن ہو سکے۔

اتحادی اصولوں کی پابندی

اس کا امکان ہے کہ تیسری شرط یعنی اتحادی اصولوں کی زیادہ حد تک پابندی کو اتحادی کارکن ایک نصب العینی صلاح سمجھیں، جس کو ان کے حقیقی تجربے نے ثابت کر دیا ہے کہ عملی جامہ پہنانا مشکل ہے۔ یہاں اس مشکل کے وجود سے انکار کرنا یا اُس کی اہمیت کو کم کرکے دکھانا مقصود نہیں ہے۔ لیکن اس پر غور کرنے کے طریقے میں تبدیلی کی جائے تو اس کا امکان ہے اتحادی اصولوں کی زیادہ مطابقت کا یقین حاصل ہو سکے۔ اس مقصد کے حصول کے لئے حسب ذیل چار ہائے کار ایک عملی ذریعے

کے طور پر تجویز کئے جاتے ہیں :-

بنک کے اپنے لئے اصل جمع کرنے پر اصرار

پہلا اتحادی اصول یہ ہے کہ قرض کفایت اور پیش بینی پر مبنی ہونا چاہئے ۔ اس کے نظر انداز ہوجانے کا ایک اہم سبب یہ ہے کہ ابتدائی انجمن سے اس وقت یہ مطالبہ نہیں کیا جاتا کہ وہ اپنے لئے اصل جمع کرنے کی کوشش کرے ۔ اصل جمع کرنے کے لئے مرکزی بنک موجود ہیں جو ابتدائی انجمنوں کو قرض دینے کے لئے ضرورت سے زیادہ بے چین رہتے ہیں ۔ ابتدائی انجمن کو سمجھ لینا چاہئے کہ وہ صرف ایک کمیشن ایجنٹ نہیں بلکہ بنک ہے جس کی اچھائی کو مقامی طور پر اصل جمع کرنے کی اہلیت سے جانچا جائیگا ۔ اس لئے اس کو چاہئے کہ مرکزی بنک کا دروازہ کھٹکھٹانے سے پہلے دیہاتیوں کے بے کار اندوختوں کو حاصل کرکے اپنے لئے سرمایہ فراہم کرنے کی کوشش کرے ۔ ممکن ہے ابتدا میں اُسے مقامی طور پر وہ سب کچھ نہ مل سکے جس کی اُسے ضرورت ہو اور کمی کو مرکزی بنک یا انجمن نگہداری سے قرض لے کر پورا کرنا پڑے ۔ لیکن مقصد تو جہاں تک ہو سکے اپنی مدد آپ کرنا ہونا چاہیے اس سے اپنی مدد آپ کرنے اور باہمی امداد کا سبق بھی ملے گا ۔ یہ کوئی نصب العینی صلاح نہیں ۔ اس وقت بھی ایسی ابتدائی انجمنیں موجود ہیں ، جو اپنے سرمایے سے کام کر سکتی ہیں ۔ صرف ریاست حیدرآباد ہی میں اس قسم کی (۳۰۰) انجمنیں ہیں جو اپنے اراکین کو ۶ ¼ فی صد کی شرح سے قرض دے سکتی ہیں ۔ اسی ریاست میں راقم کو ایک دیہی قصبے میں ایک نام نہاد شہری انجمن سے واقف ہونے کا موقع ملا جس کے بیشتر اراکین چھوٹے چھوٹے مزارعین ہیں جو اس حصصی سرمایے پر کام کر رہے تھے جو خود انھوں نے جمع کرایا تھا ۔ بدقسمتی سے ابتدائی انجمنوں کے اراکین کے پس انداز سے اپنے حصصی سرمایے کے حاصل کرنے کا طریقہ (مثلاً یہ کہ اُن کے قرضوں میں غیر معمولی اضافے کے ذریعے) اور ساتھ ہی ساتھ گاؤں میں اراکین اور دوسرے افراد سے امانتی رقوم حاصل کرنے کے اصول پر بیشتر مقامات پر عمل کیا گیا ، اور کفایت شعاری اور باہمی امداد صرف ان انجمنوں کے مقاصد ناموں کی زینت بنے ہوئے ہیں ۔

(ب) منضبط اخراجات

دوسری سیاست جس میں موجودہ طریقوں کو بدلنا چاہئے اراکین کے ساتھ معاملہ کرنے کا طریقہ ہے ۔ یہ اس قسم کا

ہونا چاہئے کہ پس انداز کرنے اور تمام امکانی اسراف سے بچنے کے لئے موزوں ہو۔ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ انجمن اپنے تمامی کا وجود قرضوں پر نگرانی رکھنا ہے، لیکن اس وقت قرض جس طور پر منظور کیا جاتا ہے، اُس کی وجہ سے بسا اوقات نگرانی کے لئے کوئی گنجایش نہیں رہتی۔ ضرورت جس چیز کی ہے وہ منضبط اخراجات ہیں، اور اس کا یقین اُس وقت حاصل کیا جاسکتا ہے جب کہ تمام مقاصد کے لئے یہ انجمن ایک تجارتی ملک کی طرح کام کرے۔ کسی بنک کا ایک اہم وظیفہ یہ ہے کہ نقد رقم کے استعمال میں کفایت پیدا کرے، اور دیہی بنک، اگر اُس کی تنظیم ایک ہمہ گیر بنیاد پر کی جائے، یہ اچھی طرح کرسکنے کے قابل ہوجائے گا۔ کسی رکن کو جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، تقریبًا وہ سب بنک اُس کے لئے حاصل کرسکتا ہے، احکام طلبی مال کے ذریعے ایسے مسلمہ گوداموں کے توسط سے، جو انجمن بنکاری سے ملحقہ ہوں۔ اس صورت میں اراکین کو نقد رقم دینے کی کم تر ضرورت پیش آئے گی، جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ قرضوں کے غلط یا مسرفانہ اور غیر ضروری اخراجات کے لئے استعمال ہونے کے مواقع کم ہوجائیں گے رکن کی نقد کمائی پر بھی اسی قسم کی نگرانی رکھی جاسکتی ہے۔ اگر اجناس اور صنعتی پیداوار بنک کے توسط سے فروخت ہو اور اُس کی قیمت اُس کے کھاتے میں جمع کرلی جائے۔ یہ واقعہ ہے کہ سال بھر کی محنت کا سارا معاوضہ کاشتکار کو یک مشت ایک وقت مل جاتا ہے، جو غیر محتاط خرچ، پس انداز کی کمی، اور غیر معاشی طرز زندگی کا باعث ہوتا ہے۔ جو رقم بنک میں امانت رکھائی گئی ہو وہ سال بھر رکن کو اُس کی ضروریات کے مطابق دی جاسکتی ہے، اور اس دوران میں محفوظ اور نفع بخش رہے گی اگر اراکین کو اپنے سارے کاروبار بنک کے ذریعے کرنے اور حسب ضرورت رقم لینے کی تربیت دی جائے تو کفایت شعاری اور پیش بینی کی عادت خود بخود پیدا ہوجائے گی۔ اپنی موجودہ ضرورتوں کے لئے رکن کو بنک سے زائد وصولی یا بذریعہ چک رقم حاصل کرنے کی سہولت حاصل ہونی چاہئے تاکہ وہ وقتًا فوقتًا ایک محفوظ حد تک، جس کا تعین اُس کی استعداد ادائی کے لحاظ سے عمل میں آئے گا، رقم حاصل کرسکے۔ نقد رقم صرف اسی وقت دینی چاہئے جب کہ بنک مطلوبہ اشیا خود، یا کسی مسلمہ اتحادی گودام کے توسط سے، جس سے اُس نے اس مقصد کے تحت کوئی انتظام کیا ہو، فراہم نہ کرسکے۔ بنک سے اس طرح معاملت کرنے کی عادت کو ترقی دینے کے لئے اس طرح ادا کردہ پیشگیات پر قرض بہ شرح معین کی بہ نسبت ایک کم شرح سے سود عاید کیا جاسکتا ہے۔ بنک کو اس امر کا بھی اطمینان حاصل کرنا چاہئے کہ کسی رکن کی ضروریات، رقم کی صورت میں ہوں یا اشیا کی، جو اُس کے لئے منظورہ حد قرض کے اندر ہوں، بر وقت پوری ہوجائیں اور یہ کہ اُسے کسی بیرونی وسیلے سے کام لینے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ قرض کی فراہمی میں تعویق بسا اوقات اراکین کی غیر وفاشعاری کا باعث ثابت ہوتی ہے

ایک عملی مثال

ان تجاویز کو کہیں قابل عمل قرار نہ دیا جائے، اس لئے یہاں حقیقی مثال ایک انجمن اتحادی کی جو انہی اصولوں پر کام کر رہی ہے اور جس سے راقم حال میں روشناس ہوا، پیش کرنا مفید ہوگا۔ یہ ایک ابتدائی دیہی انجمن ہے لیکن اس کا طریقہ کار مجوزہ بالا طریقوں کا پابند ہے، جن کو کوئی دیہی بنک آسانی کے ساتھ مناسب ترمیمات کے بعد اختیار کر سکتا ہے۔ یہ زیر نظر انجمن میسور مل کے ملازمین کی ہے۔ کفایت اور قرض کی انجمن ہونے کے علاوہ اس نے ایک اتحادی دوکان بھی کھول رکھی ہے، جس میں وہ تمام اشیا رکھی جاتی ہیں جن کی اراکین کو عام طور پر ضرورت ہوتی ہے مثلاً چاول، اور دوسرے اجناس، ایندھن اور کوئلہ، کپڑا اور روزانہ استعمال کی دوسری متفرق چیزیں۔ اراکین اپنی ساری ضروریات اس دوکان سے خریدتے ہیں۔ اصول یہ ہے کہ تمام بیوپار نقد کیا جائے، لیکن اگر کوئی رکن اُدھار خریدنا چاہے تو اُسے ادھار فروش شعبے سے مل سکتا ہے۔ اراکین کو عادتاً اپنی آمدنی سے زیادہ اخراجات کرنے سے روکنے کی غرض سے موجودہ ضروریات کی خرید کے لئے ہر رکن کا قرض اس کی ماہانہ تنخواہ کے ایک حصے تک محدود کر دیا گیا ہے۔ ان حدود کے اندر وہ اس دوکان سے ضروریات خرید سکتا ہے اور مہینے کے آخر میں اس کی جانب جتنی رقم واجب الادا ہو وہ سب اُس کی تنخواہ سے وضع کر لی جاتی ہے۔ ہر خرید و فروخت کے موقع پر رکن کو اپنی پاس بک پیش کرنی پڑتی ہے جس میں اُس کی تنخواہ، اُس کے حصص، منظورہ مقدار قرض اور ساری خرید و فروخت درج ہوتی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اراکین کو اُن کے خاندان کی ساری ضروریات کی تکمیل کے بعد اپنی تنخواہ کا ایک جزوی حصہ نقد ملتا ہے۔ اور انھیں اپنی کمائی کو منشیات یا دوسری قباحتوں پر فضول صرف کرنے، اور خاندان کو صرف غذا اور لباس فراہم کئے بغیر چھوڑ دینے کا خیال پیدا ہونے کا امکان کم ہو جاتا ہے۔ یہ طریقہ اراکین کو مقامی ساہوکاروں سے نہایت گراں شرح سے قرض لینے اور اشیا کے لئے غیر واجبی قیمتیں ادا کرنے سے روکتا ہے۔ اور اُن کے ہاتھ اشیا مقدار اور نوعیت دونوں کے لحاظ سے واجبی قیمت پر فروخت کرتا ہے۔ اس دوکان کو جو منافع حاصل ہوتا ہے اس میں بھی وہ فروخت پر مختلف شرح کی شکل میں حصے دار ہو جاتا ہے لیکن سب سے اہم فایدہ یہ ہے کہ رکن کو اُس کی آمدنی کا بیشتر حصہ اُس کی حقیقی ضروریات کی شکل میں اور بہت کم حصہ نقد رقم کی شکل میں ملتا ہے۔ کہا جا سکتا ہے کہ دیہی بنک اپنے اراکین کی آمدنی پر ایسا قابو نہ رکھ سکے گا، لیکن اس کو چاہئے کہ اپنے اراکین کی پیداوار کو اپنے توسط سے فروخت کرا کے یا فروخت کی ساری رقم کے اس کے پاس امانت رکھوانے پر اکسا کر اس پر قابو حاصل کرنے کی سعی کرے۔ اگر کسی انجمن یا بنک کو اس طریقے پر چلانے کا تہیہ کر لیا جائے تو اراکین کو ایسا کرنے کی تربیت دینا ناممکن نہیں ہوگا۔

مترجمہ میر حسن ام۔ اے (عثمانیہ)

دوشیزۂ جمال

تھی شبِ مہتاب اور ساری فضا خاموش تھی
ساز میں نغمے تھے پوشیدہ صدا خاموش تھی

غرقِ بحرِ بےخودی میں دہر کے طامات تھے
دل میں رہ رہ کر چمک تھی، جوشِ زن جذبات تھے

ایک سیلابِ تفکر میں بہا جاتا تھا میں
گنگناتا گیت فطرت کا چلا جاتا تھا میں

روبرو تالاب تھا، تالاب پر تھے مہ جبیں
گلبدن، گل پیرہن غارت گرِ دنیا و دیں

عکس تھا پانی میں یا پانی میں اک گلزار تھا
چاندنی کا کھیت گویا لمعۂ انوار تھا

منظرِ پُرکیف سے دل مست و بےخود ہو گیا
ہوش کا سارا خزانہ اک نظر میں کھو گیا

جا بجا فتنوں کا جمگھٹ تھا خرامِ ناز سے
ناوک اندازی تھی میرے دل پہ اک انداز سے

وہ تبسّم ریزیاں وہ شرم آلودہ نظر
چھینٹے اڑتے تھے نزاکت سے لچکتی تھی کمر

جم گئی میری نظر اک مہ جبیں دوشیزہ پر
دل پہ اک بجلی گری حالت ہوئی نحوِ دگر

اک نظر میں اشتیاق و شرم متوالے ہوئے ‏ اک نگاہِ ناز میں داغِ جگر آلے ہوئے
رُخ پر آنچل کھنچ گیا آنچل پہ نظریں گڑ گئیں ‏ پردے ہی پردے میں خاموشی سے آنکھیں لڑ گئیں
ہائے وہ جادو بھری آنکھیں وہ پیکانِ ادا ‏ سر جھکائے، منہ چھپائے میری جانب دیکھنا
عارضِ تاباں پہ تھیں زلفیں بھی لہرائی ہوئی ‏ لب پہ تھا ہلکا تبسم آنکھ شرمائی ہوئی
ہر قدم میں فتنے پنہاں چال تھی مستانہ وار ‏ سرو قد نازک کمر اور اُس پہ جوبن کا نکھار
مست پندارِ جوانی مائلِ انداز تھا ‏ دل میں پیوستہ مرے ہر ایک تیرِ ناز تھا

یک بیک منظر نیا آنکھوں میں میری کھنچ گیا ‏ ہو گئیں پریاں ہوا اور رہ گیا وہ مہ لقا
دل مرا برما گیا تیرِ نگاہِ ناز سے ‏ حسرتیں زندہ ہوئیں دل میں اُسی اعجاز سے
دیکھ کر محوِ تکلم جب گُل افشانی ہوئی ‏ یک بیک جذبات میں میرے فراوانی ہوئی
دل کے ہمرہ میں کھنچا جانے لگا اُس کی طرف ‏ کھول کر آغوش حسرت سے بڑھا اُس کی طرف
قطرۂ بے قدر تھا میں مجھ کو دریا کردیا ‏ اُس کے اِس اندازِ مسیحائی نے زندہ کردیا
اوجِ افزا جب نظر آیا شبابِ زندگی ‏ رہ گیا آنکھوں میں میرے بن کے خوابِ زندگی
کُھل گئیں آنکھیں جو کچھ دیکھا خیالِ خواب تھا ‏ وہ پری رُو بر میں میرے تھا نہ وہ تالاب تھا

عالَمِ پُرکیف یعنی عالَمِ تخیل تھا
رُوکشِ فردوس گویا گلشنِ تمثیل تھا

عظیم متعلم بی۔اے (عثمانیہ)

عالمِ نباتات میں صنفیت

حیات الحیات موت تمام جان داروں کے لئے ناگزیر ہے اور اس کو کم و بیش ایک راز سمجھا جاتا ہے۔ ممکن ہے یہ راز مذہب اور فلسفے کو پریشان کردے لیکن فطرت کی نظروں میں کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ قدما کے خیال کے مطابق موت سے زیادہ اہم سوال تولید کا ہے۔ ہر زندہ شے افزایش کے ذریعے اپنی بقا کی کوشاں رہتی ہے اور ہر جاندار انفرادی طور پر اپنی نوع کی افزایش کی خاطر ہر قسم کے ایثار کے لئے تیار رہتا ہے لیکن اس کے باوجود چند صدی قبل تک یہ کسی کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا کہ تولید زندگی کی ایک بنیادی خصوصیت ہے۔ ہم یہ تو جانتے تھے کہ جنسی رجحان جو عموماً تولید پر منتج ہوتے ہیں اور اعلیٰ قسم کے جانوروں میں پائے جاتے ہیں لیکن کبھی ہم یہ تصور نہیں کر سکتے تھے کہ ایسا احساس کیڑوں، مکوڑوں میں اور درختوں بیل بوٹوں اور فرن (Sea weeds) جیسے ادنیٰ پودوں میں بھی ہوتا ہے۔ لیکن پاسچر نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ تولید نہ صرف اعلیٰ قسم کے جانوروں میں پائی جاتی ہے بلکہ چھوٹے چھوٹے جراثیم بھی جن کو خوردبین کی مدد کے بغیر نہیں دیکھا جا سکتا جنسی ترغیبات سے آزاد نہیں ہیں۔ ہمارا وہ پرانا تخیل کہ انسان مٹی اور پانی کی آمیزش کا نتیجہ تھے ان حالات کی روشنی میں دھندلا پڑ جاتا ہے۔ اسی بنا پر تعلیم یافتہ طبقے میں ایک نئے خیال نے کافی رسوخ حاصل کر لیا ہے جس کو (Omnevivoevire) یا حیات الحیات کے نام سے ظاہر کیا جا سکتا ہے۔ اب

یہ خیال ہوگیا ہے کہ نئی زندگی کی تولید دراصل آباو اجداد کے اجسام سے علیحدہ کیا ہوا ایک حصہ ہے یا یوں سمجھ لیجئے کہ ایک پرزہ ہے جو پرانے تختۂ زندگی سے جدا کر دیا گیا ہے۔ اس طرح سے انفرادیت ایک حد تک غیر اہم ہوگئی ہے وہ صرف ایک زینہ ہے نسل کی بقا کا۔ ہر جاندار اگرچہ انفرادی طور پر بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھا ہو کر مر جاتا ہے لیکن اس کا وجود اس کے ساتھ ختم نہیں ہو جاتا بلکہ اولاد کے ذریعے اس کی زندگی عموماً ہمیشہ ہمیشہ کے لئے باقی رہتی ہے۔

پارینہ جمادیاتی باقیات اس بات کی کافی شہادت مہیا کرتے ہیں کہ لاکھوں سال قبل زندگی سب سے پہلے سمندروں کے اتھل پانی سے شروع ہوئی اور اس وقت سے اب تک اس کی ایک غیر شکستہ کڑی چلی جا رہی ہے۔

وہ شخص جس نے گلاب سے اس کی شاخ کو جدا کر کے ایک نئے درخت کی نشو و نما کی ہو یا ایک کرٹن سے کئی کرٹن حاصل کئے ہوں یہ نتیجہ نکالے کہ عالم نباتات میں صنفیت ایک مضحکہ خیز عنوان ہے تو بڑی بھاری غلطی کا مرتکب ہوگا کیوں کہ اگر جلد بازی سے کام نہ لیا جائے تو یہی عنوان ممکن ہے خاطر خواہ دلچسپ بن جائے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ پودوں کی صنفی تولید جانوروں کی صنفی تولید سے زیادہ مشابہ معلوم نہیں ہوتی اور وہ زردادہ جو پھولوں میں اکثر پایا جاتا ہے ظاہری شکل و شباہت میں جانوروں کے منوی جوین سے کہیں زیادہ مختلف ہے نہ صرف یہ بلکہ نباتیاتی بیض دان کو بھی حیوانیاتی بیض دان سے کوئی مناسبت نہیں اور بیج کا حیوان کے نطفے سے مقابلہ کرنا یا پھر ننھے پودے کو طفل شیرخوار کا مد مقابل ٹھیرانا دیوانگی ہے۔ لیکن اصولوں کی حد تک ان میں کافی مناسبت پائی جاتی ہے نر اور مادہ کے وہ تولیدی اجزا جن کے ملاپ سے ایک انسان عالم وجود میں آتا ہے بنیادی حد تک بالکل وہی اجزا ہیں جن سے ایک سبز پودا نمودار ہوتا ہے۔

یونان قدیم کا وہ دانش مند حکیم جس کو ہم ارسطو کے نام سے جانتے ہیں۔ اگرچہ علم نباتات میں اپنے ہم عصروں میں سب سے زیادہ واقف تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے پودوں میں صنفیت کی موجودگی کا یقین نہ تھا۔ اس کا ایک نہایت چہیتا شاگرد (Theophrastus) اس علم کا ایک بڑا ماہر گزرا ہے اور اگرچہ ہم اس کو (Father of Botany) ابوالآبائے نباتات کے لقب سے یاد کرتے ہیں لیکن اس کی تحریروں سے بھی یہ پتہ چلتا ہے کہ اس کے پاس بھی صنفیت کا کوئی واضح تخیل نہ تھا۔ بیض دان کو وہ غیر پختہ پھل تصور کرتا تھا لیکن زیرہ دان کی اہمیت سے قطعی ناواقف تھا۔ پلنی کی تحریروں سے البتہ یہ پتہ چلتا ہے کہ صنفیت سے وہ تھوڑا بہت واقف ہو چلا تھا لیکن اس کے بعد ایک کافی عرصے تک اس مسئلے پر مزید روشنی نہ پڑ سکی۔

سولھویں اور سترھویں صدی کے سائنس داں عالم نباتات میں صنفیت کو ماننے پر تیار نہ تھے ممکن ہے یہ اس وجہ سے ہو کہ پودوں کی ایک کثیر تعداد میں اعضائے نر و مادہ ایک ہی پھول پر پائے جاتے ہیں۔ زر دان جیسے اہم تولیدی مادّے کو یہ لوگ اخراجی اعضاء خیال کرتے تھے۔ صنفیت کے کسی واضح تخیل سے قبل بے ثمر پودوں کو مادہ اور ثمر لانے والے پودوں کو نر خیال کیا جاتا تھا اور ان کے بیجوں کو انیثون سے مناسبت دی جاتی تھی۔

ان ابتدائی لوگوں میں جو عالم نباتات کی صنفیت پر یقین رکھتے تھے اُن میں نیمیا کا نام سب سے زیادہ اہم ہے لیکن وہ جو کچھ کہتا تھا صرف تخیل پر مبنی تھا اور کوئی ایسے مشاہدات اور تجربات نہ تھے جن کی بنا پر اس کے خیال کو صحیح سمجھا جا سکتا وہ کہتا تھا۔ "چونکہ حیوانات اور نباتات ایک ہی صانع کا ظہور اور ایک ہی عقل کی پیداوار ہیں اس لئے نباتات میں صنفیت کی تلاش بے معنی نہ ہوگی"۔ اس سلسلے میں جیکب نامی سائنس دان کے تجربات نہایت اہم ہیں اس نے ۱۶۹۴ء میں اپنے ایک دوست کو حسب ذیل تفصیلات لکھی تھیں:۔

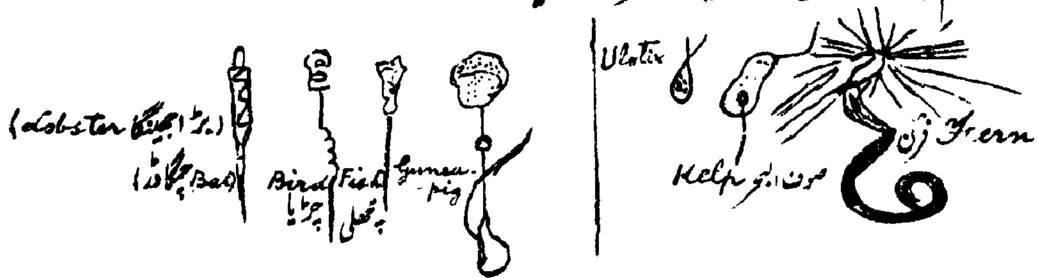
"میں نے زر دان کو پھولوں سے علیحدہ کرکے دیکھ لیا ہے کہ اس کا اثر بہت ہی خراب ہوتا ہے۔ میں نے ارنڈ کے پھولوں میں سے زر دانوں کو پختہ ہو کر پھٹنے سے قبل ہی علیحدہ کر لیا اور بعض خانے کو ویسے ہی رہنے دیا تو بجائے اس کے کہ پختہ اور مکمل پھل دستیاب ہوتے صرف غیر مکمل کھوکھلے خول حاصل ہوئے جو زمین پر گرنے کے بعد اُگنے کی بجائے سوکھ گئے۔ اسی طرح جب میں نے پھولوں میں سے اس کی کلغی علیحدہ کر دی تو اُن بالیوں میں بیج ہی نہ آئے"

غرض اس طرح سے مختلف مدارج طے کر چکنے کے بعد یہ قضیہ گارٹنر نامی سائنس داں کے ۲۵ سالہ تجربات کی بنا پر ۱۸۴۹ء میں نہایت ہی مدلّل اور مفصل بحث کے بعد طے پا گیا سائنس دانوں کا خیال ہے کہ پودوں کے ارتقا میں صنفیت کی ابتداء اس وقت سے ہوتی ہے جب کہ بذرہ سب سے پہلے زواجی بذرے کی شکل اختیار کرتا ہے جیسا کہ پارینہ جاتیاتی باقیات سے پتہ چلتا ہے کہ کرہ ارض کا نباتیاتی حصہ ابتداءً صرف ایسے پودوں پر مشتمل تھا جن کا واحد ذریعہ افزایش غیر صنفی تھا اور عالم نباتات میں صنفیت بے جاتی تولید ہی کے توافق کی حیثیت سے حاصل ہوئی لیکن جب وہ ایک مرتبہ عالم وجود میں آگئی تو ان میں کچھ ایسے فوائد پائے گئے کہ باوجود بے جاتی تولید کے آسان و سہل ہونے کے وہ برابر ترقی کرتی رہی۔

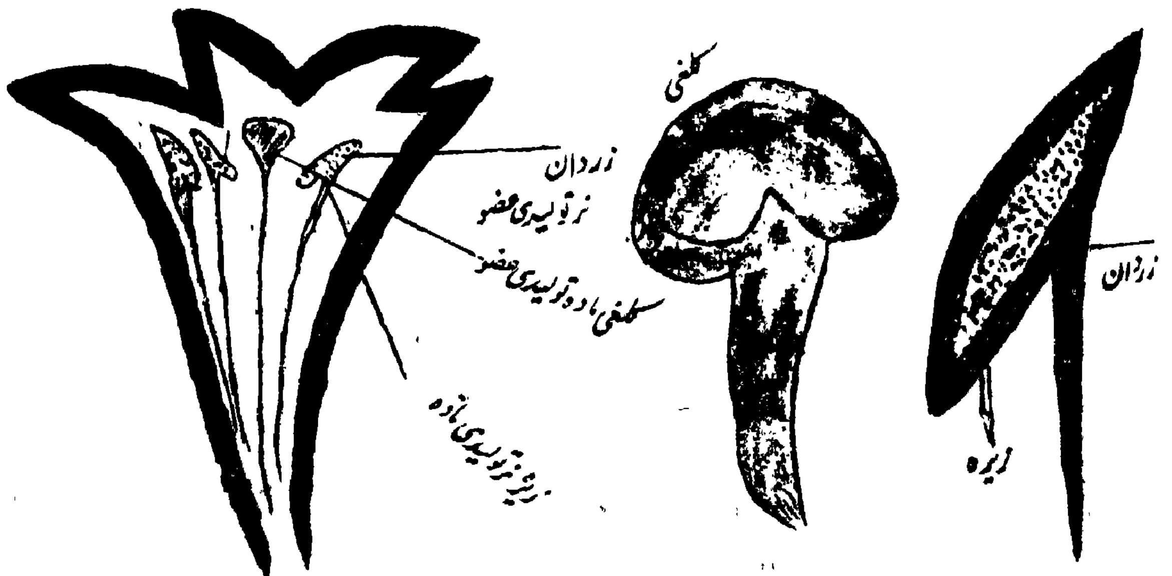
صنفی تولید دو مختلف زواجوں کے ملاپ سے وقوع میں آتی ہے اس میں سے ایک زواجہ زیادہ متحرک اور تیز ہوتا ہے اور یہی نر زواجہ ہوتا ہے۔ دوسرا کسی قدر بڑا اور ساکن ہوتا ہے جو مادہ ہے اس کے علاوہ صنفیت کے تمام دوسرے لوازم

مثلاً مور کے چمکیلے پر اور گلاب کی خوبصورت پنکھڑیاں صرف اس وجہ سے اہم ہیں کہ ان کی وجہ سے ملاپ کے موقعے زیادہ سے زیادہ حاصل ہو سکتے ہیں۔

اگرچہ مختلف جانوروں اور پودوں میں تخم حیوان سا یعنی نر اعضا مختلف قسم کے ہوتے ہیں لیکن بنیادی طور پر ان کی ساخت ایک سی ہوتی ہے یعنی یہ سب بہت ہی مختصر نکیلے اور متحرک ہوتے ہیں اس کے برخلاف مادہ زرد اجے عموماً گول زیادہ ماسی اور ساکن ہوتے ہیں۔ مختلف تخم حیوان سا شکل کے ذریعے ظاہر کئے گئے ہیں۔



پودوں کے تولیدی اعضا پھول ہیں۔ اگر گلاب کا پھول لیا جائے تو اس میں سب سے اندرونی طرف چند زرد رنگ کی ساختیں نظر پڑیں گی۔ یہی نر تولیدی اعضا ہیں ان کے درمیان گلابی رنگ کی گول مخملی ساختیں مادہ اعضا ہیں۔ یہ دو چیزیں پھول کی سب سے ضروری ساختیں ہیں اور جیسا کہ اس سے پیشتر بتلایا جا چکا ہے پنکھڑیاں وغیرہ پھول کو خوبصورت بنانے کے لئے پیدا کی جاتی ہیں۔ پھول کے نر اور مادہ اعضا ذیل کی شکل سے بخوبی واضح ہوتے ہیں۔



آپ کو قسم قسم کے پھول نظر آئیں گے۔ ان میں سے بعض خوب صورت، دلکش اور خوش نما ہوں گے اور بعض بدنما اور بے ڈول لیکن ان میں دانائی فراست ہر ایک کا حصہ ہوگی اور سب صنعت کاری کا اعلیٰ نمونہ ہوں گے۔ ان کا مقصد اپنے مفروضہ کام کی انجام دہی اور ان کا نصب العین افزائش نسل کے ذریعے زمین پر زیادہ سے زیادہ تسلط جمانا ہوگا۔ لیکن اپنے مقصد کی تکمیل میں انھیں بہ نسبت جانوروں کے زیادہ مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے کیوں کہ یہ پابہ گل ہوتے ہیں خوشبو کی جاذبیت موزوں اور تیز رنگوں کا سحر کارانہ اثر اور شہد کی پیدائش جو پودوں کے لئے بالکل بے کار ہوتی ہے یہ سب ننھے ننھے کیڑوں کو متوجہ کرنے کا جال ہے کیوں کہ انھیں پیامبروں کے ذریعے بارزیرگی عمل میں آتی ہے۔

یہ عالم نباتات جو ہمیں اس قدر خاموش۔ بُردبار اور قانع نظر آتا ہے جس کی ہر چیز پر رضامندی۔ خاموشی۔ اطاعت فرماں برداری اور استغراق کے پردے پڑے ہوئے ہیں درحقیقت قسمت اور تقدیر کے خلاف بغاوت اور عزم و استقلال کا ایک مستقل مخزن ہے۔ پودوں کا پالن ہار عضو یعنی جڑ اس کو زمین میں جکڑا رہنے پر مجبور کرتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کی تمام کوشش صرف ایک نقطے پر مرکوز ہوتی ہے ان کا اولین مقصد گوشۂ تقدیر سے نجات حاصل کر لینا اور قید کی ان زنجیروں کو توڑ دینا ہے ان کی صرف ایک اور ایک تمنا ہوتی ہے وہ اس چھوٹے اور محدود دایرے کو بڑھاتے بڑھاتے زمین پر زیادہ سے زیادہ تسلّط جمانا اور ایک نئی حسّت و چوبند دنیا میں پہنچ جانا چاہتے ہیں۔

واقعہ تو یہ ہے کہ یہ ننھے ننھے بظاہر بے جان پھول انسانوں کے لئے عزم و استقلال کا درس دیتے ہیں اور ہم کو آزادی۔ ہمت۔ استقلال اور دانائی و فراست کا سبق سکھلاتے ہیں اگر ہم ان سے سبق سیکھیں اور اپنی ترقی کی رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے ان چھوٹے چھوٹے پھولوں کی طرح ہمت و استقلال کو ہاتھ سے نہ جانے دیں تو یقین مانیے ہماری زندگی کا رنگ کچھ اور ہی ہو۔

اس میں کچھ شک نہیں کہ درخت بے زبان ہوتے ہیں نہ تو یہ چل پھر سکتے ہیں اور نہ بات چیت کر سکتے ہیں لیکن آپ کا یہ سُن کر تعجب ہوگا کہ جان دار ہونے کی حیثیت سے یہ بھی ایک دوسرے سے معاشقہ کرتے ہیں۔ یہ لطیف خیال دو ہزار سال قبل پلنی کے دماغ میں اس وقت پیدا ہوا جب اس نے مادہ کھجور کے درخت کی شاخوں کو ایک نر درخت کی طرف ایک خاص انداز دلبرانہ سے جھکا ہوا دیکھا لیکن یہ خیال رکھنا چاہیے کہ ان استادہ بے زبانوں کا معاشقہ چلنے پھرنے والے جانوروں اور انسانوں سے بالکل جداگانہ ہوتا ہے۔ چونکہ یہ چل پھر نہیں سکتے اس لئے زیرے کی کلغی پر منتقلی کے لئے اکثر بیرونی مددگاروں

کے دست نگر ہوتے ہیں کیوں کہ انھیں کے ذریعے نر تولیدی مادہ کلغی یا مادہ عضو پر منتقل کیا جاتا ہے۔ زیرے کی اس منتقلی کو زیرگی کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ زیرگی دو اقسام کی ہوسکتی ہے خود زیرگی اور پار زیرگی۔ اگر ایک ہی پھول کا زیرہ اسی پھول کی کلغی پر منتقل ہو جائے تو خود زیرگی عمل میں آتی ہے اور اگر ایک پھول کا زیرہ دوسرے پھول کی کلغی پر منتقل ہو تو اس کو پار زیرگی کہتے ہیں۔ تقریباً ۸۰ فی صدی پودے خنثیٰ شکل پھول تیار کرتے ہیں یعنی ایسے پھول تیار کرتے ہیں جن میں دونوں تولیدی اعضاء موجود ہوں اس لئے ممکن ہے زیرگی کو ایک نہایت ہی آسان عمل تصور کرلیا جائے اگرچہ بعض حالات میں ایسا ہی ہوتا ہے لیکن چارلس ڈاروِن نے متعدد تجربوں اور سالہا سال کی کوششوں کے بعد یہ ثابت کردیا ہے کہ قدرت خود زیرگی کو پسند نہیں کرتی اور اس کے ذریعے حاصل شدہ پودوں سے ہر طرح کمزور اور ناقص ہوتے ہیں اور غیر موزوں اور ناموافق حالات کا مقابلہ کرنے میں زیادہ کامیاب نہیں رہتے اسی بنا پر دیکھا گیا ہے کہ پودے آسان خود زیرگی پر مقابلتاً مشکل پار زیرگی کو ترجیح دیتے ہیں۔

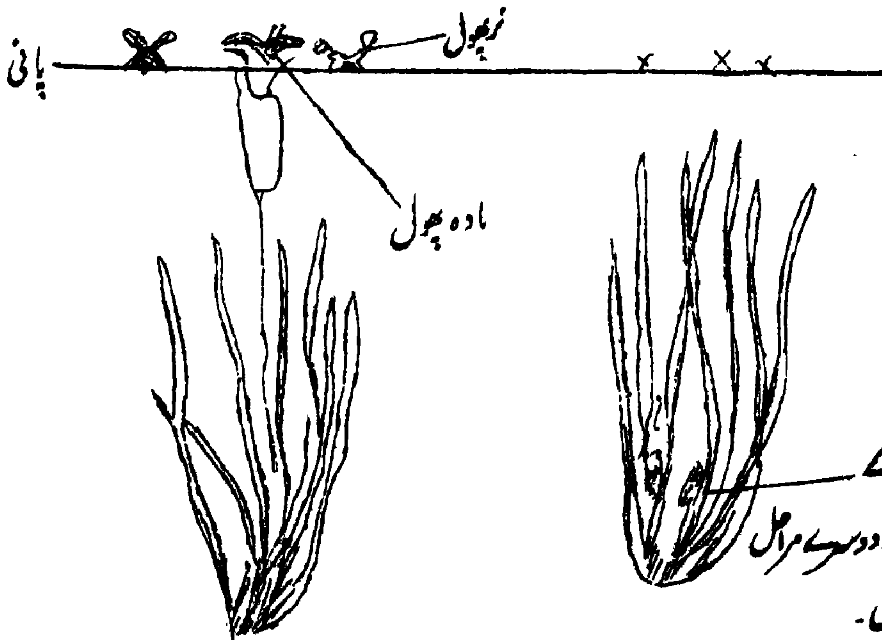
اس میں کچھ شک نہیں کہ کیڑوں مکوڑوں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لئے پودوں کو طرح طرح کے توافق تیار کرنے پڑتے ہیں کبھی تو یہ رنگ بہ رنگ کی خوبصورت پنکھڑیاں تیار کرتے ہیں اور کبھی خوش بو اور شہد کی تیاری میں انھیں کافی نقصان اٹھانا پڑتا ہے لیکن اگر ساتھ ساتھ ہم ان فوائد پر بھی نظر ڈالیں جو پار زیرگی سے حاصل ہوتے ہیں تو ان فوائد کے سامنے یہ خرچ اور محنت زیادہ گراں معلوم نہ ہوگی انھیں فوائد کی بنا پر دیکھا گیا ہے کہ قدرت ہمیشہ پار زیرگی کو ترجیح دیتی ہے اس کی ایک نہایت ہی آسان تمثیل ہم خود انسانوں میں دیکھ سکتے ہیں کہ قریبی رشتے داروں میں شادی بیاہ ہمیشہ نسل کو کمزور کردیتا ہے اور شاید اسی بنا پر تمام دودھ شریک بھائی بہنوں میں شادی غالباً ہر قوم و مذہب میں ممنوع قرار دی گئی ہے۔ عالم نباتات میں پار زیرگی کے عمل میں لانے کے لئے (۳) ذرائع بہت اہم ہیں۔ (۱) ہوا (۲) پانی (۳) حیوانات کیڑے مکوڑے وغیرہ۔

(۱) ہوا کے ذریعے پار زیرگی عمل میں لانے والے پودے عموماً ہلکا زیرہ وافر مقدار میں تیار کرتے ہیں۔ ان کے نر دان یعنی نر تولیدی اعضاء گرو ندہ ہونے کی وجہ سے ہوا سے بہت آسانی سے ہلنے لگتے ہیں اور اس طرح سے پختہ زیرہ دوش ہوا پر ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہو جاتا ہے اور اس قسم کے پودوں کی کلغیاں چونکہ بڑی اور شاخ دار ہوتی ہیں اسلئے پار زیرگی کے مواقع زیادہ حاصل ہوتے ہیں لیکن چونکہ ہوا کا رُخ اور وقت معین نہیں اس لئے یہ ایک غیر موزوں وسیلہ ہے چونکہ ہوا چاروں طرف دوڑتی پھرتی ہے اس لئے اس طریقے میں زیرے کی ایک کافی مقدار عام طور پر ضائع ہوجاتی ہے

اور چونکہ زیرہ نخزایہ جیسی قیمتی شے بنا ہوا ہوتا ہے اس لئے اس کا وافر مقدار میں پیدا کیا جانا پودوں پر ایک مضر اثر رکھتا ہے۔ اس قسم کی زیرگی گھاس وغیرہ میں عام طور سے پائی جاتی ہے۔



(۲) ہوا کے علاوہ پانی کے ذریعے بھی پار زیرگی عمل میں آسکتی ہے۔ یہ طریقہ عموماً آبی پودے اختیار کرتے ہیں ایسی صورت میں نر تولیدی اعضار پہلے پختہ ہو کر مادہ پودے سے علیحدہ ہو جاتے اور سطح آب پر تیرتے رہتے ہیں حتیٰ کہ ان کا کسی دوسرے پودے کا کلغی سے ملاپ ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد پودے کا مادہ عضو پختہ ہوتا ہے اور چونکہ زیرہ پہلے ہی پختہ ہو کر علیحدہ ہو چکا ہے اس لئے بارآوری کے لئے ضروری ہے کہ پار زیرگی عمل میں آئے۔ زیرگی عمل میں آنے کے بعد کلغی سطح آب کے اندر چلی جاتی ہے اور وہیں بارآوری کے دوسرے مراحل پورے ہوتے ہیں۔ بعض اوقات نر اور مادہ تولیدی اعضار علیحدہ علیحدہ بھی پائے جاتے ہیں۔



(۳) بار زیرگی عمل میں لانے والے ذریعوں میں سب سے زیادہ اہم کیڑے مکوڑے تتلیاں اور بھونرے ہیں۔ یوں تو ہم روز ننھی ننھی تتلیوں کو ایک پھول سے دوسرے پھول پر اڑتا ہوا دیکھتے ہیں اور اکثر بھونرا بھی ایک درخت سے دوسرے درخت کا چکر کاٹتا ہوا دکھائی دیتا ہے لیکن ہمیں شاید کبھی یہ خیال نہ پیدا ہوتا ہو کہ یہ ننھی مخلوق محض آوارہ گردی میں مصروف نہیں بلکہ قدرت کا ایک اہم فریضہ انجام دے رہی ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ خوبصورت تتلیاں اور یہ ننھے ننھے بھونرے اپنی غذا کی تلاش میں مصروف ہیں۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ عالم نباتات پر ایک زبردست احسان کر رہے ہیں اور بار زیرگی کو معتبر ترین طریقے پر عمل میں لاکر اپنی غذا کا بھی کافی معاوضہ حاصل کر لیتے ہیں۔

ایسے پودے جن میں بار زیرگی کیڑوں مکوڑوں کے ذریعے عمل میں آتی ہے عموماً خوبصورت، بڑے اور خوشبودار پھول تیار کرتے ہیں اور اگر پھول چھوٹے ہوں تو ایسی صورت میں ان کو خوشوں کی صورت میں ترتیب دے کر جاذب نظر بنایا جاتا ہے پھولوں کی خوبصورت پنکھڑیاں، ان کے رنگوں کی شوخی، دل فریب خوشبو اور شہد کی لطیف مٹھاس یہ سب جانوروں کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے انوکھے جال ہیں۔ رات میں کھلنے والے پھول عموماً سفید اور خوشبودار ہوتے ہیں۔ سفید رنگ رات کے اندھیرے میں دور سے چمکتا رہتا ہے جس کی وجہ سے کیڑے مکوڑے اس کو دور ہی سے دیکھ سکتے ہیں اور ان کی خوشبو کیڑوں مکوڑوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔ اس کے علاوہ بعض اوقات پودے شہد بھی تیار کرتے ہیں وہ ننھے ننھے کیڑے جو شہد حاصل کرنے کے لئے آتے ہیں۔ غیر ارادی طور پر زیرگی کا فعل بھی انجام دے جاتے ہیں۔ اکثر ان کیڑوں کے جسم بال دار ہوتے ہیں اس لئے جب وہ پھول پر آکر بیٹھتے ہیں تو پھول کا مادہ عضو جو عموماً نر عضو سے اونچا ہوتا ہے۔ ان کے جسم سے تماس میں آتا ہے اور اگر کیڑے اپنے ساتھ زیرہ لائے ہوں تو کلغی اسے قبول کر لیتی ہے۔ اس کے بعد کیڑا شہد حاصل کرنے شہد دان کی طرف بڑھتا ہے تو راستے میں نر عضو کا تماس ہوتا ہے اور زیرہ اس کے جسم سے چمٹ جاتا ہے۔ کیڑا شہد حاصل کر چکنے کے پھول پر نہیں ٹھیرتا بلکہ سیدھا دوسرے پھول کی طرف روانہ ہو جاتا ہے اس طرح اس عمل کے بار بار دہرانے سے بار زیرگی عمل میں آتی ہے۔ یہاں پر اس کا خیال رکھنا بھی ایک حد تک ضروری ہے کہ زیرگی یا بار زیرگی صرف اسی وقت عمل یا اثر میں آسکتی ہے جب کہ زیرے کا انتقال اسی جنس کی کلغی پر ہو۔ اگر زیرہ کسی دوسری جنس کی کلغی تک پہنچ جائے تو بالکل بے کار ثابت ہوگا۔ ممکن ہے اب یہ سوال پیدا ہو کہ اس طرح سے تو کیڑے مکوڑوں کا وسیلہ بھی زیادہ معتبر باقی نہیں رہتا کیونکہ یہ دن بھر ایک درخت سے دوسرے درخت کا چکر لگاتے رہتے ہیں اور یہ کسی طرح بھی ممکن نہیں کہ جن جن پودوں

پر پہنچیں سب ایک ہی جنس کے ہوں لیکن قدرت نے اس کا انتظام پیشتر ہی کر لیا ہے ۔ اور پھولوں سے شہد صرف خاص خاص قسم کے کیڑے ہی حاصل کر سکتے ہیں اس لئے دوسرے کیڑے ان پھولوں تک پہنچنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کرتے ۔ ممکن ہے بعض لوگوں کو اس میں شک ہو کہ کیڑے دیکھ اور سونگھ بھی سکتے ہیں لیکن اس اعتراض کے جواب میں کافی ہوگا کہ اس تجربے کا تذکرہ کر دیا جائے جو اس سلسلے میں ترتیب دیا گیا تھا ۔

یہ معلوم کرنے کے لئے کہ آیا کیڑے مکوڑے رنگ پہچان سکتے ہیں یا نہیں چند شہد کی مکھیوں کی بعض خاص رنگ کے شہد کے پھولوں پر پرورش کی گئی اور اس کا انتظام کیا گیا کہ دوسرے رنگ سے آشنا نہ ہوں ۔ اس کے چند دن بعد جب ان مکھیوں کو ان پھولوں سے علیحدہ کر کے ایک دوسری جگہ منتقل کر دیا گیا اور صرف نیلے اور زرد رنگ کے پھول رکھے گئے تو وہ مکھیاں جو پیشتر ان رنگوں سے آشنا نہ تھیں فوراً اپنے قدیم رنگ کے پھولوں کی طرف رجوع ہوگئیں لیکن جو مکھیاں وہاں رکھے ہوئے رنگوں میں کسی ایک سے بھی آشنا نہ تھیں کسی پھول تک بھی نہ پہنچ سکیں کیوں کہ ان کے پسندیدہ رنگ وہاں موجود نہ تھے ۔ اسی طرح دیکھا گیا ہے کہ چڑیوں کے ذریعے زیرگی ہونے والے پھول عموماً گہرے سرخ رنگ کے ہوا کرتے ہیں کیوں کہ چڑیوں کی آنکھ میں بعض نارنجی رنگ کے مادّے ہوتے ہیں جس کی وجہ سے وہ نیلا رنگ شناخت نہیں کر سکتیں ۔

جس طرح ہم متواتر تجربوں اور مشاہدوں کے ذریعے کسی چیز کی بھلائی یا برائی کا نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں یا جس طرح ہماری ابتدائی کوششیں تکمیل اور ترقی کے زینے طے کرتی ہوئی ایجاد و اختـــراع کی شکل اختیار کر لیتی ہیں ٹھیک اسی طرح عالم نباتات کے توافق بھی پایۂ تکمیل کو پہنچتے ہیں ۔

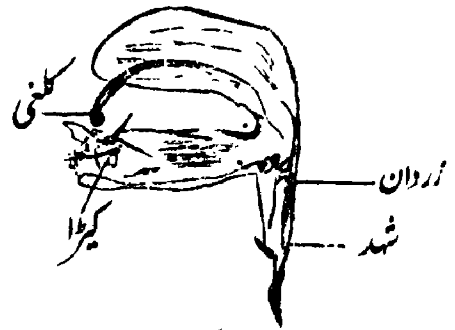
اپنی میکانی ترقیوں پر نظر ڈالئے تو ان میں بھی ایک تسلسل نظر آئے گا جس طرح کاربوریٹر ، کلچ اور اسپیڈ گیر کی ایجاد رفتہ رفتہ حاصل کی ہوئی فتوحات کی مثالیں ہیں بالکل اسی قسم کی تدریجی ترقی عالم نباتات کے توافقوں میں بھی آشکارا اور نمایاں رہتی ہے ۔ شاید ہماری ہی طرح کی کیفیات پودوں میں بھی پیدا ہوتی ہیں وہ بھی اندھیرے میں ٹٹولتے ۔ رکاوٹوں پر غالب آتے اور اس نامعلوم دنیا میں بڑھتے ہوئے آخر کار اپنی منزل مقصود پر پہنچ جاتے ہیں وہ بھی ہماری ہی طرح اصول کی قید میں جکڑے ہوئے ہوتے ہیں ۔ انھیں وہی رکاوٹیں پیش آتی ہیں اور وہی آہستہ اور تدریجی ترقی ان میں بھی پائی جاتی ہے ۔ انھیں بھی مخالف عناصر کے خلاف علم بغاوت بلند کرنا پڑتا ہے لیکن طرح طرح تجربوں کے بعد آخر کار ان کی قوت اختراع بروئے کار آتی ہے اور وہ اپنے مقصد کے حصول میں مدد ہونے والے توافق پیدا کرنے میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں ۔ اسی ہمت

واستعلال کی معمولی مثالیں پارزیرگی کے توافق میں آسانی کے ساتھ دیکھی جاسکتی ہیں۔

پارزیرگی کو یقینی کرنے کے لئے اکثر اوقات پودے اک جاتی پھول تیار کرتے ہیں یعنی یہ کہ نر اور مادہ اعضا ان پھولوں میں علحدہ علحدہ پائے جاتے ہیں یا اگر ایک ہی پھول میں ہوں تو یہ مختلف اوقات میں پختہ ہوتے ہیں اس لئے باروری کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ پارزیرگی واقع ہو۔

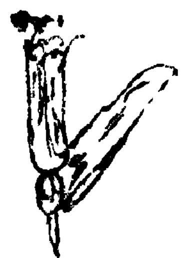
مختلف خاندانوں میں پارزیرگی عمل میں لانے کے لئے مختلف طریقے رائج ہوتے ہیں ان میں سے چند کی تفصیلی کیفیت درج ذیل کی جاتی ہے۔

Labitae میں پارزیرگی



اس خاندان کے ایک تمثیلی پھول کی ساخت شکل میں ظاہر کی گئی ہو جب کیڑا اڑ کر پنکھڑی پر آکر بیٹھتا ہے تو یہ پنکھڑی اُس کے وزن کی وجہ سے حرکت کرنے لگتی ہے۔ اس حرکت کی وجہ سے کیڑے کا جسم کلغی کے ساتھ تماس میں آتا ہے اور اگر اس کے جسم میں پیشتر سے کچھ زیرہ موجود ہو تو کلغی تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے بعد کیڑا شہد حاصل کرنے کے لئے پھول کے اندر کی طرف بڑھتا ہے لیکن راستے میں زردان کچھ اس طرح سے واقع ہوتے ہیں کہ ان کے ساتھ تماس کئے بغیر کیڑا آگے نہیں بڑھ سکتا زردانوں کے کیڑے کے ساتھ تماس میں آنے کی وجہ سے زیرہ کیڑے کے بال دار جسم سے چمٹ جاتا ہے شہد حاصل کر چکنے کے بعد کیڑا پھول پر نہیں ٹھیرتا کیوں کہ پھول پر ٹھیرنے کا مقصد پورا ہو چکا۔ اس طرح شہد کی تلاش میں وہ ایک پھول سے دوسرے پھول پر پہنچتا اور زیرگی کے فعل کو انجام دیتا ہوا گزرجاتا ہے۔

Compositae میں پارزیرگی



اس خاندان میں سب سے پہلے زردان قیف نما کلیچے سے باہر نکل آتے ہیں۔ ان کے پختہ ہو کر مرجھا جانے کے بعد اندر سے دو شاخی کلغی نمودار ہوتی ہے وہ اس وقت پختہ ہوتی ہے لیکن باروری کے لئے کسی دوسرے نر پھول کے زیرے کا اس تک پہنچنا ضروری ہو جاتا ہے۔ اس طرح اس خاندان میں مختلف زمانوں میں پختگی کے باعث پارزیرگی کا عمل میں آنا ضروری ہے۔ لیکن ان تمام شاخوں سے

یہ نہ سمجھ لینا چاہیے کہ تمام پودوں میں بار زیرگی عمل میں آتی ہے۔ اکثر ایسے پودے بھی پائے جاتے ہیں جن میں خود زیرگی واقع ہوتی ہے اور بعض تو ایسے پودے بھی ہیں جن میں پار اور خود زیرگی دونوں عمل میں آتی ہیں یعنی یہ کہ سال کے شروع میں تو یہ پار زیرگی عمل میں لاتے ہیں لیکن سال کے اخیر حصے میں بند پھول تیار کرتے ہیں جو کبھی کھلتے ہی نہیں۔ ان میں عروس اور نوشہ ایک ہی اکلیلہ میں پیدا ہوتے ہیں اور اسی حجلہ میں وہ وصل سے شادکام ہوتے ہیں اور وہیں اس کا نتیجہ بیجوں کی صورت میں نمودار ہوتا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگرچہ پودے پار زیرگی کو ترجیح دیتے ہیں لیکن بدرجہ مجبوری بقا کی خاطر خود زیرگی کو بھی قبول کر لیتے ہیں۔

صنفیّت کی ظاہری شناخت

انسانوں میں ریش داری اور گونجتی ہوئی کرخت آواز عام طور پر نر کی ظاہری خصوصیات ہیں۔ اسی طرح اعلیٰ قسم کے پودے بھی ان غیر ضروری لوازم سے مبرا نہیں۔ اکثر حالتوں میں پنکھڑیاں وغیرہ دونوں صنفوں میں مشترک ہوتی ہیں، لیکن بعض اوقات نر اور مادہ کے خط و خال بالکل جداگانہ ہوتے ہیں۔ کھجور کے درخت میں نر پھول کی پنکھڑیاں تو علیحدہ علیحدہ اور کھلی ہوئی ہوتی ہیں لیکن مادہ پھول کی پنکھڑیاں ملی ہوئی اور زیادہ تر چھلکے کی شکل کی ہوتی ہیں۔

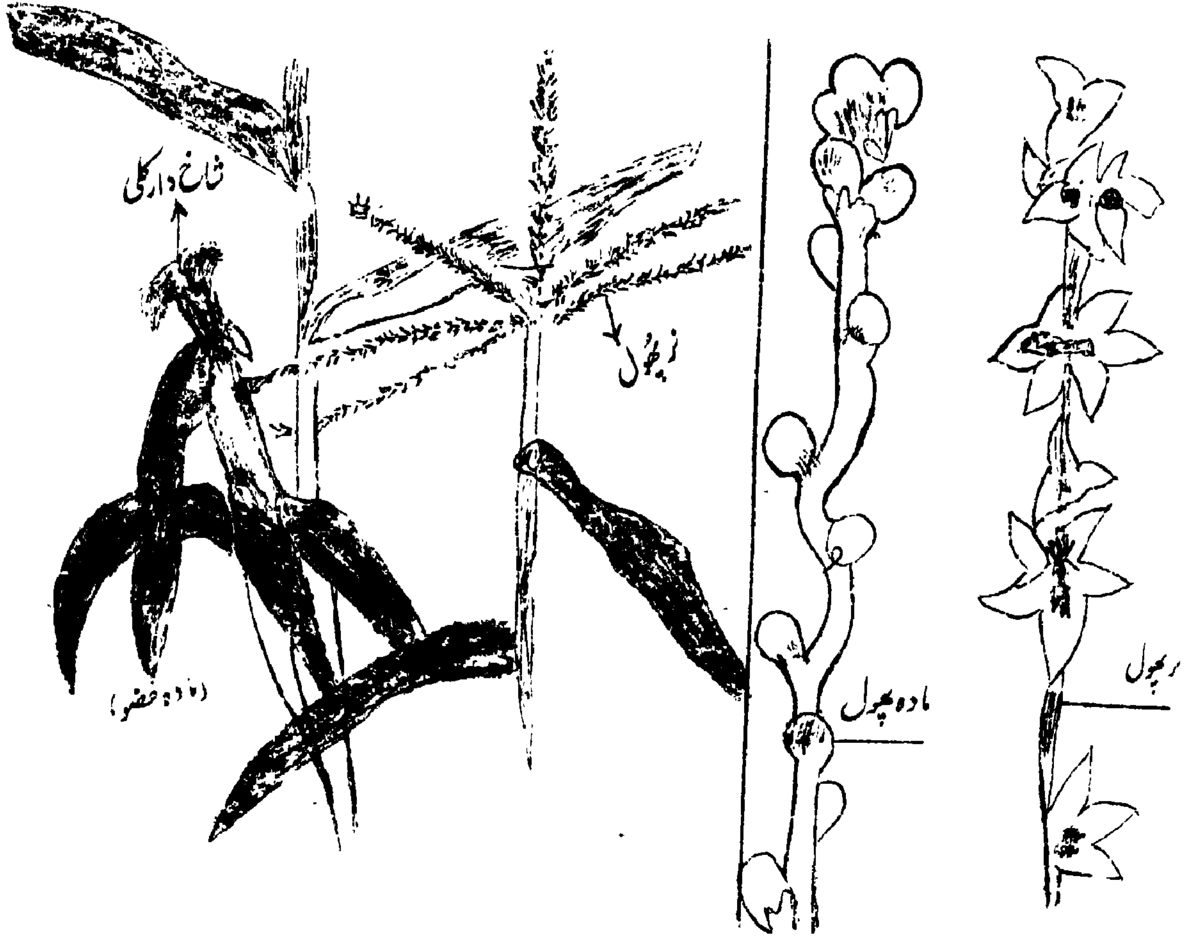
جانوروں میں اکثر ظاہری خصوصیات کچھ اس قدر جداگانہ ہوتی ہیں کہ نر کو مادہ سے پہچان لینا بہت ہی آسان ہوتا ہے لیکن پودوں میں ان کی شناخت اتنی آسان نہیں۔





ارتقائی اور اندرونی ساخت کے لحاظ سے زردان اور کلغی بہت ہی دلچسپ خصوصیات کے حامل ہیں لیکن چونکہ ان کا تفصیلی بیان زیادہ فنی شکل اختیار کرے گا اس لئے اس کو یہیں چھوڑ دیا جاتا ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ نر اور مادہ کے عضو الگ الگ واقع ہوں ان کا دور ہی سے پہچان لینا کچھ ایسا زیادہ مشکل نہیں۔ پودوں کا نر عضو عموماً بہت سادہ ہوا کرتا ہے۔ اس کے

برخلاف مادہ عضو زیادہ جسیم لیکن نر سے کسی قدر چھوٹا ہوتا ہے۔ حسب ذیل شکل تفریق کو بہت زیادہ واضح کردیتی ہے

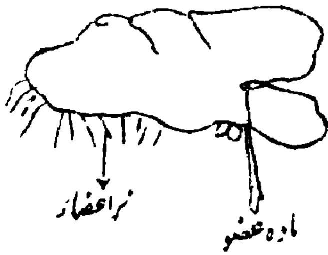


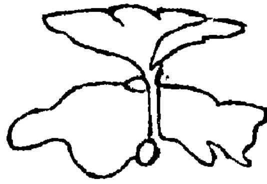
ادنی اقسم کے پودوں میں صنفیت

وسیع جنگلوں کے سرد گوشوں میں ہزاروں انسانوں کی نظروں سے پوشیدہ صنفیت کی ایک جداگانہ قسم پائی جاتی ہے۔ وہاں ایک چھوٹے سے قطرہ شبنم میں بھی فرن کا نر تولیدی اعضار مادہ کی تلاش میں تیرتے رہتے ہیں۔ ان کی یہ تلاش صرف اتفاقی ملاپ کی امید پر منحصر نہیں ہوتی بلکہ مادہ اخراجی کیمیای مادوں کی رہین منت ہوتی ہے۔

فرن میں عام بیجو پودوں کی طرح صنفی افعال ننھے ننھے صنفی پودوں کے ذریعے انجام پاتے ہیں لیکن ان پر نہ تو بیض دان ہوتے ہیں اور نہ وہ زر و زیرہ جس کو مختلف ذرایع سے ایک درخت سے دوسرے درخت پر پہنچانے کی ضرورت پیش آئے

اس کے بدلے یہاں تقریباً آدھ آدھ انچ کی سبز ساختیں پائی جاتی ہیں اور انھیں سے بذروں کے توسط افزائش نسل کا فریضہ پورا ہوتا ہے فرن کے پودے پھول، زیرہ اور کلغی کے جھگڑوں سے یکسر آزاد ہوتے ہیں۔ ان کی بجائے اگر ان کے پتوں کے نچلے حصوں کو دیکھا جائے تو نہایت ہی سلیقے سے ترتیب دی ہوئی ڈھیریاں نظر آئیں گی انھیں ڈھیروں میں چھوٹے چھوٹے بزرے ہوں گے جن کے ذریعے افزائش عمل میں آتی ہے اور صنفی پودے حاصل ہوتے ہیں۔ یہ قلب نما چپٹی ساختیں ہیں جن کی جسامت تقریباً ۱/۴ انچ ہوتی ہے ان میں جڑ کی سی ساختیں نکلتی ہیں اور انھیں میں نر اعضا پائے جاتے ہیں۔ اس کے برخلاف مادہ اعضا ساخت کے (Notch) پر جمع رہتے ہیں جیسا کہ شکل سے ظاہر ہے۔





نر اعضا دائری شکل کی ساختیں ہوتی ہیں اس کے اندرونی خلیے بڑی پیچوان نما ساختوں میں تبدیل ہوجاتے ہیں اور ان سے تجزایہ کی لمبی لمبی ساختیں نمودار ہوتی ہیں۔ یہ ساختیں تیرتی رہتی ہیں حتیٰ کہ ان کا ملاپ مادہ عضو سے ہوتا ہے۔ ملاپ کے بعد مادہ عضو فرن کے خوبصورت (Fronds) کی شکل اختیار کرلیتا ہے اور بزروں کے ذریعے دوبارہ صنفی پودے تیار ہوتے ہیں۔

غیر صنفی تولید

انسانوں میں تو تولید کا تخیل کسی طرح سے بھی صنفیت سے علیحدہ نہیں ہوسکتا لیکن پودوں میں بعض اوقات غیر صنفی تولید بھی وقوع میں آتی ہے۔ آلو اور پیاز وغیرہ اس کی بہت ہی عام اور سادہ مثالیں ہیں۔ آلو کی ہر آنکھ کو علیحدہ علیحدہ بو دیا جائے تو ہر ایک سے ایک نیا پودہ نمو پاجاتا ہے۔ اس میں کچھ شک نہیں کہ بعض ادنیٰ قسم کے جانوروں میں بھی غیر صنفی تولید وقوع میں آتی ہے لیکن عام طور پر ایسے جانوروں میں جن کو ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کوئی ایسی مثال نہیں اس کے برخلاف اعلیٰ سے اعلیٰ قسم کے پودوں میں بھی غیر صنفی تولید پائی جاسکتی ہے۔ اس خصوص میں باغ کے پودوں میں گلاب اور کروٹن کا ہر ایک کو کافی تجربہ ہوگا۔ بعض ادنیٰ قسم کے پودے صرف ایک خلیے پر مشتمل ہوتے ہیں اور ان کی افزائش عمل میں خلیے کی مادہ تقسیم ہوا کرتی ہے۔

ابوالخیر صدیقی بی، ایس، سی

شعریتِ امروز

پھر دن پھرے ہمارے، پھر جاگ اُٹھی جوانی
ہے موج زن رگوں میں سیماب کی روانی

پھر سرزمین دل پر اُلفت کی بارشیں ہیں
پھر درد بڑھ رہا ہے بے تاب خواہشیں ہیں

پھر دل کی وسعتوں میں جذبے مچل رہے ہیں
پھر محوِ خواب ارماں کروٹ بدل رہے ہیں

خوابِ گراں سے چونکے پھر عشرتوں کے نغمے
ہونے کو ہیں شگفتہ پھر زندگی کے لمحے

پیغامِ زندگی ہیں بُلبُل کی پھر صدائیں
ہستی پہ چھا رہی ہیں فردوس کی فضائیں

جاں بخش پھر بنی ہیں بادِ صبا کی موجیں
کلیوں کی ہنس رہی ہیں پھر گلستاں میں فوجیں

چڑیوں کے چہچہوں میں رقصاں ہی پھر ترنم
اہل چمن بنے ہیں پھر پیکر تبسم

شوخی اُبل رہی ہے دوشیزۂ چمن سے
پھر عطر بہہ رہا ہے پھولوں کے پیرہن سے

پھر چاند کی شعاعیں رقصاں ہیں یاسمن پر
لیتی ہے پھر بلائیں فطرت مچل مچل کر

بے چینیاں نظر کی دامن جھٹک رہی ہیں
دل میں مسرتوں کی کلیاں چٹک رہی ہیں

ہاں آج پھر "رضیہ" جلوہ دکھا رہی ہے
کونین کے نظارے دل سے بھلا رہی ہے

محمد عبدالعزیز غوثی
بی۔ اے (عثمانیہ)



Mr S. A KARIM
He is the Football Secretary
and one of the best half of Hyderabad

سالانہ رپورٹ انجمن اتحاد طلبائے جامعہ عثمانیہ

بابتہ سنہ ۱۳۴۶ و ۱۳۴۷ ف

[جناب محمد بن عمر صاحب بی۔ اے (عثمانیہ) صدر انجمن اتحاد نے یہ رپورٹ اس سال کے جلسۂ کرسی نشینی منعقدہ ۳ ر مہر ۱۳۴۷ ف میں پڑھی تھی]

صدر

۷ ر آبان ۱۳۴۶ ف کو ہم نے "انجمن اتحاد طلبائے جامعہ عثمانیہ" کا جائزہ حاصل کیا تھا۔ سال گذشتہ ہمیں ہر قسم کی مشکلات اور ہمت شکن جماعت بندیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ لیکن کبھی ان دشواریوں نے ہمیں بیٹھا نہ کیا۔ ہمیں اس کا احساس تھا کہ امکانات کا دایرہ ہمیشہ وسیع ہوتا ہے بشرطیکہ اقدامات کے دائرے کو اتنا ہی وسیع کر لیا جائے۔ ہمارا عمل ذاتی شہرت و نمود سے الگ رہا۔ ذاتی مفاد سے بالا و برتر ہو کر ہم نے وہی کیا جو مفید خیال کرتے رہے۔ اور اگر انجمن کی واقعی ہم سے کوئی خدمت ہو سکی تو یہی ہماری کوششوں کا انعام ہے

جائزے کے وقت ہم نے مصمم ارادہ کر لیا تھا کہ ذاتی اغراض اور شخصیتوں کے ہجوم میں اپنی راہ عمل گم نہ کریں گے ہر وقت اور ہر حیثیت میں انجمن کا مفاد ہماری رہنمائی کرے گا۔ انجمن کی جو کچھ خدمت ہم سے ہو سکی اس کے لئے ہم

آپ کی ستائش کے طلب گار نہیں۔ جو کچھ ہم نے کیا فرض سمجھ کر کیا۔ البتہ دیانت داری کے ساتھ فرض کو حتی الامکان پورا کرنے کا اطمینان اور خوشی ہم ضرور محسوس کرتے ہیں۔

حضرات! دستور جدید کے لحاظ سے انجمن اتحاد کے بنیادی مقاصد مباحثے منعقد کرنا، تقاریر کا انتظام کرنا اور جامعہ کی معاشرتی زندگی میں حصہ لینا ہے۔ اب ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ انجمن اس سال ان اغراض میں کہاں تک کامیاب رہی کیوں کہ انھیں امور سے اس کی کامیابی کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

مباحثے جہاں تک ہفتہ واری مباحثوں کا تعلق ہے ہم وثوق کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ کسی سال بھی اتنے مباحثے اتنی پابندی کے ساتھ نہیں ہوئے۔ سال کے آغاز ہی میں ہم نے مباحثوں کا ایک دلچسپ نظام نامہ ترتیب دیا اور سال کے آخر تک اس پر سختی کے ساتھ عمل کرتے رہے۔ ذیل میں گذشتہ سالوں کے مباحثوں کے اعداد دیئے جاتے ہیں تاکہ اضافی مطالعہ میں سہولت ہو۔

سنہ	معمولی	غیر معمولی	کاروباری	جملہ
۴۴ف سنہ	۶	۳	۲	۱۱
۴۵ف سنہ	۱۴	۷	۳	۲۴
۴۶ف سنہ	۳	۳	۵	۱۱
۴۷ف سنہ	۱۰	۹	۴	۳۰

باوجود تحریک عدم اعتماد کے جس کی وجہ سے دو ماہ تعطل رہا اور سال ایک ماہ قبل جائزہ دینے کے باوجود انجمن کے جملہ جلسوں کی تعداد (۳۰) رہی۔

مدت سے انجمن اتحاد کی یہ سعی رہی کہ کسی طرح اساتذہ صاحبان کو اراکین انجمن سے قریب تر لایا جائے۔ یہ کہتے ہوئے خوشی محسوس ہوتی ہے کہ بالآخر ہمیں اس سال بہت بڑی کامیابی حاصل ہوئی۔ نہ صرف انجمن کے ابتدائی و آخری مباحثوں میں محترم اساتذہ صاحبان نے شرکت فرمائی۔ بلکہ دوران سال میں بھی متعدد دفعہ ہماری ہمت افزائی فرماتے رہے ہم خصوصاً ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم صاحب صدر شعبہ فلسفہ، ڈاکٹر انور اقبال قریشی صاحب صدر شعبہ معاشیات، اور مولوی وہاج الدین صاحب پرسنل مددگار نائب معین امیر جامعہ کے ممنون ہیں کہ انھوں نے ہمارے جلسوں میں کئی مرتبہ بڑی خوشی سے حصہ لیا۔ علاوہ

ان حضرات کے مولوی عبدالحق صاحب، ڈاکٹر مظفرالدین قریشی، پروفیسر سعیدالدین، ڈاکٹر حمیداللہ، جناب عبدالمجید صدیقی صاحب، جناب سراج الدین صاحب، جناب عبدالقادر صاحب سروری، جناب پروفیسر حسین علی خاں مسٹر ویرابھدرو ڈو، مسٹر لیف. جے. اے ہارڈنگ، مسٹر جے، جے باسٹن اور مسٹر محمد اسلم نے بھی انجمن کی متعدد مصروفیات میں دلچسپی لی اور گہری ہمدردی کا اظہار فرمایا جس کے لئے ہم نہایت ممنون ہیں۔

سال گزشتہ نظام کالج کے جشن طلائی کے موقعے پر فی البدیہہ اردو اور انگریزی تقریری مقابلے منعقد کئے گئے تھے۔ ہماری مباحثی جماعتوں نے ان میں شرکت کی۔ ہماری ایک جماعت اردو تقریری مقابلے میں اول آنے کے صلے میں سالار جنگ کاسۂ گرداں، کی مستحق قرار پائی۔ علاوہ ازیں اردو سے مسٹر احمد خاں، مسٹر تراب علی خاں، مسٹر محمد عمر مہاجر اور انگریزی سے مسٹر پدمنا بھا چاری انفرادی انعامات کے مستحق قرار پائے۔ ہم ان تمام مقررین کی خدمت میں دلی مبارکباد پیش کرتے ہیں۔

غیر معمولی تقاریر انجمن اتحاد کی عظیم الشان کامیابی کا ثبوت وہ غیر معمولی جلسے ہیں جن میں بیرونی مقررین کو تقریر کے لئے مدعو کیا گیا تھا۔ ان ممتاز مقررین میں آنریبل بابا صاحب کھاپرڈے سابق وزیر تعلیمات صوبہ متوسط و برار، مسٹر ڈے ویز سابق ناظم تعلیمات صوبہ کینٹ انگلستان، مسز سروجنی نائیڈو سابق صدر انڈین نیشنل کانگریس مسٹر محمد علی جناح صدر کل ہند مسلم لیگ، مسٹر بھولا بھائی ڈیسائی رکن آل انڈیا کانگریس ورکنگ کمیٹی خاص طور قابل ذکر ہیں انجمن اتحاد کی گزشتہ چودہ سالہ تاریخ کے پیش نظر ہم یہ دعوے کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ اس اہتمام اور کامیابی کا اب تک ایک جلسہ بھی نہ ہوا۔ انجمن اتحاد طلبائے جامعہ عثمانیہ کی تاریخ سے قطع نظر ہندوستان کی بعض جامعات کی انجمنوں میں بھی ایسے بلند پایہ مقررین نے ایک سال میں طلبا کو مخاطب نہ کیا ہوگا۔ اس قسم کے جلسوں کی اہمیت و افادیت سے کس کو انکار ہوسکتا ہے پرانی نسل کے اعلیٰ مرتبت افراد کے طرز تقریر، طرز بیان، خیالات و افکار سے واقف ہونے اور ہمارے محسوسات کے اظہار کا یہ ایک بہترین طریقہ ہے۔ جن حضرات نے ان تقریری جلسوں میں شرکت فرمائی ہے وہ ان کی غیر معمولی کامیابی کے شاہد ہیں بعض اوقات انجمن کے دارالتقاریر کی قابل لحاظ وسعت بھی سامعین کے لئے ناکافی ہوئی۔

مجلس انتظامی ابتدائے سال میں آپ نے جن حضرات کو مجلس انتظامی انجمن اتحاد کے فرائض ادا کرنے کے لئے منتخب کیا تھا ان میں سے مسٹر مقصود شاہ خاں، مسٹر خواجہ محمد نصراللہ، مسٹر خلیل اللہ اور مسٹر ظہورالدین نے قبل اس کے کہ آپ کی عاید کردہ ذمہ داریوں کو مقررہ وقت پر ختم کرتے اس کو مناسب و بہتر سمجھا کہ اس بارگراں سے قبل از وقت

سبکدوش ہو جائیں۔ ہماری تمام تر کوشش بھی ان کے ارادوں کو ترک نہ کروا سکی۔ آپ کی انجمن کو چلنا تھا اور وہ باوجود مخالفانہ جدوجہد کے چلتی رہی اور آپ کے بقیہ نمایندوں نے آپ کی لاج رکھ لی مجلس انتظامی سال بھر سرعت کے ساتھ مصروف عمل رہی۔ کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا جس پر فوری توجہ نہ کی گئی ہو۔ اس سال مجلس انتظامی کے جلسوں کی تعداد (۲۳) ہوتی ہے جو بلاشبہ اس کی مستعدی پر دلالت کرتی ہے۔

تحریک عدم اعتماد انجمن اتحاد کا ایک بڑا نصب العین یہ بھی ہے کہ طلبا برادری کو انجمن سے قریب سے قریب تر کردے تاکہ وہ اس کی تمام مصروفیات میں دلچسپی لیں، اس کی کارروائیوں پر رائے زنی کریں اور اس کے لائحۂ عمل پر تنقید کریں کیوں کہ نکتہ چینی اور جائز مخالفت کی عدم موجودگی میں دنیا کا کوئی نمایندہ ادارہ خاطر خواہ کامیابی حاصل نہیں کرسکتا۔ اس لحاظ سے یہ ایک بے نظیر سال ہے کہ جو کام سال ہائے ماسبق میں نہ ہوسکا وہ سال گذشتہ اس تحریک کے ذریعے انجام پایا جس کی وجہ سے برادران جامعہ انجمن اتحاد سے بالکل قریب ہوگئے۔ آپ واقف ہیں کہ اس تحریک کے زمانے میں آپ نے انجمن کے تمام کاموں میں کس طرح دلچسپی لی کس طرح اس کے طریقۂ کار پر نکتہ چینی کی اور کس طرح موافقت یا مخالفت میں اپنی رائے کا اظہار فرماتے رہے۔ اگرچہ اس دلچسپی و اضطراری حرکت نے غلط راستہ اختیار کیا لیکن ہم خوش ہیں کہ ہماری برادری متحرک ہوگئی حرکت ہی زندگی کی نشانی اور نوجوانوں کا سرمایۂ حیات ہے۔

انجمن کی تاریخ میں پہلی مرتبہ ہمارے بعض مہربان احباب نے تحریک عدم اعتماد پاس کروانے کی ناتمام سعی فرمائی۔ اس کے وجوہ کیا تھے؟ اس کو معقولیت سے کیا واسطہ تھا؟ اور اس کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ یہ بحث یہاں غیر ضروری ہے۔ لیکن ہم یہ جانتے تھے کہ نفسانیت، ذاتی مفاد اور خود غرضی کی بنیادوں پر جو عمارتیں بنائی جاتی ہیں وہ پانی پر نمک کی دیواریں ہوتی ہیں۔ تحریک عدم اعتماد بھی کافی افراتفری، انتہائی مایوسی و پشیمانی کے عالم میں واپس لے لی گئی۔ اس نازک موقع پر بھی ہمارے قدم نہ ڈگمگائے ایوان کے ایک قلیل حصے کے مخصوص اختلافات جو چند غلط فہمیوں کا نتیجہ تھے ہمیں اپنے عزم صمیم، عقیدہ راسخ اور غیر متزلزل ارادے سے باز نہ رکھ سکے۔ ہماری پیہم سعی انجمن کی خاموش اور پرخلوص خدمت رہی۔ ان تمام حالات میں آپ حضرات کی اخلاقی قوت اور عملی ہمدردیاں ہمارے ساتھ رہیں۔ ہم آپ کی اس عنایت، اعتماد اور خلوص کے لئے دلی شکر گزار ہیں۔

یوم جامعہ سال گزشتہ اعتماد اور عدم اعتماد کی کشمکش نے اتنا وقت نہ چھوڑا کہ یوم جامعہ ہم اپنی توقعات کے شایان شان

منا سکتے۔ بہرحال جس طرح بھی ممکن ہو سکا امتحانات سے کچھ دنوں قبل یوم جامعہ منایا گیا اور ہم نے حتی المقدور اس کو کامیاب بنانے میں کوئی سعی اٹھا نہ رکھی۔ تحریری و تقریری مقابلے، کھیلوں کے مقابلے، جلسۂ معاشرتی، مصرانہ اور جلسۂ موسیقی کا خاطرخواہ انتظام تھا میں اس سلسلے میں اپنے تمام شرکائے کار بالخصوص مسٹر جعفر آبادکر، مسٹر محمد مولانا، مسٹر فتح نصیب خاں، مسٹر شنکر موہن لال ماتھر، مسٹر خورشید علی خاں، مسٹر پس کے ااری کا بے ممنون ہوں۔ ان کے علاوہ میرے بہت سے عزیز احباب ایسے ہیں جن کی ہمدردیوں کے گہرے نقوش میرے قلب پر مرتسم ہیں۔

موازنہ برادران جامعہ! سب سے پیچیدہ مسئلہ موازنے کا ہوا کرتا ہے۔ شبہات یہاں، ترددات یہاں، غرض وہ کون سی چیز موجود نہیں۔ لیکن خدا کا شکر ہے اس سال انجمن کی تنظیمی حالت اور بل سسٹم کی ترویج نے شکوک و شبہات کی گنجائش کو ختم کردیا اور باقاعدہ رجسٹروں کی موجودگی نے اطمینان کلی کی ہر چیز مہیا کردی ہے۔ میں اس سلسلے میں مولوی حمید الرحمن صاحب صدر شعبہ طبیعیات و خازن اعزازی انجمن اتحاد کا خاص طور پر شکریہ ادا کروں گا۔ جناب نے باوجود متعدد مصروفیات کے انجمن کے معاملات میں جو دلچسپی لی اس کے ہم بہت ممنون ہیں۔

موازنہ منظور شدہ ذیل میں منظورہ موازنہ اور اصلی خرچ تفصیل سے پیش کیا جاتا ہے۔

موازنہ منظورہ کے لحاظ سے

(۱) انتظام دفتر و تنخواہ ملازمین منظورہ	۵۵۰ روپے	۴۱۰ روپے ۱ آنہ
(۲) جشن یوم جامعہ	۱۳۰۰ روپے	۸۸۵ روپے ۰ ۴ پائی
(۳) طباعت	۲۰۰ روپے	۱۷۴ روپے ۶ آنے ۹ پائی
(۴) کتب خانہ	۷۰۰ روپے	۵۹۰ روپے ۱۵ آنے ۵ پائی
(۵) مد متفرق	۲۰۰ روپے	۱۸۷ روپے ۰ آنے ۴ پائی
(۶) کھیل	۲۰۰ روپے	۱۹۳ روپے ۱ آنے ۰
(۷) اتفاقی اخراجات	۱۰۰ روپے	۷۳ روپے ۹ آنے ۰
(۸) قرضہ سال گذشتہ	۵۰ روپے	۴۸ روپے ۱۴ آنے ۰

اس طرح ۳۳۰۰ روپے سکۂ عثمانیہ کے موازنہ منظورہ سے جملہ ۲۵۷۲ روپے ۶ / ۹ گذشتہ سال خرچ ہوئے۔ اسی طرح بچت ۷۲۸ روپے ۱۰ / ۱ ہوئی جس میں ۳۹۰ روپے ۶ زائد از موازنہ رقم جمع کرنے کے بعد (جو بعد میں حاصل ہوئی) جملہ بچت جو ہم آنے والی کابینہ

کے لئے چھوڑ رہے ہیں وہ ۱۱۱۰۷ روپے ۱۰ ار ۷ ہے ۔ جو انجمن اتحاد کی تاریخ میں ایک بے مثل بچت ہے۔

کتب خانہ بہ مقابلہ سال ہائے گزشتہ انجمن کے کتب خانے نے بھی اعلیٰ کارکردگی کا نمونہ پیش کیا۔ مسٹر امجد علی خاں کتب خانہ دار انجمن اتحاد نے کتب خانہ کو مکمل طور پر منظم کردیا ہے۔ طریقہ داد و ستد کی جدید تنظیم نے مطالعہ کرنے والوں کے لئے سہولت پیدا کردی ہے۔ آپ نے ایک غیر منظم کتب خانہ ہاتھ میں لیا تھا، لیکن ایک سال کی محنت اور توجہ کے بعد وہ اسے نہایت ہی بہتر و منظم حالت میں چھوڑ رہے ہیں، اس سال کتب خانے میں جملہ (۱۰۴) اُردو اور (۱۰۹) انگریزی کتابیں زیادہ کی گئیں جن میں اُردو و انگریزی کی علی الترتیب ۹ اور اکیس وہ کتابیں بھی ہیں جو جناب ہارون خاں صاحب شیروانی، حافظ محمد صدیق صاحب صدیقی، احمد الدین صاحب اور پروفیسر حسین علی خاں و مسٹر جے سی باٹسین کی عطا کردہ ہیں، جس کے لئے ہم مشکور ہیں۔ سال حال ۳۰۵ طلبا نے انجمن کے کتب خانہ سے استفادہ کیا۔ علاوہ ان کتابوں کے بہت سے انگریزی و اُردو کے ہفتہ وار، ماہوار، اور روزانہ اخبارات و رسائل کا بھی کافی انتظام کیا گیا

کھیل ان علمی مصروفیات کے ساتھ ساتھ انجمن اتحاد میں کھیلوں کا معقول انتظام رہا۔ تعلیمی مصروفیات اور دماغی محنت کے برادران جامعہ جب انجمن تشریف لاتے ہیں تو ان کے لئے سب سے زیادہ دلچسپ اور دل خوش کن مقام کھیل کے کمرے ہوتے ہیں۔ انجمن میں پنگ پانگ، فنگر بلیرڈ، تاش، شطرنج اور اسی قسم کے دیگر دلچسپ کھیلوں کا باقاعدہ انتظام رہا جس سے برادران جامعہ کثیر تعداد میں مستفید ہوتے رہے۔ انجمن کا یہ شعبہ مسٹر نسکر موہن لال ماتھر کے تفویض تھا اور یقیناً انھوں نے جس محنت، جاں فشانی سے کام کیا وہ قابل مبارک باد ہے۔ اس سال انجمن نے اراکین کی تفریح کی خاطر پکنک شو کا بھی انتظام کیا تھا۔ یہ شو معاشی نقطہ نظر سے بھی سودمند رہا۔ بعد وضع اخراجات، انجمن کو مبلغ ۱۹ روپے ۵ آنے منافع حاصل ہوا۔

بٹن اس سال یونیفارم کے بٹن کا انتظام بجائے خانگی دکانوں کے خود انجمن نے اپنے ذمے لیا۔ اس سے یہ فائدہ ہوا کہ طلبا کو فی سٹ ۲ ر کی کمی ہوئی اور انجمن کو انتظامی حقوق کی وجہ سے ۱۲½ فی صدی کمیشن ملتا رہے گا۔

ملازمین انجمن اس سال انجمن کے ملازمین میں ایک اہلکار اور ایک چپراسی کا اضافہ کیا گیا۔ دفتری تنظیم کے لئے ایک ہمہ وقتی منشی کی موجودگی ناگزیر خیال کی گئی اور کتب خانے کے لئے علیحدہ چپراسی کی ضرورت محسوس کی جا رہی تھی ان دونوں ملازمین کی تنخواہیں بھی انجمن کے موازنے سے دی جاتی ہیں۔

انجمن کی عمارت ہم اپنے نائب معین امیر جامعہ جناب قاضی محمد حسین صاحب کے ممنون ہیں کہ انجمن کی موجودہ جگہ کو ناکافی محسوس فرماتے ہوئے اس کے متصل مزید دو کمروں کا انتظام فرما دیا۔ ان کمروں سے انجمن کی دشواریاں بالکلیہ رفع تو نہ ہوئیں البتہ کم ضرور ہوگئیں۔ کیا عجب کہ ہمارے محترم سرپرست کی مزید توجہ سے انجمن کی یہ شکایت بالکلیہ رفع ہو جائے۔ مجوزہ ایک لاکھ کی عمارت کی تعمیر تک جسے ابھی ایک عرصہ درکار ہے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ۵، ۶ ہزار کی لاگت سے انجمن کے لئے ایک عارضی عمارت جامعہ کی عارضی عمارتوں کے قریب میں بنادی جائے۔ جگہ کی تکلیف کلیہ فنون کے اپنی مستقل عمارتوں میں منتقل ہونے پر اور زیادہ شدید ہو جائے گی۔ اسی لئے ہم اپنا فریضہ تصور کرتے ہیں کہ اس رپورٹ میں آپ حضرات کی توجہ اس طرف مبذول کروائیں۔ شعبہ فنون کے طلباء اپنی مستقل عمارت میں منتقل ہو جائیں گے اور ان کی انجمن عارضی عمارتوں کے سب سے دور افتادہ گوشے میں ہوگی۔ اگر اس کو کلیہ فنون کے نچلے حصے میں منتقل کرایا گیا تو پھر بھی دقت سائنس کے طلبہ کے لئے درپیش ہوگی۔ اس گتھی کو سلجھانے کی واحد شکل یہی ہو سکتی ہے کہ ہمارے مہربان نایب معین امیر کوشش فرما کر ایک عارضی عمارت جامعہ کے عارضی اور مستقل عمارتوں کے درمیان تعمیر کروا دیں اور یہ کوئی ایسا مشکل کام بھی نہیں ہے اگر ذرا سی دلچسپی لی جائے تو نہ صرف موجودہ سو طلبہ بلکہ آیندہ آنے والی کثیر عثمانی برادری بھی اس "قاضی ہال"، دکاش یہ ہمارا پیش کردہ نام ارباب مقتدر کو پسند آجائے) میں اپنے محبوب نایب معین امیر کی یاد تازہ رکھیں گے۔ خدا کرے ہماری یہ گذارش صدا بصحرا ثابت نہ ہو۔

شکریہ آخر میں میں آپ تمام حضرات کا شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے ہمیں منتخب کرکے اور اشتراک عمل فرما کر ہمیں اس کا موقع عطا فرمایا کہ انجمن اتحاد کی خدمات انجام دیں۔ آخر میں، میں عالی جناب نایب معین امیر کا پُر خلوص شکریہ ادا کروں گا جن کی ہمدردیاں، عنایات اور مہربانیاں ہمیشہ انجمن کے ساتھ رہیں۔

ابو الخیر صدیقی
معتمد انجمن اتحاد طلبہ

اب تو

(۱)

اب تو اس دیس میں کچھ ایسے بشر پیدا ہوں
قوم کی، دیس کی آنکھوں کے بنیں جو تارے

(۲)

جن کے سُکھ دُکھ میں ہو، دیس کا اپنا سُکھ دُکھ
قوم کو، دیس کو ہوں جان سے بڑھ کر پیارے

(۳)

جن کے ناموں میں سبھی ناموں کو اپنے بھولیں
جن کے ناموں سے بنیں دیس کے قومی نارے

(۴)

جن کی آنکھوں میں بسیں ہندو مسلماں ایسے
جیسے آکاش میں رہتے ہیں چمکتے تارے

(۵)

جن کا سب کچھ ہو فدا قوم پہ اپنی ہر دم
قوم بھی جن کے لئے۔ اپنا سبھی کچھ وارے

(۶)

جن کی یکتائی سے ہو۔ دیس میں ایکا قایم
جن کے کہنے میں چلیں پریم سے مل کر سارے

(۷)

جن کے جینے سے مری قوم بھی جینے لگ جائے
سر اٹھا کر چلیں سب کوئی نہ ہمت ہارے

پنڈت ونشی دھر ودیالنکار
لیکچرار سنسکرت ہندی جامعہ عثمانیہ

دنیائے صحافت

دنیائے صحافت میں اخبار کو جو سب سے زیادہ اہمیت حاصل ہے وہ کسی نظر و فکر سے پوشیدہ نہیں۔ اخبار کے فرائض کا کوئی مختصر خاکہ پیش کرنا بہت دشوار ہے کیوں کہ ہر ملک اور ہر قوم کے سیاسی، سماجی اور معاشی حالات کے پیش نظر اخبار کے فرایض بدلتے اور بنتے رہتے ہیں۔ ہمارے نزدیک اخبار کا یہ تخیل ہے کہ وہ ایک مختصر مگر جامع خلاصہ ہے۔ دنیا کی ایک روزہ تاریخ کا جس میں ہم رہتے بستے ہیں اس میں کلام نہیں کہ اخبار ملک کا سب سے بڑا کامیاب تعمیری آرگن ہوتا ہے لیکن ایک ایسے اخبار کے لئے جو سچائی اور ایمان داری سے اپنے فرایض انجام دیتا ہو سب سے زیادہ مشکل کام ترجمانی کا ہے۔ اگر اس فرض کو کوئی اخبار صحیح اصول پر انجام دے رہا ہو تو یقیناً وہ قوم و ملت کا سب سے بڑا خادم ہے اکثر دیکھا گیا ہے کہ ترجمانی کی اس دشوار گھاٹی سے اچھے اچھے حوصلہ مند اور اولوالعزم صاحب قلم صحیح سلامت باہر نہیں نکلے۔ اس گھاٹی کے ہر ہر قدم پر حوصلہ فرسا مصائب اور ایمان شکن ترغیبوں سے دوچار ہونا پڑے گا اس راہ پر خطر میں وہی لوگ کامیاب ہو سکتے ہیں جن میں جذبۂ ایثار، قوت ایمان، اور حوصلہ فداکاری و قربانی ہو۔ ان حقایق کی روشنی میں اگر ہم اخبار کو قوم و ملت کے خیالات، افکار اور تصورات کا سچا ترجمان کہیں تو مبالغہ نہ ہوگا اور بنا بریں اخبار کو ہم عوام کا اتالیق بھی کہہ سکتے ہیں جو ان کے کروڑوں روپیے سے زیادہ قابل قدر ہے۔ دنیا کے حالات سے واقف ہونے کا سب سے

سہل اور ارزاں طریقہ اخبار بینی ہے۔ ایک شخص تھوڑی دیر میں چند پیسوں کے خرچ پر ساری دنیا کے حالات سے واقف ہو سکتا ہے۔ اس کا پڑھنے والا دنیا کے مختلف حصوں کی تمدنی۔ معاشرتی اور سیاسی سرگرمیوں سے واقف ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد لازماً وہ ان خیالات کی رہنمائی میں اپنے ملک کی ترقی کا جائزہ لے گا اور اس کا اندازہ کر سکے گا کہ آیا اس کا ملک ترقی یافتہ ممالک کے دوش بدوش چل رہا ہے یا اُن سے بہت پیچھے ہے۔

اخبار کا پابند اور بغور مطالعہ کرنے والا ایک سال میں اُن تعلیم یافتہ لوگوں سے کہیں زیادہ معلومات حاصل کر لیتا ہے۔ جو اپنا ایک ایک لمحہ کتب خانے میں کتاب کا کیڑا بن کر گذار دیتے ہیں۔ دن بھر کے تھکے ہارے آدمی کے لئے اخبار دلچسپی اور تفریح کا سامان ہے۔ لندن میں سب سے پہلا درجہ بادشاہ کا، دوسرا کابینہ کا، تیسرا پارلیمنٹ کا اور چوتھا پریس کا ہے نپولین جیسا سپہ سالار لکھتا ہے۔ ہزار سپاہیوں سے کسی حکومت کو اتنا خوف نہیں ہو سکتا جتنا چار آزاد خیال اخبارات سے ہو سکتا ہے۔ اخبار اور پریس کی اس قوت کا بہتر اندازہ وہی ممالک کے افراد کر سکتے ہیں جہاں جمہوریت کا دور دورہ ہو۔ جمہوری ممالک میں جہاں کابینہ بذریعہ رائے دہی منتخب ہوتی ہو اور حکومت کے اکثر شعبے نمایندگی کے اصول پر چلائے جاتے ہوں رائے عامہ کی قوت اور اس کی اہمیت حد و قیاس سے بڑھ جاتی ہے۔ ان ممالک کی سب سے بڑی قوت رائے عامہ کی ہوتی ہے۔ کیوں کہ کوئی جمہوری حکومت بہت عرصے تک رائے عامہ سے غافل نہیں برت سکتی بہت جلد اس کو رائے عامہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا پڑتا ہے۔ ان حالات کے پیش نظر اگر اخبار رائے عامہ کا علم بردار ہو اگر رائے عامہ حکومت کی پوری مشینری کو چلاتی ہو تو کیا یہ کہنا مبالغہ ہوگا کہ اخبار ہی کے ہاتھ میں حکومت کی باگ ڈور ہوتی ہے!

اب یہ اس قوم کے افراد کے ہاتھ میں ہے کہ اس عظیم ترین قوت کا صحیح استعمال کریں۔ اگر ملک کے اخبار سچائی، ایمان داری اور ہمدردی سے خدمات انجام دیتے ہوں اور اپنے اخبار سے ملک کے باشندوں میں معلومات کا اضافہ، علم کی تلاش، بین الاقوامی حالات سے آگاہی، ملکی معاملات میں اخلاقی جرأت سے کام لے کر بلا خوف و خطر سچی اور بے غرض رائے دینے کا مادہ پیدا کر دیں تو سمجھ لیجئے کہ اُس ملک کی قسمت جاگ اُٹھی یاد رکھئے ملک کے لئے بدترین لعنت غدار صحافت ہے۔

ہمارا نصب العین یہ ہوتا ہے کہ ہماری عملی زندگی سنور جائے اور ہمارے معلومات اور تجربات سے ملک اور قوم کو فائدہ پہونچانے کے موثر ذرائع موجود ہوں۔ یہ چیز صرف اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب ہم اپنے آپ پہلا اپنی معلومات

پر اور اپنے تجربے پر بھروسہ کرنے لگیں، ہم میں خودداری اور بلند ہمتی پیدا ہو جائے، ہم انکسار اور ایثار نفس کا مجسمہ بن جائیں اور محنت و مشقت سے صحیح معنوں میں محبت کرنے لگیں۔ خودداری کا وجود اس وقت ہوتا ہے جب ہمیں اپنی حالت کا سچا احساس ہو، بلند ہمتی اس وقت پیدا ہوتی ہے۔ جب ہم کو اپنی قابلیتوں پر بھروسہ ہو جائے، انکسار اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اپنی خامیوں پر نظر رہے۔ یہ باتیں کہنے کو تو بے حقیقت معلوم ہوتی ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ عوام ان کو بہت کم جانتے اور اس سے بھی کم ان کو سمجھتے اور ان پر عمل کرتے ہیں۔ میں بلاخوف تردید یہ کہہ سکتا ہوں کہ یہ تمام صفات اخبار بینی سے پیدا ہو سکتی ہیں، بشاید اس دعوی پر عدم ثبوت کی وجہ سے یقین نہ کیا جائے لیکن اگر کسی نتیجے پر پہونچنے کے لئے عجلت نہ کی گئی تو بہت جلد یہ کہنے پر مجبور ہونا پڑے گا کہ اگر واقعی کوئی شخص صحیح معنوں میں ملک و قوم کی خدمت کا جذبہ رکھتا ہے تو اس کے لئے اخبار بینی سب سے زیادہ ضروری ہے۔ اخبار ایک شمع ہے جو دل و دماغ کو روشن کر دیتی ہے اخبار کیا ہے قومی حالات و روایات کا آئینہ موجودہ سوسائٹی کی چلتی جاگتی تصویر اور مختلف خیالات کا مکمل مرقع بقول شخصے "کسی قوم کے مصائب اور مشکلات کا صحیح اور اطمینان بخش اندازہ صرف وہاں کی صحافت سے لگایا جا سکتا ہے" صرف اخبار ہی اپنے ماحول کا سچا ترجمان اور بہترین نمائندہ سمجھا جا سکتا ہے۔" موجودہ تاریخ عالم کے مطالعے سے یہ حقیقت ہم پر بخوبی واضح ہوتی ہے کہ ترقی یافتہ ممالک نے اجتماعی طور پر جتنی بھی ترقی کی اس کی کامل نگہداشت صحافت کے علاوہ کسی دوسرے طریقے سے بالکل ناممکن تھی۔ موجودہ زمانے میں انفرادیت کوئی اہمیت نہیں رکھتی اجتماعیت کا دور دورہ ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ انفرادی قوت سے اجتماعی قوت ہمیشہ زیادہ ہوتی ہے۔ کسی ملک کے اجتماعی مفاد کا واحد علم بردار اس ملک کا قومی اخبار ہوتا ہی۔ اس لئے ہر محب وطن پر اس کا مطالعہ فرض ہے ایسے اخبار جن کا واحد مقصد عوام کے حقوق کی حفاظت ہو واقعی ہماری سچی ہمدردی کے مستحق ہیں، ہماری ہمدردی کس قسم کی ہو سکتی ہے۔ اس کا جواب کوئی ایسا مشکل نہیں ہے، ہمارا اولین فرض ہے کہ اخبار کی اشاعت میں زیادتی کے ساتھ ساتھ اس کی آواز کی اہمیت کو بڑھا دیں اور چونکہ وہ خود ہماری آواز کا نمائندہ ہوتا ہے اس لئے اس کی آواز کی اہمیت کو بڑھانا خود ہماری اہمیت کا بڑھانا ہے۔

اخبار کی قوت اور اہمیت اس کے پڑھنے والوں پر منحصر ہے۔ جتنی زیادہ اخبار پڑھنے والوں کی تعداد ہوگی اسی نسبت سے اس کی اہمیت اور قوت میں اضافہ ہوگا۔ اور اخبار پڑھنے والوں کی تعداد میں اسی وقت معتد بہ اضافہ

ہو سکتا ہے جب کہ ملک میں تعلیم عام ہو اور ملک کی آبادی کا کثیر حصہ جاہل اور ان پڑھ نہ ہو جس ملک میں اخبار بین طبقے کی کمی ہوگی لازماً اس ملک کی صحافت کمزور ہوگی۔ اور وہاں کے اخباروں کا شمار انگلیوں پر کیا جا سکے گا۔ ایسی حالت میں اخبار کبھی رائے عامہ کو متاثر نہیں کر سکتے۔ انگلستان جیسے تعلیم یافتہ ملک میں، جہاں کا مفلس طبقہ بھی اخبار بینی کا شوق رکھتا ہے۔ اخبار رائے عامہ کے سب سے بڑے محافظ اور ترجمان ہوتے ہیں۔

پبلک کے جذبات کے اظہار کے لئے ہر اخبار میں کچھ نہ کچھ جگہ ضرور رہتی ہے۔ اظہار جذبات کی اہمیت جتنی بھی ہے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ اگر یہ مضامین اخبارسی توسط اتک کے لکھے جائیں تو کوئی اہمیت نہ رکھیں گے۔ لیکن اگر وہ ایک مستند اور کثیر الاشاعت اخبار میں شائع ہو جائیں تو اُن کی صورت جداگانہ ہو جاتی ہے۔ عام خیال ہے کہ انگلستان کا اخبار لندن ٹائمز اس قدر اہمیت کا صرف اس وجہ سے مالک ہے کہ معمولی سے معمولی انفرادی مشکلات بھی اُس کے توسط سے حکام تک پہنچائی جاتی ہیں۔

کوئی محب وطن اس سے انکار نہیں کر سکتا کہ حیدرآباد کی قومی زندگی کے مسائل روز بروز زیادہ توجہ کے مستحق ہوتے جاتے ہیں اور بلحاظ حالات زمانہ ارباب فکر و نظر کو ملک کے اہم مسائل سے واسطہ پڑ رہا ہے اس لئے اس وقت سب سے اہم ضرورت رائے عامہ کی تشکیل ہے لیکن رائے عامہ کی تشکیل و تنظیم کوئی ایسا آسان کام نہیں اور اگر یہ ممکن ہو سکتا ہے تو صرف اخبارات و رسائل کے توسط سے یقیناً اخبارات رائے عامہ کے قابل اعتماد اور موثر نمایندے بن سکتے ہیں۔ لیکن اس کے لئے یہ نہایت ضروری ہے کہ ہم اپنی ذمہ داریوں کا احساس رکھتے ہوئے اخبارات کو اتنی اہمیت دیں کہ وہ ہمارے ملک کے کاروبار میں ایک خاص باعزت جگہ حاصل کرلیں۔ رائے عامہ کی اہمیت سے کس کو انکار ہو سکتا ہو خصوصاً ایسے دور میں جب کہ حکومتیں رائے عامہ کی پابند ہو چکی ہیں۔ دنیا کی تمام متمدن حکومتیں رعایا کے احساسات و جذبات کا کافی خیال رکھتی ہیں اور رعایا کے خیالات اُن کو صرف صحافت کے ذریعے معلوم ہو سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ انگلستان میں پریس بہت اہمیت رکھتا ہے اور حکومت کے اکثر اہم کام صرف اسی کی رائے اور اشاروں پر انجام دیے جاتے ہیں۔ اس کی بڑی وجہ جیسا کہ ہم نے آگے بیان کیا یہ ہے کہ وہاں کی رائے عامہ کی تشکیل، اظہار اور ترجمانی میں سب سے زیادہ حصہ اخبارات ہی کو حاصل ہے۔

ارل برکنہام نے بالکل ٹھیک کہا ہے کہ رائے عامہ کی تشکیل میں سب سے بڑا حصہ اخباری پریس کو حاصل ہے۔

ایک صاحب کی رائے سے ہم کو کامل اتفاق ہے کہ ہندوستان کے سیاسی حالات اس بات کے متقضی ہیں کہ ملک میں امن اور شانتی کی فضا پیدا ہو اور اخبارات جس خوبی سے اس کو انجام دے سکتے ہیں وہ کانفرنسوں اور لیڈروں سے ممکن نہیں اخبارات ملک کے رہبر ہوتے ہیں یہ ملک کو تباہی سے نکال کر ترقی کے اعلیٰ مدارج پر پہونچاتے ہیں۔ اور انہیں کے ذریعے حکومت کی پالیسی متعین ہوتی ہے فرقہ وارانہ احساسات کو کم کرنے اور فرقہ واری اتحاد کے رشتے کو مربوط کرنے میں اخبارات خاصہ حصہ لے سکتے ہیں ہم کو چاہئے کہ صرف ایسے اخبارات پڑھیں جو فرقہ واری ذہنیت کی آلودگی سے پاک ہوں اس سے ایک طرف تو خود ہمارا اخبار بینی کا صحیح ذوق پرورش پائے گا تو دوسری طرف ایسے اخبارات کی ہمت افزائی ہوگی جو ملکی مفاد کو منزل مقصود بنائے رکھتے ہیں اور جن کے نزدیک ردی فرقہ واری جھگڑے کوئی زیادہ اہمیت نہیں رکھتے۔

اخبارات رائے عامہ میں سیاسی شور پیدا کرتے ہیں لیکن اخبار بینی ہم کو موجودہ سیاست سے واقف کرانے کے ساتھ ساتھ سائنٹیفک ایجادات، تاریخی واقعات، معاشی مباحث اور اقتصادی حالات سے بخوبی واقف کرادیتی ہے سائنس کی فتوحات نے وقت اور جگہ کو بہت کچھ سمیٹ لیا ہے اب ہم دنیا کے کسی گوشے کے تغیرات اور انقلابات سے بے پرواہ نہیں رہ سکتے دنیا میں اگر کہیں کوئی تغیر ہو تو اس کا اثر بالواسطہ یا بلاواسطہ ہم پر ضرور مترتب ہوتا ہے دور دراز ملکوں کے سیاسی تغیرات بادی النظر میں ممکن ہے ہمارے لئے اہم نہ ہوں لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ وہ ان کی نیندیں اچاٹ دینے کے لئے کافی ہیں۔

بقول جواہر لعل نہرو ہندوستان تمام دنیا سے علیحدہ رہ کر اپنے لئے راہ نجات نہیں پاسکتا ہمارے لئے اسپین، چین، انگلستان۔ فرانس اور جرمنی کے حالات اتنے ہی اہم ہیں جتنے خود اپنے ملک ہندوستان کے اور ان واقعات اور حالات سے واقف رہنے کا واحد ذریعہ اخبار بینی ہے۔ اخبارات ہمیں ان تمام واقعات سے واقف رکھتے ہیں جو ہمارے لئے غور و فکر کا ایک وسیع میدان مہیا کرسکیں ہندوستان میں بدقسمتی سے اخبار بینی کا صحیح ذوق نہیں اور یہی وجہ ہے کہ یہاں رائے عامہ کبھی منظم نہیں رہی۔

خبروں اور رپورٹوں کی اشاعت کے علاوہ اخبارات کا سب سے اہم فریضہ قومی اور ملکی معاملات میں ایماندارانہ تنقید و تبصرہ ہے بعض لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ اخبارات کے اداریوں کی اب کوئی اہمیت اور وقعت باقی نہیں۔ یہ خیال

اس وجہ سے قایم ہو گیا ہو کہ ملک میں بعض ایسے خود غرض اور قوم فروش اخبار ہوتے ہیں جو محض اپنے مفاد کی خاطر اپنے اداریوں کے ذریعے زہر اُگلتے رہتے ہیں اور بدقسمتی سے اگر کسی ملک پر اغیار کا قبضہ ہو تو ایسے ایمان فروش اخبار ملک اور قوم کے لئے بدترین دشمن ثابت ہوتے ہیں۔ لیکن اس سے یہ کلیہ استخراج کرنا کہ اداریے بے معنیٰ ہو گئے ہیں بہت زیادتی ہو گی جو لوگ ان کی اہمیت سے واقف ہیں انھیں اس کا بخوبی احساس ہے کہ ذمے دار اخبار کے اداریوں اور تنقیدوں کا اثر ملکی اور قومی معاملات میں اہم سے اہم تبدیلی رونما کر سکتا ہے۔ کافی غور و خوض سے لکھے ہوئے اداریے ملکی اور قومی معاملات میں دلچسپی رکھنے والے کو ہمیشہ کوئی نہ کوئی سنجیدہ موضوع غور و فکر کے لئے مہیا کر دیتے ہیں اور عوام جن کے دماغوں میں ملکی مسایل کے مبہم اور غیر واضح نقوش ہوتے ہیں یہی اخبار کے اداریے انھیں اُجاگر کر دیتے ہیں۔ مباحث کو جب اس طرح شرح و بسط کے ساتھ مدلل طریقے سے عوام کے سامنے پیش کیا جاتا ہے تو عموماً عوام کے سامنے ایک ایسی راہ ہوتی ہے جس کے نشیب و فراز سے وہ بخوبی واقف ہوتے ہیں۔ ایسی صورت میں غلطی یا جذبات کے ہجوم کی وجہ سے جلد بازی کا بہت کم امکان ہوتا ہے

سید حامد معین الدین

متعلم بی یس سی (ابتدائی)

کنارِ آبِ گنڈی پیٹھ و گل گشت و تماشا

اگر ویٹر بیارد پیش من قابے پُر کٹلٹ　　برنگ و بوئے آں بخشم سمرقند و بخارا را

فغاں حُسن ٹمیٹو سوپ چاپ و آئرش اسٹو　　چناں بردست صبر از دل کہ ترکاں خوانِ یغما را

چہ آرائی برنگِ زعفراں رخسار بریانی　　بہ آب رنگ و خال و خط چہ حاجت روئے زیبا را

اگر کیک و کری پپ سینڈوچ داری غنیمت دل　　کنارِ آب گنڈی پیٹھ و گل گشت و تماشا را

حدیث از خوردنِ شب دیگ گو وز بخشش کم جو　　کہ کس نکشود و نکشاید بہ ٹیبل ایں معما را

اگر خواہی شوی گاما، بجز زہر روز تا بینی
کہ بر جوعِ تو افشاند فلک عقدِ ثریا را

بندۂ شکم

ہٹلر کے حربے

جنگ عظیم سے قبل جرمنی کے علمی وقار، فوجی تفوق اور صنعتی برتری نے دنیا کو کافی مرعوب کر رکھا تھا۔ خود یورپین ممالک اور ان کی نوآبادیات میں اس کو کافی رسوخ حاصل ہو چلا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ۱۹۱۴ء کی جنگ کو محدود نہ رکھا جا سکا اور اُس کو بایں وجہ عالم گیر اور فیصلہ کن کیا گیا کہ متحدہ طور پر جرمنی کے بڑھتے ہوئے خطرے کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ ہو جائے۔ یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ جنگ کے ابتدائی دو سال تک جرمنوں نے اتحادیوں کے بے پناہ لشکر کے چھکے چھڑا دیئے اور یہ ڈر پیدا ہو چلا تھا کہ مبادا اتحادی افواج کے قدم اکھڑ جائیں۔ گو جرمنی کو ہر طرف سے محصور کر لیا گیا اور اس کے تمام بیرونی ذرائع منقطع کر دیئے گئے۔ لیکن پھر بھی اتحادین پر طوفانی فوجوں کا رعب داب اس قدر طاری تھا کہ وہ اپنی قوت مدافعت پر اعتماد نہ کر سکے۔ اس فیصلہ کن موقع پر تازہ دم امریکہ کو سمجھا منا کر میدان کارزار میں اتارا گیا۔ گو یہ واقعہ اتحادین کے لئے نزول رحمت ثابت ہوا لیکن ہٹلر اچھی طرح سمجھ چکا ہے کہ اتحادین نے جنگ کس قیمت پر جیتی تھی۔ آج اس نے جرمنی کی نشاۃ ثانیہ کے لئے یہ گر اچھی طرح جان لیا ہے کہ "کسی ملک کے حق میں اس کی اصلی قوت سے کہیں زیادہ اُس کا سیاسی وقار مفید ہوتا ہے" یہی وجہ ہے کہ وہ اپنی انتہائی کوشش اس امر پر صرف کر رہا ہے کہ پھر دنیا کی نظر میں جرمنی جلد از جلد اپنی کھوئی ہوئی عظمت حاصل کر لے۔

اس مقصد کے حصول کے لئے اُس نے کئی حربے استعمال کئے ہیں۔ سب سے پہلے یہ ضروری تھا کہ ایک ایسے جرمنی کا وجود ہو جو اپنے تمام قوائے عمل کو ایک مرکز پر جمع کرلے۔ نازیت کی ترویج نے اس مقصد کو بہ درجہ اتم پورا کیا۔ آج جرمنی میں شخصی حقوق اسٹیٹ کے مفاد کے مقابلے میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے ہر جرمن اس بات پر فخر کرتا ہو کہ "اس کا وجود ریش (Reich) کے لئے ہے اور ریش اس کے لئے"۔ نازیوں کا یہی جذبۂ طاعت و اسٹیٹ پرستی ہے جس نے آج ہٹلر کو تمام جرمنی کے سیاہ و سفید کا مالک بنا دیا ہے۔ کیا بڑھے۔ کیا بچے۔ کیا مفلس کیا سرمایہ دار۔ غرض آڑے وقت میں ہر فرزند وطن بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار رہتا ہے۔

"ایک قوم، ایک ملک، ایک ریش اور ایک لیڈر" یہی نازیت کا کلمہ اور نازیوں کا ایمان ہے حقیقت یہ ہے کہ جرمنی میں مذہب کا منکر تو زندہ رہ سکتا ہے لیکن نازیت کا منکر گردن زدنی قرار پاتا ہے۔

ہٹلر کا دوسرا حربہ پان جرمانیزم ہے۔ وہ جرمن نسل کو آریائی دیوتاؤں کی منتخب اولاد سمجھتا ہے اور اُن کی ذہنی فوقیت اور نسلی برتری کے گیت گا گا کر نہ صرف جرمنی میں بسنے والے آریوں کو حلقہ بگوش کرچکا ہے بلکہ تمام یورپ کے آریا نژاد اقوام کے محافظ ہونے کا مدعی ہے۔ آریا پرچار کا یہ حربہ اتنا خطرناک نہیں معلوم ہوتا لیکن درحقیقت یہی وہ خونی آلۂ کار ہے جو آئندہ یورپ کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں نمایاں طور پر استعمال ہوگا۔ یہی وہ حربہ ہے جس نے قدیم آسٹریا کو ٹھکانے لگادیا اور زرخیز چکوسلواکیہ کو اپنا ہدف بنائے ہوئے ہے۔ ہنگری۔ رومانیہ۔ پولینڈ اور شمالی مشرقی اٹلی وہ ممالک ہیں جن کی جرمن اقلیتوں یا اکثریتوں کی وجہ سے جان کے لالے پڑے ہوئے ہیں۔ جرمن نسل کے خدائی فوجدار نے تمام "مظلوم اور منتشر" آریوں کو "آزاد اور متحد" کرنے کی قسم کھائی ہے۔

ابتدا اً یہودیت کا سوال پان جرمانیزم کی اشاعت میں سدراہ ثابت ہوا اور ہٹلر کے لئے بڑی مشکل یہ آن پڑی کہ وہ نہ تو یہودیوں سے بگاڑ کر سرمایہ دار یورپین ممالک کی مخالفت مول لے سکتا تھا اور نہ ہی ملک میں اُن کے گندے وجود کو برقرار رکھ کر نازی نظریۂ نسلیت پر کاربند ہو سکتا تھا۔ وہ اُس موقتی ملکی نقصان سے بھی بے خبر نہ تھا جو یہودیوں کے دیس نکالے میں جرمنی کو برداشت کرنا پڑتا۔ کیوں کہ قدرت کی ستم ظریفی سے دنیائے علم و فن کے بہترین یہودی دماغ جرمنی ہی کی پیداوار تھے لیکن رہ رہ کر ہٹلر کو صلح نامہ ورسائی کی نفرت انگیز صورت یاد آتی تھی جس کے انعقاد کا وہ ان یہودیوں کو کلیتہً ذمے دار سمجھتا تھا جو "ایک پردیس" کو "دیس" بنانے کی خاطر اتحادین سے ساز باز کرکے جرمنی کی ہزیمت کا باعث ہوئے

وہ اس بات سے ہمیشہ چراغ پا رہتا تھا کہ کیوں حضرت عیسیٰ کے پیرو دھن کی پوجا کرنے والی اُمت کے آگے گھٹنے ٹیک دیتے ہیں؟ بالآخر ہٹلر، برطانیہ، امریکہ، فرانس، روس اور بلقان کی موجودہ یہودیت کے اثرات کو خاطر میں لائے بغیر جرمنی کو خالص آریائی ملک بنانے پر تل گیا۔

اشتراکیت کی مخالفت تیسرا حربہ ہے جس کو ہٹلر کی جدت پسند طبیعت نے ایجاد کیا ہے۔ اس بہانے سے اُس نے یورپ کے اکثر ممالک کے غم و غصے کا رُخ پان جرمانیزم سے پھیر کر اشتراکیت کی جانب کر دیا ہے۔ ڈاکٹر نیو پولڈ (Dr. Neopold) نے سچ کہا ہے کہ "پان جرمانیزم" کی آڑ میں ہٹلر نے جرمن اور یورپ کی دیگر آریائی نسلوں کی آمریت حاصل کی ہے اور اب مخالف اشتراکی سوال پیدا کر کے وہ سہمی ہوئی تمام سرمایہ دار دنیا کی قیادت کرنا چاہتا ہے۔" آج ہم اس حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے کہ روس اور فرانس کے سوا دنیا کے اکثر و بیشتر ممالک میں نازیت اور فاشیت کے اصولوں پر ٹھنڈے دل سے غور کیا جا رہا ہے اور عام رجحان یہ پیدا ہو چلا ہے کہ اشتراکی روس برِ اعظم یورپ کی پیشانی پر کلنگ کا ٹیکہ ہے۔ خصوصاً سرمایہ دار بلا لحاظ ملک و ملت اپنی تمام ہم دردیاں ہٹلر و مسولینی کے ساتھ وابستہ کر رہے ہیں۔ کیوں کہ غریبوں کی ہم دردی، مفلسوں کی غم گساری اور انسانی برادری کی مساوات، نظری طور پر آدمیت کا کتنا ہی بلند مطمح نظر کیوں نہ ہو لیکن عملاً یہ باتیں ایک ایسا خواب ہو کر رہ گئیں ہیں جو کبھی شرمندہ تعبیر ہوتا نظر نہیں آتا۔ اسٹالن کی متجسس نگاہیں رہ رہ کر امریکہ اور یورپ کے مدبرین پر پڑتی ہیں جن کے بشروں سے وہ ہر دفعہ خلوص و محبت کا پتا لگانا چاہتا ہے لیکن اُس کو نہایت مایوسانہ انداز میں یہ نتیجہ اخذ کرنا پڑتا ہے کہ دوستی کا ہر قدم جو روس کی طرف بڑھتا ہے وہ ایثار و اخلاص سے کہیں زیادہ ناگزیر مصالح وقت کا نتیجہ ہوتا ہے۔

ہٹلر کا ایک اور خطرناک حربہ تشہیر ہے۔ بیسویں صدی میں شاید ہی کوئی ہتھیار اس سے زیادہ موثر و مہلک ہو۔ جو کام جری افواج یا سخت گیر حکمرانوں سے نہ بن پڑے وہ جاسوں اور سیاسی کارپردازوں کی ذراسی توجہ و عنایت سے پورا ہو جاتا ہے۔ ہم آسٹریا، چکوسلواکیہ اور دیگر ممالک میں نازی کارپردازوں کی ریشہ دوانیوں سے قطع نظر صرف برطانیہ عظمیٰ میں اُن کے کارناموں کو دیکھنا چاہتے ہیں۔ آج سے تقریباً پانچ سال پیشتر ہٹلر نے برطانیہ کی طرف دوبارہ دوستی و خلوص کا ہاتھ بڑھایا اور اپنا موقف صاف طور پر واضح کر دیا کہ وہ برطانیہ سے دوامی دوستی کا متمنی ہے اور مغربی یورپ کے نقشے سے بالکل مطمئن ہے لیکن برطانوی جواب سے اُس کو بہت زیادہ مایوس ہونا پڑا۔ کیوں کہ اس کو برطانیہ کے اُن قدامت پسندوں سے سابقہ پڑا جو خاطی جرمنی کے ساتھ ہم دردی رکھنا تو کجا اس کا نام لینا بھی گناہ سمجھتے تھے۔ لیکن ہٹلر نے استقلال کو

ہاتھ سے نہ جانے دیا بلکہ جہاں تک ممکن ہو سکا موقع بہ موقع برطانوی راج کے ان اصلی حکمرانوں کے کان اشتراکیت کے خلاف بھرنا شروع کئے کیوں کہ وہ بہ خوبی جانتا تھا کہ "قدامت پسندی موروثی سرمایہ داری کا دوسرا نام ہے" اور یہ کہ سرمایہ داری کی بقا کے لئے اشتراکیت کی فنا لازمی ہے۔ گو جواں مسٹر چرچل، مسٹر لائیڈ جارج اور دیگر کہنہ مشق و پختہ مغز سیاست دانوں نے ہٹلر کے اس پروپاگنڈے کی سخت مخالفت کی اور کسی غدر پر بھی جرمنی کی اس قسم کی آشتی کے جواز کو تسلیم نہ کیا لیکن ہٹلر کو بھی اپنی تبلیغ اور پرچار پر پورا پورا بھروسہ تھا۔ اسی لئے ان پختہ کار مدبروں کی مخالفت کے باوجود خود انگلستان میں آہستہ آہستہ سرمایہ داروں کا ایک ایسا ذی اثر گروہ پیدا ہوتا گیا جو اگر کسی اور وجہ سے نہ سہی تو محض ذاتی مفاد کی خاطر روس کی اشتراکی تحریک کے خلاف صف آرا ہوتا گیا۔ خوبیٔ قسمت سے اسی زمانے میں مسٹر میکڈانلڈ آنجہانی کی زیر قیادت مزدور پارٹی نے عنان حکومت ہاتھ میں لی تھی اور بقول مسٹر چرچل "حریت پسند جماعت (لبرل) اور مزدور پارٹی کے نزدیک دور اندیشی کی بجائے ابن الوقتی اور زمانہ سازی کا نام سیاست ہے"۔ یہی وجہ تھی کہ اشتراکیت کی اشاعت کے خلاف ہٹلر کے "معقول انتباہ" کو دوستانہ مشورہ تصور کیا گیا اور توازن دول کی پالیسی کو روبہ عمل لاتے ہوئے جرمنی کو دوبارہ ابھرنے کے مواقع فراہم کئے گئے۔

خواہ واقعات کچھ ہی پیش آئے ہوں لیکن آج ہم دیکھ رہے ہیں کہ پیٹر اعظم اور بسمارک نے جو خواب دیکھے تھے ان کی تعبیر ہٹلر کا دماغ دے رہا ہے۔ اگر زمانہ ساتھ دے اور پان جرمانیزم کی ہوا یورپ میں بسنے والے تمام آریاؤں کو لگ جائے تو کیا تعجب کہ دنیا کو سنہ ۱۹۱۴ء سے زیادہ اندوہ ناک فضا کا سامنا کرنا پڑے۔ کیوں کہ اب وطن پرستی جغرافی حدود سے متجاوز ہو گئی ہے۔ سیاسی جتھابندی اور نسلی تعصبات موجودہ سیاسیات میں اہم و معین شکل اختیار کرتے جا رہے ہیں۔ ڈاکٹر سید حسین پروفیسر کلفورنیا یونیورسٹی نے ایک لکچر میں یہ بالکل صحیح کہا تھا کہ "آیندہ جنگ کا دایرہ چند مخصوص ممالک کی حد تک محدود نہ رہے گا بلکہ دنیا کے مختلف سیاسی گروہ آپس میں دست و گریبان ہوں گے"۔ آجر و مزدور کی کش مکش، سرمایہ دار و مفلس کی جنگ، فاشیت و اشتراکیت کا تضاد، گوری اور رنگین اقوام کے باہمی تعصبات، ایسی چیزیں نہیں جن کو بے معنی اور معمولی سمجھ کر نظر انداز کر دیا جائے۔ خود اسپین کی زندہ مثال ہمارے سامنے ہے۔ ایک طرف جرمنی اور اٹلی، فرانکو کے پشت پناہ ہیں تو دوسری طرف برطانیہ اور فرانس، جمہورین کی دامے، درمے، سخنے مدد کر رہے ہیں۔ اسی کرہ ارض کا ایک طبقہ فرانکو مجاہد کہتا ہے تو دوسرا اس کو باغی کے لقب سے یاد کرتا ہے۔ قصہ مختصر اسپین کی خانہ جنگی فاشیت اور اشتراکیت کی ہونے والی عالم گیر خون ریزی کا پیش خیمہ ہے۔ اس امر کا قطعی تصفیہ کہ میدان کس کے ہاتھ رہے گا قبل از وقت ہے کیوں کہ فی زماننا کوئی ملک بھی اپنی

ظاہری قوت پر کامل بھروسہ نہیں کر سکتا۔ البتہ ہٹلر اور مسولینی کے بڑھتے ہوئے حوصلے اور یورپ میں اُن کے مہلک اثرات کا نفوذ، ایسے آثار ہیں جن سے یہ امر بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ اشتراکیت کی جان سخت خطرے میں ہے۔ خود برطانیہ اور روس کے تعلقات کی دو رنگی، زمانۂ حاضرہ کی ایک سیاسی بوالعجبی ہے ایشیائی نقطۂ نظر سے روسی برطانوی تعلقات کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں لیکن یورپی نقطۂ نظر سے ان کا پس منظر خوش گوار نہیں۔ مختصر یہ کہ قسمت کے دھنی ہٹلر کا ہر نیا حربہ خلاف توقع اپنا پورا پورا اثر دکھا رہا ہے اور بیسویں صدی کا مورخ اس بات پر مجبور نظر آتا ہے کہ اس عہد آفرین انسان کو مشاہیر عالم کی صف میں جگہ دے۔

محمد اسد اللہ سعید بی، ایس سی (عثمانیہ)
متعلم ال، بی (ابتدائی)

سیر کلچہ و شب دیگ

من آں نیم کہ ز شب دیگ رو بگردانم — "کہ ترکِ صحبتِ شیریں نہ کارِ فرہاد ست"

بہ معدہ تا نہ رسانم دہ شلغمِ پختہ — "نصیحتِ ہمہ عالم بہ گوشِ من باد ست"

حسد چہ می بری اے پائے بندِ ساگ ترہ — کبابِ و شلغم و نانِ روزیِ خداداد ست"

بیا بیا کہ دل و جان و معدۂ خود را — "فدا نمودنِ شب دیگ دانش و داد ست"

نصیحتے کنمت یاد گیر و در عمل آر — کہ ایں مرا ز یکے بندۂ شکم یاد ست

بکوش تا بخوری سیر کلچہ و شب دیگ

"کہ بر من و تو درِ بخشش نہ بکشاد ست"

بندۂ شکم

جدید جاپان

جاپان مشرق بعید کا نہ صرف ایک نہایت ہی کامیاب تجارتی ملک ہے بلکہ یہ ملک براعظم ایشیا میں خصوصاً اور دیگر براعظموں میں عموماً اعلیٰ شہرت، عظمت اور تمدن کا علم بردار ہے اُس ملک نے باوجود گوناگوں مصائب اور تباہ کاریوں کے ہر شعبۂ زندگی میں غیر معمولی ترقی کی ہو جس کی مثال مشکل سے کوئی ملک پیش کر سکتا ہے۔ اگر ہم جاپان کے جغرافیہ اور اُس کے محل وقوع کا مطالعہ کریں تو ہم کو معلوم ہوگا کہ یہ بیچارہ ملک کن مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ زلزلوں نے اس کو تختۂ مشق بنا رکھا ہے زلزلوں کی تباہ کاریوں کا اندازہ ذیل کے جدول سے ہو سکتا ہے۔

تاریخ و سنہ	کس حصہ ملک میں	تباہ شدہ مقامات	اموات
۳۰ دسمبر سنہ ۱۷۰۳ء	ٹوکیو	۲۰۱۶۲	۵۲۳۳
۲۸ اکتوبر سنہ ۱۷۰۷ء	شکاگو	۲۹۰۰۰	۴۹۰۰۰
۸ مارچ سنہ ۱۷۶۶ء	ہراسکی	۷۵۰۰	۱۳۳۰
۱۰ فروری سنہ ۱۷۹۲ء	ہیزن ہیگو	۱۲۰۰۰	۱۵۰۰۰
۱۷ فروری سنہ ۱۹۰۶ء	مارموسا	۵۵۵۶	۱۲۲۸

تاریخ و سنہ	کس حصہ ملک میں	تباہ شدہ مقامات	اموات
یکم ستمبر ۱۹۲۳ء	سکامی بے	۵۵۰۰۴۹	۹۱۳۴۴
۲۳ مئی ۱۹۲۳ء	ٹاجیما	۳۶۶۰	۳۸۱
۷ مارچ ۱۹۲۷ء	ٹانگو	۷۳۶۷	۲۹۰۰

زلزلوں کے علاوہ دوسری تباہی کا باعث لمبی پہاڑ ہیں جو مشرق سے مغرب تک اپنا حصار باندھے ہوئے ہیں. ان میں سے اکثر پہاڑ آتش فشاں ہیں۔ ان پہاڑوں کی وجہ سے زمین زرخیز نہیں ہے پورے ملک کا ⅛ حصہ بھی زراعت کے قابل نہیں. فوجی سب سے بڑا اور بلند پہاڑ ہے اس کی بلند ترین چوٹی (۱۲۰۳۹۵) فٹ سطح آب سے بلند ہے۔

(۲) نا بی کورا (۳) ٹاٹی یاما (۴) شرا سان (۷۲۲۴) فٹ بلند (۵) نان ٹے سان (۹۱۶۹) فٹ بلند ہے۔

سب سے بڑا آتش فشاں شمال آکٹیا فوجی (Akitafuji) ہے ان پہاڑوں سے زراعت کو بہت بڑا نقصان پہونچا۔

تیسری چیز باعث خطر وہاں تیز رفتار ندیاں ہیں جن میں کشتی رانی ناممکن ہے اس لیے تجارت اور ذرائع حمل ونقل پر بہت دشواریاں پیش آتی ہیں۔

بڑی ندیاں۔ (۱) ایشی کاری (۲) ٹیشیو (۳) ٹوکاچی (۴) ٹون (۵) کیسو وغیرہ ہیں جو پہاڑوں سے نکلتی ہیں. اور بہت زیادہ تیز رفتاری سے بہتی ہیں۔ ایسی تیز رفتار ندیوں سے ملک کو بجائے فائدے کے نقصان پہونچتا ہے. غرض متواتر زلزلوں کی تباہ کاری پہاڑوں کی آتش فشانی، آب وہوا کی خرابی، سمندروں اور دریاؤں کی طغیانی، چین اور روس سے آئے دن کی جنگ، مختلف قسم کے زہریلے حشرات الارض کی ایذا رسانی بے چارے جاپانیوں کو سکون واطمینان کی سانس لینے نہیں دیتیں. لیکن ان تمام مصائب وحوادث سے دوچار ہونے کے باوجود ہم کو یہ دیکھ کر نہایت مسرت ہوتی ہے کہ وہ اپنی تجارتی وصنعتی سرگرمیوں میں ہمہ تن مصروف ہیں اور صرف صنعت وحرفت اور تجارت ہی میں نہیں بلکہ ہر شعبۂ زندگی میں پیش پیش نظر آتے ہیں. جاپانیوں نے محنت وجفاکشی سے اپنی فطرت کو ان تمام مصائب کو برداشت کرنے کا عادی بنا لیا ہے ہر مشکل سے مشکل کام ان کو آسان معلوم ہوتا ہے. کسی ملک کی معاشی ترقی اور تمدنی ارتقا معلوم کرنے سے پہلے ہم کو اس کی مختصر تاریخ سے واقفیت کی ضرورت ہوتی ہے اس لئے اب ہم جاپان کی تاریخ پر ایک طائرانہ نظر ڈالیں گے۔

جاپان کی تاریخ کو ہم جدا جدا دو دور میں تقسیم کرسکتے ہیں (١) پہلا دور ابتدائی زمانے سے مغربی تمدن کے آغاز تک یعنی سولہویں صدی تک (٢) دوسرا دور عبوری (Transition) سے دور احیاء (Restoration) تک (١٨٦٨ء) (٣) ١٨٦٨ء سے موجودہ زمانے تک جاپانیوں کا صحیح شجرہ معلوم کرنا بہت مشکل ہے اور نہ اب تک کسی تاریخ میں اس امر کا مکمل مواد حاصل ہوا ہے۔ البتہ یہ ضرور مسلمہ امر ہے کہ جاپانیوں کی ابتدا ان قوموں سے ہوئی جنھوں نے اوائل زمانہ میں جاپان پر متواتر حملے کئے پہلے اینو ( ) قوم شمال کی جانب سے داخل ہوئی اور جاپان پر اپنا تسلط کیا یہ قوم شکل و شباہت میں انگریزوں سے بہت مشابہ ہے۔ اس کے افراد آج کل بھی (Yezo) جزیرے میں موجود ہیں اس کے بعد کوریا منچوریا منگولیا چین خاص کے باشندے آکر یہاں آباد ہوئے جاپانی درحقیقت چینی باشندے ہیں۔ جو شدت موسم کی وجہ سے جاپان میں آکر آباد ہوئے اور اپنا نام بدل کر جاپانی رکھا۔ جاپان چھوٹی چھوٹی سلطنتوں میں منقسم ہوگیا۔ جہاں مختلف خاندان حکومت کرتے تھے ان خاندانوں میں سے ایک شخص جمو لیڈر نے ایک زبردست جنگ کا اعلان کردیا اور سب خاندانوں کو شکست فاش دے کر اپنا صدر مقام "الاسکا" بنایا اور ایک علیحدہ سلطنت قایم کی۔

سلطنت جاپان کی تاریخ ٦٦٠ ق م سے شروع ہوتی ہے اور وہاں کے شہنشاہ اپنے کو جیمو ٹنو (Jimmu Tenno) کا جانشین تصور کرتے ہیں۔ جیمو ٹنو سلطنت جاپان کا بانی ہے۔ ١٢ صدی سے ١٩ صدی تک اسیر شوگنیں (Shoguns) کی حکومت رہی اس کے بعد ١٨٦٨ء میں ایک خانہ جنگی کے ذریعے شہنشاہ نے اپنے اختیارات حاصل کئے اور ایک دوسرے دور کا آغاز ہوا۔ اس دور میں جاپان نے بہت ترقی کی ١٨٩٤ء میں چین و جاپان کی جنگ ہوئی جس میں جاپان کو فتح حاصل ہوئی ١٩٠٤ء میں جاپان نے روس کو شکست دی۔ ابتدائی شہنشاہوں نے بڑی دانش مندی سے حکومت کی ان میں سے بعض اپنی اعلیٰ قابلیت حکومت کی وجہ سے قابل ذکر ہیں مثلاً یوروگو جس نے ٤٥٧ء سے ٤٧٩ء تک حکومت کی میوری تسو (Muritsuru) کا زمانہ حکومت ٤٩٩ء تا ٥٠٦ء رہا۔

اس زمانے میں اعلیٰ عہدے صرف شاہی خاندان کے لئے وقف تھے رعایا بہت ذلیل سمجھی جاتی تھی تھوڑے عرصے کے بعد رعایا اس طرز عمل سے بددل ہوگئی اور بغاوت کے آثار ظاہر ہونے لگے۔ چنانچہ چھ صدی عیسوی میں شہنشاہ کی قوت میں انحطاط شروع ہوا۔ اور ایک نئے فرقے نے شاہی حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کرکے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی۔ (٦٣٢ء سے ٦٤٥ء) تک اس خاندان نے حکومت کی جس کو (Soga) کے نام سے یاد کرتے ہیں۔ خاندان ساگا کا

دورِ حکومت تاریخ جاپان میں یادگار رہے گا۔ کیوں کہ اس دور میں جاپانیوں نے بدھ مت کی تقلید شروع کی۔ جزیرہ نما کوریا میں ایک چھوٹی سلطنت پیکچی (Paikchea) ہے جس نے بدھ مت کی تبلیغ جاپانیوں میں شروع کی چونکہ سلطنت پیکچی کی قومی قوت بہت کم زور تھی اس لیے شہنشاہ جاپان سے اس نے درخواست کی کہ وہ اس کی مدد کرے اور تحفتاً بدھ کی تصویریں کچھ بت اور بدھ مت کی مقدس مذہبی کتابیں روانہ کیں۔ دو سال بعد پیکچی سلطنت نے اپنے ہاں کے راہب جاپان روانہ کئے اور انھوں نے بدھ مذہب کی تبلیغ شروع کی۔ اس لئے مذہب نے بہت جلد ہر دل عزیزی حاصل کر لی۔ شاہی خاندان کے تمام افراد بدھ کی پرستش کرنے لگے۔ اس طرح یہاں بدھ مت کا رواج ہوا۔ اس سے پہلے جاپانی شینٹو مذہب کے پیرو تھے۔

ساگا خاندان کا ۶۴۵ء میں خاتمہ ہو گیا۔ اس حکومت نے شاہی خاندان کی بنیاد ڈالی اور جاپان کی تاریخ میں ایک انقلاب عظیم پیدا کیا۔ ملک کی تنظیم جدید کی قانون کا نفاذ بہت سختی سے کیا گیا۔ دستور (Taikwa) ۶۴۶ء اور (Taiho) ۷۰۲ء کی بنا پر تمام زمینات حکومت کے تحت لائی گئیں اور حکومت نے کسانوں کو مقررہ ٹیکس یا لگان کے ذریعہ زمینات کی کاشت کرنے کی عام اجازت دے دی ملک کو مختلف صوبوں میں تقسیم کیا گیا گورنر اور دیگر عہدے دار انتظام کے لئے مقرر کئے گئے چین کی طرح ایک ایوان اعلیٰ اور آٹھ مجالس کی تشکیل ہوئی۔ نارا (Nara) کو دار السلطنت بنایا گیا جہاں شہنشاہ جاپان کا مستقل قیام رہتا تھا ۱۸۶۸ء تک یہ مقام شہنشاہ جاپان کا دار الخلافہ رہا۔

۱۵۹۳ء میں اسپین نے لگاسپی کی قیادت میں (Manila) کو حاصل کیا اور وہاں سے ایک سفیر جاپان روانہ کیا۔ اور اس طرح جاپانیوں سے تعلقات قایم کرنا شروع کئے۔ ۱۶۰۹ء میں ڈنمارک نے تجارتی تعلقات جاپان سے پیدا کئے ۱۶۱۳ء میں انگریز سرزمین جاپان پر نظر آئے ۱۸۹۴ء میں چین اور جاپان کی جنگ ہوئی جس میں جاپان کو کامل فتح حاصل ہوئی ۱۹۰۴ء میں جاپان نے روس کو شکست دی۔ ۱۹۳۱ء میں مسئلہ منچوریا کا آغاز ہوا اور ۱۹۳۲ء میں جاپان کی زیر سرپرستی منچوریا کو خود مختار سلطنت تسلیم کر لیا گیا۔ ۱۹۳۳ء میں دوبارہ جنگ کا آغاز ہوا اور جاپان نے منچوریا کے تصفیے کو رد کر دیا اور اس سے مستعفی ہو گیا ۱۹۳۵ء میں جاپان نے اپنے استحکامات شمالی چین میں شروع کئے اور نومبر میں جاپانی فوج نے پیکن پر قبضہ کر لیا۔ جنوری ۱۹۳۶ء میں جب جاپان نے اپنے کو امریکہ اور برطانیہ کے مماثل تسلیم کرا لیا اس وقت بحری بیڑے سے دست برداری حاصل کی ۱۹۳۷ء میں چین و جاپان کی آویزش کے حالات پر کچھ لکھنا تحصیل حاصل ہے۔ ہر اخبار پڑھنے والا ان سے بخوبی واقف ہے۔

تاریخ جاپان کے چند اہم سنین: ۶۶۰ء ق م۔ بدھ مت کی ابتدا ۵۴۲ء۔ پرتگالیوں کی جاپان میں آمد ۱۸۵۴ء

امریکہ و برطانیہ سے تجارتی معاہدہ ۱۹۰۴ء روسی جاپانی جنگ ۱۹۱۲ء میں انتقال شہنشاہ (Mutsuhito) ۱۲ اگست ۱۹۱۴ء جاپان و جرمنی کی جنگ ۱۹۱۹ء میں جاپان مجلس اقوام کا ممبر ہوتا ہے ۱۹۲۳ء زبردست تباہ کن زلزلہ ۱۹۲۵ء (Manhood Sufferage act) ۱۹۲۶ء انتقال شہنشاہ (Yushi hito) اور تخت نشینی شہنشاہ (Hiro hito) ۱۹۳۱-۳۲ء منچوریا اور جاپان کی جنگ اور صلح ۱۹۳۳ء جاپان مجلس اقوام سے خارج ہو جاتا ہے۔

آب و ہوا:۔ جاپان بہت سرد ملک ہے یہاں تین مرطوب موسم ہوتے ہیں :۔ (۱) وسط اپریل سے اوایل مئی تک (۲) وسط جون سے اوایل جولائی تک (۳) اوایل ستمبر سے اوایل اکتوبر تک۔ ستمبر میں کثرت سے بارش ہوتی ہے۔ جاپان کے مشرقی اضلاع پر اور خصوصاً مغربی ساحل پر شدت کی برف باری ہوتی ہے۔ موسم سخت تکلیف دہ رہتا ہے مجموعی طور پر آب و ہوا بہت مرطوب و سرد ہے سالانہ بارش کا اوسط (۱۵۰۰) ملی میٹر ہے سال میں ۱۵۰ دن بارش اور برف باری کے ہوتے ہیں اور ۲۱۵ دن دھوپ اور معمولی گرمی رہتی ہے۔ جاپان سخت طوفان و طغیانیوں کا شکار رہتا ہے۔ یہاں کی آب و ہوا صنعت و حرفت کے لئے بہت موزوں ہے اس لئے جس قدر صنعت و حرفت کو یہاں فروغ حاصل ہو سکتا ہے اور ہے اس کی مثال مشکل سے کسی دوسرے ملک میں ملے گی۔ کسی ملک کی ترقی کا انحصار بڑی حد تک اس کی آب و ہوا پر ہوا کرتا ہے ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ جن ممالک کی آب و ہوا اچھی ہوتی ہے وہ کس قدر برق رفتاری سے منازل ترقی طے کرکے بام رفعت پر پہنچ جاتے ہیں مثلاً انگلستان کو لے لیجئے جس کے سر پر ترقی اعلیٰ تمدن، دولت، تجارت علم و عمل، ہمت اور شجاعت کا تاج جگمگا رہا ہے۔ اس کی کیا وجہ ہے۔ یقیناً یہ سب آب و ہوا کا کرشمہ ہے۔

انگلستان کی آب و ہوا کا مقابلہ جاپان سے کیجئے تو معلوم ہوگا کہ کس قدر زیادہ فرق دونوں میں پایا جاتا ہے انگلستان میں طوفانی زلزلے نہیں آتے اگر آتے بھی ہیں تو بہت کم آب و ہوا زیادہ خوش گوار رہتی ہے۔ جاپان کی آب و ہوا سخت مرطوب اور سرد رہتی ہے۔ ان حالات کے پیش نظر جاپان کی ترقی قابل صد ستائش ہے۔ اب آب و ہوا کے اثرات ملاحظہ ہوں۔ ہندوستان کو لیجئے۔ بے چارے ہندوستانی ہر طرح مجبور ہیں یہاں کے تینوں موسم بہت تکلیف دہ اور خراب ہیں موسم گرما میں وہ شدت کی گرمی پڑتی ہے کہ معاذ اللہ انسان نیم پاگل تو ضرور ہو جاتا ہے۔ کسی قسم کا کوئی کام نہیں کر سکتا۔ موسم سرما میں نہایت تکلیف دہ سردی پڑتی ہے۔ برسات میں بارش شروع ہوئی تو ہفتوں ہو رہی ہے لوگ اپنے اپنے گھروں سے نہیں نکل سکتے۔ بھلا فرمایئے اس ملک کے باشندے کیا ترقی کر سکتے ہیں جہاں ایسے تکلیف دہ موسم ہوں۔

پیداوار:۔ پیداوار کا انحصار عمدہ اور زرخیز زمین پر ہے۔ زمین زرخیز اس وقت ہوسکتی ہے جب وہ پہاڑی علاقوں سے دور اور تیز رفتار ندیوں کی زیر مشق نہ ہو۔ پانی اور کھاد حسب ضرورت موجود ہو لیکن جاپان زیادہ تر پہاڑی علاقوں پر مشتمل ہے۔ مشرق سے مغرب تک پہاڑوں سے گھرا ہوا ہے اس لئے بہت کم زمین زرخیز ہے پورے ملک کا ⅙ حصہ بھی زراعت کے قابل نہیں۔ پیداوار میں گیہوں رائی کئی۔ تمباکو اور خاص طور پر چائے قابل ذکر ہے۔ جاپان میں چائے بہت کثرت سے پیدا ہوتی ہے (چین و جاپان کی زمین خاص طور پر اس کے لئے بہت موزوں ہے) یہاں کے باشندے پانی کی جگہ چائے پیتے ہیں کھانا کھانے کے بعد جیسے ہم پانی پیتے ہیں ویسے ہی جاپانی چائے پیتے ہیں ۴۴ فی صدی آبادی کاشت کار ہے۔ کسان شہتوت کے درخت بھی اپنے کھیتوں میں لگاتے ہیں اور ان پر ریشمی کیڑوں کی پرورش کرتے ہیں۔ جاپان میں چاول کی بہت عمدہ کاشت ہوتی ہے فی ایکڑ ۲۳۵۰ پونڈ چاول اوسط پیدا ہوتا ہے۔ زراعت میں عورت، مرد، بچے سبھی کام کرتے ہیں۔ کاشت کار طبقے کی اوسط آمدنی روزانہ ۵۴ نیس ہے۔ جاپان میں ین کا چلن ہے جو ایک روپیے کے مساوی ہے۔ مرد = ۵۰ پنس۔ عورت = ۳۰ پنس۔ بچہ = ۱۵ پنس روزانہ کماتے ہیں۔ اس طرح زراعت پیشہ لوگوں کی سالانہ آمدنی ۰۰۰ ملین ہوجاتی ہے جاپان میں ممالک غیر سے روئی ٹین اور ربڑ آتا ہے۔ روئی ہندوستان سے ٹین اور ربڑ ملایا سے منگایا جاتا ہے۔ جاپان کی آبادی بہت زیادہ بڑھ رہی ہے۔ اس لئے غیر آباد زمین بہت کم ہے پورے ملک میں (۵۰۰۰۰۰۰) ایکڑ زمین ایسی ہے جو آباد نہیں ہے۔ اس میں سے صرف (۱۷۰۰۰۰۰) ایکڑ قابل زراعت ہے جاپان کی ناموافق آب و ہوا نے وہاں کی پیداوار کو بہت سخت نقصان پہونچایا ہے ورنہ آج جاپان دنیا کا بہترین زراعتی ملک ہوتا۔ ان تمام مشکلات اور قدرتی رکاوٹوں کے باوجود جاپان میدان زراعت میں بھی کسی ملک سے پیچھے نہیں۔

تجارت و صنعت و حرفت:۔ زراعتی ملک کے مقابلے میں تجارتی و صنعتی ممالک بہت جلد ترقی کرجاتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ زراعت میں کسان بے چارے شب روز کاشت کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں اور اس کے باوجود بہت کم فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ تجارت میں قلیل محنت میں کثیر فائدہ ہوسکتا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ تجارتی ممالک بہت خوش حال اور ترقی پذیر ہیں۔ برطانیہ امریکہ اور جاپان کی ترقی کی وجہ یہی ہے کہ یہ تینوں ممالک تجارتی ہیں۔ تجارت و صنعت و حرفت کا دارومدار ملک کے محل وقوع پر ہوتا ہے۔ جاپان کے لئے بحرالکاہل اسی قدر مفید ہے۔ جس قدر بحر اوقیانوس برطانیہ کے لئے لیکن معدنیات اور اشیائے خام کی کمی جاپان کی ترقی میں حائل ہے۔ روئی۔ لوہا۔ فولاد۔ ٹین اور کوئلہ اس مقدار

میں نہیں پیدا ہوتا جتنی کہ جاپان کو ضرورت ہے۔ لوہے کی برآمد ۸۰ ملین ٹن ہے جس میں سے نصف یعنی ۴۰ ملین ٹن اصلی لوہا برآمد ہوتا ہے۔ کوئلہ لوہے سے زیادہ نکلتا ہے لیکن بالکل معمولی قسم کا جس سے ملک کو کوئی فایدہ نہیں۔ اس لئے لوہے اور فولاد کی تجارت میں ہمیشہ جاپان کو نقصان ہوتا ہے صرف سنہ ۱۹۱۵ء و سنہ ۱۹۲۰ء کے سنین تاریخ جاپان میں ایسے ہیں جن میں جاپان کو لوہے اور فولاد کے کاروبار میں کافی فائدہ ہوا۔ جاپان کی تجارت کو ہم تین حصوں میں تقسیم کرسکتے ہیں۔

(۱) ریشمی کپڑوں کی تجارت (۲) سوتی کپڑوں کی تجارت (۳) جہازسازی و آہنی اشیاء کی تیاری خام ریشم کی برآمد بندرگاہ یوکاہامان سے ہوتی ہے۔ جاپان میں ریشم ہی کی سب سے زیادہ تجارت ہوتی ہے سنہ ۱۹۳۰ء میں جاپان نے (۲۲۹۳۵۸۹۶۴۱) ین کا ریشم باہر بھیجا جس میں خام ریشم (۳۰۷۱۸۵۴۷) ین کا تھا۔ سوتی تجارت کا نمبر ریشم کے بعد ہے۔ آج کل سوت کی تجارت میں جاپان لنکا شائر کا مقابلہ کررہا ہے۔ خام سوت کا استعمال جاپان میں برطانیہ سے زیادہ ہے سوت کی تجارتی منڈی اوکاسا میں ہے یہ شہر تجارت کے اعتبار اور سوتی کاروبار کے لحاظ سے مینچسٹر کا ہم پلہ ہے اوساکا سے ۲۰ میل کے فاصلے پر بندرگاہ کوبے ہے جہاں سے خام سوت کی درآمد ہوئی ہے یہ جاپان کا سب سے بڑی تجارتی بندرگاہ ہے اور مشرق بعید میں سب سے بڑی بندرگاہوں میں اس کا شمار کیا جاتا ہے۔ جاپان کی بحری تجارت کا نمبر دنیا میں تیسرا خیال کیا جاتا ہے سنہ ۱۹۱۴ء میں متواتر چین اور روس کی جنگوں کی وجہ سے جاپان کی تجارت کو بہت نقصان پہونچا اور ایک طریقے سے جاپان دیوالیہ ہوگیا (Mr. Junnosuke Inouye) جو جاپان کے بنک کے صدر اور صدرالمہام فینانس تھے۔ اپنی ایک کتاب میں تحریر کرتے ہیں "جنگ عظیم نے جاپان کے مالیات پر ایک محیرالعقول اثر ڈالا ہے سنہ ۱۹۱۴ء میں جاپان کے بحری معاہدات (۱۹۰۰۰۰۰۰۰) ین اور سونے اور بیرونی ممالک میں جو اس کا قرضہ لگا ہوا تھا۔ اس کی قیمت (۸۱۰۰۰۰۰۰۰) ین تھا سنہ ۱۹۲۰ء میں بیرونی ممالک پر قرض (۱۶۰۰۰۰۰۰۰۰) ین اور جائداد (۴۰۰۰۰۰۰۰۰۰) ین کی تھی۔ لیکن سنہ ۱۹۲۲ء میں (۵۷۰۰۰۰۰۰۰) ین سونے کا نقصان ہوا۔ اور اس جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کے بعد ہی یکم ستمبر سنہ ۱۹۲۳ء کے زلزلے نے جو کچھ ساکھ باقی رہی تھی اس کا بھی خاتمہ کردیا علاوہ لاتعداد جانی نقصان کے دس ہزار ملین ین کا مالی نقصان ہوا" ان بھاری نقصانوں کی تلافی کوئی معمولی چیز نہیں تھی لیکن یہ جاپانیوں ہی کی بلند ہمتی تھی کہ انھوں نے قلیل مدت میں اس نقصان کا تکملہ کردیا اور راہ ترقی پر گام زن ہوگئے سنہ ۱۹۳۰ء یا سنہ ۱۹۳۱ء کی عالم گیر اقتصادی کساد بازاری سے جاپان محفوظ رہا۔ اب ہم یہ دیکھیں گے کہ جاپان صنعت و حرفت و تجارت کے فروغ

کے کیا وجوہ ہیں سب سے پہلے ہم کو یہ معلوم کرنا ہے کہ تجارت صنعت وحرفت کی عمارت تعمیر کرنے کے لئے کون سے عناصر مہیا کرنا ضروری ہوتے ہیں۔

(۱) موزوں آب وہوا (۲) ذرائع حمل ونقل (۳) پیغام رسانی کی سہولتیں (۴) وہا۔ کوئلہ اور خام اشیاء کی برآمد یہی وہ چار ستون ہیں جن پر صنعت وحرفت اور تجارت کی عمارت کھڑی کی جا سکتی ہے۔ اب ان چار عناصر کے پیش نظر جاپان کی صنعت وحرفت اور تجارت کا مطالعہ کرنا چاہئے (۱) آب وہوا کو لیجئے جو صنعت وحرفت اور تجارت کے لئے بہت موزوں ہے (۲) ذرائع حمل ونقل وآمد ورفت کی بہتر سے بہتر سہولتیں موجود ہیں عمدہ سے عمدہ سواری بہت ارزاں کرایے پر مل جاتی ہے خصوصاً یہاں کے کرایے دوسرے ممالک سے بہت ارزاں ہیں مثلاً جاپان سے ہندوستان تک ایک ٹن کپڑے کا کرایہ ۱۲؎ ہوتا ہے ٹوکیو سے کوبے تک فی من ۶ ر ۳ ر کلدار ریل کا کرایہ پڑتا ہے۔ پٹرول بہت ارزاں ہے۔ ۵۰ ۳ سنٹ فی گیلن (یعنی تقریباً ۱/۲ ۲ آنے) اس لئے موٹر کا کرایہ بہت سستا ہے۔ پیغام رسانی کا بہت عمدہ انتظام ہے۔ محصول ڈاک بھی بہت کم ہو یعنی سوا پیسے میں ایک لفافہ ملتا ہے۔ تار ٹیلی فون ہر جگہ موجود ہیں چھوٹے سے چھوٹے گاؤں میں بھی ٹیلی فون اور تار کا انتظام ہے۔ تار کا ایک لفظ سوا دو پیسے میں جاتا ہے۔ برقی قوت بہت عام ہے۔ تمام کارخانے بجلی سے چلتے ہیں (۴) خام اشیاء میں تیل، کوئلہ اور لوہا بہت ارزاں ہے۔ کوئلہ فی ٹن ۱/۲ ۶ روپے۔ تیل فی ٹن ۱۲؎ یہ سب سہولتیں جاپان کو خاطر خواہ حاصل ہیں اس کے علاوہ ملک مجموعی طور پر صنعت وحرفت کی طرف راغب اور ترقی کے لئے کوشاں ہے۔ حکومت جاپان تجارت کے فروغ کے لئے انتہائی اور ممکنہ کوشش کرتی ہے۔ جاپان کے کارخانے لکڑی کے بنے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس میں ہزاروں لاکھوں مرد عورت کام کرتے ہیں۔ زیادہ تر طبقہ اناث ان کارخانوں میں ملازم ہوتا ہے ڈاکٹر جمس اے۔ بی شیپر نے ایک جگہ لکھا ہے "جہاں تک محنت کا تعلق ہے جاپان کے صنعتی انقلاب کا سب سے بڑا سبب عورتیں ہیں" پندرہ سولہ سال کی عمر میں عام طور پر لڑکیاں مدرسے کی تعلیم سے فراغت حاصل کر لیتی ہیں۔ اور کارخانوں میں ملازم ہو جاتی ہیں جہاں وہ ۸، ۱۰ سال گزار دیتی ہیں۔ ان کارخانوں کی طرف سے لڑکیوں کے لئے خورونوش۔ رہائش اور ملبوسات کا انتظام ہوتا ہی یہ بے چاری جفاکش لڑکیاں دس بارہ گھنٹے روزانہ اپنا مفوضہ کام بہت دلچسپی ومحنت سے انجام دیتی ہیں۔ اس طرح ۸، ۱۰ سال اپنی عمر کا بیش قیمت حصہ ملک وقوم کی خدمت گذاری میں صرف کر دیتی ہیں اُن کی محنت کے مقابلے میں یومیہ اُجرت بہت کم ہوتی ہے کم سے کم ۵ ر کلدار اور زیادہ سے زیادہ ۸ ر یومیہ مزدوری ہوتی ہے۔ ۲۳ یا ۲۴ سال کی عمر میں اُن کی شادی ہو جاتی

اور وہ اس کارخانے کو چھوڑ کر کارخانہ زندگی میں قدم رکھتی ہیں۔ جاپان کے کارخانوں میں ایک خاص بات یہ ہے کہ منیجر، مالک اور سب کے سب بلا امتیاز حاکم و محکوم کام کرتے ہیں۔ البتہ ماہر کار اور انجینیروں کی تنخواہ عام مزدوروں سے زیادہ ہوتی ہے اُن کو سوا سو یا ڈیڑھ سو ین ماہوار ملتے ہیں۔ کارخانوں میں سوت کاتنے اور کپڑا بننے کا کام ایک ہی جگہ ہوتا ہے۔ اس طرح کپڑا بہت جلد سہولت سے تیار ہو جاتا ہے۔ جب تھان تیار ہو جاتے ہیں تو علیحدہ گودام میں اُن کو رکھا جاتا ہے۔ باہر کی صنعت کے مقابلے کے لئے ایک کمیٹی قایم ہے جس کے انسپکٹر تیار شدہ ایک ایک کپڑے کو بذات خود معائنہ کرتے اور گھٹیا مال کو نکال دیتے ہیں جو مال باہر بھیجا جاتا ہے اُن کی قیمتیں دونی ہوتی ہیں جو بہ مقابلہ اس مال کے جو جاپان میں فروخت ہوتا ہے لیکن اس کے باوجود دوسرے ممالک کے اشیاء برآمد سے ہمیشہ ارزاں ہوتا ہے جو مال کہ برآمد کے لئے ہوتا ہے، اُس کو اس کارخانے کے ایجنٹ کے پاس روانہ کر دیا جاتا ہے وہ سوداگروں سے قیمت کا تصفیہ کر لیتا ہے یہ سوداگر اپنے پاس ہر قسم کا مال جمع کر کے ممالک غیر کو بھیجتے ہیں۔ یہ ۵ فی صدی کمیشن پر کپڑا لیتے ہیں۔ ہر شہر اور قصبے میں بڑے بڑے کارخانے موجود ہیں۔ ان کارخانوں کے علاوہ گھروں میں ریشم کا کپڑا بننے اور ریشم کے کارخانے قایم کرتے ہیں۔ ایسی گھریلو صنعت کا بہت زیادہ رواج ہے۔ ہر گھر میں ایک مختصر سا کارخانہ ہوتا ہے ان کارخانوں میں مشین کے چھوٹے چھوٹے پُرزے ہمہ قسم کی چیزیں تیار ہوتی ہیں یہ لوگ خام اشیاء بازار سے خریدتے اور اپنے گھر کے کارخانے میں اس سے مختلف قسم کی چیزیں تیار کرتے ہیں یہاں کا کوئی شخص بے کار نہیں رہتا یہی وجہ ہے کہ آج جاپان تجارت کا مرکز بنا ہوا ہے۔ چھوٹے سے چھوٹے خاندان میں گھریلو صنعت کا بہت زیادہ رواج ہے ہر گھر میں ریشمی کرگے موجود ہیں ان کرگوں سے لڑکیاں عموماً اپنے روزانہ استعمال کے لئے کپڑا بن لیتی ہیں۔ اس طرح بہت سا روپیہ جو کپڑا خریدنے میں صرف ہوتا ہے بچ جاتا ہے۔

جاپان نے میدان تجارت میں جس برق رفتاری سے ترقی کی وہ ذیل کے جدول سے ظاہر ہے۔

(مال برآمد)

سنہ	مصنوعہ سامان	نیم ساختہ سامان	سامان خام	اشیاء خور و نوش	مجموعی دوسری چیزیں
سنہ ۱۹۲۱ء	۵۴۰۱۳ لاکھ	۶۷۰۴۳ لاکھ	۸۰۵۵ لاکھ	۸۰۹۳ لاکھ	۱۴۵۰۸۲
سنہ ۱۹۲۸ء	۶۷۰۷۵ لاکھ	۶۸۰۶۴ لاکھ	۷۰۳۸ لاکھ	۱۳۰۵۲ لاکھ	۱۶۴۰۳۳

سنہ	مکمل تیاریاں	نیم ساختہ سامان	سامان خام	اشیاء خورد و نوش	مجموعی دوسری چیزیں
سنہ ۱۹۲۹ء	۷۸.۱۱ لاکھ	۷۳.۶۵ لاکھ	۷.۴۵ لاکھ	۱۳.۳۴ لاکھ	۱۷۹.۵۵
سنہ ۱۹۳۰ء	۵۷.۶۵ لاکھ	۴۳.۶۸ "	۵.۳۸ "	۱۵.۷۴ "	۱۲۲۰.۴۹
سنہ ۱۹۳۱ء	۴۴.۴۱ "	۳۵.۲۴ "	۳.۷۳ "	۵.۵۳ "	۹۵.۵۸
سنہ ۱۹۳۲ء	۵۸.۳۸ "	۴۵.۵۲ "	۴.۲۶	۸.۶۹ "	۱۱۷.۵۵
سنہ ۱۹۳۳ء	۸۵.۹۷ "	۴۴.۹۵ "	۶.۱۵	۱۳.۱۷	۱۵۵.۵۹
سنہ ۱۹۳۴ء	۱۱۲.۱۳ "	۴۱.۵۴	۷.۹۸	۱۴.۳۳	۹۸۵.۹۹

جاپان میں صنعت و حرفت سے ہر چھوٹے بڑے کو خاص شغف ہے۔

عام طرز معاشرت و معیار زندگی

جاپانیوں کی زندگی کا نصب العین سادہ زندگی اور بلند خیالی ہے۔ عام طرز معاشرت و معیار زندگی کا اثر ملک کی ترقی پر نامعلوم طریقے پر مترتب ہوتا رہتا ہے ہر شخص یہ خیال کرتا ہے کہ اگر وہ اپنی زندگی فضول خرچی اور بے پروائی سے بسر کرے گا تو اس کا اثر ملک پر نہایت برا پڑے گا۔ جاپان کی طرز معاشرت نے ہی ملک کی تعمیر میں بہت نمایاں حصہ لیا ہے۔ سادہ زندگی اعلیٰ و درخشاں مستقبل کی ضامن ہوتی ہے بہترین معاشرت کی صفت یہ ہے کہ وہ کم خرچ، سادہ اور انسان کے ہر شعبۂ زندگی میں ممد و معاون ہو۔ معاشرت بادی النظر میں معمولی اور غیر اہم چیز معلوم ہوتی ہے لیکن یہی معاشرت انسان کی دماغی، جسمانی، مذہبی، سیاسی اور علمی ترقی پر اثر انداز ہوتی ہے۔ جاپان میں اسی روپیے ماہوار کی آمدنی والا شخص مع اپنے خاندان کے (جس میں ۸، ۹ افراد شامل ہوں) عزت و خوش حالی کے ساتھ زندگی بسر کر سکتا ہے۔

جاپان میں کھانے کا خرچ بہت کم ہے ایک خاندان کے ۸، ۹ افراد کا ماہوار خرچ ۲۵ روپیے ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جاپانی گوشت اور دودھ بہت کم استعمال کرتے ہیں۔ اُن کی غذا چاول مچھلی ہوتی ہے گھی بہت کم کھاتے ہیں سالن اور مچھلی میں برائے نام گھی ہوتا ہے۔ انڈا بہت عمدہ غذا تصور کی جاتی ہے جاپانی ترکاریاں، اچار، مربہ وغیرہ بڑے شوق سے کھاتے ہیں۔ سمندر قریب ہونے کی وجہ سے مچھلی بہت سستی ملتی ہے۔ مچھلی سے طرح طرح کی چیزیں تیار کرنے

ہیں۔ سیپیوں کا شوربا جاپانیوں کی بہت عمدہ غذا ہے۔ سیپیوں کا کھانا جاپان نے رائج کیا اب یورپ میں بھی اس کا رواج ہو چلا ہے۔ جاپانیوں کے مکانوں میں کوئلے کا بہت خرچ ہے کیوں کہ ہر وقت کوئلہ جلتا رہتا ہے تاکہ سردی کی اذیت سے محفوظ رہیں اور پانی ہر وقت گرم ہوتا رہتا ہے۔ جب کوئی مہمان آتا ہے تو فوراً چائے سے اُس کی خاطر کی جاتی ہے کپڑوں کی دُھلائی کا خرچ بہت کم ہوتا ہے کیوں کہ گھر میں عورتیں کپڑے دھو لیتی ہیں اور خود استری بھی کر لیتی ہیں۔ البتہ مردوں کے گرم سوٹ دھوبی کے یہاں جاتے ہیں۔ دھلوائی بہت کم ہوتی ہے ۱۰/۱۲ ر ماہوار پورے خاندان کے لئے دیئے جاتے ہیں رہنے کے مکانات لکڑی کے بنے ہوئے دو منزلہ ہوتے ہیں اور اس پر کاغذ چڑھا ہوتا ہے۔ گھر سادگی صفائی خوب صورتی کے نمونے ہوتے ہیں۔ لکڑی پر روغن یا کسی قسم کی پالش نہیں کی جاتی۔ جاپانی گھروں میں فرنیچر نہیں ہوتا میز کرسی کی جگہ عمدہ فرش اور گدے بچھائے جاتے ہیں فرش پر ایک نفیس باریک چٹائی چڑھی ہوتی ہے۔ جو روزانہ کپڑے سے صاف کی جاتی ہے۔ اُس پر جوتا پہن کر نہیں جاتے۔ جوتے اُتارنے کے لئے ایک خاص چھوٹی کوٹھری بنائی جاتی ہے۔ عموماً گھر میں پلنگ نہیں ہوتے بلکہ فرش جس کو تتامی کہتے ہیں اس پر بچھونا بچھا کر سوتے ہیں۔ کپڑوں پر جاپانیوں کو زیادہ مصارف برداشت کرنے پڑتے ہیں کیوں کہ ان کو دو قسم کے ملبوسات رکھنے پڑتے ہیں۔ ایک اپنا قومی لباس یعنی کمونو جس میں تین کپڑے شامل ہوتے ہیں (۱) سیاہ کمونو (۲) سیاہ بادری یعنی کمونو کے اوپر پہننے کا چغہ جس پر اُن کا خاندانی نشان ہوتا ہے اور تیسرا ہکامہ سایہ جو کمونو پر ہوتا ہے دوسرا لباس سُوٹ۔ عام طور پر جاپانی سوٹ پہنتے ہیں۔ کیوں کہ اس لباس سے کاروبار میں بہت سہولت ہوتی ہے۔ عورتیں بھی انگریزی لباس اور کمونو پہنتی ہیں۔ عورتوں کے کمونو ۱۰۰ر میں اور مردوں کے ۸۰ر میں تیار ہو جاتے ہیں۔ فن موسیقی کا جاپانیوں کو بہت شوق ہے۔ ہر گھر میں ریڈیو ضرور ہوتا ہے۔ قدرتی مناظر پر یہ جان دیتے ہیں بہار کے موسم میں سیر و تفریح کے لئے خاندان کے خاندان دور دور جنگلوں میں نکل جاتے ہیں۔ یہ لوگ خاموش تفریح کے زیادہ شایق ہوتے ہیں خوش رنگ پھولوں اور چنار کے سُرخ پتوں سے بہت محظوظ ہوتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کوئی جاپانی گھر ایک چھوٹے پائیں باغ اور پھولوں کے گملوں سے خالی نہیں ہوتا۔ یہ بہت خوش اخلاق فراخ دل ہوتے ہیں۔ ہمدردی، محبت، خدمت خلق اور ایثار کے مجسمے ہوتے ہیں جاپانی عورتیں زیور بالکل نہیں پہنتیں۔ اس کی بجائے اپنا روپیہ بنک میں جمع کرتی ہیں۔ لڑکوں اور لڑکیوں کی ابتدائی تعلیم جبری و لازمی ہے۔ بڑے چھوٹے گھرانوں کی لڑکیاں کچھ نہ کچھ ہنر ضرور سیکھتی ہیں۔ لڑکیوں کے لئے فنونِ لطیفہ کی تعلیم لازمی ہے۔ ادبی تعلیم کا ذوق عورتوں میں نمایاں طور پر پایا جاتا ہے۔ ہر گھر میں ایک عمدہ کتب خانہ ہوتا ہے۔ کتابیں

بہت ارزاں ملتی ہیں آبادی کی مناسبت سے دنیا میں کوئی ایسا ملک نہیں جہاں اس قدر اخبار اور رسالے پڑھے جاتے ہوں۔ اخبار رسالے بہت ارزاں قیمت پر فروخت ہوتے ہیں۔ جاپان کا سب سے بڑا مستند اخبار "توکیو۔ ساہی" ہے جو ۱۸۸۸ء میں جاری ہوا۔ دوسرا مشہور اخبار "اوساکا ساہی" ہے جو شہر اوساکا سے شائع ہوتا ہے۔ اگر ہم ۲۵، ۳۰ سال قبل کی جاپان کی معاشرت کا مطالعہ کریں تو اندازہ ہوگا کہ کس قدر برق رفتاری کے ساتھ اس نے زندگی کے ہر شعبے میں محیر العقول ترقی کی ہے۔

اب ہم جاپان کی شادی کے رسوم کو اجمالاً تحریر کریں گے۔ جیسے کہ ہر ملک کی معاشرت و تمدن جداگانہ ہوتا ہے اسی طرح وہاں کے رسوم بھی بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ جاپان چوں کہ مشرق بعید کا ایک متمدن ملک ہے اس لئے یہاں کی معاشرت، تمدن، تعلیم، لباس، اخلاق و عادات ہر چیز پر مشرق کا رنگ ہے گو مغرب کا اثر یہاں بڑی حد تک کارفرما ہے لیکن اب بھی مشرقیت غالب ہے جاپانیوں کی سب سے بڑی مابہ الامتیاز خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے ملک، قوم، خاندان اور ناموس کے لئے بڑی سے بڑی قربانی کے لئے تیار رہتے ہیں۔ ان میں تحفظ نسل و بقائے خاندان کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہے اسی جذبے کے تحت ہر جاپانی نوجوان شادی کو اپنا فرض اولین سمجھتا ہے لڑکے لڑکی کے لئے بر تلاش کرنا بزرگ خاندان کے سپرد ہوتا ہے۔ عام طور پر ان شادیوں کے معاملات طے کرنے کے لئے ایک شادی شدہ مخلص دوست ہوتا ہے جس کو جاپانی اصطلاح میں نکودو کہتے ہیں۔ اس کا یہ فرض ہوتا ہے کہ طرفین کو خاندانی حالات و واقعات سے من وعن آگاہ کردے۔ یہ خدمت بہت نازک ہوتی ہے۔ نکودو کا فرض صرف یہی نہیں ہوتا کہ وہ نکاح کرادے بلکہ وہ طرفین کی کامیاب زندگی کا ضامن قرار دیا جاتا ہے۔ لڑکے کے والدین کی طرف سے سلسلہ جنبانی ہوتی ہے۔ لڑکا پسند ہے تو لڑکی کے والدین نکودو کے ذریعے پیام بھیجتے ہیں لیکن لڑکی کی طرف سے پیام بھیجنا معیوب نہیں سمجھا جاتا برعکس ہندوستان کے جہاں لڑکی کے والدین کی طرف سے پیام تو پیام اگر رجحان کا بھی پتہ چل جائے تو بڑی جگ ہنسائی ہوتی ہے۔ پیام آنے کے بعد لڑکے اور لڑکیوں کے ذاتی صفات و عادات کا طرفین بڑی جستجو سے پتہ لگاتے ہیں اور اس میں تین چیزوں کو زیادہ اہمیت دی جاتی ہے (۱) شرافت خاندانی۔ (۲) ذاتی صفات طبیعت (۳) صحت۔ اور اگر لڑکا ہے تو مالی حالت۔ جب نسبت پختہ ہو جاتی ہے تو لڑکے اور لڑکی میں رسم "میائی" ادا ہوتا ہے یعنی نکودو لڑکے اور لڑکی کو کسی باغ یا سینما یا کسی اور تفریح گاہ میں لے جاتا ہے اور وہاں ایک دوسرے سے تعارف کرایا جاتا ہے یہ دونوں اپنے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہیں۔ اس طرح یہ نسبت بالکل طے ہو جاتی ہے۔ اگر اس موقع پر لڑکے نے لڑکی کو یا لڑکی نے لڑکے کو ناپسند کیا تو گفت و شنید منقطع ہو جاتی ہے اور نسبت ٹوٹ جاتی ہے۔ دونوں نے

گھر واپس ہوجاتے ہیں البتہ نکو دو صاحب کو ضرور تھوڑی کوفت ہوتی ہے لیکن ایسا اتفاق شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ ۹۰ فی صدی ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں والدین اس رسم کے بعد منگنی کا رسم ادا کرتے ہیں۔ ایک دوسرے کو تحفہ تحایف بھیجتے ہیں۔ پہلے لڑکے کی طرف سے کچھ نقد رقم اور ساتھ ہی ایک تحفہ بھیجا جاتا ہے اور اس کے ساتھ سامان کی فہرست ہوتی ہے جسے یوئینو کہتے ہیں ایسی فہرست پروفیسر سیلاس صاحب کے ایک مضمون سے درج کی جاتی ہے۔

بخدمت .... صاحبہ (دلہن کا نام)

روٹی	۱ عدد
سُروے (ایک قسم کی خشک مچھلی)	۵ عدد
کومبو (ایک قسم کی بحری گھانس)	۲ عدد
کاتسو ویشی (ایک قسم کی خشک مچھلی)	۲ عدد
ذوموشرا کا (سفید سَن کے گچھے)	۲ عدد
سوے ہرو (جاپانی پنکھا)	۲ عدد
نیاگتارو (چاول کی شراب)	۲ پیپے

براہِ کرم مندرجہ بالا اشیا وصول فرمایئے یہ ہمیشہ آپ کی رہیں گی۔

راقم (دولہا کا نام)

گسروے ایک قسم کی مچھلی ہے جسے انگریزی میں کٹل فش کہتے ہیں اس کا پیٹ چاک کرکے چوڑے پتّے کی شکل میں خشک کیا جاتا ہے۔ اس سے شگون لیا جاتا ہے کہ دُلہن کی عمر دراز ہو۔ کومبو ایک قسم کی بحری گھانس ہے جس کا پتہ لمبا اور چوڑا ہوتا ہے ایک ایک پتہ خشک کرکے لپیٹ لیتے ہیں یہ اولاد ہونے کا شگون ہے۔ کاشوویشی ایک قسم کی خشک موٹی مچھلی ہے ہر جاپانی گھر میں روزانہ اس کو گھِستے اور اس کے برادے (سفوف) کا شوربہ بنا کر پیتے ہیں۔ یہ اس شگون کے لئے ہے کہ دونوں میاں بیوی دنیا کی کش مکش میں غالب رہیں۔ شوموشرا کا جاپانی سَن کی ایک قسم ہے جس کا ریشہ بالکل سفید ہوتا ہے اس سے یہ مراد ہے کہ دولہا دُلہن کے بال اسی طرح سفید ہوں۔ سُوے ہرو جاپانی پنکھا ہے جس طرح پنکھا کُھل کر پھیل جاتا ہے اسی طرح دولہا دُلہن پھلیں پھولیں۔ نیاگتارو سے یہ مراد ہے کہ دونوں شرابِ اُلفت سے مست اور سرشار رہیں۔ دُلہن والے اس

فہرست اور نقد روپیے کی دلہن کی دستخطی رسید دولہا کے گھر روانہ کر دیتے ہیں اور اس کے ساتھ ایک لفافے میں جو روپیہ دولہا کے ہاں سے گیا تھا اُس کا نصف رکھ کر روانہ کر دیتے ہیں۔ اور لفافے پر لکھ دیتے ہیں کہ یہ ملفوفہ رقم بکامہ (دولہے کا جوڑا) بنانے کے لئے ہے۔ ان تحائف کے بعد منگنی پکی ہو جاتی ہے اور والدین لڑکے لڑکی کو ایک دوسرے سے ملاقات کرنے کی اجازت دے دیتے ہیں اور دونوں تھیٹر، سینما اور تفریح گاہوں میں بہت آزادی کے ساتھ جاتے ہیں۔ اس کے سال چھ مہینے بعد نکاح ہو جاتا ہے۔ نکاح کے رسوم بہت سادہ اور کم خرچ ہوتے ہیں۔ زمانہ قدیم میں نکاح عام طور پر دولہا کے مکان پر ہوا کرتا تھا لیکن اب جگہ کی کوئی قید نہیں رہی۔ مندر، کوئی مقدس مقام یا ہوٹل میں یہ تقریب انجام پا جاتی ہے۔ ہوٹلوں میں اس مقصد کے لئے علیحدہ ایک کمرہ ہوتا ہے جو کرایہ پر لیا جاتا ہے۔ نکاح کے وقت دولہا دلہن اپنے قومی لباس یعنی کمونو میں ملبوس ہوتے ہیں دلہن کے سر پر سفید ریشمی اوڑھنی ہوتی ہے۔ برات، باجہ بینڈ وغیرہ کوئی چیز دولہا دلہن کے ساتھ نہیں ہوتی پہلے دلہن نکودو کی بیوی کے ہمراہ مقام نکاح پر آ جاتی ہے اس کے بعد دولہا والدین کے ہمراہ وہاں پہنچتا ہے۔ دولہا کے والدین ایک علیحدہ کمرے میں بیٹھ جاتے ہیں اور دولہا نکودو کو ساتھ لے کر نکاح کے کمرے میں جاتا ہے دلہن اور نکودو کی بیوی، دولہا اور نکودو کے مقابل بیٹھتے ہیں عقد خوانی کی رسم ایک نا کتخدا صغیر سن لڑکی انجام دیتی ہے سامان نکاح میں ایک چھوٹی چوبی کشتی جس میں چینی کی صراحی ہوتی ہے اور تین چوبی تشتریاں۔ صراحی میں سفید شراب بھری ہوتی ہے۔ اول لڑکی جام میں تھوڑی شراب انڈیل کر دولہا کو پیش کرتی ہے۔ دولہا جام شراب لے کر پی جاتا ہے اور جام واپس کر دیتا ہے پھر اسی جام میں شراب ڈال کر دلہن کو پیش کرتا ہے دلہن اسی طرح شراب پی کر واپس کر دیتی ہے لڑکی پھر اس جام میں شراب ڈال کر دولہا کو پیش کرتی ہے اور وہ پی کر واپس کر دیتا ہے اب لڑکی پھر جام رکھ دیتی ہے اور دوسرے جام میں شراب ڈال کر پہلے دلہن کو پیش کرتی ہے اور پہلے کی طرح ساغر گردش کرتا ہے لیکن یہ دور دلہن پر ختم ہوتا ہے۔ آخر میں تیسرا جام لیا جاتا ہے اور اُس کا دور دولہا سے شروع ہوتا ہے اور پہلے دور کی طرح دولہا پر ختم ہو جاتا ہے۔ تینوں جاموں کے نو دور پورے ہوتے ہیں۔ اس طرح نکاح کی رسم ختم ہو جاتی ہے۔ اس رسم کے بعد دولہے کے والدین کمرۂ نکاح میں داخل ہوتے ہیں اور پہلے دلہن کے خسر اپنی نئی بہو کے ہمراہ شراب نوشی فرماتے ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ انھوں نے دلہن کو اپنی بیٹی بنا لیا اس کے بعد خوش دامن صاحبہ شراب نوشی فرماتی ہیں۔ اس کے بعد دلہن اپنے دولہا اور خسر اور خوش دامن کے ہمراہ سسرال چلی جاتی ہے۔ دولہا والے اپنے احباب کا تعارف دلہن سے

کرانے کے لئے ایک پُر لطف دعوت دیتے ہیں جس میں دولہا دُلہن پاس پاس بیٹھ کر کھانا کھاتے ہیں اس دعوت میں عزیز اقارب تحفے تحائف بھی پیش کرتے ہیں نکاح کے تیسرے روز دُلہن دولہا کے ساتھ اپنے میکے جاتی ہے اس رسم کو "ستوگارمی" کہتے ہیں۔ سسرال میں دولہا کی دعوت ہوتی ہے جس میں صرف دولہا کے والدین اور دولہن کے چند خاص عزیز مدعو ہوتے ہیں۔ نکاح کی سرکاری طور پر رجسٹری کرانا دولہے کے ذمے ہوتا ہے دولہا دولہن میونسپلٹی میں دو گواہوں کے ساتھ نکاح کی رجسٹری کے وقت عروس کا نام اس کے خاندانی رجسٹر سے کاٹ کر نوشاہ کے خاندان میں شریک کر دیا جاتا ہے اور اب عروس نوشاہ کے خاندان کی رکن بن جاتی ہے اور اپنا نام بدل کر اس خاندان کے نام پر رکھتی ہے جاپانی قانون میں لڑکی کے لئے نکاح کی عمر کم سے کم ۱۵ سال اور لڑکے کے لئے ۱۷ سال لیکن عام طور پر بیس بائیس برس سے پہلے لڑکی کا نکاح نہیں ہوتا۔ عورت بانجھ ہو یا برص کے مرض میں مبتلا ہو تو طلاق ہو جاتی ہے۔ (برص جاپان میں بہت منحوس مرض خیال کیا جاتا ہے) شوہر اپنی بیوی کو "اُو بی" سے مخاطب کرتا ہے۔ یعنی اے بی بی، اور بیوی شوہر کو "انتہ" یعنی جناب کے لفظ سے مخاطب کرتی ہے۔ شادی کے روز دولہن کی ماں گیارہ نصیحتیں کرتی ہے۔

(۱) آج سے تم میری بیٹی نہیں بلکہ اب سے ساس اور سسر تمہارے ماں باپ ہیں۔ اب تمھیں اپنی ساس سسرے کی ویسی ہی فرماں برداری کرنا چاہئے جیسے ماں باپ کی تم اطاعت کرتی رہی ہو۔

(۲) اب تمہارا شوہر تمہارا آقا ہے منکسر المزاج اور لایق بیوی کی سب سے بہتر خوبی یہ ہے کہ وہ شوہر کی فرمان بردار ہو۔

(۳) اپنی ساس کا ہمیشہ احترام کرو۔

(۴) کبھی حسد مت کرو حسد سے تم اپنے شوہر کی محبت کھو دو گی۔

(۵) غصہ مت کرو اگر شوہر غلطی پر ہو تو صبر کرو اور جب غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو اُسے نرمی سے سمجھا دو۔

(۶) زیادہ مت بولو اپنے ہمسایے کی بُرائی نہ کرو جھوٹی باتیں نہ بناؤ۔

(۷) نجومیوں اور رجوتشیوں سے دُعا تعویذ اور گنڈے مت کراؤ۔

(۸) انتظام خانہ داری میں کفایت شعاری اختیار کرو

(۹) اپنے باپ کی ثروت وجاہ پر مغرور نہ ہو اپنی سسرال کے لوگوں سے اپنے گھر کی دولت کا تذکرہ نہ کرو۔

(۱۰) اپنے ہم عمر لوگوں کی صحبت میں زیادہ شریک نہ ہو

(۱۱) ہمیشہ سادہ اور صاف ستھرا لباس پہنو رنگین اور بھڑکیلے کپڑوں سے پرہیز کرو۔

(نمبر ۲، ۸، اور ۱۱ خاص طور سے ہماری ہندوستانی بہنوں کے لئے قابل تقلید ہیں)

اٹھارویں صدی کے ایک مشہور مصنف کائبارہ، نے اپنی کتاب "ادننا دری گنگو" (عورتوں کے علوم) میں لکھتا ہے:۔

"عورت کو چاہئے کہ وہ اپنے شوہر کو دیوتا سمجھے اور ہمیشہ اس دُھن میں لگی رہے کہ میں اپنے شوہر کو کس طرح خوش رکھوں" اس طریقے سے آسانی سزا سے نجات حاصل کرے عورت اپنے ماں باپ کی افزایش نسل کا ذریعہ نہیں ہوتی بلکہ وہ اپنے ساس سسرے کی نسل بڑھاتی ہے۔ اس لئے ساس سسرے کو ماں باپ سے افضل سمجھنا چاہئے اور سعادت مندی سے اُن کی خدمت کرنی چاہئے۔

سید ممتاز علی وارثی

متعلم ال ال۔ بی (ابتدائی)



غزل

کلفتِ عشق کا حاصل بھی گیا — درد کے ساتھ مرا دل بھی گیا
نہ ہوئی ذوقِ طلب کی تکمیل — بارہا میں سرِ منزل بھی گیا
دل دیا درد کے بدلے ہم نے — کچھ اگر کھویا تو کچھ مل بھی گیا
نعشِ پروانہ بھلا کیا اُٹھی — ذوقِ آرائشِ محفل بھی گیا
ایک مجنوں ہی نہ تھا دشت نورد — نجد میں صاحبِ محمل بھی گیا
ڈوبنے والا تو ڈوبا لیکن — وہ وقارِ لبِ ساحل بھی گیا
دلبری کے ہیں نرالے انداز — دل کے ہمراہ غمِ دل بھی گیا
اعتبارِ غمِ فردا، توبہ! — لطفِ ہر وعدۂ باطل بھی گیا
ناتوانی کا بُرا ہو تابشؔ — ہاتھ سے دامنِ قاتل بھی گیا

مسعود الحسن تابش

اقبال کی زندگی کے مختصر حالات

ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم نے اقبال کی زندگی کا بہت قریبی اور گہرا مطالعہ کیا ہے۔ آپ دونوں کے بڑے دوستانہ تعلقات رہے ہیں اور بعض وقت گھنٹوں دونوں نے مبادلہ خیالات کیا ہے۔ یہ ملاقاتیں یقیناً بے حد دلچسپ رہی ہوں گی کیوں کہ اقبال کی طرح ڈاکٹر صاحب کو بھی شعر و فکر کی نعمتیں ودیعت کی گئی ہیں۔ دونوں کے زاویہ نظر ایک دوسرے سے بڑی حد تک ملتے جلتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے بیان سے ہر شخص اندازہ لگا سکتا ہے کہ یہ دوستی آگے چل کر عقیدت کا رنگ اختیار کر لیتی ہے۔

انھیں تمام باتوں کے پیش نظر میں نے ڈاکٹر صاحب سے درخواست کی تھی کہ مجلے کی اس اشاعت کے لئے اقبال کی زندگی پر کوئی مضمون عنایت فرمائیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب اُن دنوں اس قدر مصروف تھے کہ ان کے لئے کوئی مستقل مضمون کا لکھنا دشوار تھا چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے یہی عذر کیا۔ اس پر میں نے اس کی اجازت چاہی کہ چھٹیوں میں ڈاکٹر صاحب میرے لئے اتنا وقت نکال لیں کہ وہ حالات بیان کرتے جائیں اور میں انھیں قلم بند کرتا رہوں۔ ڈاکٹر صاحب اس پر راضی ہو گئے اور یہ مضمون جو آپ کے زیر نظر ہے اسی طرح تیار ہوا ہے۔

کبھی کبھی میرے لئے ڈاکٹر صاحب کی تقریر کا بجنسہٖ قلم بند کرنا دشوار ہو جاتا اور میں اشارے لیتا جاتا تھا

لیکن گھر جاتے ہی اپنے حافظے کی مدد سے عبارت کو مکمل کر لیتا تھا۔ اس مضمون میں پوری پوری کوشش کی گئی ہے کہ وہی الفاظ اور جملے رہیں جو خلیفہ صاحب نے ارشاد فرمائے تھے۔ البتہ کہیں کہیں یہ "سر دلبراں" "حدیث دیگراں" ہو گیا ہے

افضل

علامہ سر محمد اقبال سنہ ۱۸۷۲ء میں بہ مقام سیال کوٹ پیدا ہوئے۔ سیال کوٹ ایک نہایت مردم خیز خطہ ہے۔ گزشتہ صدیوں میں بھی یہاں سے بعض ایسے صاحب کمال پیدا ہوئے جن کا نام تمام دنیائے اسلام میں آج تک بڑی عزت سے لیا جاتا ہے۔ ملا عبدالحکیم سیال کوٹی جو شاہ جہاں کے زمانے میں تھے اور جن کو ان کی مشہور تصنیف کے صلے میں چاندی میں تولا گیا تھا، یہیں کے رہنے والے تھے۔ میں نے ایک مرتبہ سیال کوٹ کے مردم خیز ہونے کا ذکر علامہ اقبال سے کیا تو انھوں نے اس کی تصدیق کے لیے تاریخ میں سے ایسے کئی باکمالوں کے نام گنوائے جو اس سرزمین سے اٹھے تھے۔ سیال کوٹ کا علاقہ کشمیر کی ریاست سے بالکل ملحق ہے اور بڑی کثرت سے کشمیری خاندان اس میں آباد ہیں۔ اقبال کے آبا و اجداد بھی کشمیر ہی سے ہجرت کر کے یہاں آباد ہوئے۔ ان کے اسلاف کشمیری پنڈت تھے جن کی ذات سپرو تھی۔ مجھے ان کے سپرو ہونے کا علم خود انھی کی زبانی حاصل ہوا۔ سر تیج بہادر سپرو اپنی علم دوستی کی وجہ سے اقبال کے بڑے قدر دانوں میں ہیں، خود صاحب موصوف کی زبانی اس کا پتہ چلا کہ غالباً چار یا پانچ پشت اوپر اقبال اور سپرو ایک ہی گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اس کے بعد ایک نے اسلام قبول کر لیا اور اختلاف مذہب کی وجہ سے اس خاندان کی مختلف شاخیں ایک دوسرے سے بے تعلق ہو گئیں۔

اگرچہ اسلام کے زیر اثر اقبال ذات پات اور نسل پر افتخار کو صحیح نہیں سمجھتے تھے تاہم جابجا ان کے اشعار میں اس بات کے اشارے ملتے ہیں کہ ان کو اپنے برہمن زادہ ہونے پر بھی فخر تھا۔ برہمنوں کی ذہانت اور فلسفہ دانی سے کس کو انکار ہو سکتا ہے اور غالباً از روئے قانون توارث اقبال کو اس میں اچھا خاصا حصہ ملا۔

اقبال کے والد گو صاحب ثروت نہ تھے لیکن اپنے شہر میں دل و دماغ کی پاکیزگی کی وجہ سے بہت قابل احترام سمجھے جاتے تھے کئی برس کا عرصہ ہوتا ہے جب کہ اقبال گلی والے مکان میں مجھے ان سے شرف نیاز حاصل ہوا۔ اس وقت

اقبال کی شہرت تمام ملک میں پھیل چکی تھی اور اُن کے والد اقبال کے کمال پر بجا طور پر فخر کرتے تھے۔ اُن پر تصوف کا رنگ بہت غالب تھا۔ یہی رنگ اقبال میں علم و شعر کے جوہروں کے ساتھ مل کر اور بھی زیادہ گہرا ہو گیا اور اسی کی بدولت اقبال کو عطار، سنائی اور رومی کی صف میں جگہ ملی۔

اقبال کبھی کبھی اپنے والد کے کشف و کرامات بھی بیان کرتے تھے، فرماتے تھے "میں نے والدہ کی زبانی سنا ہے کہ ایک آدھ مرتبہ ایسا بھی ہوا کہ والد کی موجودگی میں بے چراغ کمرے کے اندر تاریک رات میں عجیب و غریب قسم کا نور ظاہر ظاہر ہوا اور تاریک کمرے میں ایسا معلوم ہوا کہ سورج نکل آیا ہے" اقبال کے والد کی گفتگو میں نہایت لطافت اور پاکیزگی پائی جاتی تھی۔ وہ ایک مرتبہ فرماتے تھے "اقبال کی پیدائش کے کچھ روز پہلے میں نے ایک خواب دیکھا کہ ایک بڑا ہی عجیب و غریب پرندہ فضا میں زمین کے قریب اُڑ رہا ہے اور بڑی کثرت سے لوگوں کا ہجوم ہے۔ اس ہجوم میں میں بھی ہوں، وہ پرندہ کسی کی کوشش سے ہاتھ نہیں آتا لیکن خود بخود میرے دامن میں آکر گرا اور میں نے اُسے پکڑ لیا" فرماتے تھے "میں نے اس کی اقبال کی پیدائش کے بعد یہی تاویل کی کہ وہ پرندہ یہی بچہ ہے اور یہ ضرور کوئی غیر معمولی کمال پیدا کرے گا"

جس کسی کو اُن سے ملنے کا موقع ملا ہو اس کو قطعاً اس بات میں شک نہیں ہو سکتا کہ اقبال کو اپنی طبیعت کے بہترین عناصر اپنے باپ ہی سے بچپن میں ملے۔ فارسی کی ایک نظم میں بھی اپنے والد کے اخلاق کا ذکر کرتے ہوئے یہ واقعہ بیان کیا ہے "میں نے ایک سائل کو بُری طرح ڈانٹا۔ والد سُن رہے تھے اُنھوں نے اس درد انگیز طریقے سے میری اس درشتی پر سرزنش کی کہ اس کے بعد سے آج تک میں کبھی کسی سائل کے ساتھ کسی قسم کی سخت کلامی نہیں برت سکتا"

اقبال کو اپنی والدہ سے بھی بہت محبت تھی جس کا ثبوت اس بلیغ اور درد انگیز مرثیے سے ملتا ہے جو اُنھوں نے اپنی والدہ کی وفات پر لکھا ہے۔ جس کا ایک بند یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

کس کو اب ہوگا وطن میں آہ میرا انتظار؟　　کون میرا خط نہ آنے سے رہے گا بے قرار؟
خاکِ مرقد پر تری لے کر یہ فریاد آؤں گا　　اب دعائے نیم شب میں کس کو میں یاد آؤں گا
تربیت سے تیری میں انجم کا ہم قسمت ہوا　　گھر مرے اجداد کا سرمایۂ عزت ہوا
دفترِ ہستی میں تھی زریں ورق تیری حیات　　تھی سراپا دین و دنیا کا سبق تیری حیات
عمر بھر تیری محبت میری خدمت گر رہی　　میں تری خدمت کے قابل جب ہوا تو چل بسی

وہ جواں قامت میں ہے جو صورتِ سرو بلند | تیری خدمت سے ہوا جو مجھ سے بڑھ کر بہرہ مند
کاروبار زندگانی میں وہ ہم پہلو مرا | وہ محبت میں تری تصویر، وہ بازو مرا
تجھ کو مثلِ طفلکِ بے دست و پا روتا ہے وہ | صبر سے ناآشنا صبح و مسا روتا ہے وہ

تخم جس کا تو ہماری کشتِ جاں میں بو گئی
شرکتِ غم سے وہ اُلفت اور محکم ہو گئی

اقبال کو جس زمانے میں اپنے اندر گہرے وجدانی رجحان کا احساس شروع ہوا تو ایک روز انھوں نے اپنے والد سے اس کا ذکر کیا۔ "میں اپنے اندر کچھ ایسی چیزیں محسوس کرتا ہوں کہ اگر مجھ میں بعض جسمانی کمزوریاں نہ ہوتیں تو شاید میں بھی کسی نہ کسی قسم کا نبی ہو جاتا"۔ اس پر اُن کے والد نے ہنس کر کہا۔ "خدا کا شکر ہے کہ تم کو اپنی کمزوریوں کا علم ہے جو تم کو اس مغالطے میں پڑنے سے بچاتی رہیں گی"

انٹرمیڈیٹ تک اُن کی تعلیم سیالکوٹ میں ہوئی، خوش قسمتی سے اُردو، فارسی اور اسلامیات کے ذوق کی تربیت کے لئے اُن کو ایک ایسے اُستاد سے تلمذ حاصل ہوا جو اپنے زمانے کے بے نظیر شخص تھے۔ مولوی میر حسن بڑے عالم اور سخن فہم شخص تھے اساتذہ کا کلام اُن کو بڑی کثرت سے یاد تھا۔ جو ذوق سخن اُن کی طبیعت میں تھا اُس کو وہ ہونہار شاگردوں میں بھی منتقل کر دیتے تھے۔ کچھ اپنے میلانِ فطرت کی وجہ سے اور کچھ مولوی میر حسن کے فیضِ صحبت کی وجہ سے جوانی کے زمانے میں اقبال کا یہی حال تھا کہ اساتذہ کے ہزارہا اشعار اُن کو یاد تھے۔

سیالکوٹ کا اسکاچ مشن کالج غالباً اس زمانے میں ایف۔ اے تک محدود تھا اس لئے بی۔ اے کی تعلیم کے لئے اقبال لاہور چلے آئے اور گورنمنٹ کالج میں داخل ہو گئے۔ وہیں سے بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں بڑے امتیاز سے حاصل کیں۔

اس زمانے میں اقبال کی خوش قسمتی سے آرنلڈ وہاں فلسفے کے پروفیسر تھے۔ آرنلڈ کو فلسفے کے علاوہ ادبیات کا بھی ذوق تھا اور اسلامیات سے بھی دلچسپی رکھتے تھے۔ جس قدر اقبال آرنلڈ کے شاگرد ہونے پر خوش تھے آرنلڈ اقبال جیسے طباع اور ذہین شاگرد کی استادی پر فخر کرتے تھے آرنلڈ کا بیان تھا کہ ایسے طالب علم کے پڑھانے سے خود استاد کے علم میں اضافہ ہوتا ہے۔

ایم۔اے میں فرسٹ آنے کے صلے میں اقبال کو نانک بخش مڈل ملا اس کے بعد وہ کچھ عرصے اورنٹیل کالج اور گورنمنٹ کالج میں فلسفے کے پروفیسر بھی رہے، جب پروفیسر آرنلڈ ولایت جانے لگے تو اقبال کو اپنے ساتھ چلنے پر بہت مجبور کیا۔

اقبال کی انگلستان کو روانگی

اقبال کے اس سفر یورپ میں ان کے بڑے بھائی شیخ عطا محمد نے جو ابھی بقید حیات ہیں ان کی بڑی مدد کی۔ شیخ صاحب کی آمدنی اگرچہ محدود تھی لیکن اُن کو اپنے چھوٹے بھائی سے ایسا عشق تھا کہ اُنھوں نے اپنا تمام سرمایہ بے دریغ ان کے حوالے کردیا، اقبال بھی جب اپنے بھائی کا ذکر کرتے تھے تو ایسا معلوم ہوتا تھا کہ کسی معشوق کا ذکر کررہے ہیں۔ دونوں بھائیوں کا یہ گہرا عشق آخر عمر تک بدستور قایم رہا۔

اقبال ۱۹۰۵ء میں عازم انگلستان ہوئے لیکن اس سے پہلے ہی وہ اپنی چند نظموں کی وجہ سے ایک اعلیٰ درجے کے شاعر کی حیثیت سے مشہور ہوچکے تھے۔ جو نظمیں انھوں نے انجمن حمایت الاسلام کے جلسوں میں پڑھیں یا سر عبدالقادر کے مخزن میں شایع ہوئیں وہ ایسی بلند پایہ نظمیں تھیں کہ ہر سخن فہم کو احساس ہوگیا تھا کہ آسمان شعر پر ایک نیا آفتاب طلوع ہوا ہے۔

انگلستان میں وہ کیمبرج یونیورسٹی میں داخل ہوئے زیادہ تر اُن کا تعلق پروفیسر وارڈ اور سارلے سے رہا یا پروفیسر براون سے۔ پروفیسر نکلسن سے کیمبرج میں مَیں نے دریافت کیا تھا کہ آیا طالب علمی کے زمانے میں وہ اقبال کو جانتے تھے اُنھوں نے فرمایا،، نہیں میں اس زمانے میں اُن سے واقف نہ تھا،،

انگلستان کے دوران قیام میں مغربی فلسفے کے علاوہ اقبال نے اسلامی فلسفے کی طرف رجوع کیا اور بڑی تحقیق سے اسلامی تعلیمات کے فلسفے کا مطالعہ کیا۔ اس تحقیق کا حاصل وہ مقالہ ہے جو "Metaphysics in Persia" کے نام سے شایع ہوا، اس مقالے کی بنا پر میونخ یونیورسٹی سے اُن کو ڈاکٹر آف فلاسفی کی ڈگری ملی، لندن میں اُنھوں نے بیرسٹری کا امتحان بھی پاس کیا، اس زمانے میں پروفیسر آرنلڈ کا قایم مقام کی حیثیت سے وہ کچھ عرصے لندن میں عربی کے پروفیسر بھی رہے، انگلستان کے زمانۂ قیام میں اُنھوں نے (۶) لکچر اسلام پر بھی دیئے۔

واپسی

۱۹۰۸ء میں وہ وطن واپس لوٹے علمی شوق کی وجہ سے زیادہ موزوں بات تو یہی تھی کہ وہ پروفیسر ہوتے لیکن کسی وجہ سے اُنھوں نے تہیہ کرلیا تھا کہ ملازمت نہ کریں گے۔ اس زمانے میں انڈین ایجوکیشنل سروس میں پنجاب میں غالباً کوئی ہندوستانی نہیں تھا۔ یہ سروس زیادہ تر انگریزوں کے لئے مخصوص تھی لیکن اقبال کے علم کا چرچا اس وقت بھی ایسا تھا کہ خود گورنمنٹ نے ان کے سامنے یہ خدمت پیش کی لیکن اقبال نے اس کو قبول

کرنے سے انکار کر دیا۔ ان کے دوستوں کو بڑا افسوس تھا کہ انھوں نے ایسا نادر موقع ہاتھ سے کیوں کھو دیا۔ جسٹس شاہ دین مرحوم اس زمانے میں ہائی کورٹ کے جج تھے۔ اس بارے میں وہ اقبال سے بہت ناراض تھے اور ان سے ہمیشہ کہتے تھے تم جیسے آدمی کا عدالت میں کوئی کام نہیں، تمھیں علمی زندگی کو بطور پیشے کے اختیار کرنا چاہئے۔ انھا نے ان سے ایک مرتبہ دریافت کیا کہ "آیا یہ بہتر نہیں تھا کہ آپ پروفیسر ہو جاتے" فرمانے لگے "میں نے کچھ دن پروفیسری کی اور اس نتیجے پر پہونچا کہ ہندوستانی کالجوں کی پروفیسری میں علمی کام تو ہوتا نہیں البتہ ملازمت کی ذلتیں ضرور سہنی پڑتی ہیں"۔ فرماتے تھے "ایک مرتبہ طالب علموں کی حاضری کے متعلق گورنمنٹ کالج کے پرنسپل سے کچھ جھگڑا ہو گیا اور پرنسپل نے مجھ سے کچھ اس طرح گفتگو کی جیسے کوئی کلرک سے باتیں کرتا ہے۔ اس دن سے ملازمت سے طبیعت کچھ ایسی کھٹی ہوئی کہ جی میں ٹھان لی کہ جہاں تک ہو سکے گا ملازمت سے گریز کروں گا۔ اپنے اسی خیال کو انھوں نے اسرار خودی میں بیان کیا ہے۔

رزقِ خویش از دستِ دیگر الحذر الحذر از نانِ چاکر الحذر

انگلستان کے دوران قیام میں قومی احیاء کے خیالات ان کی طبیعت میں موج زن ہونے لگے تھے وہاں انھوں نے جو نظمیں لکھیں ان سے انھیں خیالات کا پتہ ملتا ہے۔

ہر شاعر جو دیگر کمالات کی بھی اہمیت رکھتا ہو کبھی کبھی شاعری کو لاطائل بھی سمجھنے لگتا ہے۔ اقبال کو انگلستان میں خیال ہوا کہ مسلمانوں میں شاعری انحطاط کے ساتھ وابستہ ہے اور اس قوم کو مزید شاعری کی ضرورت نہیں۔ چنانچہ انھوں نے ارادہ کیا کہ وہ شاعری چھوڑ دیں گے اور کوئی ایسا کام کریں گے جس سے قوم میں بیداری اور قوت عمل پیدا ہو۔ اس وقت تک ان کو اس کا پوری طرح احساس نہیں ہوا تھا کہ شاعری کا رخ بدل کر بھی یہ کام بطریقہ احسن اس سے لیا جا سکتا ہے۔ اس زمانے میں سر عبدالقادر بھی انگلستان ہی میں تھے اور دونوں ساتھ ہی رہتے تھے۔ سر عبدالقادر کو اس کا خطرہ ہوا کہ کہیں سچ مچ اقبال شاعری ترک نہ کر دیں۔ اس معاملے میں دونوں میں بحث ہو گئی اور فیصلہ یہ ہوا کہ پروفیسر آرنلڈ سے مشورہ کیا جائے اور اس کے بعد قطعی فیصلہ کیا جائے۔ دنیائے ادب کے لئے یہ نہایت خوش قسمتی کی بات ہے کہ آرنلڈ نے ان کو صحیح مشورہ دیا اور ان سے کہا کہ بلند پایہ شاعری سے قوم کا ایسا تعمیری کام ہو سکتا ہے جو کسی اور ذریعے سے ممکن نہیں۔ اس پر اقبال کچھ نرم پڑ گئے اور ان کا وہ خیال رفتہ رفتہ جاتا رہا لیکن اس کے ساتھ یہ ارادہ بھی کیا کہ شاعری کو محض تفنن طبع کا ذریعہ

نہ بنایا جائے بلکہ اس کی تمام قوت قوم کے اندر صحیح جذبات کے بیدار کرنے کے لئے صرف کی جائے۔

انگلستان سے واپسی پر اقبال بیرسٹری کے پیشے میں اپنے آپ کو استوار کرنے لگے۔ اگرچہ اُن کو اپنی ذہانت، محنت، اور شہرت کی وجہ سے کچھ نہ کچھ کام ملتا رہتا تھا لیکن دیر تک اُن کو یہ پتہ نہ چلا کہ اُن کی بیرسٹری اُن کی شاعری میں حایل ہے اور اُن کی شاعری اُن کی بیرسٹری میں مزاحم، عمر کا ایک نہایت ہی قیمتی حصہ انھوں نے اس پیشے پر ضائع کیا۔ میں نے اُن سے ایک مرتبہ کہا، "آپ نے یہ دو متضاد سے شغل کیوں اختیار کر رکھے ہیں؟" فرمانے لگے "اس تضاد سے بہت فایدہ پہونچتا ہے۔ وکالت دنیا داری کا نچوڑ ہے۔ تمام جہان کی کثافتوں اور خباثتوں سے انسان اس پیشے میں آشنا ہو جاتا ہے اور طبیعت میں اس کے خلاف ایک ایسا ردعمل پیدا ہوتا ہے کہ بڑے زور سے انسان کی روح لطیف چیزوں کے حصول کے لئے بال و پر پھیلاتی ہے" اس پر انھوں نے یورپ کے بعض ایسے لوگوں کا ذکر کیا جو شاعر بھی ہیں اور بیرسٹر بھی۔ اقبال کے انتقال کے بعد مجھے اُن کا یہ فرمانا یاد آیا کیوں کہ جس اخبار میں اُن کی خبر انتقال درج تھی اس میں ساتھ ہی یہ خبر بھی تھی کہ اسی روز سر ہنری نیو بولٹ انگلستان کے مشہور شاعر بیرسٹر کا بھی انتقال ہو گیا دونوں کی خبر وفات ٹائمس میں ساتھ ہی ساتھ چھپی تھی۔

جتنی مدت اقبال بیرسٹری کرتے رہے تمام علمی مشاغل اُن سے نہیں چھوٹے، وقتاً فوقتاً وہ شعر بھی کہتے تھے لیکن ظاہر ہے کہ اس شغل کے لئے وہ اتنا ہی وقت دے سکتے تھے جتنا اپنے پیشے کے مشاغل سے بچ جاتا۔ قانون کی کتاب وہ ہم مقدمے کی تیاری ہی کے وقت دیکھتے ہوں گے کیوں کہ سیکڑوں ملاقاتوں میں میں نے اُن کو اکثر فلسفے، ادب، تاریخ اور مذہب وغیرہ کی کتابیں پڑھتے ہوئے دیکھا لیکن کبھی قانون کی کتاب اُن کے ہاتھ میں نہیں دیکھی۔

بیرسٹری کے بہترین زمانے میں بھی اُن کی آمدنی کبھی ایک ہزار روپے سے متجاوز نہیں ہوئی۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے قیام کے وقت ریاست کے بعض عہدے داروں کا خیال ہوا کہ اقبال کو بطور پرنسپل کے یہاں بلایا جائے میں نے اُن سے اس کے متعلق دریافت کیا معلوم ہوا کہ وہ اس کے خواہش مند نہیں تھے فرماتے تھے "تنخواہ کے لحاظ سے تو مجھے کوئی فایدہ نہیں ہوگا اور اگر تھوڑی سی رقم مجھے زاید مل بھی جائے تو اس کے لئے جلا وطن ہونا کوئی معقول فعل نہیں۔

اس زمانے میں وہ بڑی کثرت سے ہندوستان کی مختلف یونیورسٹیوں کے امتحانات میں ممتحن بنائے جاتے تھے سینکڑوں جوابی بیاضوں کے پلندے اُن کے پاس پڑے رہتے تھے۔ امتحانوں کے پرچے دیکھنے کا کام کچھ ایسا میکانکی ہو جاتا ہے کہ وہ بیاضیں پڑھتے بھی جاتے تھے اور ہم نشینوں سے باتیں بھی کرتے جاتے تھے اس کا مطلب یہ نہیں کہ

وہ پرچوں کو غور سے نہیں دیکھتے تھے۔ اُن کی عادت تھی کہ وہ اپنے ذمے اول تو کوئی کام کے لینے سے بہت گریز کرتے تھے لیکن اگر کوئی کام اپنے ذمے لیتے تھے تو اُس میں پوری کوشش صرف کرتے تھے۔

(۲۰) برس سے زیادہ عرصے تک بیرسٹری اور شاعری کا ملا جلا شغلہ جاری رہا۔ اس زمانے میں عام قاعدہ تھا کہ ہر پلیڈر لیڈر بننے کی کوشش کرتا تھا جس کی طرف اکبر الہ آبادی نے ظریفانہ اشارہ کیا ہے۔

موکل چھٹے اُن کے پنجے سے جب | تو پھر قوم مرحوم کے سر ہوئے
پپیہے پکارا کئے "پی کہاں"! | مگر وہ پلیڈر سے لیڈر ہوئے

اقبال کی سلامتی طبع کی یہ بہت بڑی دلیل ہے کہ وہ اس لالچ میں نہیں آئے، اُن کو پبلک لائیف میں گھسیٹنے کی بہت کوششیں کی گئیں لیکن وہ اس سے گریز کرتے رہے، اس زمانے میں سیاسیات کا جو رنگ تھا اقبال کو اس میں علانیہ سیاست کی بو آتی تھی اور وہ کہتے تھے "جب تک صورت حال یہی ہے تو لیڈر کسی قدر قوم فروشی ہی کے ساتھ بن سکتے ہیں" جس کے لیے وہ اپنی طبیعت کو آمادہ نہیں پاتے تھے اس کیفیت پر اُنھوں نے وہ نظم لکھی ہے جس میں اُنھوں نے لیڈری کا نقشہ کھینچا ہے۔

میں نے اقبال سے از راہ نصیحت یہ کہا | عامل روزہ ہے تو، اور نہ پابندِ نماز
تو بھی ہے شیوۂ اربابِ ریا میں کامل | دل میں لندن کی ہوس، لب پہ ترے ذکر حجاز
ختم تقریر تری مدحتِ سرکار پہ ہے | فکر روشن ہے ترا موجدِ آئینِ نیاز
اور لوگوں کی طرح تو بھی چھپا سکتا ہے | پردۂ خدمت دیں میں ہوسِ جاہ کا راز
اس پہ طرہ ہے کہ تو شعر بھی کہہ سکتا ہے | تیری مینائے سخن میں ہے شرابِ شیراز
جتنے اوصاف ہیں لیڈر کے وہ ہیں تجھ میں سبھی | تجھ کو لازم ہے کہ ہو اُٹھ کے شریکِ تگ و تاز

غرض اس تمام نظم میں اُنھوں نے لیڈروں کے اخلاق کا ایک خاکہ کھینچا ہے۔ آخر میں فرماتے ہیں کہ یہ سب کمال اور کم زوریاں مجھ میں بھی موجود ہیں چاہوں تو اچھا خاصا لیڈر ہو جاؤں لیکن ایک بڑے ضروری عنصر کی کمی ہے۔ فرماتے ہیں۔

سُن کے کہنے لگا اقبال ... بجا فرمایا | تنگ مجھے آپ کی باتوں میں نہیں بندہ نواز
مجھ میں اوصافِ لیڈری تو ہیں موجود مگر | ہے کمی ایک، کہوں تم سے جو ہو فاش نہ راز"

"ڈھب مجھے قوم فروشی کا نہیں یاد کوئی
اور پنجاب میں ملتا نہیں استاد کوئی"

۱۵ ، ۲۰ برس تک اسی خیال پر قایم رہنے کے بعد آخر سیاسی حالات کے انقلاب اور بعض احباب کی ترغیب نے اُن کو اس میدان میں گھسیٹا، اس کے بعد وہ پنجاب کی اسلامی سیاست میں پیش پیش رہے، مسلم لیگ کے پریذیڈنٹ بھی ہوئے مسلم کانفرنس کی روح رواں بھی رہے اور پنجاب کونسل کے ممبر بھی ہوئے۔ میں نے اُن سے ایک روز مذاق سے کہا کہ "کیوں جناب! آپ تو کونسلوں کو سرمایہ داروں کا اکھاڑا کہتے تھے۔ اب خود اس میں کیسے شریک ہو گئے؟" فرمانے لگے "جو کہتا تھا وہ ٹھیک تھا، میں اسی لئے شریک ہوا ہوں کہ اندر سے اس کی بیخ کنی کی جائے۔

کچھ سال کے تجربے کے بعد اُن کو محسوس ہوا "میں عملی سیاست کا مرد میدان نہیں بن سکتا مجھ کو اس سے بلند تر کام کرنا چاہیئے اور شعر کے ذریعے ایک طرف تو قوم کے دلوں میں تغیر پیدا کرنا چاہیئے اور دوسری طرف لیڈروں کی طبیعتوں کی باگ خاص نصب العین کی طرف موڑنی چاہیئے۔

اقبال زندگی کے کسی شعبے میں بھی عملی آدمی نہیں تھے انکار و تاثرات نے اُن کی تمام شخصیت پر قبضہ کر لیا تھا، مسلمانوں میں چوں کہ قحط الرجال ہے اس لئے یہ قوم ایک ہی انسان سے مختلف اور متضاد تقاضے کرتی ہے اور چاہتی ہے کہ ایک شخص شاعر بھی ہو، فقیر بھی ہو، قومی لیڈر بھی ہو اور پیر و مرشد بھی ہو۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ "ہر کسے را بہر کارے ساختند"، ہر اہل کمال کسی خاص ہی صنف میں کمال رکھتا ہے اور دوسری سمتوں میں اس کی استعداد اوسط سے بھی گر جاتی ہے، ایک زمانہ ایسا آیا کہ ہندوستان کے اکثر بڑے بڑے لیڈر اقبال کے اشعار سے اپنی روحوں میں گرمی پیدا کرتے تھے اور اس کے اشعار کے پیدا کئے ہوئے جوش کو عمل میں تبدیل کرتے تھے، ان میں سے بعض لیڈر جو شاعر کی نفسیات سے واقف نہیں تھے اقبال پر طعنہ زن ہوتے تھے کہ "تم نے ہم کو مومن بنا دیا لیکن خود کافر کے کافر ہی رہے" ایک مرتبہ مولانا محمد علی نے اقبال سے یہی کہا۔ اقبال نے جواب دیا "سنو بھائی! تم نے دیکھا ہوگا کہ جب قوالی ہوتی ہے تو قوال بڑے مزے اور اطمینان سے گاتا ہے لیکن سننے والے ہُو حق کرتے ہیں، وجد میں آتے ہیں، ناچتے ہیں، مضطرب ہوتے ہیں، بے ہوش ہو جاتے ہیں لیکن اگر یہی کیفیتیں قوال پر بھی طاری ہوں تو قوالی ختم ہو جاتی ہیں۔ تو قوم کا قوال ہوں، میں گاتا ہوں تم ناچتے ہو، کیا تم چاہتے ہو کہ میں بھی تمہارے ساتھ ناچنا شروع کر دوں؟"

اس بیان میں اقبال نے بڑے ظریفانہ انداز میں ایک بڑی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ جس طرح فطرت میں تقسیم عمل ہے اس طرح افراد میں بھی تقسیم عمل ہونی چاہئے۔

سیاست اور وطن پرستی

جہاں تک سیاسی افکار، تاثرات اور نصب العین کا تعلق ہے اقبال کی سیاست کے (۳) پہلو تھے، ایک طرف تو وہ تمام بلند پایہ مفکرین، مصلحین کی طرح تمام نوع انسان کی بہتری کے متعلق سوچتا تھا۔ اس کی شاعری کا بیشتر حصہ انسانی زندگی کے نصب العین سے تعلق رکھتا ہے اور براہ راست ملکی سیاست سے بے تعلق معلوم ہوتا ہے، محض مخصوص گروہوں کے متعلق سوچنا عملی سیاست دانوں کا کام ہے اعلیٰ درجے کے شاعر، حکیم اپنی مخصوص گروہوں کو اپنی نظرگاہ نہیں بناتا۔ اقبال ہی کے ماثل جرمنی کا سب سے بڑا شاعر اور مفکر گوئٹے ہے جس کا زمانہ جرمنی کا وہ پرآشوب زمانہ تھا جس میں نپولین نہ صرف جرمنی کو بلکہ تمام یورپ کو تہ و بالا کر رہا تھا۔ گوئٹے اس تمام ہنگامے سے کچھ ایسا بے تعلق معلوم ہوتا تھا کہ بعض نقادوں نے اس کو متہم کیا ہے کہ اس میں جذبۂ حب الوطنی کی کمی تھی اس قسم کی تنقید کوتاہ نظری ہی پر مبنی ہوسکتی ہے وہی گوئٹے جس نے براہ راست اس وقت کی عملی سیاست میں نہ قلم سے حصہ لیا اور نہ عمل سے اپنے افکار کی بدولت جرمنی کی علمی اور تہذیبی عظمت کا بانی ہے۔ اقبال کے متعلق بھی صورت حال اسی قسم کی ہے اس نے شروع میں حب وطن کے عام جذبات کے ماتحت بڑی پرجوش نظمیں وطن پر لکھیں جن سے بہتر آج تک کوئی ہندوستانی شاعر نہیں لکھ سکا لیکن اس دور کے بعد اس کی نظر وطن سے بے تعلق تو نہیں ہوئی لیکن وطن سے بلند ہوگئی اور وہ اس نقطہ نظر پر آگیا جو قرآن میں بیان کیا گیا ہے کہ کسی قوم میں تغیر حقیقی طور پر پیدا نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس قوم کے نفوس میں تغیر پیدا نہ ہو۔ سیاست داں کی نظر فقط ظاہر پر پڑتی ہے اور وہ فقط سطحی تغیرات کی اُدھیڑبُن میں لگا رہتا ہے لیکن حقیقی مصلح کی نظر اساسیات پر پڑتی ہے اور سیاست داں کے مقابلے میں بہت زیادہ وسیع اور دوررس ہوتی ہے۔ سیاست داں محض ابن الوقت ہوتا ہے اور معاملات کی گتھیاں جیسے جیسے پیدا ہوتی جاتی ہیں ان کو سلجھانے کے لئے وہ قاعدے اور قانون بناتا رہتا ہے جن کی تہ میں کوئی پایدار حقیقت نہیں ہوتی۔ اقبال کو یہ خیال ہوا کہ وطن کے متعلق کورانہ جوش کو اُبھارنے کا وہی نتیجہ ہوگا جو مغرب نے جابجا حب الوطنی سے پیدا کیا ہے۔ جغرافیائی حدود کی پرستش سے انسان کی نظر تنگ، اس کی عقل بہانہ جو اور اس کا دل حقیقی عشق سے محروم ہوجاتا ہے لہٰذا وہ اہل وطن کے دلوں میں ایسے جذبات پیدا کرنا چاہتا تھا جن میں محض یورپ کی حب الوطنی کی تقلید نہ ہو بلکہ عدل و انصاف کا راستہ صالحانہ جدوجہد سے سب کے لئے کھل جائے، وطن کی صحیح محبت

اس کے دل میں آخر تک موجود تھی اور وہ اس کو ایک فطری جذبہ خیال کرتا تھا۔ آخر تک اپنی فارسی نظموں میں جہاں کہیں وہ ہندوستان کا ذکر کرتا ہے اس کے بیان میں بڑا درد اور سوز و گداز ہوتا ہے۔ وہ ہر قسم کی غلامی سے بیزار تھا اور وطن کو نہ صرف سیاسی بلکہ اقتصادی، عقلی، مذہبی اور اخلاقی غلامی سے بھی آزاد دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی سیاست کا دوسرا پہلو اس امر کے ساتھ وابستہ ہے کہ وہ صرف ہندی ہی نہیں بلکہ ہندی مسلمان تھا۔ اس نقطۂ نظر سے وہ تمام ہندوستانی مسلمانوں کا نمائندہ تھا جہاں تک سیاست کا تعلق گروہوں کی اصلاح اور ارتقا سے ہے وہ جس طرح ہندوستان کی آزادی اور اس کے لئے اعلیٰ درجے کے اقتدار کا آرزومند تھا، اسی طرح وہ تمام اسلامی دنیا کی آزادی اور اس کی ترقی کا متمنی تھا۔

ہندوستان کے بعض غیر مسلم حضرات مسلمان کی اس فطرت سے آشنا نہیں ہیں چنانچہ جب کوئی مسلمان ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کے متعلق دلچسپی یا جوش اور جذبے کا اظہار کرتا ہے تو وہ یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ یہ ہندوستان کو اپنا وطن نہیں سمجھتا اور وطن پرست یا قوم پرست نہیں ہے۔ ہر صحیح الفطرت مسلمان ہندوستان کی پستی سے اتنا ہی دلگیر ہے جتنا کہ اور کوئی غیر مسلم۔ ہندوستان کی عزت اس کی عزت اور ہندوستان کی ذلت اس کی ذلت ہے اس کا وجود خاکی اسی زمین سے ابھرا اور اسی میں پیوند ہو جائے گا لیکن اسلام نے اس کو ایک ایسی برادری کا بھی رکن بنا دیا ہے جو جغرافیائی حدود سے ماوریٰ ہے مراکش اور چین کے مسلمان کی سیاسی اور تمدنی کشمکش کے ساتھ بھی اس کے دل کو وہی رابطہ ہے جو خود اپنے وطن کی جد و جہد سے ہے۔

مسلمان کی وسعت قلب میں وطن کے لئے ایک نہایت عزیز مقام موجود ہے لیکن وطن سے ماوریٰ دنیا کی عالمگیر اسلامی برادری کو بھی وہ اپنے دل سے الگ نہیں کر سکتا۔ جب تک اسلام کے نصب العین میں کوئی قوت باقی ہے۔ ہر سلیم القلب ہندی مسلمان کی طبیعت میں یہ دونوں جذبے بیک وقت موجود رہیں گے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ان میں سے ایک جذبہ دوسرے کے منافی ہے۔ اب ہندوستان کے غیر مسلم، وسیع النظر راہنما پنڈت جواہر لال نہرو نے بھی سیاست میں یہی نقطۂ نظر اختیار کر لیا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے مسئلے کو باکوئی ہندوستانی سمجھ سکتا ہے اور نہ کوئی صحیح راہ عمل پیش کر سکتا ہے جب تک کہ باقی اقوام کی سیاست کو بھی ساتھ ملا کر اس پر غور نہ کیا جائے۔ جس زمانے میں مسٹر گاندھی اور ان کے شرکا نے خلافت کی تحریک میں عملی حصہ لیا باوجود اس امر کے کہ خلافت سے غیر مسلموں کو کوئی تعلق نہیں تھا مسٹر گاندھی کی اس جد و جہد میں کسی کے دل میں یہ شک و شبہ پیدا نہیں ہوا کہ گاندھی جی ہندوستان کی سیاست سے دور ہٹ گئے ہیں، اس

زمانے میں لالہ لاجپت رائے نے جو ہندوں کے نہ صرف سیاسی بلکہ مذہبی لیڈر بھی تھے ایک مضمون لکھا جس کا موضوع یہ تھا کہ ہندوستان کبھی آزاد نہیں ہو سکتا جب تک کہ اسلامی ممالک بھی آزاد نہ ہوں۔ ہندوستان کی آزادی اور غلامی ان ممالک کی آزادی اور غلامی سے غیر منفک طور پر وابستہ ہے یہی نقطۂ نظر لینن کا بھی تھا حالانکہ وہ اپنی تحریک کو مذہب کے خلاف ایک جہاد سمجھتا تھا محض اپنے سیاسی اور معاشی پروگرام کو مدنظر رکھتے ہوئے لینن کا یہ خیال تھا کہ جب تک اسلامی ممالک آزاد نہ ہوں یورپ کی سرمایہ داری اور ملوکیت کو شکست نہیں ہو سکتی۔

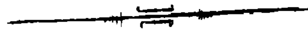
ان حقایق سے آشنا ہونے کے بعد کوئی کج اندیش شخص ہی اس نتیجے پر پہونچ سکتا ہے کہ اقبال کا جذبہ جو اسلامی دنیا کے متعلق تھا وہ اس کی حب وطن سے کوئی الگ چیز ہے۔ حریت کی ایک ہی پکار کے یہ دو حربے تھے اور یہ دونوں حربے اقبال کی شاعری میں نمایاں اور ساتھ ساتھ موجود ہیں۔

جب وہ یہ کہتا ہے کہ انسان کو وطنیت سے پاک ہونا چاہئے اور اس کی گرد کو دامن سے جھٹک دینا چاہئے تو اس سے اس کی مراد فقط وہ غلط وطنیت کا جذبہ ہے جس نے مغربی اقوام کو اندھا کر دیا۔ وہ اس غلط وطنیت سے بچا کر اپنے ہم وطنوں کو وطنیت کے اس جذبے کی طرف لانا چاہتا تھا جو کسی خاص زمین کے ٹکڑے کی پرستش پر مبنی نہ ہو بلکہ عزت انسان اور اس کی روحانی ترقی کے ماتحت ہو۔ ہندوستان کے دوسرے مشہور عالم شاعر ٹیگور کا نقطۂ نظر بھی اقبال سے کچھ الگ نہیں ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ ٹیگور میں جذبہ وطنیت کی کمی ہے لیکن مغربی رنگ کی وطن پرستی کے خلاف ٹیگور نے بھی اپنی آواز بلند کی۔ ٹیگور نے دنیائے ادب میں انسانی دلوں پر جو قبضہ کیا ہے وہ وطن کے متعلق راگ گا کر نہیں کیا ہے بلکہ روح انسانی کی گہرائیوں میں ڈوب کر کیا ہے اور ایسے افکار و تاثرات کی بدولت اس کو عالم گیر شہرت حاصل ہوئی جو ذات پات، نسل اور رنگ اور جغرافیائی حدود سے بلند تر ہیں۔

اقبال ہندوستان کی آزادی اور عظمت کے طالب تھے اور ان مقاصد کے حصول کے لئے ان کی روح میں بڑی بے تابی تھی لیکن ان کو یہ خطرہ محسوس ہوتا تھا کہ یہ آزادی محض آقاؤں کی تبدیلی نہ ہو اور ظلم کی قوتیں جوں کی توں گوروں کے ہاتھوں سے نکل کالوں کے ہاتھوں میں نہ آجائیں۔ سچی آزادی کے لئے وہ یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں ہر گروہ کو نہ صرف نصب العینی طور پر مساوی حقوق حاصل رہیں بلکہ آئین و قوانین اس انداز سے وضع کئے جائیں کہ اس وقت ملک میں جو جو گروہ جس حیثیت سے پس ماندہ اور مظلوم ہیں ان کی پس ماندگی اور مظلومیت کا علاج کیا جائے۔

بعض نام نہاد قوم پرست فقط انگریزوں سے سیاسی قوت چھین لینے کے درپے ہیں اور اُن کے ضمیر میں وہ عدل پیدا نہیں ہوا جو تمام انسانوں کے لئے مساوی طور پر ترقی کی راہیں کھول دے۔ اقبال کے دل میں ہندوستان کے تمام مظلوم طبقوں کے لئے بڑا درد تھا اور اس معاملے میں مسلم اور غیر مسلم کی کوئی تمیز ان کی نگاہ میں نہیں تھی جب وہ مسلمانوں کے جائز حقوق کی حمایت گول میز کانفرنس میں کر رہے تھے تو اس کے ساتھ ہی ہندوستان کی دیگر پس ماندہ اقوام کو بھی شریک کرتے تھے۔ بے سرمایہ اور محروم مزدوکسانوں کی حمایت میں جو کچھ انھوں نے لکھا اس میں کیش و ملت کی کوئی تفریق نہیں پائی جاتی۔

اقبال بھی وطن کی آزادی کا ایک پرجوش مجاہد تھا لیکن مغربی انداز کی وطن پرستی کو بت پرستی سمجھتا تھا جہاں دوسرے قسم کے اصنام کو توڑنے کا کام اس نے اپنے ذمے لیا وہاں یہ بڑا بت بھی اس کی ضرب و حرب سے نہیں بچ سکتا تھا۔



چاندنی رات

تو نے اے خانہ نشیں دیکھا کہاں ہے وہ سماں — جب افق سے چودھویں کا چاند ہوتا ہے عیاں
وہ سہانے جھٹ پٹے میں نقرئی کرنوں کے تار — جس طرح ساون کی بدلی میں ہو بگلوں کی قطار
چمن کے پتوں سے شعاعوں کے گزرنے کا سماں — تھرتھرا اٹھتی ہیں جس سے باغ کی تاریکیاں
تیرگی اور نور کا سنجوگ وہ زیرِ شجر — جس طرح انساں کے دل میں امتزاجِ خیر و شر
وہ نکلنا بادلوں سے چاند کا باآب و تاب — جس طرح گھبرا کے کوئی کھول دے بندِ نقاب
من چلی لہروں پہ کرنوں کے بکھرنے کی ادا — کاکلِ زرتار کے بن کر بگڑنے کی ادا
وہ کنول کے پھول گویا سربسر تصویرِ یاس — رہ کے پانی میں بجھا سکتے نہیں جو اپنی پیاس
خاک پر بکھرے ہوئے کچھ برگ ہائے چاک چاک — انقلابِ زندگی کی داستانِ دردناک

تازگی، افسردگی، تاریکی و تابندگی
باغ سارا اک مرتب داستانِ زندگی

بھیگتی جاتی ہے شب، سارا جہاں خاموش ہے
قلبِ شاعر کے سوا جو چیز ہے مدہوش ہے

شاخ کی آغوش میں کلیوں کا وہ خوابِ گراں
جیسے اطفال نیند کے ماتوں کی ہوں بدمستیاں

نازنیں بوٹے، چمن کی گود کے پالے ہوئے
نیند میں بے سُدھ کھڑے ہیں گردنیں ڈالے ہوئے

چپ کھڑے ہیں کہنہ سال اشجار مثلِ پاسباں
اپنے کندھوں پر سنبھالے بارِ فکرِ گلستاں

خانماں آوارہ ندی جس کی قسمت ہے سفر
دوریٔ منزل سے تھک کر سو گئی ہے بے خبر

صرف دو چیزیں جہانِ پر سکوں میں ہیں رواں
آسماں کا چاند اور میرے نفس کا کارواں

ہے سبق آموز سنّاٹے کی سرگوشی مجھے
درس گاہِ ہوش ہے دنیا کی بے ہوشی مجھے

خامشی یوں بات کرتی ہے دبی آواز سے
اَن سُنے نغمے اُبل پڑتے ہیں دل کے ساز سے

آتی ہے کانوں میں آوازِ ضمیرِ کائنات
جاگ اُٹھتی ہیں دلِ انساں کی خفتہ ممکنات

توڑ کر قیدِ حواسِ خمسہ بندِ شش جہات
خود بخود کھل جاتے ہیں سربستہ اسرارِ حیات

تھک کے ہو جاتا ہے شل جب عقل کا پائے تلاش
آپ کر دیتی ہے فطرت اپنے دل کا راز فاش

چاندنی راتوں میں فرشِ سبز پر لیٹا ہوا
صاف سنتا ہوں زمیں کے دل دھڑکنے کی صدا

دیکھتا ہوں زندگی کی کش مکش ذرات میں
سانس کی جنبش نظر آتی ہے موجودات میں

توڑ کر اک اک کڑی زنجیرِ محسوسات کی
تیرتا پھرتا ہوں لہروں پر روپہلی رات کی

سید وہاج الدین احمد

اقبال کے خدمات

وہ جس نے ایک بے ہمہ و باہمہ زندگی گزاری، سب سے الگ رہ کر بھی جو سب کے ساتھ رہا اور برسوں حقیقی انسانیت اور دین فطرت کا درس دیتا رہا، رزم حق و باطل کے لئے تیغ بے نیام بن کر آیا، انسان گم کردہ خودی کو حریم خودی سے آشنا کرایا اور رموز بے خودی کا جلوہ دکھایا، بھلا اس کے خدمات کا سچا اعتراف کس منہ اور کس زبان سے ہو سکتا ہے مگر پھر بھی آج ہم انسانیت کے اس شیدائی اور اسلام کے اس فدائی کے اہم خدمات کا ذکر کریں گے۔

اسلامی خدمات:-

انسانی تاریخ کی یہ خصوصیت رہی ہے کہ قوموں میں ایک نہ ایک وقت ایسا آتا ہے جب فساد پیدا ہوتا ہے اور وہ اپنے آپ کو منصب انسانیت سے گرا کر ضلالت و گمراہی میں ڈال دیتی ہیں۔ چنانچہ اس سے نجات دلانے کے لئے وقتاً فوقتاً نبی آتے رہے۔ موجودہ دور کی اس عالمگیر ضلالت عجب کہ بنی نوع انسان حق و صداقت کی روشنی سے جدا ہو کر کذب و باطل کی تاریکیوں میں پھنس گئی ہے اور انسانیت اپنے حقیقی اور اصلی مرکز سے بھٹک کر اوہام و خرافات کی اندھیری اور پیچ در پیچ وادیوں میں اِدھر سے اُدھر بھٹک رہی ہے۔ اُسے صراط مستقیم کا کہیں نشان نہیں تھا، مسلمان، جو سیاسی طور پر مغلوب ہو چکے تھے اور قدرت نے ان پر عذاب اسی قسم کا آمادہ کر دیا، پراگندہ دماغ قوموں کی محکومیت کی لعنت مسلط کی جس کا قدرتی طور

پر اثر پڑنا چاہیے تھا اور آخر کار یہ پڑ کر رہا۔ وہ بھی بے دینی کے گرداب میں چکر کھانے لگے اور شک و تذبذب کے انگاروں پر لوٹنے لگے۔ اس روحانی کرب و مصیبت، درد، اور بے چینی سے نجات دلانے کے لئے یہ تو ناممکن تھا کہ پھر ایک نیا نبی پیدا ہوا اور نہ اس کی ضرورت ہی ہی جب کہ ان کو راہ راست پر لانے کے لئے قرآن حکیم اپنی اصلی حالت میں موجود ہے اور پیغمبر (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زندہ سیرت، احادیث طیبہ کی شکل میں ایک زندہ رسول کا کام انجام دے رہی ہے، مگر یہاں سوال تو یہ ہے کہ جب مسلمان انہی سے کنارہ گیر ہو کر ذلت کی زندگی کا شکار ہو گئے تھے تو اب ان سے استفادہ کی شکل ہی کیا باقی رہی تھی، بجز اس کے کہ تقاضائے وقت کے لحاظ سے کوئی ایسا شخص ہو جو ان کو کتاب الٰہی اور پیغمبر کے اسوۂ حسنہ کی طرف متوجہ کرے اور ایک ایسا مولوی معنوی، پھر پیدا ہو جو قرآن کو قند پارسی میں نہ سہی طوطیان ہند کی گفتار ہی میں مسلمانوں کے آگے پیش کرے اور ایک ایسا جمال افغانی، وجود میں آئے جو انھیں خواب غفلت سے چونکا دے۔ آخر یہی ہوا کہ وہ ہستی **اقبال** کی شخصیت میں جلوہ گر ہوئی اور اپنی آتش نفسی سے مسلمانوں کی ایک معقول تعداد کے قلوب میں ایک نئی روح پھونک دی اور ایک ایسا صور پھونکا کہ اگر اکثر اٹھ نہ بیٹھے تو کم از کم چونک تو ضرور پڑے جس کا احساس اُسے خود بھی ہوا اور وہ پکار اٹھا

عجم از نغمہ ام آتش بجان است　　صدائے من درائے کاروان است
حُدی را تیز تر خوانم چو عرفی　　کہ رہ خوابیدہ و محمل گران است

اقبال مسلمانوں میں ایک انقلاب پیدا کرنا چاہتے تھے اور اس قوم کو بیدار کر کے پھر شرف انسانیت کے اعلیٰ ترین زینے پر پہنچانا اور اس کی کھوئی ہوئی عظمت اسے واپس دلانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ محسوس کیا کہ یہ انقلاب اسی وقت ہو سکتا ہے جب ان کی اندرونی گہرائیوں میں انقلاب کا سامان پیدا کیا جائے کیوں کہ یہی قانون فطرت ہے جس کو قرآن کے سادے اور بلیغ الفاظ میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ یعنی،

خدا نے آج تک اُس قوم کی حالت نہیں بدلی　　نہ ہو جس کو خیال آپ اپنی حالت کے بدلنے کا

مسلمانوں کی پستی کا اس وقت یہ حال تھا اور اُن کی ذہنیت اس درجہ مردہ ہو چکی تھی کہ دولت و عظمت طاقت و حشمت سب کچھ لٹا دینے اور انتہائی بے بسی اور کم مائیگی کی حالت پر پہنچ جانے کے باوجود بھی ان میں اتنا احساس باقی نہ رہا کہ وہ کیا تھے اور کیا ہو گئے۔ چنانچہ اس حالت کو وہ اس طرح بیان کرتے ہیں۔

وائے ناکامی متاع کارواں جاتا رہا　　کارواں کے دل سے احساس زیاں جاتا رہا

ایسی حالت میں اقبال نے یہ ضروری سمجھا کہ ان کی موجودہ حالت سے ان کو خبردار کرایا جائے، ان کو بھولا ہوا سبق پھر سے یاد دلایا جائے اور ان کے مقصدِ حیات اور منشائے تخلیق سے ان کو پوری طرح آگاہ کرایا جائے۔ غرض اس سلسلے میں انھوں نے ان کی تمام برائیوں کو ان کے سامنے مختلف طور پر پیش کیا اور ان کی عظمت کی جسے وہ کھو بیٹھے تھے اور اُن کی حقیقت کی جسے وہ فراموش کر چکے تھے خوب خوب تشریح کی تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ صرف اپنے زوال و انحطاط کے احوال سُن سُن کر وہ اور بھی پست ہمت ہو جائیں اور ان پر قنوطیت کا غلبہ ہو جائے بلکہ اس کی بجائے ان میں امنگ اور رجائیت پیدا ہو امید و رجا کا یہی پیغام ہے جو موجودہ عہد کے تمام قومی شاعروں کے مقابلے میں ڈاکٹر اقبال مرحوم کو ممتاز کرتا ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ مسلمانوں میں ہمت کا ایک جذبہ پیدا ہوا اور دلوں میں ایک انقلابی لہر دوڑ گئی، خواہ وہ کتنی ہی ہلکی کیوں نہ ہو۔

اک ولولۂ تازہ دیا میں نے دلوں کو — لاہور سے تا خاکِ بخارا و سمرقند

مسلمان اپنی خودی کو مٹا کر غیر اقوام میں جذب ہو رہے تھے اور اغیار کے سامنے سرِ نیاز خم کرنے میں ذرا بھی جھجک محسوس نہ کرتے تھے۔ اقبال نے بتایا کہ یہ عمل قومی خودداری اور انسانی غیرت کی خودکشی ہے، خود اپنے ہاتھوں اپنا گلا گھونٹنے کی اجازت کسی طرح کسی کو بھی نہیں دی جا سکتی۔

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے — جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو روسیاہی

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات — تو جھکا جب غیر کے آگے نہ من تیرا نہ تن

فقدانِ خودی کے دور میں قومی سیرت غارت ہو جاتی ہے، قلوب میں صرف نفاق ہی نفاق گھر کر لیتا ہے۔ اور ریاکاری کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ خود قوم کے اکابر و شیوخ میں اس عارضے کی شدت ہوتی ہے اور وہی قومی روایات و خصوصیات کو پامال کرنے لگتے ہیں چنانچہ مسلمانوں کے علما، مشائخ، حکما اور اکابر اس بدبختی میں بری طرح مبتلا تھے علما میں نہ حقیقی علم ہی باقی رہا تھا نہ عمل، مطلب کے موافق نئے نئے مسائل گڑھنا قرآن کی من مانی تاویل کرنا ان کا شیوہ بن گیا تھا۔ کہتے ہیں۔

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں — ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

احکام ترے حق ہیں مگر اپنے مفسر — تاویل سے قرآں کو بنا سکتے ہیں پاژند
مجھ کو تو سکھا دی ہے افرنگ نے زندیقی — اس دور کے ملا ہیں کیوں ننگ مسلمانی

مشائخ اور صوفیوں نے طریقت کا ایک نیا نظریہ پیش کیا جس کے تحت شریعت سے کوسوں دور ہو گئے اور احکام الٰہی اور ارشاد نبوی کو اس طرح پامال کیا کہ حقیقی روحانیت سے بالکل محروم ہو گئے نہ ان میں بایزید بسطامی کی سیرت باقی رہی اور نہ جنید بغدادی کی خصوصیت ؎

تم باذن اللہ کہہ سکتے تھے جو رخصت ہوئے — خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن

اب حجرۂ صوفی میں وہ فقر نہیں باقی — خون دل شیراں ہو جس فقر کی دستاویز

ریاکاری اور عیاری کے دام میں خدا کے سیکڑوں سادہ دل بندوں کو پھنسا کر محض دولت کمانے اور گلیم فقر کی تذلیل کرنے لگے۔

ندرانہ نہیں سود ہے پیران حرم کا — ہر خرقۂ سالوس کے اندر ہے مہاجن

قوم میں یوں تو نام نہاد مصلح بھی ہیں اور حکما بھی مگر ان کا جو حال ہے ملاحظہ فرمایئے۔

شاعر بھی ہیں پیدا حکما، اور علما بھی — خالی نہیں قوموں کی غلامی کا زمانہ
مقصد ہو ان اللہ کے بندوں کا مگر ایک — ہر ایک ہو گو شرح معانی میں یگانہ
بہتر ہے کہ شیروں کو سکھا دیں رم آہو — باقی نہ رہے شیر کی شیری کا فسانہ

دور حاضر کی علمی و فنی ترقیوں اور تسخیر فطرت کی کرشمہ سازیوں سے مغرب میں ایک عجیب تحریک کا آغاز ہوا جس کے تحت معبود حقیقی کی پرستش کی بجائے مادیت اور مادی تنگ نظری نے ان میں وطنیت و قومیت کے نئے نئے دیوتا بنا بنا کر کھڑے کرنا شروع کر دیئے۔ وہی کائنات جو انسان کے لئے تھی، انسان ہی اس کا غلام بن گیا، کائنات کی یہ شریف ترین ہستی جس شریف مقصد کے لئے پیدا کی گئی تھی اس سے بیگانہ ہو گئی اور پروردگار عالم کی تسبیح و تہلیل کو چھوڑ کر امتیازات نسل و رنگ کی مالا جپنے لگی اور خدائے کائنات کی عبادت کی جگہ زبان، ملک اور نسل و رنگ کے بھجن گانے لگی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انسانوں کی تقسیم در تقسیم، زبان، ملک، نسل اور رنگ کے اعتبار سے کی جانے لگی اور ایک انسانی گروہ دوسرے انسانی گروہ کا دشمن بن گیا اور ان کے دلوں سے انسانیت کا احترام جاتا رہا۔ اس شیطانی تحریک کا اثر مسلمانوں پر بھی پڑا اور بعض ممالک اسلامیہ میں قومیت

وطنیت اور امتیازاتِ نسل و رنگ کو معبودِ حقیقی اور مقصودِ اصلی کا درجہ بھی ملنے لگا۔ اقبال نے اس کے خلاف ایک زبردست آواز بلند کی اور بتایا کہ کس طرح نہ صرف یہ صحیح انسانیت کے اصول کے منافی ہے بلکہ اسلامی عقاید کے بھی بالکل خلاف ہے، انسانیت کی اس سے بیخ کنی ہوتی ہے، اسلامیت کی اس سے جڑ کٹتی ہے۔

اقوامِ جہاں میں ہے رقابت تو اسی سے تسخیر ہے مقصودِ تجارت تو اسی سے
خالی ہے صداقت سے سیاست تو اسی سے کمزور کا گھر ہوتا ہے غارت تو اسی سے

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے
قومیتِ اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

مغربی اقوام ہوں خواہ مشرقی آج کل انھوں نے قومیت کی ساری بنیاد وطن پر رکھی ہے نتیجہ یہ ہوا کہ خود غرضی اور تفرقہ انگیزی، جنگ و جدال و ہر قسم کے استحصال نے بنی نوع انسان کی مٹی پلید کر ڈالی۔ اقبال نے تبلایا کہ افرادِ قوم کی صحیح اور قومی انسانی سیرت کی تجدید اسی وقت ہوسکتی ہے جب کہ انسان جغرافی حدود سے بالاتر ہو جائے اور صاف طور پر یہ واضح کر دیا کہ ملتِ اسلامیہ کی بنیاد وطن پر رکھنا بالکل ناجائز ہے۔

آں چناں قطعِ اخوت کردہ اند بر وطن تعمیرِ ملت کردہ اند
تا وطن را شمعِ محفل ساختند نوعِ انساں را قبائل ساختند
ایں شجر جنت ز عالم بردہ است تلخیٔ پیکار بار آوردہ است
مردمی اندر جہاں افسانہ شد آدمی از آدمی بیگانہ شد
روح از تن رفت و ہفت اندام ماند آدمیت گم شد و اقوام ماند

ایک اور جگہ اپنے اس مسلک کی تشریح ایک اسلامی واقعہ سے کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ ملک خدا کی ملکیت ہے جس پر اس کے تمام بندوں کا برابر برابر حق ہے۔

طارق چو بر کنارۂ اندلس سفینہ سوخت گفتند کارِ تو بہ نگاہِ خرد خطا است
دوریم از سوادِ وطن باز چوں رسیم؟ ترکِ سبب ز روئے شریعت کجا رواست؟
خندید و دستِ خویش بہ شمشیر برد و گفت ہر ملک ملکِ ماست کہ ملکِ خدائے ماست

یہ ایک افسوس ناک حقیقت ہے کہ وطنی فرق اور نسلی امتیاز سے قوموں میں تباہی پھیل رہی ہے مگر پھر بھی ترکی و ایرانی اور ہندی و افغانی کی تفریقیں باقی ہیں۔

هنوز از بندِ آب و گِل نه رستی تو گوئی رومی و افغانیم من
من اول آدمِ بے رنگ و بوم ازاں پس ہندی و تورانیم من

قوم جب تنزل اور انحطاط کی طرف مائل ہوتی ہے تو اس کے قوائے عمل شل ہو جاتے ہیں۔ یقین جاتا رہتا ہے اور قوم شک کی ٹھوکریں کھانے لگتی ہے۔ لوگوں میں مستی کردار مطلق باقی نہیں رہتی اور مجاہدانہ اوصاف یک قلم مفقود ہو جاتے ہیں۔ وہ اپنی ناکامی اور نامرادی کی بے جا تاویلات کرنے اور اس کو تقدیر الٰہی کے سر تھوپنے کے عادی ہو جاتے ہیں قناعت بے جا کے تحت اچھی شے کے حصول کی پروا نہیں کرتے اور بری ہی شے کو بہتر شمار کرنے لگتے ہیں۔

تن بہ تقدیر ہے آج ان کے عمل کا انداز تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر
تھا جو ناخوب بتدریج وہ خوب ہوا کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

وہ مرد مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستی کردار

چنانچہ انہیں حالات کے پیش نظر اقبال نے یقین و عمل کی ہر جگہ مختلف پیرائے میں تعلیم دی اور ان کے اسرار سے مسلمانوں کو آگاہ کرانے کی کوشش کی۔

یقیں محکم، عمل پیہم محبت فاتح عالم جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی شمشیریں

یقیں مثل خلیل آتش نشینی یقیں اللہ مستی خود گزینی
سن اے تہذیب حاضر کے گرفتار غلامی سے بتر ہے بے یقینی

یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے جس کی شہادت تاریخ کے اوراق سے مل سکتی ہے کہ غلام قوم خود بھی ذلیل ہو جاتی ہے اور اپنے ساتھ اپنی تمام خصوصیتوں اور روایتوں کو بھی ذلیل سمجھنے لگتی ہے۔ مسلمان اپنے ساتھ اپنے پیغمبر دین کو بھی رسوا کر رہے تھے اور ان کے خصوصیات کو ذلیل و بے معنی سمجھنے لگے تھے، اقبال نے اسلام کی بلندی و برتری کی ایسی

تشریح کی کہ غیر تو غیر خود اپنے بھی حیران ہو گئے کہ واقعی ہمارا اسلام، اتنا ارفع و اعلیٰ ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے مسئلہ خلافت انسان کی ایک عجیب و غریب تعبیر کی اور کائنات کے آقائے علی الاطلاق ہونے کی خوب خوب تشریح کی۔ مختلف پیرائے میں اس کا جا بجا ذکر کیا اور بتلایا کہ ساری کائنات انسان کے لئے پیدا کی گئی ہے، زمین و آسمان، چاند سورج، حور و ملائک سب کے سب انسان کے لئے ہیں اور انسان ان سب کی شمولیت میں خدا کے لئے اور پھر خدا انسان کے لئے ہے۔ اس نکتہ کی تشریح نہایت حکیمانہ اور لطیف و بلیغ پیرایے میں یوں کرتے ہیں۔

در دشتِ جنونِ من جبریل زبوں صیدے   یزداں بہ کمند آور اے ہمتِ مردانہ

پھر اسی خیال کو اردو میں اس طرح ادا کرتے ہیں۔

ترا جوہر ہے نوری پاک ہے تو   فروغ دیدۂ افلاک ہے تو
ترے صید زبوں افرشتہ و حور   کہ شاہین شہ لولاک ہے تو

ایک سچا مسلمان جب کہ انسان کامل ہے اور اِنِّی جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیفَۃً کی سچی تعبیر ہے تو پھر کوئی وجہ نہیں کہ سارا عالم اس کی میراث نہ بن جائے۔

عالم ہے فقط مومن جانباز کی میراث   مومن نہیں جو صاحب لولاک نہیں ہے

جہاں تمام ہے میراث مرد مومن کی   مرے کلام پہ حجت ہے نکتۂ لولاک

اقبال عبد و معبود کے تعلق کو قانونی رسم کی بجائے عاشق و معشوق کا تعلق کہتے ہیں اور اس طرح انسانی زندگی کو کیف بخش اور نشاط انگیز بنا دینا چاہتے ہیں اور اس میں ایک سوز و ساز پیدا کر دیتے ہیں۔

عشق سے پیدا نوائے زیر و بم   عشق سے مٹی کی تصویروں میں سوزِ دم بدم

بہ برگ لالہ رنگ آمیزی عشق   بجانِ ما بلا انگیزی عشق
اگر ایں خاکداں را وا شگافی   درونش بنگری خونریزی عشق

عشق کے مضراب سے نغمۂ تارِ حیات		عشق سے نورِ حیات، عشق سے نارِ حیات

جمالِ عشق و مستی نے نوازی		جلالِ عشق و مستی بے نیازی
کمالِ عشق و مستی ظرفِ حیدر		زوالِ عشق و مستی حرفِ رازی

داعی اسلام کے ساتھ مسلمانوں کے باطنی لگاؤ اور دلی عقیدت کی چنگاریاں کو اقبال نے خوب خوب چمکایا، اس باب میں ان کا کلام نہ صرف اردو بلکہ شاید دوسری اسلامی زبانوں کے ذخیرے سے بھی دعویٰ برتری کر سکتا ہے

وہ دانائے سُبل ختم الرسل مولائے کُل جس نے		غبارِ راہ کو بخشا فروغِ وادیٔ سینا
نگاہِ عشق و مستی میں وہی اول وہی آخر		وہی قرآں وہی فرقاں وہی یٰسیں وہی طٰہٰ

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوۂ دانشِ فرنگ		سرمہ ہے میری آنکھ کا خاکِ مدینہ و نجف

کی محمد سے وفا تو نے تو ہم تیرے ہیں		یہ جہاں چیز ہے کیا، لوح و قلم تیرے ہیں (جوابِ شکوہ)

یہاں تک تو ہم نے دیکھا کہ اقبال نے کس طرح اسلامی تعلیم کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کیا ان کے دلوں میں نئے سرے سے اس کی عظمت کا احساس پیدا کرنے کی کوشش کی۔ مگر یہ کام صرف یہیں ختم نہیں ہوجاتا بلکہ ابھی تو صرف نبض دیکھی تھی اور مرض کی تشخیص ہوئی تھی مریض کو جو روز بروز نحیف و مضمحل ہوتا جارہا تھا یہ بتایا گیا کہ وہ کس مرض مہلک کا شکار ہے۔ لہذا اب ضرورت تھی کہ معالجے کی طرف توجہ کی جائے چنانچہ اس کے لئے جو نسخہ کارگر اقبال کو نظر آیا وہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو بتایا جائے کہ انسان کی حقیقت بہ حیثیت فرد کیا ہے اور ایک فرد کو انسان کامل بننے کے لئے جو دراصل مردِ مسلمان کا درجہ ہے، کون سی چیز سب سے اہم ہے چنانچہ اس عجیب و غریب انفرادیت کے لئے خودی کی صفت کو ضروری قرار دیتے ہیں جس کے ذریعے انسان تخلقوا باخلاق اللہ کا سچا مظہر بن کر خالق کائنات کو اپنے اندر جذب کر سکتا ہے۔ اس کے بعد اجتماعی حیثیت اختیار کرنے کے لئے خودی کے درجے سے گزر کر بے خودی کی منزل میں قدم رکھنا ضروری ہے یعنی جب تمام افراد میں اختلاط پیدا ہوجاتا ہے اور فرد ملت میں گم ہوجاتا ہے، اور یہی ملت دراصل ملت اسلامیہ ہے جس میں حریت۔ مساوات اور اخوت بدرجہ اتم پائی جاتی ہیں

اور جس کی زمانی یا مکانی حد بندی نہیں کی جاسکتی۔ غرض اقبال نے فلسفہ خودی اور رموز بے خودی کو ملت اسلامیہ کی حیات و بقا کا واحد علاج بتایا ہے۔

خودی کو یہ اصل نظام عالم قرار دیتے ہیں جس پر افراد کی زندگی کے تسلسل کا انحصار ہے۔

پیکر ہستی ز آثار خودی است		ہر چہ می بینی ز اسرار خودی است
خویشتن را چون خودی بیدار کرد		آشکارا عالم پندار کرد
چوں خودی آرد بہم نیروے زیست		می کشاید قلزمے از جوے زیست

عشق و محبت سے خودی کو تقویت پہنچتی ہے اور گدائی سے یہ کمزور ہو جاتی ہے۔ پس خودی کے استحکام کے لئے لازمی ہے کہ عشق و محبت یعنی جذبہ عمل کو بڑھایا جائے اور ہر قسم کی گدائی یعنی بے عملی سے احتراز کیا جائے۔

نقطۂ نورے کہ نام او خودی است		زیر خاک ما شرار زندگی است
از محبت می شود پائندہ تر		زندہ تر سوزندہ تر تابندہ تر
از سوال آشفتہ اجزائے خودی		بے تجلی نخل سینائے خودی

خودی کی تربیت کے لئے تین مراحل طے کرنا پڑتے ہیں اول اطاعت، دوم ضبط نفس، سوم نیابت الٰہی اور یہی نیابت انسانی زندگی کا درجہ کمال ہے جب کہ خودی مکمل ہو جاتی ہے اور انسان بہ حیثیت خلیفۃ اللہ دنیا پر حکومت کرتا ہے

نائب حق در جہاں بودن خوش است		بر عناصر حکمراں بودن خوش است
نائب حق ہمچو جان عالم است		ہستی او ظل اسم اعظم است
از رموز جزو و کل آگہ بود		در جہاں قائم بامر اللہ بود

یہاں تک خودی کا درجہ ہے اس کے بعد بے خودی کا درجہ آتا ہے جب کہ تمام افراد ایک ہی رشتہ ملت میں منسلک ہو جاتے ہیں اور فرد و ملت کا ایک ایسا ربط باہمی قایم ہو جاتا ہے کہ فرد جماعت میں گم اور جماعت فرد میں گم ہو جاتی ہے وحدت کثرت میں جذب اور کثرت وحدت میں پنہاں ہو جاتی ہے۔

فرد را ربط جماعت رحمت است		جوہر او را کمال از ملت است
تا توانی با جماعت یار باش		رونق ہنگامۂ احرار باش

حرزِ جاں کن گفتۂ خیر البشر — ہست شیطاں از جماعت دور تر
فرد و قوم آئینۂ یک دیگراند — سلکِ گوہر کہکشاں و اختراند
فرد می گیرد ز ملت احترام — ملت از افراد می یابد نظام
فرد تا اندر جماعت گم شود — قطرۂ وسعت طلب، قلزم شود
پیکرش از قوم و ہم جانش ز قوم — ظاہرش از قوم و پنہانش ز قوم
وحدتِ او مستقیم از کثرت است — کثرت اندر وحدت او وحدت است

اب اس ملت کو ملت اسلامیہ میں تبدیل کرنے کے لئے جن اساسی ارکان کی ضرورت ہے وہ توحید خداوندی اور رسالت ہیں جن کے بغیر ملت اسلامیہ کی تاسیس و تشکیل ناممکن ہے۔

ملتِ بیضا تن و جاں لا الہ — ساز ما را پردہ گرداں لا الہ
لا الہ سرمایۂ اسرارِ ما — رشتہ اش شیرازۂ افکار ما
ما ز نعمت ہائے او اخواں شدیم — یک زبان و یک دل و یک جاں شدیم

رسالت کی تعبیر فرماتے ہیں۔

حق تعالیٰ پیکرِ ما آفرید — وز رسالت درتنِ ما جاں دمید
حرفِ بے صورت دریں عالم بُدیم — از رسالت، مصرعۂ موزوں شدیم
از رسالت در جہاں تکوینِ ما — از رسالت دینِ ما، آئینِ ما
از رسالت صد ہزارِ ما یک است — جزوِ ما از جزوِ ما لاینفک است
ما ز حکمِ نسبتِ او ملتیم — اہل عالم را پیامِ رحمتیم
فرد از حق ملت از وے زندہ است — از شعاعِ مہر او تابندہ است

بنی نوع انسان کو اپنی جماعت یا ملت میں منزلِ انسانیت پر پہنچنے اور عزت و احترام کی زندگی بسر کرنے کے لئے لازمی ہے کہ اس میں حریت، مساوات اور اخوت کے زریں اوصاف پائے جائیں۔ چنانچہ ان کی تاسیس و تشکیل رسالت محمدی کے ذریعے عمل میں آئی۔ دنیا میں جب وقت خواجگی اور بندگی کا دور دورہ تھا ایک انسان

دوسرے انسان کی غلامی میں ذلت و حقارت کی زندگی بسر کر رہا تھا، مرتبت انسانیت کے سیکڑوں درجے مقرر تھے اور بنی آدم کے درمیان بیگانگی و مغائرت کی سیکڑوں خلیجیں حائل تھیں کہ صحرائے عرب میں بحیرہ احمر کے ساحل پر ایک رسول آخرالزماں آیا اور اپنی رسالت کے ساتھ حریت و مساوات اور اخوت کا پیغام لایا اور غلامی و بادشاہی کی زنجیر آہنی کو اپنی آسمانی تیغ کی ایک ہی ضرب سے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ محمود و ایاز ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے محتاج و غنی کے امتیازات جاتے رہے اور تمام مسلمان بھائی بھائی ہو گئے۔ یہ تھا رسالت محمدیہ کا اعجاز جو ملت اسلامیہ کا راز ہے۔

اُمتے از ماسوا بیگانۂ — بر چراغ مصطفےٰ پروانۂ
مرسلان و انبیا آبائے او — اکرم او نزد حق اتقائے او
کل مومن اخوۃ اندر دلش — حریت سرمایۂ آب و گلش
ناشکیب امتیازات آمدہ — در نہاد او مساوات آمدہ

کسی ملت کے نظام کے لئے آئین و قوانین ہونا چاہئیں چنانچہ اس ملت اسلامیہ کا آئین مسلّم اور قانون محکم قرآن مجید قرار پایا۔

تو ہمی دانی کہ آئین تو چیست؟ — زیر گردوں سرّ تمکین تو چیست
آن کتاب زندہ قرآن حکیم — حکمت او لایزال است و قدیم
نسخۂ اسرار تکوین حیات — بے ثبات از قوتش گیرد ثبات
حرف او را ریب نے تبدیل نے — آیہ اش شرمندۂ تاویل نے
گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

اقبال نے نہایت صداقت و خلوص کے ساتھ مسلمانوں کو بتا اور جتلا دیا کہ اُن کی زیست و بقا کا دارو مدار صرف قرآن و رسالت پر ہے۔

انسانی خدمات:۔

اسلامی خدمات کے سلسلے میں ہم نے ابھی دیکھا کہ اقبال کی ساری تعلیم صحیح انسانیت پر مبنی ہے جو لوگ اسلام اور اسلامی تعلیم کو محدود کر دیتے اور عام انسانی فلاح و بقا کو پیش نظر نہیں رکھتے وہ درحقیقت اسلام کے صحیح مفہوم سے

ناآشنا ہیں۔ اسلام ایک فطری مذہب ہے جس کا مقصد بنی آدم کو انسانیت کے اعلیٰ ترین مراتب اور کامیابی و فلاح کے بلند ترین مدارج پر پہنچانا ہے اور یہ اس بات کی کوشش کرتا ہے کہ انسان اُس رفیع ترین مرتبے سے جو اس کے شایان شان ہے، گر کر خدا کی دیگر مخلوق کے سامنے ذلیل نہ ہونے پائے۔

اقبال کی شاعری محض مسلمانوں کے لئے نہیں بلکہ تمام بنی نوع انسان کے لئے ہے اور ان کے خدمات نہ صرف مسلمانوں کے واسطے ہیں بلکہ تمام انسانوں کے واسطے۔ ان کے فلسفۂ خودی سے نہ صرف ایک مسلمان بہرہ ور ہو سکتا ہے بلکہ دیگر انسان بھی مساوی طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔

بے ذوقِ نمود زندگی موت　　　تعمیرِ خودی میں ہے خدائی
رائی زورِ خودی سے پربت　　　پربت ضعفِ خودی سے رائی

تری زندگی اسی سے تری آبرو اسی سے　　　جو رہی خودی تو شاہی نہ رہی تو رو سیاہی

ان کی تعلیم محبت میں نہ صرف مسلمانوں کی فلاح و نجات ہے بلکہ عام انسانوں کی بھی۔

شکتی بھی شانتی بھی بھگتوں کے گیت میں ہے　　　دھرتی کے باسیوں کی مُکتی پریت میں ہے

اقبال ہرگز یہ نہیں چاہتے کہ ایک دوسرے انسان کی بندگی کرے وہ جوہرِ شرافت کا احترام کرتے اور اس کی حفاظت کرنا چاہتے ہیں وہ انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے، کبھی بھی حیوان کے درجے پر دیکھنا نہیں چاہتے۔

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد　　　گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد
یعنی از خوئے غلامی ز سگاں خوار تر است　　　من ندیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد

انسان کو باہمی پیار اور محبت کا درس کس لطیف پیرایے میں دیتے ہیں۔

خدا کے عاشق تو ہیں ہزاروں بنوں میں پھرتے ہیں مارے مارے　　　میں اس کا بندہ بنوں گا جس کو خدا کے بندوں سے پیار ہوگا

تمدنی و عمرانی خدمات :-

اقبال کا شمار عہد حاضر کے اُن مفکرین میں کیا جا سکتا ہے جنھوں نے تہذیب نوکی اور تمدن جدید کی حقیقت کو آشکارا کیا ہے چنانچہ ان کی نگاہیں موجودہ تمدن کی تہہ تک پہنچ گئیں اور انھوں نے اس کو بے نقاب کرکے تمام نقائص پر روشنی

ڈالی اور آنے والے خطرات سے لوگوں کو آگاہ کرنے کی کوشش کی۔

ہر تہذیب و تمدن میں عموماً تین بڑے عناصر کارفرما ہوتے ہیں۔ ایک معیشت۔ دوسرے معاشرت۔ تیسرے سیاست چنانچہ موجودہ تہذیب و تمدن کے انھیں تینوں عناصر کا مطالعہ علی الترتیب ہم اقبال کے اشعار کی روشنی میں کریں گے۔

معیشت:۔ موجودہ نظام معیشت کی سب سے بڑی خصوصیت سرمایہ داری کا عروج اور اصل دارانہ طریق پیدائش کا کمال ہے جس کے تحت دولت ایک کثیر مقدار میں پیدا ہو رہی ہے مگر اس دولت کو پیدا کرنے والے دو اہم عوامل یعنی آجر اور مزدور کو جو ثمرہ ملنا چاہئے وہ یہ ہے کہ ایک مالا مال ہو جاتا ہے اور دوسرا خستہ حال۔ بے چارہ مزدور روٹیوں کو محتاج اور آجروں کے در کا بھکاری بن گیا ہے۔ دولت کی بے جا تقسیم نے سرمایہ داروں کے ہاتھوں مزدوروں کے حقوق تلف کرڈالے اور وہ اپنی جائز اُجرت سے بھی محروم کر دیئے گئے۔

دستِ دولت آفریں کو مُزد یوں ملتی رہی　　اہل ثروت جیسے دیتے ہیں غریبوں کو زکات
مکر کی چالوں سے بازی لے گیا سرمایہ دار　　انتہائے سادگی سے کھا گیا مزدور مات

خواجہ از خونِ رگِ مزدور سازد لعلِ ناب　　از جفائے دہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب
انقلاب، انقلاب، اے انقلاب

یہ ہے موجودہ نظام معیشت کا خلاصہ جس سے تنگ آکر کارل مارکس، جرمنی کے مشہور اسرائیلی ماہر معاشیات نے سرمایہ داری کے خلاف آواز بلند کی اور ایک نیا نظام معیشت پیش کیا۔ کارل مارکس کی آواز سُنئے:۔

یہ علم و حکمت کی مُہرہ بازی یہ بحث و تکرار کی نمایش　　نہیں ہے دُنیا کو اب گوارا پُرانے افکار کی نمایش
تری کتابوں میں اے حکیم معاش رکھا ہی کیا ہے آخر　　خطوط خم دار کی نمایش مریز و کج دار کی نمایش

موجودہ نظام معیشت میں ساری قوت سرمایہ داروں کو اور ساری اہمیت اصل و سرمایہ کو حاصل ہے جو تجارتی کاروبار اور سود کی پیداوار ہے یہ وہی سود ہے جس کو ارسطو نے نفرت کی نگاہ سے دیکھا اور یہ کہتے ہوئے کہ زر چونکہ بچے نہیں دیتا اس کو قطعاً ناجائز قرار دے دیا۔ یہ وہی سود ہے جس کے متعلق کارل مارکس کا یہ خیال تھا کہ یہ ایک قسم کی ڈکیتی ہے جس کے ذریعہ سرمایہ دار غیر معمولی طاقت حاصل کر لیتا ہے اور مزدور اس کی جبرہ دستیوں کا

شکار بن جاتا ہے۔ یہ وہی سود ہے جس کو اسلام اور بعض دیگر مذاہب نے بھی حرام قرار دیا ہے۔ مگر معاشی تاویلات نے اسے جائز قرار دے دیا۔ حالانکہ یہ تجارت کی فریب وہی ہے جس کے پردے میں جوا کھیلا جارہا ہے اور سود کے پیدا آور ہونے کا ایک بہانہ ہے جس کے ذریعے مین دار کا خون چوسا جارہا ہے اس راز کو اقبال نے طرح طرح سے فاش کیا ہے

ظاہر میں تجارت ہے حقیقت میں جوا ہے ۔۔۔ سود ایک کا لاکھوں کے لئے مرگ مفاجات

تجارتی تعلقات کی ترقی، مختلف اشیاء کا مختلف ممالک کے مابین مبادلہ، رقوم کی ادائیگی، اصل و سرمایہ کی فراہمی اور نظام زر کی ترقی نے بڑے بڑے بنک قایم کر رکھے ہیں جن کی عالی شان عمارتوں سے آنکھیں خیرہ ہوجاتی ہیں۔

رعنائی تعمیر میں رونق میں صفا میں ۔۔۔ گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کے عمارات

دنیا کی ہر زرعی ملک میں کاشت کار اور کسان طبقہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس ملک کی دولت بڑی حد تک اسی کی محنت و مشقت کا نتیجہ ہوتی ہے لیکن یہ کس قدر ناانصافی ہے کہ اس سے مستفید دوسرا طبقہ ہوتا ہے اور کسانوں کا خون چوسا جاتا ہے۔ ہندوستان کے زراعت پیشہ طبقے کا یہی حال ہے۔ اس کی پیداوار کے مالک حاکم، زمیندار اور ساہوکار ہوتے ہیں اور یہ بے چارہ اُن کا دست نگر اور مرہون منت ہوکر انتہائی غربت و افلاس کی زندگی بسر کرتا ہے

دہقاں ہے کسی قبر کا اگلا ہوا مُردہ ۔۔۔ بوسیدہ کفن جس کا ابھی زیر زمیں ہے

جاں بھی گرو غیر بدن بھی گرو غیر ۔۔۔ افسوس کہ باقی نہ مکاں ہے نہ مکیں ہے

قدیم زمانے میں جو جنگیں ہوا کرتی تھیں وہ بہت کچھ جہاں بانی اور ملک گیری کے جذبے کے تحت مگر آج کل کی جنگوں کا مقصد محض معاشی استحکام و اقتدار حاصل کرنا ہے اور یہی وہ جذبہ ہے جس نے خوں ریزی و غارت گری کو اس درجہ عام کر دیا ہے انسانی خون پانی کی طرح بہایا جارہا ہے۔ حبش، ہسپانیہ، اور چین کی جنگیں ہمارے سامنے ہیں۔

غارت گری جہاں میں ہے اقوام کی معاش ۔۔۔ ہر گرگ کو ہے برۂ معصوم کی تلاش

معاشرت:- تہذیب جدید کے معاشی پہلو کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قدیم معاشرت کا اخلاقی و معاشرتی معیار بہت کچھ بدل گیا۔ اور ان کی جگہ نت نئے اصول و معیار تراشے جارہے ہیں۔ اسلاف کے عادات و اطوار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ جو کام پہلے معیوب سمجھا جاتا تھا وہ اب مستحسن قرار دیا جاتا ہے۔ غرض قماربازی، مے خواری، فیشن پرستی، نسوانی آزادی و بے پردگی جیسی ہر شے موجودہ تہذیب کے لوازم میں داخل ہے۔ تہذیب کے فرزندوں کے خیال میں

جب تک یہ ساری باتیں کسی معاشرت یا قوم میں نہ ہوں وہ مہذب نہیں کہی جاسکتی۔

جہاں قمار نہیں زن تنک لباس نہیں — جہاں حرام بتاتے ہیں شغل مے خواری
بدن میں گرچہ ہے اک روح ناشکیب و عمیق — طریقۂ اب و جد سے نہیں ہے بے زاری
نظر دران فرنگی کا ہے یہی فتویٰ — وہ سرزمین مدنیت سے ہے ابھی عاری

تعلیم نسواں کی عمومیت اور عورتوں کو مردوں کے ہم پلہ کردینے کی ہوس نے عورتوں کو کہیں کا بھی نہ رکھا۔ عورتوں نے تعلیم پائی اپنی جہالت کو دور کیا، اچھا کیا، مگر افسوس اس کے ساتھ ہی نسوانیت کو بھی بھلا بیٹھیں ایسی تعلیم جو عورت کو عورت باقی نہ رکھے کہاں تک درست ہے۔

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن — کہتے ہیں اسی علم کو ارباب نظر موت

مغرب والوں نے پردہ کو اتنا ذلیل سمجھا کہ یک قلم اسے اتار پھینکا۔ عورتیں بے پردہ ہوگئیں، خلوت سے جلوت میں آگئیں۔ آنکھوں سے نسوانی حجاب اٹھ گیا۔ نگاہیں روشن ہوگئیں مگر افکار و خیالات روشن نہ ہوسکے۔ معاشرت میں بداخلاقی رائج گئی۔

رسوا کیا اس دور کو جلوت کی ہوس نے — روشن ہے نگہ آئینۂ دل ہے مکدر
بڑھ جاتا ہے جب ذوق نظر اپنی حدود سے — ہو جاتے ہیں افکار پراگندہ و ابتر

مغربی معاشرت کی خصوصیت و کمالات کا ایک اور نتیجہ ملاحظہ فرمائیے۔

کوئی پوچھے حکیم یورپ سے — ہند و یوناں ہیں جس کے حلقہ بگوش
کیا یہی ہے معاشرت کا کمال — مرد بے کار و زن تہی آغوش

آخر معاشرت میں یہ خرابیاں کیوں پیدا ہوئیں؟ اس کا ذمہ دار کون ہے؟ مرد یا عورت: یہ کس کی نوبی عقل کا نتیجہ ہے جواب ملتا ہے کہ اسی مرد فرنگ کے یہ سب کرامات ہیں۔

قصور زن کا نہیں اس خرابی میں — گواہ اس کی شرافت پہ ہیں مہ و پرویں
فساد کا ہے فرنگی معاشرت میں ظہور — کہ مرد سادہ ہے بے چارہ زن شناس نہیں

تہذیب و تمدن کی ترقی و تغیر کے ساتھ ادبیات و فنون لطیفہ میں بھی تغیر پیدا ہوگیا ہے۔ فنون لطیفہ میں مصوری اور مجسمہ تراشی

کو قدیم زمانے سے خاص اہمیت حاصل رہی ہے۔ موجودہ زمانے کی معاشرت میں سینمانے خاص درجہ حاصل کر لیا ہے۔

وہ صنعت نہ تھی شیوۂ کافری تھا
یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے
وہ مذہب تھا اقوامِ عہدِ کہن کا
یہ تہذیب حاضر کی سوداگری ہے

ہندوستانی شاعر، ہندوستانی ادیب اور مصور کا یہ حال ہے کہ مغربی تہذیب کا پجاری اور فرنگی ہنر کا بھکاری ہے، وہی عورت پرستی و شہوت ناکی اس پر بھی مستولی ہے:۔

عشق و مستی کا جنازہ ہے تخیل اُن کا
ان کے اندیشۂ تاریک میں قوموں کے مزار
چشم آدم کو چھپاتے ہیں مقامات بلند
کرتے ہیں روح کو خوابیدہ بدن کو بیدار
ہند کے شاعر و صورت گر و افسانہ نویس
آہ! بے چاروں کے اعصاب پہ عورت ہے سوار

غرض مغربی تہذیب نے موجودہ معاشرت کا جو حال کر دیا ہے وہ مختصراً یہ ہے کہ

بے کاری و عریانی و میخواری و افلاس
کیا کم ہیں فرنگی مدنیت کے فتوحات

سیاست :۔

اس میں شک نہیں کہ انسان نے علم و فن میں گوناگوں ترقیاں کیں اور نئے نئے کمالات پیدا کئے سیاست اور طرز حکومت نے نئی نئی شکلیں اختیار کر لی ہیں جو بظاہر تو ترقی کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں لیکن اگر بنظر غور دیکھا جائے اور اُن کے عملی نتائج کا مشاہدہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ سب کی سب مستبد ملوکیت سے کسی طرح کم نہیں۔ قرآن حکیم میں اس کی تشریح یوں کی گئی ہے۔ اِنَّ الْمُلُوكَ اِذَا دَخَلُوا قَرْيَةً اَفْسَدُوهَا وَجَعَلُوا اَعِزَّةَ اَهْلِهَا اَذِلَّةً (بادشاہ جب کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو اُس کو خراب کر دیتے اور وہاں کے سرداروں کو بے عزت کر دیتے ہیں) اور اقبال نے اس کی توضیح یوں کی ہے۔

آ بتا دوں تجھ کو رمز آیۂ اِنَّ الْمُلُوکْ
سلطنت اقوامِ غالب کی ہے اِک جادوگری
ہے وہی سازِ کہن مغرب کا جمہوری نظام
جس کے پردوں میں نہیں غیر از نوائے قیصری
دیو استبداد جمہوری قبا میں پائے کوب
تو سمجھتا ہے، یہ آزادی کی ہے نیلم پری
مجلس آئین و اصلاح و رعایات و حقوق
طب مغرب میں مزے میٹھے اثر خواب آوری

گرمیٔ گفتارِ اعضائے مجالس الاماں
یہ بھی اک سرمایہ داری کی ہے جنگِ زرگری

غرض شہنشاہیت، جمہوریت، اشتراکیت اور فاشیت کے پردے میں مردم کشی و غارت گری اس طرح جائز ہوگئی اور اس بت نے انسان کی وہ گت بنا رکھی ہے کہ بنی آدم کا اس خاک دان ارضی پر چین اور اطمینان کی زندگی بسر کرنا ناممکن ہو گیا ہے۔ ارباب سیاست جن کو حریت اور انسانیت کا نگہبان بنایا گیا تھا وہی اسے اس طرح پامال کر رہے ہیں اور لاکھوں معصوم بندگان خدا کو اس بے رحمی سے ہلاک کر رہے ہیں کہ الاماں والحفیظ، شیطان نے تو اپنی ابلیسانہ حرکت سے ایک ہی انسان کو قتل کرایا تھا مگر آج ارباب سیاست اپنی اس خصلت سے لاکھوں انسانوں کو تہ تیغ کر رہے ہیں۔ خود شیطان بھی کانوں پر ہاتھ دھرتا ہے اور پکار اُٹھتا ہے۔

جمہور کے ابلیس ہیں ارباب سیاست
باقی نہیں اب میری ضرورت تہِ افلاک

ہر قوم کا سیاسی مقصد یہ بن گیا ہے کہ دنیا کی ساری طاقتوں کی تنہا مالک ہوجائے چاہے اس میں کتنی بھی سفاکی اور خوں ریزی سے کام لینا پڑے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ظلم و استبداد کی تلواریں سیاسی نیام سے بے دھڑک نکلتی اور کمزور اقوام کی گردن پر چلتی جاتی ہیں۔ جاپان نے نہ صرف منچوریا کو ہڑپ کر لیا بلکہ چین پر بھی اپنے خونی پنجے مار رہا ہے۔ اطالیہ نے کمزور حبش کو ایک آن میں ہضم کر لیا۔ فلسطین ایک عجیب بدامنی کا شکار ہے۔ اسپین میں ایک نئی قیامت برپا ہے۔ غرض ایک طاقت دوسری طاقت کی حریف بنی ہوئی ہے اور لطف تو یہ ہے کہ ہر طاقت صرف اپنے لئے ظلم و سفاکی کو روا تصور کرتی ہے اور دوسری کو ملامت کرتی اور طعنے دیتی ہے۔ حالاں کہ غرض و غایت سبھوں کی ایک ہی ہوتی ہے چنانچہ مسولینی اپنے مشرقی حریفوں سے سوال کرتا ہے۔

کیا زمانے سے نرالا ہے مسولینی کا جرم
بے محل بگڑا ہے معصومانِ یورپ کا مزاج

میں پھٹکتا ہوں تو چھلنی کو برا لگتا ہے کیوں
ہیں سبھی تہذیب کے اوزار تو چھلنی میں چھاج

میرے سودائے ملوکیت کو ٹھکراتے ہو تم
تم نے کیا توڑے نہیں کمزور قوموں کے زجاج

یہ عجائب شعبدے کس کی ملوکیت کے ہیں
راج دہانی ہے مگر باقی نہ راجہ ہے نہ راج

آلِ سیزر چوبِ نے کی آبیاری میں رہے
تم نے تو دنیا کے بنجر بھی نہ چھوڑے بے خراج

تم نے لوٹے بے نوا صحرا نشینوں کے خیام
تم نے لوٹی کشتِ دہقاں تم نے لوٹے تخت و تاج

پردۂ تہذیب میں غارت گری آدم کشی — کل روا رکھی تھی تم نے میں روا رکھتا ہوں آج

انگلستان کے ایک اہل قلم مذہبی پیشوا نے لکھا ہے "کسی عقلی اور اخلاقی معیار سے بھی جانچا جائے تو دنیا میں فریڈرک اعظم اور نپولین سے بڑھ کر کوئی بدمعاش نہیں گزرا اس لئے کہ ان دونوں کا مقصد ہی یہ تھا کہ جنگ کئے جاؤ چاہے انسانوں کا کتنا ہی خون بہہ جائے" سکندر اور چنگیز پر بھی ان کے مظالم و استبداد کے پیش نظر لعنتیں بھیجی جاتی ہیں مگر سوال یہ ہو کہ ان لعنتوں میں صرف ان بے چاروں ہی کو کیوں شریک کیا جاتا ہے یہاں تو ایسے کتنے ظالم ہیں جنھوں نے موجودہ زمانے میں سفاکی اور خوں ریزی کو اپنا پیشہ بنا لیا ہے۔ سکندر کی قزاقی اور سفاکی صرف خشکیوں تک محدود تھی۔ موجودہ زمانے کے سکندر کی قزاقی اور سفاکی خشکی سے متجاوز ہو کر سمندروں پر چھا گئی چنانچہ قدیم سکندر جدید سکندر کی بڑھتی ہوئی سفاکی کو دیکھ کر اس پر لعنت بھیجتا ہے۔

صلہ تیرا تری زنجیر یا شمشیر ہے میری — کہ تیری رہزنی سے تنگ ہے دنیا کی پہنائی

اس کا جواب موجودہ سکندر جس کی حیثیت ایک بحری قزاق کی ہے اس طرح دیتا اور اپنا راز فاش کرتا ہے۔

سکندر! حیف تو اس کو جواں مردی سمجھتا ہے — گوارا اس طرح کرتے ہیں ہم چشموں کی رسوائی

ترا پیشہ ہے سفاکی مرا پیشہ ہے سفاکی — کہ ہم قزاق ہیں دونوں تو میدانی میں دریائی

اسی خوں ریزی اور بدامنی کو روکنے کی خاطر جمعیت اقوام قایم کی گئی اور لوگوں نے یہ سمجھا کہ اب دنیا کے ہر گوشے میں امن ہی امن کا دور دورہ ہوگا۔ لیکن اقبال افرنگ و سیاستِ افرنگ کے مزاج سے اچھی طرح واقف تھے انھوں نے اس حقیقت کو بھی واضح کر دیا۔

برفتد تا روشِ رزم دریں بزم کہن — دردمندانِ جہاں طرحِ نو انداختہ اند

من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند — بہرِ تقسیمِ قبور انجمنے ساختہ اند

نتیجہ بھی اس انجمن کا ایسا ہی ہوا اور واقعات نے ثابت کر دیا کہ ارباب سیاست کی عیاریوں کے سامنے اس کی کچھ نہیں چل سکتی۔ بے چاری امن کی یہ دیوی کس مپرسی کی حالت میں اپنی زندگی کی آخری سانسیں لے رہی ہے۔ آج ختم ہوئی کل ختم ہوئی۔

بے چاری کئی روز سے دم توڑ رہی ہے — ڈر ہے خبر بد نہ مرے منہ سے نکل جائے

تقدیر تو مبرم نظر آتی ہے ولیکن پیران کلیسا کی دعا یہ ہے کہ ٹل جائے
ممکن ہے کہ یہ داشتۂ پیرک افرنگ ابلیس کے تعویذ سے کچھ روز سنبھل جائے

بہرحال موجودہ تہذیب و تمدن کی معاشی، معاشرتی اور سیاسی حالات کچھ دنوں اگر یوں ہی رہے تو پھر اس کا کیا مآل ہوگا کچھ نہیں کہا جاسکتا بجز اس کے کہ سائنس کی ترقی، سیاست کی پیچیدگی اور اقوام عالم کی خود غرضی، انسانیت اور بھلنساہت سے بے توجہی اپنا گلا آپ گھونٹ لے گی۔ اور مغرب کی یہ رنگینیاں کچھ زیادہ پائدار ثابت نہ ہوں گی۔

شفق نہیں مغربی افق پر یہ جوئے خوں ہے یہ جوئے خوں ہے طلوع فردا کا منتظر رہ کہ دوش و امروز ہے فسانہ
وہ فکر گستاخ جس نے عریاں کیا ہے فطرت کی طاقتوں کو اسی کی بے تاب بجلیوں سے خطر میں ہے اس کا آشیانہ

لہذا تہذیب و تمدن کے علم برداروں کو سمجھ لینا چاہیے

تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائدار ہوگا

ادبی خدمات:-

اقبال کے ادبی خدمات سے متعلق تو بہت کچھ لکھا جا چکا ہے اور لکھا جائے گا مگر یہاں اس کا ذکر ایک تو یوں بھی ضروری ہے کہ یہ مضمون ادھورا نہ رہ جائے دوسرے اس لئے کہ اس ضمن میں بعض ایسی باتوں کا خاص طور پر اظہار مقصود ہے جن پر عموماً بہت کم توجہ کی گئی ہے یوں تو ادبی خدمات کے سلسلے میں اقبال نے پیام مشرق، مثنوی اسرار و رموز جاوید نامہ جیسی گراں مایہ کتابیں لکھ کر فارسی جیسے وسیع ادب کو بھی اپنا رہین منت بنائے بغیر نہ چھوڑا مگر اردو ادب کو انھوں نے اپنی حکیمانہ، فلسفیانہ اور فطری شاعری کا جو ایک بے بہا خزانہ عطا کیا ہے۔ اس کے بار احسان سے وہ کبھی بھی سبکدوش نہیں ہوسکتا۔

انھوں نے جدید اردو شاعری میں ایک ایسا رنگ بھر دیا کہ نہ صرف جدید شاعری کے پرستاروں کو یہ رنگ بھلا معلوم ہوا بلکہ قدیم دبستان سے تعلق رکھنے والوں کے منہ سے بھی بے ساختہ واہ نکل گئی۔

اقبال نے اپنی شاعری کے لئے آسان سے آسان اور مشکل سے مشکل موضوع اور عنوان کا انتخاب کیا تاکہ متوسط اور معمولی فہم والے بھی اس سے مستفید ہوسکیں اور اعلیٰ ذہانت و فہم رکھنے والے بھی اس سے لطف حاصل کرسکیں۔ اور نہ صرف یہ بلکہ بچوں کے لئے بھی متعدد نظمیں لکھیں۔ اس کے علاوہ ایک طرۂ امتیاز جو اقبال کو حاصل ہے وہ یہ کہ انھوں نے شاعری کی

تقریباً ہر صنف میں طبع آزمائی کی اور نہ صرف کامیاب ہی رہے بلکہ اس میں کمال بھی پیدا کیا۔ غزل ایک ایسی صنف ہے جس میں جدید رنگ کا شاعر بھی قدیم طرز اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے مگر اقبال نے نہ صرف قدیم طرز میں عمدہ سے عمدہ غزلیں لکھیں بلکہ اپنی غزلوں میں ایک نیا رنگ ایسا پیدا کیا کہ وہ اپنے کمال حسن اور ترنم و سوز میں کسی طرح بھی قدیم طرز کی غزلوں سے کم نہیں۔ پھر خوبی یہ کہ کسی غزل کو بھی شروع سے آخر تک پڑھ جایئے ہر شعر میں ایک نئی خوبی، ایک نیا حسن ایک نیا تخیل اور سوز و ساز ظاہر ہوتا ہے۔ یہ امتیاز نہ صرف غزلوں میں پایا جاتا ہے بلکہ تقریباً ان تمام اصناف شاعری میں مشکل سے کوئی شعر بھرتی کا معلوم ہوتا ہے اور غالباً ان کی یہ سب سے بڑی خصوصیت ہے جس کی بنا پر بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ اقبال دنیا کے ان چند شاعروں میں ہیں جن کے کلام میں شاذ و نادر کوئی شعر یا مصرع بھرتی کا ملتا ہے۔

اقبال کی قدیم طرز کی غزلوں میں سے بہترین اشعار کے سلسلے میں یہ شعر پیش کیا جا سکتا ہے ؎

تڑپ کے شان کریمی نے لے لیا بوسہ　　کہا جو سر کو جھکا کر گناہ گار ہوں میں

اسی طرح جدید رنگ کی غزلوں میں سے ہم یہ اشعار پیش کر سکتے ہیں۔

تو مری رات کو مہتاب سے محروم نہ رکھ　　ترے پیمانہ میں ہے ماہ تمام اے ساقی

کوہ شگاف تری ضرب تجھ سے کشاد شرق و غرب　　تیغ ہلال کی طرح عیش نیام سے گزر

کہہ گئیں راز محبت پردہ داری ہائے شوق　　تھی فغاں وہ بھی جسے ضبط فغاں سمجھا تھا میں
کارواں تھک کر فضا کے پیچ و خم میں رہ گیا　　مہر و ماہ و مشتری کو ہم عناں سمجھا تھا میں
تھی وہ اک درماندہ رہرو کی صدائے دردناک　　جس کو آواز رحیل کارواں سمجھا تھا میں
عرصۂ محشر میں میری خوب رسوائی ہوئی　　داور محشر کو اپنا رازداں سمجھا تھا میں

اردو زبان میں جو دو معرکۃ الآرا مسدس ملتے ہیں اور زندۂ جاوید سمجھے جاتے ہیں، ان میں ایک تو حالی کا مسدس مدوجزر اسلام ہے۔ دوسرا اقبال کا شکوہ و جواب شکوہ ہے۔ حالی میں قنوطیت غالب نظر آتی ہے اور اقبال میں رجائیت اس کے علاوہ اقبال نے اردو شاعری کے خزانے میں ایک اور گوہر نایاب کا جو اضافہ کیا وہ ان کے دو مرثیے ہیں۔ یوں تو

اس میں شک نہیں کہ اُردو زبان میں اعلیٰ درجے کے مرثیے موجود ہیں مگر ان میں نہ تو کوئی ایسا مرثیہ ملتا ہے جس میں فلسفۂ موت وحیات پر علمی بحث کی گئی ہو جیسا کہ یورپی زبانوں کے بعض مرثیوں میں کی گئی ہے دوسرے یہ کہ ایسا مرثیہ بھی نہیں ملتا جس کا موضوع فردِ واحد کی بجائے انسان کی ایک مخصوص جمعیت ہو۔ انگریزی زبان میں ایسے مرثیے ہیں جن میں مسئلہ موت وحیات پر حکیمانہ اور فلسفیانہ بحث کی گئی ہے مثلاً ٹینی سن کا "اِن میموریم" جس کا موضوع فردِ واحد یعنی خود اس کا دوست ہنری ہیلم ہے، اور جس میں موت وحیات کے فلسفے پر نہایت ہی پُرمغز اور حکیمانہ بحث کی گئی ہے۔ دوسرے گرے کا وہ مشہور مرثیہ ہے جس کا ترجمہ گورِ غریباں کے نام سے کیا گیا ہے اور جس کا موضوع ایک خاص جماعت انسانی ہے۔

اقبال نے بجنسہٖ ایسے دو معرکۃ الآرا مرثیے لکھے ایک تو "والدہ مرحومہ کی یاد" ہے جس کا موضوع خود ان کی والدہ مرحومہ ہیں اور اس میں ٹینی سن کے "اِن میموریم" کی طرح زندگی اور موت کے فلسفے کو بیان کیا گیا ہے۔ دوسرا "گورستانِ شاہی" جس کا موضوع گرے کے گورِ غریباں کی طرح جماعت انسانی ہے مگر دونوں میں فرق یہ ہے کہ اول الذکر شاہانِ قطب شاہی سے متعلق ہے اور ثانی الذکر انگلستان کے ایک دیہات کی غریب جماعتوں سے۔

اس کے علاوہ انھوں نے فطری مناظر اور مختلف عنوانات پر بھی ایک کثیر تعداد میں نظمیں لکھیں۔ نیز کائنات اور موجودہ تہذیب وتمدن کے مختلف اور گوناگوں مسائل سے متعلق جا بجا اپنی شاعری میں نہایت ہی عالمانہ، دل فریب اور موثر طریقے پر بحث کی

اقبال نے ادبی خدمات کے سلسلے میں جو خدمت اُردو زبان کی کی، اس لحاظ سے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اُردو شاعری کو زندہ جاوید بنانے میں غالب، میر، انیس و دبیر، اکبر و نظیر اور حالی کے بعد جس شاعر نے کام کیا وہ اقبال ہیں انھوں نے اردو شاعری میں ایک انقلاب عظیم برپا کیا اور اُس کو بہت مالا مال کیا ؎

گیسوئے اُردو ابھی منت پذیرِ شانہ ہے — شمع یہ سودائی دل سوزیٔ پروانہ ہے

اس کام کو بطورِ احسن انجام دیا۔ اور گیسوئے اُردو کو سنوارنے میں مشاطگی کا پورا پورا کمال دکھلا دیا۔

سید فخر الحسن متعلم ایم۔ اے (ابتدائی)

"اعترافات"

وہ دن بھی تھے کہ تیرا نام سن کر مسکراتا تھا
دلِ مسرور سینے میں خوشی سے جھوم جاتا تھا

چھپائے سے نہ چھپتا تھا تبسم میری آنکھوں کا
نہیں رکتا تھا روکے سے تکلم میری آنکھوں کا

اور اب یہ حال ہے جب نام لیتا ہی ترا کوئی
تڑپ اٹھتا ہوں میرے دل پہ گر پڑتی ہی بجلی سی

نظر کے سامنے تصویر پھرتی ہی مرے دل کی
فسردہ مضمحل، خاموش بے جان دھندلی دھندلی سی

کبھی دل دوڑتا پھرتا تھا رنگیں لالہ زاروں میں
تخیل پرورش پاتا تھا فطرت کی بہاروں میں

شفق، نورِ سحر، کالی گھٹائیں چاند اور تارے
کبھی اجزا تھے یہ سب میری دنیائے مسرت کے

حسیں جلووں کی اپنی آنکھ سے تخلیق کرتا تھا
تمناؤں کی رنگینی سے اُن میں رنگ بھرتا تھا
اور اب یہ حال ہے دل خود بہ خود کچھ بیٹھا جاتا ہے
بھیانک پستیوں تاریکیوں میں گرتا جاتا ہے
نگاہیں پڑ گئیں جس پر، اُسی پر جم رہیں پہروں
جو آنکھیں ڈبڈبا آئیں تو پلکیں نم رہیں پہروں

زمین و آسماں بے جان سے معلوم ہوتے ہیں
یونہی بے کیف سے ویران سے معلوم ہوتے ہیں

زمین اور اُس کی ہر شے سے کہو دلچسپیاں لائے
فلک اور اُس کی وسعت سے کہو رنگینیاں لائے
جو طاقت ہو تو آئیں دل کو دل کی زندگی دے دیں؟
مری اُجڑی ہوئی دنیا کو پھر تابندگی دے دیں؟

محبت کا فسانہ اور اس دنیا کو تبلا دوں؟
فلک والوں کی باتیں اور زمیں والوں کو سمجھا دوں؟

صمد رضوی ساز

بنیتھم اور سیاسی افادیت

انگلستان میں افادیت کی ابتدا سترھویں صدی ہی میں ہو چکی تھی جب کہ رچرڈ کمبرلینڈ نے معقولیت پسندی کے اخلاقی نظریات سے انکار کر کے مملکت کا مقصد اعلیٰ۔ بہبودی عوام قرار دیا تھا۔ لیکن جس مفکر نے اس نظریہ کو وضاحت کے ساتھ پیش کیا وہ جریمی بنیتھم (۱۷۴۸ء۔ ۱۸۳۲ء) ہے اسی لئے اس کو جدید افادیت کا بانی تسلیم کرنا بے جا نہیں۔ بنیتھم کی عملی زندگی کا دور امریکی انقلاب سے شروع ہو کر ۱۸۳۲ء کے مسودہ اصلاحات پر ختم ہوتا ہے۔ اس کو ابتدا ہی سے معاشری مسائل اور اس کی اصلاح سے خاصی دلچسپی تھی اور وہ اس سلسلے میں نفسیات کے اصول اور سائنس کی انکشافات سے مدد لینا چاہتا تھا۔

۲۳ سال کی عمر میں اُس نے پریسٹلی کے (Essays on Government) کا مطالعہ کیا تھا اور اس اصول سے بہت متاثر ہوا تھا کہ مملکت کو جانچنے کا معیار افراد مملکت کی بہبودی اور خوش حالی کو قرار دینا چاہیئے۔ اُس نے قانون کی نہ صرف تعلیم حاصل کی تھی بلکہ اس سے خاصی دلچسپی بھی رکھتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اُس نے قانون سازی کے مقاصد اور اُس کے نتائج پر بھی بہت زور دیا ہے۔ زمانۂ طالب علمی ہی میں اُس نے بلیک اسٹون کے سیاسی نظریات سے اختلاف کیا تھا جس کا خیال تھا کہ برطانوی قانون اور برطانوی دستور مکمل اور بہترین ہیں۔ اس نے اپنی کتاب (Fragments on Government) بلیک اسٹون ہی کی مخالفت میں لکھی تھی۔ بلیک اسٹون اور اس قسم کے دوسرے لوگوں کا خیال تھا کہ انگریزی قانون فطری

ارتقا کا نتیجہ ہے۔ لیکن بینتھم نے اس خوش اعتقادی پر سختی سے تنقید کی اور یہ تبلایا کہ انگریزی قانون ایسے اصولوں پر مبنی ہے جن کی مدد سے طاقت ور مظلوم، مجبور اور جاہل پر قبضہ کر رہا ہے۔ وہ اس کا بھی مخالف تھا کہ قانون کی بنیاد معاہدۂ معاشری پر ہے۔ اس کا خیال تھا کہ مملکت عوام کی مشیت اور رائے پر نہیں بلکہ اطاعت گزاری کی عادت پر قایم ہے اس کا وجود اس لئے عمل میں آیا کہ افادی نقطۂ نظر سے اس کی سخت ضرورت تھی۔ اس لحاظ سے افادیت کا نظریہ انقلابی کہا جاسکتا ہے کیوں کہ بینتھم کے نزدیک فطری حقوق اور معاہدۂ معاشری کی کوئی اہمیت نہیں تھی اور نہ برک کے روایتی اصولوں کو وہ صحیح تسلیم کرتا تھا اس کی رائے میں مملکت نہ تو ایک نظری معاشری عضویہ تھی اور نہ ایک مصنوعی معاشرہ جو اس لئے وجود میں لائی گئی ہے کہ اپنے اراکین کے فطری حقوق کی حفاظت کرے۔ وہ سمجھتا تھا کہ مملکت اس لئے وجود میں آئی ہے کہ اس کا وجود میں آنا ناگزیر تھا

بینتھم کا نظریہ افادیت دراصل دو سوالوں کا جواب ہے۔ اول تو یہ کہ صحیح عمل سے کیا مراد ہے ؟ اس کا جواب بینتھم اور دوسرے افادی مفکرین کے نزدیک یہ ہے کہ وہی عمل صحیح ہے جو بہترین نتائج پیدا کرے۔ نتائج پر بینتھم نے بہت زور دیا ہے اور اسی کو اعمال کے جانچنے کا معیار قرار دیا ہے۔ لیکن اسی کے ساتھ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ بہترین نتائج سے کس قسم کے نتائج مراد ہیں ؟ افادی نقطۂ نظر سے وہی نتائج قیمتی اور قابل قدر ہیں جو افراد معاشرہ کی خوش حالی اور مسرت کا باعث ہوں۔ ان دونوں امور کو یکجا کرنے سے ہم جس نتیجے پر پہنچتے ہیں وہ جان اسٹورٹ مل کے الفاظ میں یہ ہے: "اعمال اسی حد تک صحیح ہیں جس حد تک وہ مسرت میں اضافہ کرتے ہیں اور اسی لحاظ سے غلط ہیں جس لحاظ سے وہ مسرت کے برعکس نتائج پیدا کرتے ہیں"۔ "افادیت کا اصول" ہی انسانی اعمال کا تعین کرتا ہے اور "افادہ" ہی ان کا معیار ہے جس سے بقول بینتھم کسی عمل کے اخلاقی پہلو کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے

یہ واضح رہے کہ بینتھم کو خالص اخلاقی مسائل سے کوئی خاص دل چسپی نہ تھی اور نہ وہ اخلاق کو محض اخلاقیات کے نقطۂ نظر سے دیکھنا چاہتا تھا۔ اس کی دل چسپی محض اس حد تک تھی کہ وہ اُن ذرائع سے واقف ہونا چاہتا تھا جن سے ایک قانون ساز انسانی اعمال سے افادی نتائج پیدا کرنے میں مدد لے سکتا ہے۔ چونکہ افادیت پسند، تجربات اور حالات سے نتائج اخذ کرنے کے قائل تھے اور اُن کا طرز استدلال استقرائی تھا اس لئے اُن کے نظریۂ افادیت کا تعلق بھی زیادہ تر عملی اخلاقیات اور عملی سیاسیات ہی سے تھا۔ اور نظری اخلاق کی اُن کے نزدیک کوئی اہمیت نہ تھی۔ غرض اُن کے نظریہ کی بنیاد اخلاقیات کے مجرد اصولوں سے زیادہ انسان کے حقیقی تجربات اور مشکلات پر قایم تھی۔

اس استدلال کے متعلق کہ اعمال کے نتائج کا اندازہ مسرت اور خوش حالی کی مقدار سے کیا جانا چاہئے بنیتھم لکھتا ہے

"فطرت نے انسان کو دو متقدر حاکموں کے تابع رکھا ہے جن میں سے ایک تکلیف اور الم ہے اور دوسرا مسرت۔ یہ بتلانا انہیں کا کام ہے کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے اور ہم جو کچھ کریں اس کا نہ کرنا بھی انہی کا اختیار ہے۔ ہمارے تمام خیالات انہی کے مرہون منت ہیں۔ ہم اپنے تمام تصفیوں اور زندگی کے جملہ فیصلوں کو انہی سے رجوع کرتے ہیں۔ جو شخص اپنے آپ کو اس اطاعت سے بے نیاز ثابت کرنے کی کوشش کرے در اصل وہ جانتا نہیں کہ کیا کہہ رہا ہے"

اپنی کتاب (Introduction to morals and Legislation) میں بنیتھم نے اسی نفسیاتی اصول پر اخلاقی قوانین کو جانچنے کی کوشش کی ہے۔ اس کا خیال تھا کہ انسانوں کے تمام فطری احساسات یکساں ہوتے ہیں۔ اس لئے ان کی اچھائی یا برائی کو صرف ان کے نتائج ہی سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ انسان پر کلیسا، مملکت یا جماعت جیسے مجردات کے کوئی فرائض عائد نہیں ہوتے بلکہ اس کے فرائض صرف دوسرے انسانوں تک محدود ہوتے ہیں جو اسی طرح مسرت اور غم کے احساسات رکھتے ہیں۔ مسرت کے کوئی معنی نہیں اگر اس کا تعلق انسانوں کے انفرادی احساسات سے نہ ہو۔ عوام کی مسرت انفرادی اشخاص ہی کی مسرت ہے" کثیر ترین افراد کی تکالیف، ان کا الم اور ان کی مسرت ہی اخلاق کا معیار ہے۔

سیاسی افادیت کے حامی۔ جن کا سردار بنیتھم تھا۔ مملکت اور فطری حقوق کے بجائے افراد کی بہبودی اور خوش حالی کو اپنے نظریہ کی بنیاد قرار دیتے ہیں۔ ان کے نزدیک انسانی بہبودی اور مسرت ہی سیاسی معاشرہ کے اعلیٰ ترین مقاصد ہیں مسرت کے ذریعے حقوق کا اندازہ لگانے کا تخیل ایک عام اخلاقی نظریہ کی حیثیت سے اٹھارویں صدی میں کافی روشناس ہو چکا تھا۔ جب کہ اس کو مجرد اصول حقوق اور انسانی ضمیر کے نظریوں کے مقابلے میں پیش کیا گیا۔

سیاسی افادیت کا نظریہ در اصل فطری حقوق کی تنقید اور اس کا جواب ہے۔ اس کے حامی سیاسیات میں عملی نقطۂ نظر کے قائل تھے۔ وہ خالص فکر اور مجرد فلسفہ کو غیر مفید تصور کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بنیتھم بھی مملکت اور اقتدار اعلیٰ کے تصوری نظریات سے زیادہ حکومت اور اس کے اراکین کی جدوجہد اور ترقی پر زیادہ زور دیتا ہے۔ اس کا نظریہ ہی ایک ایسا فلسفہ پیش کر رہا تھا جو اس وقت کی ضروریات اور احتیاجات کا ساتھ دے سکتا تھا۔

انگلستان کے حالات نے اس نظریہ کو معقول بنانے میں بڑا حصہ لیا۔ زور آور ذہنیت کی بدعنوانی اور نپولین کی شہنشاہیت

پسندی نے انقلابی نظریوں کو انگلستان میں غیر معقول بنا دیا تھا۔ یورپ کی جنگوں نے جو ردعمل پیدا کر دیا تھا اس کی وجہ سے فطری حقوق اور اقتدار عامہ کے خیالات اپنی اہمیت کھو چکے تھے۔ اس کے ساتھ انگلستان میں ایک جماعت ایسی پیدا ہو گئی تھی جو ورثی جماعت کے خیالات اور برک کی اعیانیت پسندی کو بری نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ صنعتی انقلاب نے صنعتی لوگوں کا ایک ایسا گروہ پیدا کر دیا تھا جس کو چین کی انتہا پسند عمومیت یا گاڈون کے اصولوں سے کوئی ہمدردی نہ تھی لیکن یہ گروہ قدامت پسند حکومت سے بھی نالاں تھا کیوں کہ وہ رائج الوقت صنعتی احساسات اور تحریکات کا ساتھ دینے سے قاصر تھی۔ تجارتی امور میں عدم مداخلت کا اصول اور سیاسیات میں انفرادیت پسندی کے خیالات حقیقت میں اس دور کے مطالبات کا عکس تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس صنعتی گروہ نے اٹھارویں صدی کے جمود کی مخالفت کی اور ایسی جدید تحریکات کو، جن سے اس وقت کے مطالبات اور ضروریات کی تکمیل ہو سکتی ہو، سیاسیات اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں شریک کرنے کی کوشش کی صنعتی انقلاب نے مزدوروں میں بھی ایک حد تک بیداری پیدا کر دی تھی اور صنعتی اصلاح اور حکومت میں عوام کے اقتدار کو بڑھانے کا برابر مطالبہ کیا جا رہا تھا غرض انہی محرکات نے فطری حقوق جیسے نظری اصولوں کی اہمیت گھٹا دی تھی۔

بینتھم اور دیگر افادیت پسندوں کے نزدیک یہ اصول کہ انسان بعض حقوق کا حامل ہے یا یہ کہ قدرت نے چند حقوق انسانوں کے لئے ودیعت کر دیئے ہیں، ایک مابعد الطبیعیاتی مفروضہ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا تھا۔ واقعات جس کی تصدیق کرنے سے قاصر تھے۔ بینتھم کے خیالات کی وجہ سے انگلستان میں اس تخیل نے کافی اہمیت حاصل کر لی کہ مملکت بجائے ایک ایسا ادارہ ہونے کے جس میں فطری حقوق کی حفاظت کی جاتی ہے، ایک ایسا ذریعہ ہے جو عام خوش حالی کے بڑھانے میں مدد دیتا ہے۔ بینتھم کے نزدیک فطرت انسانی اس لئے سیاسی اقتدار کی بنیاد ہے کہ فطرتاً اس کے تمام اعمال کا تعین الم اور مسرت ہی سے ہوتا ہے۔ انسانی اعمال کے یہی دو پہلو ہیں جو نیک و بد اور صحیح و غلط کا معیار قایم کرتے ہیں۔

بینتھم نے قانون فطرت سے انکار کیا۔ اس کا نظریہ یہ تھا کہ قانون ایک حکم کی صورت میں سیاسی معاشرے کے مقتدر، ادارہ کا اظہار ہے۔ اس حکم کے خلاف افراد کو کوئی حق حاصل نہیں۔ ان کو صرف وہی حقوق حاصل ہیں جو قانون کے ذریعے عطا کئے گئے ہوں۔ حق لازم و ملزوم چیز ہے اور اقتدار کے وجود کو ثابت کرتا ہے۔ اس نظریہ کی رو سے انفرادی حقوق کے مطالبات سے سیاسی اقتدار کی تحدید نہیں ہوتی کیوں کہ سیاسی اعمال کا مقصد نہ تو فطری حقوق کی حفاظت کرنا ہے اور نہ مملکت کے اقتدار یا قوم کے مرتبے میں اضافہ کرنا ہے بلکہ اس کا نصب العین صرف یہ ہے کہ افراد معاشرہ کی بہبودی اور خوش حالی میں مجموعی

طور پر اضافہ کرے۔ مقتدر اپنے اثر کو اس حد تک بڑھا سکتا ہے جہاں تک کہ افادہ ملحوظ ہے۔ یہ الفاظ دیگر قانون کے اچھے یا برے ہونے کا معیار بھی یہی ہے۔ یہ نکتہ بنیتھم کے نزدیک سب سے اہم ہے۔ اس کے نظریہ کی رو سے سیاسی اقتدار کی اطاعت کا مقصد بھی یہی ہے کہ اُس کے اعمال کثیر ترین افراد کی زیادہ سے زیادہ مسرت پیدا کرنے میں مدد دیں۔ چنانچہ وہ کہتا ہے کہ اگر انقلاب سے یہی نتائج برآمد ہوں تو پھر اس میں حصہ لینا ایک اخلاقی فرض ہے۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں کہ فطری حقوق اور افادیت کے نظریات آپس میں کوئی گہرا اختلاف رکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے ان کا ایک دوسرے سے قریبی تعلق ہے۔ کیوں کہ بنیتھم کے کثیر ترین افراد کی زیادہ سے زیادہ مسرت کے لئے ضروری ہے کہ افراد معاشرہ کے کسی خاص گروہ کو دوسرے گروہ پر کوئی سیاسی یا معاشری ترجیح نہ دی جائے کیوں کہ تمام افراد معاشرہ مسرت اور خوش حالی کے حصول کا فطرتاً مساوی حق رکھتے ہیں۔ اسی طرح فطری حقوق کا نظریہ بھی افادیت کے اصول سے مطابقت رکھتا ہے۔ لیکن فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں آرام و آسایش، مسرت اور خوش حالی کو جن کی مجموعی طور پر افراد کو ضرورت ہوتی ہے یا جن کا وہ "فطرتاً" مطالبہ کرسکتے ہیں، حقوق کا نام دے دیا گیا ہے۔ دونوں نظریات دراصل انسانی شخصیت کے تجربات ہی پر مبنی ہیں اور نتیجتاً ایک ہی قسم کے اصلاحات کی طرف رجوع کرتے ہیں۔

دونوں نظریوں کی رو سے سیاسی معاشرے کو زیادہ تر افراد کی آزادی اور اختیاری کوششوں کا نتیجہ قرار دیا گیا ہے مملکت ایک ایسا ادارہ ہے جس کو انسانوں نے اپنی سہولت اور تحفظ کی خاطر قایم کیا اس لئے وہ اس میں تبدیلی اور اصلاح کرنے کے بھی مستحق ہیں۔ جب کوئی حکومت ان مقاصد کی تکمیل نہیں کرتی جن کے لئے اس کا قیام عمل میں آیا تھا تو انھیں اس زمانے کے افراد کی خواہشات، خیالات اور مطالبات کے مطابق تبدیلی کی جاسکتی ہے۔ مملکت چونکہ اپنے افراد کی قوت تخلیق کا نتیجہ ہے اس لئے وہ بجائے خود کوئی آزاد حیثیت نہیں رکھتی اُس کو بنانے اور اس میں اصلاح و تبدیلی کرنے کا حق برابر افراد کو حاصل ہے اور وہ اپنے "حقوق" کے تحفظ یا اپنی "مسرت" میں اضافے کی خاطر قدیم ادارات کو بالکل جدید ادارت سے تبدیل کرسکتے ہیں۔ چنانچہ اس سلسلے میں بنیتھم کا خیال ہے کہ کسی ادارہ کی افادیت کو جانچنے کے لئے محض "قدامت کوئی وجہ نہیں قرار دی جاسکتی" بلکہ بسا اوقات کسی ادارہ کی قدامت ہی اس کی غیر افادیت کا ثبوت ہوا کرتی ہے۔ کیوں کہ اس کی تصویر اپنی معنویت کھو دیتی ہے، اُس کے نقوش بہت ہی مدہم پڑجاتے ہیں اور اس میں موجودہ مطالبات اور خواہشات کی تکمیل کی صلاحیت مفقود ہوجاتی ہے۔

نظری حقوق کا نظریہ اس کو تسلیم کرتا ہے کہ انسانوں کی متضاد خصوصیات کی اہمیت اُن کی مشترک خصوصیات سے بہت کم ہے اس حد تک افادیت کا نظریہ بھی نظری حقوق کے نظریے سے متفق ہے کیوں کہ اس کی رو سے بھی انسانوں کی مشترک خصوصیات بہ نسبت متضاد اور مختلف خصوصیات کے بہت زیادہ ہیں۔

عمومیت کے اس پہلو کی تائید سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ نظریۂ افادیت خالص حقوق کا بھی مدعی ہے بنیتھم کے نزدیک عمومیت اس لئے بہتر ہے کہ حکومت میں عوام کے اشتراک اور تعاون سے مفید نتائج برآمد ہوتے ہیں۔ سیاسی امور میں مساوات کی ضرورت پر وہ اس لئے زور نہیں دیتا کہ تمام انسان پیدائشی طور پر مساوی حقوق رکھتے ہیں بلکہ اس لئے کہ سیاسی مراعات میں مساوات ہی سے افراد نہ صرف اپنے لئے بلکہ دوسروں کے لئے بھی مسرت کے حصول کا مفید ذریعہ بن سکتے ہیں چنانچہ اس نظریہ کی رو سے عوام کا حکومت میں حصہ لینے کا حق اس لئے نظری ہے کہ آزادی کے بغیر مسرت کا حصول ممکن نہیں۔ اس نظریہ کی رو سے عمومیت اس طرز حکومت کو کہیں گے جس میں تمام اراکین معاشرہ کے مفادات اور ضروریات کا زیادہ سے زیادہ علم ہو اور اُن کو پورا کرنے کی زیادہ سے زیادہ کوشش کی جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس نظریہ کے حامی عمومیت کو آزادی اور مسرت دونوں کے لئے موزوں تصور کرتے ہیں۔ اور اسی بنا پر وہ مطلق العنانی کے بھی مخالف ہیں۔ چنانچہ بنیتھم انگلستان کے دستور کو اس لئے ناقص تصور کرتا تھا کہ وہاں شاہی اور دارالامرا جیسے ادارات موجود ہیں۔ اس کے نزدیک بہترین طرز حکومت ایک ایسی جمہوریہ ہے جو صرف ایک ہی ایوان پر مشتمل ہو۔ بنیتھم لاک کی طرح اس پر یقین رکھتا تھا کہ کسی معاشرے میں اس کی اکثریت ہی کے فیصلے کو اہمیت ہونی چاہیئے۔ اکثریت کے فیصلے کا صحیح یا غلط ہونا اُس کے نزدیک کوئی خاص مفہوم نہیں رکھتا تھا۔ بشرطے کہ اُس سے عوام کی خوش حالی میں اضافہ ہوتا ہو۔ اس نظریے کی رو سے جب شہریوں کی عام جماعت یعنی اکثریت حکومت کے فرائض انجام دیتی ہے تو اس کا احتمال بہت کم رہتا ہے کہ وہ افراد کے اعمال پر بے جا اور نامناسب پابندیاں عاید کرے گی۔ بلکہ زیادہ امکان اس کا بات کا ہوتا ہے کہ تجربہ اور حالات جن پابندیوں کو ضروری قرار دیں اُن کے عائد کرنے میں وہ غیر جانب دارانہ طرز عمل اختیار کرے گی۔ اقتدار اعلیٰ بھی اس اصول کے بموجب کسی سیاسی معاشرے کی اکثریت ہی پر مشتمل ہوتا ہے۔

غرض افادی طرز استدلال یہ ہے کہ چونکہ سیاسی معاشرہ کا مقصد افراد معاشرہ کی بہبودی اور خوش حالی کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ نیز تمام افراد کی خوش حالی یکساں حیثیت رکھتی ہے اس لئے کوئی معاشرہ سیاسی لحاظ سے اسی حد تک منظم

سمجھا جائے گا جس حد تک اس میں مفادات کی ترقی، حقوق کے تحفظ اور معاشرے کے کثیر ترین افراد کی زیادہ سے زیادہ مسرت اور خوش حالی کے ذرائع پیدا کرنے کی صلاحیت موجود ہوگی۔ اس سلسلے میں بنیتھم نے بعض عملی تجاویز بھی پیش کی تھیں جن کا مقصد یہ تھا کہ رائے عامہ بہت ہی موثر طریقے پر حکومت کے فیصلوں پر اثر انداز ہو سکے۔ سب سے پہلے تو وہ عام رائے دہی کو ضروری سمجھتا تھا کہ ہر عورت اور مرد کے مطالبات کو حکومت محسوس کر سکے۔ دوسرے یہ کہ جماعت مقننہ کے انتخابات ہر سال ہوا کریں تا کہ عوام کے نمائندوں کو رائے عامہ سے پوری طرح واقف ہونے کا موقعہ ملتا رہے تیسرے مقننہ کے اراکین کو اپنے انتخاب کنندوں کی ہر حیثیت سے نمائندگی کرنے کا حق حاصل ہے بلکہ وہ صرف انھی اغراض کی نیابت کریں جو اُن کے تفویض کئے جائیں اور انتخاب کنندوں کے براہ راست نگرانی میں رہیں۔

واضح رہے کہ افادیت پسند آئینی اصلاحات کے بھی علم بردار تھے۔ ان کا یہ اعتقاد تھا کہ ملکی قوانین کے ذریعے انسانی بہبودی اور خوش حالی میں اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ چنانچہ بنیتھم نے اثباتی قوانین کی اہمیت پر بہت زور دیا ہے اور اُن لوگوں کی مخالفت کی ہے جو افادیت پسندوں کی قانونی اصلاحات کو عالم گیر حق یا رواج یا کسی ملک کے غیر تحریری قانون کے اصول کے منافی تصور کرتے تھے۔ بنیتھم قانون سازی کے اصول کا بڑا مدعی تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ اُس کے ذریعے سیاسی نمائندگی، حکومت کی معاشی پالیسی، جرم و سزا کے روایتی قوانین وضوابط میں بہت اہم تغیرات عمل میں لائے جائیں۔ اس کے خیال میں موجودہ قوانین اس کی اجازت نہیں دیتے تھے کہ افراد پبلک امور میں مناسب حصہ لے سکیں۔ یہ قوانین دراصل ایسی غیر ضروری پابندیاں تھیں جو افراد کو اُن کے حقوق کے تحفظ اور خوش حالی کے حصول سے روکتی تھیں۔ سیاسی معاشرے میں طبقہ واری امتیازات بہت نمایاں ہو گئے تھے اور حکومت خواہ وہ مرکزی ہو یا مقامی، چند ایسے افراد کے ہاتھوں میں تھی جن کا عوام سے کوئی تعلق نہ ہوتا تھا۔ ان خرابیوں کا نتیجہ یہ تھا کہ امیر و غریب، زمیندار و کاشت کار، جاگیر دار، تجارت پیشہ اشخاص میں بنیادی اختلافات پیدا ہو گئے تھے اور ہر طبقے کے مفاد کی نوعیت بدلتی جا رہی تھی۔ ان نقائص کو دور کرنے کا کارآمد ذریعہ بنیتھم کے نزدیک قانون سازی تھا۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہئے کہ افادیت پسند مفکرین انفرادیت کے حامی نہ تھے۔ برخلاف اس کے وہ حکومت کی مداخلت کو اس حد تک ضروری سمجھتے تھے جس حد تک کہ اُن کا تعلق گزشتہ قوانین کے نقائص سے تھا۔

اسی خیال کے تحت بنیتھم اور دوسرے افادیت پسندوں نے پبلک زندگی میں عملی حصہ بھی لیا۔ چنانچہ قانون اصلاحات، کانوں اور کارخانوں کے حالات کی اصلاح، پارلیمانی نمائندگی اور رائے دہی کے اصولوں کی اصلاح، انھی

کی کوششوں کا نتیجہ تھی۔ دستوری تحریک، قانون غربا کی اصلاح اور عام حق رائے دہی کے اصول بھی اسی فلسفۂ افادیت پر مبنی تھے۔

بنیتھم، جرم و سزا، قید خانوں کے نظام اور فوجداری و دیوانی کے رائج الوقت قوانین کو ناانصافی پر مبنی سمجھتا تھا۔ سزا کا مقصد اس کے نزدیک انسداد جرم تھا۔ وہ اس کو ضروری سمجھتا تھا کہ جرم کے لحاظ سے سزا کا بھی تعین ہونا چاہئے۔ سزا میں مجرم کی اصلاح بھی ملحوظ رکھنی چاہئے اور قانون کے نفاذ میں تیقن اور غیر جانب داری سے کام لینا چاہئے۔ بنیتھم کے بعد انگریزی قانون میں جو اصلاحات کی گئیں وہ زیادہ تر اسی کے اثر کا نتیجہ تھیں۔

معاشی نظریات میں بنیتھم آدم اسمتھ کا پیرو تھا اگرچہ کہ اکثر امور میں اس سے اختلاف بھی رکھتا تھا۔ وہ اس کا بڑا مدعی تھا کہ حکومت کو طلب و رسد کے قوانین میں کم سے کم مداخلت کرنی چاہیے اور آزاد تجارت کے اصولوں پر عمل پیرا ہونا چاہئے وہ اجاروں کا بھی مخالف تھا اور ایسی مسابقت کو بہتر سمجھتا تھا جس پر کوئی قیود عائد نہ ہوں۔ وہ شہنشاہی نقطہ نظر کا بھی مخالف تھا چنانچہ اس نے ۱۸۲۸ء میں کینڈا کی علیحدگی کے سلسلے میں، کینڈا والوں کی طرف سے ایک محضر بھی تیار کیا تھا۔ جس کی وجہ سے اس کو ہندوستان سے بھی کسی قدر دلچسپی پیدا ہو گئی تھی۔

انگلستان کے علاوہ غیر ممالک پر بھی بنیتھم کے خیالات اور نظریات کا کافی اثر پڑا۔ اس نے انقلاب فرانس سے بھی گہری دلچسپی ظاہر کی تھی۔ فرانسیسی زبان میں اس کی اکثر تحریرات کا ترجمہ بھی کیا گیا۔ ۱۷۹۲ء میں بنیتھم اور پین کو فرانس کے شہری بھی تسلیم کر لیا گیا۔ فرانس کے علاوہ بنیتھم کے اصول اور نظریات کو روس، پرتگال، اسپین اور جنوبی امریکہ میں بھی کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔

شہاب الدین ایم اے

ایک دوست سے!

آئینۂ صفا ہے وہ تیرا دلِ حزیں   گردِ ریا کا جس پہ نشاں تک نہیں کہیں
تیرے سلوک سے ہیں پشیمان اہلِ کیں   تیری روش پہ سر بہ گریباں ہیں نکتہ چیں

تیرے دل و دماغ کو پہچانتا ہوں میں
تو مجھ کو جانتا ہے، تجھے جانتا ہوں میں

کیا تو نے عکس کھینچے ہیں ماضی و حال کے   ہیں جن پہ نقش روز و شب و ماہ و سال کے
مداح اہلِ ذوق ہیں تیرے کمال کے   قصّوں میں رکھ دیا ہے کلیجہ نکال کے

محفل میں دوستوں کی مزے تیرے دم سے ہیں
زخمِ جگر ہرے تری نوکِ قلم سے ہیں

رنگیں بیانیوں کا تری عام ہے چلن — افسانے تیرے کیوں نہ ہوں مقبولِ اہلِ فن
دل کش خیال، اُس پہ عبارت کا بانکپن — الفاظ میں نزاکتِ برگِ گُل و سمن
مضموں ترے تمام ہیں نغمے ہزار کے
ہیں جن پہ صاف عکس خزاں کے بہار کے

کیوں ختم ذوقِ بانیٔ سرجوش ہوگیا؟ — بزمِ ادب سے کس لئے روپوش ہوگیا؟
اپنی زباں کا حق بھی فراموش ہوگیا؟ — اُفتاد کیا پڑی ہے کہ خاموش ہوگیا؟
ناکامیوں کا غم ہے تو ناکامیاب ہے!
چھا جائے جو شکست پہ وہ کامیاب ہے!

باطل کے نقش خاکِ وطن سے مٹا کے چل — ہو کوئی سدِ راہ تو ٹھوکر لگا کے چل
آئیں مصیبتیں تو ذرا مُسکرا کے چل — سر جُھک گیا تو موت ہے! ہاں سر اُٹھا کے چل
جُھکتی ہے خلق صرف دلاور کے سامنے
دبتی ہے موج دستِ شناور کے سامنے

سکندر علی وجد

رفیقِ شفیق[1]

فرض کیجئے ہمیں دوست کے صحیح انتخاب کی آرزو ہے اور ہم اس کا سلیقہ بھی رکھتے ہیں پھر بھی ہم میں سے کتنے اس پر قادر ہیں؟ ہمارا دائرۂ انتخاب کس قدر محدود ہے! ہماری اکثر صحبتیں یا تو محض اتفاقی ہیں یا ضرورت پر مبنی، مگر اُن کا حلقہ بھی تنگ! جن سے ملنے کی ہمیں آرزو ہوتی ہے اُن سے ہم مل نہیں سکتے، اور جن سے ہم مل سکتے ہیں، شدید ضرورت کے وقت اکثر وہ ہم سے دور ہوتے ہیں۔ انسانی عقل و فراست کے تمام اعلیٰ طبقوں کے دروازے اپنے سے ادنیٰ طبقے والوں پر صرف وقتی اور جزوی طور پر کھلے ہوتے ہیں۔ ممکن ہے خوش نصیبی سے ہمیں ایک بڑے شاعر کے درشن کا موقع مل جائے اور ہمیں اُس سے شرفِ تکلم بھی حاصل ہو جائے، یا کسی بلند پایہ سائنس داں سے ہمیں مختصر سوال جواب کر لینے کا موقع ہاتھ آ جائے اور وہ نہایت خندہ روئی کے ساتھ پیش آئے، گھس پیٹھ کر پانچ دس منٹ کے لئے کسی زبردست سیاست داں سے بات چیت کی عزت بھی ہم حاصل کر سکتے ہیں اور اُس کی پُر ریا گفتگو سے محظوظ بھی ہو سکتے ہیں۔ یا زندگی میں ایک آدھ بار کسی خوب صورت شہزادی کی رہ گزر میں ایک گل دستہ ڈال دینے کا نادر موقع بھی ہمیں مل سکتا ہے، یہ سب موقعے کتنے ہی بے حقیقت اور زوال پذیر رہیں، ہمیں ان کی تمنا رہتی ہے اور ہم ان بے بساط لمحات پر زندگی کی بیش بہا گھڑیاں، جذبات کے انمول موتی اور اپنی بے نظیر اندرونی قوتیں، سب کچھ قربان کر دیتے ہیں! حالاں کہ ایک انجمن ایسی بھی موجود ہے جس کے دروازے ہم پر ہمیشہ کھلے ہوئے ہیں۔ یہ

---

[1] جان رسکن کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے۔

ایسے افراد کی انجمن ہے جن میں ہم جب تک چاہیں بیٹھ سکتے ہیں اور جن سے ہم جب تک چاہیں بات چیت کر سکتے ہیں، وہ کبھی نہیں تھکتے، اور نہ کبھی چیں بہ جبیں ہوتے ہیں، وہ ہم سے بے تکلف ملتے ہیں خواہ ہم کسی درجے اور رتبے کے ہوں، وہ ہم سے گفتگو کرتے رہیں، بہترین الفاظ میں جو انہیں مل سکتے ہیں، اور اگر ہم دھیان سے سنیں تو وہ ہمارے ممنون بھی ہوتے ہیں۔ یہ محفل سارے سارے دن ہمارے اطراف جمی رہ سکتی، بڑے بڑے بادشاہ اور سیاست داں نہایت صبر و ضبط کے ساتھ ہمارے منتظر ہیں،۔ ہمیں باریاب کرنے کے نہیں خود باریاب ہونے کے آرزو مند! پر سکون کمروں میں الماریوں کے اندر خاموشی کے ساتھ وہ ہماری راہ تک رہے ہیں اور ہم ہیں کہ اس بزم احباب کی کوئی قدر نہیں کرتے؛ ان کی زبانِ بے زبانی سارے سارے دن تقریر میں مصروف ہے، اور ہم ہیں کہ ان کے ایک حرف پر بھی کان نہیں دھرتے:

اس بزم شرفا کا ہر ہر رکن ہماری منتیں کر رہا ہے اور ہم اس سے سرد مہری برت رہے ہیں، اس کے برخلاف ایک ناشائستہ مجمع ہے۔ جو ہم کو خاطر میں نہیں لاتا، بلکہ ہمیں حقیر جانتا ہے مگر ہم ہیں کہ اپنی ساری گرم جوشیاں ان پر صرف کر دیتے ہیں؛ شاید اس کی توجیہ آپ یوں کریں کہ اس مجمع کا ہر شخص بجائے خود موجود ہوتا ہے اور اس کے خیالات آپ براہِ راست واقف ہونا چاہتے ہیں مگر واقعہ اس کے برخلاف ہے، فرض کیجئے آپ ان لوگوں کی صورتیں کبھی نہ دیکھ سکیں، فرض کیجئے آپ کو ایک بلند پایہ سیاست داں کے کمرے کے اسکرین کے پیچھے کھڑے رہنے کا موقع ہاتھ آجائے، اور آپ اندر کی ساری گفتگو سُن رہے ہوں، تو کیا آپ اس سے لطف اندوز نہ ہوں گے؟ اگرچہ اسکرین کے اُدھر جانے کی آپ کو اجازت نہیں؛۔ اور جب وہ اسکرین اِس اسکرین سے ذرا مختصر ہو، یعنی بجائے چار کے صرف دو حصوں میں مڑتا ہو اور آپ سارے سارے دن کتاب کی آڑ سے سُن رہے ہوں، کوئی اتفاقی بات چیت نہیں، بلکہ وہ گفتگو جو خاص طور پر آپ ہی کے لئے تیار کی گئی ہو، اور جو نہایت غور و خوض کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کی گئی ہو۔ یعنی دنیا کے داناترین افراد کے چیدہ خطبات اور منتخب مقالات۔ اس سے آپ کنیاتے ہیں، اس بزم علما کو، اس محترم مجلس اعلیٰ کو آپ نظر تجاہل سے دیکھتے اور ٹھکرا دیتے ہیں:

شاید آپ خیال کریں کہ آپ کی ہم عصر بلند پایہ ہستیوں کی گفتگو زیادہ تر واقعات حاضرہ سے متعلق ہوتی ہے، جو آپ کی فوری دلچسپی کا باعث ہوتے ہیں، اور اسی لئے آپ ان سے بات چیت کرنے کے خواہشمند ہوتے ہیں۔ مگر حقیقت اس کے برعکس ہے، یہی لوگ اپنے خیالات کو تقریر کی بہ نسبت تحریر میں زیادہ خوبصورت و دل کش اسلوب میں پیش کر سکتے ہیں۔

کتابوں کی دو قسمیں ہیں، ایک تو وہ جو جلدی ہیں، بسا اوقات کسی خاص غرض کے ماتحت لکھی جائیں جیسا کہ نفع

نفع کے لالچ اور شہرت کے بھوکے عام طور پر کرتے ہیں؛ اور دوسری وہ جو نہایت سوچ بچار اور غور و فکر کے بعد لکھی جاتی ہیں اور بقائے دوام جن کے حصے میں ہوتی ہے۔ پہلی قسم کی کتابوں کو ہم موقتی اور دوسری کو دائمی کتابیں کہیں گے۔ اس امتیاز کو بخوبی ذہن نشین کر لیجئے، یہ محض نوعیت اور صنف کا امتیاز نہیں بلکہ ماہیت اور حقیقت کا امتیاز ہے۔ یہ تقسیم اچھی اور بری ہر دو کتابوں پر حاوی ہو۔

اچھی کتابیں موقتی بھی ہیں اور دائمی بھی۔ بری کتابیں موقتی بھی ہیں اور دائمی بھی۔ آگے بڑھنے سے قبل ان دو قسموں کی تشریح کر دینا بھی مناسب ہوگا۔

اچھی موقتی کتاب۔ یہاں بری کتابوں کا ذکر نہیں۔ محض دل لبھانے والی باتیں ہیں جو طباعت کے لباس میں ہمارے سامنے آتی ہے، ایسی کتاب اکثر بہت مفید ہوتی ہے اکثر ایسی کتاب سے وہ باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کی آپ کو ضرورت ہوتی ہے، یہ کتاب آپ کے لئے دلچسپی و لطف کا سامان مہیا کرتی ہے، جس طرح کسی ذی عقل دوست کی بالمشافہ گفتگو، سیر و سیاحت کے دلچسپ حالات، ظریفانہ و قابلانہ بحثیں، دل کش اور اثر بھری کہانیاں، ناول کے پیرایہ میں، حالات حاضرہ کے متعلق ٹھوس معلومات، وہ بھی ان کے قلم سے جو تاریخ حاضرہ کے بنانے والے ہیں، یہ ساری کی ساری موقتی کتابیں جو تعلیم کی عمومیت کے ساتھ ہمارے گرد روز بروز بڑھتی جاتی ہیں، زمانہ حال کی خاص ملکیت ہیں، یہ کتابیں زمانے اور ماحول کی سیرت پر روشنی ڈالتی ہیں، ہمیں ان کے لئے شکر گزار ہونا چاہئے، اور اگر ہم ان سے صحیح فائدہ نہیں اٹھاتے تو ہمیں اس کوتاہی پر شرمندہ ہونا چاہئے۔ لیکن ان کا نہایت ہی ناجائز استعمال ہوگا اگر ہم انھیں حقیقی کتابوں کا حق مارنے کا موقع دیں کیوں کہ متانت و سنجیدگی کے ساتھ اگر غور کیا جائے تو یہ کتابیں "کتابیں" نہیں بلکہ اخبار کے فائل یا خطوں کے مجموعے ہیں جنھوں نے کتابوں کے خوبصورت لباس پہن رکھے ہیں۔ ایک دوست کا خط مسرت بخش ہو سکتا ہے مگر صرف ایک دن کے لئے، آیا یہ رکھنے یا سینتنے کے لائق ہے؟ یہ امر بھی غور طلب ہے۔ اخبار ناشتہ کے وقت نہایت موزوں ہے مگر سارے دن تو نہیں پڑھا جا سکتا۔ اسی طرح ایک خوبصورت جلد میں بند، وہ طویل خط جس میں قیام گاہوں، سڑکوں اور خاص خاص مقاموں کے موسمی حالات قلم بند ہوں یا جس میں کوئی دلچسپ کہانی لکھی ہو یا بعض خاص واقعات کی روداد جس میں موجود ہو، اتفاقی حوالہ کے لئے کتنا ہی ضروری سہی، مگر حقیقی معنوں میں نہ اس کو "کتاب" کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی صحیح معنوں میں اس کو "پڑھا" جانا چاہئے۔

کتاب ہرگز ہرگز کوئی بات چیت نہیں بلکہ ایک لکھی ہوئی چیز ہے، انتقال صوت کی خاطر نہیں بلکہ مداومت کے لئے،

بات چیت کی کتاب صرف اس لئے چھاپی گئی ہے کہ اس کا مصنف بہ یک وقت ہزاروں آدمیوں سے گفتگو نہیں کر سکتا، اگر وہ اس پر قدرت رکھتا تو ایسا ہی کرتا، یہ کتاب ایک آلہ ہے جس کے ذریعے اُس کی آواز ہم تک پہنچ رہی ہے، آپ اپنے کسی معصری دوست سے بالراست بات چیت نہیں کر سکتے اگر ایسا ممکن ہوتا تو ضرور کرتے، بلکہ اس کی بجائے بہ ذریعہ تحریر گفتگو کرتے ہیں، یہ تحریر محض انتقال آواز کا ایک ذریعہ ہے، مگر کتاب ۔ ۔ ۔ کتاب کبھی اس طرح نہیں لکھی جاتی، نہ ہی اس کا مقصد آواز کو دور دراز پہنچانا ہے، بلکہ کتاب ہم تک ایک پیام سرمدی پہنچاتی ہے، اُس کا مصنف آپ سے کچھ کہنا چاہتا ہے، وہ بخوبی واقف ہے کہ جو کچھ وہ کہے گا اس میں صداقت اور افادہ مضمر ہے، جس کا درجہ بہت بلند ہے اور جو ہر طرح سود مند ہے۔ جہاں تک اُسے معلوم ہے اس کے دل کی بات اب تک کسی نے نہیں کہی، جہاں تک وہ جانتا ہے کوئی اور وہ بات نہیں کہہ سکتا، وہ اس کے کہنے پر مجبور رہے اور کہہ کر رہے گا، اور جو کچھ وہ کہے گا صاف اور شستہ انداز میں بلکہ اگر ہو سکا تو نہایت دل کش پیرائے میں کہے گا، لیکن اُس کی تحریر کا نصیح و سلیس ہونا ہر حال میں لازم ہے۔ اس خیال یا مجموعۂ خیالات کو وہ اپنی ساری زندگی میں نہایت نمایاں پاتا ہے، یہی علم حقیقی کا ایک بصیرت افروز جزو ہے جو اس کا حاصل زندگی ہے، اگر اس کے بس میں ہوتا تو وہ اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیتا، وہ اسے کسی چٹان پر کندہ کر دیتا اور کہتا: ”یہ میرا سرمایۂ حیات ہے جسے دنیا کے سامنے پیش کر رہا ہوں، یوں کہ یوں تو میں نے بھی اوروں کی طرح کھایا پیا، محبت کی اور نفرت کی۔ میری زندگی ایک قطرۂ شبنم تھی جسے زمانہ کا آفتاب تعلیم فنا دے رہا ہے، اور جو اب بھاپ کی صورت فضا میں غائب ہو جائے گی، مگر یہ چیز جو میں آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں، اس کو میں نے دل کی آنکھوں سے دیکھا ہے، اسے میں نے جانا اور محسوس کیا ہے، اگر میری کوئی چیز بھی اس قابل ہے کہ آپ کے دلوں میں جگہ پائے تو وہ یہی چیز ہے اور صرف یہی“ یہ ہے اُس کی تصنیف، گو ایک فانی انسان نے اپنے معمولی طریقے پر اسے لکھا ہے، مگر اپنے اندر ایک الہامی کیفیت چھپائے ہوئے ہے، یہ ہے اُس کی تحریر، اور یہی ہے حقیقی معنوں میں ”کتاب“۔

آپ کہیں گے اس طرح تو کوئی کتاب نہیں لکھی جا سکتی، مگر میں آپ سے سوال کروں گا، آخر دیانت اور صداقت بھی تو کوئی چیز ہے؟ کیا آپ یہ خیال کرتے ہیں کہ صاحب عقل اور دانا انسانوں میں صداقت و دیانت کا کوئی مادہ ہی نہیں ہوتا؟ میں نہیں سمجھتا آپ میں کوئی بھی اتنا قابل رحم ہے جو ایسا خیال رکھتا ہو۔ میرا مطلب تو یہ ہے کہ وہ چھوٹے سے چھوٹا حصہ یا مختصر سے مختصر جزو، جو صداقت و دیانت کے ساتھ کسی مصنف کے قلم سے ٹپک پڑے وہی ”کتاب“ ہے، اسی کو ہم اُس مصنف کے آرٹ کا ایک ٹکڑا کہیں گے۔ اس قسم کے قیمتی ٹکڑے اکثر بیہودہ اور غیر اہم اجزا میں چھپے ہوتے ہیں، یہ اجزا حقیقت اور صداقت

سے عاری، اغلاط سے پر اور بدنما تکرار و تصنع سے لبریز ہوتے ہیں۔ لیکن اگر آپ صحیح اور حقیقی معنوں میں "مطالعہ" کریں تو حق و صداقت کے وہ جواہر ریزے جو ان خزف پاروں میں ملے جلے ہیں بہ آسانی الگ کر سکتے ہیں۔ اور در اصل یہی جواہر ریزے ہیں جن پر لفظ "کتاب" کا اطلاق ہوتا ہے

اس قسم کی کتابیں ہر زمانے میں اس وقت کی بلند پایہ ہستیاں، بڑے بڑے رہنما اور سیاست داں، اور اعلیٰ پایہ کے مفکرین لکھتے ہیں، اور یہ سب کی سب آپ کی نظر انتخاب کی منتظر ہیں۔ مگر زندگی مختصر ہے، اس سے قبل آپ بہت کچھ سن اور پڑھ چکے ہوں گے لیکن کبھی اس مختصر زندگی اور اس کے امکانات پر ٹھنڈے دل سے غور بھی کیا ہے؟ کون کہہ سکتا ہے کہ اگر کسی نے ایک کتاب پڑھ لی تو دوسری کتاب بھی وہ پڑھ سکتا ہے؟ آج آپ جو محنت و سعی کر رہے ہیں کل اس کے پھل پانے کا یقین کس کو ہے؟ تو پھر کیا گھر کی کنیزوں اور ماماؤں سے گپ شپ کرنا آپ پسند کریں گے؟ جب کہ بادشاہ اور شہزادے آپ سے گفتگو کرنے کے منتظر و مشتاق ہیں!

کیا آپ شہر کے گلی کوچوں میں کندھے سے کندھا ٹکراتے ہوئے پھرنے اور فرومایہ اجنبیوں سے اختلاط بڑھانے کو پسند کریں گے؟ جب کہ دنیا کے منتخب علما، فضلا و شعرا و ادبا کا ایک دربار آپ کے لئے آراستہ ہے، دنیا کے ہر مقام اور ہر زمانے کے چیدہ نمایندے اس دربار میں موجود ہیں، ان سے آپ راہ و رسم بڑھا سکتے ہیں، یہاں آپ وہ رتبہ اور درجہ حاصل کر سکتے ہیں جس کی آپ کو خواہش ہے، یہاں جب ایک مرتبہ آپ داخل ہو گئے تو پھر کوئی آپ کو نکال باہر نہیں کر سکتا، یہ اور بات ہے کہ آپ خود اپنی علیحدگی کا سبب بنیں۔ انھیں بلند پایہ و عالی مرتبہ ہستیوں کے میار پر آپ کا درجہ و مرتبہ جانچا جاتا ہے، یہیں آپ کی اس نیت کا امتحان ہوتا ہے جس سے متحرک ہو کر آپ اپنے ہم عصروں میں درجے اور مرتبے کے متلاشی ہوتے ہیں، جو جگہ آپ مرد افراد کی اس انجمن میں حاصل کریں گے وہی میار ہوگی آپ کی ہمت اور صداقت کا۔

یہ دربار دنیا کے عام درباروں کی طرح نہیں، یہاں مکاری، عیاری اور دغا بازی سے کوئی اپنا مطلب نہیں حاصل کر سکتا، اس دربار کا دربان کبھی بھی دھوکا نہیں کھا سکتا، یہاں انھیں کی دال گلتی ہے جن میں محنت اور قابلیت دونوں جمع ہوں، اس دربار میں دولت کی حکومت نہیں، نہ نام و نمود ہی سے یہاں کوئی مرعوب ہو سکتا، عیاری و سازش کی بھی یہاں پیش نہیں جاتی۔ یہاں تو صرف ایک سوال ہے "کیا آپ اس دربار میں داخل ہونے کا حق رکھتے ہیں؟" "کیا آپ علما اور شرفا کی صف میں بیٹھنا چاہتے ہیں؟" اپنے آپ کو پہلے شریف بنایئے آپ کو وہاں خود بخود جگہ مل جائے گی" "کیا آپ

داناؤں اور عاقلوں سے گفتگو کرنا چاہتے ہیں؟" پہلے ان کی گفتگو کو سمجھنا سیکھئے پھر اس کی آرزو کیجئے۔ اس کے علاوہ کوئی اور شرط یہاں قابل قبول نہیں۔ یہ لوگ بہ زبان حال کہہ رہے ہیں :۔

" اگر آپ ہمارے منصب تک اپنے آپ کو بلند نہ کریں گے تو ہم اپنے آپ کو آپ کے درجے تک نہیں گرا سکتے۔ ممکن ہے ایک بعید حیات ہستی شفقت و مہربانی سے پیش آئے، ایک فلسفی نہایت لطف و عنایت کے ساتھ اپنے خیالات آپ کے ذہن نشین کرائے، مگر ہم ایسا کرنے سے عاجز ہیں۔ جو ہمارے خیالات سے لطف اندوز اور مستفیض ہونا چاہے، اپنے آپ کو ہماری سطح تک بلند کرے۔ اسی وقت وہ ہمارے رتبے کو پہنچ سکے گا اور تبھی وہ ہم سے صحیح معنوں میں فیض حاصل کر سکے گا۔"

(ترجمہ)

ابو محمود

پُرسہ

(بچہ کے انتقال پر ماں کے حضور میں)

نہ رُو ہم نشیں یہ جہاں اور ہی ہے
یہاں کی رہِ امتحاں اور ہی ہے

تیرے دِل کی ٹھنڈک کو تاروں میں ڈھونڈا
تیرے پھول کو مرغزاروں میں ڈھونڈا

تیرے آنسوؤں کے چراغوں سے ڈھونڈا
تیرے دِل کے نوخیز داغوں سے ڈھونڈا

بہاروں کو لوٹانے والی ہوائیں
نہ تیری ہوائیں نہ میری ہوائیں

مرادوں کو برلانے والی دعائیں
نہ تیری دعائیں نہ میری دعائیں

نہ وہ اور نہ میں اور نہ تو جاودانی
ازل کے مصوّر کا ہر نقش فانی

مخدوم محی الدین

نقد و نظر

نذر عقیدت | نذر عقیدت جناب مسعود علی محوی بی اے (علیگ) کے فارسی کلام کا مجموعہ ہے، یہ کلام بیشتر قصاید پر مبنی ہے جو حضرت سلطان العلوم کی مدح میں لکھے گئے ہیں۔ آخر میں چند قطعات بھی ہیں۔

محوی ہندوستان کے موجودہ فارسی گو شعرا میں ایک امتیازی حیثیت رکھتے ہیں آپ کا کلام رطب و یابس سے پاک ہے کہنہ مشق ہیں اس لئے ترکیبوں میں چستی ہے، خیالات سلجھے ہوئے ہیں لیکن زبان میں وہی قدامت کا رنگ جھلکتا ہے، معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے جدید فارسی میں طبع آزمائی کی کوشش ہی نہیں کی۔

محوی کا ذوقِ سخن نہایت پاکیزہ ہے اور کیوں نہ ہو شبلی جیسے بلند پایہ استاد کی شاگردی کا فخر ان کو حاصل ہے، محوی کی ابتدائی شاعری کا حال خود انہی کی زبانی سن لیجئے۔

"مولانا مرحوم (شبلی) کی دل چسپ اور موثر صحبت اور شاگردی کا یہ اثر ہوا کہ ہم میں سے بعض طلبہ فارسی میں ٹوٹی پھوٹی نظم لکھنے لگے اور سب نے قاآنی ہی کا طرز اختیار کیا، کالج سے نکلنے کے بعد بعض ساتھی تو شعر گوئی کی علت سے بالکل پاک اور صاف ہو گئے اور بعض نے

فارسی چھوڑ کر اردو کی طرف توجہ کی اور اچھے شعر کہنے لگے مگر میں
اس علت کے قدیم جراثیم اپنے دماغ سے نکالنے میں آج تک
کامیاب نہ ہوسکا۔"

یہ خیال کہ اب اہل ہند کو فارسی شعر گوئی کی طرف توجہ کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں طویل بحث کا محتاج ہے میں بحث کے صرف اس حصے سے ضرور متفق ہوں کہ اہل ہند کی فارسی شاعری کا سرمایہ خرافات اور اغلاط سے پُر ہے ہاں اس میں شک نہیں کہ بعض اہل کمال ایسے نکلے جن کی شاعری فارسی ادب میں خاص رتبہ رکھتی ہے ان ارباب فن میں خسرو، فیضی، بیدل اور غالب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں، غالب کے بعد فارسی شاعری کی شمع یقیناً خاموش ہو جاتی اگر گرامی اور اقبال جیسی ہستیاں اس کی طرف التفات نہ کرتیں۔ اقبال نے جس انداز سے اس شمع کو روشن کیا وہ طرز ایسا نہیں کہ کوئی دوسرا اس کو نبھا سکے۔ محوی کو اس حیثیت سے اہمیت حاصل ہے کہ انہیں فارسی شاعری سے خاص لگاؤ ہے اور صرف اسی میدان کو انہوں نے اپنے اشہب خیال کی جولان گاہ بنایا ہے۔ محوی نے جیسا کہ خود اعتراف کیا ہے قصیدہ گوئی میں شعرائے طبقہ متوسطین کی پیروی کی ہے اور یہ دور خیالات کی بلندی، تشبیہوں کی نزاکت اور زور مبالغہ کے لئے اور اردو ادب میں ممتاز حیثیت رکھتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ محوی کا کلام بھی ان محاسنِ شعر سے آراستہ ہے۔

عجیب حسن اتفاق ہے کہ محوی کی شاعری بھی فارسی شاعری کی طرح قصیدہ گوئی سے شروع ہوتی ہے۔ یہ امر خاص طور پر قابلِ لحاظ ہے کہ فارسی شاعری کی ابتدا قصیدے سے ہوتی ہے۔ اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جس وقت فارسی شاعری کا آغاز ہوا ہے تو عرب میں قصیدوں ہی کا دور دورہ تھا۔ اگر فارسی شعرا بھی عرب شعرا کی طرح مدح کو حقیقت سے آگے نہ بڑھنے دیتے تو شاعری کی یہ ساری کائنات رائگاں نہ جاتی لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوا اور یہی وجہ ہے کہ فارسی قصیدہ گوئی کا دفترِ بے پایاں محض خرافات سے لبریز ہے اور فارسی قصیدہ گوئی کا آخری دور تو بالکل غزل ہی ہو کر رہ گیا ہے۔

اگر قصیدوں سے حقیقی کام لیا جاتا تو یہ صنف بڑی کارآمد ثابت ہوتی اور اس سے کیا عجب کہ افرادِ قوم کے قلوب میں ماضی کے کارناموں کی ایسی یاد باقی رہ جاتی جو ان کے لئے تازیانے کا کام کرتی اور ان کے اسلاف کے سچے واقعات انہیں دعوتِ عمل دیتے رہتے۔

عموماً قصائد میں جن واقعات کا ذکر کیا جاتا ہے وہ ہفتخوان رستم سے کم نہیں ہوتے، یہ ایسے واقعات ہوتے ہیں جن کا اس مادی دنیا سے تو کوئی تعلق نہیں معلوم ہوتا پھر جن ممدوحین کی شان میں یہ قصیدے لکھے گئے ہیں ان کی تاریخ میں کوئی حیثیت نہیں، بڑی دقت سے تاریخ میں ان کا پتہ چلے تو چلے۔ اسی لئے قصائد میں ان دو[1] صفتوں کی ہمیشہ ضرورت محسوس ہوتی رہی۔

ا۔ جس[2] کی مدح کی جائے وہ ایسا نہ ہو کہ تاریخ میں محض تمام سلسلہ کے لئے ایک سرسری ذکر کر دیا جائے

۲۔ مدحیہ[3] مضمون میں ایسے دور از قیاس واقعات نہ بیان کئے جائیں جو ممدوح سے منسوب نہیں کئے جا سکتے یعنی مبالغہ اور پرواز تخیل سے "عدم آباد" نہ بسا یا جائے۔

ان شرایط کی روشنی میں اگر محوی کے کلام کا مطالعہ کیا جائے تو آپ یقیناً اس نتیجے پر پہونچیں گے کہ محوی کا کلام بڑی حد تک ان ضرورتوں کو پورا کرتا ہے۔

میں محوی کا کلام پڑھنے سے پیشتر یہ فیصلہ کر چکا تھا کہ اور شعرا کے کلام کی طرح یہ بھی بھٹی سے پر ہوگا، لیکن بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس زمانے میں جب کہ بادشاہ تو بادشاہ وزرا اور معمولی عہدہ داروں کی تعریف میں زمین اور آسمان کے قلابے ملا دئے جاتے ہیں محوی نے اپنے لئے نہایت ہی صحیح راستے کا انتخاب کیا ہے۔

مبالغہ یقیناً شاعری کی جان ہے لیکن ایسا مبالغہ:۔

آن سُبک سیر کہ گرم عنانش سازی	از ازل سوے ابد وز ابد آید بہ ازل
قطرہ اکش دم رفتن چکد از پیشانی	شبنم اساش نشیند گہ رجعت بہ کفل

بے معنیٰ نہیں تو اور کیا ہے؟

محوی نے بھی مبالغہ کیا ہے لیکن وہ ایسا نہیں کہ مضحکہ خیز ہو جائے مثلاً وہ صفحہ ۳ پر سلطان دکن کی مدح کرتے ہیں

دلِ او صاف راے او روشن	عقلِ او تیز چشم حق نگر است
ملک را کار ساز و کار کشا	قوم را چارہ ساز و چارہ گر است
حیدر آباد زیر سایۂ او	منبع فضل و چشمۂ ہنر است

[1] ماخوذ از شعر العجم

[2] ایضاً

. . . .

عہد مامون و روزگار رشید — چشم بد دور باز در نظر است
می کند سنجری و در خیلش — انوری و معزی و عمر است
می کند اکبری و در بزمش — صد چو فیضی و فضل و بیربر است

ایک اور جگہ لکھتے ہیں

جز یکے خورشید خورشید دگر پیدا نکرد — عمرہا بگذشت می گویند شب آبستن ست
آفتاب دین و دولت شمع بزم علم و فن — نیست جز شاہ دکن بر اہل عالم روشن ست
بادشاہ ماست یا ہارون دیا مامون عہد — حیدرآباد ست یا علم و ہنر را معدن ست

ہمیں اس کا بخوبی احساس ہے کہ قصیدہ گوئی میں مدح کا پہلو قیاس و خیال سے ضرور بلند ہو جاتا ہے لیکن اگر اس میں اتنا غلو ہو کہ طائر تخیل بھٹکنے لگے تو شاعری نہیں بلکہ سحر ابن ہو جاتا ہے۔ دیکھئے ظہیری نے بھی مبالغہ کیا ہے لیکن کس سلیقے انداز سے

نہ کرسئ فلک نہد اندیشہ زیر پائے — تا بوسہ بر رکاب قزل ارسلان دہد

شعر کی خوبی میں کس کو کلام ہے لیکن دیکھنا یہ ہے کہ اندیشے نے جس کے لئے یہ ساری تکلیف گوارا کی ہے اس شخص کی تاریخ میں کوئی حیثیت بھی ہے؟

سلطنت آصفیہ اغیار کی نظروں میں کیسی ہی گئی گزری کیوں نہ سہی لیکن یہ مغلیہ سلطنت کی آخری یادگار ہے، اسی سلطنت نے شاہان مغلیہ کے بعد اس ملی جلی تہذیب و تمدن اور زبان کو خون سے سینچا جس کو سلیم مرحوم ہند ولسانی کہتے تھے ان تاثرات کے علاوہ شاعر کا دل زمانے کی ناسازگاری، طوطا چشمی اور خصوصاً عالم اسلام کی زبوں حالی سے بھی متاثر ہے وہ حیدرآباد کو دیکھتا ہے تو اس کے دل میں غرناطہ، دمشق اور بغداد کی یاد چٹکیاں لینے لگتی ہے وہ سچے دل سے اس حکومت اور اس کے فرمان روا کی بقا کے لئے دعا کرتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس کی تمناؤں اور دعاؤں میں خلوص اور درد ہے جب وہ ماضی کا سماں باندھتا ہے تو آنکھیں پرنم ہو جاتی ہیں اور جب وہ تمناؤں کی رنگین داستان کا ذکر چھیڑتا ہے تو دل مسرت سے لبریز ہو جاتا ہے۔

حیدرآباد بعہد تو اگر خواست خدائے — مرکز دائرۂ دولت و دین خواہد شد
پردہ از عظمت غرناطہ بخواہد افتاد — قصۂ شوکت بغداد یقیں خواہد شد
صولت غزنی و دہلی و بخارا و دمشق — ہست افسانہ کہ با عقل قریں خواہد شد

چشم اسلام چو از خواب گراں بکشاید — چار سو بنگرد و لب بفغاں بکشاید
خویش را زار چو در پنجۂ اعدا بیند — نظر یاس سوئے اتیاں بکشاید
کیست آن مرد کہ از ملت بیضائے رسول — دست شر بند و آغوش اماں بکشاید
تا رخ غوطہ دگر بار بتابد چو چمن — تا سر دجلہ دگر آب رواں بکشاید
راست گویم کہ دعا از دل من گشتہ قوم — ہمچو تیرے ست کہ از سخت کماں بکشاید

مفتیٔ شہر ندانم کہ چنیں بے خبر ست
با تو اے شاہ کہ گفتست؟ دعا بے اثر ست

قصیدہ گوئی میں ایک اور بڑا نقص یہ ہے کہ ممدوح کی درازیٔ عمر کے لئے جو دعائیں کی جاتی ہیں وہ ایسی عجیب و غریب ہوتی ہیں کہ بس شاعر کے تخیل ہی کی داد دیجئے۔ اگر کبھی کسی شاعر کی دعا پوری ہو جاتی تو معلوم نہیں ممدوح کب تک زندہ رہتا ان کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں۔

حساب عمر و بقائے تو باد چندانی — کہ از محاسبہ عاجز شوند کلک کتاب

سال عمرت باد تا روزی کہ گوید روزگار — اینک اینک شورش یوم الحساب آمد پدید

سال و مال و بخت و تخت و قال و حال او بود — تا نخستیں صور اسرافیل یارب می رسد

محوی بھی اپنے بادشاہ ذیجاہ کی درازی عمر کے لئے دست بدعا ہیں لیکن ان دعاؤں میں بجائے تصنع کے خلوص ہے۔

عمرت دراز باد کہ در عہدِ امن تو — عالم اماں ز گردشِ لیل و نہار یافت

دوش ہنگامِ دعا از ربِ ذو المنن — بہرِ شہ توفیق و اقبال و بقامی خواستم
خدا بہ شاہ دہد عمر و دولت و اقبال — کہ بہرِ راحتِ ما رنج بے شمار کشید

محوی صرف مدح ہی پر اکتفا نہیں کرتے بلکہ سعدیؒ کی طرح وہ بادشاہ کو نصیحت بھی کرتے ہیں، بادشاہ بھی تو آخر انسان ہوتا ہے۔ سہو جب پیغمبروں سے ہوتا ہے تو بادشا کس قطار میں، دیکھئے ذیل کے اشعار میں محوی نے کس دلنشیں انداز میں نصیحت کی ہے۔

شاہ را روشن گرِ ہر انجمن باید شدن — ہمچو جاں قوت دہِ ہر عضوِ تن باید شدن
در رسومِ داوری چوں آفتابِ نیمروز — بر سرِ اہلِ جہاں پرتو فگن باید شدن
در تنِ ہر مملکت روح و روان علم ست و فن — بادشہ را سرپرستِ علم و فن باید شدن
باعثِ معموریِ ہر سلطنت مرد و زن ست — خواجہ را تسکینِ جانِ ہر مرد و زن باید شدن
گر تو خواہی خواجہ بر خلقِ خدا فرمان دہی — خود ترا فرماں پذیرِ ذو المنن باید شدن
گر تو می جوئی تسلط بر دلِ اسلامیاں — فارغ از اندیشہ ہائے ما و من باید شدن
برگِ گل خوشبوئے اخلاقِ تو ہر ذی ہوش را — سرخوش و سرشار چوں مرغِ چمن باید شدن

یہی وہ چیزیں ہیں جو ایک بلند کردار کو اوروں سے ممیز کرتی ہیں، دیکھنے میں یہ چیز بڑی آسان معلوم ہوتی ہے لیکن اچھے اچھے زاہدانِ کامل اور حاملانِ دین شریعت جب بادشاہ کے سامنے ہوتے ہیں تو وہ تملق آمیز باتیں کرتے ہیں کہ الاماں!

اس کے علاوہ محوی کا کلام ادبی محاسن سے بھی آراستہ ہے۔

رات کو عموماً شعرا حاملہ عورت سے تشبیہ دیتے ہیں دیکھئے محوی نے اس مضمون کو کس اچھوتے انداز میں باندھا ہے۔

جز یکے خورشید خورشید دگر پیدا نکرد عمر ہا بگذشت می گویند شب آبستن است

اس خیال کو کہ حضرت غفران مکان کے زمانے میں ہائی کورٹ کی تعمیر شروع ہو چکی تھی لیکن تکمیل حضرت آصف سابع کے عہد میں ہوئی نہایت ہی بلیغ انداز میں بیان کیا ہے۔

ہر خیالے کہ پدر بست پسر کرد تمام از پدر انچہ نیامد ز پسر می آید

موجودہ مجلس عالیہ عدالت کی تعمیر اس جگہ ہوئی ہے جہاں قطب شاہوں کے زمانے میں ایک عالی شان عمارت "داد محل" تھی اور اس عمارت کی تعمیر سے پہلے مجلس عالیہ عدالت ایک مقام سے دوسرے مقام پر منتقل ہوتی تھی دیکھئے اس واقعہ کو کس دلچسپ اور ظریفانہ انداز میں لکھا ہے۔

"داد" آوارہ و سرگشتہ بگردید بسے عزم فرمود کہ زیں پیش چنان نگزارد

"داد" را داد چنیں قصر معلی کہ بہ لطف نام در دہر ز فردوس دجنان نگزارد

اس کے بعد ذیل کے دو شعروں میں ایک فلسفیانہ نکتہ بیان کیا ہے۔

گفتم اے "داد محل" خیز و نظر کن چمنے کہ بہارش چمن آرائے خزان نگزارد

گفت خامش کہ دریں دائرۂ نقش و دال ہیچ جز نام نکو دور زماں نگزارد

"زاہل درد شنو قصۂ زلیخا را" اس مصرعہ طرح پر محوی نے بھی ایک غزل کہی ہے۔ اسی بحر قافیہ اور ردیف میں بعض اکابر شعرا مثلاً حافظ، فیضی، ظہیر، نظیری اور غالب نے بھی طبع آزمائی کی ہے۔ یوں تو محوی کی پوری غزل مرصع ہے لیکن بعض شعر بڑے لاجواب ہیں۔

بیا دِ روئے تو تسکین دل تواں کردن ولے چہ چارہ کنم چشم ناشکیبا را

ہزار رنگ تماشہ شکستہ اند و ہنوز ہزار رنگ تماشاست چشم بینا را

نشستن من بیچارہ از قناعت نیست زبس دویدہ ام و رنجہ کردہ ام پا را

بہرحال اس زمانے میں جب کہ فارسی ادب کے محاسن سے بہت کم لوگ واقف ہیں محوی کی یہ کوشش ہر طرح قابل ستائش ہے۔ محوی کا مجموعہ یقیناً پڑھنے اور پڑھانے کا مستحق ہے۔ **افضل**

عربک کالج میگزین مدیر جناب عزیز احمد چودھری، کاغذ عمدہ، چھپائی ٹائپ مگر بہت صاف، عربی کالج دہلی کا غالباً ماہوار مجلہ ہے، مضامین کا بیشتر حصہ طلبار کے قلم سے نکلا ہے، صفحۂ اول پر شاعر مشرق علیہ الرحمۃ کی ایک دل کش تصویر ہے، جسے دیکھ کر دل سے بے ساختہ آہ نکل جاتی ہے، "آہ اقبال" کے تحت جناب مدیر نے اس ہستی کی موت پر اشک باری کی ہے جس کے سوگ میں ملت اسلامیہ برسوں خوں کے آنسو روئے گی۔

"دو دو باتیں" کے ذیل میں کالج سنسار کی خبریں درج کی گئی ہیں، بیان کا اسلوب کسی قدر مزاحیہ ہے۔ "علامہ اقبال مرحوم" اور "اقبال" دو مختصر مضامین ہیں، ثانی الذکر میں صاحب مضمون نے شاعر کے فلسفۂ خودی کی تشریح فرمائی ہے۔ اقبال رح کی ساری تصانیف کی بنیاد اسی فلسفے پر ہے، اس پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے، مضمون ایک حد تک نامکمل ہے، "لفظ صوفی کے معنیٰ و استخراج" کے عنوان سے ایک دلچسپ بحث چھیڑی گئی ہے، مگر بیان کو تشنہ ہی چھوڑ دیا ہے۔ انجم صاحب کا مکالمہ "سرمایہ دار و مزدور" خوب چیز ہے، ہرچند ضرب کلیم و بال جبریل کے مکالموں کے آگے اس کی کوئی حقیقت نہیں، تاہم یہ اتباع داد کا مستحق ہے، ہمارے نوجوان شعرا غزل گوئی کو چھوڑ کر جو نہ صرف کل بلکہ بہت مشق طلب صنف شعر ہے، اس نوع کی شاعری طرف رجوع ہوں تو بہتر ہے

سرمایہ دار:-

دنیا کی سیاست مرے قدموں کی بھکارن
تہذیب و شرافت میری ہستی کا ہے پرتو

ہوں صاحب املاک جہاں دست نگر ہے
ہیں مصلح و رہبر یہوں میری قوم غلط رو

آخری مصرعہ مضحکہ خیز معلوم ہوتا ہے

اسی طرح

مزدور:-

رنگینیٔ عالم ہے مرے خون کی سرخی
یہ میری تباہی نہیں دنیا کا زیاں ہے

میں راز ہوں قدرت کا کہاں اوج ثریا؟
دنیا کا تغیر مری ٹھوکر میں نہاں ہے

کہاں اوج ثریا کی بلاغت سمجھ میں نہ آئی۔

"چاند تارا" ایک مزاحیہ مضمون ہے، مزاح نگاری بہت آسان سمجھ لی گئی ہے، حالانکہ یہ بہت نازک صنف ادب

ہے اس میں بڑی احتیاط اور مشق کی ضرورت ہے، ذرا قدم ڈگمگائے اور ابتذال کی خندق میں گرے، زیادہ زمانہ نہیں گزرا مزاح نگاری بُری طرح اُبل پڑی تھی، ہر بوالہوس نے مزاح نگاری شروع کر دی، بلکہ بعضوں نے تو پیشہ بنا لیا، مگر چونکہ سلیقہ نہ رکھتے تھے بیہودگی اور پھوہڑ پن پر اتر آئے، اور اب تو ان کا کہیں نام بھی نہیں سنائی دیتا، ہر صنف ادب کے لئے خاص اصول و آداب مختص ہیں ان کی پابندی از بس ضروری ہے، جب تک اُن خاص اصول و قواعد پر عبور حاصل نہ ہو جائے اس پر قلم اُٹھانا اور اس کو پبلک کے سامنے پیش کرنا، خوش مذاقی کے خلاف ہے، اس مضمون میں بھی جا بجا اس قسم کی خامیاں نظر آتی ہیں،

"اقبال سے" جناب تبسم کی فکر کا نتیجہ ہے، نظم چونکہ اقبالؒ کے نام پر لکھی گئی ہے ہم اس کو تعظیم دیتے ہیں۔ ورنہ حال یہ ہے۔۔۔۔

ختم ہی اسلامیانِ ہند تھے　　قلم تیرا گر نہ ہوتا یوں رواں

"قلم"، بہ سکونِ لام غالباً ضرورت شعری کے سبب باندھا گیا ہے،

"ہے ثریا سے بلند تیرا مقام" "بلند" کی دال گر جاتی ہے، اسی طرح "اک نئی روح زندگی میں پھونک دی" "روح" کی "ح" ادا نہیں ہوتی"۔

مختلف اوصاف ان شعرا کے　　ہوئے ہیں نغموں سے تیرے ضوفشاں

قطع نظر مصرعِ اول کی غیر موزونیت کے اوصاف کا نغموں سے ضوفشاں ہونا سمجھ میں نہیں آتا۔

افسانہ "انتقام" مدیر مجلہ کے زورِ قلم کا نتیجہ ہے، این جا ست کہ آفتاب تیز است، افسانے کا پلاٹ مبتدیانہ اور تحریر کا اسلوب نہایت غیر موزوں، یہ چیز قابل اعتراض اس لئے نہیں کہ فسانہ نگار خود نومشق معلوم ہوتے ہیں، لہذا ہم اسے نظر انداز کرتے ہیں، مگر ایک بات جو جا بجا کھٹکتی ہے وہ زبان کی مذموم غلطیاں ہیں،

"حال میں وہ ڈپٹی کلکٹر ہو کر یہاں لگا تھا"۔ اردو میں تو اس موقعہ پر "آیا تھا" یا "مقرر ہوا تھا" بولتے ہیں۔ "ان کی باز پرسی کرنے والا کوئی نہ تھا" باز پرس کے بجائے "باز پرسی"، ممکن ہے اردو کو ہندی بنانے میں زیادہ مدد دے!

"واعظ نے اس کے لئے اپنے ہاتھ سے کئی تکیوں کے غلاف اور رومال نکال کر رکھے ہوئے تھے" قطع نظر اس جملے کی پنجابیت کے "نکار ڈھ کر" کی بجائے "نکال کر" کی بھی ایک ہی کہی!

"کامیابی کی تاریں" حالانکہ اردو میں تار مذکر مستعمل ہے (ملاحظات دہلی و لکھنؤ)، ڈاکٹر نے لکھنے پڑھنے سے منع کیا ہوا تھا" چہ خوش!

اگر زبان کا پنجابی رنگ عمداً قائم رکھا گیا ہے تو یہ بہت زیادتی ہے، ایسی انتہا پسندی ٹھیک نہیں اس میں شک نہیں کہ مقامی اثرات کم و بیش ہر زبان میں موجود ہوتے ہیں، خود انگریزی میں دیکھ لیجئے اسکاٹ لینڈ کی Dialect اور ہے تو ویلز کی اور، مگر اس کے برخلاف معیاری انگریزی جو ایک بار قرار پا گئی۔ دنیا کے ہر حصہ میں وہی معیاری زبان تسلیم کی جاتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ انگریزی زبان میں یک سانیت پائی جاتی ہے، مقامی اثرات کو اپنے خاص دائرے سے متجاوز نہ ہونا چاہئے، اور زبان کا جب ایک معیار مقرر ہو چکا اور تسلیم کیا جا چکا تو اس میں جا و بے جا مقامی بول چال کے الفاظ و محاورات ٹھونسنا، ہٹ دھرمی ہے۔ جس کی حدیں تنگ نظری سے مل جاتی ہیں ہم اُن مقامی الفاظ و محاورات کو غلط نہیں کہتے، بشرطیکہ وہ اپنی خاص حد سے آگے نہ بڑھیں، دکن میں بھی بہت سے مقامی الفاظ و محاورات روزمرہ کی بول چال میں داخل ہیں، مثلاً ڈاک کے لئے "ٹپہ" کا لفظ، یا چنگی کے لئے "کروڑگیری" کی اصطلاح، مگر یہ صرف دکن کی حد تک ہیں، ہمیں اس پر ہرگز اصرار نہیں کہ یہ الفاظ معیاری اردو میں شامل ہو جائیں زبان کی توسیع و اشاعت جیسے خوشگوار فرائض کو چھوڑ کر ہمیں اس کی اصلاح کے درپے نہ ہونا چاہئے، اصلاح جو ہونا تھی ہو چکی اور اس میں شک نہیں خوب ہوئی ہمیں بے جا ترمیم و تبدیل کا کوئی حق نہیں، ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بنانے سے زبان کے حصے بخرے ہو جائیں گے، صحیح الفاظ و محاورات کو چھوڑ کر نامانوس مقامی الفاظ و محاورات کی بھرمار کرنا یقیناً زبان کے راستے میں بہت بڑی رکاوٹ پیدا کرنا ہے اور اس طرح ہم کبھی بھی زبان کو ایک مرکز پر نہیں لا سکتے، بہتر تو یہی ہوگا کہ مقامی بول چال کو مقام کی حد تک رہنے دیا جائے اور ہم کوشش اس امر کی کریں کہ سارے ہندوستان میں اس سرے سے اس سرے تک ایک ہی زبان لکھی جائے۔

"قومیت" جناب سید احمد صاحب کا مضمون خوب ہے، انداز بیان شگفتہ اور زبان سلیس ہے، جہاں تک خیال کا تعلق ہے ہمیں اختلاف ضرور ہے، موصوف نے نہایت متانت و سنجیدگی سے یہ ذہن نشین کرانے کی کوشش کی ہے کہ قومیت کی تعمیر وطن کی بنیادوں پر ہوتی ہے نہ کہ مذہب پر، یہ بحث ابھی زیادہ عرصہ نہیں ہوا بڑی شد و مد سے ہمارے جرائد میں چھڑی ہوئی تھی، اور بعض اوقات تو اس نے بہت تلخ و ناخوش گوار صورت بھی

اختیار کر لی ہے، ہمیں از سرِ نو اس کے اُٹھانے کی ضرورت نہیں تاہم اتنا ضرور کہیں گے کہ دیگر اقوام و ملل کے متعلق ممکن ہے صاحب مضمون کا خیال درست ہو لیکن جہاں تک ملتِ اسلامیہ کا تعلق ہے ہمیں ان کے خیال سے قطعی اختلاف ہے، مسلمان ہر جگہ مسلمان ہے، اس کی سیاست مذہب، اُس کی حکومت مذہب، اس کا تمدن مذہب، اس کی معاشرت مذہب، غرض مذہب اُس کی زندگی کے ہر شعبے میں رچا ہوا ہے۔ اسلام وطنیت و نسلیت کو دنیا سے فنا کرنے کے لئے آیا ہے۔

اقوام میں مخلوقِ خدا بٹتی ہے اس سے   قومیت اسلام کی جڑ کٹتی ہے اس سے

یہ کہنا کہ یہی وطنیت بڑھتے بڑھتے عالمی بھائی چارہ (Universal brotherhood) تک پہنچ جائے گی، دور کی کوڑی لانا ہے تا تریاق از عراق آوردہ شود مار گزیدہ مردہ شود، رفتار زمانہ کا خیال کرتے ہوئے یہ خیال ایک خوابِ شیریں سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا، جس کی تعبیر ممکن ہے کسی اور حشر کی تباہی سے زیادہ واضح ہو جائے! بحث بہت طویل اور فرصت طلب ہے،

اس رشتہ بہ انگشت مپیچی کہ دراز است

مجلہ فی الجملہ برا نہیں، اُمید ہے نقشِ ثانی نقشِ اول سے بہتر ہوگا، اربابِ مجلہ کو حصۂ اردو کے اختصار پر بھی غور کرنا چاہئے، اور حصہ اردو ہی ہماری زیادہ توجہ کا محتاج ہے کیونکہ یہی ہماری قومی زبان ہے اور اس کی خدمت ہمارا اولین فرض ہے۔

ا۔م



Mohd. AFZALUDDIN B.A. (Osmania)
Editor Urdu Section, Osmania Magazine

nion therefore must always be transient and for the time being. Our good is the University's and we are part of it, so also are the different members both of the University staff and of the University administration.

At present however we are trying to do so, and progressing towards that one great goal which is our destiny— a higher tone of human perfection.

MIR ABBAS ALI KHAN,
M. A. Previous (Osmania).



My analysis of it is this. So far as they are students of the University, they have before them—at least 90% of the students have before them as an aim—one or other competitive examination for Government or Imperial Service. Hence they realise that it is inadvisable to offend those who although authoritarian are perhaps a part of the examining body. But all the 90 in every 100 do not succeed in the Services and other tests. Hence the remaining disappointed element seeks public platforms and becomes nationalistic. Thus the mild, the silent and the meek become unruly boisterous and revolutionary and the contrast is explicable. To the credit of this University it must be said that an Osmanian student is and always remains the same.

Of course, exceptionally, one finds that being mentally very deeply wounded, an Osmanian too seems to be a little unruly, but, thanks to the wise leadership of certain astute educationists, that even those discrepancies are fast disappearing from the University life of Osmania.

The most congenial and healthy feelings ought to exist and, thanks to providence, do exist between all branches of life at the Osmania, and we can only to-day say that we are entering a vast region of untold happiness and real progress when student and student, and teacher and taught all have between them the healthy relations of an immensely large family.

May this family develop, progress, extend and co-ordinate, and culminate in the form of the best educational and cultural family the world has ever seen, with traditions of brotherhood, selflessness, devotion, attachment and search after the Great Truth. However widely we differ we must remind ourselves that ours is a general good : and to attain that good we have to live as a whole. Differences of opi-

is a holiday, and perhaps in all, there are about fifteen such days in the whole year which are held in esteem by the different castes and communities. This leaves a very big margin for academic pursuits and the labour being more continued and persistent, is more fruitful. Intervening holidays here at Osmania lessen the charm of assiduous student-life and the degree of instruction is also reduced.

The most lamentable aspect of life at the Osmania University is the total indifference towards that particular kind of life which is characteristically scholarly, and the environment and atmosphere of the two Universities therefore is different. For with all that is highest and best, what is a university worth if its units are not true students?

One more observation about the Allahabad students and I am finished.

In a comparison of the general life at Allahabad and life within the Allahabad University itself, I find a remarkable and direct contrast. On the one hand, every evening one finds a group of men gathered in one park or the other in the Allahabad city, delivering the most vigorous anti-authoritarian speeches, and a congregation ready to vomit fire at any institution which smells of authority. On the other, in the University, students crouch up to their seats in the university as meek and submissive creatures apparently ready to bear even the worst brunt of the rod of authority. Does not the anti-aunthoritative public contain men who have passed their days quietly and submissively at the University? Then, how does this immense change result in them? How can men collectively and individually be the most meek and the most revolutionary within the brief space of a few years?

duce really bold speakers, but the enthusiasm created at the Lucknow University All-India Debate (1937) was perhaps the most trying test even for the best speaker of Aligarh. The greatest power of achieving an All-India standard is latent in the speakers of the Mysore University but the only trouble about them is their too close phonetic affinity with Madras, and if at all there is any reason for the failure of the Madras speakers to attain an All-India reputation it is because of their style of speaking under which heading they lose a great deal of marks by the Kanarese and Tamil tone in their pronounciation.

As for Urdu speakers, Allahabad is an impoverished institution. Lucknow, Osmania and Aligarh are perhaps the outstanding Universities as regards the standard of Urdu speakers, and Punjab and Delhi rank next but for one or two of Delhi speakers, especially one from the Anglo-Arabic College. Seldom do the speakers differ widely in matter, and hence the manner of speaking is the deciding factor. Here, originality comes in.

Perhaps there is no greater point of contrast in the University life of Allahabad and Osmania than in the number of working days. And this is true of most of the Universities in British India for, holidays being very much less frequent there, the amount of work done and the opportunities for continued labour are both greater.

The university terms begin in mid-July and continues up to late April, as compared to Osmania's term of June to March, but neither the long-term vacations nor the shorter holidays are as long or as frequent respectively as at Osmania. Dasahra claims fourteen days in October and Christmas eight in December; for the rest, every Sunday

doubt about his appealing—most. Often, on any given subject, the method of approach between any two speakers differs. Again, some make it a point to create humour and perhaps the saddest folly of a naturally sober speaker is the attempt to enliven his speech with the insertion of jokes and humorous incidents, for usually it is very difficult to let the two extreme points meet at any very adaptable mean, unless the humour is instantaneous and impromptu. Humour fallen flat on an audience creates the worst feeling in the speaker and it is this uneasy feeling which every speaker ought to avoid.

At Allahabad, the standard of the speakers is not very high. Of course the medium of instruction being English, the average Allahabad speaker expresses himself more often in that language than an average speaker at the Osmania University in the same language. Hence, so far as speaking in English is concerned the Allahabad speakers, on the average, are better off than the Osmanians, but judged from an All-India standard, the Allahabad platform has not produced for the last four or five years a speaker who can boast to have the reputation of a first rate All-India speaker. The University of Bombay has produced certain very good speakers, so also has the University of Punjab, but speakers from Lahore often fall short, in their standard of speaking, of the Allahabad University nowadays, although at the All-India Debate held at Allahabad last year, a speaker from Lahore carried away a prize. Again, the average Benares University speaker excels the average Allahabad University one, but the best from the latter is by far superior to the best from the former. At Lucknow, debaters are fewer, as at Allahabad, but the standard is perhaps lower than either that of Allahabad or of Aligarh. The Muslim University platform is undoubtedly a very good platform to pro-

at Allahabad, where nothing but a whole list of a candidate's qualifications is deemed sufficient for the purpose. At Osmania pamphlets are one of those assets which go a great way either to bring up, or to pull down, the weight of the electors' opinion about the candidates.

Pamphlets, during my stay at Osmania have been seen to have altered the fates of different ministries but pamphleteering is no part of the Allahabad University elections. Again, because there are no parties, there is not that fervour and zeal among the workers of different ministries which makes for the blowing of trumpets and the show of democracy. Farce it may be, but if even a farce has such enthusiasm, it is worth the having.

Elections have been copied to the last letter at the Osmania University from the large-scale political elections in democratic countries.

At Allahabad, the election day seems to be a day of mourning. Not with shouts of merriment nor with cries of peculiar party shibboleths, but with the growing quiet and the reigning silence of a funeral procession do voters proceed to the polls. In a word, voting here, although a duty, becomes also a pleasure: there, it is duty and compulsion.

The standard of the Allahabad University speakers ought to be judged from two standpoints. Firstly, from the opinion of the judges at the University Debates, and secondly from their relative standard among the speakers of India. Judges in debates form better opinions about speakers than perhaps speakers among themselves. Primarily, in debates and speeches the striking quality is originality.

Obviously, if among a number of speakers any particular speaker shows a certain originality about himself there is no

abad Student's President neither reigns nor rules, but, unlike him, he is stable: he does not resign so often; although under the constitution he is made to lay down the seals of office once every three months.

The short-term disadvantages therefore are more keenly felt there than at any other University in India. Then again, the Osmania President will suffer immensely in prestige if he goes out canvassing for himself or for his party. It is, otherwise at Allahabad. He suffers if he tries to maintain this kind of prestige. His prestiage lies in the very act of requesting his friends to spread a net of canvassers but it is still incomplete if he does not himself canvass. The result of this system of election is not very wholesome. The absence of party strife result in a series of individual personal differences between the President and others, which necessitates a regular consultation with the Vice-Chancellor, who is approached so often that he is perceptibly annoyed. It means lack of individual ability to settle differences: it means a waste of time, both on the part of the Union and the Vice-Chancellor it means absence of the congenial and adaptable habit which in all political and semi-political institutions settles a great many differences through the great political virtue of compromise. But it means more. It shows freedom from that party out-look which sacrifices higher and wider interests. In elections based on party systems a candidate counts not for what he is personally worth, his ability, his sincerity in a good cause and personal qualifications, but for the number votes he commands. A candidate therefore, in the American party technology is not "much" but "so many."

Pamphlets form a very interesting enterprise in elections held at the Osmania. For here they are more than they are

elections the party system, with all its undesirable shortcomings is perhaps the best training-ground for that larger democratic process which is becoming more and more keenly felt by ever aspiring Indian. It is on this basis more than on any other that I appreciate the system of election obtaining in Osmania, but even here certain very desirable alterations are needed—of traditions which are essentially the resulting weaknesses of party system itself, that for instance of sacrificing merit and University interest for party needs.

At this very moment, the Union here at Osmania is endorsing the names of the candidates for the next election. As I write these lines I am feeling one great change in the life of the Union : the elections so far are passing off as if the Union and its sometime prize-posts have no glamour about them. Opinions are always personal and likely to be miscalculated, but my analysis is that either the moral tone of the students has increased considerably in that they have risen above the usual turmoil and party conceptions entailing elections, or that the moral prestige of the union has suffered so much that it offers no temptation to the aspiring and the ambitious. Whatever is true, it cannot be denied that some change has come May it be the former, may it be for the best. For the Union is the Students' body, and the University too survives only if there are students. Without them, both the institutions are of no use, hence they must feel the burden of responsibility. The leadership of about two thousand students is not a matter of pastime. It is serious.

Allahabad there are no definite parties as we understand them here. At best there are groups. It is therefore more France than England, but for certain differences. Like the French President, the Allah-

Small rooms, practically no furniture and) this is true of at least half the hostels) bad bath-rooms and unhealthy corners are usually the broad features of the average hostels. Insufficent funds, of course, are their weak point, The Lucknow University surpasses the Allahabad in matters of convenience, the Punjab and Bombay come higher up still, and Osmania hightest.

The U.T.C. of the Allahabad University is an efficient organisation. Dress and discipline are much the same as in Osmania but certain differences there are most desirable.

Firstly, the U.T.C. there is duly regarded as a living organisation of the university and the strength (671) is a whole battalion of ready, interested, keen active young men, fearless and enterprising. Secondly, its high prestige protects it from too frequent use.

Here at Osmania, students take little personal interest in it and the general feeling towards the organisation is one of derision. This is neither a healthy sign nor a healthy encouragement for the proper growth of any institution. It is by virtue of this willingness to encourage the corps on the part of the students, that a rank in the U.T.C. there counts a great deal for success in Military and Police Competitions. With all efforts to raise its prestige in Osmania the institution, unfortunately, is achieving a negative value, although its handling is efficient.

The Allahabad University Union is a curious organisation. From three elections held each year for all posts of Union the number has come down to two from the last year, but the system of election is placed on an entirely different basis.

Differences of opinion are a sign of real moving life especially in a body of students. And in the University

An Introduction Night is celebrated but it is so far localised that a few "Seniors"—by virtue of long residence and not seniority of class—are all that the new-comers need be afraid of. On the other hand, the Introduction Night at the Osmania Hostels is far more pleasant, the seniors of all the hostels combining to form a jolly company.

Not much need to be said of the Allahabad Hostel management for even the Hostel or House, and the Dining Hall, monitorships are but in name. The Dining Hall is but a pantry extended, and the office-bearers have hardly any control over the policy or the finance of the office under their control. There no restrictions upon dress at the table, no observances regarding a prescribed behaviour at the table, and hardly a palatable diet. For all this too, differences of social atmosphere and domestic upbringing are responsible.

One observation must however be made to complete this side of the student life. Real democracy, if it prevails at all, prevails to the fullest in the relations between the servants and the masters in hostels and private homes. Few are the places where relations are so equal as in the U.P. It reminds us of the Islamic brotherhood.

There are nine hostels altogether, excluding the Women's Hostel, and each of these has an elected Secretary a tennis, football, cricket, volley ball and indoor-games Captain. Each has one, two or in certain cases even three tennis courts—all lawn courts—a cricket and football field, a Debating Hall, two House Monitors, a Hostel Superintendent and a warden.

In matters of convenience, of course, the Allahabad Hostels are no match to the Osmania University ones.

much above Osmania's in Cricket but in Tennis and Hockey and even in Football, Allahabad possesses far better teams. The cause for this is not far to seek. The whole blame rests here on the lack of proper attention paid by the students themselves. Even the most desirable arrangements cannot produce a really good quality of sportsmen if students manifest as little interest as they do here at Osmania. A general disinclination prevails here and the fields are as much disliked as the class-rooms.

That earnest zeal for improvement which is manifested by growing interest is hardly ever witnessed amongst students in generol in Hyderabad. There, if there is anythihg to vie with the interest of the classroom and the library, it is the playing field. Growing consciousness has made the value of sports in university life steadily felt in Osmania too, but it must increase if it is to produce better material fit fot selection in the higher order of the country's sports.

One thing Osmania very much needs is a good swimming pool to keep the youths of the university in the fulness of health, and although the pool of the Allahabad university is not as enviable as that of the Muslim University at Aligarh or the Canal recently built in the Benares University, still it serves the purposes. University authorities here must be approached to construct one such pool in the vicinity of the hostels. The period for different activities in the various hostels of the university at Allahabad is from the beginning of the term in July to about the middle of September when growing cold forces the seniors to abandon teasing the new-comers with buckets of water and colour at night.

The next is a delicate point to touch, but an honest and truthful exposition of facts must not be ill-judged. Firstly, the staff of the two universities and secondly, the relations of the students with the authorities, both here and there. At both places the staff is no doubt efficient but certain minute details must be brought out. There is a marked different in the methods of imparting education. In Osmania the professors teach, in Allahabad they educate. No doubt, much depends upon the curricula of the two, and the staff are justified in making a reference to what is prescribed, but the mode is essentially different.

In one point Osmania overwhelming by excels. There, education in the classroom is onesided – the students being no party to it except as listeners (except with one or two professors). Here, discussion is more free and more frequent. If not actually disallowed—which frequently it is—in Allahabad a hint is somehow dropped to the effect that discussion is not desirable. But that institution makes amends for such a drawback by weekly seminars, which in Osmania appears in the form of tutorials. The saminer is perhaps a better method.

Relations there existing between the students and the staff can best be judged from this view-point that discussions are totally disallowed : with the result that students are less free with their professors there than here, and a great gulf intervenes between them. Not that too friendly relations are the most ideal but that the effects of too strained ones also retard progress. And relations must be healthy, and signs of such are daily increasing at Osmania. The general standard of their games is not

What I have, during my association with the Osmania University longed for, is the prevalence of that academic or university atmosphere which consists in earnest individual labour: in a word, that which characterises a student and makes him scholarly.

The average Osmanian cares very little to bury himself in original books and depends largely on class-notes, whereas not only in Allahabad but in various universities of India, I have found that students on the whole give little credit to notes except for quick revision.

Any friend that you find missing at Allahabad during the daytime, you are sure to find buried in books in the Library during leisure. True, a small percentage is very fond of 'tea-ing' (as here) in the recess, but that is a negligible section. Books from the Library can be taken, as here, for a fortnight: books are nearly always "out" from the library (again as here) for quite long periods, but what is perhaps the best feature of the library there is that all books are accessible to the student for perusal in the library itself, whereas here, only reference books are available in this way.

This fact makes the library the centre of attraction and students do not of their own accord leave the library. Either the university bell calls them to their classes, or, at six in the evening, the library peon reminds them that the time is over. And I have myself known students, particularly late in the year, practically living in the library.

The procedure for obtaining books is simple enough. The student receives two cards at the beginning of the year, called the Reader's Ticket and the Membership Card. For taking books outside the library the latter, and for perusal in the library itself the former is used.

institution falls short of other universities also because of the fact that the Hindustani and not English is the medium of instruction. True, this medium is to our purpose, it is profitable and highly appreciable as a principle of education, but true also that it reduces the influx of men from all over British India where English is still more paying than Hindustani. The strength affects the material: it reacts upon the spirit of competition, upon struggle, for it is this conflict of intellects which is always constructive: a wholesome growth. But outlook is not the growth of practical experience or day to day eventualities alone; together with daily experience, outlook grows and expands with study. That is its theoretical side: the book-work. And in this the average Allahabad student surpasses the Osmanian. In criticising mine is a good intention to instruct, to stir, to animate, not merely to disparage.

The ultimate aim before the student speaks of both the degree of usefulness and the realisation of the purposes of education. It indicates aspiration, ambition and the capacity to do.

In Allahabad, as perhaps in several universities of India, the object of education with the students is primarily livelihood through government service. Out of every ten that one comes across, every eight have the I. C. S. as their aim, the remaining are bent either upon the Provincial Civil Service, the Imperial Police Service or some such prize Service. Competitive examinations are hence the aim of at least ninety per cent. of the student population. These require tremendous industry and an advanced standard of knowledge coupled with genuine spirit of research and self help which is unfortunately not the chief feature of the average Osmanian.

education, during the period of assimilation, of synthesis, of growing, enlarging and developing, even during that period, health and physique ought to be the primary considerations. *Important as it is in itself, today is always the threshold of tomorrow.*

Vigour and bloom therefore is absent from the appearance of the students not only of Osmania and of Allahabad, but from the youth of nearly fourteen out of the sixteen universities of India.

In outlook, of course, the average student of the Allahabad university is far ahead: but there are reasons accountable for it. Firstly, Hyderabad is a more or less self-sufficient unit, where 'to live' has not yet become as difficult as in other places say, Allahabad, where to live one must struggle more, fight more. It is true, the only convincing sign of life is struggle. It not only maintains, it develops, it enlarges, it stimulates, it makes grow. Osmania has very few outsiders on its rolls. To Allahabad, on the other hand, students flock from distant places. Although not the most, it is one of the more cosmopolitan' (to use the word in a restricted sense) Universities of India, Aligarh was the one University of the type before the Benares University came into being, for to it, students came, and even now come from all the parts of India. Hence, greater competition.

Then there is another reason. Whereas it is true that the Osmania University was not established either to vie with the other universities in matters of numelical strength or to boast that it contains elements from all parts of India in it, it is perhaps indisputable that the strength of this

The Allahabad and the Osmania University

A Survey

Usually, but not invariably, things belonging to us are dearer to us than things not our own: hence the feeling of self-interest and prejudice. But the student should have as little prejudice as possible, although a certain amount of partiality, if not bias, is not absent even from the most disinterested and truthful criticism. It is inevitable.

In such light, I have sincerely endeavoured to study things in their true perspective. Of course, when I compare a University where I have spent four long years of an advancing, assimilating life with one where I have passed only one such, I can be taken to have been at a disadvantage for the fullest information: but, invariably the new and the strange call for a more investigating spirit, and the inquisitive mind meddles most with the unknown.

To begin with, I take the students, in general, of the two universities. Plainly enough, the student of any one is hardly better than the other in his physique. Their form and physique speaks rather of an apology of youth itself; and perhaps the best university in India where "the perfect youth," in point of physique, is to be found is the Punjab University. And this "youth" counts for much in educational, as in various other activities. The weaklings, even if they are first among the first classes, prove unfit in the field of life for which education is but a preparation. And even during

dual instead of the organisation. Thus citizenship is the result of the urge in man to leave behind isolation and to co-operate with his fellow-beings. Man in his forward march has increased his power and secured a satisfaction in proportion to his ability to co-operate effectively with his fellows. He has broken away from the subjectivity of older political orders to seek responsible citizenship in the new. He has deposed monarchy for democracy and has ceased to be a subject and has become a citizen.

T. R. PADMANABACHARI,
M. A. Final Class (English)

growing apathy of the average individual towards political problems. The increasing centralisation of different institutional functions and the totalitarian tendencies are its contributory factors. To Harold Laski "that opportunity to contribute his instructed judgement to the public good which is, as the Greeks saw, the essence of citizenship is not within his power." The necessary consequence of a forced international outlook without any idea of world-civilisation is the cause of the present deficiency in civic interest. It has led to a common belief that 'everybody's business is nobody's business. "The whole implied purpose of a democratic system is its assumption that each individual citizen is, equally with any other, entitled to find the avenues of satisfaction fully open to him." This can be made true by a devolution of the governmental responsibilities, not merely on a territorial, but also on a functional basis. And such a scheme of decentralisation brings the various organised interest-units into contact with central and local governments, and enhances the personality of the individual, whose opinion and criticism leave their impress upon Authority.

Pandid Jawaharlal Nehru, ex-President of the Indian National Congress, replying to the civic address of the Corporation of Madras, said that the municipalisation of public utilities is socialism. The transport facilities, and the daily necessities like electricity, chlorinated water and coal gas should never be allowed to remain a medium of individual exploitation of the citizens. The transition from the I-feeling to the We-feeling is important and marks a definite stage in the advance of citizenship. Good citizens are socialised citizens, in whom the egotism of the I-feeling gives place slowly to the social interest of the We-feeling. Miss Follett, hence, advocates a socialisation of the indivi-

rights to the latter. For example the Presidentship of the United States of America is open to only natural born citizens of that State.

Citizenship is generally acquired by birth within a territory. In English law, for purposes of this, an English vessel and an English embassy are considered as part of English territory. But in Germany only Aryan descent is the decisive factor. Semitics and other non-Aryan races have not even elementary citizenship rights.

By marriage a foreign lady becomes ***ipso facto*** a naturalised citizen. Naturalisation may be by appointment or also by application. But one of the ordinary conditions for the same is residence for a specified number of years. One that is not by birth and parentage a ***Mulki*** becomes one if he has lived within the limits of the Hyderabad State for fifteen years, or if his father or immediate guardian has served in H.E.H. the Nizam's Government for twelve years.

If new territories are incorporated into the State, citizenship is very often conferred upon the residents in the acquired territories. After the ***Anshluss*** the Austrians, if they are Aryans, are eligible for the citizenship of the German Reich. Similarly are Pondicherry, Yanam, and Frenchpet in Masulipatam affiliated to France.

The laws regarding the loss of citizenship are equally complicated and varied in different countries. Continued absence, desertion from the military, or acceptance of service under a foreign government may cause loss of citizenship. But the modern tendency, at least in England after 1870, is to allow the individual to have his free choice. And if he so chooses, most states provide for repatriation.

Due to several obvious reasons there is an unfortunately

The citizen has a right to work, and also the right to be paid adequate wages of his labour. Hence Unemployment Insurance and old Age Pensions are the functions of the state. To Laski "Citizenship is the contribution of one's instructed judgment to the public good," from which it is a corollary that every citizen has a right to education. He has also the right to political power, which contains three derivative rights:—the right to franchise, the right to represent, and the right to political office.

There should be freedom of speech, as properly understood, freedom of religious thought, and freedom of publication for raising the individual to his full stature, and the proper progress of the state. In the memorable words of the author of 'Liberty in the Modern State,' "A Government can always learn more from the criticism of its opponents than from the eulogy of its supporters. It stifle that criticism is—at least ultimately—to prepare its own destruction". The freedom of speech includes in it the right to freedom of association and of public meeting.

From a restricted and specialised use of the word, citizen has in everyday parlance come to mean a resident within the limits of a municipal corporation. Thus ***citizen*** is opposed to ***alien***. The aliens though owing extra-territorial allegiance, are nevertheless subject to the common law of the land. In ancient Rome one set of laws were applied to her citizens and another to the alien residents. Thus arose the two great branches of Roman Law,Ius Gentium, and Ius Civile.

Citizens by birth are known as natural citizens while domiciled aliens are called naturalised citizens. The rules that govern the naturalisation of a citizen vary in every state. But the natural citizens have superior or preferential

recognised by the state, for, though all rights are claims, all claims are not rights. Prof. Harold Laski in his chapter on 'Rights' in 'The Grammar of Politics' says: "The rights are those conditions of social life without which no man can seek, in general to be himself at his best. It is only by maintaining rights that the state secures its end."

The first essential duty of each citizen is obedience to the law of the land. For law exists for the well-being of the community, and any breach of it is individual licence, and only courts legal punishment.

The citizen owes allegiance to the State, which implies several things. *In times of war, the individual citizen* might be asked to serve at the battle front. Ordinarily, it is the duty of citizens to support the servants of the state in the performance of their official functions. The police must be rendered all possible aid for the suppression of a riot, or in detecting a miscreant. Other public duties which may be demanded of citizens are to serve as members of the jury in a Sessions case and to record votes in an election. In a democracy, which is "a government of the people," the vote is the only weapon of public opinion. The citizen is expected to keep abreast with the progress of the world, and be conversant with the ever-changing politics of the world. Last, but not the least, is the payment of taxes. The local rates are levied according to local requirements, and may be called a kind of commutation for services that are rendered to the community. It must be remembered that no local or central Government can function without a system of public finance. And the object of all taxation is to secure the maximum social advantage. These duties are not fixed for, they may vary according to time and place.

primary essential of life. Then being "naturally a citizen" he must be prepared to play his past in the political and economic life of the country. And lastly, education must cater for the higher or spiritual needs of man by means of Religion, Painting and Music, and Literature. "Indeed the essential value of a man's education may well be determined by what in later life, is his scale of spiritual values". "Any organisation which makes for the enlargement of knowledge and for great facility of conference is a means not only to industrial peace but to the quickening and stimulation of that sense of comradeship on which our civic life ultimately depends. For education in citizenship, like all education has these two principal aims in view, to present the truth and to fit the minds of men for its reception". (Hadow)

A discussion on citizenship does and must mostly deal with civic rights and duties. As Sir Henry Jones says, "The obligations or duties of the State are the rights of the individual citizens." The converse of it is equally true. He further goes on to say : "The test of a right is, does it or does it not make for the common good. does the granting or the refusal of a citizen's claim make for the development of humanity in the citizen—his good : or does it make for the unity, solidarity, power, and comprehensiveness of the life of the state ? And it is this ***making for*** that must be accentuated."

Whoever wishes to be benefited by the safety and prosperity provided him by the community, must also place his will and services at the disposal of the community. Rights and duties are correlatives. He who would not perform any functions cannot enjoy rights, even as he who does no work, gets no bread. Rights are only claims

The benefits that are conferred upon the citizens by the State, though not exhaustive, may be divided under four heads—the maintenance of security, the promotion of social reform, and the preservation of linguistic culture and tradition. The first includes both protection from foreign invasion, and internal tyranny or anarchy. The material needs of the community imply that the State should pass sumptuary laws, and keep control over trade and commerce. Beyond this the State should undertake Public Works in the interests of the well-being of its citizens.

Whether the State or more properly, the Legislature should tamper with social reform or not is still a debatable point. But gradually as the Police-State is transforming itself into a Social-Service state, state-intervention in matters of social customs and economic organisation is accepted. Sati or slave labour cannot be tolerated in a modern state.

As Aristotle observed, Man is a political animal. And education is a process of training to fit man for the necessities of such a life. Fisher says, "In a broad sense all education should aim at good citizenship. It should have for its principal object the inculcation of a sense of duty to others." The school should engender a common language, a common culture and a common civic outlook among the students, A good and broad general education is ever to be preferred to a sectarian discipline in one or the other school of political thought. Nor should one aspect of national or social life alone be over-emphasised to the detriment and slighting of the others. Aristotle regards civic education as of great moment, and considers it the basis for his plan of civic life. There are three aims of all education. Firstly, education must equip man to earn his bread, the

damage, are not the less sure to offend. Thus conducting our private social intercourse with reciprocal indulgence, we are constrained from wrong on public matters by fear and reverence of our laws—especially such laws as are instituted for the protection of wrongful sufferers, and even such others as, though written, are enforced by a common sense of shame. The private citizen, while engaged in professional business has competent knowledge of public affairs; for we stand alone in regarding the man, who keeps aloof from these latter, not as harmless but as useless".

Almost the same idea prevailed among the Romans to whom, more than to the Greeks, citizenship was an order established. Yet was every right or concession dispensed to the people under the pressure of an insurrection or a foreign war.

Great Britain is exceptional in the history of Europe in combining an enormous quantity of public criticism with very little of practical interference. The civil disturbances and political ferments, great though their magnitude be, have not in the least disturbed the municipal life of the country.

"The city", says Plato, "comes into being because, as a matter of fact, each one of us is not self-sufficient but full of wants." The primary necessities of life being food, shelter and clothing, the social organisation must have begun with a farmer, a mason and a weaver. As human needs increased, there was a concomitant increase in the number of the professional classes. To quote the words of Hadow, "The basis of the state is, in fact, division of labour, so that each man may best realise his own capacities and the tasks are assigned partly by the progressive needs of the community and partly by the respective abilities of its constituents".

responsibility of service that he must render to the community. Without this civic spirit the state will perish. In the words of the Right Honourable H. A. L. Fisher, "There must be some planning for the whole as well as some apprehension of the part, some vision of the future as well as some grasp of the present, some feeling for the needs of others as well as some appetite for the advancement of self."

In ancient Greece there existed the City-States. Sparta, Thebes and Athens were each of them Sovereign States. To the Greeks the State was all-important, and in the conception of Aristotle, "The State comes into being for the sake of mere life : it continues to exist for the sake of the good life." The State was a primary qualification for a civilised life. The city-states having been small in extent and in population roused an intense civic consciousness and patriotism by inculcating a family-feeling among the inhabitants. In Athens, immigrants were allowed to settle down, trade, and also serve in the military, but were never accorded the civic rights, which carried with them the political privileges of a vote or an office. They were considered beyond the pale of Hellenic civilisation, and were deridingly called the "Barbarians." But the Athenian citizen himself was expected to serve the common good of his city by obeying the law to preserve order and peace in the society, to be tolerant in matters of political or religious differences, and try his utmost to improve the lot of all his fellow men. Pericles, who ruled Athens during her golden age, and the outbreak of the Peloponesian war, declared in one of his speeches : "We are not angry with our neighbour for what he may do to please himself, nor do we ever put on those sour looks, which, though, they do no positive

Citizenship

Citizenship has been best defined by Dr. William Boyd in 'The Modern Teacher' as "the right ordering of our several loyalties." A man's loyalty is bounded by circles of social organisations or institutions which are not quite concentric in their importance, but rather, if we may say so, eccentric. For they cut, or overlap each other and direct us towards conflicting orbits. In a conflict between the Church and the State, people might be asked to choose between salvation and patriotism. In all human society there are two antagonistic principles, whose amicable relationship is essential for the continued well-being of its members. The first is Obedience or the submission of the individual will to that of the community. The second, and no less important, is the idea of Independence or the assertion of the individual will against the rest. An excess of the one results in despotism or tyranny, while that of the other ends in anarchy. As James Bryce observes, "The reasonable mean between, or an adjustment to one another of, these two principles creates what we call Free or Popular Government, in which a relatively large number of individual wills agree to form a collective will of the community, and to obey that will cheerfully because each individual has borne a part in forming it." But Independence will soon degenerate unless every member of that free community is capable of citizenship, which involves the triple qualities of Intelligence, Self-Control, and Conscience. He must comprehend the needs of his community, must subordinate his own to the general will, and lastly, realise the

ording to which a person should conduct himself, but the main object is to live up to it and that is the best part of one's education. Self-respect and self-reverence should also be developed in a citizen, as no one would respect himself without respecting his fellowmen. One cannot become a citizen without recognising that he is a part and parcel of the society to which he belongs. To possess professional standing and votes does not at all make a citizen. What really makes a citizen is a recognition of the social obligation that one owes to his country, in order, that within the limits of his own knowledge and resources, he does what he can to leave society better than he found it. Citizens should not be proud that they hold a high office in the state, nor should they by reason of what one calls education, separate themselves unconsciously or consciously from the rest of their society in their lives, thoughts and duties ; nor should they look down upon the uneducated with contempt. Besides this, the prevalence of communalism is very detrimental to ideal citizens. Religion and creed should not dominate a citizen, as everybody can reach their own ends by whatever means they like. But they should not bring this higher and bigger matter of religion between man and God, into a dispute of nationality.

Thus, it is, in addition to intellect and emotion, the acquisition of the instinct and the spirit of living up to what one thinks right, to be just, to be noble, to learn the spirit of discipline and co-ordinate action which is the foundation of ideal citizenship.

H. W. BUTT

B. A. Senior.

for the expense of the performance of public duties. One must not think taxes to be unreasonable, as the government cannot perform certain things without any help from the people ; consequently we should admit the right of the state in levying taxes. Of course, the government tries its best to avoid complaints such as taxing one class of people for the benefit of the other, but it is very difficult for a government to apportion its taxes satisfactorily.

As regards the duty of the government towards the citizen, one is not certain about them. There are various schools of thought which think differently. Some believe that the government should not interfere in anything else except person and property. There are others who say that all the management of the country's social activity should be carried on by the government, but unless the citizens co-operate with the government, no state can prosper.

In conclusion, it is essential for every ideal citizen to have co-ordinate action. It is not sufficient to possess merely an amount of sensitive emotion, or so to say, a sufficent amount of responsive action : nor is mere intellectual achievement enough, but the most important factor is the spirit of co-ordinate action and sacrifice for the right. The sacrifice for the right does not mean the sterile education of understanding the rights, but of living the rights and being able to fight for the right at the cost of oneself. No doubt citizens are entitled to individual judgment, but its corresponding relation to corporate decision should not be ignored. Individual judgment is not *all* in life, as there are occasions where there is no room for individual judgment. Education does not merely consist in acquiring knowledge, nor is it a standard of life acc-

willingly, participate in all the activities of the state in which his presence is most required. To speak clearly, a citizen should be prepared to sacrifice his own life for the interest of his state. Most of the states insist on compulsory military training, wherein each male individual has to undergo military service till he reaches a certain age, so that he may be of use in case of necessity. Refusal to comply with these orders, often leads to imprisonment or deprival of citizenship

It is the duty of every citizen to preserve peace in the country. In fact, if a citizen deliberately refrains from discharging his duty he is liable to punishment. Suppression of riot and revolution are compulsory for the citizen. At the same time no citizen should instigate riots or sow sedition which lead to disturb the public peace. In case citizens wish to voice grievances, they should do so in a constitutional way.

Regarding the duties of a citizen, it is also necessary for him to give his service for public duties in case he is needed, and also record his vote. Citizens even if they do not aspire to public office, should consider it their duty to record their vote. In modern states the will of the majority of the people is the government, and consequently if a citizen refuses to give his vote he will not be entitled to complain if the government is conducted against his wishes. To vote is to acquaint oneself with all the problems of the day and to train oneself to be judicious in the decision of public and political matters.

In ancient days the duties of the citizen also consisted of giving certain days of the year for service on public roads. But this has at present taken the shape of voting for public bodies and paying of taxes. Taxes are levied

in case of stringent conditions. The English theory is that every Englishman remains an Englishman until with the consent of the crown, allegiance is renounced.

The main duty of the state is to further the good of the community. States are usually supposed to be tyranical machines meant for oppression, but one is unable to realise that the state consists of its citizens and as the state tries to further the general good of the community, it is the citizens themselves who are trying to improve. Most of us should try to remove the wrong conception that the state and the government are apart from the citizens. Where state are blamed for mismanagement, it is the citizens themselves who are at fault. The responsibilities of the state are the responsibilities of its citizens. The errors of the state are due to the neglect of civic duties by the citizens.

Now, coming to the duties of the citizen, we find that the first and foremost is obedience to the law. Laws exist in a state, not merely to be obeyed, but to further the interests of the community. Therefore strict obedience to the law is most necessary to advance the interests of the community. Sometimes it may appear to be cruel for an individual to be punished, but as this is the chief instrument to further the good of the whole community, individual interest must be sacrificed for general interest.

Besides obedience, if a citizen wishes to consider himself a citizen, he should be prepared to give his whole-hearted service to his state: in other words, he should be prepared to defend his state against all danger and most

is not entitled to be called a citizen. France regards the children of foreigners born in France as French unless they choose within a year after becoming an adult to follow their parents; and according to the French law, all children of French parents, inspite of being born outside France, are citizens os Fsance. Despite all these various principles regarding citizenship, one may judge for oneself the most equitable way of deciding whether one is a true citizen. Most probably after regarding all the absurdities of the various countries, one would suggest that the rule of kinship or blood is the most appropriate way to entitle people to citizenship. But even here the difficulty of proving the exact nationality of the parents is the chief obstacle.

As I mentioned before, the next important method of acquiring citizenship is naturalization. There are various methods by which naturalization may take place. Marriage is the first, by which a foreign woman becomes a citizen by marrying a citizen; or children of foreign parents, after becoming adults, can decide whether they would choose to be members of that state. Sometimes when a state confers an office on a foreigner, he naturally becomes a citizen, or sometimes if a foreigner applies for citizenship it is conferred on certain conditions.

In the same way citizenship can also be lost, for example if a woman married a stranger she would lose her citizenship, or service under a stranger may lead to the loss of it. Sometimes the causes of losing citizenship are refusal to perform military service or by condemnation of law. Of course the simplest way in which one can lose one's citizenship is by voluntary resignation. Several states refuse the right of resignation, while few States permit it

state who are above eighteen years of age; sometimes the financial condition plays the part of distinguishing a citizen, and sometimes it is sex or literacy: whereas often the balance of mind and character determine a citizen.

A person who is born and lives in a country for his lifetime can be entitled to be called a citizen of that country; the other way in which a person can become a citizen is by giving up his former country and adopting the citizenship of the place he chooses to live in In the first case such a citizen would be termed a natural citizen, and in the second a naturalised citizen. Speaking generally, most of the states make a difference between a natural and a naturalised citizen. Usually the difference extends so far as to deprive the naturalised citizens of the superior positions in the state. There is a common belief that natural citizens prove to be more loyal and patriotic, and it is for this reason, perhaps, that the United States of America limits the office of the President to 'natural-born' citizens.

The way in which one can acquire citizenship is usually by birth, bnt birth is used in quite a broad sense, e. g., the English people can still be called true citizens even if they are born in an English ship or in an English colony. There are some states which have decided descent to be the main factor to judge a true citizen. "Ius sanguinis", as it is called in Germany, Switzerland and Sweden, is a rule which determines that every German, Swiss or Swede whether born in the state or elsewhere is by birth a true citizen. Some states such as Argentina believe that all those who are born in their land become true citizens though their parents may be foreigners, and if a child is born abroad, even though the parents be true citizens, he

Citizenship

At the very outset, the word citizen stands for a person belonging to a particular city who enjoys the privileges of the residence of that city, and is authorised to exercise the rights which its membership confers. In other words, the word citizen is opposed to the word stranger. In a state the residents are divided into two parts, citizens and non-citizens, i. e. strangers. The difference between the two is that one owes his allegiance to the state in which he resides, and the other does not, but to another state to which he really belongs. Strangers, or to put it better, aliens receive protection of the law for their property and person in the country they inhabit and, in return, it is compulsory for them to abide by the ordinary laws of that land; they are not exempted from taxes and rates prevalent there, nor do they have the privilege of taking part in its political affairs.

A citizen, in the true sense of the word, is protected by the law, and has the right to vote, to be elected, or to be appointed. There is a general confusion about the real meaning of a citizen. Some believe that a citizen is one who resides in a state, is protected by its laws and participates in its privileges, political and social; others differ from this, and proceed to confine the word citizen to only those who enjoy political privileges. Theoretically, every individual of a democratic state is equal before law, but not equal in political privileges. These privileges are, in some states for example, confined to those members of the

With a full hand offer it, Brother, lest her anger turn
on thee
And the son of thy heart be stricken and thy house-
hold plunged in grief—
Come offer to Brahma, Vishnu and Shiva, the Trinity.

Most sacred the bull of Shiva makes way down the
noisy street:
We have borne him as unmolested he fed from our
meal at will—
Thus have we worshipped Shiva and laid at his awful
Seat
Full measure of rice and barley for the priest to take
his fill.

Ere the sun was high this morning and the monkey-god
awake,
We slew for the eight armed Durga a goat at her
mystic shrine
That the blood-delighting goddess perchance for a dead
goat's sake
Shall shatter the demon-armies drunk with sacrificial
wine.

What seeketh the sacred river in the land where the
sun is born?
Where the sun is born of the Silence and the fire night-
wanderers flee—
Guard well the Law, O Brother, till heeding nor eve
nor dawn
The high gods snatch thee to Silence as the river is
snatched by the sea.

Elizabeth Douglas-Palleyne

Benares

Flame-rose on the Ganges river, O Brothers, sinks the sun,
Sucked to rest in the silence of the grey smoke-shadowed gloom,
And the haze clings to the rice-field where the long day's planting done
Now scatter the gay-veiled women to the hearth and the weaving-loom.

Through the brooding mists of the night-fall comes the sound of the temple bells
And the horn and the drnm and the warning of the gongs which clang to prayer,
Cease from your toil, O Faithful, by the boats and the fields and well
To mount where the priests watch wary at the head of the steep ghat stair.

See, how the fire glows lurid on the edge of the sacred wave:
A crimson flare in the swampland on the long brown line of shore:
Where low to the whispering waters, whose lingering touch shall save,
Stretch the Feet which shrink in the burning—the Feet which may climb no more.

Come, offer your ghee to the goddess, aflame on a floating leaf:

"Guess now who holds thee?"

Can you not think of me as set apart
from tired form of flesh and aching hands?
Is it then only God who understands
how many shapes like this have held my heart?

The silver chord will loosen soon again
—What matter child or woman; man or mother?
I am Myself to you and not another
when both or caught upon the wheel of Pain.

All thirst has passed away from me, save one
desire of full fulfilment with your soul
—That merging, which at last can make us whole
and draw us safely past the setting sun.

How many creeds yet have we to unlearn
from downward-drifting music of the spheres!
Give me your eyes now; lay to rest your fears
lest, Friend, I grow too tired to return.

Elizabeth Douglas-Pulleyne

munal life of a country, or mar it. It is surely time that those responsible for the advances of science began to voice an opinion of their uses and misuses. "

Association of Scientific Workers
Cambridge
1936.

for those who continue in academic work, teaching and administration tend to take more and more of their time from pure research. In addition many academic posts are of short or uncertain tenure.

5. Industrial Research

There is little need to labour the misfortunes of the Industrial Scientist. Though some Research Associations and Industrial Laboratories are well-run, in the majority the work of the scientist is very materially handicapped. Uncertain tenure of posts, in many cases extremely low salaries, lack offacilities, and, above all the urgent need for positive and profitable results serve to render the life of the Industrial Scientist both personally and scientifically unsatisfactory.

The extensive suppression of scientific discoveries by industrial concerns also reacts on the general progress of science. In many cases the research worker is under contract not to divulge the results of any of his work, and on leaving a post, not to undertake work for another firm in the same field. It necessarily follows that many industrial scientists are isolated from contact with others engaged on related problems, so that both they and their work suffer.

6. The Scientist and the Community

The great developments of our age are largely the result of the devoted work of scientists and technicians. But parallel with this we have the application of science to destructive ends; the permanent state of unemployment of over one million workers is often laid at the door of science. The applications of science can either greatly aid the

effect of this higher (though by no means sufficient) proportion is easily seen in the scale and extent of scientific work there. In addition to the absolute amount spent on scientific research in this country, its distribution is not satisfactory. The main bulk goes either to the physical sciences or to those in some way connected with medicine. The social sciences, which are daily becoming of more importance from the point of view of the welfare of the community, are very much neglected. The United States here also shows an improvement, but provision is still not adequate for needs.

4. Academic Research

The position of the research worker in academic work is, in general, better than that in industry. The facilities are good, and the work, if of a sufficient standard, is almost always published. But the main body of research workers at the universities are Junior Research Students, who after two or three years must seek work elsewhere. These Junior Research Students in provincial Universities are very inadequately financed (those under the D. S. I. R., receiving grants of the order of £120 per annum), and their work must always be conducted with view to completion in two or three years, usually with the necessity of a favourable report even after one year.

The Junior Research Students often take up subsequently posts in which their scientific abilities are by no means used. Admittedly in the physical sciences many take up industrial work, but particularly in the biological field the student is glad to get any post that offers.

In other words, for a fair proportion of the research students, their research careers are three years long. Even

with each other except at the Universities and in the learned societies. In a short period of thirty or forty years, the whole present system of organised research in large laboratories has sprung up. The Universities have become centres of research, the industrial firms are either amalgamated or at least joined together to form Research Associations, and the Department of Scientific and Industrial Research has started many research Institutes. This meteoric growth of the number of research workers has allowed no time for the development of a professional association. In all the other professions—medicine, law, engineering—the slow growth in numbers and importance has permitted the formation of powerful organisations to safeguard the interests of their members. Only in this, the youngest profession, is there no real protection from low salaries, bad conditions and misuse of results. It is also evident that the increasing concentration of scientists in large laboratories has now made it a practical proposition for them to organise themselves.

3. The Finance of Science

Before considering the position of the scientist in detail, it is worth while to consider the aggregate expenditure on scientific research. This has been estimated at roughly 0.1% of the total national income. In relation to the usefulness of science even considered solely in terms of the creation of wealth, this figure is pitiable. When it is also realised that a proportion of this amount is allotted to war research, it is seen that the provision for both pure and applied research, is totally inadequate to secure the maximum benefit for the community. It may be compared with the figure of 0.3% of the national income which is the amount which science receives in the United States. The

The Organisation of Scientists

By

Dr. M. Zaki Uddin M. Sc. (Cambridge), Dr. Phil. (Bonn).,
M. Sc., Ph. D. (Aligarh)

1. Introduction

The organisation of scientists is attracting increasing attention among research workers, no matter whether they are engaged in pure scientific research, or in its applications in industry. The abuses of science, the poor salaries of industrial scientists, the absence of co-ordination in all branches of scientific work, and the anomalies which result from the utilisation of science, are forcing scientists to realise the need for some organisation. Such an organisation must be sufficiently powerful to protect the interests of scientists, and to state effectively the attitude of the scientist to his work and its applications.

This article is being published here to make available a clear explanation of the need for organisation.

2. The Scientist and the Professional Worker

The scientist of the last century was either a person of independent means, an employee or part owner of one of the innumerable small chemical firms, a member of the teaching staff of a university, or, in a very few cases, a holder of research grant made available by endowment. These scientists were very scattered and had little contact

really is. It is the merest cant to say that the plan would lead to " socialism ". The contrary would be the case.

The Calcutta University publications show that it would be altogether a sound thing to organize the young for several years in a labour army, rendering many great national services. This is a most interesting study for India in connection with the realization of her greatest ambitions.

The main thing is that we must ***get to work***, also that we not only can begin with the young, but must do so, for the immense good it would do them. Save the young and they will save us, is the slogan of the Calcutta University propaganda. If you will study what is being done on your University land you will see how practically that applies to you. You will then appreciate the practical sense, as well as idealism of your chancellor and his principal officers, in calling upon you not to argue about the new co-operation but to try help those who are trying to establish it.

The two things we must have fixed in our minds are these: We must bury the hatchet between capital and labour and get them to co-operate for production for use, and then India will be able to advance rapidly, in industrial development as well as in other things. They will not bury it; however, we shall have to do it for them, ***by actually starting the production for use organization.*** The second thing is that we must SAVE THE YOUNG AND THEY WILL SAVE US; the slogan of the Calcutta University propaganda. We can get straight to work and start creating a paradise for the young. That is what we must do first.

great men and your distinguished Chancellor and your departmental chiefs, so that you are now called upon by them in your turn to act.

IT IS EVIDENT THAT WE MIGHT ARGUE FOR EVER ABOUT ALL THIS, ONLY WE MUST NOT ARGUE, BUT BEGIN IT WITH THE YOUNG, AS WE ARE DOING IN HYDERABAD.

There are many prejudices "Rightist" and "Leftist" against this co-operation. Some will say that it would create conditions under which it would be impossible to have discipline in industry. They fail to realize that it would create new conditions under which the workers would become responsible partners quite able, moreover, to deposit a sum as guarantee of regularity.

Some will enquire honestly how we should ensure our young workers fair remuneration in kind. With the educational organization it would be possible, if necessary, to have some industries under covenant with the organization, and to secure a market for them thus to make the co-operation worth their while. Probably however, that would not be necessary.

The rural colonies might very soon go on to enabling people to earn a small capital to pay off the family debt or improve the family holding, saving India from a curse.

The possibility of youths earning capital is of the greatest national, economic and social importance. The use of it could be kept under control, to make it serve national purposes. It would help industrial development, and the evolution of the new industrial system. It would make the youths keen to earn their capital and go out, and do with it something they had planned—with approval. We should, therefore, know under those conditions, what ***individualism***

capitalists would be able to take it all is nothing but absurd. Whenever there is general prosperity the worker gets his share. At the time of the great boom in the United States the workers were highly paid. ***They were quickly becoming shareholders in the concerns in which they worked. We have therefore actually seen the first dawn of a state in which there will be a few big financier capitalists and a great number of small worker capitalists. Co-operation would tend in every way to hasten that dawn of a new era.***

Economists and sociologists, of course, know better than to indulge in day dreams. To the question where all this would lead us, we will simply answer, ***let us begin with the young and the future will show how much or how little will develop. What, we can say is that, with the means of production we possess now, co-operation ought to led to a condition of society in which little groups of free workers would work at parts of manufacturing, and they would be little capitalists. The big capitalist's role would be to help finance them and organize them.*** Under those conditions the "wolf" and the "lamb" might become more or less friends. They would have some of each other's clothing!

THE GREAT THING TO REALISE IN THIS CONNECTION IS THAT WE MUST NOT LET THE SELF-STYLED " PRACTICAL MAN BLUFF US WITH TALK ABOUT " THE NEEDS OF INDUSTRY. ONCE AGAIN THE NEEDS OF MEN ARE THE IMPORTANT CONSIDERATION AND WITH PRODUCTION FOR USE WE SHALL BE ABLE TO ARRANGE THINGS TO BE GOOD FOR MEN AS WE CANNOT NOW.

That is one of the greatest messages you have to deliver, and specially to India where there is so much prejudice against modern industrialism.

It is the grand idea that led your premier university to its " action perhaps without a parallel ", that struck your

Speaking generally, people would go out to work in the factory, farm, or other business, for remuneration in credit with that business; it must be stated incidentally that the seasonal and occasional help the organization might give to farmers in that way might be a feature of the very greatest national and economic importance. Workers would normally sell their credit to the organization. It would pay them for it with *its* credit, with which they would be able to purchase practically anything. The organization, then, would use the farm's or factory's credit which it had purchased, to order from it whatever it wanted of its products. ***That in a few words explains the modern way of carrying out co-operation between capitalists and workers, which seems to be our great*** new hope that has dawned on the horizon.

Making all allowances for the power property gives, and the selfishness it engenders, actual facts give us every reason to hope well of it.

Our commercial system, as it is now, with its cut-throat competition, from which capitalists and workers suffer alike, gives the capitalist every excuse to cut wages down. Often it is with absolute truth that the employer tells his workers that if he gave them more pay they would soon lose everything, because he would cease to be able to compete. I need not go into details about that. You know the truth there is in it, and the extent to which it may be a mere excuse. In a production for use organization, however, in which capitalists and workers would be co-operating to produce commodities abundantly, the circumstances would be entirely different. It seems impossible that the workers should fail to get a very good share of the abundance of products. Under any co-ordinated system the production could scarcely fail to be enormous. The idea that the

sell the organization's products to other customers. Similarly all shops would readily take payment in cheques transferring some credit to them as the credit would soon be as good as money within wide and constantly widening limits. On the same principle many people would readily cash a cheque for a member. This will generally make things clear. There are many other ways by which those working for such an organization would be able to get anything they fancied for their shares, even products of other countries. Knowledge of all this must be popularized.

With sympathetic public, the village school master, getting his pay in credit, would soon find it as good as money. The doctor paid in credit would also.

From the beginning, and throughout, the organization would send its workers to work in commercial concerns working for remuneration in kind—half-day shifts in factories. Its function would be only to "plan production", to send people to work in the right establishments, and to divide the products among them. That is all that "planning" would really mean in co-operative production. It is simple.

There is no need to say very much about "planning production" now. The word is apt to convey a wrong idea.

Planning production for use would be mere empyricism. The organization would send people to work in the industries whose products were wanted by its members, or by the people to whom they would transfer some of their credit. It is only partizan cant that says that production for use presents great difficulties. Really the economics of co-operation, of this of any kind, are remarkable only by their simplicity. Co-operative production for use is the hope not only for India but for the world. All must know about it and, above all, examples must be given.

socialism proposes, only established by all classes co-operating, without any expropriations, capitalists joining.

Some may ask you why it has not been done long ago if it is possible, and why such attempts as have been made to establish colonies have failed. One simple answer is that the organization must have a large permanent foundation. Now the educational colony system is a hopeful foundation. Once again we must try now beginning with the young.

It is also of great importance to explain simply and clearly to the layman that the school masters, doctors, and others who would be paid by the educational colonies organization, would not have sacks of rice—perhaps of qualities they might not care for—or yards of cloth they did not fancy, doled out to them. We are appealing to people to understand what prospects a co-operative production for use organization would open up to them and must make such important points as this quite clear; very soon, perhaps from the very beginning, those workers would be able to get whatever they wanted as their pay in kind.

To explain this, the best plan may be to point out how things would work when the organization was well developed. Everyone will, of course, see at once that a developed production for use organisation would give people credit to the amount of their share. They would then draw with that credit ***whatever goods they wanted***. The great majority of them, when the organisation was well developed, would not be living in the colonies, but in the towns and villages. Shops and co-operative stores would distribute the products to them. Workers might be given a certain amount of credit with those stores or shops. The stores would readily give them, not only the organization's products, but any they wanted, because they would be able to

existence of the Llanó colony in America—that has kept alive although attempting the communistic system which in the past always led to swift failure—you have facts to go on. Progress has made well conceived colonies possible now. Get to know all about it now, and tell others.

Once again these are days of wonderful things, we have great wonders before our eyes and we must call upon true patriots and philanthropists to strive earnestly to work wonders for their country and for mankind by new co-operation. But you economists must do the pioneering. It is indeed, as Sir Dinsha Wacha said, still "double darkness to the millions". Every patriotic Indian should be an economist now as far as the economics of co-operation go. They are simple after all, but you must give a lead.

Though co-operative production is the most ancient system, the idea is "newfangled" to the man in the street, also to many in the office chair. Industrial development, independent of markets, and of trade cycles is a great puzzle to some who look at things through the spectacles of commercialism. The best way perhaps to explain it all to them is by pointing out that such a system —educational colonies, or any other units producing for use, "United Communities"—would be ***nothing but a great self-contained village community spread out over the country***. In the great spread out self-contained community, the spinning and weaving factory colonies would take the place of the primitive spinners and weavers in their cottages, the iron foundry colonies would take the place (mainly though of course not entirely) of the blacksmith in his cottage, and ultimately great collective farms would take place of cultivators of the primitive village. Another way of explaining it is that it would be the plan that

CATED CLASSES. SIR ASUTOSH MOOKERJEE SPOKE OF IT AS THE ONLY SOLUTION FOR THEIR PROBLEM THAT ANYONE REALLY BELIEVES IN. You have also to make clear to all, the fact that there is no limit to the possible extension of co-ordinated production for use, though the speed of extension, would be governed by the available capital. With the enormous productive power organised labour has now, a co-operative production for use organisation might capitalise itself rapidly.* As, however, the late Sir Dinshaw Wacha wrote, "all these facts, which are as clear as crystal to you (economists), are still double darkness to the millions". You must all help. Dispel that "double darkness". The best way is by establishing the co-operative colonies in which students —and others also—who appreciate the great advantages of self-support will begin actually to do the great patriotic work. That, once again, is what your rulers saw, so have placed at your disposal facilities to start a colony. I am sure I shall not appeal in vain to you to take advantage of those facilities, and try earnestly to do for India, for mankind and for yourselves something that will be worth while. The new co-peration is the great hope for you too.

The economics of co-operation is the neglected branch of your science, that is why Calcutta University sent out its publications on it to all parts of the world, as well as India, with two-thousand five-hundred printed circular letters from the university. Few as yet understand exactly why, as with Sir Gilahad's spiritual source of strength, it is able to make one man worth ten. All these possibilities, therefore seem fantasies to most. But we have facts now. With the wonders of the Swiss colonies, of Russia's advance, of Dyalbagh's success, and, one must say, that of the continued

*See "Man and Machine Power", Calcutta University, pp 100., Rs. 1/12.

A co-operative production for use system, might soon bring steadily more and more of the population to industrial centres similar to the farm-schools and factory colonies in which the youths would work. First, they would come from the places where the pressure on the land was great. In these centres, people would similarly spend half of the day cultivating a "homecroft", producing a great deal of the food for their own use, and the othe half day at industrial or kindred work. Once more, you must insist on the fact that it is the economically sound plan. People must not be left under the impression that it is sound philanthropy but bad economics. But there must be holdings in which the industrial workers will produce most of their food. Probably they would practise collective cultivation, and then be able to use the best methods.

More and more, then, the rest of the land would be left to be cultivated by good large-scale methods, each field to produce what it was best suited to produce. As you know well, no one can say what would be the limit of what the land might yield under those conditions. With India's population underfed and increasing you are called upon to study to make known and to try to help practicaly all research work in those directions. We do not know how fast we might advance. We must keep in mind the great fact that Russia, though working under conditions of discord, astonished the world by the rapidity of her advance towards the collectivation of agriculture. India, once more, might be working under conditions of co-operation between the classes. We must try at once, and not argue uselessly about it.

One point to be specially noted, and that is strongly insisted on in the Calcutta University publications, is that THE VERY FIRST STEPS IN THE DIRECTIONS OF COLLECTIVATION MIGHT PROVIDE ABUNDANT EMPLOYMENT FOR THE EDU-

ganda of fatalism, and deliver the new messages of hope. Osmania University is now specially called upon to do it.

The Hyderabad co-operative colony was described from a more general point of view in two long articles in the last issue of the University Magazine, and still more fully in publications issued from the office of the colony, * but to understand the object in view all must be clear about these new facts of modern "technocracy". You must also help people to face squarely, without party bias the modern and changed facts concerning socialism and individualism.

Everybody knows that progress has given us "tools" —powerful machines, processes and methods—that give enormous productive power to the labour of people properly organized to use them. If only we could establish some kind of a co-ordinated system, that would enable us to use those "tools", the most industrially backward country would be able to gallop ahead by well conceived "Five Year Plans". It would be mere child's play, with the means we possess now, for India to satisfy the very simple needs of her people and easy to make her enormous man power effective, and make her what she should be: a great power in the world. The new co-operation could do it.** Every true patriot must help.

But many will perhaps ask you how new co-operation would affect the problem of pressure on the land, and enable India's soil to ***feed her population*** amply. That is, after all, the great problem. Many will begin to be interested in the plan only when that has been made clear to them.

---

* Osmania University Buildings. P. O. Amberpet, Hyderabad-Deccan.

** See a paper by Sir Daniel Hamilton read at the Imperial Conference on Agricultural Co-operation, held at the Glasgow Exhibition, obtainable from his colony at Gosaba, via Canning, Bengal.

The mantle has now fallen on Hyderabad, and Hyderabadis must know that the highest patriotism and philanthropy inspired the Calcutta University propaganda and now, Hyderabad's rulers and high officials, to give their help in the begining to be made.

But the only effective propaganda for new plans is that which is accompanied by as many demonstrations as possible. It takes a number of them to overcome inertia and prejudices. You as economists must be the vanguard of the attack. You must make the facts clear to all whose minds are open, so that they will help the colony.

Study, for instance, Senator Sheppard's bill. Explain people the idea of "United Communities"; how co-operative colonies multiplying and CO-OPERATING MUTUALLY, WITH THEIR NEIGHBOURS, LATER WITH BIG INDUSTRIES, IN A VARIETY OF WAYS, WOULD BRING CO-OPERATION FORWARD TO THE POINT AT WHICH IT WOULD, UNDER SUITABLE CONDITIONS, OF COURSE, GIVE PEOPLE NECESSARIES FOR PAYMENT IN LABOUR (OR ITS PRODUCTS). PARTICULARLY MUST YOU HELP ALL TO SEE THAT EVERY STEP IN THAT DIRECTION WOULD GIVE GREAT NEW OPPORTUNITIES FOR INDUSTRIAL DEVELOPMENT. ABOVE ALL YOU MUST MAKE IT WIDELY KNOWN AND UNDERSTOOD HOW EVERY STEP WOULD BRING US NEARER TO *MAKING THE MACHINE MAN'S DOCILE SERVANT, INSTEAD OF THE CRUEL MASTER IT IS NOW.* ALSO THAT IT WOULD GIVE PEOPLE "ACCESS TO THE MACHINERY OF PRODUCTION". —THEY CAN HAVE IT ALL BY NEW CO-OPERATION MAKING IT PROFITABLE TO THE OWNERS TO GIVE THEM THE "ACCESS".

There are people sedulously spreading the totally wrong idea that such things will be possible only when we have dispossessed the present owners. We can have them now and the greatest authorities on co-operation, Charles Gide, Sir Horace Plunkett, your own great practical economist Sir Dinshah Wacha, call upon you to combat the propa-

to come home for the busy days, so the poorest parents would be only glad to let them go to the collective farming. Next we should hope to see colonies for collective cultivation and industrial work established near enough to factories for the youths to do a half day's work in the factory, or alternate days if the distance was great. As you will see at once, and I shall explain more fully later, ***that would be the beginning of co-operation of big industries*** which, once started might make India, with the different classes co-operating instead of being at each other's throats, advance industrially with a rapidity that would far outstrip Russia's. The factory colony would be a first step to the most beneficial social reform that could be carried out, GIVING THE WORKERS MOST NECESSARY OF THINGS FOR THEIR WELFARE: NAMELY, *VARIETY OF WORK*, AND GIVING INDUSTRIAL WORKERS CONTACT WITH THE LAND AND WITH NATURE. Half the day in the factory and half growing their own food might be the beginning, starting with some enthusiasts, that would lead on to the systematization of a plan of changes, for all, between in-door and out-door work. I can make no more than a passing reference to this aspect, but one of the most important things that co-operative production for use will do will be to create conditions under which we shall be able to arrange for the daily work to be good for the workers, instead of sacrificing them to the needs of a cruel competitive system. With the colossal productive power we have now all this should be possible, and it must be our first thought. Co-operation will give that new era humanizing our civilization.

A striking and outstanding fact is that co-operation can do everything to moralize and humanize industrialism. That, the Calcutta University publications point out, is what educated people must now apply themselves to understanding rendering thus the greatest of all services to mankind.

let alone good boys and girls, and enthusiastic amateurs, to do useful work in connection with the production of necessaries. You have in India the brilliant example of Dyalbagh to show you how, under modern conditions, a little colony well started may grow; you must follow.

As I cannot insist too much, look at these wonders that have been wrought by others and determine to do as well.

The Swiss pioneers have shown how, by co-ordinated production for use, a colony consisting largely of unemployables may be made self-supporting, and how even the unemployables can be given a little bonus on leaving. They then went on to show how the same can be done with a small colony of ex-prisoners, and finally with a reformatory.

Make a beginning here to interest people and so overcome their natural incredulity of such wounders, then we may multiply Dyalbaghs rapidly, for each pioneer makes it easier for another to follow him, and industry may develop soon.

The Calcutta University publications analyse successes of nearly a half a century's duration now, and point out how this co-operation might not only give a splendid system of education for the rural districts, but also rapidly industrialize them in the right way ; they insist especially on the fact that "educational co-operative colonies", by GIVING THE VILLAGE YOUTHS THE OPPORTUNITY TO WORK IN CO—ORDINATION IN FARM-SCHOOLS, as the colonies are called in them, might enable them to earn for themselves a splendid training and education, and soon to provide necessaries for doctors and assistants for the villages. They show that that is the hopeful way to begin.* The lads would be able generally

*See a recently issued Calcutta University pamphlet "Self-supporting Education for the Indian Villages" reprinted from the Jan. Calcutta Review". Obtainable also from the colony office : 9 University Buildings, N. P. O. Amberpet.

This brings us to another of the most important aspects of the new colony. ***Variety of occupation is as necessary to adults as it is to children. With the increasing artificiality and monotony of work in modern industry it is absolutely necessary for us now to think of systematically varying people's occupations.*** As the most eminent of modern industrialists, Mr. Henry Ford, insists, the modern industrial worker should spend half his time working on the land. Something of the kind has become an urgent neccessity now. The new colony will give it to us for all.

There are large classes of people with whom a beginning might be made in that direction. Educational colonies, in which they would have systematically trained and supervised children to help them, would make the plan possible for great numbers of people. The adults, thus will benefit.

Some of you could be the adult workers in the colony we are establishing. It will be for many an interesting practical training. You can also be colonist teachers receiving remuneration in the form of useful products for a few hours a week of teaching. You may thus do very usefully your "little bit" towards spreading the idea of the new co-operative colony and the new co-operation.

These are days of wonders of all kinds. The Calcutta University publications, and now Hyderabad's leaders appeal to educated people is to get to work and ***do something wonderful for education, for their country, their class and themselves.*** Others have done wonders you must too in this way with the lead you have.

Among the greatest wonders of our age are those just of this kind: of "technocracy". Our labour simplifying methods, as Mr. Henry Ford has insisted, enable cripples,

that in the long run it would give us infinitely better cultured people, whose education would not stop on leaving school.

Now it will be said, it has been tried again and again by educationists who have known what priceless value it would have but they have failed. ***They have failed, however, because, they young can work usefully only when helping experienced workers. But that is just the difficulty that progress has now enabled us to overcome.*** In a well-organized colony WELL-TRAINED ADOLESCENTS COULD BE AS GOOD AS ADULTS NOW, WITH A FEW ADULTS GUIDING THEM. THAT HAS WON HALF THE BATTLE FOR US. THE OTHER HALF HAS BEEN WON BY PROGRESS IN LABOUR SAVING METHODS THAT HAS MADE IT POSSIBLE FOR WELL ORGANISED LADS, TO PRODUCE SO MUCH, AND BRING SUCH A VARIETY OF PRODUCTS HOME, THAT THE POORER THE PARENTS THE MORE READILY THEY WOULD CONSENT TO THEIR ADOLESCENT CHILDREN REMAINING IN THE ORGANISATION. IT WILL BE EASILY REALIZED THAT THIS IS SPOKEN OF AS PERHAPS THE BRIGHTEST HOPE THAT HAS EVER DAWNED ON THE SOCIAL HORIZON.

Your rulers call upon you now to help to show how that hope might be realised for India. We must try again what failed in the past, with new means at our disposal. That then is what is to be done on your university land. You must understand the varied significance of the pioneering.

Now we come to another point of very great interest.

How are we to begin, you will ask, as well-trained adolescents are to be the back-bone of the educational colony. The answer is that there are adults who want colonies as much as the children do, and who would want the help of the children to establish them as much as the children want the help of their elders. At the start those adults could take the place of the trained adolescents.

The new very practical colonies will, however, be established with the original aim in view, of bringing into existence a great organization of co-ordinated production, that will result in rapid industrial development on lines that will lead to the most important results, social and national. The new plan, however, is to attain that goal, not by establishing self-contained colonies, which were an economic eccentricity, *but by establishing a great number of practical colonies, for practical purposes. These then multiplying rapidly and co-operating with their neighbours, will form the desired new co-operative organization—"United Communities" in the terms of the American bill*, and the great hope is to begin with a "United Communities" system for the young. The general idea of the educational colony is to form the children and adolescents for "educative employment" in colonies of this new kind with some adults.

Everyone knows how immensely valuable it would be educationally. In fact nothing in the world could be so beneficial to the young as to divide their day between really good productive work, good games, and class work, approximately the same time for each. With those three things to *ring constant changes on, we could keep them joyfully busy all day*—with, of course, proper intervals for the right kinds of relaxation. Everyone knows that such a school day would make every normal child grow up healthy, active alert, and capable. Every educationist knows well that it would be the best moral education, making the young *happy in rendering real service*, giving the fullest play to their best aspirations and most generous impulses. There is hardly to be found a pedagogue so narrow that he would not know that the shorter school hours under those ideally healthy and invigorating conditions would give as good cultural results as the longer hours in ordinary school and

the ***first step towards the new co-operation*** which might solve India's problem of industrial development.

The new co-operative colony, first, differs absolutely from the old. It is a new possibility, a great new hope that has dawned on the horizon as naturally as the sun dawns daily, and that may soon give us a new era.

We have been rapidly perfecting ***labour-simplifying*** methods. As a result of this we have now reached the point at which even the most untrained and unskilled people might join together, sometimes co-operating with some experienced workers, to produce many useful things mainly for themselves. Specially might we have all children brought up in "educational co-operative colonies" on that plan. Every educationist knows it would be of absolutely priceless benefit to them in every way to gide that help.

In the new colonies, practical considerations will dominate, not social doctrines. Production for use will be organized to help the "colonists", to make them as independent as possible of having to sell products, but they will be free to produce for sale as much as they want to, and can sell.

We must put out of our mind the idea of the old co-operative colony of the enthusiast idealists, with their beautiful but impossible plans, which failed in practice. In the colony we are going to establish, people will group themselves as they wish, or work separately in their undertaking if they prefer. No kind of communism or any other "ism" will be enforced. The undertakings will be ***private enterprise, but helping each other mutually*** to produce for each other's use.

to education, so that now ten governments have done something or published something about this new co-operation.

People have come to realize that progress has given colossal productive power to organized labour, and that if we used that power on some plan of co-ordination—not at all necessarily socialism—we should enter into a new era. Capitalists are human beings like socialists. Many of them want to see our power used for the good of the people. Many want to see every good plan tried. The new co-operation is one to **try practically.** It has appealed to the best of them, and to your Government, and thus, again, that we are now making a beginning on your university buildings with twelve acres of land. The plan must be tried, that is evident, every Hyderabadi must now help that is as clear.

I have great sympathy with those who are a bit impatient to know what is actually being planned and carried out in your buildings and on your land. We all know that sociology is a vast ocean of unrealized possibilities strewn with the wrecks of attempts to realize them, many therefore naturally want to clutch at something, however small, that is immediate. But we are in presence of great possibilities, and first we must soar to a higher plain. We must think of India's pressing needs, and great aspirations, and of the world's great distress. Nevertheless we shall go straight to the practical side. It is the best way of illustrating the principles of the new co-operation. In doing it I shall throw at least a sop to those who are impatient for details of the first step. Turning, then, for the moment from the general to the particular, we can tell them at least that the university's land has been taken to give a practical example of ***the new co-operative colony,*** specially for education, which is to be a solution for unemployment among the educated, and.

believing ", with the Chancellor of your University and the chiefs of your Government departments connecting themselves with the effort. But let us not mince matters, the idea is not yet popular and that is why you may not have heard of it. The very greatest have appreciated it but many lesser people have hated the idea. It is a fine suggestion, the socialist says sarcastically, co-operation between the wolf and the lamb! All right, if by co-operation you mean co-operation for a good meal for the wolf, he says. There are others who have also their reasons to turn their backs and shut their eyes. But you in Hyderabad have been put "up against it"; there is no facile slipping away for you. You must carefully study the facts. You will enquire, you will find that eminent men throughout the world approved of the immense propaganda that India's premier university carried out for this " co-operation between the wolf and the lamb". Prominent business men, leading economists and men of practical affairs generally gave generous support these including Lord Sinha, Sir Dorab Tata, Sir Dinshah Wacha, Sir Rajendranath Mookerjee (the Tata of Bengal) Sir Manmatha Nath Mukerji, the Acting Law Member of the Viceroy's Council, who has been untiring in his efforts for the cause, India's great philanthropic nobleman, the late Maharajah of Kasimbazar. A hundred Calcutta citizens signed the "Hundred Citizens' Appeal" in favour of it. To that phalanx of distinguished Indians was added one of Europeans which included the late King Edward, the Prime Minister at the time—who wrote repeatedly, the late Viceroy, Lord Chelmsford, Sir Claude Hill (a late Home Member) and that doughty champion of the cause, Sir Daniel Hamilton. You must study it also.

A Royal Commission and a series of Government committees examined the plan, specially in its applications

have to study these examples and plans of co-ordinated production.

Now there is one aspect of all this which will appeal to most of you more strongly than any other. Man does not live by bread alone. India wants to be a nation, not a dependency. But a country without manufacturing power cannot defend itself with modern methods of warfare. It is absolutely dependent. We have China's fate at the hands of Japan to emphasise the lesson. ***In every way the question of industrial development is the great question for India to-day.*** That is why Calcutta University's eminent Vice-Chancellor launched it into "action perhaps without a parallel" to open people's eyes to that fact that co-ordination can give India ***rapid*** development. That also is why people of his own calibre responded to the appeal, and why Hyderabad, on the initiative of the eminent President of her State Council, is taking the matter up now, appealing to Hyderabadis to help some pioneering that is to be undertaken in the direction of new developments of co-operation.

Now what is the system of co-ordination to be, and what are the main facts in connection with it? Facts always are what one wants in the domain of sociology.

In a word, the new developments are to be in the direction of ***co-operation between capitalists and workers for production for use.*** For twenty years now, as "The Times" reminds us, many of the most eminent Indians have been so impressed with its great hopefulness for India, that they have supported Calcutta University's "action perhaps without a parallel" to make the plan known.

You will very likely be surprised at these statements. You will enquire why, then, you have not heard of it before. In Hyderabad, however, it is now a matter of "Seeing is



only too well what distress her educated classes are in, less perhaps in Hyderabad than anywhere else, but terrible in many parts of India. The cultivators and workers are no better off. Too often they are pitifully under-nourished. With this, population is increasing rapidly. Necessity is the mother of invention, the stern mother is there, vocal enough. What are we to do?

There is but one solution: rapid industrial development, and with it there must be rapid educational progress. *But how are we to make them rapid?* That is the question.

Sincere people will look to the world around them for an answer. They will see what there is to be learned from things that are being done and planned in different countries.

Now, whatever we may think of Bolsheviks and Bolshevism, let us look at what they have achieved and see what there is to imitate in them. Russia, torn by dissensions some of her people working to carry out a plan, others are working to sabotage it, has nevertheless advanced industrially and educationally as no other country has ever advanced before. Every one of you, as economists, will understand exactly why. She has at least had a system of co-ordination. She has shown us that, with modern methods, when there is co-ordination, there is, one might almost say, infinite power. She has had hell against her, but with co-ordination has forged ahead despite all. Then as a bright ray of light on the horizon, pioneers are beginning to show how co-ordinated production for use can be established effectively without socialism. Some Swiss pioneers have given a series of very illuminating examples on a comparatively small scale, and a distinguished American Senator has placed a bill before the United States Legislature to follow up the Swiss success on a large scale. We

Great Problems of Hyderabad India & the World

An address to the Osmania University Economic Society on the 4th of August 1938 by Captain J. W. Petavel, late Lecturer on the Poverty Problem, Calcutta University.

Under the title "A Pioneer Indian State", the London "Times" of the 5th of March last, in the "Educational Supplement," reminds Hyderabadis of the world-wide interest there is in the co-operative undertaking that is being started under their State Co-operative Department, on the initiative of the distinguished President of the State Council, with an inter-departmental committee consisting of heads of departments, and in connection with the university.

It is a clarion-call to the university, and indeed to intellectuals generally, a direct call to parents and educationists, also to all members of the educated classes who have to think about the problem of employment; and, above all, it is a rousing call to every Indian patriot.

The pioneering is being carried out on university land, and with special appeal to the university, because the new developments of co-operation which are to be pioneered must not only be studied, but helped practically by the educated classes, to whom they promise abundant good employment in connection with industrial development on co-ordinated lines, and with education.

Taking first the national view we all know that India must do something energetic and do it quickly. All know

Thou ledst a very obscure life, yet thine eyes saw the world in all its nakedness.
Nature is so much given to the preservation of its mysteries,
That it will never create such a confederate again.

Mir Hasan,
M. A. (Osmania).

If thou art free, I too am not in bondage.
Flight is characteristic of all winged creatures,
Then why should the birds brag.
This insulting remark hurt his vanity and the bird thus began:
" No doubt thou too canst fly,
But thy range is limited to the tops of human habitations.
Thou art unaware of the aspiration of birds.
Thou livest down on the earth, whereas they scale the heavens.
Thou art a domestic fowl and thou searches for food in the dust,
Whereas they, in search of grain, peck at the stars.

Shakespeare.

The twilight of morning finds a mirror in the majestic flow of a river,
The melody of evening is reflected in its glossy quiet.
A rose-petal bears a mirror to the beautiful Goddess of Spring.
For wine, the bridal bower of glass is a mirror.
Beauty is the mirror for truth, and the heart is the mirror for beauty.
For human hearts the beauty of thy songs is a mirror.
Life owes its perfection to thy heaven-scaling imagination.
Was thy omniscient genius all that nature could bring forth ?
When the searching eyes searched for thee,
They found the sun lost in its own radianee.

Now I am in a desert, now in a garden.
Cities, ruins, jungles and oceans are all my domains.
If I choose to rest in some emerald valley, the mountain green serves me as a bed of velvet
God has endowed me with the faculty of showering pearls.
I urge the camel of the Goddess of nature to go forward.
I mitigate the miseries of the depressed peasants, and impart a loveliness to the youths in gardens.
Sometimes like locks I spread myself on the face of the globe.
The comb of the violent blasts of wind restores me to order.
From a distance I tantalize the expectant eyes,
While passing calmly over some green valley.
Out on my round of pleasure,
When I chance to sail over some lake
I present the ear-rings of Vortex to its waters.
I am the hope of the rising green, daughter of the waters and the morning sun.
To the mountain stream I granted the undulation of the sea and standing beside the green I ordered it to rise.
These nightly huts: cottages of the peasants by the mountain side are an outcome of my munificence.

A Dialogue

A domestic fowl said to a bird
Thou hast wings but are they denied to me?
If thou canst fly, I too can.

Islamic Anthem

Ours is China, Arabia and India too.
We are Muslims and the whole world is our mother-land.
The dauntless flame of monotheism burns in our hearts,
It is not easy to destroy us.
We are the custodians of the very first temple of god on the globe,
Which in its turn shields us from all calamities.
We are brought up under the shadow of swords,
Our national emblem bears a sword of crescent.
Our Azan has resounded in the villages of the West.
None could resist our ever-advancing torrent.
O heavens, you have tried us many a time,
And you know that we cannot be overpowered by any falsehood.
O garden of Spain, do you still retain the memory of the days,
When we had our nests in your branches.
You too recognize us, O waves of the Tigris,
Your waves still sing songs of our achievements.
O precincts of Kaaba, we have sacrificed our lives on the altar of thy reverence,
Our blood still runs through thy veins.
Mir-e-Hedjaz is the leader of our caravan,
His is the name which is, for us, a source of eternal comfort.
Iqbal's anthem is, as it were, a clarion call
Lo ! our caravan starts again.

The Mountainside Cloud

My skyey bower scales the heights of heavens.
I am the Mountain cloud that showers a rain of flowers upon the earth.

Drop down from the heavens with dew.
The atmosphere of the garden of my verse preserves
and prolongs life.
I am its gardener, but its spring
And its foundation are as strong as eternity,

Iqbal's Inferno

With imagination as my fellow traveller,
I rose towards the heavens.
On and on I went, and there was no acquaintance of mine.
The stars gazed at me in astonishment,
As my errand was a closed secret.
I found myself beyond the limits of days and nights.
Oh, what a beautiful place paradise is!
An ideal treat for eyes and ears.
Birds sent forth a flood of music from the branches of
Tooba.
Hoories displayed their charms unrestrained.
Beautiful Saqis held cups in their hands
The revellers cried "drain, drain."
At a distance from paradise I beheld a dark region,
Cold and silent,
As dark as the fate of Majnun, or the looks of Laila,
So cold that it would make even the coldest nook of the
globe hide its face in shame.
When I enquired about it, the reply of the unseen guide
was surprising;
"This cold region is inferno, devoid of fire and light.
Its flames are imported,
Which make the sensitive souls quake with fear.
The earthly people, who enter this region,
Bring their own fires with them."

ancient and modern, and has commented upon most of them with an astonishing propriety and comprehension.

Iqbal was not an escapist. He did not try to sublimate his dissatisfaction with life in the emptiness and conceits of sainthood or abstractions. He lived and thought intensely. He was as alive and alert as his "Saheen." Conversation with him was an intellectual adventure. To be derisive about modernity or to idealize the good old days was not his object. He was free from the "civilization complex" which misrepresents everything and is ever preoccupied with white-washing lies. Iqbal's work is completely expressive of his personality.

His genius was eclectic. His eyes could see beyond the lotus-land of India, and beyond the horizon itself. His was not a one-track mind. He loathed shams and revealed the numerous facts of experience stark naked, stripping them for the public gaze. He strove to make man feel the one living God-head, the light which is in man himself. Sometimes he grows wings and sails among the stars, producing masterpieces of rare and exquisite excellence.

The Morning Star

The morning star wept and said,
"Eyes are granted to me but no chance of observation.
The sun has instilled life into all beings,
I am the only that could not find shelter in the lap of
dawn.
How brief is the span of a morning star!
The breath of a bubble or the dying flame of a spark."
I said, "O ornament of the radiant face of dawn,
Does Mortality shock thee? Come down to the earth,

Iqbal

Iqbal is undoubtedly one of the greatest poets of the East, an immortal, an all-time singer of universal and lasting appeal. He was a profound scholar and a full-fledged philosopher whose medium was poetry.

Iqbal fought for freedom, preached love and praised action. With him all belief was subject to revision in the light of new evidence, as he himself once remarked during a conversation with Professor Khaleefa Abdul Hakim, "A man is alive as long as he retains the capacity to accept new ideals; the moment this faculty leaves him, he ceases to be". His change from nationalism to internationalism seems to be an unexpected twist, but it is fully conversant with what preceded it. Thus he advanced from strength to strength always on his way to higher and brighter spheres of mental and spiritual experience.

Love is the motive power of Iqbal's songs. It is the meaning of all things that are. He hated hatred, scorned coercion and tyrrany. "Mard-e-Momid" was his ideal, of whose praise he has sung in many of his pages.

Iqbal's philosophy was dynamic. He proclaimed that passiveness is tantmount to death, and that it is the urge to attain one's own ideal, the magnetism of desire, the volcanic propulsion towards the objective which are the only ways in which man can add more and more rungs to his ladder.

Iqbal has penetrated into all religions and creeds,

indicating to her great surprise that something alive was there, and the next instant the head and neck of the *huge serpent had protruded from a hole in the canvas two* or three feet from her hand. She then leaped back from the bed and had been terrified by seeing first one and then the other of these great snakes glide out from underneath the bed and begin circling around on the floor of the room.

Now, thinking that I might have been the cause of my beloved Rashida's death if the snakes had done any harm to her, I embraced her involuntarily and thanked God that He had saved my Rashida. When I was standing in the room hugged to Rashida, a voice from behind had woken me from my rends of thought. I saw Rahim holding my gun and aiming at Rashida. I left Rashida and proceeded to Rahim. In moment the fellow fired the gun and killed Rashid. The last words that came out from her mouth were, "Mahmood".

Hafeez Siddiqi,
B. Sc. (Osman).

a strip of canvas about a foot wide had been tacked and the edges sewn to the lower sheet. I could not understand what was the idea of the maker in such a construction, but it was presented to my father by some businessman of the jagir. The result of this construction was that an open space a foot deep and comprising the whole under-surface of the bedding had been completely enclosed. One morning, the central part of the canvas sheet was sagging somewhat as though some heavy object was resting upon its central portion. Later on, the sagging was materially increasing and the question recurred to me as to what possible cause there could be for it. I finally concluded that there must be a hole in the mattress out of which the filling was escaping. So I directed Rashida to take off the canvas, clean out the interior, and ascertain whether the mattress needed repairing. After breakfast I went into the garden. Within a few moments I was startled by a series of shrieks the like of which I had never heard from the throat of a human being. Running quickly around the corner of the house, I entered the room to behold a strange spectacle. My Rashida, with broom upraised, in an attitude of mortal terror, which by this time had rendered her spechles, had backed up in the corner of the room farthest from the door. Between her and the doorway were two huge serpents. They were moving slowly about the floor with their heads raised almost to the height of a man's body and darting their tongues out in an excited manner. Immediately I took my gun from the corner of the room and proceeded to kill them. As soon as Rashida recovered from her hysteria and was able to speak, she informed me that on going into the room, she had looked under the bed and struck the heavy body which was bearing down the canvas with the side of the broom. And immediately a commotion had started inside the the canvas

Rashida. But my mother, who is now repenting of her actions, insisted upon my marriage into some noble family. Rashida was poor, and this was her only fault. But this she could not help. I told my mother that I would never marry any other girl except Rashida, but there was no response to my feelings. The result was that in my absence, when I was with you studying in the college, Rashida was married to Rahim. I was not informed of this ; but when I returned home hearing the news of my father's death, the marriage was another shock to me. I had to abide by the decision of my elders. The marriage, as I was told, took place only two months before my father's death.

As I was the only son to manage my father's jagir, I was involved in my own affairs. Poor Rashida cared for me so much that I believe my own mother could not have done so more. My feelings were just the same for Rashida and I still worshipped her. She also responded to my feelings, but I never showed any kind of grievance about her recent marriage. This was, of course, a matter she could not help."

Now Mahmood stopped and asked me, "I think my story boring to you. you—"

"Not in the least," I replied, "I am much interested".

Then he again continued, "You know I am now sleeping in this room. Prior to this I slept in a corner room on the ground floor. It possessed two large windows which were always open. My bed was a four-poster, the mattress being raised to a height of three feet or more from the floor. The space underneath the mattress had been partially enclosed by stretching a strong sheet of canvas horizontally between the posts in such a way that a space of about a foot in depth was left between it and the slats. Around this open space

me in a very sorrowful tone "Ahmed! You do not know what a crime you have committed now".

I confess I could not understand the meaning of this. Mahmud was so pale at the moment that I was terrified to see his face. He did not want to proceed, and so we returned home. We reached the graveyard which was on our way to the house. I now observed Mahmud's eyes began to shed tears involuntarily. He then turned his face towards Rahim, and wept bitterly. Rahim lowered his eyes and seemed to me as a person much ashamed of some noble deed. Mahmud tried to hide his feelings from me but I was becoming more curious to know the secret underlying all this. As soon as we reached home, I impatiently asked Mahmud to reveal his secret to me. I at last persuaded him to do so. Mahmud replied, "Brother, I do not want to hide any thing from you, but I think it advisable not to let you share in my misfortunes". When I insisted upon knowing it, he promised me to tell his story after supper. What he told me that night is an unforgettable thing which has left a scar on my heart, never to be effaced as long as I live on earth.

* * * * * *

"So you are keen to know my story", began Mahmud after supper, when we were lying on our beds. "You will have to listen with patience. Rahim, my servant, whom you see now with me, has been with our family from my childhood. There was a girl in our house, who was adopted by my mother. We two were brought up together in the same house, playing under the same trees of the garden. Later on, I was so much attached to her that I thought our separation would mean death to me. She was a girl of such beauty as cannot be expressed in words. I loved her more than any other thing in the world, in other words, I worshipped h... I wanted to marry

was situated not far from the house. Rahim also added, "My master was not so melancholy after his father's death, but for the last month and a half, he is losing himself". When I asked to give the reason why, he at once replied, "I don't know, sir. But I noticed there were tears in his eyes. I could not, however, understand the matter.

Mahmud, when he was studying with me in the college, was a man of revolutionary ideas. He was more or less a communist. He often told me, "I am at a loss to under stand why one is born poor and the other rich." He wished to see all human beings equal with no distinction of caste or creed, great or small. He at least wanted to have for his jagir a plan of peculiar kind, if he could not do it for the rest of the world.

But now all this was gone. He had wanted to change the circumstances, and if possible, change the whole world, but now he had himself under-gone a great change. I often wanted to ask the reason of all this, but I do not know why I could not.

* * * * * *

One day we were out for shikar. Rahim also followed us, carrying a water-bottle, a chest of cartridges, and a cigarette tin. We intended to hunt deer, but Rahim said we were too late. "For that", he said, "we ought to have come early in the morning, as these deer come to the corn-field very early". We therefore wanted to get some birds and rabbits at least. While we were passing through the forest, we saw a pair of doves sitting on the branch of a tree. I stopped and aimed at it. Mahmud shouted, "You must have both of them in one shot". But unluckily, only one of them fell on the ground and the other escaped. Mahmud, who was quite happy all the time, lost his mood. He was much affected by the event. He told

other friends, but I received no reply. I believe he did not receive my letters as his jagir was at a considerable distance from the railway station. I intended to go over to his place but I had no opportunity.

* * * * * *

I was waiting for the winter vaction and I need not say how impatient I was to see Mahmud. At last the day came. I left for Nizamabad. His house was at a distance of seven or eight miles from the station, and I had difficulty in finding it. I did not inform him of my arrival, as I thought he would never receive my letter. I, therefore, engaged a bullock-cart from the stati on and had an experience of what is called "journey by a bullock-cart". By the time I reached Mahmud I was very tired, but all this disappeared when Mahmud, seeing me from his garden, ran to me with the utmost joy. He then embraced me and began to weep like a child. I could not but console him, and shared a little in his tears. After a time we walked into the house, which was in the centre of the garden. It was the house of a jagirdar, well-built and well-furnished. After ablutions and meals we talked for hours.

* * * * * *

Just a year ago, Mahmud had been quite hale and healthy. He was a jolly and a pleasure-loving fellow. But my surprise knew no bounds when I found Mahmud in quite a different condition. There was a great change in him. I thought his father's death had had a great effect upon him, and I could well-imagine how severe was the shock that this loss had given him. I thought it preferable to bring Mahmud to Hyderabad, so that a change of place and environment might serve to make him forget his grievous loss. Rahim, a servant of the house, told me that Mahmud was happy in my company, otherwise, he said, he was spending the greater part of his time in the graveyard, which

Tragedy

Our B. A. examination was just over, and we were planning a tour of Northern India. Mahmud, a very good friend of mine also agreed to follow us and spend the summer vacation in our company. We were making arrangements for the tour and were waiting impatiently for the appointed date to start. At last the day came when we were to leave Hyderabad. But to our surprise shocking news was heard. Mahmud received a telegram from Nizamabad, his native place, which brought the news of his father's death, and so he had to leave for his home instantly. Mahmud informed a friend of ours of the situation and hurried to Nizamabad. Some of the party came to me and told the sad news. As Mahmud was one of my few close friends, I felt a responsibility to go to him, but my other friends insisted upon my going with them and I could not help but submit to them half-heartedly.

After visiting almost all the important and historical places like Delhi, Agra and Benares, we returned home after a month. Again we had the same routine. I was busy in my own affairs and began to prepare for the LL.B. exam.

Though Mahmud was my very good, friend, he never wrote a single letter after he left for Nizamabad. I thought he was angry with me because I went with the party and not to him for condolence. I wrote, however, two or three letters showing him how I was compelled to go with my

life to have a vital effect upon the life of the country. This is hardly the time to decry universities. There never was greater need in India for the right type of university life than now.

V. S. Krishnan.

tutor the essay written laboriously and with confidence; and the tutor gently and cleverly drawing him out of his shell to argue and defend the points he has urged in the essay; finally convincing him that much of what he thought marvellous in his work was but half correct, and that the tutor was a very nice oldman. Work so done and so discussed becomes one's own, and it remains as a personal possession. The tutorial system to be successful, demands a few conditions : tutors who are learned but are not too heavily weighed down by the sense of their own importance ; small and manageable numbers of students under each tutor, and a first class, well-equipped library near at hand.

The universities in our country are placed in an invidious position by a half-hearted policy which, while unwilling to spend adequately, is eager for quick and tangible results. The public life of the country has not been effectively linked to the universities, resulting in a certain unreality, and therefore some irresponsibility in the life of the undergraduate. The leaders of the country should more and more look upon the universities as the training centre for persons who would make the public life of the country healthy. When we see the amount of mismanagement and corruption in the municipal and local board elections of our country how sorely do we feel the need for independent and honest-minded and cultured men to purge our public life. Our undergraduates must take themselves more seriously especially in their club meetings and union debates. Unless we have a few well-equipped and competently managed universities, where independent thought, a lively and active interest in the life of the country and an eager quest of knowledge are steadily fostered and cultivated, we cannot expect our university

subjects discussed. Only a few years ago the Oxford Union discussed and passed the memorable resolution, that they would not, under any conditions, fight for their King and Country. The first-rate sensation that this resolution created in the whole of the British Isles and in the English and European press shows how seriously the proceedings of the Union are taken by the rest of the country. There is indeed a close and live contact between the public life of the country and the life of the under graduate. Most of the clubs and societies in the university are formed along party lines. You have the Liberal Club, the Conservative Association and the Labour club in Oxford. The leaders of the country naturally look to the universities for their successors. And it is the most natural thing for an undergraduate of Oxford who plays a prominent part in the Union, to expect to be elected to the parliament once he is out of the university. If the British Empire was won on the playing fields of the English public schools, it is governed in the union halls of her universities.

One might imagine, from what I have said, that the university life abroad is just one round of teas, clubs and the union. I hasten to and a word about the academic side of life, especially about the much-discussed and much-misunderstood tutorial system. The academic teaching in most western universities is done less by regular lectures than by tutorial essays and other work. The lectures, attendance at which is not always compulsory, form merely a subsidiary source of information. The main part of the instruction is done between the tutor and the student. The relationship between them is intimate and valuable. The memory of it should remain green in the minds of many a graduate of Oxford or Cambridge. He will remember many an afternoon or after-dinner hour, reading to the

clubs to discuss subjects of a surprising range and variety. Authoritarian influence or supervision is entirely shut out from these groups, where the students dictate and direct the business. Now and then, perhaps, a kindly don might be invited to participate in the discussions; but upon such occasions he is only a guest. The activities of these clubs form a considerable part of the undergraduate's life; and it has been truly said that many a new school of thought or political movement has been born in them.

But discussions are by no means confined to these clubs: they are perhaps more heartily and cheerful at the numerous teas that the undergraduates treat themselves to, either in the common rooms or at their apartments. At these small gatherings of friends, the cup that cheers serves merely to warm up the talk which would range in its subjects from the follies of the National Government to the aesthetics of wearing 'plus-fours'. Nothing keeps the young mind agile and active so successfully as conversation of the right type which calls for the exercise of one's best intellectual powers. When a few genial minds gather together round a blazing fire, the conversation turns on subjects of varied interest, and they are taken up and turned over in each mind with an avidity characteristic of youth. Such talks are wellknown to any undergraduate of Oxford; and it is said with some justice that the student learns more from these talks than through the regular academic course. The residential system helps frequent and prolonged gatherings of this kind, and is richly fruitful in producing keen and well-informed minds.

The universities, besides, have a Union Society where the more ambitious of the undergraduates display their powers of elocution and debate. Here again there is hardly any restriction with regard to the nature and range of the

versities were the cloistered refuge of the select few who gave themselves up to the quest of higher knowledge. In the mediaeval cathedrals and in other places of religious worship, they lived a life of self-renunciation, having few ties with the daily traffic of the world, finding satisfaction in the discovery of some philosophic truth, or in the perception of some secret law of nature. Such dedication to knowledge has its value; and in most modern universities there are specialised Research Departments which carry on similar protracted studies, the results of which are not always quick or tangible. But higher education today not only fosters advanced investigations in science or art, but provides training for the educated citizen whose functions in these democratic and enlightened days are numerous and important. The university men may not discover a comet or a star every day, but the university expects to make its pupils efficient, honest and useful.

The undergraduate who enters one of the great western universities steps into an element of lively and stimulating activity. Two things catch his attention: the complete and unqualified freedom enjoyed by the undergraduates in intellectual matters, and consequently, the confidence and independence with which they pronounce their judgements upon men and affairs—while I say this, I should add that in recent years conditions have changed in certain continental universities; notably in the German universities. But the principles of independent thinking and free discussion on all intellectual matters is still upheld to a greater or less extent by the universities of Oxford and Cambridge. In the first few days of his life in the university the fresher finds that he has become a member of a large number of clubs and societies of political, social, aesthetic and other interests. Almost every night of the week the undergraduates foregather in several of these

University Life In India And Abroad

The undergraduate is a factor of the last importance in modern society. Society spends a considerable share of its monies upon him, and naturally expects a more than ordinary share of usefulness from him when he is qualified and competent to render it. The life in the university is expected to assist and accelerate his many-sided development and fit him for service and responsible work in public life. The undergraduate is put through a course of vigorous training morally, intellectually and spiritually and is taught to think and form his opinions with independence and honesty. Unfortunately, however, the present time in our country does not seem to look kindly upon the under graduate and the university where he leads his life. The university is pronounced by some leaders of our country to be a white elephant whose maintenance even as an ornament is not to be continued because of the inadequacy of our purse. It is not for me to vindicate the importance of the university. Expert educationists behind whose words lie years of university experience have spoken most convincingly about it. Suffice it to say that a country shorn of its universities, though possessing a liberal number of primary schools, will be but half educated and half civilized. The university and its life, which is the life of its undergraduates, from the standard and set the pace for the higher life of society as a whole.

In the olden days, when society was less complex and public life as we know it was yet in its infancy, the uni-

(4) "There was a tiny flower that among throns, and I carried, 'the world's hope is not dead.

To a spiritualist, the flower is a fit offering to his beloved, the respected, the only symbol of his own thoughts and emotions, love and humility. To him it is a re-incarnation of his soul, a symbol of self-renunciation. Thus, the *four inhabitants of the topmost branches of the tree of life*, are man and bird, butterfly and flower—in communion for the perception of Joy and Beauty, the visible form of Truth.

How then can a man pass a flower nonchalantly or with an idea of possession? Symbols of Nature's beautifully mysterious loving self, they are our companions in the search for Truth.

Mohammed-Abdul-Lateef,
B. A., (Osmania).

flower is a thing of beauty and joy for ever. Flowers of various shades and forms beautify the garden and delight the soul. Flowers are the heralds of spring—the childhood and youth of Nature, unfolding from a bud to perish in a few hours. So beautiful are they nodding in the soft winds, opening and closing at dawn or sunset, cheering by their mere presence, the cold sodden atmosphere, and symbolising the pure, mysterious and beautiful.

We transplant our own thoughts on these wonderful things. Saddened by experience, we feel that they too suffer the pangs of death. Does the flower die when the petals whither and fall silently one by one ? Is it afraid of Death and sad to leave this transient life ? Or has it a sense of fulfilling the mission of its life and does it resign itself to its inevitable fate, to mix with the soil whence it sprang forth ? To mix with the salts circulating in the plant, to throb with life and to burst forth again as a new flower, smiling and defying Death ? Who knows ? We, with our few, imperfect senses cannot fathom the vast mysteries of Life.

Seeing the flowers laughing and dancing like children living like us, the Poet indentifies them with everything that is dear, delicate, pure and lovely. He projects his personality and thinks the thoughts of flowers, in the great flower-garden. Here are some thoughts from Rabindranath Tagore.

(1) "The Jasmine's lisping of love to the sun is her flowers".

(5) "The first flower that blossomed on this earth was an invitation to the unborn song".

(3) "God waits to win back his own flowers as gifts from man's hands.

We hungry-eyed monsters look on them with satisfaction because they are the harbingers of the forthcoming seed and fruit. They gladden the gourmand with the prospect of the coming feast. Man plants his fruit-gardens and sows his fields to sustain his life. He, in pollinating and selecting the best seed, acts the role of a fostermother. Once the baser self is satisfied, the sense of the aesthetic in the greedy soul awakens.

Flowers again are stores of perfume. Inhale the exquisite perfume and one forgets the worries of life for a time. Boil the petals and scald with oil—the fleeting perfume is retained thereby. Forget Time and Space and Reality and wander in the vanished gardens in imagination. Flowers are of beautiful colours and lovely forms. On the plant in bud-form or fully bloomed, how charming they look! A blaze of colours, intricate patterns, with shades mingling like a rainbow. It seems as if flowers strewn on the shady, sun-spotted walks, or at the florists, eye the flood of human beings, drifting in the street, with their dreamy resigned eyes.

Think again of their colour and form, lending charm to the wearer, beautifying the gardens, and creating a heavenly atmosphere, from the vases and bowls in a room, thus soothing our jarred, tired nerves.

Enticing imitations of flowers spring a surprise in clever hands. Flowers on rugs, walls, and pillars are an effort to immortalize their fleeting beauty. The painter and the sculptor make concrete images of colour and form, creating ideals with the brush and chisel, and expressing, to the best of their power, the vision of the beauty hidden. The fond gardener creates new wonders; loves and tends them like children unmindful of the events of the world. To him a

life, sprung so miraculously, being ambitious to last to eternity. Life is tenacious beyond comparison. Preservation of self or at least of the race, seems to be the moto of life.

Flowers are produced at a loss to the individual. It is surely an inherent, mysterious urge from within that makes the plants forget themselves so as to sacrifice their lives and live as future plants. Some plants, short-lived, flower and die. Others spend the energy, gathered in the previous season, in producing a blaze of flowers and die in the end, exhausted; and the long-lived tress rhythmically flower in season, steadily living for themselves, and populating the globe with life. Even the vicious parsites and impoverished plants forget their greed, and sacrifice their bodies in giving forth flowers.

Flowers live an intense life, short but sweet. The birth of pollen comes first, then its flights into the air, floating free or carried by inspects or by butterflies. Lovely balloons carrying the lover to meet his bride awaiting him eagerly in the bridal Chamber in a distant flower, are these butterflies who carry the pollen on their bodies, unawares, intoxicated by a sip of nectar! And this is a drama enacted day after day in every flower that blooms.

Flowers and butterflies both help, mutually by suiting their bodies to the taste and liking of each other. They are interdependent and evolved together. White flowers for the night-moths; gay colours, guiding spots, scent of the hidden shy flower are mechanisms to prevent the undesired, and to invite and attract only the eligible butterflies. Oh! the wonderful ways of these loving flower-maidens! Flowers appear to be the highest expressions of Love and Sacrifice.

The Philosophy of Flowers

Life and a flower-are both mysterious and beautiful. How and why is life gladdened and elevated by flowers? What does a flower mean to the life of a plant, to an insect, or to us all?

Early in the morning, one gets up and looks out of the window, upon the blue sky and the rosy clouds, of the hills and the green carpet; an eternal background on which human beings live, laugh and vanish like a dream—a bird singing in the trees, a shivering butterfly on an alluring flower. What an affinity between the song-bird, the butterfly, the flower and man! All these are grown, as it were, on the topmost branches of the Tree of Life.

Flowers are the children of plants, playmates of birds and butterflies and a source of inspiration to men. Is it not curious that the remaining animals in creation should be insensible to the aesthetic or even the utilitarian side of flowers? The beasts tread on their patron, and destroy 'the hand that feeds them'. There is no place for a rose in the life of a buffalo, for uneatables do not exist in the minds of the beasts.

But what is a flower to the plant that produces it? Flowering plants are a later creation, springing on our earth, eighty-nine millions of years ago. A large and varied horde of flowerless plants lived before them, and still persist in the keen struggle of existence, reproducing in simple ways, uniting and leaving their offspring to con inue the precious

certain that Great Britain would never relish a weaker France and a stronger Germany. Thus finally she would have to throw her lot against the German-group to preserve that balance of power which is the corner-stone of her diplomacy and which she has tried to maintain so far with increasing unpopularity in Europe.

MOHAMMED BIN OMER,
B. A. (Osmania)

the later cannot sever its connection with the former, unless prepared to suffer a grim financial collapse. Rumania may stand firm; but the organisation of the Little Entente is liable to be broken owing to the highly precarious situation of Yugoslavia.

None can suggest with certainty the division of powers into hostile camps in a future war. It may be suggested here that Czechoslovakia lying between Poland in the north and Hungary in the south is in a great danger. These powers are rather unfriendly towards her, as they have ever since the Great War tried to recover their lost territories from Czechoslovakia. Their relations with Germany are more friendly and stand on more solid grounds than with any other power. Bulgaria leans heavily on Italy and is exploited in return. She would never be likely to raise even a finger to help her neighbour. Thus, we see a net of hostile powers closely woven round Czechoslovakia, while her allies on whose fidelity she can count further off from her frontiers are few.

Reviewing the whole situation at this stage, it becomes increasingly clear that the German bid for supremacy in central and eastern Europe involves the removal of Czechoslovakia from the map of Europe either by means of the German minority problem, intense economic pressure, diplomacy or naked force does not seem to be a remote possibility. It is definite that Czechoslovakia isolated from her allies cannot withstand the German onslaught for any length of time. And France cannot watch this change in geography with perfect equanimity and this is bound to bring about a fatal direct conflict between the two eternally hostile powers, leading to an international war. Though success must depend in a future war upon the grouping of powers, incredible circumstances, and length of time, yet it is

Germany by the economic exploitation of these countries to be finally directed against France. These are the cogent reasons that brought about the pact of mutual help in October 1925 between them. Three days after the occupation of Austria, the then French Prime Minister, M.Blum, assured Czechoslovakia that in case of a German advance on her territory France would fly to her assistance without consulting either the British Government or the impotent League of Nations.

The relations between Czechoslovakia and Russia are friendly for more than one reason. The common hatred and dread of the Fascist powers has cemented them more closely than ever. Moreover the occupation of Czechoslovakia by Germany places Ukraine (Russian territory) at the mercy of Germany. This is indeed, one of the links in the chain of Russian encirclement long ago thought of by Germany, the other being the Baltic States in the north and Rumania in the south. Apart from these considerations, the pacts concluded in May 1935 between France, Russia and Czechoslovakia make it incumbent one these powers to come to each other's rescue if attacked by a fourth power.

Yugoslavia, Rumania and Czechoslovakia formed the Little Entente in 1921. These States have similar political and economic interests which they settle by means of common councils. Though extremely friendly relations have existed between them, yet it is difficult to foretell their loyalty to each other in face of a European War. Evidently Yugoslavia being nearer to Italy and Germany than France or Russia (who cannot come to her immediate relief) cannot but stand with the Fascist powers (who can at once crush her) against the democratic States. Besides, Italy has such great economic influence in Yugoslavia that

In this tumultuous sea of European diplomacy and the surging storm of rising Imperialist aggression, the only anchor of hope for Czechoslovakia and peace for mankind lies in her relations with allied Powers. Now, let us study these relations.

Leaving Italy aside, as she has become an ally of Germany we turn towards Great Britain only to be disillusioned. Great Britain has renounced all interest in Czechoslovakia. There, in Central Europe she has nothing to lose but everything to gain through the restoration of cordial relations with Germany. So long as Germany does not molest Great Britain in the west of Europe, she is not anxious to check the progress of Hitler in the east of Europe. Indeed, this is the pivot round which Mr. Chamberlain, the present Prime Minister is moving today. The British Prime Minister has plainly stated in the House of Commons on 24th : March 1938 that his Government would not be bound to help Czechoslovakia in case of a German attack. He has refused to consider even the proposal of convening a conference of democratic powers against the German agression put forth by Russia.

In addition to the age-long bitter racial animosity, cultural differences, and suspicious dread existing between France and Germany, the political interests of Czechoslovakia and France are so intimately bound with each other that the success of Germany with either of the powers is the ruin and destruction of the other. Any undue economic or political influence of Germany on Czechoslovakia means (a) the removal of a threat to the German rear from Bohemia which can be effectively utilised in case of a war against Germany (b) the termination of French influence in Czechoslovakia, Hungary, Yugoslavia, Rumania and Bulgaria (c) the general enlargement of the fighting power of

Germany. "Common blood", he has declared "should belong to a common Reich". Hence, the German invasion of Czechslovakia is not after all a Spanish Castle built out of mental aberrations of—journalists or speakers but a foregone conclusion of German militaristic Imperialism.

It has been said that Czechoslovakia can be raided by Germany from three directions. In the northern range of the country there is a gap of nearly 50 miles. German armies rushing through this gap can invade Moravia. Owing to the annexation of Austria, it has become extremely easy for the Nazi forces to base their operations on the Danube basin and make a push for Brno and Moravia through the south. The Fascist forces advancing from the north and the south can divide the country in a few days. Meanwhile, the highly machanised German units will force their way through the passes in the west and capture Bohemia with all its industrial importance. The eastern part of Czechoslovakia, thus separated from Bohemia, stands a chance of falling an easy prey to the Nazi fusillade. The hand which directs the Nazi aggression in these directions will also direct a general rising of the Sudeten Germans in Czechoslovakia. This internal trouble would mean not a little embarassment to a country fighting against an enemy with a standing army of 650,000 soldiers. There is also the menace of the German air-craft to be reckoned with. Germany not being a maritime power has concentrated her attention on the development of an Air Force till she has become the terror of Europe. Powerful German machines can cross the Czechoslovakian frontier at various points within 15 minutes and lay in ruins important places in a couple of hours. Co-ordination of these methods of attack can bring Czechoslovakia to the feet of Hitler in less than a month.

to withold their support, then 144 members in a house of 300 always stand a chance of being defeated on any measure, leading the country either to Fascist rule as come about in Germany in 1933 or inviting Nazi interference under some guise or other from an appeal to the country, as happened at the time of Austrian Plebscite in March 1938.

It was perhaps the effect of these rapidly changing circumstances that was responsible for the statement made by Dr. Hodza, the Prime Minister, in Prague, on March 28, 1938 to the effect that a minority State would be drawn up for the German and other minorities. All existing laws and measures relating to the German speaking minority would be consolidated in the new measure which would form the basis for the settlement of the minority problem. The announcement was considered satisfactory, by the English and the French Governments. Herr Hitler, before and after his entry into Austria has most solemnly assured Czechoslovakia of his intention of strict non-interference in the affairs of the country. But it is to be feared that the Fuhrer will hold as sacred the territorial integrity of Czechoslovakia as he has held that of Austria.

Czechoslovakia is evidently a thorn in the side of Germany, and under one pretext or other it has to be removed. If the clearance is delayed today, it will be started a decade later with renewed vigour. For, in the words of Hitler, it has been decided to direct the German advance towards the east instead of the west: "We start anew where we left off six centuries ago. We reverse the eternal migration of the German people to the south and west of Europe and look eastward". Apart from this declaration of policy, Hitler has not a little emphasised the desirability of including the German minorities near the frontiers in a common Reich for the realisation of a vision of Imperial

Agrariam party had resigned their ministerial posts in the Cabinet. Thest parties had been hitherto strongly supporting the Government and their refusal to co-operate with the Government during the two weeks following the Austrian debacle caused a constitutional crisis of the first magnitude. Even the German Small Traders Party resolved to side with the Henlein Party which has a following of 44 Deputies. The threats of Herr Enhuber and Herr Frank, the spokesman of the Henlein Party on the floor of the two Houses (on 15th: and 16th: March 1938) asking the Government to "accept our demands before it is too late" proved ominous.

The extremely precarious position of the Government Party can be gauged from the following representation in the Chamber of Deputies :—

1.	Henlein Party	44
2.	German Social Democrats	11
3.	German Clericals	6
4.	German Agrarians	5
5.	Nazis	28
6.	Commerce	17
7.	Fascists	6
8.	Communists	30
9.	Czeches & Slovaks	144
10.	Other Minorities	9

It ought not to be supposed the 144 Czechs and Slovaks (shown under one group) from one solid block or owe their allegiance to one party alone. They are divided amongst themselves. There are acute internal differences between them, for they hold divergent views even an fundamental problems of Government policy. The Communists have no representation in the Coalition Cabinet. If they decide

ing a way to the long-cherished south-eastern expansion of Germany. The refusal of the government to consider the demand has led the present deadlock which may at any time invite the Fuhrer to meddle in the affairs of this democratic government against all the principles of international morality and justice.

Moreover, the constitutional problem of the country has become perilous. It has threatened the very organisation of the state and jeopardized the machinery of the government.

The constitution of the country became law from 1920. It granted civil liberty, right of association and freedom of speech to the people irrespective of nationality or creed. It provided two Houses of Parliament: the Lower House consisting of 300 deputies the Upper House of 150 senators. The former are elected for a period of 6 years and latter for 8 years. Both Chambers elect a President for 7 years who forms a Cabinet out of the representatives of the different parties who are willing to carry on the government. The Cabinet Ministers are responsible to the Parliament which in turn should retain the confidence of the electorate.

It is not a little surprising to note that since the beginning of parliamentary government, this small republic has steered her course without extraordinary constitutional deadlocks, which are a common characteristic of democratic governments. But Hitler's success in Austria had immediate repercussions on the German representatives in the Czechoslovak Parliament. The House of Deputies received the shock of its life and its members started in their chairs when it came to hear that Dr. Czech, leader of the German Social Democratic Party, M. Zajicek, leader of the German Clerical Party and Dr. Spina, representative of the German

Leadership was rather thrust upon him. From the post of an ordinary clerk in Reichenberg, he has risen to the fore-front as the unchallenged dictator of the Sudeten Germans through the efforts of his friend Rutha and the "Comrades Union" founded with the object of fighting Bolshevism, Pacifism and Democracy, and acquiring for the German minority the right of self-administration, under one leader. Henlein now fell to work in right earnest. He organised the Union on a broader basis and infused in it the vigour and enthusiasm of his own personality.

The close of the year 1933 saw a more formidable menace to Czechoslovak authority in the "United Home Front" organised by Henlein and consisting of National Socialists, Comrades, Sudeten Germans and others. Henlein was successful to a great extent in bridging the gulf between the rank and file of the German minority community, with different political outlooks. He easily swept the polls in 1935 and won over the Activists.

Until 1935 the Czechoslovak Coalition Government was supported by a majority of more than 65 percent of the German population but since the rise of Henlein and his Party the tables are turned. Things have changed for the worse. The discontended elements of the Activists (the largest German Party) consisting of the Agrarians, Social Democrats and Clericals have flocked under the banner of the Henlein Party, with extremely nationalistic feelings. Henlein was now the acknowledged leader of his people. Supported by Sudeten Germans, financed and advised by Herr Hitler, he flung a challenge to the Czechoslovak Government to recognise the right of forming entire German autonomous districts within the republic. This means an invitation extended to Hitler to direct interference in the internal affairs of Czechoslovakia and open-

occupy vast industrial areas in the west, north and south of Bohemia. Northern and southern Moravia are also inhabited by an almost exclusively German population. Apart from these geographically well situated and centralised areas, they are spread throughout the country. The Germans who have been more than once the masters of the Czechs and Slovaks and possess the haughtiness and grandeur of a ruling nation, feel themselves slighted under the changed conditions. They are not prepared to wear the fresh weeds lightly. They eagerly look towards Berlin for succour in all their domestic troubles. This superiority-complex breeds hatred for the present rulers who pay back in contempt.

The chief complaint of the Sudeten Germans, as they are called after the region, seems to be the negligence of the central government towards their economic interests and civic rights. They believe that the government is out to exterminate the German language and culture. They complain that Czechs and Slovaks receive preferential treatment in architectural enterprises, civil and military services, educational amenities, and quote the growing figure of unemployed people in support of their arguments. These complaints arise more from distrust than from genuine causes and but these grievances for what they are worth, have been fully exploited by Herr Hitler and extravagantly fanned by Herr Henlein, the Nazi leader of the German minority in Czechoslovakia.

Herr Henlein belongs to a class of dictator different from that of Hitler and Mussolini. He neither initiated any political movement nor formed any political organisation, at the outset. He is unaccustomed to dictatorial or bombastic declarations or gorgeously flamboyant expressions.

of them are members of some insurance company or co-operative association. They are generally honest in their dealings frank in their business, and upright in their transactions. They live simply, eat heartily and live carefully.

The Slovaks are more luxurious and extravagant. They are jovial and care-free and more submissive. The Czechs are more subtle, and the Slovaks are more studious.

Minority Problem.

But the peace of these simple, loveable creatures seems to be affected today by the problem of minorities. The following is the proportion of the different nationalities in Czechoslovakia:—

1. Czechs and Slovaks	66.92%
2. Germans	22. 5%
3. Hungarians	4.78%
4. Ruthenians	3.79%
5. Jews	1.37%
6. Poles	.64%

The Hungarian minority has been pacified by the Government to a considerable extent. The Ruthenians who are Ukrainians by race and culture have less cause for complaint under the new regime. The Poles form a negligible minority. Though discontented, there is no fear of their rising in arms against the central authority at Prague. The Jews are for the Government, more out of Nazi dread than from any genuine sympathy. But it is the problem of the German minority that forms the nucleus of the trouble.

The German minority consists of not less than 3,315,385 people. Carefully organised, highly educated, well-equipped and proud of their individuality, large numbers of them

destiny of Czechoslovakia and hence the destiny of Europe lies in the slender hands of this small man with a large head.

Dr. Hodza, formerly leader of the largest party in the Czechoslovak Parliament, and the present Prime Minister acts as a foil to the human weaknesses of Dr. Benech, the President. The son of a Slovak clergyman, he had the most distinguishing qualities of his race—gaiety, devoutness, ambition and extravagance. It was he who severed the connection of the Slovaks from the Hungarians and brought about the political union of his race with the Czechs, in the constitutional Government. Dr. Hodza is a far-sighted man with great enthusiasm and energy. He has tried hard for the economic and political co-operation of the Danubian States much against the wishes of Germany and Italy. His success or failure can only be determined if the pacts of mutual assistance stand the brunt of a future war.

It goes without saying that these people who have risen from obscurity to eminence have immensely contributed to the solidarity and advancement of the country and they are regarded by the people as bulwarks of national liberty.

The age-long exploitation of the Czechs by Germany and the continuous domination of Slovaks by the Austro-Hungarian empire has left ineffaceable marks the people. They have become wary, cautious, and distrustful of foreigners. They guard their independence with infinite devotion and cling to constitutional rights and privileges with zealous care. Moderation is the keynote of their national character. They are moderate in living and moderate in thinking.

The Czechs are very fond of books and gymnastics. They are very careful of their money like the Jews. Most

from Prague and Masaryk was unanimously elected the first President of the Republic.

Masaryk is indeed the Messiah of his people. Born in 1850 to a Slovak coachman and a Czech country maid, he had worked his way to the reins of a Republican Government as its President, through difficulties and dangers, by means of his unimpeachable statesmanship and fine character. He rose to fame as an able Professor of History, and attracted enthusiastic crowds of young disciples around him. He founded the 'Realist Party' whose chief aim was complete independence for the mother-land. The movement expanded, and with it his reputation became established. In 1914 he was the first to realise the chance of victory and began to be looked upon as the champion of the people. With the establishment of the Czechoslovak National Council in Paris, he was universally recognised as the accredited representative of the whole nation and has requited the charge with singular honour and great distinction. Advanced in years and tired of office he retired to his castle in 1935 with the consolation of having left an independent, strong, united and progreseive republic.

Masaryk was succeeded by Dr. Benekh in the election of 1935 for a period of seven years. He had distinguished himself as the Foreign Minister since the Great War and proved his mettle in international treaties and conferences in London, Paris and Geneva. He was a Socialist in the beginning but under the magnetic influence of Masaryk he became a staunch Nationalist. As the secretary of the National Council he rendered inestimable services and has ever since braved the storm of European diplomacy with a stout heart, clear brain and firm step. He is one of the most unemotional and argumentative speakers, gifted with a wonderful knack of thoroughly convincing the hearers. The

The Great War marks a turning point in the political aspirations of the Czechs and the Slovaks (or Slavs). They wholeheartedly threw in their lot with the Allies least the success of the Austro-German alliance would deal a fatal blow to their only change of liberation from alien domination. The struggle for independence was carried on by the—" Czechoslovak National Council", founded in 1915 by a few patriots of the country such as Thomas Masaryk, Dr. Benesh, and Milan Stefanik, with headquarters in Paris. The National Council supported by exiled Czechs and Slovaks in Great Britain, France and Italy raised Czechoslovak Legions consisting of more than 1,50,000 soldiers to fight for the Allies in France, Italy and Russia till the end of War. The holding of Siberia for a long time and the return of, 70,000 badly equipped Czechoslovak soldiers to the western front after crossing Siberia and the Pacific-Ocean, led by young generals and suffering innumerable mishaps, forms one of the most heroic achievements of the Great War. During this momentous epoch of European history, the founders of the National Council were striving hard to secure recognition for Czechoslovakia 'as an independent and allied Nation'. They were paying hurried visits to the allied powers to gain their favour and enlist the sympathy of the people on their behalf by speeches, pamphlets, meetings, articles and diplomatic methods of propaganda.

At last Masaryk was able to persuade the English, French, Italians, Russians, Japanese and Americans to proclaim the independence of Czechoslovakia. The National Council at Paris was recognised as the future government of Czechoslovakia with Carpathian Ruthenia (taken from Austro-Hungary) and a few districts snatched from Germany and Poland were included under the new Government. On October 28, 1918 Czechoslovakia was declared a Republic

the French in letters, music and poetry, and is even to-day retained in some of the Czech fine arts. In the time of Charles IV, the son of this German Emperor, Prague became the centre of the Holy Roman Empire and the first university of central Europe was founded in it in 1348. During the reign of King Charles the IV the struggle of the Czechs against the Roman Catholic Church became acute and bitter. The rulers at last were forced to accede to the religious demands of the people. This proved the vanguard of religious revival and national consciousness. German influence was now on the wane. Nationalistic sentiments began to assert themselves and foreign influence was thrown above board. But they had hardly recuperated when Ferdinand I of the House of Habsburg, King of Austria and Hungary became also the King of Bohemia in 1526. Both the Czech and the Slav remained under the domination of the House of Habsburg for a period of three hundred and ninety years (lasting till the Great War). The first hundred years of the foreign rule proved a period of peace and prosperity only to be followed by a period of belligerency, national uprisings, heroic struggles, suppression of liberty, emigration and misery. Between 1848 and 1916, the Austrian rule under the Habsburgs became intensively oppressive and intolerable. A reaction set in. The minorities sank their differences. The Czechs and the Slavs who had grown into full-fledged nationhood joined with each other and with other minorities. They presented a common front against the common foe. Czech industries, Czech newspapers and Czech political associations began to grow. Everything that belonged to the soil,—language, architecture, music, and painting found an enthusiastic response in the hearts of the people against all that was exotic. They had now cast off the remnants of intellectual slavery and were steadily preparing for complete independence under the shadow of swords and thunder of guns.

distance in the east. Prague is the capital: Bohemia, Moravia, Slovakia, Silesia and Ruthenia are the important provinces. Brno, Ostrava, Bratislava and Pizen are the important cities. Life from west to east is not highly urbanished. It is simple and picturesque. But the western *part of the country is famous for its highly mechanised in*dustries and scientifically developed agriculture. From east to west it covers a distance of 590 miles and from north to south it is between 30 and 170 miles. It ranks fourteenth among the European countries in area and ninth in population. It has an army of perfectly equipped soldiers numbering 2,60,000 and an airforce of 650 most up-to-date flying machines, with a large number of intensively specialised ammunition factories, famous for their quality and output. Czechoslovakia is rich in natural resources—iron, steel, lignite, graphite and magnesium. It chiefly exports machinery, cotton, timber, glass-wares, silk material, paper, sugar, and imports fruits, raw materials, mineral oils, paints and cattle.

Czechoslovakia, as the word indicates, stands for two distinct yet analogous tribes, the Czech and the Slav. They originally settled in Bohemia and Slovakia during the second and fifth centuries A. D. and founded their respective states. These were later on united in what was called the Moravian Empire with the neighbouring countries, but the Empire soon succumbed to the Magyar (Hungarian) invasion. After the downfall of the conquerors, Bohemia fell a prey to the Holy Roman Empire in 1105 A. D., after enjoying a brief period of independence. As a result of this contact, Bohemia imbibed German influence in every branch of life. When the Imperial Crown fell to John of Luxembourg, a German Prince, a great lover and admirer of French fine arts, the German influence was replaced by

Czechoslovakia

After the sudden and dramatic German occupation of Austria on March 11, 1938, all eyes are turned towards Czechoslovakia which lies like a stumbling block in the way of German expansion in the south-east of Europe. Great Britain and France in particular are more perturbed today about the independence of Czechoslovakia and her intricate minority problem than about the success of General Franco in Spain or the progress of Japan in China ; for the conquest of this republic lying exactly in the centre of Europe means strategically the possession of the key-point to the whole of Europe. But no scheme for a German drive to the fertile plains of Eastern Europe with abundance of raw material and profuse natural resources will be complete, unless this country with a population of 14,726,158 people and an area of 54,000 square miles falls under the Nazi sway. Czechoslovakia presents externally a baffling problem to the hostile camps of Europe and is itself internally divided by the German minority problem, which has acquired great prominence both at home and abroad. This apple of discord may prove a volcanic region whose faintly luminous flickers may plunge the whole world into a mighty conflagration. It will be interesting to review its geographical situation and historical significance before attempting an analysis of its political situation.

Czechoslovakia has no access to the sea. It is surrounded on all sides by independent powers. There is Poland in the north, Austria, Hungary and Rumania in the south ; Germany in the west and the U. S. S. R. at a great

Verily, the Muses shed tears over the laureate hearse of Iqbal. Sir Muhammad, however, is not dead; his soul is imperishable and it has only lapsed into the star-world.

T. R. Padmanabhachari,
M. A. (English) Class.

The Governor's ruby seal 'tis my sweat that buys,
His heart is gemmed with tears from my children's eyes."

His last words whispered on the 21st of April 1938 into the ears of his old and faithful servant, Elahi Buxam, as the soul was leaving the body,——" I have not been afraid of death; I am a Mussalman and shall welcome death with a smiling countenance," while revealing yet another side of his noble nature, recall his own lines in ***Shikwa,***

"In one row stood Mahmood and Ayaz
Neither was he a master nor he a slave."

And again

" Hark! the sign of the virtuous one,
To thee I unfold.
When to him the Angel of Death approaches
On his lips a smile you behold."

It was only a few months ago (7th January) that the sixtieth birthday of the great poet was celebrated all over the length and breadth of this great country with pomp and rejoicing, and the universal encomiastic tributes paid to the Man and the Poet reveal the love and the veneration which all Indians entertained for him. As Mrs.Sarojini Naidu so charmingly put it, he was "one of the supremely great poets of the Indian Renascence and the true laureate of Islamic Asia."

The last verses that fell from his lips,here the curtain was rung down on his earthly life are so wistful and characteristic of him:

" This minstrel played on his lute a while in this age
But, oh! will another wise one follow me."

His was inspired poetry surging forth from a throbbing restless passion, revealing sometimes a marvellous delicacy and quite often the savage wildness of the *Wali*. In the words of Dr. Nicholson, his eminent translator, his poetry is ever new and inspiring, "a fiery incantation scattering ashes and sparks and bidding fair to be 'the trumpet of prophecy.'" A study of his poetry shows as if in spectrum analysis the many aspects of his genius, chief among which stand out patriotism, fervent adoration of beauty, and a noble idealism commingled with deep perception of the great metaphysical truth that runs through the universe as does the thread through the garland of flowers. He brought to Indian literature the beauty, the wisdom and the mystery of Hafiz and Saadi. His *Ghazals* written in the style of the ancient poets will live for ever, such for example the one on love :

"Love painteth red the tender tulip petals,
And lo our life with anxious recklessness."

In his *Workman's Song* his response to the triple ideals of Equality and Liberty and Fraternity, to which as a true follower of the Prophet he had devoted his life, is fully given expression to. He emphasised in his writings and talks that in Allah's eyes all are equal and no Moslem is a true Moslem unless his heart is pure with the "charity of the great". In one of his impassioned moments he cried out in song :

"O Moslems ! I will un-moslemise ye by my song
If you think your neighbour is other than yourself."

His heart goes out for the poor and the down-trodden :

"Clad in cotton rags I toil as a slave for hire,
To earn for an idle master his silk attire,

Where changing non-existence is displayed,
A night of nothingness is all its tale;
None there can beauteous be who do not fade,'

The moon near by overhood what then was said
As soon through the skies the saying spread,
Until at length it reached the Morning Star,
And he to Dawn conveyed the answer dread.

The Dawn to Dew retold it word for word,
And thus an earth-born creature also heard
A matter of high Heaven. Next 't was the flower
Received it with a tear, at heart sore stirred.

Then dark with grief e'en the bud's wee heart;
From garden bowers did weeping Spring depart!
And Youth who there had strolled for pleasure's
sake
Sick-souled turned slow away with sorrow's heart."

A notable feature of Iqbal's poetry is the happy blending of philosophical meditations with poetical emotions. This is illustrated by his double allegorical poem, ***The Candle and the Moth***, about man and his aspirations, the candle symbolising the light of Wisdom and the moth the individual soul hungering for and hankering after Knowledge Divine. It is again a poem signifying the parable of moral strength which serves to illustrate the great truth that by complete annihilation of the self alone can be realised the personal love of the Beloved. As observed by Principal Sayidain, " For Iqbal poetry is genuine and significant only when it impinges dynamically on life, deepening its appreciation, quickening its pulse, and interpreting its fundamental purposes. In his poetry he combines the elucidation of eternal values with a discussion of current problems." In Sir Akbar Hydari's words " Iqbal's poetry is a unique mingling of mysticism, philosophy and Nationalism."

Sir Mohammad Iqbal's poetry has an imaginative glow, a fineness of perception, a language bedecked and bejewelled,

pressed, but one cannot but give credit to his transparent sincerity and religious fervour, his vigour of expression and catholicity of views. His rhetorical writings are all characterised by intense fire and spirited expression for he was always a born fighter and a vigorous propagandist. "He is a leader. He sweeps everything before him iike a great wind swirling through a forest of pines. He would recreate Islam, an active, non-sensual, non-imperialistic Islam".

By his writings Sir Muhammad Iqbal had built for himself a niche in the temple of fame. He had achieved a world-wide reputation. His works have been translated not only into English but into Arabic, Turkish and Russian as well. In Germany has been established an Iqbal Society for the study of his poetry and the propagation of his philosophy. By his translation of the Sanskrit Gayatri into Urdu he sought to signify and symbolise his supreme and unshakeable belief in the "Unity of the All-inclusive Ego who creats and sustains all egos from which follows the essential Unity of Mankind".

To Iqbal, Nature is only a background for the play of man's emotions. His poems on the ***Himalayas***, the ***New Moon*** and the ***Banks of Ravi*** are instances of his keen appreciation of the beauties of Nature and his responsiveness to its allurement and fascination. He felt as if Nature whispered into his ears the soft melody that creates life.

His ***Plaint of Beauty***, a dainty lyric, expresses regret in forceful and plaintive language that beauty is short-lived.

"'Great God!'—thus Beauty to Allah cried—
'Ah! why is immortality denied
To me on earth? Am I not lovely there?'
And Lo! an awful voice to her replied:

'The world an empty picture-show was made,

of man to God. Of western life and thought Sir Muhammad complains :

" Amassing love, thou hast lost thy heart to-day
Ah, what a precious boon thou hast given away."

Sir Muhammad Iqbal chose as his medium of expression Persian, rich in its vocabulary and turns of expression and eminently fitted therefore to convey his high-flown thoughts with grace and charm.

" Although the language of Hind is sweet as sugar
Yet sweeter is the fashion of Persian speech."

But many and inspiring are his verses in Urdu—"the sweet language of Hind". ***Bangi Dira*** published in 1924 is an anthology of his Urdu poems; and since then have been published ***Javid Namah, Musafir, Bal-i-Jibriel*** and ***Dharb-i-Kalim***. He had enriched Urdu poetry by the infinite variety of themes chosen by him for treatment—Love, Religion, Philosophy, Nationalism, Pantheism and Pan-Islamism. He introduced into Urdu the touching metaphors and the tender images of Persian, Punjabi and other Indian dialects. He believed that national India required a national language and he sought to mould Urdu into shape and to modernise it.

" The comb seeks the locks of Urdu to tame,
This wild hearted moth still burns on the flame".

In 1929 he delivered six lectures at the Lawley Hall, the Anjuman, Madras, on Islam, which have since been published under the title of Reconstruction of Religious Thought in Islam, He there attempted to reconstruct Muslim religious philosophy with due regard to the philosophical traditions of Islam and the more recent developments in the various domains of human knowledge. One may not agree with everything that Sir Muhammad ex-

"Our Pilgrimage will be higher than all the pilgrimages of this world,
We will raise the pinnacles of our temple to meet the very edge of the sky,
We will rise every morning to sing sweet hymns,
We will dispense to all worshippers the wine of love.

Power and Peace is in the song of the devoted ;
The true end of man on earth is to love each other."

His virile optimism soars into lofty heights and drinks deep of the "Joy of Living". No wonder he has no patience with the platonic ideal of life as mere death. Plato he condemned as "that old philosopher of sheep" and treated the platonic illusion and non-progressive idealism with withering scorn and sarcasm in the following lines :

"Plato, the prime ascetic and sage,
Was one of that ancient flock of sheep ;
His Pegasus went astray in the darkness of philosophy
And galloped over the mountains of Being.
He was so fascinated by the Ideal
That he made eye and ear of no account."

Iqbal was conscious of the destiny of a poet as a prophet and proclaimed of himself :

"I have no need of the ear of to-day
I am the voice of the poet of tomorrow."

His ***Payam-i-Mashriq*** (message of the East) dedicated to Amir Amanullah of Afghanistan was a worthy reply to Goethe's "West-Oestlicher Divan". It was written in Goethe's own style and gives philosophical explanations to the many important problems in human life and the relation

Once this place was the tent of those dwellers of
the desert
For whose ships the ocean was the playground,
Who raised earthquakes in the courts of mighty
Emperors,
In whose sabres lay hidden life-scorching flames,
Whose birth tolled the knell of effete ideals,
With whose fear the strongholds of falsehood
trembled,
Whose electric touch revived life into the world,
And broke the chains of superstition.
Once thou wert the cradle of civilisation of this
race,
The fire of whose glance was world-captivating
beauty.
To sing the dirge of thy ruin has fallen to my lot;
This torture—Yea, self-torture, was reserved for
me.
Tell me of thy anguish; I too am full of pain;
I am the dust raised by that caravan which
Once broke its journey here.
Paint me that picture of old,
Rouse me by telling the tale of bygone days;
And I shall carry thy gift to India,
And make others weep as I weep now."

The glorious past of Islam was the breath of his nostrils and the glorious future of pan-Islamism was ever the vision before his mind's eye.

He was not a mere poet but a poet of humanity. "His intellect sweeps the centuries and his language is set in the rhythm of the rise and fall of ages and races." He imagines in an "Erewhon" of Peace, Love and Universal brotherhood. His ***Nia Shiwala*** (new tabernacle) is a ***locus classicus*** showing his love of mankind.

In his view, Action is the main spring of a life seeking to perfect the Self, and

> " Subject, Object, means and causes—
> They all exist for the purpose of Action."

The finite centres of experience are for Sir Muhammad Iqbal the fundamental facts of the Universe. The Hegelian Absolute, the Vedantic Brahman, the Sufi God—these are, in his opinion, fictions of the mind, hallucinations of the neurotic imagination. To him all life is individual; there is no such thing as universal life. God himself is an individual. Individuals partake of the nature of God. Man not only absorbs the world of matter by mastering it; he absorbs God Himself into his ego by assimilating divine attributes.

Sir Muhammad Iqbal was a great patriot but his patriotism was not of the narrow type. It revealed a transcendental internationalism and a width of outlook very refreshing in an age when loyalty and patriotism were conceived on a sectarian and sectional basis. The poetry of Milton is no more engrossed in the affairs of the State during the Great Rebellion, the poetry of Dante enmeshed with the Florentine politics of his age, than was Iqbal's poetry with the storm and stress of events that clouded the political horizon of India. The surge of patriotism so characteristic of the age is there. The past glory of the Muslims raises in his imagination a vision-splendid, and in powerful and unforgettable lines he reproaches his fellow men for their present degradation and disintegration. Tears trickle down his cheeks and he gets choked with emotion as he beholds the fair Sicilian coast that once formed a part of the great Ottoman Empire, and he cries out:

> " Weep to thy heart's content, O blood-weeping eye!
> Yonder is visible the grave of Muslim Culture.

Asrar-i-Khudi, the treasures of which have been made available to the English-knowing world by the eminent Dr. Nicholson's translation. ***Asrar-i-Khudi*** deals with the life of the individual Muslim and is modelled on the famous "Masnavi" of Rumi. It is more of philosophy than of poetry. "It is the melting of all philosophy by the fire of his genius to express his manly feeling at the sight of that weakness in man which is the cause of all his distress." This book took the younger generation by storm. Herbert Read in his interesting and informed criticism of the poem remarks: "A poem that crystallises in its beauty the most essential phases of modern philosophy, making a unity of Faith out of its multiplicity of ideas, a universal inspiration out of the esoteric logic of the schools." The English translation has an added value to us in that Sir Muhammad has in an introduction given in his own words a brief and succinct summary of his philosophical outlook on life. In 1918 followed ***Ramuz-i-Bekhudi*** (mysteries of selflessness), which deals with the life of the Muslim nation on lines parallel to the previous poem. Poetry and philosophy are, observes Dr. Syed Abdul Latif, "so inextricably intermixed that his utterance appears to me neither pure poetry nor pure philosophy. It is a mixture of the two blended into a political mysticism transcending them both."

These poems are semi-philosophic musings in verse dealing with the entire problem of man, and Iqbal pleads for a reversion to the simpler and more vigorous life of the ancient days when the early Muslims practised the preachings of the Prophet. The cardinal principle of his dynamic philosophy, which won him world admiration, is contained in these works of his. He there sings:

> "The form of existence is an aspect of the Self,
> Whatsoever thou seest is a secret of the Self."

Let not thy soul be vexed with drunkard's noise
and rout !

O *Saqi*, tell me fairly who it was that breached the
Jar.

The scent of the rose showed first the way into the
garden,

Else how should the nightingale have known that
roses are. "

Muhammad Iqbal returned to India in 1908 and began the practice of law, but his leisure hours he devoted to poetry. Success in life and honours came thick on him ; he was knighted in 1923 and in the following year was elected to the Punjab Legislative Council. He was a delegate to the Round Table Conference held in London in 1932 and he held the Presidentship of the Muslim League with distinction for some years. When the Afghan Government decided to establish a University at Kabul it was Sir Muhammad Iqbal who was invited by that Government for advice and guidance. And at the last Convocation, the Osmania University honoured itself and the great poet and distinguished savant by conferring on him a Doctorate of Letters.

The personality of Sir Muhammad Iqbal is a many faceted one. He was not only an inspiring philosopher ; for more mundane things too he found time. His handbook on Economics written in Urdu in his professorial days, though no longer in print, was well written and well read. In the field of philosophy his *magnum opus* was his early thesis on the Development of Metaphysics in Persia, which won him the doctorate of a German university. This was published in 1908 and because of its sound judgment and illuminating exposition it still holds the field unrivalled. In 1915 was first published his long philosophical poem in Persian,

The gold you think is pure, soon shall impure turn.
A suicide's death awaits your civilisation;
A slender bough to rest a nest is no safe position".

Again in the Khizr-i-Rah he continues:

" The democracy of the West is the same old organ,
Which strikes the selfsame note of Imperialism;
That which thou regard'st as the fairy Queen of
Freedom.
In reality is the demon of autocracy clothed in the
garb of democracy.
Legislature, reforms, concessions and rights
In the materia medica of the West are but sweet
narcotics.
The heated discussions at Peace conferences,
Are but the camouflage of capitalists.
Thou takest mere illusion for a garden,
O thou fool! a cage for the nest"!

His severe disapproval of the modes and manners of the West does not however prevent him from gratefully acknowledging the immense benefit he derived from his sojourn in England. He was no believer in the dictum of that prophet of Imperialist Jingoism, Rudyard Kipling, who wrote, " Oh East is East and West is West, And never the twain shall meet." He was firmly convinced of the great benefits an Indian derives from a stay in England and Europe, and in verse, sweet and ornate, melodious and fragrant, he wrote:

" An eastern tasted once the wine in Europe's glass
No wonder if he broke old vows in reckless glee.
The blood came surging up in his new-born thought;
Predestination's bond-slave, he learnt that man is
free.

and he was called on to fill the distinguished Chair of Arabic at the University of London.

During his stay in England Muhammad Iqbal does not appear to have had much time for poetry but his verses of that period bear the impress of Persian Romanticism. Love and its relation to beauty provided mainly the theme. True to the Oriental traditions he regards earthly love as a stepping stone to Divine Love.

"The fountain of life is Love's flashing sword.
The hardest rocks are shivered by love's glance,
Love of God at last becomes wholly God !
Learn thou to love and seek to be loved".

And again

"The song of love for Him fills my silent reed,
A hundred notes that are in my bosom.
How shall I tell what devotion He inspires?
My dawn rises from the sun of His heart".

In poems like ***Kali*** (buds), ***Tanhai*** (solitude), and "An ***Evening Near The River Neckar Near Heidelberg***" his imagination transcends all limits of space and time and peers into the beyond of Divine Love. That God-intoxicated genius, Swami Ram Tirath, strikes a sympathetic chord in his breast and his song to him is at once touching and sublime and gives us a glimpse of the Deep.

He realised that the congested soul less materialistic civilisation and thought of Europe were uncongenial to his youthful outlook on life and his orientalistic raptures of love, and in his poem, ***March 1908***, he warned the West of the dangers of a blind devotion to sordid materialism :

"O Ye that in western lands reside, learn,
God's home is not a business concern,

kept alive the celestial fire—***poeticus furor***—in the heart of Iqbal.

The year 1900 witnessed his stepping on to Parnassus. At one of the ***Mushairas*** he read his lyric, ***The Himalayas,*** which at once proclaimed him as the national poet of India. The influence of both English and Persian culture and literature is discernible clearly in his writings, which, while they are no more translations, reveal in a marked degree his assimilation of western poetic ideas. ***Hamdardi*** (sympathy) and ***Piam-i-Subh*** (message of the Morning) recall to our memories Cowper and Longfellow ; and we see the echo of Tennyson and Emerson in ***Isk aur Maut*** (Love and death) and ***Rukhsat-Al-Bazm-Jahan*** (Farewell O World), and Walt Whitman's ideal of Pragmatism is seen reflected in the ***"Secrets of the Self"***.

After taking the degree of Master of Arts he was for a time Professor of History, Philosophy and English at the Lahore College. His insatiable thirst for knowledge took him in 1905 to England, where he came into personal contact with reputed scholars and Indologists like McTaggart, the Hegelian, Browne, the author of the History of Persian Literature, R. A. Nicholson, then Professor of Persian at the Cambridge University, and Sorely, Professor of Moral Philosophy. Incessant study and deep research for three years bore fruit in his thesis on the Development of Persian Thought which earned for him a Doctorate of the University of Munich, in Germany. Returning to England he joined the London School of Political Science and about the same time was called to the bar. In London he delivered a series of six lectures on Islam. His vast erudition, his refreshing catholicity and his penetrating critical acumen won for him wide admiration, and when shortly afterwards Professor Arnold went on leave the choice fell on Muhammad Iqbal

early in life with a wonderful spontaneity. "He lisped in numbers for the numbers came." And even his lispings reveal a masterly perfection of sense and rythm that raises him from the level of a mere versifier to that of a genius. His earliest known composition contains the following lines, which for the high philosophic sense that it embodies is indeed a rare gem of poetic art.

> " Divine Grace the dew of remorse has gathered,
> Thinking them pearls, as they studded my forehead".

About this early efflorescence of Iqbal's genius, Nawab Sir Zulfiqar Ali Khan of Malerkotta expressed himself thus: "In one sublime verse the poet depicts the angelic sanctity of a soul after its resurrection, how the Divine Love rejoices to see the ennobling virtue of remorse. Supremely exquisite is the analogy of drops of perspiration to pearls whose purity resembles the chastity of the awakened conscience. This poetic euphony which embellishes the dignity of the human soul with incomparable vesture lays claim to be enjoyed as a free work of art". It was, however, reserved to Nawab Mirza Khan Dag Dehlawi, an eminent poet and tutor to His Exalted Highness the Nizam of Hyderabad, to discover the budding poet and to draw out his latent talents. His days at the Scottish Mission College, Sialkot, were most useful and marked the turning point in his interesting career. There he came under the influence of Shams-ul-Ulema Maulana Syed Mir Hasan, his tutor, who created in his pupil a genuine and abiding interest in philosophic studies and a zest for rich classic lore, Sanskrit, Arabic and Persian, and for the history of Islamic culture. At the Lahore Government College he found in Sir Thomas Arnold, the pre-eminent Orientalist, a friend, philosopher and guide, who early recognised and

The Late Sir Muhammad Iqbal

"Thou art Fire; fill the world with thy glow
Make other's burn with thy burning!

Up, and reinspire every living soul!"

The recent death of Sir Muhammad Iqbal is more than a national loss. In him we have lost the doyen of Indian renaissance poetry and an illustrious pioneer of Indian national revival. If Mrs. Sarojini Naidu is a poetess and a politician, if Dr. Sir Rabindranath Tagore is a poet and a philosopher, Sir Muhammad was all the three; in him poetry, philosophy and politics blend harmoniously, and he stands out an idealist, his head in the clouds of romance and metaphysics, his feet firmly fixed on the *terra firma* of materialistic thought. A great poet and a profound scholar, his share in strengthening the Indian national and literary revival was indeed great. His contribution to Muslim society as a whole, in Turkey, Persia, Egypt, Afghanistan and Arabia, and to the process of their regeneration has been of vast value, for it was he who inspired the poetic philosophic consciousness of those lands.

By birth as well as education Sir Muhammad Iqbal was marked out for a place in the "Cloud-Cuckoo-Land". Two of the noblest races blended in him, as also the oldest cultures of the world. Born in 1878 at Sialkot, he was, as it were, cradled in the Sufistic thought and the mysticism of Jalaluddin Rumi. His education also prepared him for his destined course and during his school days he was known as a devout student of Arabic and Persian classics, as also of Urdu poets like Ghalib and Hali. To him poetry came

YESTERDAY

The wind had cleared a cold device
 Of stars upon the sky,
As the hollow ghost of yesterday
 Unchallenged glided by.
Ah me! I thought: Such wondering
 For ever, unreclaimed,
With shadow-deeds that might have been
 By warbling children famed!

TO-DAY

Where lies the Past?
 For ever gone!
Forget it; look not back.
And where To-morrow?
 In God's hands;
He lendeth what we lack.
This day, thou man of might,
Is thine, to make each chiming hour
A victory of light.

E. E. Speight

THE PIONEER

He knows the nature of the very planets,
Yet, though he yieldeth to no mystery,
A little thought that Singeth out of nowhere
Eludeth such as he.

What though he vanquish all the plagues of Egypt,
Hold men from death, avert a nation's need,
He hath no charm to lure away the shadow
That digs an evil deed.

The earth he girdles with unbroken travel
Of trusty ships : he peereth everywhere ;
But all his wisdom helpeth not to follow
The pathway of a prayer.

E. E. Speight

THE SOLDIER

He walked the lonely woods the livelong day,
Wounded, with naught but warrior's grief to prove,
When lo! nigh beaten by the pain he bore,
He saw, last solace of his trusty heart,
A rainbow of wild roses cross his way,
And, lingering beyond that magic portal,
The wife and little children of his love
He died to save.

E. E. Speight

and also that the new road, to which we have all been looking forward for so long, is now in a fair way to completion.

We are extremely sorry to record the death of Dr. Iqbal, the eminent poet and philosopher of the East. A great advocate of Eastern culture during his life-time, he has left his thoughtful poetry to guide the efforts of his countrymen for the glory of the orient. There is an article on him in this issue written by Mr. Padmanabhachari, and also translations of some of his poems by Mr. Mir Hasan, an able graduate of our University.

Mr. Speight, though he has no connection now with the University, still takes an interest in the Magazine. We are grateful to him for his poems. Our thanks are due also to Mr. Krishnan of the English Department for his contribution, "On University Education."

Czechoslovakia is, at present, the centre of political unrest in Europe. Herr Henlein's party is avowedly opposing the Government and is supported by Hitler whose intentions have made the situation critical. We publish an article by Mr. Md. Bin Omar upon this topic.

Captain Petavel is working hard for the betterment of the poorer classes. With the help of the Government, he has established a co-operative colony at Amberpet in the vicinity of our University. The address delivered by him in this connection appears elsewhere. His previous articles in this Magazine have attracted the attention of the London Press, and we are very glad to be of help in popularising his scheme.

We thank all the contributors and especially the old students of our University who still remember their **Alma Mater.**

Editor.

EDITORIAL

The eleventh year of our Magazine's career ends wtih this issue. At the outset we apologise for the late issue of this number. But at the same time we are glad that we have secured a number of contributions on various topics. The chief aim of our Magazine is to provide good reading matter as well as to place before the readers an outline of the social and intellectual activities of the University. This is the only organ in which the students display their ability and power of writing. But we are sorry that the lack of co-operation from the students is still felt as much by us as by our predecessors. We hope that our appeal will not fall on deaf ears.

To encourage the students it has been decided this time to award prizes for the two best articles written by students on "Citizenship". We congratulate the successful competitors.

We are extremely glad that the University authorities have kindly provided at our request facilities for coaching for the Civil Service Competitive Examination. We are grateful to the Pro-Vice-Chancellor for his keen interest in the various activities of the University.

In the last issue we had pointed out that the appointment of a Provost or some such official is essential to unify the three hostels. Now intense rivalry is prevailing among the students. Each hostel is carrying out its functions independently and is trying to supersede the others. This is detrimental to the unity of the hostel students. In the light of this situation at the hostels, we emphatically repeat our request for a provost.

We are glad to see that such considerable progress is being made with the permanent buildings of the University



M. A. JABBAR, B. A., L. L. B., (Osmania)
The Managing Editor, and the Editor of English Section.

CONTENTS

Annual Subscription.

		Rs.
From	Government	12
,,	Universities, other Institutions and State Officials ...	8
,,	General Subscribers	6
,,	Old Boys, Aided Societies and Reading Rooms ...	5
,,	Present Students, Osmania University	4
,,	Abroad	Fifteen Shillings.
,,	Old Students, Abroad	Ten Shillings.
,,	Single Copy	Two Rupees.

Note:—Registrations and V.P.P. Charges Extra.

The Osmania Magazine

Vol. XI Nos. 3 & 4

THE OSMANIA MAGAZINE

BEING

THE JOURNAL OF THE STUDENTS

OF

The Osmania University

HYDERABAD-DECCAN.



EDITOR

M. A. JABBAR, B.A., (Osman.)

JOINT EDITOR

PADMANABH, B.Sc., (Osman.)

Vol. XI | 1938 | Nos. 3 & 4



Printed at

THE OSMANIA PRINTING WORKS,

87-E & 87-F Kingsway, Sec'bad.